حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

حیات، افکار، خدمات

تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند نئی دہلی ۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

حیات — افکار — خدمات

باہتمام

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

نئی دہلی-۲۵

نام کتاب	:	حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ حیات افکار خدمات
سنہ اشاعت	:	2005
ایڈیشن	:	پہلا
قیمت	:	-/300 روپے
باہتمام	:	تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند - نئی دہلی
کمپوزنگ	:	نوشاد عالم قاسمی گلوبل کمپیوٹر سینٹر، ذاکر نگر، نئی دہلی - ۲۵

ملنے کے پتے:

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند - نئی دہلی

143/12, II Floor, Zakir Nagar, New Delhi 110025
Tel./Fax. (011) 26987535

کتب خانہ حسینیہ دیوبند

Kutub Khana Husainia, Deoband 247554
Tel. (Off.) 01336 - 223266 (Res.) 222469

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

شافعِ کون ومکاں کی راہ پر لاتا رہا
گمرہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا
پرچمِ اسلام ابرِ درخشاں کے رُوپ میں
بتکدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا
ہمرہانِ دل گرفتہ کو بہ اعلانِ جہاد
تیغِ جوہر دار کا آئینہ دکھلاتا رہا
اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

شورش کاشمیری (مرحوم)

معمارانِ جامعہ

(جامعہ ملیہ اسلامیہ)

پروفیسر ظفر احمد نظامی

ترتیب مضامین

• افتتاحیہ	: مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی	۷
• مقدمہ	: مولانا عمید الزماں کیرانوی	۱۰

خطبات:

• خطبۂ صدارت	: مولانا سید نظام الدین	۱۹
• کلیدی خطبہ	: مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	۲۳
• خطبۂ استقبالیہ	: مولانا حکیم محمد عبد اللہ مغیثی	۲۸
• خطبۂ مہمان خصوصی	: جناب عبد الرحمٰن ناصر العوہلی	۳۲
• تعارفی کلمات	: مولانا قاضی زین الساجدین قاسمی	۳۵
• حرفے چند	: مولانا محمد مزمل الحق الحسینی	۳۹

پیغامات

• مولانا محمد رابع حسنی ندوی	:	۵۱
• مولانا عبد اللہ سورتی کاپودروی (کناڈا)	:	۵۲
• مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)	:	۵۳
• مولانا یعقوب اسماعیل منشی القاسمی (لندن)	:	۵۴

پہلا باب: ——— شخصیت اور حیات

• الامام محمد قاسم النانوتوی کی شخصیت کے امتیازی پہلو	: مولانا محمد سالم قاسمی	۵۷
• حضرت مولانا نانوتوی کی سیرت - ایک نظر میں	: مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ	۷۶
• حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی	: مولانا محمد اسلم قاسمی	۸۹
• مولانا محمد قاسم نانوتوی - خدمات اور کارنامے	: مفتی نسیم احمد قاسمی مرحوم	۱۰۵
• مولانا نانوتوی — عہد اور خدمات	: مولانا اختر امام عادل	۱۰۸

Memaaran-e-Jamia
by
Dr. Zafar Ahmad Nizami
Rs.95/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ھیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/95 روپے
ISBN :978-81-7587-475-6 سلسلۂ مطبوعات: 1381

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرا باب: ——— آراء وافکار

- فکر قاسمی کے چند اساسی رجحانات : ڈاکٹر شمس تبریز خاں ۱۲۳
- حضرت مولانا نانوتوی کی فکری بصیرت اور .... : مولانا ندیم الواجدی ۱۳۵
- نبی علیہ السلام کے لیے تکوینی اختیار اور.... : مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی ۱۵۵
- مولانا محمد قاسم نانوتوی اور جدید علم کلام : مولانا بدرالحسن قاسمی ۱٦۷
- اسلام پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات اور..... : مولانا عبدالحفیظ رحمانی ۱۷۷
- ہندوستانی غیر مسلموں کے اشکالات اور.... : مولانا اسعد اسرائیلی ۲۰۳
- امام نانوتوی کی وجودی فکر اور فلسفۂ وجودیت : ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز ۲۳۴
- الامام محمد قاسم النانوتوی اور اہل تشیع : مولانا عبدالعلی فاروقی ۲۴۴
- حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی کا فقہی ذوق ومزاج : مولانا عتیق احمد قاسمی ۲٦۱
- دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور مولانا نانوتوی.... : مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی ۲۷۱

تیسرا باب: ——— علمی خدمات وآثار

- مولانا محمد قاسم نانوتوی بحیثیت محدث وفقیہ : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۲۸۹
- صحیح بخاری کے حواشی میں الامام النانوتوی کا انداز : مولانا محمد برہان الدین قاسمی سنبھلی ۲۹۸
- مناظر اسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی : مولانا ابوبکر غازی پوری ۳۱۰
- حضرت نانوتوی کے مکتوبات گرامی، ان کے.... : مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی ۳۱۸
- حضرت نانوتوی کا قصیدۂ بہاریہ درنعت النبیؐ : مولانا اسیر ادروی ۳۴۸
- ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیوبند... : مولانا محمد رضوان القاسمیؒ ۳٦۹
- بانیٔ دارالعلوم دیوبند : مولانا ابوالقاسم نعمانی ۳۸۲
- الامام النانوتوی نظام مدارس کے مجدد اعظم : مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم ۳۸۹
- الامام النانوتوی کی تصنیفات.... : ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی ۴۰۱
- مولانا نانوتوی کا سلوک واحسان.... : مولانا مفتی عبدالقدوس رومی ۴۱۱
- ہم نواؤں سے ہم کلامی.... : مولانا عبدالوحید حیدرآبادی ۴۸۰

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطّل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آیندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

چوتھا باب: ——— اساتذہ ورفقاء

- حضرت امام محمد قاسم نانوتوی کے اہم اساتذہ : مولانا نور عالم خلیل امینی ۴۹۱
- مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے نامور رفقاء : مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ۵۱۴
- مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مخصوص رفقاء کرام : پروفیسر بدر الدین الحافظ ۵۲۸
- دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ مولانا نانوتوی اور سرسید... : پروفیسر اختر الواسع ۵۳۴
- حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی اور سرسید احمد خاں : مولانا عقیدت اللہ قاسمی ۵۳۹

اختتامیہ:

- رپورٹ : مولانا عبدالقادر شمس قاسمی ۵۶۵
- تجاویز : ۵۷۳
- آئینۂ حیات : مولانا وارث مظہری ۵۷۷

افتتاحیہ مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی*

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

(۱۲۴۸ — ۱۲۹۷ھ)

آپ کے ہاتھوں میں ایک ایسی ہستی کے اوراق زندگی ہیں جنھیں پڑھ کر علم و آگہی کی روشنی، غیرت ربانی کے جلوے اور عزائم کے نمونے سامنے آتے ہیں۔

امام محمد قاسم نانوتوی برطانوی سامراج کے عہد میں پیدا ہوئے جب وہ اپنی طاقت، تنظیم اور سازش کے ذریعہ نہ صرف اس آزاد ملک کو غلام بنانے کے لیے بنگال سے دہلی تک دوڑ بھاگ کر رہے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو اندلس کے تجربہ کی طاقت سے فتح کرنے کی دھن میں تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے آگرہ کی راجدھانی میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے عیسائیت اور اسلام پر جو مناظرہ ہوا اور اس میں لندن سے ٹریننگ پانے والے پادری، فنڈر کی سربراہی میں شریک کیے گئے تھے اور پورا برطانوی سامراج اس میدان جنگ میں جشن منانے کی تیاری کر رہا تھا، مگر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے انجیل، تثلیث اور تحریف کے موضوعات پر پادری کو چاروں خانے چت کر دیا تھا اور اس سے بڑا کام یہ کیا تھا کہ اپنے کو بچا کر آگرہ سے باہر چلے گئے تھے حتیٰ کہ انھیں ہندوستان سے ہجرت کر کے عرب جانا پڑا تھا۔

ایسے سنگین ماحول میں ۱۸۵۷ء کا طوفان اٹھا اور اسے سامراجی طاقت نے اسلام، علما اور مسلمانوں کے خلاف اتنا بھیانک بنا دیا کہ علماء نے ہجرت کی اجازت دیدی، چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ ایسے سینکڑوں حضرات ہجرت کر کے نیپال اور عرب چلے گئے، مگر جن دو مولویوں نے ہجرت بھی نہیں کی اور اس کی نیت بھی نہیں کی بلکہ جان کی بازی لگا کر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم کر لیا وہ تھے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی، ان

* صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی

اپنے والد محترم

حکیم جمیل احمد صاحب مرحوم کے نام

جن کی شفقتوں کے سائے آج بھی

میرے وجود پر سایہ فگن ہیں

حضرات نے چند برس بعد ۱۸۶۶ء میں دیو بند کی مسجد چھتہ میں غیر معروف جگہ پر مدرسہ اسلامی کی بنیاد رکھدی۔

اس مدرسہ میں ذریعۂ تعلیم علوم اسلامیہ کو بنا کر نائبین رسول بنانے کی راہ کھول دی اور نصاب کو درجہ وار مرتب کر کے اچھے اساتذہ کو کام سپرد کر دیا جس سے وہاں کے طلبا شیخ محمود حسن اور شیخ فخر الحسن بن کر نکلے۔

پھر مولانا نے دار العلوم کو اپنی تگ ودو کا مرکز بنا دیا اور اسی انگریزی سامراج کے مقابل کام شروع کر دیا جس نے اندلس اور قرطبہ میں مسلمانوں کو عیسائی بنا کر ملک کو عیسائی بنا دیا تھا اور ہندوستان کو غلام بنا کر اسے تباہ کرنا چاہتا تھا۔

حضرت مولانا نے پہلے ان پادریوں سے مقابلے شروع کر دیئے جو مسلمانوں کو کھلے عام چیلنج دیتے تھے اور عیسائیت کی دعوت دینے کے لیے تنخواہ پاتے تھے۔ مولانا نے ان کے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی اور وہاں اپنی برجستگی، علمیت اور تقریر کا سکہ بٹھا دیا، اگر دیانند سرسوتی نے شعر پڑھ کر مسلمانوں کو ہراساں کیا اور للکارا کہ:

''ماس ماس برابر جیسی گائے ویسی سور'' تو مولانا نے بھی برجستہ شعر پڑھ کر سرسوتی کو حیران کر دیا۔ فرمایا: ''عورت عورت برابر جیسی بیوی ویسی مادر'' اگر یہی فلسفہ ہے تو گھر کی عورتوں میں ماں، بہن، بیوی کا فرق کیوں ہے جب کہ سب برابر ہیں۔

تو مولانا نے تقریر کا جواب تقریر سے، کتاب کا جواب کتاب سے، شعر کا جواب شعر سے دے کر انجیل کا جواب قرآن سے دے کر اور ہر جگہ خود پہونچ کر پادریوں اور پنڈتوں کو گھر تک پہونچا دیا اور وہ جہاں جہاں سے بھاگ گئے وہاں کئی کئی دن رک کر اسلام کی حقانیت، انجیل کی تحریف اور تثلیث کی تردید فرمائی اور مسلمانوں کو مطمئن کر کے واپس آئے۔

مولانا نے سر سے کفن باندھ کر میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور اور دہلی مین اتنے مناظرے کئے کہ پادری تو پادری حکومت بھی حیران ہوگئی، پنڈت لوگ بھی منہ چھپانے لگے، چنانچہ رڑکی جا کر مولانا نے دیانند کو بہت للکارا مگر وہ نہ ان کے سامنے آیا نہ ان کے شاگردوں کے سامنے۔ اس طرح جلسے کر کے مسلمانوں کو چیلنج دینے کی ہمت ٹوٹ گئی۔

مولانا نے دارالعلوم کو مرکز بنا کر ایک اسلامی چھاؤنی قائم کردی، اسی چھاؤنی کے لیے انھوں نے شیخ الہند محمود حسن علامہ فخرالحسن جیسے شاگرد تیار کردیے جن کے ساتھ مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جیسے یگانۂ روزگار علما نے اسلام اور اتباع سنت کا اور فرق باطلہ کا مقابلے کر کے دیوبندیت کا اسلامی اور دینی اسکول قائم کردیا۔

حضرت مولانا کی اسلامی غیرت نے ایک طرف برطانوی سامراج سے ٹکرا کر عیسائیت پھیلانے کے عزائم کو چکنا چور کردیا دوسری طرف تحریر وتقریر کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تیسری طرف جگہ جگہ مدارس قائم کر کے مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا کردیا اور ہزاروں نائبین انبیاء پیدا کردیئے۔ اگر اسی طرح کسی محمد قاسم نے قرطبہ اور اندلس میں عیسائیوں کے مقابلے کئے ہوتے تو وہاں آج بھی اسلام اسی طرح زندہ رہتا جس طرح ہندوستان میں ہے:

چھیڑ دیتا ہے جب ان کو باطل کہیں
دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی ''بزن''

☆☆☆

فہرست

تمہید و تعارف	۷
شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ	۱۷
مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں	۴۵
مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی	۸۱
رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر	۱۰۳
ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۳۷
عبدالمجید خواجہ	۱۴۹
ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۹۷
ڈاکٹر ذاکر حسین	۲۱۷
شفیق الرحمٰن قدوائی	۲۵۳
پروفیسر محمد مجیب	۲۷۵

مولانا عمید الزماں کیرانوی*

مقدمہ

برصغیر ہند میں اسلام کے احیا وتجدید کے افق پر ابھر کر آنے والی وہ چند شخصیات جنھوں نے اس دیار میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی اور دین وعقیدے کی پاسبانی کا ناقابل فراموش اور تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا، ان میں نابغۂ عصر حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیتِ گرامی قدر کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ اللہ نے آپ سے وہ کام لیا جو وہ اپنے نہایت چیدہ وبرگزیدہ اور مخصوص بندوں سے لیتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں جب بھی حق وباطل کے مابین معرکۂ کارزار گرم ہوا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب حق کا دم واپسیں ہے تو اللہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ کے تحت ایسے بندوں کو میدان میں لا کھڑا کیا جو دیکھنے والی آنکھوں میں بے سروسامان اور کم مایہ تھے، جن کے بازوؤں میں ظاہری طور پر وہ طاقت بھی نہیں تھی جس کا احساس اور اندازہ اہل باطل کے دلوں میں خلش پیدا کردے، لیکن انھوں نے اپنے سرفروشانہ حوصلے اور عزائم کی قوت سے نہ صرف یہ کہ انہی معرکوں کو سر کیا بلکہ آئندہ کے ایسے بہت سے معرکوں میں حق کی فتح یابی اور باطل کی شکستِ وپسپائی کا سامان چھوڑ گئے۔

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی کے کارناموں کی عظمت کا ادراک صحیح طور پر اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم اس ماحول اور پس منظر پر نظر ڈالیں، ان حالات کا بچشم غور جائزہ لینے کی کوشش کریں جن حالات میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی عظمت وشوکت کی بساط باضابطہ شکل میں لپیٹی جاچکی تھی۔ سوسال (۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے انقلاب ۱۸۵۷ء تک) کی پے بہ پے شکست خوردگی اور برطانوی سامراج کے ظلم وجارحیت نے مسلمانوں کو اپنی لاچاری وبے بسی اور حرماں نصیبی پر خون کے آنسو بہانے پر مجبور کردیا تھا۔ ایسے وقت میں ایک سوال تو یہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو قائم وبرقرار رکھنے کی سعی کی جائے لیکن اس سے بڑا سوال مسلمانوں کے دینی وتہذیبی سرمائے اور متاع ایمان ویقین کی حفاظت وپاسبانی کا تھا۔ حضرت

---

* کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

نانوتوی نے دونوں سوالوں کو اپنے فکر وعمل کا موضوع بنایا۔ چناں چہ شاملی کا جہاد اسی پہلے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش تھی لیکن آپ کو خدا کی جانب سے عطا کردہ فکر وبصیرت نے دوسرے پہلو کو اصل مرکز توجہ بنانے کی طرف راغب کیا۔ یہ دین وملت کے لحاظ سے عسر میں یسر کی تلاش تھی جس میں وہ پورے طور پر کامیاب رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احیائے سلطنت اسلامیہ کی جو جنگ شاملی کے میدان میں آپ اور آپ کے رفقا نے ہاری تھی وہ جنگ زیادہ بھرپور اور وسیع طور پر آپ نے احیائے دین وملت کے میدان میں جیت لی۔

مسلمانوں کی ملی زندگی میں دارالعلوم دیوبند اٹھارہ سوستاون کے خسارے کی تلافی کا سب سے بڑا ذریعہ بن کر سامنے آیا۔ وہ محض ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ اس کی تاسیس ایک تحریک کا نقطۂ آغاز تھا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اسی حیثیت سے اسے اسلامی چھاؤنی قرار دیتے تھے۔ اسے محض ایک درس گاہ کی شکل میں دیکھے جانے کے وہ قائل نہ تھے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی شکل میں مدارس کے قیام کی تحریک کی شروعات بروقت نہ کی گئی ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔ ان کے اسلام وایمان کی کیا حالت اور درگت بنتی اور ان کی تصویر کے کیا خدوخال ہوتے۔

اس تصویر کو اگر مسلمانوں کے فردوس گم شدہ (الفردوس المفقود) اندلس کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ایک حد تک صحیح حقیقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تحریک دیوبند تحریک ولی اللہی کا ہی امتداد اور پرتو اور اسی ''نظام شمسی'' کا کوکب درخشاں ہے۔ اس لیے اس میں وہی تابانی ودرخشانی اور وہی حرارت پائی جاتی ہے جس نے ایسے وقت اسلام اور مسلمانوں کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑادی تھی جب دور دور تک سوائے مہیب سناٹوں یا آہ وفغاں کی صدائے جاں گسل کے، شاید کم ہی کچھ باقی رہ گیا تھا۔

حضرت نانوتوی کی فکری اور عملی جدوجہد کے پیکر مجسم دارالعلوم دیوبند کے قیام پر تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزرنے کو ہے اس طویل مدت میں دین کے تحفظ وبقا کی جدوجہد میں عالمی سطح پر اس کا جو نمایاں کردار ابھر کر سامنے آتا ہے، اس کی حیثیت اس مہر نیم روز کی ہے جس کی روشنی نابیناؤں کو بھی اپنے وجود واہمیت کا احساس دلادیتی۔ حالات میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں، زمانے کا رنگ بدل چکا ہے۔ سیاسی، سماجی، فکری، تہذیبی اور علمی تمام سطحوں پر برصغیر ہند کا نقشہ وہ نہیں ہے جو

تمہید و تعارف

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندستانی مسلمانوں کو بڑے بھیانک نتائج سے دوچار کر دیا تھا کیونکہ انگریزوں کے مظالم نے انھیں قعرِ مذلت میں دھکیل کر ان کے مستقبل کو تاریکیوں میں گم کر دیا تھا۔ اگرچہ ہنگامہ کے دوران سر سید احمد خاں نے انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری کی زبردست مثالیں قائم کیں تاہم وہ بھی مسلمانوں کی حالت زار سے بے پناہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اسی لیے ان کی خدمات کے صلے میں حکومت نے ایک بہت بڑا تعلقہ جو ایک نہایت نامی گرامی خاندان کی ملکیت اور ایک لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا انھیں دینا چاہا تو ان کے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ خود سید کے الفاظ میں ''میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہوئی اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اسے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندستان میں رہنے کا نہیں اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔۔۔ جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا'' لیکن پھر ان کے دل نے ملامت کی اور ان کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ''نہایت نامردی اور بے مروتی ہے کہ میں اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں کمرِ ہمت باندھنی چاہیے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا''۔

سید احمد خاں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت قائم کر کے دونوں کے مابین فاصلے کو کم کرنے کی جہت میں قدم اٹھاتے ہوئے ''اسبابِ بغاوت ہند'' تالیف کر کے ہندستانیوں کی وکالت کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے رسالہ ''خیر خواہان مسلمانان'' میں ''اطراف ہندستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت میں جاں بازیاں کی'' تھیں ان میں سے ہر شخص کا حال ''مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ'' قلمبند کیا اور ان کے تئیں انگریزوں کی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت تھا لیکن اس عظیم ادارے کی عظمت و معنویت اب بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ دن بہ دن اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ دنیا کے کم ہی ایسے خطے ہوں گے جو اس کے آب حیات سے فیض یاب نہ ہوئے ہوں اور اس سے پھوٹنے والی کرنیں وہاں تک نہ پہنچی ہوں۔ یہ دراصل اس کے بانی اور ان کے رفقائے کار کے اخلاص کی برکت کا ہی کرشمہ اور معجزہ ہے۔

حضرت نانوتوی نے اپنے لیے گم نامی کو پسند کیا۔ حسرت کی حد تک ان کی خواہش تھی کہ وہ تو دنیا کو جانیں، زمانے پر نگاہ رکھیں لیکن دنیا انھیں نہ جانے اور زمانے کی ان پر نگاہ نہ ہو۔ حضرت نانوتوی سے متعلق اپنی مختصر تحریر کردہ سوانح میں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں کہ:... اور ''(حضرت نانوتوی) کچھ اپنے لیے صورت تعظیم کی نہیں رکھتے، علما کی وضع، عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔'' مزید لکھتے ہیں: ''مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پر فرماتے، فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے'' (سوانح قاسمی جلد اول ص:۳۱) آج ان کے نام اور کام کی عظمت و شہرت چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ارشاد گرامی کی سچی تصویر ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رتبے کو بلند کرتا ہے۔ دین و ملت کے لیے حضرت نانوتوی کے دل میں وہی جذبہ موجزن تھا، وہی سوز اور تڑپ تھی جس کی صورت گری قرآن میں ان لفظوں میں کی گئی: ''شاید منکرین کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنی جان کو ہلکان کر لیں گے'' **لعلك باخع نفسك ألا يكونوا مؤمنين** (الشعراء آیت:۳) اور جو بدر کے میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر خدا کے حضور اس گریہ و دعا کی صورت میں ڈھل گیا تھا کہ ''اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی ملت ہلاک و برباد ہو گئی تو روئے زمین پر تیرا کوئی نام لیوا نہیں رہے گا **اللهم إن تهلك هذه العصابة اليوم لا تعبد** (سیرت ابن ہشام ج:۱ص:۵۴۸) حضرت نانوتوی کا یہی وہ سوز دروں تھا، دل دردمند کی یہی وہ کیفیت تھی جو انھیں اپنوں اور غیروں، دونوں کے لیے بے تاب و مضطرب رکھتی تھی۔ انھوں نے اصلاح معاشرہ کی کوششوں کے تحت نکاح بیوگان کا احیا کیا، لڑکیوں کے حق وراثت کی لڑائی لڑی۔ تشیع کے زیر اثر تعزیہ و ماتم کی جڑ پکڑی ہوئی رسم کا اپنے علاقے سے استیصال کیا۔ دوسری طرف اسلام کی

اس پورے عرصہ میں سید احمد گزرے ہوئے واقعات پر غور و فکر کر کے مسلمانوں کے زوال و تذلیل کی وجوہات تلاش کرتے رہے اور "اس کا جواب یہ ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی اور انگریزوں سے جن کو خدا نے ہماری قوم پر مسلط کیا ہے میل جول اور اتحاد نہ تھا"۔ اسی لیے انھوں نے ہم مذہبوں کی بہتری کے لیے "تعلیم" اور "انگریزوں سے اتحاد و دوستی" کا نسخہ تجویز کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی، انگلستان کا سفر کر کے تعلیمی تحریک کے تصور کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا اور تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔

اپنی تعلیمی تحریک کو عملی شکل دینے کی غرض سے ایک مدرسۃ العلوم کے قیام کے سلسلے میں سرسید کے بیٹے سید محمود نے فروری ۱۸۷۳ء میں ایک مبسوط اسکیم تیار کی جو "ولایت کے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا انتظام اور طریقۂ تعلیم دیکھ کر مرتب کی گئی تھی۔ آخر کار ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مجوزہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام عمل میں آ گیا اور اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد جنوری ۱۸۷۷ء میں وائسرائے لارڈ لٹن نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھ کر مسلمانوں کی اعلا تعلیم کے لیے راستے ہموار کر دیے۔ سرسید نے عمر بھر اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر مرکوز کرتے ہوئے کالج کو سیاسی سرگرمیوں سے ہمیشہ دور رکھا تاہم ان کی وفات کے بعد ان کے رفقا نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی عملی کوششیں شروع کر دیں۔ انھوں نے سرسید کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے توسط اور توسل سے یونیورسٹی کے قیام کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی اور اس سلسلے میں جنوری ۱۹۱۱ء میں آغا خاں کی سرکردگی میں محمڈن یونی ورسٹی کمیٹی قائم کر دی اور اگلے ہی ماہ یونیورسٹی کا آئین مرتب کرنے کی غرض سے راجہ صاحب محمود آباد کی سربراہی میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہو گئی لیکن ان کمیٹیوں کی تجاویز سے حکومت نے اختلاف رائے کیا۔ دراصل حکومت یونیورسٹی کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کرنے کے حق میں تھی۔ وہ اسے الحاقی یونیورسٹی کا درجہ نہیں دینا چاہتی تھی اور اسے "علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی" کا نام دینے کے بجائے صرف "علی گڑھ یونیورسٹی" کہلانا پسند کرتی تھی۔ لہٰذا اگست ۱۹۱۲ء میں یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے حکومت کی ان شرائط کو مسترد کر دیا۔

بعد ازاں نواب وقار الملک نے، جو یونی ورسٹی کمیٹی کے سکریٹری تھے، نومبر ۱۹۱۲ء میں مسلمانوں کی جد و جہد میں ناکامی کے نتیجہ میں یونی ورسٹی کے لیے جمع شدہ روپیہ سے ایک "جامعہ اسلامیہ" کے قیام کی تجویز شائع کی جس میں تعلیم و تربیت، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم

عقائدی بنیادوں پر عقلی اعتراضات وشبہات کے جواب میں آپ نے زبان اور قلم دونوں کی قوت کا استعمال کرتے ہوئے متعدد مناظرے کئے اور پادریوں اور پنڈتوں کو گھر کی راہ دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، پھر اس موضوع پر ایسی تحریریں رقم کیں جو شبہات کی دلدل میں پھنسے اور عقلی کج روی کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے لوگوں کی رہنمائی اور تسکین کا سامان بنیں۔

آج ضرورت ہے حضرت نانوتوی کے نام اور پیغام سے دنیا کو متعارف کرانے کی، ان کی فکر کو عملی سانچوں میں ڈھال کر زمانے کے سامنے پیش کرنے کی۔ فطرت کے ازلی قانون: گردش زمانہ (مداولة الایام آل عمران: ۱۴۰) کے تحت حالات کی کشمکش ایک بار پھر اس تقاضے کو دہرا رہی ہے کہ ہم بالخصوص ابنائے دارالعلوم دیوبند اور قاسمی فکر وحکمت کے خوشہ چیں، حضرت نانوتوی کے نقوش پا کو ڈھونڈ کر سامنے لائیں اور ان پر چل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ ہم نے اپنے اسلاف کی سیرتوں کو بھلا دیا۔ وہ ہمارے فخر واعزاز کا سرمایہ تو ہیں لیکن ہم ان سے اپنی قوت فکر کی بیداری اور جوش عمل کی بازیابی کا وہ کام نہیں لیتے جس کی آج پہلے کے مقابلے میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

مئی ۲۰۰۰ء میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند- نئی دہلی کی طرف سے ''الامام محمد قاسم نانوتویؒ سیمینار'' کے انعقاد کی غرض وغایت یہی تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ ہم حضرت نانوتوی کی فکر اور کام کو دنیا کے سامنے لائیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا نہیں یا کس حد تک کامیاب ہوئے لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ ہم نے اس کام کا آغاز کیا سیمینار نے لوگوں کی نگاہوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ حضرت نانوتوی پر باضابطہ کام کی ضرورت ہے، ان پر جتنا کام ہونا چاہیے صحیح معنی میں اس کا عشر عشیر بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ حضرت نانوتوی اگر آج کے دور کی شخصیت ہوتے، آج کے انقلابی وسائل ابلاغ کے دور میں ان کی وفات ہوئی ہوتی تو نہ جانے کتنے مظاہر تعظیم وتوقیر دیکھنے کو ملتے، کتنے مجلات ورسائل کے ضخیم ترین نمبر نکلتے اور سیمینار پر سیمینار منعقد کئے جاتے اور اگر وہ اس طائفہ کے سرخیل نہ ہوتے جو سالگرہ منانے کو بجا طور پر ایک عمل عبث سمجھتی ہے تو نہ جانے کتنی دھوم دھام سے برصغیر ہند کے طول وعرض میں ان کا یوم پیدائش منایا جاتا، لیکن اس باب میں ہم لوگوں کی بے التفاتی و بے توجہی بھی سنگین کوتاہی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور تمام چیزوں کو تو چھوڑیئے حضرت نانوتوی کی وہ بیش بہا تصنیفات وتالیفات جو فکر دیوبند کے لیے نشانِ

سے متعلق تفصیلات بھی درج تھیں۔ نواب صاحب نے اپنی اسکیم کے تعارفی حصہ میں کہا تھا کہ "اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کر کے 'آل انڈیا یونیورسٹی' بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعے سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کر سکیں گے، اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیے کہ تمام ہندستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علاحدہ "جامعہ اسلامیہ" (قومی دار العلوم) خود قائم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونی ورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کر دیا جائے جو باستثنا ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے" اس تجویز کا عام طور پر خیر مقدم ہوا اور علی گڑھ کے نوجوانوں نے بیگم سلطان جہاں کے نام پر دہرہ دون میں سلطانیہ کالج کے قیام کے لیے کوششیں شروع کر دیں لیکن یہ اسکیم بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ دراصل بیگم سلطان جہاں والئی بھوپال ایم اے او کالج کی چانسلر اور ہر معاملہ میں حکومت کی دست نگر تھیں۔

ہندستانی مسلمان حکومت سے بدظن اور مایوس ہو چکے تھے۔ اس کے لیے جنگ بلقان میں ترکی کے خلاف برطانیہ کی مدد' ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں طبّی مشن کی ترکی کے لیے روانگی' مچھلی بازار کان پور میں مسجد کے ایک حصہ کی شہادت اور پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے خلاف جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے ترکی کی شمولیت اور اس کی شکست ذمہ دار تھے۔ ان واقعات کے علاوہ مولانا آزاد کے "الہلال" محمد علی کے "کامریڈ" اور "ہمدرد" مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" اور مولانا حسرت موہانی کے "اردوئے معلّی" میں قوم پرورانہ تحریریں بھی ذمہ دار تھیں جن کے مدیران کو حکومت نے جیلوں میں محبوس کر دیا تھا۔

جنگ میں دولت عثمانیہ کی شکست نے ہندستانی مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچایا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے پر انگریزوں نے جس طرح مختلف مقامات پر اور خصوصاً امرت سر کے جلیان والا باغ میں ہندستانیوں کا قتل عام کیا، اس نے بھی انھیں ان کا مخالف بنادیا۔ ترکی کا سلطان مسلمانوں کا خلیفہ تھا' اس لیے اس کی شکست کو مذہبی اعتبار سے بھی اہم قرار دیا گیا اور جب اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے ان پر قابض ہونے کا فیصلہ کیا تو مسلمان بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے گاندھی جی کی قیادت میں تحریک خلافت کے پروگرام کو عملی شکل دی اور ترک موالات کو اپنا کر پورے ملک میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔ اس تحریک میں انگریزی اسکولوں اور سرکاری نگرانی میں چلنے والے تعلیمی اداروں کو ترک کر دینے

امتیاز ہیں جن کا لفظ لفظ آب حیات ہے اور جو آج بھی تشنہ لبوں کی سیرابی و آسودگی کا ذریعہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں، خود دیوبند کے تجارتی مکتبوں میں دستیاب نہیں، جو اسلامی کتابوں کے معاملے میں ہندستان کا بیروت سمجھا جاتا ہے۔ بعض کتابیں پاکستان میں چھپی ہیں اور چھپ رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ حضرت نانوتوی کی کتابوں کو آج کے اسلوب اور زبان میں تسہیل کر کے شائع کیا جائے۔ خاص طور پر حضرت کی وہ کتابیں جو کلامی مباحث و موضوعات پر مشتمل ہیں ان پر مستقل کام کے لیے علمی اکیڈمی یا متعدد ایسی اکیڈمیاں قائم ہونی چاہئیں جن میں باہمی ربط و تنسیق ہو، ایسے افراد کو اس کام پر لگایا جانا چاہیے جو جدید فکری چیلنجوں سے واقف ہوں، آج کی عقلیات پر ان کی نظر ہو۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کے پورے طور پر اہل ہوں کہ کلام کے باب میں حضرت نانوتوی کے استدلالی فکر و فلسفے، دلائل اور تجزیے کو ذہن میں اتار کر قابل فہم انداز میں الفاظ و حروف کا جامہ پہنا سکیں۔

برادر گرامی قدر مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے اس جہت میں کام کی ابتدا کی تھی۔ انہوں نے اپنے تلمیذ رشید مولانا خالد القاسمی کو خاص اس کام پر لگایا اور اس طرح ان کی کوششوں کے نتیجہ میں کئی کتابیں: ''صداقت اسلام''، ''عظمت اسلام'' اور ''مجموعۂ افادات قاسمیہ'' وغیرہ دار المولفین سے شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ اس کام کو مزید وسعت دینے کی ضرورت تھی۔ وہ اگر اور زندہ رہتے اور وسائل کی قلت نہ ہوتی تو شاید علمی حلقوں کو اس تعلق سے وہ شکوہ نہ ہوتا جو آج زبانوں پر ہے۔ بے بضاعتی اور فرومایگی کے احساس کے باوجود تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کی خواہش ہے کہ وہ اس سمت میں قدم اٹھائے اور بساط بھر اپنی کوشش سے دریغ نہ کرے لیکن ظاہر ہے یہ صرف تنظیم کے کرنے کا کام نہیں۔ دیوبند سے نسبت رکھنے والے اصحاب علم و فضل کی بہت بڑی تعداد ہندستان اور ہندستان سے باہر دنیا کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی ہے۔ اصحاب فکر و وسائل میں سے کچھ لوگ بھی اگر اس کام کے لیے کمر ہمت کس لیں تو ایک بہت بڑا ملی فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ تاہم جو لوگ بھی اپنے طور پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بجا طور پر ہم سب کی ستائش و مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں پچھلے دنوں نمایاں طور پر جو کام سامنے آیا ہے، وہ محترم مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کا ہے ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی: احوال و آثار و باقیات

کی شق بھی شامل تھی۔ تعلیمی محاذ پر ترک موالات کے لیے مولانا محمد علی نے اپنی مادرِ علمی یعنی علی گڑھ کے ایم اے او کالج سے پہل کی۔

گاندھی جی نے کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کے والدین کے نام ایک اپیل میں کہا کہ "آپ کے بچے علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں۔ آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم سے متعلق جو فکر ہے اس میں میں آپ کا شریک ہوں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری اس بات سے آپ کے جذبات مجروح نہیں ہوں گے اگر میں آپ کے بچوں سے آپ کی مرضی کے خلاف اسکول اور کالج چھوڑ دینے کے لیے کہوں۔۔۔ کاش آپ کو بھی یہ احساس ہوتا کہ وطن عزیز کا مقدر ہم والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا ہم انھیں اس غلامی کی لعنت سے جس نے ہمیں اپنے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا ہے، چھٹکارا نہ دلائیں گے؟۔۔۔ اگر وہ آزاد بچوں کی طرح تعلیم حاصل کریں تو اس سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا"۔ اس اپیل کا اثر تو ہوا لیکن کالج کے ٹرسٹیوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔

تاہم ایم۔ اے۔ او کالج کے طلبہ کی درخواست پر مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی اور سوامی ستیہ دیو کے ساتھ ۱۲/ اکتوبر کو مراد آباد سے علی گڑھ پہنچے جہاں انجمن اتحاد کے جلسہ میں گاندھی جی نے مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالی اور علی برادران کے ساتھ طلبہ سے اپیل کی کہ وہ اپنی مادرِ علمی کو خیر باد کہہ کر تحریک ترک موالات میں شامل ہو جائیں لیکن طلبہ نے اس شمولیت کے بارے میں غور و فکر کے لیے وقت طلب کیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۳/ اکتوبر کو انجمن اتحاد کا جلسہ پھر منعقد ہوا۔ اس میں ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی کہ کالج کے ٹرسٹی حکومت سے امداد لینا بند کر دیں اور حکومت کی یونیورسٹی سے کالج کا الحاق ختم کر دیں۔ ٹرسٹیوں کو یہ الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر وہ ۲۹/ اکتوبر سے پہلے حکومت کی امداد ترک کر کے الحاق ختم کرنے پر رضامند نہ ہوئے تو طلبہ وہ تمام ذرائع استعمال کریں گے جو ان کے اختیار میں ہیں اور کالج کو خلافت کمیٹی کی نگرانی میں دے کر اسے ایک قومی تنظیم کی شکل دے دیں گے۔

اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں رہنمایانِ وطن و قوم نے ٹرسٹیوں سے جن میں وہ خود بھی شامل تھے، درخواست کی کہ وہ حکومت سے امداد لینا بند کر دیں لیکن انگریز نواز ٹرسٹیوں نے ان کی درخواست نامنظور کر دی۔

انجام کار ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی مسجد میں بعد نماز جمعہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) کی رسم افتتاح ادا ہوئی شیخ الہند کی علالت کے پیش نظر ان کا خطبہ صدارت ان کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ

ومتعلقات'' کے نام سے پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب، جسے مجلّہ ''صحیفۂ نور'' کے پہلے شمارے کے طور پر شائع کیا گیا ہے، علوم و معرفت قاسمیہ کا بیش بہا گنجینہ ہے،(۱) جس کی دوسری قسط مرتب و مؤلف کے وعدے کے مطابق، ابھی باقی ہے۔ مولانا راشد صاحب اکابر علمائے دیوبند کی وراثت علمی کے سب سے بڑے امین و پاسباں اور صاحبِ ذوق و دیدہ ور محقق ہیں۔ انھوں نے صحیح معنی میں اس موضوع پر تنہا پوری اکیڈمی کا کام کیا ہے اور کر سکتے ہیں۔ اللہ انھیں مزید اس کی ہمت و صلاحیت عطا کرے اور دست غیب سے اس سلسلے میں ان کی مدد کرے۔

اس کام کا دوسرا حصہ حضرت نانوتوی کے علوم و معارف کی دوسری زبانوں بالخصوص عربی اور انگلش میں اشاعت ہے۔ راقم الحروف کی معلومات کی حد تک، دوسرے مکاتب اور حلقہائے فکر کے لوگ جس طرح اپنی اپنی شخصیات کے تعلق سے اس معاملے میں سرگرم ہیں، ہمارے حلقے میں اس کی قابل التفات کمی نظر آتی ہے۔

ہمارے برادر مکرم مولانا نور عالم خلیل الامینی رئیس التحریر ماہنامہ ''الداعی'' (دارالعلوم دیوبند) نے کسی حد تک اس کمی و کوتاہی کی تلافی کا کام شروع کیا ہے حضرت نانوتوی سمیت دیگر اکابر دیوبند کے علم و حکمت کے شہ پاروں کو، صلے اور ستائش کی خواہش و تمنا کے بغیر، اپنے مؤقر عربی مجلّے کے ذریعہ سلسلہ وار جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں وہ انھی کا حصہ ہے۔ پوری قاسمی برادری کو اس کے لیے موصوف کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ راقم الحروف نے بھی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں قائم ''اکیڈمی قرآن عظیم'' (مجلس معارف القرآن) میں کام کے دوران (۱۹۶۴ء-۱۹۶۵ء) الامام محمد قاسم نانوتوی کے معوذتین کے تفسیری رموز و نکات سے متعلق ایک رسالہ کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ یہ مختصر رسالہ ''تفسیر المعوذتین'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ حضرت نانوتوی کی مشہور کتاب ''حجۃ الاسلام'' کا بھی میں نے ترجمہ شروع کیا تھا جو ملازمت کی تبدیلی کے باعث دہلی منتقل ہو جانے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ بعد میں برادر گرامی قدر مولانا

---

(۱) مرتب موصوف کی وضاحت کے مطابق (ص: ۳۸) اس کتاب کی ترتیب کا اصل محرک بھی حضرت نانوتوی پر تنظیم کی طرف سے کیا جانے والا یہ سیمینار ہی ہے۔

کر سنایا۔ اس میں مولانا نے فرمایا تھا:۔

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا"۔

جامعہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ الہند نے فرمایا:۔

مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال' ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کریں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہییں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"۔

بعد ازاں جامعہ کے یہی مقاصد، اکابرین جامعہ دہراتے رہے اور ان کی وضاحت کرتے رہے۔ جامعہ کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد میں امیر جامعہ حکیم اجمل خاں نے کہا:

ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں ہندو طلبہ کے لیے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہیں رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندستانی قومیت کی اساسِ محکم اس باہمی تفہیم پر منحصر ہے"۔

جامعہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا کہ "اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو حق دوست اور حق پرست بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندستانی بنایا جائے۔"

وحیدالزماں کیرانویؒ نے ترجمہ شدہ حصہ کو الگ الگ عنوانات کے تحت چند کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اگرچہ یہ اتنا چھوٹا کام تھا جس کو بلاشبہ لائق ذکر بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن پھر بھی اس تذکرہ سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس جہت میں کچھ کوششیں ایسی بھی ہوئیں جو قبل از وقت ہی دم توڑ گئیں اور ان کے منصوبے تشنۂ تکمیل ہی رہ گئے۔

بہرحال ''الامام محمد قاسم نانوتوی سیمینار'' پر لکھے اور پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم خدام تنظیم کو جہاں ایک طرف بے انتہا خوشی ہورہی ہے وہیں دوسری طرف اس میں غیر متوقع اور افسوس ناک حد تک تاخیر پر شرمندگی اور ندامت کا احساس بھی دامن گیر ہے۔ اگرچہ اس تاخیر کی بعض وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں تاہم اس غیر ضروری عمل کے بجائے ہمارے نزدیک حقیقی معنوں میں اس کے لیے کھلے دل سے معذرت ہی صحیح وطیرہ ہوسکتا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں حضرت نانوتوی کی سوانح اور افکار و خدمات کے اکثر پہلوؤں کا احاطہ و جائزہ شامل ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس جائزے میں تفصیل اور تعمق کی کمی بہرحال محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص افکار کا گوشہ کسی حد تک تشنہ ہے۔ تنظیم کی طرف سے جو عنوانات مقرر کیے گئے تھے اور اہل علم و قلم سے ان کے مطابق مقالات تحریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی اپنے اصل نقشے کے مطابق، اگر تمام یا اکثر عنوانات پر بھی تحریریں موصول ہوگئی ہوتیں تو بلاشبہ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے یہ مجموعہ اس سے بہت حد تک مختلف ہوتا۔ ایک طرف اس کا حجم بھی دوگنا بلکہ سہ گنا ہوتا تو دوسری طرف اس کمی کا بھی کسی کو شکوہ نہ ہوتا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

اس کے باوجود بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زیر نظر مجموعۂ مقالات میں موضوع سے متعلق خاصا مواد جمع ہوگیا ہے جس میں بعض مقالات کو نہایت اہم علمی حیثیت حاصل ہے اور امید ہے کہ یہ مجموعہ، معارف قاسمیہ کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوگا۔

اخیر میں ہم ان تمام اصحاب قلم اور معاونین کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جن کی بدولت موجودہ شکل میں یہ مجموعہ منظر عام پر آسکا۔

☆☆☆

اسی طرح شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۳۰ء میں کہا:۔

"۔۔۔جامعہ جہاں اسلامیہ ہے، دوسری طرف ملیہ بھی ہے۔ وہ اپنے اندر ایک طرف اسلامی روایات اور تعلیم کو زندہ کرے گی اور اسی کے ساتھ دوسری طرف متحدہ قومیت کی تعمیر اور اپنے وطن کی آزادی میں مساعی رہے گی۔ جامعہ ملیہ کا مقصد اس سے زیادہ واضح اور روشن اور کچھ نہیں ہو سکتا"۔

۱۹۴۵ء میں ذاکر صاحب نے "جامعہ ملیہ کیا ہے" نامی کتابچہ میں تحریر کیا تھا کہ:۔

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم، ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گی۔۔۔ جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔۔۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔۔۔"

الغرض وقتاً فوقتاً جامعہ کے اغراض و مقاصد پر اظہار خیال ہوتا رہا اور بانیان و رہنمایان جامعہ انہی مقاصد کی روشنی میں اسے پروان چڑھاتے رہے۔ ان کے مطابق تعلیمی آزادی، دینی و دنیوی علوم کی ہم آہنگی، وطن دوستی اور حریت پروری، اردو زبان کی ترقی، حرفت کی تعلیم اور سادگی پسندی و بلند خیالی جامعہ کا نصب العین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نے شروع ہی سے سیکولرازم کے اصول کو اپنا کر مختلف فرقوں کے درمیان یک جہتی کے فروغ کو اپنا شعار بنایا۔

خطبات

۱۹۴۷ء میں ہندستان کے افق پر مہر آزادی طلوع ہوا تو جامعہ نے بھی آزادی کی فضا میں سانس لی۔ حکومت نے اسے قومی تعلیم کا اہم مرکز قرار دیا' ۱۹۶۲ء میں جامعہ کو deemed to- be-university بنا دیا گیا اور ۱۹۸۸ء میں اسے مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔

جامعہ کے افتتاحی جلسہ میں جو رہنمایان قوم شریک تھے اور جنھوں نے جامعہ کے قیام کے سلسلہ میں عملی کوششیں کی تھیں وہ بانیان جامعہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن' حکیم حافظ محمد اجمل خاں' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' علی برادران' عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین شامل ہیں۔ مہاتما گاندھی نے چونکہ ترک موالات کی چنگاری کو ہوا دی تھی اور جامعہ کے قیام کے لیے ایم اے او کالج کے طلبہ سے اپنی مادر علمی کو خیر باد کہنے کے سلسلے میں پہل کی تھی اس لیے ان کا نام بھی بانیاں جامعہ میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین' پروفیسر محمد مجیب اور شفیق الرحمٰن قدوائی جامعہ کے معماروں میں شامل ہیں۔ اگرچہ فہرست میں اور بھی نام شامل کیے جاسکتے ہیں لیکن راقم الحروف نے اس کہکشاں میں صرف ان ہی درخشندہ ستاروں پر اکتفا کیا ہے جو ان صفحات کی زینت ہیں۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۹۹ء تک جامعہ نے اپنے طویل سفر میں حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' عبدالمجید خواجہ' ڈاکٹر ذاکر حسین' جسٹس ہدایت اللہ' مظفر حسین برنی اور خورشید عالم خاں جیسے ناموروں کی امارت میں کامیابی کی منزلیں طے کیں اور اسے مولانا محمد علی' عبدالمجید خواجہ' ڈاکٹر ذاکر حسین' پروفیسر محمد مجیب' پروفیسر مسعود حسین خاں' انور جمال قدوائی' پروفیسر علی اشرف، پروفیسر ظہور قاسم' ڈاکٹر بشیر الدین احمد اور جنرل ایم۔اے۔ زکی کی قیادت نصیب رہی۔ جامعہ آج بھی مینارۂ نور بن کر دنیائے علم و دانش کو منور کرنے میں مصروف ہے۔

معماران و بانیان جامعہ میں عمر کے اعتبار سے شیخ الہند سب سے بڑے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۱ء میں ہوئی' پھر حکیم محمد اجمل خاں (۱۸۶۸ء)' مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ء)' مولانا محمد علی (۱۸۷۸ء)' ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء)' عبدالمجید خواجہ (۱۸۸۵ء) اور ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۸۹۷ء، کی ولادت ہوئی ۔ڈاکٹر عابد حسین ۱۸۹۶ء، میں شفیق الرحمٰن قدوائی ۱۹۰۱ء اور پروفیسر مجیب ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ شیخ الہند' عابد صاحب' شفیق الرحمٰن قدوائی اور ذاکر صاحب مدرس و معلم تھے' حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری معالج تھے، مہاتما گاندھی اور عبدالمجید خواجہ بیرسٹر اور مولانا محمد علی صحافی تھے۔ ان میں سے جن چار بانیان جامعہ کو انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کا شرف حاصل ہوا ان میں حکیم اجمل خاں نے ۱۹۲۱ء میں احمد آباد

میں' مولانا محمد علی نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں' مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۴ء میں بیلگام میں اور ڈاکٹر انصاری نے ۱۹۲۷ء میں مدراس میں کانگریس کے اجلاسوں کی صدارت کی۔ ان حضرات میں سے مہاتما گاندھی' مولانا، محمد علی' ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، عابد صاحب مجیب صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بیرون ہند جاکر تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں مشترکہ قدریہ تھی کہ ان سبھی نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حکیم اجمل خاں، عابد صاحب، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب کے علاوہ سبھی کو جیل میں محبوس کیا گیا۔ ان میں سے مہاتما گاندھی' عبدالمجید خواجہ، عابد صاحب، مجیب صاحب، شفیق الرحمٰن قدوائی اور ذاکر صاحب نے ملک کے افق پر مہر آزادی کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور آزاد ہندستان کے خاکہ میں رنگ آمیزی کی، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب شیخ الجامعہ رہے اور بعد ازاں امیر جامعہ منتخب ہوئے۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اپنی وفات تک امیر جامعہ رہے۔ ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز رہتے ہوئے فوت ہوئے۔ مولانا محمد علی کا انتقال لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران ہوا اور وہ مسجد اقصیٰ میں مدفون ہوئے۔ حکیم اجمل خاں کی وفات رام پور میں ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری کا انتقال ٹرین میں اس وقت ہوا جب وہ مسوری سے واپس ہو رہے تھے۔ شیخ الہند نے ڈاکٹر انصاریؒ کے مکان پر دہلی میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی' عبدالمجید خواجہ نے علی گڑھ میں وفات پائی اور ذاکر صاحب کی روح نے راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں قفس عنصری سے پرواز کی۔ مہاتما گاندھی نے دہلی میں شہادت کا جام نوش کیا۔ شفیق صاحب دہلی ریاست کے وزیر تعلیم رہے، عابد صاحب ' مجیب صاحب نے جامعہ سے سبکدوش ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

معماران و بانیانِ جامعہ کی زندگی کی داستان نہایت دلچسپ اور بڑی سبق آموز ہے۔ انھوں نے اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر ملک و قوم کے تئیں جو خدمات سر انجام دیں وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ تابندہ رہیں گی۔

جامعہ کی پچھترویں اور ہندستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بانیان جامعہ کی داستانِ حیات کو منظر عام پر لانے کا پروگرام تھا لیکن میری علالت اور مصروفیت کے سبب اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا، بہر حال بانیان جامعہ کی زندگی کے اوراق اب کتابی شکل میں پیش ہیں۔ یوں تو مضامین میں سبھی شخصیتوں کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم جامعہ سے ان کے خصوصی تعلق اور اس کے تئیں ان کی خدمات کو بطور خاص اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ قارئین کو بعض جگہوں پر واقعات اور اقتباسات کی تکرار

مولانا سید نظام الدین*

خطبۂ صدارت

محترم حضرات علماء کرام اور اصحاب علم ودانش!

اللہ کا فضل وکرم ہے کہ آج حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ہمہ گیر جامع شخصیت اور ان کی دینی وملی خدمات پر تاریخ ساز سہ روزہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے، اس کے لئے ہم دل کی گہرائیوں سے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہیں ہدیۂ تحسین وتبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ سیمینار بامقصد اور دوررس نتائج کا حامل ہو۔

حضرات! حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جب عقل وشعور اور خرد وآگہی کی وادی میں قدم رکھا اس وقت سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ چکا تھا اور اس طرح مسلمانوں کے ہزار سالہ اقتدار کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ جس ملک کو مسلم حکمراں، صوفیاء اور مشائخ نے تہذیب وتمدن، اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اسلامی مساوات کے ذریعہ سنوارا تھا اور جس گلشن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی اس کی بہاریں خزاں رسیدہ ہو چکی تھیں اور انگریز اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے، جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اس سونے کی چڑیا کو شکار بنانے کے لئے آئے تھے۔ تجارت کی آڑ میں وہ کلکتہ، مدراس اور رفتہ رفتہ ملک کے دیگر مرکزی شہروں میں اپنے بال وپر پھیلانے لگے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد پورے ملک کی قسمت کے مالک بن گئے، عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی اور جبراً مسلمانوں میں ارتداد پھیلانے کی کوشش کی جانے لگی اور مسلمانوں کو مناظرہ کے لئے چیلنج کیا جانے لگا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی برصغیر کی امت مسلمہ کے لئے ''مسیحا'' اور امام بن کر ابھری، ایک طرف انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف تحریک

* امیر شریعت بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

ملے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مضمون اپنے آپ میں ایک اکائی ہے اور اس کا دوسرے مضمون سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے ضروری حقائق کو مختلف مضامین میں دہرانا ناگزیر ہو گیا۔

میں ڈاکٹر ذاکر حسین سینٹرل لائبریری اور محمودیہ لائبریری جمعیۃ علماء ہند کے اسٹاف کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی۔ میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر صغریٰ مہدی کے تئیں اظہار ممنونیت کرتا ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً مواد فراہم کیا۔ میں برادر مکرم جناب شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا بھی بے حد ممنون ہوں جن کے سبب " معماران جامعہ " اشاعت کے نور سے منور ہو سکی۔

(پروفیسر) ظفر احمد نظامی
شعبہ سیاسیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی

۲۹ر اکتوبر ۱۹۹۹ء

جہاد میں عملی طور پر حصہ لیا اور شاملی کے میدان میں ان کا جرأت ایمانی کے ساتھ مقابلہ کیا تو دوسری طرف عیسائی مشنریوں کی سازشوں اور محاذ آرائیوں کا جم کر مقابلہ کیا، عیسائی مبلغین اور پادریوں سے مختلف مقامات پر مناظرے کئے، اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا، اسی طرح آریہ سماج کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور کوششوں کو ناکام بنا کر دعوت و تبلیغ کا اہم فریضہ انجام دیا۔

آپ کی زندگی نہایت ہی سادہ تھی، تواضع اور انکساری آپ کا وصف امتیازی تھا، گمنامی اور شہرت سے دوری آپ کا شعار تھی۔ چنانچہ بعض اوقات ملاقات کی غرض سے آنے والے حضرات دریافت کرتے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کون ہیں؟ ائمہ سلف کے آپ سچے جانشین تھے۔

دار العلوم دیوبند کا قیام:

حجۃ الاسلام کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ برصغیر میں علوم دینیہ کے احیائے نو کے لئے اسلامی تعلیمی تحریک کا آغاز ہے، انگریزوں کے کورٹ لارڈ میکالے نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں تیار ہونے والی نسلیں ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر ذہن وفکر کے اعتبار سے عیسائی ہوں۔ حجۃ الاسلام نے میکالے کے اس چیلنج کو سنجیدگی سے لیا اور ایک ایسے نظام تعلیم وتربیت کے قیام کی عملی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں ایسی نسل تیار ہو سکے جو ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے جو بھی ہو مگر فکر ونظر اور شعور کے اعتبار سے مسلمان ہو، چنانچہ آپ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی دینی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ۱۸۶۶ء بمطابق ۱۲۸۳ھ میں دار العلوم کے قیام کا فیصلہ فرمایا۔

دار العلوم صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے جس نے مختلف محاذوں پر امت مسلمہ کی صحیح قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اس کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے منصوبہ بند کوشش کی، دینی تعلیم وتربیت کا یہ ایسا مرکز ثابت ہوئی جس نے ہندو پاک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کو دعاۃ، مبلغین، مجاہدین، ائمہ اور مختلف محاذ پر کام کرنے والے افراد فراہم کیے۔ حجۃ الاسلام نے مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم کو مفید وبامقصد بنانے کے لئے اصول ہشت گانہ مرتب کئے جو آج بھی ہمارے

لئے مشعل راہ ہیں، جن کا لب لباب یہ ہے کہ اس مدرسہ کی آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ ہے ان شاء اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی ایسی آمدنی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر اور کارخانہ، تجارت یا کسی کا وعدہ تو پھر یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی، کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

حجۃ الاسلام کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قانون شریعت کے تحفظ اور مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات کی روح پیدا کرنے اور تنظیم واتحاد کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کی مجلسیں منعقد کیں نیز شعائر اسلام کے تحفظ اور عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور حملوں کا مومنانہ فراست کے ساتھ مقابلہ کیا، پادری تاراچند سے مناظرہ ہوا جس میں اسے شکست فاش ہوئی اور وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ ۱۲۹۳ھ میں چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں میلۂ خداشناسی منعقد ہوا جس میں تمام مذاہب کے علماء اور عوام کے سامنے تثلیث کی تردید اور حقانیت اسلام پر آپ نے پرزور اور لاجواب تقریر کی۔ ۱۲۹۳ھ میں پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرہ ہوا اور اس نے منہ کی کھائی۔ آپ کی دو درجن سے زیادہ تصانیف ہمارے لئے ایک علمی دستاویز ہیں۔ مولانا کی زندگی کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ نے جو کچھ کہا اس پر پہلے خود عمل فرمایا، نکاح بیوگان کی سنت کا احیاء اپنے گھر سے کیا، جنگ بلقان کے موقع پر اپنی اہلیہ کو مالی تعاون کی ترغیب دی، جس پر انہوں نے سارے زیورات آپ کے حوالہ کر دیئے، ترکہ کی تقسیم بھی اپنے گھر سے شروع کی۔

میں نے مولانا قاسم نانوتویؒ کی تحریروں سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس کی روشنی میں مولانا کی فکری خصوصیات کے چند پہلو خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں:

(الف) امت مسلمہ کے مختلف مسالک ومذاہب اور نظریاتی گروہوں کی تکفیر وتفسیق، تحقیر وتنقیص اور توہین وتذلیل کی روش سے اجتناب واحتیاط اور ان کے تئیں توازن واعتدال کا رویہ، نفرت کے بجائے محبت، دوری کے بجائے قربت اور ناانصافی کے بجائے انصاف کی راہ اختیار کرنے کی حکمت۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

۱۸۵۱ء تا ۱۹۲۰ء

مولانا محمود حسن کی ولادت ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی جہاں ان کے والد مولانا ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر فائز تھے۔وہ دیوبند کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز خانوادے کے فرد تھے جسے علم و عمل، شرافت و دینداری کے علاوہ دنیوی وجاہت بھی حاصل تھی وہ عربی زبان کے ممتاز ادیب تھے۔ کئی تصانیف ان کے علم و فضل کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بریلی سے ان کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا اور محمود حسن بھی بچپن میں بریلی اور میرٹھ کے درمیان آتے جاتے رہے۔ ان کا تعلق ولی اللہی تحریک سے تھا ان کے بھائی مولانا مہتاب بھی اس تحریک کے فعال رکن تھے۔ اٹھارہ سو ستاون میں پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب ۱۸۶۳ء میں مولانا قاسم نانوتوی نے دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی تو مولانا ذوالفقار علی نے بھی ان کی مدد کی اور سب سے پہلے اپنے بیٹے محمود حسن کو اس میں داخل کرایا۔ اس طرح مولانا محمود حسن ان اولین پانچ طلبہ میں سے ایک تھے جنھیں دارالعلوم میں سب سے پہلے داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھوں نے قرآن پاک اور ابتدائی فارسی کی تعلیم ایک دیندار بزرگ میاں جی منگلوری اور عبداللطیف سے حاصل کی۔ عربی اور فارسی کے اسباق اپنے چچا سے لیے اور کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتابیں مولانا قاسم نانوتوی سے پڑھیں جنھوں نے ان پر اپنی پوری توجہ صرف کی اور اپنی نگرانی میں ان کی تربیت کی اور سفر و حضر میں بھی انھیں اپنے ساتھ رکھا۔ ان کی اس خصوصی توجہ نے مولانا محمود حسن کے دل میں اسلام کی محبت اور آزادئ وطن کے جذبات بیدار کیے۔

۹ر جنوری ۱۸۷۴ء کو مولانا محمود حسن کو دارالعلوم کی جانب سے فارغ التحصیل ہونے کی سند اور دستار فضیلت عطا ہوئی تو کچھ عرصہ انھوں نے اپنی مادر علمی کی خدمت میں گزارا، پھر اگلے سال دارالعلوم میں مدرّس چہارم کی حیثیت سے ان کا باقاعدہ تقرر عمل میں آگیا اور وہ انتہائی تندہی اور خلوص کے ساتھ طلبہ کو مختلف علوم کا درس دینے لگے۔ ۱۸۷۷ء میں مولانا نے اکابر و مشائخ کی معیت میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ساتھ ہی انھوں نے شاہ

(ب) دینی ودنیوی تعلیمات کی افادیت کا اقرار اور اس کی اہمیت کا اعتراف۔

(ج) سماج اور سوسائٹی سے تعلق وربط، سماجی اصلاحات کی ضرورت پر زور۔

(د) عالمی مسائل اور امت مسلمہ کے حالات پر مسلسل نظر۔

(ہ) توکل علی اللہ اور صدق حالی ومقالی کی زندگی۔

موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم حجۃ الاسلام کے علمی وفکری سرمایہ کو نئے انداز واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں نیز ان کے نقوشِ علمی کی ترویج واشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر کوشش کریں۔

اخیر میں پھر آپ حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی نیک خواہشات اور تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين.

عبدالغنی مجددی سے اجازت اور سند حدیث لی اور حاجی امداد اللہؒ سے بیعت ہوئے۔ حاجی امداد اللہؒ سے انھوں نے ہندستان کی صورت حالات سے متعلق گفتگو کی اور آیندہ کے لیے پروگرام مرتب کرنے کا فیصلہ کر کے چھے ماہ بعد دارالعلوم واپس لوٹ آئے اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

مولانا محمود حسن نے "ثمرۃ التربیت" نامی ایک تنظیم قائم کی جو اساتذہ اور طلبہ پر مشتمل تھی۔ اس کی تاسیس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اراکین کے دلوں میں انقلابی خیالات پروان چڑھیں اور وہ ہندستان کی آزادی کے شعور سے ہمکنار ہوں۔ اس تنظیم کا قیام ان کے استاد مولانا قاسم نانوتوی کی ہدایت کے مطابق خود انھیں کی نگرانی میں عمل میں آیا تھا۔ اس طرح اس تنظیم کے اراکین پر یہ واضح ہو گیا کہ ہندستان کو انگریزوں سے نجات دلانا ان کا بنیادی اور مذہبی فریضہ تھا۔ ان خیالات اور نظریات کو جنم دینے والی وہ پالیسیاں تھیں جو انگریزوں نے ہندستان کے تئیں اپنا رکھی تھیں۔ وائسرائے لارڈ لٹن نے ہندستانیوں کا بری طرح استحصال کیا تھا اور ان کے جذبات کو ہر طرح صدمہ پہنچانے اور مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور دکن میں پھیلنے والے قحط زدہ لاکھوں لوگوں کی جانیں بچانے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا۔ اس نے بھوکوں مرتے ہوئے لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور دہلی میں ایک زبردست دربار منعقد کیا جس میں بے پناہ روپیہ خرچ کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے پریس ایکٹ کے تحت اخبارات پر پابندی عائد کر دی اور آرمس ایکٹ کے تحت ہندستانیوں سے ہتھیار چھین کر انھیں نہتا کر دیا۔ اس نے ہندستان کے مختلف فرقوں میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی کو اپنا شعار بنایا۔ اسی وقت مولانا محمود حسن اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت نے اب جبکہ ہتھیار چھین کر ہندستانیوں کو نہتا کر دیا تھا تو جب تک کوئی غیر ملکی حکومت اشتراک نہ کرے تب تک جنگ آزادی کا آغاز ممکن نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انھوں نے یہ طے کیا کہ افغانستان سے اس امر میں مدد لی جائے اور اپنی تحریک کا آغاز شمالی مغربی صوبہ سرحد کے ان آزاد قبیلوں کی مدد سے کیا جائے جو دارالعلوم اور اس کے اساتذہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ وہاں سرحد کے ایک ممتاز رہنما حاجی صاحب ترنگ زئی بڑے با اثر اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا نے ان سے رابطہ قائم کیا۔

افغانستان اور ہندستان کی سرحد پر سید احمد شہید کے بہت سے رفقا جا بسے تھے اور انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ مولانا نے انھیں اپنا ہمنوا بنا لیا اور ان ہندستانیوں سے بھی روابط قائم کر لیے جو ہجرت کر کے افغانستان کے علاقوں میں آباد ہو گئے

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ*

کلیدی خطبہ

اسلام کی عمارت جن دو بنیادوں پر قائم ہے، ان میں ایک اللہ تعالیٰ کی توحید ہے اور دوسری جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت، توحید کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ قیامت تک انسانیت کے لیے ہدایت کا سروسامان موجود رہے، یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عین تقاضہ ہے، جو رب العالمین انسان کی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں پر توجہ نہ دے، دوسری طرف ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، پچھلے پیغمبروں کی نبوت ایک مخصوص گروہ کے لیے اور ایک محدود زمانہ کے لیے ہوتی تھی، لیکن آپ کا آفتاب نبوت عالمگیر بھی ہے اور دائمی بھی، اب قیامت تک جو لوگ پیدا ہوں گے، وہ آپ ہی کی امت ہوں گے۔

ایک طرف ہدایت الٰہی کی ضرورت باقی رہنے اور دوسری طرف سلسلۂ نبوت کے تمام ہو جانے کی وجہ سے اب دین کی حفاظت واشاعت کی ذمہ داری امت کے دردمند علما اور خدا ترس صلحا پر رکھی گئی ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل اور اسی بنیاد پر اس امت کو یہ اعزاز عطا کیا گیا کہ اس میں مجتہدین ومجددین پیدا ہوتے رہیں گے، مجتہدین تحقیق دین کا فریضہ انجام دیں گے اور مجددین حفاظت دین اور احیاء دین کا۔ تجدید واجتہاد کے اس کام میں ان شاء اللہ تسلسل باقی رہے گا۔

جب دین پر انحراف کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور حق پر باطل کی یلغار ہونے لگتی ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسی شخصیتوں کو پیدا فرماتے ہیں، جو تیز وتند ہوا میں بھی اپنا چراغ جلاتے ہیں اور جو طوفان کے

---

* سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

تھے۔ اس زمانے میں افغانستان کے امیر حبیب اللہ تھے۔ مولانا نے شہزادہ نصر اللہ کے اس مطالبہ کی روشنی میں کہ انگریزوں کو افغانستان کی سیاست سے بے دخل ہو جانا چاہیے اپنی سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں اور وہاں کی انگریز مخالف تنظیم کے ساتھ جو جمعیت سیاسیہ کے نام سے موسوم تھی اپنے تعلقات استوار کر لیے۔

ان کوششوں کی کامیابی میں مولانا محمود حسن کی اپنی شخصیت کو بڑا دخل تھا۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات کے بعد جب مولانا محمود حسن دار العلوم کے سربراہ مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے علم و فضل، احساس فرض شناسی اور محنت و جانفشانی سے اس ادارہ کو ایک مرکزی دانش گاہ بنا دیا ان کی قیادت میں دار العلوم کی شہرت ہندستان کی سرحد سے نکل کر بیرونی مسلم ممالک تک جا پہنچی اور اس میں غیر ہندستانی طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مولانا کی شہرت بھی چہار دانگ عالم میں پھیلتی گئی اور ان کے معتقدین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ علم الحدیث کے مسلم الثبوت عالم تسلیم کر لیے گئے۔ شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں۔ دراصل ان کے دل میں آزادی کی تڑپ ان کے دونوں پیش رووں یعنی مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ مولانا کے حلقۂ درس سے ہزاروں طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ان میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ، مفتی کفایت اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، جیسے عظیم علماء شامل ہیں۔ مولانا درس و تدریس اور سیاسی امور میں مصروفیت کے باوجود لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے ان کی تصانیف کی تعداد آٹھ ہے۔ صدر مدرس مقرر ہو جانے کے بعد برسوں تک وہ علوم کی نشر و اشاعت کرتے رہے انھوں نے ہندستان کی تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے سیاسی و اقتصادی مراحل و مسائل پر غور و فکر کیا تھا۔ وہ اخبار بینی کے عادی تھے جس نے انھیں عالمی مسائل و معاملات سے برابر واقف رکھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب انھوں نے دار العلوم کی قیادت کی ذمہ داری قبول کی تو انھوں نے اپنے نہایت مخلص اور ذی شعور سابق طلبہ کو منظم کر کے ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار نامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اپنے چہیتے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو اس کی نگرانی سپرد کی۔ اس تنظیم کی سرگرمیوں اور مقاصد کو بڑے صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔

اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز مولانا محمود حسن نے ۱۹۱۰ء میں جلسہ دستار بندی سے کیا جسکا انعقاد دیوبند میں عمل میں آیا اس میں مختلف طبقات کے تیس ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ دراصل اپنے سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے انھوں نے اس جلسے کو ایک پردہ بنایا

بیچ امت کے سفینہ کو ساحل سے ہم کنار کرتے ہیں، ایسی ہی شخصیتوں میں ایک حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، قدرت کے دست فیاض نے انھیں واقعی قاسم بنایا تھا، وہ علوم و معارف اور خیرات وحسنات کے قاسم تو تھے ہی، درد دل بھی بانٹتے تھے اور امت کی فکر و غم کے سوداگر بھی تھے، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے اپنے مورث اعلیٰ اور اس عظیم ہستی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے امام نانوتوی سیمینار کا انعقاد یقیناً ایک فرض کفایہ کی ادائیگی ہے اور وفادار اولاد پر اپنے محسن وشفیق باپ کی نسبت سے جو قدردانی اور احسان شناسی واجب ہے، یہ اس کا ایک معمولی سا حصہ ہے۔

اس موقع پر یہ بات کافی نہیں کہ ہم حضرت نانوتوی کی شخصیت پر چند مقالات سن لیں اور سنالیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کی ذات کو اپنے لئے آئینہ بنائیں اور اس آئینہ میں اپنے فکر وعمل کے خط وخال کو درست کریں، پس آیئے! اور اس ارادہ کو دامن دل سے باندھئے کہ حضرت نانوتوی کی خصوصیات اور ان کی عالی صفات ہم اپنے اندر جذب کریں گے اور عملی طور پر ہم ان سے سچے اور پکے تعلق کا ثبوت دیں گے۔

حضرت نانوتوی کا سب سے اہم امتیازی وصف بے پناہ جذبۂ اخلاص ہے، اس اخلاص نے ان میں فنائیت اور کسر نفسی کو اوج کمال پر پہونچا دیا تھا، ان کے اخلاص کی سب سے بڑی مثال خود ہمارا مادر علمی دارالعلوم دیوبند ہے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا، اسے دین کی مضبوط حفاظت گاہ بنایا اور جہالت کے اندھیرے میں فکر وفن کے چراغ روشن کیے، لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھنے اور چھپانے کی کوشش کی۔ بنیاد رکھنی تھی تو کسی اور بزرگ سے رکھوائی، اہتمام وانتظام کا شعبہ کسی اور بزرگ کے حوالہ کیا اور خود اس بنیاد کی طرح رہے، جس پر پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن وہ نظر نہیں آتی، مگر اللہ کا قانون ہے کہ جو خدا کے لیے اپنے آپ کو بچھاتا ہے اور چھپاتا ہے، اللہ اسے اسی قدر اٹھاتے اور سربلند کرتے ہیں۔ من تواضع لله رفعه الله چنانچہ آج دیوبند کی پیشانی پر آپ کا نام کندہ ہے اور یہ اس پوری تحریک کے لیے سرمایۂ اعزاز اور تمغۂ افتخار ہے، حضرت نانوتوی کے بے پایاں اخلاص نے ان کی زندگی کو اخفائے حال اور سادگی کا مرقع بنا دیا تھا، جو لوگ ان سے واقف نہیں تھے، وہ جب انھیں دیکھتے، تو انہیں ایسا لگتا کہ جیسے کوئی دہقان

تھا تاکہ محکمہ خفیہ کے افسران پر اصل حقیقت ظاہر نہ ہو سکے۔ بعد ازاں "جمعیۃ الانصار" کا پہلا جلسہ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں پہلی بار اس تنظیم کے اصولوں اور مقاصد کو ظاہر کیا گیا۔ جب "جمعیۃ الانصار" کا قیام عمل میں آیا تو عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ یہ علی گڑھ کے اولڈ بوائز کی نقل ہے جو ایک غلط خیال تھا کیونکہ ثمرۃ التربیت ہی کی دوسری شکل جمعیۃ الانصار تھی جس کا قیام ۱۸۷۶ء میں عمل میں آیا تھا لیکن چونکہ یہ تنظیم وقت کا ساتھ نہ دے سکی اور دارالعلوم کے اکابرین کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ناکافی تھی اس لیے اس کی سرگرمیوں کو درمیان میں ہی ختم کر دیا گیا۔ ویسے ۱۹۱۰ء میں ایک کامیاب کوشش یہ کی گئی کہ علی گڑھ اور دارالعلوم کے درمیان حد فاصل ختم کر دی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ ہر سال دارالعلوم کے کچھ طلبہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ آیا کریں گے اور اسی طرح علی گڑھ کے چند طلبہ عربی کا درس لینے کی خاطر دیوبند جایا کریں گے۔ لیکن اس فیصلہ کے مطابق علی گڑھ سے طلبہ کا پہلا گروہ جب دیوبند پہنچا تو اس میں سے ایک طالب علم کو حکومت نے اپنا راز داں بنا کر دارالعلوم کے بیشتر راز اگلوا لیے۔ اگر چہ مولانا محمود حسن کی سرگرمیوں سے حکومت واقف نہیں ہو سکی لیکن اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ مولانا انگریزوں کے خلاف کسی بڑی سازش کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

۱۹۱۰ء میں جلسہ دستار بندی میں مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک تقریر میں دارالعلوم کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اسی تقریر میں انھوں نے جمعیۃ الانصار کے مقاصد بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ اب تک ان مقاصد کو بالعموم لوگوں پر ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ انھوں نے جمعیۃ الانصار کا مقصد یہ بتایا کہ دارالعلوم کے مقاصد کی حمایت کی جائے اور بغیر سیاست میں ملوث ہوئے اس کی تبلیغ و تشہیر کی جائے۔ اس انجمن کے اراکین صرف وہی افراد ہو سکتے تھے جو دارالعلوم کے سابق طالب علم تھے تعلیمی، انتظامی اور مالیاتی اصلاح کے لیے جدوجہد ہر رکن کا فرض قرار دیا گیا۔ مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کا رکن اس انجمن کا سرپرست تھا جس کی منظوری ہر امر کے لیے ضروری تھی۔ ہر وہ تعلیم یافتہ شخص جو جمعیۃ کے اغراض و مقاصد کا حامی تھا اعوان کہلاتا تھا اور اس کے جلسوں میں شرکت کا مجاز تھا۔ جمعیۃ کے سرپرست ہر جلسہ کے لیے کسی بھی شخص کو صدارت کے لیے نامزد کر سکتے تھے۔ سرپرستوں کی عدم موجودگی میں اس کام کے لیے تمام اراکین اکثریت سے فیصلہ کر سکتے تھے۔

کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے جمعیۃ مسلمانوں سے روپیہ اکٹھا کر سکتی تھی اور تحائف وصول کرنے کی مجاز تھی اور اس رقم کو ضرورت کے مطابق خرچ کر سکتی تھی البتہ

اور گاؤں کا مزدوران کے سامنے کھڑا ہے —— حضرت نانوتوی کا یہ کردار آج ہمارے لئے نمونۂ عبرت ہے، آج ہمارے درمیان عزت وجاہ کی لڑائی، عہدہ واقتدار کی حرص، خودنمائی کا جذبہ عشرت آرائی اور سہولت پسندی کا مزاج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ علماء امت میں اپنا وزن کھوتے جا رہے ہیں اور جو لوگ قوم کی قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اپنے خلوص ووفا اور جذبۂ للّٰہیت سے صالح انقلاب پیدا کرتے ہیں وہ خود اصلاح کے محتاج ہیں اور ان کے باہمی جھگڑوں اور مقابلہ آرائیوں کی داستانیں عام مسلمانوں کی زبان زد ہیں۔

حضرت نانوتوی کی دوسری میراث ایمانی حمیت اور دینی غیرت ہے، امت کے باہمی اختلاف میں نرم خو اور ابریشم کی طرح نرم اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے مقابلہ میں آہن وفولاد، یہی حمیت انھیں شاملی کے میدان کارزار میں لے جاتی ہے اور تختۂ دار کے قریب پہونچاتی ہے اور یہی حمیت کبھی انہیں میلۂ خدا شناسی کے بزم مباحثہ کو گرماتی ہے اور شاہ جہاں پور اور رڑکی میں آریہ سماجیوں سے مباحثات کرواتی ہے، وہ علم کا سمندر تھے، لیکن انھوں نے قلم بہت کم اٹھایا، اگر وہ چاہتے تو اپنے خامۂ آبدار سے ایک کتب خانہ سجا سکتے تھے، لیکن ان کا اصل مقصد دین کا احیاء اور اس کا دفاع تھا، اسی لیے ان کی زیادہ تر تالیفات اسلام کے عقائد حقہ کی ترجمانی اور اہل باطل کی نفی وتردید پر مشتمل ہیں۔

وہ امت کے درد میں گھلنے والے اور ان کی فکر میں تڑپنے اور بے قرار رہنے والے شخص تھے وہ ہر اس طوفان سے ٹکراتے اور اس کے مقابل کھڑے ہو جاتے تھے، جو مسلمانوں کے ایمان پر حملہ زن ہونا چاہتے تھے، عیسائیت کا فتنہ ہو یا آریہ سماجی یا کوئی اور باطل تحریک۔ اسی لیے انھوں نے فروعی مسائل پر بہت کم قلم اٹھایا اور اہل سنت والجماعت کے باہمی فروعی اختلاف کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی، یہی حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ورثۂ نانوتوی ہے اور ہمیں اس کا حامل ہونا چاہیے، افسوس کہ ہم اس اثاثہ سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، دفاع عن الاسلام کی طرف ہماری توجہ کم ہو گئی ہے اور باہمی اختلافات کی طرف ہماری توجہ بڑھ گئی ہے ہم اپنی بیش قیمت صلاحیتیں جزوی مسائل اور فروعی اختلافات میں کسی کو صواب اور کسی کو خطا ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں اور جس کو ہم نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے، اس کے بجائے ہماری کوششوں کی سمت یہ ہونی چاہیے کہ ہم اسلام کے خلاف

جمعیۃ کو اغراض کی تکمیل کے علاوہ کسی رقم کو خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جمعیۃ کے مالیہ کو خزینۃ الانصار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جمعیۃ کے ہر جلسہ میں فیصلہ اکثریت سے ہوتا تھا۔ اس کے اراکین میں سے ایک دانشمند تجربہ کار اور قابل اعتماد شخص کو ناظم مقرر کیا جاتا تھا جسے پورے اختیارات حاصل تھے۔

جمعیۃ کے جلسے تین مقاصد کے لیے منعقد کیے جا سکتے تھے (۱) اجماع الانصار (۲) جلسہ انتظامیہ اور (۳) جلسہ علمیہ۔ ان مقاصد کی تکمیل کی خاطر تکمیل التعلیم، نظام التعلیم، الرشاد، التالیف واشاعت اور جلسہ علمیہ نامی پانچ شعبہ جات قائم کیے گئے تھے۔

مولانا محمود حسن نے جمعیۃ الانصار کے بارے میں ہر چیز کو مخفی رکھا تھا اس لیے اس کے اصل مقاصد کسی سرکاری ملازم پر واضح نہیں تھے۔ اسی لیے سی۔ آئی۔ ڈی کے ریکارڈ میں جمعیۃ کے مقاصد مندرجہ ذیل بیان کیے گئے تھے:۔

(۱) دارالعلوم کی اصلاح اور تنظیم

(۲) اس کی معقول کارکردگی کے لیے چندے اکٹھا کرنا

(۳) ان نظریات اور آدرشوں کی تشہیر جن کے لیے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تھا

(۴) ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اسی قسم کے اداروں کا قیام

اسی لیے اس کے مقاصد میں یہ مقصد بھی شامل تھا کہ ملک میں جتنے ادارے اسلامی تعلیم کے کام میں مصروف تھے ان سبھی کو جمعیۃ الانصار کے تحت منظم کیا جائے۔ دارالعلوم کے فارغ التحصیل عالموں کو مختلف اداروں میں بھیجا جائے تاکہ ملک بھر میں اسلام کے اصولوں کی یکسانیت سے تعلیم ہو۔ بعد ازاں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس مراد آباد اور میرٹھ میں بھی انعقاد پذیر ہوئے۔

جمعیۃ الانصار کا ایک مخصوص حلقہ بھی تھا جس میں انتہائی معتبر اور قریبی افراد شامل تھے مگر ان کی سرگرمیوں سے کوئی واقف نہ تھا لیکن یہ سبھی جانتے تھے کہ وہ تمام انگریز مخالف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

جمعیۃ نے انگریز مخالف انقلابی لٹریچر کی اشاعت کے لیے ہندستان اور بیرون ہند سے رقومات جمع کی تھیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی چار سال تک ناظم کی حیثیت سے جمعیۃ الانصار سے وابستہ رہے۔

حاجی صاحب ترنگ زئی نے صوبہ سرحد میں بہت سے اسلامیہ مدرسے قائم کردیے کیونکہ یہی مدرسے تحریک کو موثر بنانے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ اس کام میں

اٹھنے والے فتنوں سے برسر پیکار ہوں اور دین مبین کے خلاف ہونے والی یورشوں کا مقابلہ کریں، یہی کام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کیا جنھوں نے پوری امت کو جوڑنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے فتنۂ قادیانیت کا مقابلہ کیا، میرے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے تلامذہ نے انگریزوں سے پنجہ آزمائی کی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور ہمارے کتنے ہی بزرگوں نے فتنۂ انکار حدیث کی سرکوبی کی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے عقل وحکمت سے ہم آہنگ کر کے شریعت اسلامی کی معقولیت اور اپنے عہد کے تقاضوں کے ساتھ دینے کی صلاحیت اور اس کی عالمگیر افادیت پر عظیم الشان لٹریچر تیار کیا، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اپنے رفقا کے ساتھ آزاد ہند میں تحریک تحفظ شریعت کی بنیاد رکھی اور اس قافلہ کی سالاری کی، یہی دیوبند کا اصل امتیاز اور اس کی پہچان ہے۔

اس حمیت کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دیوبند کو نہ سونے کی زنجیر خرید سکی اور نہ لوہے کی زنجیر خوف زدہ کر پائی، دیوبند کی تاریخ بہادروں، دلیروں اور فرزانوں کی تاریخ رہی ہے، یہ تاریخ مالٹا کے قید خانوں سے لے کر ہندوستان کے زندانوں تک پھیلی ہوئی ہے، اس کے فرزندوں کے سر کاٹے تو جا سکتے تھے، لیکن جبینِ اقتدار پر جھکائے نہیں جا سکتے تھے، لیکن افسوس کہ آج ہم اس جرأتِ رندانہ اور جذبۂ مجاہدانہ سے بھی خالی ہوتے چلے جا رہے ہیں، ہمیں دنیا پر اپنے بزرگوں کی طرح یہ بات واضح کر دینی ہے کہ ہم متاع خرید وفروخت نہیں ہیں ہمارے ایمان، ہماری حمیت اور شریعت اسلامی سے ہماری وفاداری کا ہرگز سودا نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت نانوتوی نے وقت کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی تعلیمی تحریک چلائی جس کے اثرات آج عالمگیر سطح پر محسوس کئے جا سکتے ہیں، اس تحریک نے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور تبلیغ واصلاح کا فریضہ اس خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے کہ کم سے کم گزشتہ دو تین صدیوں میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، ضرورت ہے کہ فرزندان دیوبند موجودہ حالات کے پس منظر میں دینی تعلیم کو گاؤں گاؤں پہونچانے کی کوشش کریں، کیونکہ دور دراز کے دیہات وقریہ جات ارتداد کی سرحد

حاجی صاحب کو خان عبدالغفار خاں سے بڑی مدد ملی جو آگے چل کر سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ حکومت نے ان مدرسوں پر پابندی عائد کردی تو مولانا محمود حسن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حاجی صاحب آزاد قبیلوں کے علاقے میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے پٹھانوں کو منظم کیا۔ اس کام میں مولانا محمود حسن صاحب کے شاگردوں نے ان کی بڑی مدد کی۔

اسی اثنا میں اٹلی اور ترکی کے درمیان جنگ طرابلس کا آغاز ہوگیا اور بعد ازاں بلقان کی جنگیں چھڑ گئیں۔ حکومت برطانیہ نے ان جنگوں میں ترکی کے خلاف اس کے حریفوں کی مدد کی جس سے ہندستانی مسلمان سخت برہم ہوئے کیونکہ ان کی وفاداریاں اور حمایت ترکی کے سلطان کے ساتھ تھیں جو خلیفۃ المسلمین بھی تھا۔ ایسے حالات میں مولانا نے چند روز کے لیے دارالعلوم بند کردیا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ مختلف مقامات کے دورے کیے اور مسلمانوں کو ترکوں کی مدد پر آمادہ کیا۔ انھوں نے دارالعلوم میں انجمن ہلال احمر کی شاخ قائم کی اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ ترکوں کی مدد کے لیے بھیجا۔ جمعیۃ الانصار کی سرگرمیاں حکومت کی نظروں میں آچکی تھیں اور ان کو بہانہ بنا کر کسی وقت بھی دارالعلوم کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا اس لیے جمعیۃ کے صدر دفتر کو دہلی منتقل کردینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا محمود حسن کی ہدایت پر مولانا عبیداللہ سندھی بھی دہلی منتقل ہوگئے۔ اور ۱۹۱۳ء میں انھوں نے "نظارۃ المعارف القرآنیہ" نامی ایک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ کا مقصد مغربی تعلیم سے آراستہ لوگوں کو قرآن کی تعلیمات سے روشناس کرانا تھا۔ اس ادارہ کا قیام مسجد فتح پوری میں عمل میں آیا وقار الملک، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری اس کے سرپرستوں میں تھے۔ انھوں نے اس کے لیے نواب بھوپال، نواب رام پور اور دوسرے مقامات کے صاحب حیثیت مسلمانوں سے چندہ بھی فراہم کیا۔

شمس العلما مولانا محمد احمد کے مطابق، جن پر حکومت کے مخبر ہونے کا الزام تھا، نظارۃ المعارف ایک باغی ادارہ تھا جس کے ناظم مولانا عبیداللہ سندھی تھے اور جسے بھوپال سے بھی رقم وصول ہوتی تھی۔ شمس العلما نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ مولانا عبیداللہ کو جو سازش کا مرکزی کردار تھے، واپس سندھ بھیج دیا جائے۔

بہت سے سرکردہ مسلمان نظارۃ المعارف کی جانب مائل ہوئے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور مولانا محی الدین قصوری بھی شامل تھے اس ادارہ کا اصل مقصد قرآن اور دینیات کا درس دینا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں قرآن کی تعلیم کو عام کرے اور قرآن پاک کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرائے تاکہ

پر کھڑے ہیں اور مکاتب ہی کے ذریعہ ان کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جا سکتا ہے، اسی طرح عصری تعلیم کی درس گاہوں میں ہمای ملت کے نونہال لاکھوں کی تعداد میں زیر تعلیم ہیں اور یہ بات ضروری بھی ہے کہ مسلمان جدید تعلیم میں آگے بڑھیں، لیکن وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ شعوری طور پر مسلمان بھی باقی رہیں اور ان کے دل ودماغ کا کعبہ حجاز ہو نہ کہ امریکہ ویورپ، اس کے لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیم کی تحریک کو جدید تعلیم گاہوں تک بھی پہونچائیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا کوئی بچہ مبادیات دین سے بے خبر نہ رہ جائے۔

حضرت نانوتویؒ کی روح آج آپ کی طرف متوجہ ہے کہ آپ کس حد تک اس کی فرزندی کا حق ادا کرتے ہیں آپ کو اعتدال فکر، حمیت ایمانی، اخلاص وتقویٰ، دین کی فکر اور دردمندی اور حق کی راہ میں ضمیر فروشی کے بجائے سرفروشی اور خودغرضی ومصلحت کوشی کے بجائے جوش جنوں اور جذبۂ ایمانی کی میراث دی گئی ہے آپ نے کس حد تک اس امانت کو قبول کیا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔

اس کا آفاقی پیغام دور دور تک پہنچ سکے۔ مولانا سندھی اسلام کی تبلیغ ایک انقلابی مذہب کی حیثیت سے کرتے تھے جو مسلمانوں کو جہاد کی تعلیم دیتا ہے اور جب کبھی مسلمانوں نے جبر و ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے پہلو تہی کی تبھی وہ آلام و مصائب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ آزادی کا دوبارہ حصول چاہتے ہیں اور گمشدہ وقار کی انھیں جستجو تھی تو ان کے لیے لازم تھا کہ وہ برطانوی استعماریت کے خلاف تلوار اٹھالیں۔ سرکاری خفیہ رپورٹ میں نظارۃ المعارف کی سرگرمیوں کو بڑا اشتعال انگیز قرار دیا گیا۔ اس کے مطابق اس کا دفتر علماء کا سازشی مرکز تھا۔

جب ترکی اور بلقان ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو مولانا محمود حسن نے ترکی کی مدد کرنے کا پروگرام بنایا اور ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کی بھرپور مدد کی۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو مولانا نے اسے انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کا بہترین موقع تصور کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مختلف اداروں اور تنظیموں کی تنظیم نو شروع کر دی اور حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جیسے نامور رہنماؤں سے اس سلسلے میں بھرپور مدد حاصل کی۔ انھوں نے ہر انگریز دوست تحریک کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور ایسے تمام فتووں پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا جو انگریزوں کی موافقت میں صادر کیے گئے تھے اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ جلد ہی ان کی گرفتاری عمل میں آجائے گی لیکن حکومت نے ان کے خلاف کوئی بھی اقدام کرنے سے احتراز کیا اگرچہ حکومت اس سلسلہ میں بڑی سرگرم تھی کہ ذرا سا بہانہ مل جائے تو وہ مولانا کو گرفتار کر کے جیل میں محبوس کر دے لیکن اسے اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور اگر موقع ملا بھی تو اس نے مصلحتاً ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

مولانا کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ تحریک کی کامیابی کے لیے کسی اسلامی سلطنت کی تائید و حمایت ضروری تھی اسی لیے انھوں نے موقع کو غنیمت جان کر اپنی تحریک کو عملی شکل دینے کی غرض سے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل جانے کی ہدایت کی۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ ایران اور افغانستان کے مابین زیادہ سے زیادہ قربت پیدا کر کے ترکی کی فوجی مدد سے انھیں ہندستان پر حملہ آور ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ جب مولانا نے انھیں کابل جانے کا حکم دیا تو کوئی واضح پروگرام ان کے علم میں نہ تھا لیکن کابل پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ مولانا نے پچھلے کئی برسوں کی محنت سے کابل میں خاصی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ جنرل نادر خاں سے مل کر انھیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ان سے اور ان کے پروگرام سے واقف تھے۔ دراصل انگریزوں کے حامی امیر حبیب اللہ کو اقتدار سے محروم کر کے افغانستان میں امیر

مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی*

خطبۂ استقبالیہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله و صحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين... أما بعد

دور دراز سے آئے ہوئے مہمانان کرام، علماو فضلائے گرامی قدر و محترم حاضرین!

سب سے پہلے میں اپنی طرف سے اور مجلسِ استقبالیہ کے تمام رفقاء اور سیمینار کے منتظمین کی طرف سے آپ تمام حضرات کا نہایت مخلصانہ اور پُر تپاک خیر مقدم کرتے ہوئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کی اور شدید گرمی کے اس موسم میں سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار میں تشریف لا کر ہم سب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرات!

دہلی ہمارے اس عظیم ملک ہندوستان کی راجدھانی اور اس کا دل ہے، اس کے کونے کونے پر بکھرے ہوئے ہماری عظمت دیرینہ کے نقوش زبان حال سے اس ملک اور شہر سے وابستہ ہمارے گذشتہ جاہ و جلال کا افسانہ سنا رہے ہیں۔ اس عظیم اور تاریخی شہر میں، نئی صدی کے پہلے سال میں، بانی تحریک دیوبند اور انیسویں صدی کی یگانہ روزگار علمی، اسلامی اور انقلابی شخصیت حضرت امام نانوتویؒ پر منعقد اس سیمینار کے موقع پر آپ حضرات کا استقبال کرتے ہوئے ہم فخر و مسرت محسوس کرتے ہیں۔

گرامی قدر سامعین!

اس ملک سے اسلام کا تعلق تقریباً تیرہ سو سال پرانا ہے، اس عہد کا بیشتر حصہ ہمارے تابناک ماضی سے تعلق رکھتا ہے جو تاریخ میں درج ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جو ہوا، اس کی تاریخ بھی تقریباً مرتب ہے۔ یہ وہ صدیاں ہیں جن میں امت مسلمہ مجموعی طور سے زوال پذیر ہوئی اور پوری

* نائب صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

امان اللہ کو تخت نشین کر کے انگریزوں کے اثرات سے پاک کرنے میں مولانا محمود حسن نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا سندھی تقریباً سات سال کابل میں قیام پذیر رہے۔ وہاں انھوں نے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف مہم جو دیکھا لیکن وہ سبھی غیر منظم تھے۔ انھیں منظم کرنے اور تربیت یافتہ کرنے کی سخت ضرورت تھی۔

مولانا محمود حسن کی ہدایات کے مطابق مولانا سندھی کو راجہ مہندر پرتاپ کی انقلابی جماعت کا تعاون حاصل کر کے جرمنی، ترکی، ایران اور افغانستان کی مدد سے ہندستان کو آزاد کرانا تھا چنانچہ مولانا سندھی نے جلاوطنی میں ایک ہندستانی عبوری حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ منتخب ہوئے اور وزیر اعظم مولوی برکت اللہ بھوپالی مقرر ہوئے۔ خود مولانا سندھی وزیر داخلہ کی ذمہ داریوں سے ہمکنار ہوئے۔ اس حکومت نے افغانستان کے ساتھ معاہدے کیے اور روس اور جاپان سے بھی روابط قائم کیے اسی طرح انھوں نے افغانستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کی اور خود اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس شاخ کا باقاعدہ الحاق ہندستان کی انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا اگرچہ امیر حبیب اللہ کے عہد میں اسے ہندستانی انقلابیوں کے پروگرام سے دلچسپی اور ہمدردی تھی لیکن اس نے انگریزوں سے متصادم نہ ہونے کی غرض سے اس سلسلے میں غیر جانبدارانہ پالیسی اپنائی۔ تاہم امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد جب امیر امان اللہ تخت نشین ہوئے تو شمال مغربی صوبہ سرحد پر انگریزوں کے خلاف کچھ ناکامیاب فوجی اقدامات ضرور ہوئے۔

اپنی کوششوں میں مولانا سندھی کو کابل کے منصفِ اعلیٰ مولانا عبدالرزاق کا پورا تعاون حاصل ہوا۔ انھوں نے مدینہ کو صدر دفتر بنا کر "جزب اللہ" نامی خدائی فوج کی ترتیب میں کافی مدد کی۔

مولانا سندھی کے کابل روانہ ہونے کے بعد ۱۸/ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن خود بھی حج بیت اللہ کے فریضہ کی ادائگی کے لیے اپنے شاگردوں کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جن میں مولانا محمد میاں امبیٹھوی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا محمد سائل بھاگلپوری، حکیم خان محمد، مولانا مطلوب الرحمٰن دیوبندی، حاجی محبوب خاں سہارن پوری، حاجی عبدالحکیم، مولانا وحید احمد وغیرہ شامل تھے۔ ہندستان کی سی آئی ڈی بھی سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے مولانا محمود حسن کی خواہش تھی کہ خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں تمام اسلامی ممالک، افغان،

دنیا میں مسلمانوں کو شدید کرب و بے چینی سے دوچار ہونا پڑا، خاص طور سے انیسویں کے اواخر اور بیسویں صدی اوائل میں مسلمانوں کو اپنی فکری اور عملی آزادی سے نمایاں طور پر محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا اور براہِ راست یا بالواسطہ طور پر پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کے زیرنگیں آ گیا۔ ادھر ہندوستان میں بھی انگریزوں کے اقتدار کی گرفت سخت ہوئی اور انھوں نے ترجیحی طور پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا، ان کو معاشی اور تعلیمی میدان میں پسماندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کے لئے مختلف حربے استعمال کئے۔ علاوہ ازیں، انگریزی حکومت کی سرپرستی میں عیسائی پادریوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول دیا اور کھل کر اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا جانے لگا۔ انگریزوں اور عیسائی پادریوں کے اس طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس کے نتیجہ میں، تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے مسلمانوں کے خلاف مختلف دوسرے محاذ کھول دیئے۔ پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج نے خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کیں، شدھی سنگٹھن تحریک اور فتنۂ ارتداد کا آغاز ہوا اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اسلام کی صحیح تصویر کو بگاڑنے کی پوری کوشش کی جانے لگی۔ سیاسی، علمی اور فکری زوال کے ساتھ چاروں طرف سے ہو رہے ان مختلف النوع حملوں نے مسلمانوں کو حیران و سراسیمہ کردیا، جس کے نتیجہ میں قوت عمل سے محروم اس قوم کو احساس کمتری و محرومیت، یاس و حسرت اور باطل افکار و خیالات سے مرعوبیت کی ذہنیت نے افسوس ناک حد تک اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اس تشویش ناک صورت حال میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اللہ نے ایسے لوگ پیدا کئے، جنھوں نے اس سوئی ہوئی امت کو جگایا، اس کے مردہ و افسردہ جسم میں روح پھونکی اور احیائے امت و احیائے اسلام کی منظم و منصوبہ بند کوششیں کیں اس کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا ہوا اور انھوں نے اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یوں دینی، دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ان چند برگزیدہ ہستیوں میں، جن سے اللہ نے برصغیر میں احیائے امت اور احیائے اسلام کا عظیم کام لیا، حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا نام سرفہرست ہے، جن پر ہو رہے

سرحدی قبائل اور ہندو مسلم عوام کی مشترکہ اجتماعی کوشش سے ہندستان سے انگریزوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کے نزدیک ترکوں اور عربوں کو اس مقصد سے یکجا کر کے ان پر اثر انداز ہونے کے لیے سرزمین عرب سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے حج بیت اللہ کا قصد کر کے اپنے پروگرام پر عمل آوری کی جانب پہلا قدم اٹھایا۔ برطانیہ کے خلاف پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے ترکی کی شمولیت نے مولانا کو اس حقیقت کا یقین دلا دیا تھا کہ ہندستانی مسلمان پان اسلام ازم کے جذبہ کے تحت یکجا ہو کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنے سے منہہ نہیں موڑیں گے۔ اگرچہ حکومت نے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی اور مولانا بخیر و عافیت مکہ جا پہنچے۔

مکہ میں انھوں نے دہلی کے ایک تعلیم یافتہ اور مذہبی خانوادے کے فرد اور سید احمد شہید کے پیروکار حافظ عبدالجبار سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ اپنے منصوبہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ حافظ صاحب نے ان کی ملاقات گورنر حجاز غالب پاشا سے کرادی۔ غالب پاشا مولانا کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں ان کے منصوبہ میں کامیابی کے لیے اپنی مدد کا یقین دلایا۔ غالب پاشا کو امید تھی کہ امیر افغانستان بھی تحریک کے سلسلہ میں ان کی حمایت کریں گے اور پیرس میں امن مذاکرات کے موقع پر احتجاج کرنے میں معاون ثابت ہوں گے لہٰذا غالب پاشا نے مولانا پر واضح کیا کہ ہندستان کے مسلمان تنہا اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ناکام ثابت ہوں گے اس لیے ان کے لیے لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں کا تعاون حاصل کریں۔

غالب پاشا نے مولانا کو تین خطوط دیے جن میں سے پہلا خط ہندستانی مسلمانوں کے نام تھا اس میں کہا گیا تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کے لیے صف آرا ہو جائیں۔ رولٹ کمیٹی نے اس خط کو "غالب نامہ" کے نام سے موسوم کیا کیونکہ اس پر غالب پاشا کے دستخط موجود تھے اور ان کی مہر بھی ثبت تھی۔ غالب پاشا کا دوسرا خط بصری پاشا کے نام تھا جو مدینہ کے گورنر تھے۔ تیسرا خط وزیر جنگ غازی انور پاشا کے نام تھا جس میں ان سے استدعا کی گئی تھی کہ مولانا کو ان کی مطلوبہ اشیا اور اسلحہ جات کی فراہمی کر دی جائے اور ہر طرح ان کی امداد کی جائے۔

مدینے میں مولانا محمود حسن نے ترکی حکومت کے وزیر جنگ انور پاشا اور جمال پاشا سے جو حجاز کے سوئز کمانڈر تھے ملاقات کی۔ ان دونوں حضرات نے مولانا کو ہر ممکن مدد کا یقین دلایا لیکن ان سے یہ بھی کہا کہ "اصل مدد تو آپ کے ملک کے لوگ ہی کر سکتے ہیں اور اس کے لیے

اس سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں آج ہمیں آپ کے استقبال کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

محترم حضرات! حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی شخصیت، ان کے فکر و فلسفہ، ان کی برپا کی ہوئی دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکات، تحفظ اسلام کے تعلق سے ان کی مساعی، پر سیر حاصل گفتگو تو ہمارے فاضل مقالہ نگار حضرات سیمینار کی علمی نشستوں میں کریں گے، تاہم یہاں میں مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ انچاس (۴۹) سال کی نسبتاً کم عمر میں امام نانوتویؒ نے سیاسی، سماجی، اصلاحی، دینی، علمی اور دعوتی نقطۂ نظر سے اسلام کے تحفظ و دفاع کی خاطر توفیق الٰہی کی بدولت جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، اگر وہ نہ ہوتے تو خدا جانے آج برصغیر میں ہم مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی۔ امام نانوتویؒ کی تحریک نے اس دور پُر آشوب میں جو جماعت پیدا کی، وہ بلا شبہ خیر القرون کی یادگار، سلف صالحین کا نمونہ اور اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ جسے اللہ نے علم و فضل کے ساتھ سادگی، تواضع وللّٰہیت، انابت و تقویٰ اور خدمت دین وملت کے بے پناہ جذبے سے نوازا تھا۔ آج اس جماعت سے وابستہ افراد نے برصغیر کے دور دراز علاقوں میں، نہایت بے مایگی کے عالم میں بھی، علم و ہدایت کی جو قندیلیں روشن کر رکھی ہیں، اُن سے عام مسلمانوں میں پھیلی جہالت، بے دینی اور بدعات و خرافات کی تاریکی دور کرنے میں جو مدد مل رہی ہے، اُس سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔

معزز سامعین!

آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جن حالات میں امام محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریک دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، جس نے إحیائے اُمت اور احیائے اسلام کے ساتھ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا، آثار بتا رہے ہیں کہ ہم اسلامیانِ ہند دوبارہ کچھ اسی قسم کے تشویش ناک حالات سے دوچار ہونے والے ہیں۔ آج پھر ہماری اسلامی شناخت کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہماری شریعت، ہمارے قوانین، ہمارے عقائد، ہماری عبادت گاہیں اور ہمارے مدارس و مراکز کو پھر سے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ہمیں سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس لیے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم منصوبہ بندی کے ساتھ درپیش مسائل و خطرات کا مقابلہ کریں اور اس سلسلے میں بانی تحریک دیوبند کے کارناموں کا بھی بہ غور مطالعہ کریں، جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پیشتر آج سے زیادہ تشویش ناک

ضروری ہے کہ آپ غیر مسلموں کو بھی اپنے ساتھ لیں" مولانا نے کابل میں مقیم اپنے شاگردوں کو کہلا بھیجا کہ وہ ہر طرح اپنی تحریک میں غیر مسلموں کو بھی شامل کریں اور انھیں ذمہ دار مناصب پر فائز کریں اور انھیں بطور خاص یہ یقین دلائیں کہ اس تحریک کا مقصد پھر سے ہندستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ صرف ملک کی آزادی کا حصول ہے۔
اسی پیغام اور ہدایت کی روشنی میں عارضی حکومت میں راجہ مہندر پرتاپ کو منصب صدارت پر فائز کیا گیا جسے مولانا سندھی نے کابل میں قائم کیا تھا۔ انور پاشا اور جمال پاشا نے بھی ہندستانی مسلمانوں کے نام ایک خط لکھ کر اس میں ان کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ میں اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اس خط کو "انور نامہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ خط عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں تحریر تھا جسے شیخ الہند کے قریبی رفقا مولانا ہادی حسن مظفر نگری اور حاجی شاہ بخش سندھی کے ساتھ ہندستان بھیج دیا گیا تاکہ وہ اسے حاجی نور الحسن مظفر نگری تک پہنچا دیں جو اس کی نقلیں کرا کے دہلی کے افراد اور دیگر متعلقہ اشخاص کو بھجوا دیں۔ انھوں نے حسب ہدایت اس خط کو احتیاط سے متعلقہ افراد تک پہنچا دیا مگر وہ گرفتار کر لیے گئے اور اس خط کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکا کیونکہ جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ غالب پاشا کا خط شیخ الہند نے محمد میاں انصاری کے ساتھ ہندستان بھیج دیا تاکہ وہ اسے ہندستانی مسلمانوں کے مطالعہ میں لانے کے بعد قبائلی علاقوں میں بھجوا دیں۔ محمد میاں انصاری بمبئی سے بھوپال پہنچے جہاں انھوں نے قاضی بھوپال نواب محی الدین احمد خاں سے ملاقات کی جو شیخ الہند کے قریبی رفیق تھے اور انھیں شیخ الہند کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد محمد میاں نے علی گڑھ میں مولانا حسرت موہانی اور کلکتہ میں مولانا آزاد سے رابطہ قائم کر کے انھیں منصوبہ سے باخبر کیا۔ اور پھر غالب نامہ کو قبائلی لوگوں تک پہنچا دیا۔

مدینہ سے شیخ الہند طائف پہنچے تاکہ غالب پاشا سے مل کر دوسرے اہم مسائل پر بھی گفتگو ہو جائے لیکن وہاں یہ طے ہوا کہ مولانا ہندستان نہ جا کر حجاز ہی میں قیام کریں کیونکہ ہندستان جانا ممکن نہ تھا۔

برطانوی حکومت بڑی کوشش میں تھی کہ وہ شیخ الہند کو گرفتار کر لے مگر ہر بار وہ ناکام رہی تھی۔ اب جبکہ وہ مکہ میں مقیم تھے حکومت نے انھیں گرفتار کرنے کے لیے ایک نئی چال چلی۔ اس نے ان کی خدمت میں ترکی کے خلاف ایک فتوے پر دستخط حاصل کرنا چاہے جسے شیخ الہند نے مسترد کر دیا۔ اس میں شریف حسین کی حمایت اور مکہ کے شریف کی حیثیت سے اسے تسلیم کیے جانے کا اقرار تھا۔ اس انکار کے سبب مولانا اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جدہ لایا

حالات وخطرات میں گھرے برصغیر کے مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لحاظ سے سیمینار کا انعقاد حالاتِ حاضرہ کی ایک اہم ضرورت تھی۔

مہمانانِ کرام! میں ایک بار پھر آپ حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ساتھ ہی تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کے ذمہ داران و کارکنان کو بھی اپنے اور ہم مسلمانوں کے محسن حضرت امام نانوتویؒ پر یہ کامیاب سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اسی طرح دہلی اور باہر کے جن حضرات نے بھی اپنے گراں قدر تعاون سے نوازا ہے، اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ سیمینار کامیاب ہوگا اور اس سے فکر و عمل کے ایسے گوشے سامنے آئیں گے، جو آج کے حالات میں ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين.

گیا جہاں سے انھیں مصر لے جایا گیا۔ ان سے حکومت کے اعلیٰ افسروں نے کئی سوالات کیے جو فتوے پر ان کے دستخط سے انکار اور ریشمی رومال تحریک سے متعلق تھے۔ مصر میں ڈیڑھ ماہ قیام کے بعد انھیں ۲۱ر فروری کو مالٹا بھیج دیا گیا۔ مالٹا بحرۂ روم میں واقع ایک جزیرہ ہے جو ان دنوں سیاسی قیدیوں کی اسارت گاہ تھا۔ شیخ الہند جب وہاں پہنچے تو مختلف ممالک کے تقریباً دو ہزار قیدی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ تمام شیخ کی علمیت اور شخصیت سے مرعوب ہوئے۔ انھوں نے ان کا بڑا احترام کیا خاص طور سے اس لیے بھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ہندستانیوں کی آزادی کے لیے برسرپیکار تھے۔

مالٹا میں ان کی اسیری کا زمانہ نہایت عزم و ہمت اور جبر و استقلال سے گزرا تاہم مالٹا کی آب وہوا شیخ الہند کو راس نہیں آئی۔ ان کی صبح نماز تہجد سے شروع ہوتی تھی پھر اپنے ساتھیوں اور معتقدوں کے لیے درس قرآن ہوتا تھا اور مذہب سے متعلق اسی قسم کے دوسرے اسباق ہوتے تھے۔ غرضیکہ وہ اپنا بیشتر وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ مالٹا ہی میں انھوں نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ تاہم انھیں ہندستان کے مستقبل کی فکر تھی جس کے بارے میں وہ اپنے رفقا سے شب و روز گفتگو میں مشغول رہا کرتے تھے انھیں اس وقت شدید صدمہ اٹھانا پڑا جب ان کے عزیز مرید اور شریک اسارت مولانا حکیم نصرت حسین کا ۱۹۱۹ء میں انتقال ہو گیا۔ اس اثنا میں ان کی رہائی کے لیے ہندستان میں تحریکیں جاری رہیں مختلف جماعتوں نے اپنے اجلاسوں میں ان کی رہائی کے لیے قرار دادیں منظور کیں اور سبھی اداروں اور تنظیموں نے ان تجاویز کی حمایت کی۔ مولانا محمد علی جب خلافت کے وفد کے قائد کی حیثیت سے انگلستان گئے تو وہاں انھوں نے اپنی تقریر میں براہ راست برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> "دیوبند کے مولانا محمود حسن صاحب ہندستان کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہیں۔ حکومت نے ان کو اپنے مطلب کی خاطر استعمال کرنا چاہا مگر انھوں نے بزدلی نہیں دکھائی۔ ان کی عمر ستر سال کے قریب ہے لیکن ان کو ہندستان چھوڑنا پڑا۔ ان کو ڈر پیدا ہوا کہ مذہب کے نام پر ان سے کسی ایسی تحریر پر دستخط لیے جانے کی کوشش کی جائے گی جو ان کا ضمیر پسند نہ کرے۔ وہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے جہاں امید تھی کہ ان کے ضمیر پر کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے گا لیکن وہاں بھی ان پر اسی بات کے لیے دباؤ ڈالا گیا جس کا انھیں ڈر تھا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ اسلام کی مقدس ترین جگہ میں شریف

عزت مآب جناب عبدالرحمن ناصر العوہلی*

خطبۂ مہمان خصوصی

یہ میرے لیے انتہائی مسرت اور فخر و اعزاز کا مقام ہے کہ میں آپ کے اس مبارک اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو اسلامی ہند کی مایہ ناز شخصیت، اسلام کے عظیم سپوت اور از ہر ہند کے نام سے معروف برصغیر ہند کی قدیم ترین اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت اور خدمات پر ہونے والے سیمینار کا افتتاحی اجلاس ہے۔ میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس اہم اجلاس میں شرکت کی دعوت دی اور سرکردہ علما اور ارباب علم و فکر کے اس مجمع کو مخاطب کرنے کا موقع عنایت کیا۔ مجھے اس اجلاس میں مدعو کر کے دراصل آپ نے اپنے اس بھائی کو دعوت دی ہے جو آپ کے وطن ثانی سعودی عرب کی نمائندگی کرتا ہے۔ سعودی عرب جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز اور ان کی کبھی نہ ختم ہونے والی عقیدت و محبت کی آماجگاہ ہے کہ اسی سرزمین پر وہ مقدس مقامات واقع ہیں جہاں سے اسلام کے آفاقی پیغام کا سورج طلوع ہوا۔ سعودی عرب جو دعوت الی اللہ کا علم بردار ہے اور جس کو بیت اللہ اور حرم نبوی کی خدمت کا شرف حاصل ہے۔

علماء کرام معزز حاضرین!

میں اس مبارک موقع پر آپ کے ساتھ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عظیم خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں جنھوں نے اپنے رفقاء کار اور دیگر علما کرام کے ساتھ مل کر اس ملک میں اسلامی تشخص کی حفاظت، ہندوستانی مسلمانوں کا اپنے ایمان و عقائد سے رشتہ استوار و برقرار رکھنے اور اسلام مخالف رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسے وقت میں جدوجہد کی جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک مشکل اور نازک دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب بیرونی سامراج نے ہندوستان کی آٹھ سو سالہ مسلم حکومت کا چراغ گل کر دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور مسلمانوں کے مذہب اور

* سفیر سعودی عرب برائے ہند

کے ذریعہ گرفتار کر لیے گئے اور مصر بھیج دیے گئے لیکن حکومت کو یہ خوف پیدا ہوا کہ ایسے ایماندار اور پاک ضمیر رکھنے والے شخص کی موجودگی سے مصر کے باشندے کہیں متاثر نہ ہو جائیں اس لیے ان کو مالٹا میں لے جا کر محبوس کر دیا گیا اور وہ اب تک وہاں ہیں حالانکہ شاہی اعلان سے اور سب کو معافی دے دی گئی ہے۔ یہ شکایت بھی سننے میں آئی کہ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو پوری غذا نہیں دی جاتی ہے، معلوم نہیں یہ صورت حال اب بھی جاری ہے یا ختم کر دی گئی۔ ان کی مشروط رہائی کی خبر ملی تھی لیکن انھوں نے مشروط طور پر رہا ہونا پسند نہیں کیا۔ سورۂ یوسف میں خود حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ "اے میرے مولا قید خانہ مجھ کو اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس کے لیے مجھ کو دعوت دی جاتی ہے، ہندستان کے تمام مسلمان اس برے رویہ پر احتجاج کر رہے ہیں اور اگر مولانا کی جلد رہائی نہیں ہوئی تو اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوں گے۔"

انجام کار تقریباً تین سال اور دو ماہ مالٹا میں اسیر رہنے کے بعد مولانا کو بروز جمعہ ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو رہا کر کے ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اسکندریہ (مصر) لے جایا گیا جہاں انھیں مزید اٹھارہ روز قیام کرنا پڑا یہاں بھی ترکی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد محبوس تھی لیکن انھیں کسی سے کلام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں سے انھیں سویز لے جایا گیا اور اس کے بعد عدن پہنچا دیا گیا اور پھر بالکل رہا کر دیا گیا اور وہ ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچ گئے جہاں ہزاروں افراد نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا کیونکہ انھیں پہلے ہی مولانا کے پروگرام سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ بمبئی میں حکومت کے افسروں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ وہاں نہ تو کسی سیاسی جماعت کے رہنما سے ملاقات کریں اور نہ کسی جلسہ میں شریک ہوں بلکہ براہ راست دیوبند چلے جائیں لیکن شیخ الہند نے اس مشورہ پر عمل نہ کرتے ہوئے خلافت کمیٹی کے اراکین اور قومی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان کے استقبالیہ جلسے میں بھی شرکت کی جو منارہ مسجد میں منعقد کیا گیا تھا۔ جہاں ان کی خدمت میں سپاس نامہ کے ساتھ ہی ان کی خدمات کے اعتراف میں شیخ الہند کا خطاب بھی پیش کیا گیا جو ان کے نام کا جزو بن گیا۔ بمبئی میں ان کا استقبال کرنے والوں میں ہندستان کے مختلف رہنماؤں کے علاوہ گاندھی جی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولوی کفایت اللہ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے ان سے تبادلہ خیال کیا اور سیاسی حالات سے انھیں آگاہ کیا۔ ہندستان میں خلافت کی تحریک سے متعلق شیخ الہند نے انھیں

عقیدے کو نشانہ بنانا شروع کردیا تھا۔ لیکن اللہ تعالی نے ان علماء کرام کی بدولت سامراجی طاقتوں کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

برادران گرامی حاضرین کرام!

میں اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی و علمی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقا نے ۱۳۰ رسال قبل تقویٰ وللّٰہیت کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی ابتدا ایک چھوٹے سے مدرسے کی شکل میں ہوئی تھی لیکن اس کے بانیوں کے اخلاص اور کوششوں کی بدولت بہت جلد اس کو ایک مکتب فکر، ایک ہمہ گیر تعلیمی واصلاحی تحریک اور اسلام کے ایک قلعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی جو اسلام کی عظمت، آفاقیت اور ابدیت کا ایک ثبوت ہے۔ اس ادارے نے ہزاروں علما اور خادمان دین پیدا کئے جنھوں نے اس ملک میں اسلامی علوم کی نشر واشاعت، کفر والحاد، مغربی تہذیب اور تخریبی طاقتوں کے ساتھ محاذ آرائی اور بدعات وخرافات کا مقابلہ کرنے میں قابل ستائش کردار ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔

علمائے کرام معزز حاضرین!

آپ کو معلوم ہے کہ مملکت سعودی عرب اپنے قیام سے لے کے آج تک دنیا بھر میں مختلف طریقوں سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے پیہم کوشاں رہی ہے اور خاص طور پر مسلم اقلیتیں اور ان کے مسائل ومشکلات سعودی عرب کی خصوصی توجہات کا مرکز رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمارے یہاں ایک مستقل وزارت برائے اسلامی امور قائم ہے جس کی سربراہی ایک کیبنٹ درجہ کے وزیر کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والے اسلامی کاموں کو مادی ومعنوی امداد بہم پہنچانا سعودی عرب اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ یہی اسلامی اخوت اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، لیکن ساتھ ہی سعودی عرب اس بات کا پوری طرح خیال رکھتا ہے کہ مسلمان جن ملکوں کے باشندے ہیں یا جہاں مقیم ہیں ان ممالک کے قوانین وضوابط کے احترام میں کوئی کمی نہ آئے، کیونکہ دوسرے ممالک کے معاملات میں دخل نہ دینا اور ان کے نظام اور قوانین کا مکمل احترام ملحوظ رکھنا سعودی عرب کی خارجہ پالیسی کا بنیادی جز ہے۔

علمائے کرام معزز حاضرین! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام دین رحمت ہے۔ یہ دین،

اپنے دلی اشتراک کا یقین دلایا اور اس سلسلے میں ایک فتویٰ بھی صادر کیا جس سے ترک موالات کو شرعی حیثیت حاصل ہو گئی اور آزادیِ کامل کے حصول کی جدوجہد کو تقویت ملی۔ اسی طرح انھوں نے ایک دوسرے فتوے پر پانچ سو علما کے دستخط حاصل کر کے ترک موالات کو مذہبی طور سے لازمی قرار دیا جس سے حکومت مخالف جذبات کو جلا ملی۔ اسی زمانے میں علماء نے اپنی خانقاہوں کو خیرباد کہہ کر جمعیۃ علماء ہند قائم کی تھی جو تحریک خلافت کی حمایت میں پیش پیش رہی۔ مولانا محمود حسن نے جمعیۃ کے قیام کو ایک فال نیک سے تعبیر کیا اور اس کی پالیسیوں کی حمایت کی۔

بعد ازاں شیخ الہند نے علالت کے باوجود ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور ترک موالات کے پیغام کو عام کیا۔ ان اسفار سے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ حاصل ہوا اور ہندستان کے عوام نے تحریک میں شمولیت اختیار کی۔

گاندھی جی کے ترک موالات کی تحریک میں جہاں حکومت کے جلسوں کا بائکاٹ، خطابات کی واپسی، وکیلوں کے لیے وکالت کا ترک جیسی شقیں شامل تھیں وہیں اس میں یہ شق بھی تھی کہ طلبہ کو سرکاری کالجوں اور تعلیمی اداروں کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ کی تحریک پر ایم اے او کالج علی گڑھ کے طلبہ کی خاصی بڑی تعداد نے اپنی مادر علمی کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا تو ایک نئی دانش گاہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس دانش گاہ کی رسم افتتاح بروز جمعہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ شیخ الہند کے مبارک ہاتھوں سے ادا ہوئی۔

مالٹا میں اسارت کے دوران شیخ الہند اس قدر نحیف ہو گئے تھے کہ انھیں دیوبند سے علی گڑھ تک لیٹے لیٹے سفر طے کرنا پڑا اور ان کا افتتاحی خطبہ ان کے عزیز شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ خطبہ میں شیخ الہند نے فرمایا:۔

"جلسوں کی عام روش کا اقتضا یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر جو کہ ایک نہایت ہی سرفروشانہ ایثار اور شجاعانہ جدوجہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے' شکر گزاری اور منت پذیری کا اظہار کروں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ چند وسیع اور شاندار الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا اور نہ مجھ کو محض رسمی اور مصنوعی ممنونیت کی نمائش اور بھاری ذمے داری کے بوجھ سے سبکدوش کر سکتی ہے جو فی الحقیقت آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے۔

"دو چار پھڑکتے ہوئے جملے بلاشبہ عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کر سکتے ہیں' مگر میں

اعتدال اور رواداری کا علم بردار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ساری انسانیت پر اس دین برحق کے بے پناہ احسانات ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نے بنی نوع انسان کے لیے ترقی اور تمدن کی راہ روشن کی اور ایسے اصول وضوابط پیش کیے جو انسان کی زندگی منظم کرتے ہیں، اس کو سچائی کا راستہ دکھاتے اور گمراہی کی تاریکیوں سے بچاتے ہیں۔ لیکن آج کچھ ایسی کوششیں ہو رہی ہیں جن کا مقصد اسلام کی روشن اور صاف وشفاف تصویر کو داغدار کرنا ہے۔ آج اسلام کو تعصب، تشدد اور دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور کبھی آزادی کے نام پر، کبھی انسانی حقوق کا سہارا لے کر اسلامی شریعت کو بدنام کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت حال میں آپ جیسے علما و مفکرین سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے تاکہ اسلام کی سچی اور حقیقی تصویر دنیا کے سامنے آسکے۔

علمائے کرام معزز حاضرین!

میں آپ کی خدمت میں خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز، ان کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز، نائب وزیر اعظم دوم شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز اور سعودی عرب کی حکومت اور عوام کی طرف سے ہدیہ سلام اور نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ حکومت سعودی عرب اپنی صالح قیادت کی زیر رہنمائی، دین برحق کی نصرت وحمایت اور مسلمانوں اور مسلم اقلیتوں کی خدمت میں پورے عزم وحوصلے کے ساتھ سرگرم عمل رہے گی۔ اسی طرح حکومت سعودی عرب نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ حرمین شریفین اور دیگر مقامات مقدسہ کی توسیع وتعمیر کے جو منصوبے زیر تنفیذ ہیں ان کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا جائے گا اور حجاج وزائرین کرام کو زیادہ سے زیادہ آرام وراحت اور سہولت فراہم کرنے کے لیے مزید منصوبے روبہ عمل لائے جاتے رہیں گے۔ سعودی عرب کا اپنے آپ سے یہ عہد ہے کہ حجاج وزائرین کرام کو بہتر سے بہتر سہولیات بہم پہنچانے کے سلسلے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے یہاں ایک مستقل وزارت برائے حج قائم ہے جس کی سربراہی کیبنٹ درجے کے وزیر کے ہاتھوں میں ہے۔

آخر میں ایک بار پھر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے سیمینار کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ☆☆

خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درماں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم و دائم جوش کی' نہایت ہی صابرانہ ثبات قدم کی' دلیرانہ مگر عاقلانہ طریق عمل کی' اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی، غرض ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش محمدی بننے کی۔

"میں ہرگز آپ کے لکچراروں اور فصیح اللسان تقریر کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرتا ہوں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جو چیز سوئے ہوئے دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے' اور زمانہ کی ہوا میں اوّل تموّج پیدا کرتی ہے' وہ یہی دعوت حق کا غلغلہ ڈالنے والی زبان ہے۔ ہاں اس قدر گزارش کرتا ہوں کہ تاوقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعی جمیل کا سچا جذبہ' اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار' اس کے جوارح میں قوت عمل' اور اس کے ارادوں میں پختگی اور چستی نہ ہو' محض گرم جوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کر سکتیں:

کیف الوصول الی سعاد و لونها: قللُ الجبال و لونهن خیوف۔

"اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادی پُر خار کو آپ برہنہ پا ہو کر قطع کرنا چاہتے ہیں وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے۔ قدم قدم پر وہاں صعوبتوں کا سامنا ہے' طرح طرح کی بدنی اور مالی اور جاہی مکروہات آپ کے دامن استقلال کو الجھانا چاہتی ہیں لیکن "حفت الجنت بالمکارہ' کے قائل کو اگر آپ خدا کا سچا رسول مانتے ہیں (اور ضرور مانتے ہیں) تو یقین رکھیے کہ جس صحرائے پُر خار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے راستہ سے جنت کا دروازہ بہت ہی قریب ہے' کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دکھائی دیا ہے۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستهم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب

(کیا تم کو یہ خیال ہے کہ تم جنت میں جا گھسو گے اور تمہیں اس طرح کے حالات پیش نہ آئیں گے جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئے؟ ان کو سختیاں اور مضرتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ کے مومنین بول اٹھے کہ خدا کی مدد کہاں ہے؟ یاد رکھو کہ خدا کی مدد نزدیک ہے۔)

"دوسری جگہ ارشاد ہے

ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی*

تعارفی کلمات

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم.

صدر محترم حضرت مولانا نظام الدین صاحب، علماء کرام، دانشوران عظام، مندوبین ومہمانان گرامی اور حاضرین جلسہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے احقر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہے کہ اس نے تنظیم کو اس امر کی توفیق اور سعادت سے نوازا کہ اس نے اسلام کے عظیم علم بردار، حق وصداقت کے مبلغ، علم وعرفان کے شہسوار، انسانی حقوق کے محافظ، اسلامی شریعت کے ترجمان، حکمت قرآن وسنت کے حامل وعالم حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی حیات اور ان کے زریں کارناموں پر سیمینار منعقد کیا۔ احقر اس سیمینار میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہے اور آپ حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ سخت گرمی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے اپنے عظیم محسن کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے آپ یہاں تشریف لائے۔

حضرات! تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی ذات بابرکات ہی تھی جو نہ صرف یہ کہ ظلم واستبداد اور استعماریت کے خلاف برہنہ تلوار بن گئی تھی بلکہ جس نے برصغیر میں اسلامی تعلیم کے مراکز ومدارس قائم کرکے انگریزوں کا طاقت کے بل پر اسلام کا چراغ بجھانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا اور اسلامی تعلیمات کو دلائل وبراہین کے زیور سے آراستہ کرکے گھر گھر پہونچایا، آج جب فسطائی اور باطل طاقتیں مدارس اسلامیہ اور اسلامی اقدار کو مٹانے کی کوشش کررہی ہیں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت وسیرت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اس سیمینار میں ملک کے ممتاز علماء، محققین اور

* ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

ام حسبتھم ان تدخلواالجنۃ و لما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم و یعلم الصابرین۔

(کیاتم نے یہ خیال نہیں کیاکہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے بدون اس کے کہ اللہ جانچ کرے تم میں سے مجاہدین کی اور صابرین کی؟)

الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لایفتنون ولقد فتنّاالذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین

(کیالوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض آمنا کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے؟ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے تو ضرور ہے کہ اللہ پرکھے گا سچے اور جھوٹے لوگوں کو۔)

"یہ حق تعالیٰ شانہ کی سنت مستمرہ ہے' جس میں کسی قسم کی تبدیلی و تغیر کو راہ نہیں۔ کوئی قوم اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے راستے پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی جس کو امتحان و آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو۔ خدا کے برگزیدہ اور اولوالعزم پیغمبر' جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہو سکتا' وہ بھی مستثنیٰ نہیں رہے۔ بیشک ان کو مظفر و منصور کیا گیا۔ مگر کب؟ سخت ابتلاء اور زلزال شدید کے بعد۔ خود فرماتے ہیں۔

حتی اذا جاء ھم الرسل و ظنوا انھم قد کذبوا جاء ھم نصرنا فنجی من نشاء ولا یرد باسنا عن القوم المجرمین۔

"پس اے فرزندان توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیاء و مرسلین اور ان کے وارثوں کے راستہ پر چلیں۔ اور جو لڑائی اس وقت شیطان کی ذریت اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے اس میں ہمت نہ ہاریں' اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوند قدیر کی امداد کے سامنے تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا

(ایماندار تو خدا کے راستے میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کے راستے میں۔ پس تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ بلاشبہ شیطان کی فریب کاری محض لچر پوچ ہے۔)

ان ابتدائی الفاظ کے بعد حرف مطلب زبان پر لاتے ہوئے شیخ الہند نے فرمایا:۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں' جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی

دانشوروں کے ذریعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کے زریں کارناموں کو منظر عام پر لاکر مسلمانانِ ہند کے لیے ایک نمونۂ عمل پیش کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ حضرت نانوتوی کی مانند اسلامی درس گاہوں اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

حضرات! تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ عظیم اسلامی دانش گاہ دارالعلوم کے فضلاء اور علماء کی تنظیم ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں حضرت مولانا نانوتویؒ کا اس ادارہ کو قائم کرنے کا مقصد صرف ایک مخصوص نصاب تعلیم کی تدریس نہیں تھا بلکہ ایسے باصلاحیت اور صاحب عزم افراد تیار کرنا تھا جو اسلامی علوم پر مکمل عبور اور مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ وقت کے ہر طرح کے چیلنج کا جواب دیتے ہوئے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور وہ یہ ثابت کرسکتے ہوں کہ انسان کے تمام مسائل کا حل صرف اسلام کے نظریۂ حیات میں ہے جو ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کو علم و شعور کے ہتھیار کے ذریعہ فتح و کامرانی میں تبدیل کرسکتے ہوں جو غیروں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں پر انحصار کرنے کے بجائے خود اپنی تعلیم گاہیں قائم کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں جو دوسروں کی غلامی اور تابعداری کے بجائے قیادت و سیادت کی صلاحیت اور عزم و حوصلہ کے ذریعہ امت مسلمہ کو عزت و وقار سے ہم کنار کرسکتے ہوں۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ کی تربیت کے ذریعہ حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ وغیرہ جیسی شخصیات پیدا ہوئیں جن کی خدمات ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے زریں باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ تربیت کا جو کام حضرت الاستاذ تنہا انجام دیتے تھے اب اسی کام کو فضلاء دارالعلوم اجتماعی طور پر انجام دیں اور اسی مقصد کے لیے ایک تنظیم کی تشکیل دی جائے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسنؒ کی سرپرستی اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی زیر نظامت، فضلاء دارالعلوم کی پہلی تنظیم جمعیت الانصار کے نام ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں قائم ہوئی اس کے دو شاندار جلسے مرادآباد اور میرٹھ میں ہوئے لیکن جب حضرت

جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا، اور ان کے سامان حرب و ضرب کا، حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیئے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل، خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اسی قسم کے مضمون کی طرف حق تعالیٰ شانہ نے ان آیات میں اشارہ فرمایا ہے۔

الم ترا الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوۃ واتو الزکوۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللّٰہ أو أشد خشیۃ وقالو ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب۔ قل متاع الدنیا قلیل۔ والاخرۃ خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا۔ اینما تکونو ا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ۔

(کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ کو روکو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو یکایک ان میں کا ایک فریق ڈرنے لگا آدمیوں سے برابر اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگا کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اور مہلت نہ دی؟ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا سا ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، جہاں کہیں بھی تم ہو موت تم کو آدبائے گی، اگرچہ تم مستحکم قلعوں میں ہو)

شیخ الہند نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح کے سلسلے میں فرمایا:۔

"اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

"کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔

مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کی ایماء پر دیوبند سے دہلی آ گئے تو انہوں نے مسجد فتح پوری میں نظارۃ المعارف قائم کی اور پھر جامعہ اسلامیہ میں بیت الحکمۃ کے ذریعہ اسی مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا نظم کیا۔

۱۳۷۸ھ م ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ دارالعلوم میں تنظیم ابنائے قدیم کا دفتر کھولا جائے تاکہ دارالعلوم اور فضلاء کے مابین رابطہ قائم کیا جاسکے۔ اضلاع اور صوبوں میں بھی اس کے مراکز کھولے گئے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر اس تنظیم کی پھر تشکیل نو ہوئی اور اس نے کافی عرصہ کام کیا مگر اس کی سرگرمیاں پھر مسدود ہو گئیں اگرچہ اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس باقی تھا۔ چنانچہ ۴؍جون ۱۹۹۰ء کو حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد مرحوم اور حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی سرپرستی، مولانا افضال الحق قاسمی، مولانا سید احمد ہاشمی، مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا آس محمد گلزار قاسمی اور احقر کی کوششوں سے جیون بخش ہال مسجد فتح پوری میں فضلاء دارالعلوم کا ایک بڑا اجتماع منعقد ہوا اور تنظیم کی تشکیل نو کی گئی۔ الحمدللہ دس سال سے نہایت استقلال، استقامت، اخلاص اور تندہی کے ساتھ تنظیم کام کر رہی ہے اس کا باقاعدہ ایک دستور ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے رہنما اصولوں کی روشنی میں تنظیم نے فضلائے دارالعلوم کے لیے ایک عملی پروگرام مرتب کیا ہے جس میں فضلا کی علمی، فکری، تعلیمی، سماجی، اصلاحی تربیت کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

تنظیم کی جانب سے ہر مہینہ پابندی کے ساتھ ترجمان دارالعلوم کے نام سے ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے جس کے ذریعہ دارالعلوم کا مسلک، اکابر دارالعلوم کے افکار و نظریات اور فضلائے دارالعلوم کا خود نوشت تعارف شائع کیا جاتا ہے۔

حضرات! تنظیم کا بنیادی مقصد دارالعلوم کے تمام ابنائے قدیم کے درمیان اتحاد و محبت اور یکجہتی کے جذبات اجاگر کرنا اور ہر طرح کے اختلاف و افتراق کو ختم کرنا ہے۔ ابنائے قدیم کے مابین اختلاف کو تنظیم، تحریک دارالعلوم کے لیے نہایت مضر اور نقصاندہ تصور کرتی ہے چنانچہ آج ہم جب اپنی مادر علمی کے بانی کی شخصیت اور خدمات پر تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سیمینار منعقد کر رہے ہیں ہم نے تمام فرزندان دارالعلوم کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت یا ادارہ سے ہو اس سیمینار میں مدعو کیا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم سر عفاف ملکوت
بامن راہ نشیں بادۂ مستانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے کہ جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں' یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں' تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔

"اب از راہ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے؟ اور کیا یہ وہی بات نہیں جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ:

"ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھے صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو"

بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی کہ وہ اپنے نفع وضرر کا موازنہ کریں اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی بھپکے کے ذریعہ سے علاحدہ کر لیں۔۔ آج ہم وہی بھپکا نصب کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بھپکا "مسلم نیشنل یونیورسٹی" ہے۔

"مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی' کیونکہ زمانہ نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے بلند خیالی اور تدبر اور ہوشمندی کے پودے نشوونما پاتے ہیں اور اُسی کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے رستہ پر چل سکتا ہے۔

"ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو' اور اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق واعمال کے اور کیا باعتبار

حضرات! ہماری تنظیم کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنی مادری علمی کی فلاح و بہبود اور اس کی علمی وفکری ترقی اور اس کو عالمی دانش گاہوں میں امتیازی مقام دلانے کے لیے جدوجہد کرے اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی کوشش کو وہ اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری مادر علمی دارالعلوم کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کی خواہش اور منصوبہ کے مطابق ترقی کے اعلیٰ منازل سے نوازے اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بلکہ عالم اسلام اور پوری انسانیت کو اس کے ذریعہ فیض و ہدایت حاصل ہو۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

اوضاع واطوار کے، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

"ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علما نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا۔ تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

"ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہوگا۔

"مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالانِ وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہیے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالات نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔

"شاید ترک موالات کے ذکر پر آپ اس مسئلہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان عامتہ الورود سوالات و شبہات کی دلدل میں پھنسنے لگیں جو اس بہت ہی اہم و اعظم مسئلے کے متعلق آج کل عموماً زبان زد ہیں، اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑا سا وقت مجھ کو اس تحریر کے سنانے کے لیے عنایت فرمائیں جو میں نے بعض مسائل دریافت کیے جانے پر دیوبند سے تیار کر کے بھیجی تھی۔ وھوھذا۔

مولانا محمد مزمل الحق الحسینی*

حرفے چند

بانی تحریک دیوبند الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم و معارف کی فہم و تفہیم، ان کے افکار و مواقف پر ریسرچ اور تحقیق، ان کی حیات و خدمات کے گوشوں اور پہلوؤں کا احیاء و تذکیر، فرزندانِ قاسمی پر ایک ایسا واجب الادا قرض تھا جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے ان کے کاندھوں کو بوجھل اور نگاہوں کو شرمسار کیے ہوئے تھا۔ الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کے انعقاد کے ذریعے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے اس قرض کی ادائیگی کی جانب پیش رفت کی خصوصی توفیق نصیب فرمائی یہاں تک کہ دیکھنے والی آنکھیں اور بولنے والی زبانیں پکار اٹھیں کہ علماء دیوبند کی حالیہ تاریخ میں اس اجتماع سے زیادہ پُر وقار اور نتیجہ خیز اجتماع منعقد نہیں ہوا۔

الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ذمہ داران وارکانِ تنظیم کی ایک آرزو کی تکمیل تھا اور وہ آرزو یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے بعد اکابر دیوبند پھر ایک اسٹیج پر جمع ہو کر علما اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اتحاد و اتفاق کا پیغام دیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ ان مؤمنین مخلصین کی یہ پاکیزہ آرزو بھی بڑی حد تک پوری ہوئی اور سیمینار کو جماعت کے تقریباً سبھی اکابر اور بزرگوں کی تائید و سرپرستی حاصل رہی۔

سیمینار کے انعقاد کا ایک اہم ترین مقصد مستقبل میں تنظیم سے وابستہ ہونے والے علما و فضلاء پر افکار قاسمیہ کو واضح کرنا تھا تاکہ وہ ان سے روشنی پا کر اپنے علمی و عملی مستقبل کی مضبوط اور سیدھی بنیاد قائم کر سکیں۔

اکابر کی سرپرستی

سیمینار کو جماعت کے تقریباً سبھی اکابر کی سرپرستی اور دعائیں حاصل تھیں تیاریوں کے

* کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند - نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اس تمہید کے بعد مولانا نے فرمایا:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

"ان مسائل کا جواب سننے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ایک مسلم صادق تمام گردوپیش کے خیالات سے علاحدہ ہو کر اپنے ایمان کی قدر و قیمت اور شعار الٰہیہ کی عظمت اور مقامات مقدسہ کے تقدس و احترام کو اچھی طرح دلنشیں کرے اور دروس ماضیہ کے ساتھ واقعات حاضرہ پر ایک گہری نظر ڈالے' تو اسے معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی متاع گرانمایہ جس کا تحفظ ہر ایمان رکھنے والے کا اولین فرض ہے کس طرح لوٹی جارہی ہے اور کن بدعہدیوں اور شرمناک عیاریوں اور روبہ بازیوں سے جزیرۃ العرب کے متعلق پیغمبر اسلام (فداابی وامی) کی سب سے اہم وصیت کا مقابلہ کیا جارہا ہے۔

"اعداء اللہ نے اسلام کی عزت اور شوکت کی بیخ کنی میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عراق' فلسطین' اور شام جن کو صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے خون کی ندیاں بہا کر فتح کیا تھا پھر کفار کی حریصانہ حوصلہ مندیوں کی جولانگاہ بن گئے' پیراہن خلافت کی دھجیاں اڑادی گئیں' خلیفۃ المسلمین' جس کی ہستی سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی ہستیوں کا شیرازہ بندھتا ہے اور جو بحیثیت ظل اللہ فی الارض ہونے کے آسمانی قانون کا رائج کرنے والا اور مسلمانوں کے حقوق اور مصالح کا محافظ اور شعائر اللہ کی صیانت کا ضامن اور کلمۃ اللہ کی رفعت و سربلندی کا کفیل تھا وہ بھی بے شمار دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر بے دست و پا ہو چکا ہے۔

صبت علی مصائب لو انھا صبت علی الایام صرن لیا لیا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا (خاکم بدہن) سرنگوں ہوا جارہا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ' سعد بن ابی وقاص' خالد بن الولید اور ایوب انصاری رضی اللہ عنہم کی روحیں اپنی خواب گاہوں میں بے چین ہیں۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس لیے کہ مسلمانوں میں سے غیرت و حمیت مفقود ہو رہی ہے۔ جو جرأت اور دینی حرارت ان کی میراث تھی وہ انھوں نے غفلت اور تعیش کے نشہ میں دوسروں کے حوالہ کردی ہے۔ یہی نہیں کہ اس مصیبت کے وقت ایک مسلمان نے مدد نہیں کی بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ کفار کی موالات و اعانت اور وفاداری کے شوق

دوران عارف باللہ حضرت مولانا محمد صدیق باندوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے تو مسجد خواجہ پیر فرینڈس کالونی میں راقم سطور نے حضرت کو سیمینار کے انعقاد کے فیصلے کی اطلاع دیتے ہوئے دعا کی درخواست کی، حضرت نے راقم کے سر پر ہاتھ رکھا اور مجموعۂ عام میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ: ''اللہ پاک اس اجتماع کو اپنے دین کے لیے قبول فرما اور منتظمین کی غیب سے امداد فرما'' سیمینار کی مجالس نے پالیسی کے طور پر طے کیا تھا کہ سیمینار میں سبھی اکابر کو پوری اہمیت اور احترام کے ساتھ مدعو کیا جائے گا، چنانچہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی دامت برکاتہم کو باقاعدہ سیمینار کا سرپرست نامزد کیا گیا تھا اور نامزدگی کے فوراً بعد ان اکابر کو اس نامزدگی کی اطلاع بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک کردی گئی تھی اسی کے ساتھ سیمینار کے دفتر سے شائع ہونے والے کتابچوں میں ان کے ناموں کی اشاعت بھی کردی گئی تھی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی، حضرت مولانا قاری عبداللہ سلیم، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی کی تائید و دعائیں ان کے گرامی ناموں سے موصول ہوئی تھیں۔ اسی طرح فضلاء دیوبند مقیمین سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور قطر کے حلقوں میں بھی سیمینار کا زبردست خیر مقدم کیا گیا تھا خاص طور پر مولانا محمد شمشاد قاسمی جدہ، مولانا جمیل الرحمٰن قاسمی ریاض، مولانا عبدالرحیم قاسمی دبئی، مولانا لئیق اللہ خاں جدہ، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز قطر، ڈاکٹر عبدالقادر خاں قطر، مولانا حفظ الرحمٰن ملک ریاض، عبدالوحید حیدرآبادی ریاض، مولانا عبدالحفیظ صدیقی جدہ اور مولانا طاہر الاسلام قاسمی مکہ مکرمہ وغیرہ کی جانب سے دعاؤں اور خیر مقدمی کلمات پر مشتمل والا نامے موصول ہوئے تھے۔

ستمبر ۱۹۹۸ء میں مجلس عاملہ کی جانب سے سیمینار کی قرارداد کی توثیق کے بعد تنظیم کے ایک چھ رکنی وفد نے جس میں ناظم تنظیم جناب مولانا آس محمد گلزار قاسمی اور ممبران مشاورتی بورڈ جناب مولانا محمد سلیمان قاسمی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی مرحوم، مولانا محمد رضوان اختر قاسمی، قاری عبدالرحمٰن عابد اور راقم سطور شامل تھے۔ اکابر کے مشوروں، دعاؤں اور اطلاع کے لیے دیوبند، سہارنپور، مغربی یوپی

میں ایک مسلمان نے دوسرے کی گردن کاٹی، بھائی کا خون پیا اور دشمنوں کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے ہی خون میں رنگے۔

"اے فرزندان اسلام! اور اے محبان ملت و وطن! آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ جس برق مسلم سوز نے ان بلاد اسلامیہ کے خرمن آزادی کو جلایا اور خلافت اسلامیہ کے قصر کو آگ لگائی اس کا اصلی ہیولا عربوں اور ہندستانیوں کے خون گرم سے تیار ہوا تھا اور جس دولت سے نصاریٰ ان ممالک مقدسہ میں کامیاب ہوئے اس کا بہت بڑا حصہ بھی تمہارے ہی دست و بازو سے کمایا ہوا تھا۔

"پس کیا اب بھی کوئی ایسا بلید اور غبی مسلمان پایا جاتا ہے جس کو نصاریٰ کے موالات و مناصرت کے نتائج قطعیہ معلوم نہ ہوئے ہوں۔ اور ایسی تشویشناک حالت میں جب کہ ڈوبتا ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے وہ اس فکر میں ہو کہ کوئی صورت موالات کے جواز کی نکالے۔

"اے میرے عزیزو! یہ وقت استحباب اور فرضیت کا نہیں بلکہ غیرت اسلامی اور حمیت دینی سے کام لینے کا ہے۔ کہیں علمائے زمانہ کا چھوٹا بڑا اختلاف تمہاری ہمتوں کو پست اور تمہارے دلوں کو پژمردہ نہ کر دے۔ میں اس وقت تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم تلوار لے کر جہاد کرو یا عراق اور شام میں جا کر اپنے بھائیوں کا ساتھ دو بلکہ محض اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ اور حق تعالیٰ شانہ کے ان ارشادات پر نہایت مستعدی اور جوانمردی اور اخلاص نیت سے عمل کرو۔

یا ایھا الذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔

(اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست اور مددگار بنائے وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔)

لایتخذ المؤمنون الکفرین اولیاء من دون المؤمنین۔ ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیٔ۔

(مسلمانوں کو نہیں پہنچتا کہ وہ مومن کے سوا کافروں کو اپنا دوست یا مددگار بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔

بشّر المنافقین بان لھم عذابا الیما الذین یتخذون الکفرین اولیاء من دون المؤمنین أیبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا۔

اور دہلی کے دینی تعلیمی مراکز کا دورہ کیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور، حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب سرپرست مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد سلمان مظاہری ناظم مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ دہلی، حضرت مولانا محمد عبداللہ مغیثی مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ نے سیمینار کے لیے از راہ تبرک وتعاون اپنی جیب خاص سے عطیات پیش فرمائے اور دعاؤں سے نوازا۔ دیوبند کے مذکورہ سفر میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم نے اپنی جیب خاص سے دوسو روپیہ کا جو عطیہ عنایت فرمایا وہ سیمینار کے لیے حاصل ہونے والا سب سے پہلا عطیہ تھا۔ اس سفر میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے شرف ملاقات حاصل نہ ہوسکا تھا۔ اکابر کے مشوروں اور دعاؤں کے ساتھ سیمینار کی تیاریاں شروع کردی گئیں اور پھر چند ہی مہینوں بعد جنوری ۱۹۹۹ء میں تنظیم کا ایک اور دورکنی وفد جس میں راقم سطور اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز شامل تھے اکابر کو تیاریوں کی اطلاع اور شرکت کی دعوت دینے کے لیے دیوبند گیا۔ سیمینار کے لیے چلائی جانے والی اس مہم کے دوران حضرت مولانا محمد اختر صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپور، حضرت مولانا محمد اسلم صاحب مہتمم مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور، حضرت مولانا محمد حنیف صاحب مہتمم مدرسہ خادم الاسلام باغوں والی، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ ناشر العلوم پانڈولی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب خانقاہ محمودیہ پانڈولی، حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب مفتی اعظم مدرسہ امینیہ دہلی، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب صدر المدرسین مدرسہ عالیہ فتحپوری، ڈاکٹر معین الدین بقائی مہتمم مدرسہ حسین بخش، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مہتمم مدرسہ بیت العلوم جعفرآباد، حضرت مولانا شعیب انجم وحضرت مولانا زبیر احمد جامعی صاحبان مہتمم مدرسہ شمس العلوم شاہدرہ، حضرت مولانا روض الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ مصباح القرآن سلیم پور نے بھی خصوصی عطیات عنایت فرمائے۔

جون ۱۹۹۹ء میں سیمینار کی مجلس علمی ومجلس انتظامی کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں

(ان منافقین کو دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ جو مومنین کے سوا کافروں کو اپنا رفیق بتاتے ہیں۔ کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں حالانکہ تمام تر عزت خدا کے لیے ہے۔)

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا الکفرین اولیاء من دون المومنین اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا۔

(اے ایمان والو! مومنین کے سوا کافروں کو اپنا یار و مددگار مت بناؤ۔ کیا تم لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا الزام صریح۔)

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذو الذین اتخذوا دینکم ھزوا ولعبامن الذین اوتو الکتب من قبلکم والکفار اولیاء واتقو اللہ ان کنتم مؤ منین۔

(اے ایمان والو! تم ان اہل کتاب اور کافروں کو اپنا یار و مددگار مت بناؤ جنھوں نے بنالیا ہے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل اور اللہ سے ڈرتے رہو تم مومن ہو۔)

تری کثیرا منھم یتولون الذین کفروا لبئس ما قدمت لھم انفسھم ان سخط اللہ علیھم وفی العذاب ھم خلدون۔ ولوکانوا یؤمنون باللہ والنبی وما انزل الیہ مااتخذوھم اولیاء ولکن کثیرا منھم فاسقون۔

(ان میں بہت سے تم ایسے دیکھو گے جو رفیق بنتے ہیں کافروں کے۔ بیشک برا ہے وہ جو آگے بھیجا ہے انھوں نے خود اپنے لیے کہ اللہ کا غضب ہے ان پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں ہیں' اور اگر یقین رکھتے وہ اللہ پر اور نبی پر اور اس پر جو نبی کی طرف اُتارا گیا تو کافروں کو رفیق نہ بناتے لیکن ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔)

لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاداللہ ورسولہ ولوکانوا اباء ھم او ابناء ھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضواعنہ۔ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔

(نہیں پاؤ گے تم کسی قوم کو جو یقین رکھتی ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر کہ وہ دوستی کرے ان سے جنھوں نے مقابلہ کیا اللہ کا اور اس کے رسول کا' اگرچہ وہ ان کے باپ بیٹے یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا اور اپنی روح سے ان کی مدد فرمائی اور ان کو داخل کرے گا باغ بہشت میں جس کے نیچے بہتی ہیں نہریں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش۔ یہ جماعت ہے خدا کی' یاد رکھو کہ خدا

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب اور حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی صاحب دامت برکاتہم نے بھی شرکت فرمائی۔ اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد سالم قاسمی ہی نے فرمائی۔ ذمہ داران تنظیم نے جب ان دونوں اکابر کو تنظیم کے اس متفقہ فیصلے کی اطلاع دی کہ سیمینار میں دیوبند کے سبھی اکابر کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب دامت برکاتہم مجلس سرپرستان میں شامل ہیں تو اس پر حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ: حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے میرا مختلف طرح کا تعلق ہے، ایک تو یہ کہ وہ میرے استاد زادے ہیں دوسرے یہ کہ وہ میری جماعت کے بزرگوں میں ہیں ان دونوں حیثیتوں سے میں ان کا غایت درجے احترام کرتا ہوں اور مجھے ان کی شرکت پر کوئی اختلاف نہیں اور پھر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ یہی موقف حضرت مولانا کا بھی ہے، حضرت نے اس کی تائید فرمائی۔

ان دونوں بزرگوں کی وسعت ظرفی سے تنظیم اور سیمینار کے ذمہ داران کو بے انتہا تقویت اور حوصلہ حاصل ہوا اور تنظیم کا ایک اعلی سطحی وفد جس میں تنظیم کے صدر حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، ناظم اعلیٰ ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی اور راقم سطور شامل تھے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم سے سیمینار کی صدارت یا افتتاح کی درخواست کرنے کے لیے بجنور حاضر ہوا، ان دنوں حضرت علالت کے سبب بجنور ہی میں قیام پذیر تھے، لیکن اسی دن اتفاق سے حضرت کی طبیعت غیر معمولی طور پر شدید خراب ہوئی اور وہ وفد کے پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے بجنور سے دہلی کے لیے روانہ ہو چکے تھے جہاں وہ بعد میں اپولو اسپتال میں داخل ہوئے۔ اسپتال میں حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی، حضرت مولانا ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، حضرت مولانا ڈاکٹر بدر الدین الحافظ کنوینر مجلس علمی (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کے قطر چلے جانے کے بعد ڈاکٹر موصوف کو مجلس علمی کا کنوینر منتخب کیا گیا تھا)، مولانا عبد الستار سلام قاسمی انچارج دفتر سیمینار اور راقم سطور نے حضرت کی عیادت کی، عیادت کرنے والوں میں راقم سطور کا نمبر سب سے بعد میں تھا، گفتگو کے دوران حضرت نے ازراہ شفقت ومحبت فرمایا کہ اب تم دیوبند کیوں نہیں آتے ہو؟ میں نے چہرے پر قدرے بشاشت دیکھ کر سیمینار کی صدارت، افتتاح یا کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی

کی جماعت ہی کامیاب ہے۔)

یا ایھاالذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاء کم من الحق۔

(اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو رفیق مت بناؤ۔ پیغام بھیجتے ہو تم ان کی طرف دوستی کا حالاں کہ وہ منکر ہوئے ہیں اس سچائی سے جو تمھارے پاس پہنچی ہے۔)

"اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں جن کا استیعاب مقصود نہیں' مگر اس قدر واضح رہے کہ اولیاء کا ترجمہ جو ہم نے دوست اور مددگار سے کیا ہے اس کا مآخذ امام بن جریر طبری اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اور امام فخر الدین رازی وغیرہم اکابر مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہماری غرض صرف اس قدر ہے کہ ترک موالات کے تحت میں جیسا کہ ان کی مدد کرنا داخل ہے اسی طرح ان سے امداد لینا بھی ہے۔ لہٰذا آپ کے سوال اول و دوم کا جواب یہ ہوگا کہ مدارس میں جو امداد گورنمنٹ سے لی جاتی ہے اور جو وظائف طلبہ وغیرہ کو ملتے ہیں وہ سب قابل ترک ہیں اور اس ترک موالات میں طلبہ اپنے والدین کی اجازت کے محتاج نہیں ہیں؟ بلکہ ان کا حق ہے کہ وہ ادب اور تہذیب کے ساتھ' اپنے والدین کو بھی ترک موالات پر مستعد بنائیں۔ اس وقت جو خلجان بعض طلبہ کو پیش آرہا ہے عہد نبوت میں بھی بعض مومنین کو پیش آیا تھا، چنانچہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں عرض کیا کہ یارسول اللہ کفار سے بالکل علاحدگی اور قطع تعلق کس طرح ہوسکتا ہے؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنے ماں باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے خویش واقارب سب سے چھوٹ جائیں گے' ہماری تجارتیں تباہ ہوجائیں گی' ہمارے اموال ضائع ہوں گے اور ہماری بستیاں اجڑ جائیں گی۔
اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمایا کہ:

قل إن کان اباء کم و ابناء کم واخوانکم و ازواجکم وعیشرتکم و اموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ واللہ لایھدی القوم الفاسقین۔

(کہہ دو کہ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کی کسادبازاری سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ سب تم کو خدا اور خدا کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو منتظر رہو تاکہ لے آئے اللہ اپنے حکم کو اور اللہ دستگیری نہیں کرتا اس قوم کی جو نافرمان

شرکت کی درخواست کی اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں اس سیمینار میں ضرور شرکت کرتا مگر ڈاکٹروں نے معمولی نقل وحرکت سے بھی منع کیا ہے چہ جائیکہ سفر کا عزم کیا جائے اور شاید یہ صورت حال اگلے دنوں تک باقی رہے گی۔ اس سے قبل حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے بھی رابطے کی مختلف کوششیں کی جا چکی تھیں جو ناکام ہوئیں۔ سیمینار سے کچھ دن قبل ذمہ داران سیمینار کا حضرت سے براہِ راست رابطہ ممکن ہوا تو حضرت نے شرکت سے معذرت فرمادی ؛

سیمینار کے افتتاحی اجلاس منعقدہ تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں جب جماعت دیوبند کے سبھی حلقوں کے اکابر واصاغر تقریباً چار ہزار کی تعداد میں جمع ہوکر بانی تحریک الامام محمد قاسم النانوتوی کو خراج عقیدت پیش کررہے تھے اور جماعتی اتحاد واتفاق کا ایک روح پرور مظاہرہ ہورہا تھا تو دل میں بار بار یہ حسرت کروٹیں لے رہی تھی کہ کاش ہماری کوششیں کامیاب ہوتیں اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم بھی کسی طرح سیمینار میں شرکت فرمالیتے تو اپنوں اور پرایوں میں کس قدر وقار بلند ہوتا۔

منصوبہ بندی ونگرانی

تنظیم کے موجودہ کارگزار صدر حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی دامت برکاتہم کی سرپرستی ونگرانی میں فضلا دیوبند پر مشتمل تنظیم کی مستقل مجلس عمل نے مجلس عاملہ کی قراردادوں کی روشنی میں سیمینار کی مکمل منصوبہ بندی اور اس کو مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھانے کا کام انجام دیا، سیمینار کے انعقاد اور اس کی کامیابی میں اس مجلس کا کردار انتہائی اہم اور کلیدی تھا اس کی دیگر ذمہ داریوں میں سیمینار کے علمی کاموں کی ترتیب وتبویب اور مراجعت، سیمینار کی مختلف مجالس کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانا، فراہمی مالیات کی سبیلیں سوچنا اور ان پر عمل پیرا ہونا، ہر طرح کے علمی وانتظامی کاموں کی نگرانی کرنا ہر ہفتہ کارکردگی کا جائزہ لینا اور آئندہ ہفتہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا شامل تھا۔ یہ مجلس دراصل تنظیم کی ایک مستقل منظور شدہ مجلس ہے جو کارگزار صدر حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی کی نگرانی میں تنظیم کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکمتِ عملی تیار کرتی ہے اور ہر ہفتہ اس کی کارکردگی کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ اس کے ارکان میں حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی کے علاوہ جناب مولانا فرید الزماں کیرانوی، مولانا بدر الزماں کیرانوی، مولانا خالد القاسمی، مولانا اسعد

ہے۔)

"کبھی دل میں یہ وسوسہ گزرتا ہے کہ خدانہ خواستہ اگر یہ تحریکات جو ملک میں پھیل رہی ہیں ناکام ہوئیں اور گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہی تو ہم کو سخت ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح کے خیالات اس زمانہ میں بھی پیش کیے گئے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ:

یقولون نخشی ان تصیبنا دائرہ۔ (یعنی منافقین کہتے ہیں کہ ہمارے دوستانہ تعلقات یہود کے ساتھ اس لیے ہیں کہ زمانہ کی گردش سے کہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے ناکامیاب رہیں اور یہود غالب آ جائیں تو اس وقت ہمارے لیے بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا)

اس کے جواب میں حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا

فعسی اللہ ان یاتی بالفتح او امر منؔ عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم نادمین۔

(تو قریب ہے کہ لے آئے اللہ فتح یا کوئی اور بات اپنے پاس سے پھر منافقین ان خیالات پر نادم ہو کر رہ جائیں جو ان کے دلوں میں مکنون ہے۔)

"پس اے عزیزو! تم اللہ پر بھروسہ کر کے اور اس کی رسی کو مضبوط تھام کر اپنے عزم پر قائم رہو اور موالات نصاریٰ کو ترک کرو اور اپنی استطاعت کے موافق جو خدمت گزاری اسلام اور اہل اسلام کی کر سکتے ہو اس سے درگزر نہ کرو۔ اب وقت درگزر کا نہیں۔

"حسنِ اتفاق سے اس وقت ہندستان کی سب سے بڑی کثیر تعداد قوم (ہنود) کا مطمحِ نظر بھی تمھاری ہمدردی اور واقعات پنجاب اور خواہش سیلف گورنمنٹ کی وجہ سے ترک موالات مع النصاریٰ ہے اور ابھی حال میں سنا گیا ہے کہ سکھ لیگ نے بھی یہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ تم اپنی نظر فقط خدا پر رکھو' تمھارا دوست اور مددگار صرف وہی ہے۔ البتہ جو قومیں تمھارے اس پاک مقصد میں خود بخود شریک ہو جائیں یا تمھاری تائید اور غم خواری کریں ان سے تم بھی مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرو اور مبرہ واقساط (مروّت اور حسنِ سلوک) سے پیش آؤ۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم۔ ان اللہ یحبّ المقسطین ط انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم و ظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظلمون۔

(اللہ ان لوگوں کے متعلق جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو

الاعظمی اور راقم سطور شامل ہیں حسب ضرورت تنظیم اور دفتر کے دیگر ذمہ داران کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

مجلس علمی و مجلس انتظامی

تنظیم نے الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ اپنی مجلس عاملہ کے دوسرے اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۹۱ء بمقام دولت کدہ حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحب) میں جناب ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی ناظم اعلیٰ تنظیم کی تحریک پر کیا تھا لیکن چونکہ اس دوران تنظیم اپنے ابتدائی اور تشکیلی مراحل سے گزر رہی تھی اور وہ اس عظیم المرتبت ذمہ داری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے تقریباً سات سال بعد ستمبر ۱۹۹۸ء میں مجلس عاملہ نے اپنی اس تجویز کی توثیق کر کے مجلس علمی وانتظامی کی تشکیل کی، سیمینار کی یہ دونوں مجلسیں ملک کی تقریباً ایک سو اہم علمی اور سماجی شخصیتوں پر مشتمل تھیں، مجلس علمی کا کنوینر معروف شاعر اور ادیب اور قطر میں تنظیم ابنائے قدیم کے صدر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کو اور مجلس استقبالیہ کا جنرل سکریٹری ملک کی معروف ادبی وسماجی شخصیت جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد (ہمالیہ ڈرگس) کو منتخب کیا گیا تھا، صدارت کے لیے دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن، امیر شریعت بہار واڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم کا انتخاب عمل میں آیا تھا، طے شدہ پالیسی کے تحت سیمینار کی تمام اہم ذمہ داریاں غیر جانب دار اور غیر مختلف فیہ شخصیات کو سپرد کی گئی تھیں تا کہ ہر حلقے کے لیے بلا تامل شرکت کا دروازہ کھلا رہے۔

فراہمی مالیات اور دیگر انتظامات

بجٹ کے خاصا بڑا ہونے اور تنظیم کے وسائل انتہائی محدود ہونے کی بنا پر مالیات کا مسئلہ سنگین صورت حال اختیار کئے ہوئے تھا، ایک موقع پر جب اس کا تذکرہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کے سامنے کیا گیا تو حضرت نے فرمایا کہ حضرت نانوتویؒ کے حوالے سے کیے جانے والے کاموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہمیشہ بے سروسامانی کی کیفیت درپیش رہتی ہے مگر وسائل کی کمی کے باعث کوئی کام رکتا بھی نہیں اس سلسلے میں حضرت نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے کچھ حیرت انگیز تجربات اور مشاہدات کا ذکر فرمایا اور ہمت دلاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ

تمھارے گھروں سے نکالا اس سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی اور منصفانہ سلوک کرو' بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ اللہ تو ان لوگوں کی دوستی سے روکتا ہے جو تم سے دین کے معاملے میں لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں مدد دی اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں وہی ظالم ہیں۔)

"اس موقع پر اس قدر تنبیہ ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان کے ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے کسی مذہبی حکم کو بدلیں اور شعارِ کفر و شرک کو اختیار کرنے لگیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نیکی برباد گناہ لازم کی مثل اپنے اوپر منطبق کریں گے۔

"میری غرض یہ ہے کہ آپ ترک موالات پر نہایت دیانت سے عمل کریں اور خالص خدا پر اپنی نظر رکھیں اور جن طلبہ سے حقوق واجبہ فوت نہ ہوتے ہوں وہ اس تحریک کی تبلیغ میں بھی حصہ لیں۔ بقدر ضرورت تعلیم دینی اور ضروریات زندگی حاصل کرنے کے بعد آج کل یہ مشغلہ نہایت سود مند ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور جن لوگوں کے ذمہ اولاد یا بیوی یا ماں، باپ کے حقوق ہوں وہ اسی حد تک اس کام میں حصہ لیں جہاں تک ان کی خبر گیری سے اغماض نہ ہو، کہ وہ بھی فرض ہے ۔اور اگر خلافت کی امداد و حفاظت میں سعی کرنے والے کو بقدر اس کی ضروریات کے خلافت کمیٹی اس چندہ میں سے جو اسی کام کے لیے کیا گیا ہو کچھ حق الخدمت دے تو اس کا لینا جائز ہے۔

"الحاصل موالات کفار حرام ہے اور جہاں تک قدرت ہو اپنے کو اور دوسروں کو موالات کفار سے علاحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنی توجہ سب سے ہٹا کر اسی رب العزت سے وابستہ کرے جس کے ہاتھ میں ہر ایک شاہ و گدا کی باگ ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بہ گذارند و سر طرہ 'یارے گیرند"

شیخ الہند نے خطبہ کے اختتامی حصہ میں فرمایا:

"اب بندہ التماس ختم کرتا ہے اور اس قدر معروض ہے کہ بندہ کوئی مفتی نہیں۔ فتویٰ لکھنا دوسرے علما کا کام ہے۔ تاہم امید ہے کہ میری معروضات سے آپ کو اپنے سوالات کا جواب مل جائے گا۔ اور علی گڑھ کالج کی عمارتوں اور کتب خانہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آپ کے دل کو دستک دے گا کہ قسطنطنیہ 'شام 'فلسطین 'اور عراق کی قیمت سے ان چیزوں کی قیمت کو کیا نسبت ہے۔

"بالکل آخر میں مجھے یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ تحریکِ ترک موالات کا موجودہ

کام کی ابتدا کریں وسائل غیب سے فراہم ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بے سروسامانی کے احساس نے بعد تک بھی پیچھا نہیں چھوڑا مگر اخراجات اور ضرورتوں کے مطابق وسائل بھی فراہم ہوتے رہے یہاں تک کہ مجلس عاملہ میں پیش کرنے کے لیے جب حسابات تیار کیے گیے تو کچھ قرض باقی تھا جو الحمد للہ بعد میں ادا ہو گیا۔

سیمینار کے لیے فراہمی مالیات کے سلسلے میں جن حضرات نے خصوصی مساعی انجام دیں ان میں حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی، جناب مولانا فرید الزماں کیرانوی، جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد، جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی (مرحوم) کے اسماء گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دامت برکاتہم اور جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی کی خصوصی توجہ اور تحریک پر افتتاحی اجلاس کے طعام اور ایک گراں قدر رقم کی فراہمی کی ذمہ داری فصیل بند شہر دہلی کے ذمہ داران نے قبول فرمائی تھی جسے انھوں نے شایان شان انجام دیا۔

سیمینار کی تیاریوں کے مختلف مراحل میں ایک سو سے زائد فضلاء گرامی اور ممبران وارکان تنظیم نے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کی تھیں جن میں خصوصیت کے ساتھ مولانا آس محمد گلزار قاسمی ومفتی عطاء الرحمٰن قاسمی دہلی نظماء تنظیم، مولانا اعجاز اللہ دہلوی استاذ مدرسہ حسین بخش، مولانا محمد سلیمان قاسمی خطیب جامع مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی (مرحوم) مہتمم مدرسہ عربیہ پنج پیران، مولانا عبد العزیز ظفر جنکپوری، جناب سید عارف میاں صاحب، قاری عبد الرحمٰن عابد، مولانا عبد القادر شمس قاسمی، مولانا انوار الوفا اعظمی، مولانا محمد انیس شاہجہانپوری، مفتی محمد ارشد فاروقی استاد مظاہر علوم وقف سہارنپور، مولانا یعقوب بلند شہری ناظم تنظیم وترقی مظاہر علوم وقف سہارنپور، مولانا سعید احمد کشمیر، مولانا محمد رضوان اختر قاسمی آفس سکریٹری تنظیم ابنائے قدیم، مولانا عبد الستار سلام قاسمی انچارج دفتر سیمینار، مولانا وارث مظہری، مولانا نوشاد عالم قاسمی آفس انچارج دفتر تنظیم، مولانا بشیر احمد قاسمی استاذ مدرسہ حسین بخش، مولانا بشیر احمد قاسمی اجراڑہ، مولانا عبد السمیع صاحب اجراڑہ، مولانا انور علی قاسمی، مولانا ذاکر الوحیدی اور مولانا ساجد علی قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں، علاوہ ازیں دار العلوم دیوبند، وقف دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ کے طلبا کی جماعتوں نے بھی اس تاریخی موقع پر رضا کارانہ خدمات کی سعادت حاصل

حالت میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیے جو نقص امن یا سفک دماء کی موجب ہو اور یہی نصیحت اس ملک کے تمام سر برآوردہ دانش مندوں کی ہے، اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا جائے ورنہ فائدہ کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

" اب میری یہ التجا ہے کہ آپ سب حضرات بارگاہ رب العزت میں نہایت صدق دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رسوا نہ کرے اور ہم کو کافروں کا تختہ مشق نہ بنائے اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائے وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين۔ وصلى الله على خير خلقه محمد واله و اصحابه اجمعين۔"

شیخ الہند نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح ادا کر کے دلی مسرت کا احساس کیا۔ ان کے خطبہ کو ہندستان کے ہر حصے میں بڑی دلچسپی اور عقیدت سے پڑھا گیا اور حکومت مخالف سرگرمیوں کے ضمن میں ایک بڑے قدم سے تعبیر کیا گیا۔ جو ترک موالات کے لیے مذہبی جواز کی حیثیت کا حامل تھا۔

جمعیۃ علما کا دوسرا اجلاس ۲۰ر نومبر ۱۹۲۰ کو دہلی میں منعقد ہوا تو اس کی صدارت کے لیے بھی شیخ الہند سے درخواست کی گئی اور شدید علالت کے باوجود انھوں نے اس میں شرکت منظور کر لی ان دنوں وہ ڈاکٹر انصاری سے اپنے علاج کی خاطر دیوبند سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے مکان پر ہی قیام فرما تھے۔ جمعیۃ کے اجلاس میں بھی ان کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔

اپنے خطبہ صدارت میں انھوں نے مقامات مقدسہ کے برطانوی قبضہ کی مذمت کی اور جزیرۂ عرب کی عظمت و تقدس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> "پس اس لیے کہ جزیرہ عرب اسلام کا اعلیٰ سرچشمہ ہے، آفتاب توحید کا مطلع ہے۔ اسلامی شوکت اور مرکز اور تعلیمات الٰہی کا مظہر ہے۔ اس میں خدا کے سب سے زیادہ مقدس اور محبوب رسولؐ کی آرام گاہ ہے۔ اس میں دنیا کا سب سے پہلا توحید کا عبادت خانہ ہے۔ اس کے ریگستان کے ذرّے صحابہ کے خون سے سیراب کیے گئے ہیں۔ اس میں اسلام کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی یادگاریں ہیں۔ ضروری ہے کہ کسی غیر طاقت اور دشمنِ اسلام سلطنت کے قبضے اور تسلط سے پاک رہے۔"

انھوں نے برطانوی حکومت کو اسلام اور ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہوئے اس کے ساتھ عدم تعاون کو لازمی ٹھہراتے ہوئے فرمایا:

کی۔

اللہ کا فضل ہے کہ اکابر کی دعاؤں اور اصاغر کی جدوجہد کے نتیجے میں سیمینار کو شاندار اور تاریخی کامیابی نصیب ہوئی۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں دہلی، نواح دہلی، مغربی و مشرقی اتر پردیش، ہریانہ، پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، بہار، بنگال، اڑیسہ، گجرات، کشمیر اور ملک کے دیگر حصوں سے تقریباً چار ہزار فضلا نے شرکت کی اور پھر مسلسل تین یوم تک جامعہ ہمدرد کے اسکالرس ہال میں مقالات کی خواندگی کی نشستیں منعقد ہوتی رہیں جن میں تین سو سے زائد علما، دانشوروں اور محققین نے پوری دلجمعی اور فعالیت کے ساتھ شرکت فرمائی سہولت کے پیش نظر مدعوئین خصوصی اور مقالہ نگاروں کے قیام وطعام کا نظم جامعہ ہمدرد ہی کے اسکالرس ہاؤس میں کیا گیا تھا البتہ اسکالر ہاؤس میں جگہ کی قلت کے باعث کچھ مہمانوں کے قیام کا نظم جناب کمال احمد فاروقی صاحب کی خصوصی عنایت سے نیو ہورائزن پبلک اسکول نظام الدین میں رکھا گیا تھا۔

اہل دہلی کا شکایت آمیز مطالبہ

سیمینار کے لیے چلائی جانے والی عوامی مہم کے دوران اہل دہلی کی جانب سے کئی مجلسوں میں یہ شکایت آمیز مطالبہ سامنے آیا کہ دہلی اہل علم اور اعلیٰ سطحی دینی تعلیمی مراکز سے خالی ہوتی جارہی ہے لہٰذا دہلی میں کام کرنے والی تنظیموں کا فرض ہے کہ وہ دہلی کو مرکز بنا کر ملک کے دیگر حصوں میں دینی ادارے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ دہلی میں بھی اعلیٰ سطحی دینی و تعلیمی مراکز قائم کریں تاکہ اس شہر کی تاریخی علمی عظمت کی بازیابی ممکن ہو سکے۔ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند سے اہل دہلی کا یہ مطالبہ اس بنیاد اور اعتماد پر تھا کہ بانی دیوبند حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی عملی و تعلیمی سرپرستی کا سہرا اسی سرزمین رجال ساز کے سر ہے، چنانچہ سیمینار کے بعد جب تنظیم اس کی قراردادوں اور سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے دہلی میں ایک اعلیٰ سطحی تعلیمی و دینی ادارے کے قیام کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا اور ۲۰۰۳ء میں عربی زبان وادب میں تخصص کے لیے "معهد التخصص في اللغة العربية" کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی یہ ادارہ دراصل ایک طویل المدت اور وسیع تعلیمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا قدم ہے اگر اس ادارے کو عوام وخواص کی سرپرستی حاصل رہی تو منصوبے کے تحت تفسیر، حدیث، قضا، تربیت معلمین اور انگریزی وغیرہ میں بھی تخصص کے شعبے قائم

"مسلمانوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک برطانیہ کے وزرا اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں اس وقت تک تمام ہندستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہنچے اور ان کے نشۂ غرور تکبر کو تیز کرے۔ مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ وہ دشمنِ اسلام کو دشمن کے مرتبے میں رکھیں اور ایسے تعلقات کو جو میل جول اور دوستی اور محبت پیدا کرنے والے ہیں ایک دم چھوڑ دیں۔"

ہندستانی مسلمانوں کو ان کی اہمیت کا احساس کرانے کی غرض سے شیخ الہند نے کہا:

"آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد چالیس کروڑ ہے جس میں صرف ہندستان میں سات ساڑھے سات کروڑ آباد ہیں۔ اگر یہ سب متفقہ طور پر اسلامی خدمت کے لیے صبر و استقامت کی ڈھال لے کر کھڑے ہو جائیں تو کیا کوئی طاقت ہے جو توحید کی بجلی پر غالب آجائے۔"

شیخ الہند نے ہندو مسلم اتحاد کو تحریک ترک موالات کے لیے لازمی قرار دیا اور تحریک خلافت میں اہل ہنود کی شمولیت کو احسان مندی سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

"برادران وطن نے ہماری اس مصیبت میں جس قدر تمہارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کر رہے ہیں وہ اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام احسان کا بدلہ احسان قرار دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دے دیں۔ کسی دوسرے کی اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے۔ پس آپ برادران وطن کے احسان کے بدلے میں وہی کام کر سکتے ہیں جو شریفانہ طور پر اسے اپنے اختیارات سے کر سکتے ہیں۔"

جمیعتہ علماء کے اجلاس کے آخری دن اپنے آخری تحریری بیان میں شیخ الہند نے فرمایا:

"مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی روح (جماعت علماء) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جن میں وہ بالکل مردہ سمجھے جا چکے تھے اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتے تو اسلام کی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم و دین اگر اب بھی عالم اسلامی کے خوفناک

کیے جائیں گے اور پھر انھیں ایک جامعہ کے تحت لے آیا جائے گا انشاء اللہ

مقالات کا مجموعہ

حضرت نانوتویؒ کی حیات وخدمات پر اگرچہ وقتاً فوقتاً اہل علم کی کچھ انفرادی کاوشیں منظر عام پر آتی رہی ہیں مگر الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار دیوبند کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا جب فرزندان وخوشہ چینان دیوبند نے اس عظیم پیمانے پر اپنے محسن اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کے افکار وخدمات پر بیش بہا کاوشیں اور تحریریں اجتماعی طور پر سامنے لانے کی سعی کی۔ مقالات کا پیش نظر مجموعہ انھیں کاوشوں اور تحریروں کا مرقع ہے جو انشاء اللہ العزیز حضرت الامام کی حیات افکار اور خدمات کے احیاء وتذکیر کا سبب اور چراغ باز روغن دادہ کا مصداق ثابت ہوگا۔

حضرت الامام کے افکار ومعارف پر کوئی مضمون لکھنا دراصل ایک ایسی چٹان سے ہیرا نکالنے کے مترادف ہے جس میں ہیروں کے زبردست ذخائر موجود ہوں لیکن اس کے عمق تک رسائی کے لیے تیشۂ فرہاد کی ضرورت ہو اس کا اندازہ مقالوں کی تدوین کے دوران مقالہ نگاروں کی جبینان عرق عرق کو دیکھ کر بار بار کیا جارہا تھا اس سیمینار کے لیے جن محققین نے مقالہ نگاری کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ جوئے شیر لانے کے مترادف اور ان کے پایۂ علم وتحقیق کی مضبوطی اور بلندی کی دلیل ہے۔

سیمینار کے لیے تیار کی گئی عنوانات کی فہرست میں کچھ عنوانات ایسے ہیں جن پر مقالات نہیں لکھے جاسکے ہیں اس میں زیادہ تر تو مذکورہ دشواری ہی کو دخل ہے لیکن بعض مقالے اس دوران مفوض الیہ شخصیات کی غیر معمولی اور ہنگامی مصروفیتوں کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ طے کیا گیا تھا کہ سیمینار کے بعد ہی سہی ان عنوانات پر مقالے لکھوا کر مجموعے میں ایک خصوصی گوشے کی حیثیت سے شامل کردیے جائیں گے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہوسکا اب یہ عنوانات کھلے طور پر اہل علم وتحقیق کی خدمت میں پیش ہیں اگر کوئی صاحب ان پر خامہ فرسائی کرنا چاہیں تو دفتر تنظیم سے طلب فرما کر سعی فرماسکتے ہیں، اشاعت کے لیے ماہنامہ ترجمان دارالعلوم کے صفحات میں بھی ان کا خیر مقدم ہے اور مجموعے کی اگلی اشاعتوں میں بھی شامل اشاعت کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے چونکہ اب لکھنے والوں کے لیے وقت کی قلت وتحدید مانع نہ ہوگی اس لیے ان موضوعات پر اعلیٰ تحقیقات سامنے آسکتی ہیں۔

مصائب سے آنکھیں بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرت ایمانی اور شرافت انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کیئے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔۔۔

"اور اب بھی اگر ہم تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعت کی گرمی محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہو گئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہو گی جو اکسیر شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا ہے لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔

"اب ہم سب کو مل کر متوکلاً علی اللہ ان تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہیے جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت و آبرو اور ہمارے وطن اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہو گا جس کو ہم جان بوجھ کر اپنے ہاتھوں سے کھو دیں گے۔"

شیخ الہند نے اپنے اس آخری تحریری بیان میں ہندو مسلم اتحاد پر اصرار کیا۔ اس ضمن میں آپ نے فرمایا:

"کچھ شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہو گی تو وہ ہندستان کی آزادی کو ناممکن بنا دے گی اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا اس لیے ہندستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے

سیمینار میں مقالات کی خواندگی کا سلسلہ اگرچہ محققین و منتظمین کی پوری فعالیت اور جفاکشی کے ساتھ تین دن تک جاری رہا لیکن پھر بھی تمام مقالوں کی خواندگی ممکن نہ ہوسکی جن اہل قلم کے مقالات سیمینار میں نہیں پڑھوائے جاسکے ان میں اہم شخصیات شامل ہیں ان مقالات میں سے کچھ تو شامل اشاعت ہیں لیکن کچھ کو مجموعے کی طوالت یا کسی اور اہم مجبوری کے تحت شامل اشاعت نہیں کیا جارہا ہے ہم اس زمرے کے تمام اہل قلم کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں **والعذر عند کرام الناس مقبول۔**

دارالعلوم دیوبند حضرت الامام کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے ذکر کے بغیر ان کی خدمات کا تذکرہ ناقص اور ادھورا ہے لیکن یہ ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی گہرائیوں اور وسعتوں کو ناپنے کے لیے خود ایک مستقل سیمینار بلکہ سیمیناروں کی ضرورت ہے اس لیے مجلس علمی نے حضرت الامام کی خدمات کے اس پہلو کو کم چھوا ہے بلکہ اپنی زیادہ تر توجہ ان کی شخصیت اور افکار پر مرکوز کی ہے۔

مجموعے میں شامل مقالات جہاں حضرت الامام کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہیں وہیں ہمارے لیے فکر وعمل کے نئے گوشے اور مجالات بھی واشگاف کرتے ہیں دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس مجموعے کو قبول عام عطا فرمائے اور ہم سب کو اس سے بیش از بیش استفادے کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

☆☆☆

شکست کر سکے گی۔"

شیخ الہند کی یہ آخری تحریر و تقریر تھی جو انھوں نے ترک موالات کی حمایت میں جمعیتہ علماء کے دوسرے اجلاس کے آخری دن دہلی میں پیش کی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد شدید علالت کے سبب ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے صرف ایک ماہ بعد اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کے جسدِ خاکی کو دہلی سے دیوبند لے جایا گیا اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے الفاظ میں چاشت کے وقت صبح کے نو بجے

"قدوۃ المواصلین" امام المحدثین والعارفین، قطب عالم علوم و کمالات، بطلِ حریت، آزاد کنندۂ ہندوستان، حاتم دوراں، بخاریٔ زماں، کوہ وقار حلم، آفتاب معرفت وعلوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ، خزینۂ احادیث و سننِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لحد میں اتارا گیا اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لیے نظروں سے چھپا دیا گیا"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی تدفین میں شریک تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اشکبار ہوتے ہوئے فرمایا: "حضرت شیخ الہند کی موت نے ہماری کمر توڑ دی"۔!!

پیغامات

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں

۱۸۶۸ء تا ۱۹۲۷ء

محمد جمل نے ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۲ر فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں یونانی اطبا کے ایک ممتاز خانوادے میں آنکھ کھولی۔ ان کا سلسلۂ نسب تاشقند کی عظیم المرتبت روحانی شخصیت نصیر الدین خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے ملتا ہے' جن کے تئیں تیمور کے جانشین بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان میں بابر کے والد عمر شیخ مرزا خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔

اپنی پارسائی اور خدا ترسی کے علاوہ خواجہ احرار کے قابلِ احترام ہونے کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کا سلسلۂ نسب اولین دو خلفائے اسلام تک پہنچتا ہے۔ والد کی جانب سے ان کا شجرۂ نسب خلیفہ' اول حضرت ابو بکر صدیقؓ اور والدہ کی طرف سے خلیفہ دوم حضرت عمر ابن خطابؓ سے ملتا ہے۔ اپنی خود نوشت میں بابر نے لکھا ہے کہ اس کے والد خواجہ احرار سے بیعت تھے اور یہ کہ خواجہ صاحب اکثر اپنی تشریف آوری سے اس کے گھر کو عزت بخشتے تھے۔ وہ عمر مرزا سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اسے اپنا بیٹا کہا کرتے تھے اور خواجہ احرار ہی نے بابر کو ظہیر الدین محمد بابر کے نام سے سر فراز کیا تھا۔ بعد ازاں خواجہ عبید اللہ احرار کے بیٹے' جو سمر قند میں سکونت پذیر تھے بابر کے شریکِ سفر ہو کر مغرب کی جانب رخ کر کے ہندستان پہنچے جہاں بابر نے ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح خواجہ احرار کے جانشینوں نے ہندستان میں وارد ہو کر ہندستان اور وسط ایشیا کے درمیان ثقافتی' سماجی اور اقتصادی مبادلوں کے سلسلوں میں قابل قدر کردار ادا کیا۔

شاہانِ مغلیہ کا یہی وہ ممتاز خاندان تھا جس نے بعد کے ادوار میں بہت سے نامور طبیبوں کو پیدا کیا۔ ان میں سے حکیم فاضل خاں نے مغلیہ سلطنت کے پانچویں وارث شاہجہاں کے آخری ایّام میں سب سے پہلے فن طب کو ایک پیشہ کی شکل میں اختیار کیا۔ ان کے بعد ماہرین طب کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو گیا جن کی سرپرستی میں یونانی طرز طب نے ایک مکمل سائنس کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان میں سے حکیم اکمل خاں اور ان کے بھائی حکیم اجمل خاں تھے اول کو شاہانِ وقت کی جانب سے جاگیریں اور منصب بھی عطا کیے گئے تھے۔ حکیم اکمل خاں کو 'اکمل المحققین الملک' کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ علم طب کے میدان میں اس خاندان کی

شہرت حکیم شریف خاں (۱۲۲۲ھ۔۱۳۸ھ) اور ان کے بیٹے حکیم اکمل خاں کے ہاتھوں پایۂ عروج کو پہنچی جنھیں مغل بادشاہ شاہ عالم دوم نے دہلی کے مغلیہ دربار کی خدمات کے صلے میں پانی پت اور ڈاسنہ میں جاگیریں عطا کیں اور "اشرف الحکماء" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ انھوں نے علم طب پر بے شمار رسالے قلمبند کیے اور منطق، حدیث اور تاریخ پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اور فارسی اور اردو زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا تھا اس کے ساتھ "تحفۂ عالم شاہی" یا "خواص الجواہر" نامی اپنی تصنیف کو بادشاہ وقت شاہ عالم دوم کے نام سے معنون کیا تھا۔ انھیں علم طب کا مسلم الثبوت ماہر تسلیم کیا جاتا ہے جن سے اُس دور کے تمام طبیب مشورے کیا کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں حکیم شریف خاں پر تحسین و تعریف کی بارش کرتے ہوئے ان کا موازنہ ارسطو اور جالینوس جیسی عظیم شخصیتوں کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی رہائش گاہ کو شریف منزل کے نام سے پکارا جاتا ہے جو آج بھی دہلی کے مشہور علاقے بلیماران میں واقع ہے اور یہیں اجمل خاں کی پیدائش ہوئی۔

حکیم شریف خاں کے چوتھے بیٹے حکیم صادق علی خاں نے طبیب کی حیثیت سے ان کی جانشینی کا شرف حاصل کیا اور اسی برس کی عمر میں ۱۲۶۴ھ میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ حکیم صادق علی کے منجھلے بیٹے حکیم غلام محمود خاں بڑے شہرت یافتہ طبیب تھے۔ ان کے مطب میں ہندستان اور مغربی ایشیا کے مختلف گوشوں سے آنے والے مریضوں کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ وہ بڑے فیاض اور بہت رحمدل انسان تھے۔ اگرچہ وہ کئی والیانِ ریاست کے درباروں سے وابستہ رہے تاہم انھوں نے کبھی غریبوں سے پہلو تہی نہیں کی۔ دراصل حکیم محمود خاں کے سر اس حقیقت کا سہرا ہے کہ انھوں نے یونانی نظام طب کو شاہی درباروں کی سرپرستی کے حصار سے باہر نکال کر عوام الناس میں عام کیا اور اسے ایک جمہوری شکل عطا کی۔ انھوں نے دہلی کے لال قلعہ سے تعلقات منقطع کرکے اپنے فن کو غریبوں کے لیے وقف کردیا۔ وہ اکثر و بیشتر غریبوں کے گھروں پر مریضوں کا معائنہ کرنے کی غرض سے جایا کرتے تھے مگر انھوں نے نہ تو کبھی ان سے فیس طلب کی اور نہ ہی دواؤں کی قیمت وصول کی۔ انھوں نے ۱۳۰۹ھ میں بہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔

اجمل خاں حکیم محمود خاں کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے مراحل گھر پر ہی طے کیے۔ اور سولہ برس کی کم عمر میں تین سال کی مختصر سی مدت میں قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ انھوں نے درس نظامی اور اسلامی روایتی تعلیم کا حصول نسبتاً اور بھی کم عمری میں کیا تھا۔ ان کی تعلیمی استعداد کا سلسلہ فارسی، عربی، قواعد، منطق،

پیغامات

مولانا محمد رابع الحسنی الندوی *

آج سے ڈیڑھ صدی قبل علماء حق نے برصغیر ہند میں استعماری نظام کے ملحدانہ وکافرانہ اثر کو روکنے اور دین کی حفاظت وبقا کے لئے جو کوششیں کیں ان میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا کام و مقام سرفہرست آتا ہے، انہوں نے اور ان کے رفقاء نے علوم دینیہ کی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی دینی شخصیت سازی کے لئے موثر نظام تعلیم چلایا، جس نے دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ ملک میں غیر معمولی اثر ڈالا، اس برصغیر میں غیر ملکی اور استعماری حکومت نے اسلام کی بقاء کے لئے جو رکاوٹیں کھڑی کردی تھی اور اپنی استعماری مصلحت کے لحاظ سے جو نظام ونصاب تعلیم جاری کیا تھا، اس کے اثرات کو روکنے میں اس ادارہ نے اور اس کے ہم مقصد دیگر اداروں نے بڑا کام انجام دیا، پھر اس عظیم کام کو علماء دین واخیار امت کی جو جماعت ملی اس نے نہ صرف یہ کہ مذہبی عقائد واقدار، شریعت اسلامی سے پختہ واقفیت اور علوم اسلامیہ سے مکمل شناسائی کا عظیم کام انجام دیا بلکہ امت کے لیے دین وتعلیمات دین سے پختہ واقف کاروں کی ایک تعداد تیار کردی، جس نے امت کی دینی وشرعی ضرورتوں کو پورا کیا اور امت کی دینی سرپرستی اس طرح کی کہ دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ رہا اور اس کی حفاظت کے لیے افراد برابر تیار ہوتے رہے۔

یہ ایک زبردست کارنامہ تھا جس میں برصغیر کے مسلمان دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلہ میں ممتاز ثابت ہوئے اور ان کا مفید اثر نہ صرف برصغیر کی ملت اسلامیہ پر پڑا بلکہ قرب وجوار کے دیگر ملکوں کے افراد ملت پر بھی پڑا، ہمارے یہ علمائے کرام جو اس عظیم دینی تعلیمی مرکز اور اسی قبیل کے دیگر دینی تعلیمی مرکزوں سے تیار ہوکر نکلتے رہے، علوم اسلامیہ سے واقفیت کے ساتھ علی العموم اخلاص لدین اللہ اور رضائے الٰہی کی طلب سے پورے طور پر متصف رہے۔ اُن کے اخلاص ودینداری نے امت اسلامیہ کے اخلاق وکردار کو سنوارنے اور بنانے میں بڑی مدد کی۔

آپ کا یہ سیمینار انشاء اللہ علوم اسلامیہ کے اس زعیم اور حفاظت دین کے انتظام کے اس

* ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

طبیعیات' ادب' نجوم' ریاضی اور فلسفہ تک وسیع تھا جن پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ وہ روانی کے ساتھ عربی اور فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ بعد کے ادوار میں یورپ کے سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر انھوں نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھی تھی۔

اگرچہ اطبا اپنی بد خطی اور نا قابل مطالعہ تحریر کے لیے بدنام ہوتے ہیں تاہم اجمل خاں خوش خطی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ انھیں جسمانی ورزش سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اپنے آپ کو جسمانی طور سے توانا رکھنے کی غرض سے وہ بلاناغہ اکھاڑے میں کسرت کرتے تھے۔ انھیں بلیرڈ سے بھی رغبت تھی۔ طب کی تعلیم کا حصول اجمل خاں نے اپنے والد حکیم محمود خاں کی نگرانی میں کیا لیکن اس فن میں مہارت انھیں اپنے بھائیوں یعنی حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں کی تربیت سے حاصل ہوئی۔ وہ ایک انتہائی کامیاب مطب قائم کرنے کے سلسلے میں ان ہی کے مرہون منت تھے۔

۱۸۸۴ء میں اجمل خاں کی شادی اپنے چچا حکیم غلام اللہ کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی جن کے بطن سے ان کی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ان کے فرزند حکیم جمیل خاں نے اپنے جدی پیشے کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس میں اہم اضافے بھی کیے۔

اپنے والد اور باکمال پیش رو حکیم محمود خاں اور بھائی حکیم عبدالمجید خاں کے نقش قدم پر گامزن ہو کر حکیم اجمل خاں نے بھی دربار رام پور سے نہ صرف اپنے تعلقات استوار رکھے بلکہ ۱۸۹۲ء میں وہ والیِ رام پور نواب حامد علی خاں کے طبیب خاص مقرر ہوئے اور اس منصب پر ایک دہائی سے ذرا کم مدت تک فائز رہے۔ رام پور میں اپنے قیام کے دوران انھیں بہت سے قومی رہنماؤں سے روابط قائم کرنے کے مواقع فراہم ہوئے جو مختلف امور کے سلسلے میں نواب صاحب سے مالی اعانت کے حصول کی خاطر رام پور کا رخ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے نواب محسن الملک کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کیے جو سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ ان تعلقات نے انھیں بھی کالج کے معاملات میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا اور بہت سے والیان ریاست سے کالج کے لیے عطیات حاصل کرنے کا سبب بنایا۔ بعد ازاں ۱۹۰۰ء میں انھیں کالج کا ٹرسٹی بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون کے آغاز اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام تک وہ اس کے ٹرسٹی بنے رہے۔

حکیم صاحب نے نواب صاحب کے کتب خانہ میں موجود تقریباً اٹھارہ ہزار نادر و نایاب مخطوطوں اور مختلف موضوعات پر تقریباً تیرہ ہزار کتابوں سے استفادہ کیا اور انھیں باقاعدگی اور خوش سلیقگی سے ترتیب دیا اور مضمون وار ان کی درجہ بندی کر کے اپنی مرتبہ فہرست پر

رہنما کے مقام کو یاد دلانے اور اس کے احسان کو سراہنے اور قدر کرنے کا فریضہ انجام دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے اور اس کو امت کے سامنے ایک اعلیٰ نمونہ کے تعارف و تذکیر کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

مولانا عبداللہ سورتی کاپودروی*

امام محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں سیمینار کی تجویز سے بے حد مسرت ہوئی، ابنائے قدیم دارالعلوم کو یہ سیمینار بہت پہلے منعقد کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال اب بھی یہ سیمینار صحیح ڈھنگ سے کام کر کے پختہ عزم کے ساتھ ہو تو انشاء اللہ امت اسلامیہ کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بہت کچھ پیغام مل سکتا ہے۔

فتنۂ اکبری کے دفاع کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے فرزندانِ گرامی کو منتخب فرمایا تھا جنہوں نے اکبر کے ارتدادی فتنہ کا قلع قمع کر کے توحید و سنت کا احیاء فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے امت کی حفاظت فرمائی۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کے بعد امت اسلامیہ ہندیہ جس طوفان میں پھنس گئی تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے رفقاء خصوصی حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ذریعہ امت کی حفاظت کا سامان فرمایا۔

ہمارے ان بزرگوں نے سیاسی، علمی اور اصلاحی میدان میں وہ عظیم کارنامے انجام دئے جس نے امت اسلامیہ کو حیاتِ نو بخشی اور اعداء دین کو ناکامی نصیب ہوئی۔ جزاھم اللہ عن جمیع المسلمین خیر الجزا.

۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں پھر ایک تبدیلی آئی ہے اور آزادی کے ان پچاس سالوں میں جو احوال سامنے آرہے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے تلامذہ نے جس للّٰہیت، قربانی اور دینی حمیت کے ذریعہ اسلام اور امت اسلامیہ کو بچایا تھا ان کے نام لیوا اسی دینی حمیت اور اخلاص و للّٰہیت سے میدان میں آئیں اور طوفان کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم ذمہ داری ابنائے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی مسلک کے

* ٹورنٹو، کناڈا

ایک مبسوط تعارفی مضمون بھی قلمبند کیا۔

۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں کی وفات کے بعد افسر الاطباء کے عہدے اور نواب صاحب کے ذاتی معالج کے منصب سے دست کش ہو کر رامپور کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور دوسرے بھائی حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد ان کے جانشین اور فنِ طب یونانی کے تنہا وارث کی حیثیت سے دہلی میں اپنا شاندار مطب قائم کیا۔ وہ اپنے مطب میں مریضوں سے کسی قسم کی کوئی فیس قبول نہیں کرتے تھے مگر جب دہلی سے باہر جاتے تھے تو فیس کے طور پر ایک ہزار روپے یومیہ وصول کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت کے والیانِ ریاست اور ہندستانی سماج کے اعلا طبقے کے افراد ہی دہلی سے باہر ان کے علاج کے متحمل ہوتے تھے تاہم دہلی کے باہر بھی وہ غریبوں سے کوئی فیس قبول نہیں کرتے تھے۔ ویسے وہ اپنی پوری آمدنی طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نذر کر دیا کرتے تھے۔

حکیم اجمل خاں اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ غالباً دربار رام پور سے ان کی وابستگی اور اسد اللہ خاں غالب کی ہمسائگی نے انھیں وقت گزاری اور مشغلہ کے طور پر شعر گوئی کی جانب مائل کیا ہوگا۔ اُن کی فارسی غزلوں پر حافظ اور بیدل کا اثر ہے جبکہ ان کی اردو شاعری داغ اور حالی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ تاہم انھوں نے کبھی کسی مشاعرے میں اپنا کلام نہیں سنایا اور اسے محض اپنے قریبی احباب کے حلقے تک ہی محدود رکھا۔

حکیم اجمل خاں کا مجموعہ کلام "دیوانِ شیدا" کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے برلن سے شائع کیا تھا۔ اس پر قاضی محمد عبدالغفار کا پیش لفظ تھا اور اسے عبدالمجید خواجہ اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ کے نام منسوب کیا گیا تھا۔ بعد ازاں اس دیوان کی اشاعت دہلی میں بھی عمل میں آئی۔

حکیم محمود خاں اور ان کے فرزند حکیم عبدالمجید خاں نے یونانی طب کے طریقہ تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کی غرض سے ۱۸۸۳ء میں ایک مدرسۂ طبیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس ادارے کے مقاصد میں طب یونانی کے طریقہ تعلیم کی تجدید، مفت تعلیم کا انتظام، غیر تربیت یافتہ طبیبوں سے نجات اور ملک کے لوگوں کو طبی امداد کی فراہمی کے لیے ہر سال یونانی اطباء کی تربیت شامل تھی۔ ۱۹۰۱ء میں حکیم عبدالمجید خاں کی وفات کے بعد طبیہ اسکول کو قائم رکھنے کی ذمہ داری حکیم محمود خاں کے منجھلے بیٹے حکیم واصل خاں اور چھوٹے بیٹے حکیم اجمل خاں کے کاندھوں پر آ گئی۔ انھوں نے لوگوں سے اسکول کے لیے ایک لاکھ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی اور مجلۂ طبیہ نامی ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جس میں اسکول سے متعلق خبریں اور مضامین کی اشاعت عمل میں آتی تھی۔ اسی طرح اسکول کے مستقبل کو محفوظ کر دینے کی غرض سے

اداروں کے فضلاء پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے نقوش کی پیروی کریں پوری بصیرت، بلند ہمتی اور اتفاق واتحاد کے ساتھ جدید فتنوں کا مقابلہ کریں۔

فضلاء مدارس عربیہ اسلامیہ میں اپنے اسلاف کی روح پھونکنے کے لیے اس طرح کے سیمینار نیز ان بزرگوں کی سیرت وسوانح کی نشر واشاعت بہت ہی کارگر ثابت ہوسکتی ہے۔

امید ہے کہ اس سیمینار کے ذریعہ ہمارے اسلاف کا پیغام ہندوستان کے ہر ضلع اور ہر گاؤں میں پہنچے گا۔

ابنائے دارالعلوم کا فرض ہے کہ وہ موجودہ خطرناک موڑ پر اختلاف کو ختم کر کے امت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔توحید وسنت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مضبوط وابستگی کے ذریعہ ہی امت صحیح اسلامی زندگی گذار سکے گی۔

امام محمد قاسم نانوتویؒ نے جس طرح مختلف میدانوں میں مجتہدانہ ومجاہدانہ کارنامے انجام دیے ہیں۔اس کو نشان راہ بنا کر چلنے میں ہی ہماری کامیابی ہے۔

ابنائے دارالعلوم دیوبند کو تعلیم اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے نیز امت میں اتحاد اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔چھوٹے چھوٹے مسائل کو اہمیت دے کر اختلافات پیدا کرنا شدید نقصان کا باعث ہے۔اس لیے ابنائے دارالعلوم ایک دوسرے کو قریب کرنے اور پچھلی تلخیوں کو فراموش کرنے کی مخلصانہ جدوجہد فرماویں تو انشاءاللہ وہ ایک مضبوط قوت ثابت ہوں گے۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی*

مجھے افسوس ہے کہ میں خاندانِ قاسم نادر اور اللہ کرے تاریخ ساز تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں کر پا رہا ہوں۔لیکن دعا گو ہوں کہ حضرت بانی دارالعلوم کے نام پر ہونے والا یہ سیمینار اپنے بہترین مقاصد میں کامیاب ہو۔بہترین مقاصد کا تعین تو آپ اور آپ کے رفقائے کار فضلا ہی بہتر طور پر کر سکتے تھے۔اور یقین ہے کہ کیا ہوگا ایک خواہش مجھ دور افتادہ کے ذہن میں بھی ہے کہ اس موقع پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات، افکار اور کارناموں کے حوالے سے پیش کیا جانے والا مطالعہ فرزندانِ قاسمیہ کے دلوں میں بھی اس طرح کی اجتہادی فکر وبصیرت کا چراغ اپنے زمانے کی ضرورت

* مقیم حال لندن

انھوں نے ایک انڈین میڈیسنز کمپنی بھی قائم کی جس کی تمام تر آمدنی ادارے کی ضروریات کی تکمیل پر صرف ہوتی تھی۔

۱۹۰۴ء میں حکیم واصل خاں کی وفات کے بعد طبیہ اسکول کی ذمہ داری پوری طرح حکیم اجمل خاں پر آگئی۔ انھوں نے انڈین میڈیسنز کمپنی کے تمام حصص اسکول کے نام پر خرید کر کمپنی کو تحلیل کر دیا اور ہندستانی دواخانہ کے نام سے اس کا از سر نو آغاز کر کے اس کی پوری آمدنی کو طبیہ اسکول کی کفالت کے لیے وقف کر دیا۔ یہ دواخانہ آج بھی بلیماران میں دلی ایڈ منسٹریشن کے زیر انتظام کارکردگی میں مصروف ہے بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں انھوں نے اسکول اور دواخانہ دونوں ہی کو انجمن طبیہ نامی ایک انجمن کی نگرانی میں دے دیا جسے ۱۸۶۰ء کے ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت قائم کیا گیا تھا پھر اس انجمن کو ایک بورڈ آف ٹرسٹیز میں منتقل کر دیا۔ دراصل حکیم اجمل خاں کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اول تو وہ طبیہ اسکول کی مالی بنیادوں کو مستحکم کر کے اسے ایک ایسے مستقل کالج کی حیثیت عطا کرنا چاہتے تھے جس میں جدید سائنسی تحقیقات کی تمام تر سہولیات مہیا ہوں۔ دوئم وہ دیسی طبوں یعنی یونانی اور آیورویدک نظام طب کو جدید بنانے کی غرض سے ایک منظم تحریک کا آغاز کر کے ہندستان کے تمام طبیبوں اور ویدوں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دیسی طب زبوں حالی کا شکار ہو کر اپنا وقار کھو چکی تھی کیونکہ کسی طبیب نے اسے باقاعدگی اور عقلیت سے ہمکنار کرنے کی جانب متوجہ ہونے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ مطب کرنے والے طبیب قدیم روایتی طریقوں سے اس درجہ چمٹے ہوئے تھے کہ انھوں نے اس میدان میں ہونے والی جدید اختراعات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ غرضیکہ دیسی طریقہ علاج کو جمود سے نجات دلا کر اسے خامیوں سے پاک کر کے انگریزی طریقہ علاج کے مساوی درجہ سے ہمکنار کرنے کی غرض سے حکیم اجمل خاں نے یونانی، آیورویدک اور مغربی یعنی تینوں طریقہ ہائے علاج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندستانی طریقہ طب کے تئیں ان کی بے مثال خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے جنوری ۱۹۰۸ء میں انھیں حاذق الملک کے خطاب سے نواز کر ان کی عزت افزائی کی۔ انھوں نے طبیہ اسکول کی توسیع کے طور پر ایک نسوانی دایہ گری کا اسکول اور ہسپتال بھی قائم کیا۔

۱۹۱۰ء میں یونانی طریقہ علاج کو مقبول بنانے کے اِن اقدامات سے برافروختہ ہو کر بمبئی میڈیکل ایسوسی ایشن نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سبھی دیسی طبوں پر قانونی طور سے پابندی عائد کر دے جو اس کی نظر میں باضابطہ نہیں تھیں۔ حکومت نے اس اشتعال انگیز مطالبہ

کے مطابق روشن کردے جس طرح کی مجتہدانہ فکرو بصیرت حضرت مرحوم کے عملی کاموں اور آپ کے خزانہ علوم و معارف سے ٹپکتی ہے۔ دقائق اور مسائل کے بیان اور اثبات کے لیے جو طرز کلام اور نہج استدلال آپ نے اپنایا اس کے اچھوتے پن میں کسے کلام ہوگا؟ تاہم ہمارے زمانے کو اپنے مزاج کے مطابق طرز کلام اور منہج استدلال اپنانے کی ضرورت ہے۔

مولانا یعقوب اسمٰعیل منشی القاسمی*

انگریزی استعمار و استبداد نے جب برصغیر ہند میں اپنے پنجے مضبوط گاڑ لیے اور اپنی قوت و اقتدار کے بل پر برصغیر ہند کے مسلمانون کے اسلام و ایمان پر علمی و فکری اور عملی میدانوں میں مختلف نوعیت سے ڈاکہ ڈالنے کی سازشیں شروع کردیں مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور عوام و علماء کا باہمی رشتہ ختم کرنے کے لیے برصغیر ہند کے ہزاروں مقتدر علماء کرام کو تختۂ دار پر لٹکا دیا تو اس وقت علماء کرام نے اسلام و ایمان کی خاطر اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے۔

ایسے خطرناک دور میں برصغیر ہند کے مسلمانوں اور ان کی نسلوں کے اسلام و ایمان کی حفاظت و بقا امام الطائفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی کوششوں کی مرہون منت ہے، اور ان کوششوں کی ایک مضبوط اور دائمی کڑی ''دارالعلوم دیوبند'' ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے مقام کے بارے میں ان کے پیر و مرشد سید الطائفہ امام طریقت و معرفت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی شہادت کافی ہے: فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ شانہ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لے کر آئے؟ تو مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو پیش کردوں گا۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے بانی دارالعلوم کی حیاتِ طیبہ اور خدماتِ جلیلہ پر ہونے والے سیمینار میں استفادے کی غرض سے حاضری کی دعوت راقم کے لیے باعث سعادت ہے۔

راقم آپ بزرگوں کی دعوت و قدردانی کا مشکور ہے ''جزاکم اللہ خیرا'' اور دل سے دعا گو ہے کہ اللہ جل شانہ آپ حضرات کی مساعی جلیلہ کو قبول فرمائے اور سیمینار کو امت مسلمہ کے لیے بالخصوص فرزندانِ دارالعلوم کے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ آمین۔☆

---

* رئیس مجلس تحقیقات شرعیہ، برطانیہ

کے پیش نظر ۱۹۱۱ء میں طبیبوں کے رجسٹریشن کے لیے بمبئی کی مجلس قانون ساز میں ایک بل پیش کیا۔ یہ بل ان تمام طبیبوں اور ویدوں کی موت کا پروانہ تھا جو طویل مدت سے مطب کررہے تھے اور ہندوستان کی تقریباً اسی فیصد آبادی کی خدمت میں مصروف تھے۔ اس بل نے بے شمار ایسے ہونہار نوجوانوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جو مستقبل میں پیشہ طب کو اختیار کرنے کے خواہش مند تھے۔ حکیم اجمل خاں نے حکومت کے اس منفی اقدام پر فوری رد عمل کا اظہار کیا اور بل کی مخالفت میں رائے عامہ ہموار کرتے ہوئے حکومت بمبئی کے خلاف ایک آئینی جنگ کا اعلان کر دیا اس کے نتیجے میں کونسل میں ہندوستانی اراکین نے بل کی زبردست مخالفت کی اور دیسی طریقہ علاج کے سلسلے میں حکومت کے منفی رویہ کی شدید مذمت کی لیکن بمبئی کی مجلس قانون ساز نے حکیم صاحب یا طبی کانفرنس کی کسی بھی تجویز کو قبول کیے بغیر بل کو منظوری دے کر اسے قانون کی شکل بخش دی۔ حکومت بمبئی کے اس اقدام کی مطابقت کرتے ہوئے مدراس، بنگال، اڑیسہ اور پنجاب کی مجالس قانون ساز نے بھی اسی قسم کے بل پاس کر دیے۔ حکیم اجمل خاں کو ہر بار اپنی پوری قوت حکومت کے ان اقدامات کا مقابلہ کرنے میں صرف کر دینی پڑی مگر ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔ انجام کار انھوں نے مرکزی مجلس قانون ساز کے ہندستانی اراکین سے درخواست کی کہ وہ دیسی طریقہ علاج کے کاز کی حمایت اور وکالت کریں تاکہ حکومت ہندستانی معالجوں کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے حکیم صاحب کے دیسی طرز علاج کو منظور کرنے کے جائز مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر حکیم صاحب نے مختلف طبی طریقوں سے وابستہ پریکٹیشنروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کی سمت میں آیورویدک اینڈ طبی کانفرنس کو منظم کیا۔

دیسی طریقہ طب کو جدید بنانے اور میڈیسن اور سرجری کے میدانوں میں ہونے والی تازہ ترین تحقیقات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کی غرض سے حکیم اجمل خاں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا دورہ کیا۔ وہاں انھوں نے مغرب کے بیشتر طبی مراکز اور ہسپتالوں کا معائنہ اور نامور معالجوں سے ملاقاتیں کر کے ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اسی سفر کے دوران لندن میں پہلی مرتبہ ان کی ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو زندگی بھر کی رفاقت میں بدل گئی۔

ہندستان واپس آنے کے بعد حکیم صاحب نے اپنی تمام تر توجہ طبیہ اسکول کو ایک کالج میں تبدیل کرنے پر صرف کر دی۔ انھوں نے دہلی کے قرول باغ نامی علاقے میں ایک قطعہ زمین خرید کر ۱۹ر جنوری ۱۹۱۶ء کو وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھوں اس مجوزہ کالج کا سنگ بنیاد نصب کرایا۔ کالج کی عمارت کی تعمیر کی تکمیل سے پہلے ہی حکیم صاحب کے سیاسی

◄◄ پہلا باب ►►

شخصیت اور حیات

نظریات میں تبدیلی رونما ہوگئی اور وہ ایک کٹر قوم پرور رہنما بن گئے'اسی لیے بعد ازاں انھوں نے طبیہ کالج کی عمارت کی رسم افتتاح گاندھی جی کے ہاتھوں سے ادا کروائی۔ یوں تو حکیم صاحب کو سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن وہ ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کی جانب سے متردد رہا کرتے تھے اور انھیں سماجی' اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے ہمکنار کرنے کے خواہش مند تھے۔ انکے خیالات کا اظہار ان کے والد کے جاری کردہ ہفت روزہ "اکمل الاخبار" کی مختلف اشاعتوں کے اداریوں سے ہوتا ہے جو حکیم اجمل خاں کی نوک قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔

اگرچہ حکیم اجمل خاں کو عملی سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا تاہم وہ اس وقت اس سے کنارہ کش نہیں رہ سکے جب انھیں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کرنے والے اس وفد میں شامل کرلیا گیا جو پینتیس نامور مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ حکیم صاحب نے اس وفد میں دہلی کی نمایندگی کی۔ بعد ازاں جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا تو وہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ حکیم اجمل خاں نے قیام مسلم لیگ کے سلسلے میں پیش کردہ تجویز کی تائید کی اور وہ اس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں کراچی او ۱۹۰۸ء میں امرت سر میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کی اور اپنے گراں قدر مشوروں سے مسلمانوں کو مستفید کیا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے دہلی میں مسلم لیگ کے اجلاس کا انعقاد عمل میں لاکر اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ اگرچہ اس اجلاس میں حکیم صاحب مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ظاہر ہوئے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اس کردار کو خیر باد کہہ دیا اور وہ ملک کے سبھی فرقوں کے رہنما تسلیم کیے جانے لگے یہی وجہ تھی کہ وہ مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب تر کرنے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۱۲ء کے جنگ بلقان کا آغاز ہوتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے ایک طبی مشن ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکی بھیجا تو حکیم صاحب نے مشن کے لیے چندے کی فراہمی میں اپنا سارا وقت صرف کیا اور اس کے اراکین کے انتخاب میں بھی مدد کی۔ اسی طرح اگست ۱۹۱۳ء میں کان پور کے مچھلی بازار میں واقع مسجد کا ایک حصہ جب سڑک کو چوڑا کرتے ہوئے شہید ہوگیا تو مسجد کی عمارت کا ملبہ اٹھانے کے لیے جمع ہونے والے لوگوں پر پولس نے گولیوں کی بوچھار کرکے بہت سے مسلمانوں کو شہید کردیا۔ اس واقعہ نے پورے ملک میں ایک ہیجان برپا کردیا۔ سبھی مسلم رہنماؤں نے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے ایک ملک گیر تحریک کا آغاز کردیا۔ حکیم اجمل خاں بھی اس تحریک میں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ شامل

ہو گئے۔ وہ ہر ہفتہ کان پور جاتے رہے اور اپنے دوست نواب رام پور کی وساطت سے اس معاملہ کو سلجھانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بیک وقت لکھنو میں منعقد ہوئے اور میثاق لکھنو عمل میں آیا۔ اس کے تحت اتحاد کی خواہش نے ہندستان میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ کانگریس لیگ نے اصلاحات کے لیے ایک مشترکہ اسکیم تیار کی جسے برطانوی حکومت کو پیش کر دیا گیا۔ ان تمام اقدامات کے لیے بڑی حد تک حکیم صاحب بھی ذمہ دار تھے۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کے خلاف جرمنی کی حمایت میں ترکی کی شمولیت کے سلسلے میں برطانوی حکومت کی ظالمانہ پالیسی سے حکیم صاحب کو شدید صدمہ پہنچا۔ ان کی وفاداری حکومت کی نظروں میں مشکوک ہو گئی اور خود حکیم صاحب کو بھی حکومت پر اعتماد نہیں رہا۔ صوبہ جاتی حکومتیں پہلے ہی طب دشمن رویہ اختیار کر کے انھیں بدظن کر چکی تھیں اب حکومت کو یہ بھی شک ہونے لگا کہ حکیم صاحب برطانوی حکومت کے خلاف افغانوں سے مل کر کوئی سازش کرنے میں مصروف تھے۔ اس کا یہ خوف مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری کی قائم کردہ تنظیم "خدام کعبہ" سے حکیم صاحب کی وابستگی کے سبب پیدا ہوا۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب نظارۃ المعارف نامی ایک اکادمی سے بھی وابستہ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن سے ان کے گہرے مراسم نے بھی انگریزوں کو ان کی جانب سے مشکوک کر دیا تھا اسی وجہ سے مکان اور مطب میں ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی ہونے لگی اور مستقل دو برس تک ان کی خط و کتابت پر بھی نظر رکھی گئی لیکن حکیم صاحب نے کبھی ان نگرانیوں کی پروانہ کی اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں پہلی بار دہلی میں کانگریس کے اجلاس کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ اس اجلاس میں خطبہ استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے مانٹ فورڈ اصلاحات کی تجاویز پر سیر حاصل تبصرہ کیا، فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا اور سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ نظر بندوں کی رہائی کا کاز انھیں دل سے عزیز تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسنٹ کے جیل سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے ان تمام مسلم رہنماؤں کی رہائی کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں جو مختلف جیلوں میں مقید تھے۔ ان کوششوں کو تیز تر اور موثر کرنے کی غرض سے "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے صدر راجہ صاحب محمود آباد، سکریٹری ڈاکٹر انصاری اور خازن حکیم اجمل خاں منتخب ہوئے۔

جہاں ہندستانی عوام جنگ کے اختتام پر جنگ میں ہندستانیوں کے تعاون کے صلے میں بڑے اعلان و انعام کی توقع کر رہے تھے وہیں برطانوی حکومت نے مرکزی مجلس قانون ساز

مولانا محمد سالم قاسمی*

الامام محمد قاسم النانوتوی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز عبقری شخصیت ہے جن کے امتیازات کو قلمی تحدیدات میں محدود کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اس لئے کہ جسے قدرتِ فیاض کی جانب سے دعاویٔ منقولہ پر نا قابل شکست منقول براہین آفرینی سے منوروہ عقل عظیم عطا فرمائی گئی ہو کہ جس نے اسلام پر عقلی ہتھیاروں سے مسلح حملہ آوروں کو بار بار المناک شکست و پسپائی پر مجبور کردیا ہو اور جسے ایمانِ کامل سے پُر نور وہ سراپا خشوع و خضوع قلب سلیم بخشا گیا ہو کہ جس نے طالبانِ راہ ہدایت کو حسبِ صلاحیت بہ نگاہ معنوی اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ کے مقامات تک رسائی عطا فرمادی ہو اور جسے حکمتِ قرآن کی ترجمان، وہ فیاض زبان مرحمت فرمائی گئی ہو کہ جس نے دین کے بارے میں شکوک وشبہات اور اعتراضات و تلبیسات کی دلدلوں میں پھنسنے والے محروم یقین طبقات کو دولتِ ایمان و یقین سے مالا مال فرمادیا ہو۔

غرض فہرستِ امتیازات بر سبیل اجمال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ جس کی ذات گرامی علم کتاب وسنت میں بے مثال، عالمگیر فکرِ اسلامی میں بے تمثال، ترتیبِ روحانی میں باکمال، زندگی کے ہر جز وکل میں متبع سنت، معلّمیت میں منفرد، طاعت وعبادت میں شب زندہ دار، اصلاح باطن میں ماحی ذوق معصیت، علم و تقویٰ میں مرادِ حق شناس، تصنیف وتالیف میں اطمینان آفریں نکتہ سنج، انفرادیت میں متین اور اجتماعیت میں متدیّن رہنمائے عظیم جیسے بیشمار بنیادی امتیازاتِ عظیمہ کی حامل ہو اور ان کا اعتراف اپنوں ہی نے نہیں، بلکہ مخالفین واعداء اسلام نے بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کرکے کیا ہو، اُس سراپا عظمت وامتیاز کی ذاتِ گرامی پر "سیمینار" کے صاحب فکر ونظر ارباب بست وکشاد نے راقم

---

* مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند

میں ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کی جگہ دو بلوں کا مسودہ پیش کر دیا جن سے ہندستانی عوام کی آزادی سلب ہوتی تھی۔ بلوں کے مسودوں کے مجلس قانون ساز میں متعارف ہوتے ہی پورے ملک کے مختلف حصوں سے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ حکومت کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہ پا کر گاندھی جی نے ایک عہد نامہ تیار کیا جس پر دیگر اکابرین کے علاوہ حکیم اجمل خاں کے دستخط بھی ثبت ہوئے۔ ان تمام رہنماؤں نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر ان بلوں نے قانون کی شکل اختیار کر لی تو وہ نہ صرف اسے بلکہ دوسرے قوانین کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ گاندھی جی نے قوم سے اپیل کی کہ وہ ۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کر کے ستیہ گرہ کا آغاز کر دیں۔ بعد ازاں اس تاریخ کو ملتوی کر کے ۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کر دیا گیا۔ دہلی کے لوگوں کو ستیہ گرہ کی تاریخ میں تبدیلی کا علم نہیں ہو سکا اس لیے انھوں نے ۳۰ر مارچ کو ہی تحریک کا آغاز کر دیا۔ پروگرام کے مطابق سارے دہلی شہر میں ہڑتال رہی اور شہریوں نے ایک شاندار جلوس نکالا۔ یہ سلسلہ دوسرے دن بھی جاری رہا۔ پولس نے احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کر لیا لیکن لوگوں نے ان کی رہائی کے لیے کوششیں کیں۔ ۶ر اپریل کو پھر ستیہ گرہ کا سلسلہ شروع ہوا جو کئی روز جاری رہا۔ ہجوم پر پولس نے گولیاں چلائیں جن سے کچھ لوگ ہلاک ہو گئے۔ رولٹ ستیہ گرہ کے اس تمام عرصہ میں حکیم اجمل خاں شہر کو پُر امن رکھنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ انھوں نے جگہ جگہ جا کر ہر قسم کے لوگوں سے مل کر ان سے شہر میں امن قائم رکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے ڈاکٹر انصاری اور سوامی شردھانند جیسے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مل کر اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر دہلی میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مجروح نہیں ہونے دیں گے۔ یہ حکیم صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شہر میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں مستحکم رہیں۔ حکیم صاحب اور سوامی شردھانند کے آدرشوں سے متاثر ہو کر دونوں فرقوں کے لوگوں نے تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے شانہ بہ شانہ کوششیں کیں۔ انھوں نے برطانوی عدالتوں کی جانب سے منہ پھیر لیا اور اپنے رہنماؤں کے فیصلوں کو قبول کیا۔ حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند نے صدہا ایسے مقدمے فیصل کیے جن سے دونوں فریقوں کو طمانیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے جلیان والا باغ کے حادثہ کی شدید مذمت کی۔

حکیم اجمل خاں نے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ہنٹر کمیٹی کے سامنے اپنی شہادت قلمبند کرائی۔ ان کا بیان بڑا بے لاگ اور بے خوف تھا جس میں انھوں نے حقائق پیش کیے اور بے جھجک کوتاہیوں اور ظلم و تشدد کے لیے حکومت کو موردِ الزام قرار دیا۔ رولٹ ستیہ گرہ کے دوران حکیم صاحب کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے گاندھی جی نے بمبئی کے ایک

بے بضاعت کو اس کے "ذکر امتیازات" پر مامور فرمایا ہے اس لئے سوچنا پڑتا ہے کہ تیرھویں صدی کے اس مجدد اعظم کے امتیازات پر قلم حرکت میں آئے تو کیسے آئے؟ کیونکہ انبیاء کرامؑ کی ذاتِ مقدسہ کے علاوہ کسی میں عہد آفریں شخصیت کے تمام نقوش حیات و خدمات کو اس طرح سمیٹنا کہ کوئی گوشہ اظہار و انکشاف سے رہ نہ جائے، نہ صرف ناممکن ہی ہے بلکہ امّت کے آفتابوں اور ماہتابوں کی تابناک تاریخ حیات کے نہاں خانوں سے اس کی کوئی مثال بھی بظاہر پیش نہیں کی جا سکتی...... اس لئے اس نقطۂ فکر کے تحت کسی تاریخ ساز شخصیت کے امتیازات کا تذکرہ، مزید غیر معمولی اور مشکل ترین اہمیت کا حامل بن جاتا ہے:

۱۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کا وہ اولین اور بنیادی امتیاز کہ جو تمام دیگر مہتم بالشان امتیازات کا مورث ہے وہ "اتباعِ سنت" کا وہ فطری ذوق تھا کہ جس کو حق تعالیٰ نے چھ سال کی عمر میں ایک "رؤیائے صادقہ" کے ذریعہ اس معصوم بچے کی عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیت بننے کی امید کو توقع سے آگے بڑھا کر اہل علم و بصیرت بزرگوں کے لیے یقین میں تبدیل کر دیا تھا جس کا اجمال یہ ہے کہ حضرت الامام نے چھ سال کی عمر میں خواب دیکھا کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کی تمام انگلیاں پانی کا چشمہ بنی ہوئی ہیں اور ان سے صاف و شفاف پانی نکل کر چار دانگ عالم میں پھیل رہا ہے۔

حضرت الامامؒ کے خاندانی عالم و بزرگ، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواب سن کر تعبیراً فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ محمد قاسم کے ذریعہ دینی علم کا فیضان عالمگیر پیمانے پر جاری فرمائے گا۔" اس سچے خواب کی سچی تعبیر حضرت الامامؒ کے تاسیس فرمودہ اس دارالعلوم دیوبند کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے کہ جس کے عالمگیر فیضان پر کسی توضیحی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اس اساسی امتیاز کے ذکر کے بعد، تعمیلاً للحکم، آغاز کلام کے لیے یہ عرض کرنا انشاء اللہ بے محل نہ ہوگا کہ تیرہ صدیوں پر مشتمل اسلام کی مسلّمہ عظیم علمی اور دینی شخصیات عظیمہ کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد ان کے بیشمار، صاحب فضل و کمال منتسبین و تلامذہ میں سے عام طور پر کسی ایک ہی کو قدرتِ فیاض نے ان کے علوم دقیقہ اور معارف عمیقہ کی تشریح و تحقیق کی توفیق سے نوازا ہے جیسے حضرت شمس

جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"واقعتاً یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جب وقت اپنا کام پورا کرلے گا تو اس پر ہندستان فخر کا احساس کرے گا تمام تر اعزاز سیاسی شردھانند اور حکیم اجمل خاں کی موثر اور دلیر قیادت کو جاتا ہے۔۔۔"

غالباً یہی سبب تھا کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ کے اجلاس امرت سر میں منعقد ہوئے تو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے حکیم اجمل خاں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اپنے طویل خطبۂ صدارت میں حکیم صاحب نے تفصیل کے ساتھ ان تمام مسائل کا احاطہ کیا جن سے ملک دو چار تھا۔ ان کا خطبہ پنجاب میں برطانوی حکومت کی ظالمانہ حرکتوں کی افسوسناک روداد تھا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مستحکم کرنے کی غرض سے انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندو بھائیوں کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے گاؤ کشی سے پرہیز کریں۔ حکیم صاحب نے کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے اجلاسوں میں بھی شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

حکیم اجمل خاں کو ترک موالات کے بانیوں میں شمار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں خلافت اور عدم تعاون کے پروگرام کا آغاز کرنے اور اس کا افتتاح کرنے کا امتیاز بھی حاصل رہا۔ انھوں نے وائسرائے کو اپنا قیصر ہند کا طلائی تمغہ، تاجپوشی کی تقریب میں حاصل ہونے والے دو نقرئی تمغے اور طبیب کی حیثیت سے ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت کی جانب سے عطا کیے جانے والے "حاذق الملک" کے خطاب کو واپس کر دیا تو قوم نے انھیں مسیح الملک کے خطاب سے نواز دیا جو ان کے نام کا جزو بن گیا۔

۹ر جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے مندرجہ ذیل چار شقوں پر مشتمل ترک موالات کا پروگرام جاری کیا:

۱۔ خطابات اور اعزازی حیثیتوں کی واپسی
۲۔ سرکاری سول سروسز کے عہدوں سے استعفیٰ
۳۔ پولیس اور فوج سے استعفیٰ
۴۔ ٹیکسوں کی ادائگی سے انکار

اس پروگرام کے جاری ہوتے ہی حکیم صاحب نے تحریک خلافت و عدم تعاون کی حمایت میں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں اپنا پورا وقت صرف کر دیا۔ اگست ۱۹۲۰ء میں سیورز کے صلح نامے پر دستخط ہو جانے کے ساتھ ہی عالم اسلام کی تحقیر اور توہین کا عمل مکمل

تبریزؒ عالم رنگ و بو سے پردہ کناں ہوئے تو ان کے کثیر التعداد تلامذہ میں سے حق تعالیٰ نے حضرت شیخ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے القائی علوم کی ترجمانی کی توفیق سے مشرف فرمایا۔

حافظ ابن تیمیہؒ کے علوم کے بحرِ ذخار سے ہزاروں سیراب ہوئے۔لیکن ترجمانی کی فضیلت ابن قیمؒ کا مقدر بنی، ابن حجر عسقلانیؒ مقبور ہوئے تو ان کے لاتعداد تلامذہ خدمت حدیث کے لئے مؤفق ہوئے، لیکن ترجمانی علومِ ابن حجر کا عز و شرف علامہ سخاویؒ کے حصے میں آیا۔

صاحب فتح القدیر ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے متنوع علوم کو ترجمانی کے ذریعہ آفاقی شہرت عطاء کرنے کا اعزاز قاسم ابن قطلو بغا کو نصیب ہوا۔

محسن ملّت، مسند ہند، محدث جلیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب وسنّت میں بے مثال استنباطی حکمت سے بے شمار فیضیاب ہوئے لیکن اس مشکل ترین حکمت آفریں علم کی ترجمانی کا شرف کبیر رب العزّت نے اُن کے عظیم المرتبت صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو عطا فرمایا اور سرتاجِ مشائخ کرام حضرت اقدس الحاج حضرت شاہ امداداللہ صاحب تھانوی قدس سرہ کو لدنّی علوم اور مربیانہ معارف سے حق تعالیٰ نے بہرہ یاب فرمایا تھا ان کی ذات گرامی سے یہ عرفان اور فیضان بے شمار طالبین حق کو پہنچا۔لیکن فہم و فراست کی معقول ترین امتیازی بنیادوں پر امداد اللّٰہی علوم کی آخری گہرائیوں تک رسائی اور ان سے دُررِ نایاب و عجیب کی دریافت وترجمانی کا اعزاز عظیم حق تعالیٰ نے حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کو عطا فرما کر نہ صرف اس بحرِ ذخار کے برے بڑے شناوروں کو ہی صف مستفیدین میں شامل فرمادیا بلکہ یہ عرض کرنا مبالغہ سے قطعاً مبرّا ہے کہ سرزمین نانوتہ کے اس عظیم الافادہ ''شمس تبریز'' علوم ربانیہ کے ''حافظ ابن تیمیہ'' آفاقی عظمت و وسعتِ فکر کے ''ابن حجر عسقلانی'' اور ''امداد اللّٰہی'' علوم لدنیہ کے ترجمان کو امت کے لاتعداد عظمائے علم کی رمز شناسی، زعمائے فکر کی دقت شناسی اور اپنی ذاتی عرفان آبی کے شرف وامتیاز نے جس باعظمت مقام اختصاص پر فائز فرمادیا تھا اس نے ہمہ جہت ایمانی بزرگی اور مسلّم عرفانی برگزیدگی کے ساتھ آپ کی حیرتناک علمی اور استدلالی ندرت وقدرت کے اعتراف میں انصاف وعرفان ناشناسوں کو چھوڑ کر آج تک ہر دور کے منصف اہل علم وایمان، رطب اللسان بنے ہوئے ہیں۔

ہو گیا۔ ڈبلو' سی' اسمتھ کے الفاظ میں "پورے ملک کے سامنے اب قوم پروری اور خلافت ہی دو مقاصد رہ گئے تھے" اس لیے گاندھی جی نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون کی تحریک کو وسیع تر کر دیا۔ اس اجلاس میں حکیم اجمل خاں نے بھی زبردست کردار ادا کیا اور بعد ازاں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ملک کا دورہ کیا تاکہ وہ عدم تعاون کے پروگرام سے متعلق لوگوں کو صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں۔ اس دوران عدم تعاون کے پروگرام کو تعلیمی میدان میں عملی شکل دینے کے عمل کو تیز تر کرنے کی غرض سے ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔

جب ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کو ایک تحریک کی شکل دینے کا عزم کیا گیا اور سرکاری یا حکومت کے زیر نگرانی یا اس کی مالی اعانت سے چلنے والے تعلیمی اداروں سے طلبہ کے باہر نکل آنے کے سلسلے میں فیصلہ کیا گیا تو دوسرے ٹرسٹیوں کے ساتھ مل کر حکیم اجمل خاں نے بھی ایم اے او کالج علی گڑھ کے ارباب اختیار کے نام ایک خط لکھ کر ان سے حکومت سے کوئی امداد قبول نہ کرنے کی استدعا کی۔ وہ خود بھی کالج کے ٹرسٹی تھے اس لیے انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کی کہ اگر ان کی التجا پر غور نہیں کیا گیا تو وہ مجبور ہو جائیں گے کہ طلبہ سے اپنے کالج کو خیر باد کہنے پر اصرار کریں۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، علی برادران، تصدق احمد خاں شیروانی اور عبدالمجید خواجہ نے یونیورسٹی کورٹ کے جلسے میں بھی اپنی درخواست کو دہراتے ہوئے حکومت کے ساتھ عدم تعاون پر اصرار کیا تاکہ اس ادارے کو قومی خطوط پر چلایا جا سکے مگر ارباب اقتدار نے ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک سے اس کا جواب دیا۔ نتیجۃً عدم تعاون کے حامیوں کو جن میں گاندھی جی اور علی برادران شامل تھے ایم اے او کالج کے طلبہ کو اپنی مادر علمی کو خیر باد کہہ کر قومی تحریک میں شامل ہونے پر اصرار کرنا پڑا تاکہ ایک آزاد یونیورسٹی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ اگرچہ صاحبان اختیار نے دھمکیاں دیں اور طلبہ پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں تاکہ وہ کالج کو خیر باد نہ کہہ سکیں۔ تاہم تقریباً تین سو طلبہ کالج کی چہار دیواری سے باہر نکل آئے اور انھوں نے تحریک ترک موالات میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ انجام کار ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں عمل میں آگیا جو انھی دنوں مالٹا میں اسارت کے بعد رہا ہو کر واپس ہوئے تھے جہاں برطانوی حکومتِ نے انھیں ریشمی رومال نام کی تحریک کے سلسلے میں نظر بند کر دیا تھا۔ اپنے تاریخی خطبے میں شیخ الہند نے جامعہ ملیہ کے قیام اور اس کے مقصد کی وضاحت کی اور اسے وقت کی اہم ترین ضرورت سے تعبیر کیا تھا۔

۳۔ حضرت الامامؒ کا یہ تیسرا امتیاز بھی قابل ذکر تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ جس طرح قدرت فیاض نے انھیں اپنے منفرد علوم عظیمہ کے ساتھ بیشتر مشاہیر اسلاف کرام کے علوم کا حامل بنایا تھا اُسی طرح اُن کے بعد ان کے بے نہایت نادر الوجود علوم عمیقہ کی ترجمانی وتوضیح بھی طرز مذکور کے مطابق کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ راسخین فی العلم کی ایک پوری جماعت کے حصے میں آئی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں صرف ان مخلص ترین عرفاءِ کاملین کے اسماءِ گرامی سپرد قلم کردوں کہ جنہوں نے حضرت الامام کے فیضان علم ومعرفت کے بعد کی نسلوں کو مستفید ہونے کی راہ ہموار فرمائی ہے اور حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم الحروف کو ان کی زیارت اور ان کی مبارک زبانوں سے دیگر اکابر رحمہم اللہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت الامام کے ایمان آفرین کلمات وواقعات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جو درج ذیل ہے:

(۱) محقق جلیل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سابق سرپرست دار العلوم دیوبند۔ (۱)

(۲) امین علوم قاسمیہ جامع المعقول والمنقول استاذ الاساتذہ حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

(۳) متکلم اسلام، محدث جلیل، دانائے رموز قاسمیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

(۴) عارف جلیل، نمونہ اسلاف حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ۔

---

(۱) حضرت حکیم الامتؒ کے ذکر خیر کے اس موقعہ پر، اپنی تہی دستی کے اعتراف کے ساتھ، بطور تحدیث نعمت اس فضل خداوندی پر مشتمل واقعہ کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی ہوگی کہ شوال ۱۳۶۲ھ میں احقر کو حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ نے اپنی اس آرزو کی تکمیل کیلئے کہ احقر کے دروس عربیہ کا افتتاح حضرت حکیم الامتؒ سے کرائیں۔ احقر کو حضرت والد ماجدؒ نے اپنے سفر مدراس کی وجہ سے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ اس خواہش پر مشتمل خط دے کر تھانہ بھون بھیجا چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ نے از راہِ شفقت وکرم درس نظامی کی اولین کتاب میزان الصرف بذاتِ خود پندرہ روز میں درساً درساً احقر کو پڑھا کر شرف تلمذ سے نوازا اور یہ ہی نہیں بلکہ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ سے تعلق خصوصی کے تحت اس پورے عرصہ میں احقر کو اپنا مہمان رکھ کر عزت بخشی۔ بوقت تحریر ہٰذا حضرت حکیم الامتؒ کے براہِ راست تلامذہ میں احقر کے علاوہ غالباً کوئی اور زمین پر سانس لینے والا موجود نہیں ہے۔

حکیم اجمل خاں کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین امیر جامعہ (چانسلر) بننے کا شرف حاصل ہوا اور اس منصب پر وہ ۱۹۲۷ء میں اپنی وفات تک فائز رہے۔ مولانا محمد علی کو اس کے اولین شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعد ازاں ان کے مقید ہو جانے پر عبدالمجید خواجہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو منعقدہ ایک جلسے میں حکیم اجمل خاں کو جامعہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا تاوقتیکہ بورڈ آف ٹرسٹیز کا قیام عمل میں نہ آجائے اور اس کے اصول و ضوابط مرتب نہ ہو جائیں۔ کمیٹی کے فیصلہ اور مولانا محمد علی اور حکیم صاحب کے مشورے پر گاندھی جی نے شاعر مشرق علامہ اقبال سے ایک خط کے ذریعہ شیخ الجامعہ کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی۔ گاندھی جی نے انھیں لکھا کہ "مسلم نیشنل یونیورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کی ذمہ داری قبول فرمالیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کی مہذب قیادت میں ترقی کی منزلیں طے کرے گی۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور علی برادران بھی اس کے خواہش مند ہیں۔ کاش آپ اس کا جواب اثبات میں دیں۔" تاہم علامہ اقبال نے خرابیِ صحت کے سبب اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت کرلی۔

جامعہ کو جاری و ساری رکھنے کی ذمہ داری حکیم اجمل خاں کے کاندھوں پر رکھی گئی اور امیر جامعہ کی حیثیت سے اس کی فلاح اور ترقی ان کے سپرد کردی گئی۔ اگرچہ علی برادران جامعہ کو قومی تحریک کے لیے رضاکار اور کارکن فراہم کرنے کے لیے تربیتی مرکز کی حیثیت عطا کرنے کے خواہاں تھے تاہم حکیم صاحب نے اسے طلبہ کو قومی تعلیم دینے والے ایک مستقل ادارے کی شکل دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دراصل وہ سیاسی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے روپیوں کو ضائع کرنے کے مخالف تھے جس کے لیے دیگر وسائل مہیا کیے جاسکتے تھے۔ غرضیکہ جن مقاصد کے تحت جامعہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا ان میں نہ صرف قدیم و جدید علوم کی تعلیم کا پروگرام شامل تھا بلکہ مذہبی اور سیکولر مضامین کی تعلیم بھی اس کا ایک حصہ تھی۔ اسے حکومت کے قبضہ اور اثر سے قطعی طور پر آزاد رکھا گیا تاکہ ہندستان کی آزادی کے لیے قومی جدوجہد کے کاز کو فروغ دیا جاسکے۔

جس مقصد کی تکمیل کے لیے جامعہ کو قائم کیا گیا تھا اس کی وضاحت ۱۹۲۱ء میں منعقدہ اولین تقسیم اسناد کے جلسہ میں حکیم صاحب کے خطبہ صدارت سے ملتی ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جب ہم نے اپنی آنکھ سے مغربی زہریلی تعلیم کے مہلک اثرات دیکھ لیے تو دیگر مصروفیتوں اور ہجوم کار کے باوجود ہم نے اپنا ملی فرض سمجھ کر جامعہ کی بنیاد رکھی اور اپنے جدید تعلیم کے مقاصد کی وضاحت کردی جن میں یہ کہا گیا کہ

(۵) غواص بحر معارف، واقف اسرار حکم قاسمیہ، خطیب اعظم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیو بند۔

(۶) مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق مفتی دار العلوم دیو بند و بانی دار العلوم کراچی۔

(۷) عالم ربانی، فقیہ عظیم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمہ اللہ، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور۔

(۸) مربی کامل، مثیل شیخ تھانوی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کراچی، (پاکستان)

(۹) مرشد کبیر حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جلال آباد، (مظفر نگر)

(۱۰) نمونۂ شیخ تھانوی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، الہ آباد۔

(۱۱) مستفید باکمال حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ، سابق مہتمم مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر، اعظم گڑھ

(۱۲) عارف کامل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، بانی و سابق مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان (پاکستان)

(۱۳) منیب باکی حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ پشاور (پاکستان)

(۱۴) عارف عرفانِ شیخ تھانوی حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۱۵) خطاطِ کبیر حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب، سابق صدر شعبۂ کتابت، دار العلوم دیو بند۔

۴۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی کے علم وسیع اور عالمگیر اسلامی فکر وسیع کے امتیاز کا جس طرح اعتراف وقت کے بلند پایہ علماء اسلام نے فرمایا ٹھیک اسی طرح دیگر مذاہب کے اختصاص علمی میں ممتاز شمار کئے جانے والے غیر مسلم اہلِ علم کو بھی آپ کی قوت استدلال اور ہر دعویٰ کو ثابت کرنے والے ناقابل شکست دلائل و براہین قائم کرنے کی بے مثال صلاحیت پر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور

"۔۔۔۔۔ایسے مسلمان پیدا کرنا جو اپنے مذہب سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس پر سختی سے عامل بھی ہوں، جو اپنے ماضی سے بخوبی آشنا اور اپنے مستقبل سے آگاہ ہوں، جو دنیا میں اپنے اور اپنی قوم کے وجود کی اصل غایت جانتے ہوں اور اپنے مذہب کے مبلغین کی صف میں ایک مفید فرد کی حیثیت سے شامل ہو سکیں۔ وہ جدید علوم سے ضرور واقف ہوں لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرز زندگی کا۔ وہ اپنی روزی کمانے میں کسی کے دست نگر نہ ہوں اور ایک خوددار مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ ان مقاصد کو مد نظر رکھ کر اور اس حقیقت سے آگاہی کے باعث کہ ۔

از یک آئیں مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است

"ہم نے تعلیم قرآن کو اپنے نظام میں مرکزی حیثیت دی ہے۔ اگرچہ ہم نے تمام دیگر علوم جدیدہ کو اپنے نظام میں جگہ دی لیکن قرآن اور اسلام کو مخدوم بنایا اور انھیں خادم۔۔۔۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا ایک بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے' جہاں ہندو طلبہ کے لیے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندستانی قومیت کی اساسِ محکم اسی باہمی افہام و تفہیم پر منحصر ہے۔۔۔۔"

ان خیالات سے ایک متحدہ معاشرے کے قیام کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جس میں مشترکہ قومیت کا شعور اجاگر ہو اور جس کی تشکیل جامعہ کے مقاصد میں شامل تھی۔ یہ اس حقیقت پر بھی مبنی تھا کہ ہندستانیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اچھے مسلمان یا اچھے ہندو ثابت ہوں۔

جامعہ نے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ اظہار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے

ہونا پڑا ہے۔

اس ذیل میں حضرت الامامؒ کی جانب سے معاندین اسلام کے حملوں کے ان دنداں شکن جوابات کو بلاخوف وتردد پیش کیا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے اعداء اسلام کی زبانوں کو نہ صرف گنگ کر دیا تھا بلکہ عقلِ انسانی کو براہِ راست اپیل کرنے والے اُن جوابات کو سنکر بدترین دشمنانِ اسلام نے اپنی لاجوابی کا اعتراف اس انداز میں کیا کہ اگر کسی کی تقریر پر ایمان لایا جاسکتا تو مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر پر ہم ایمان ضرور لے آتے جس کے معنی اس کے سوا کیا ہوسکتے ہیں کہ حق کے ناقابل تردید مدلل ثبوت کے بعد ان کے دینِ حق کو قبول نہ کرنیکی توجیہہ، اپنے دنیوی اعزاز ومنافع سے محرومی کے خطرے کے سوا کچھ نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ حضرت الامام کی یہ عظیم سیاسی رہنمائی، تاریخی اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہی ہے کہ فرنگی حکومت غاصبہ سے نبرد آزمائی میں ناکامی اور اس کے پُر فریب امن عام کے اعلان کے بعد حضرت الامامؒ نے بھی بلاتاخیر اپنی فراست ایمانی سے شمشیر وسنان کے بجائے جنگ کا رخ ملت میں علمی اور ایمانی استقامت اور جذبۂ حمیت وطن کی برقراری کے لیے نہ صرف تعلیم دین ہی کی جانب موڑ دیا بلکہ وہ دور چونکہ ملت اسلامیہ پر اقتدار سے محرومی کے بعد غالب وظالم انگریزوں کے بے تحاشا مظالم سے پیدا شدہ شکست خوردگی اور عجز ومایوسی کا دور تھا جس میں ملّی زندگی کا دائرہ فکر وعمل پست فکری سے دوچار ہوچکا تھا اس لئے ایسے شدید اور نازک وقت میں عام سیاسی قائدین کا محور فکر ملت کو اس فکری پستی وناامیدی کی ذلت ناکیوں سے نکالنے کے سوا دوسرا نہیں ہوتا جو بادیٔ النظر میں وقیع اور صحیح بھی معلوم ہوتا ہے اور ضروری بھی۔

لیکن حضرت الامامؒ نے اپنی فراست ایمانی آمیز سیاستِ اسلامی سے اس کو ملّت کے مرض کی صحیح تشخیص نہ قرار دے کر اپنا محورِ فکر، ملّت کی اُن فطری صلاحیتوں کو بنایا کہ جو عہد مغلوبیت میں مستور تو ہوسکتی ہیں لیکن معدوم نہیں ہوتیں اور قیادتِ سلیمہ پر بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ صلاحیتیں بروئے عمل آنے کے بعد شکست خوردگی کے بجائے ''ہمت آفریں شعور'' ذلت ومغلوبیت کے بجائے مددِ خداوندی پر یقین، شدید وقبیح حوادث سے ہمت شکنی کے بجائے حوصلہ مندانہ عزم، رفعت پسندانہ

میں حکیم صاحب نے فرمایا:

"۔۔۔۔۔چونکہ ہماری تعلیم کا مقصد ملازمین و محکومین کی ایک جماعت پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ہم طالب علم میں علوم کا ذوق پیدا کرنا اور اس کے اعمال پر اس کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم نے ایک غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے غیر فطری طریقہ کا بھی یک قلم سدباب کر دیا۔۔۔۔"

دوسرے بہت سے ہندستانی رہنماؤں کی طرح حکیم صاحب بھی تعلیم کو سرکاری ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ بنانے کے مخالف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ طلبہ جامعہ میں رواج پانے والی صنعت و حرفت کو بھی اپنائیں اور اس کے سہارے ایک باعزت زندگی بسر کریں اس ضمن میں انھوں نے فرمایا:

"۔۔۔۔۔آدمی مسلمان رہ کر اور ملت اسلامی کے ایک حساس اور فرض شناس رکن کی حیثیت سے بھی تو کسب معاش کر سکتا ہے۔ اس کے لیے قومی خودداری کا خون کرنا تو ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ ذاتی مفاد پر ملی نفع کو قربان کیا جائے۔ میں یقیناً چاہتا ہوں کہ ہم اپنے متعلمین کے لیے کسب معاش کی ہر ممکن سہولت فراہم کریں اور مجھے خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ کے جدید نظام میں تعلیم صنعت و حرفت ہر شخص کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے تا کہ ایک نوجوان محض اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے اپنی عمر کا عزیز اور قیمتی حصہ تحصیل علم میں صرف کیا ہے بقیہ عمر کو دریوزہ گری میں ضائع کرنے پر مجبور نہ ہو بلکہ اپنی خودداری اور عزت نفس کو قائم رکھ کر دنیا میں ایک ایماندار انسان کی زندگی بسر کر سکے۔ اس لیے یہ ہرگز نہ سمجھیے کہ میں کسب معاش کو کوئی غیر اہم چیز تصور کرتا ہوں۔ ہاں مجھے نفرت ہے اس تجارتی اور لین دین والی غلامی اور کم ہمتی کی فضا سے جو ہندستان کے تقریباً تمام مدارس میں دکھائی دیتی ہے۔۔۔۔"

جامعہ کے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے حکیم صاحب نے انھیں یاد دلایا کہ ان کا فرض اپنے طلبہ کو صرف کتاب کے اسباق پڑھا دینے ہی سے پورا نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ محسوس کریں تو ان کے ہاتھ میں وہ اثر پذیر مادہ دیا گیا ہے جس سے ملت اسلامیہ کے مستقبل کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ اس پختہ اور مستحکم عمارت کے لیے ضروری تھا کہ اساتذہ ان کی تمام خامیوں کو زمانۂ تعلیم میں دور کر دیں اور وہ یقیناً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ یہ کام زبانی درس سے

اقدامات کے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے بجائے کامیابی کا یقین اور بااقتدار معاند قوتوں کے سامنے خودسپردگی کے بجائے غیرت مندانہ موقف استقامت قومی زندگی کے دھارے میں انقلاب برپا کرنے کا ایسا مؤثر ذریعہ بنتے ہیں کہ جس کا ادنیٰ تصور بھی مغلوب ومفتوح ملت کو محض پست فکری اور یاس وناامیدی سے نکالنے کے طرز قیادت میں متصور نہیں ہوسکتا۔

بہ نظر غائر اگر جائزہ لیا جائے تو فطری قیادت کے یہ اُصول خودساختہ نہیں بلکہ کتاب اللہ سے ماخوذ ومستفاد ہیں جن کو فرائض نبوت میں گنواتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ اَنْفُسِهِم يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيٰته وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْن.

(الف) تلاوت آیات کے ذریعہ مخاطب ملت کو مقصدِ قیادت پر مطلع کرنے کی راہنمائی کے ساتھ اس پر مکمل اعتماد۔

(ب) تزکیہ کے وسیع تر مفہوم سے شکست خوردگی اور اس کے لوازم سے قلب ودماغ کو فراغ بخشنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

(ج) تعلیم کتاب سے قائدانہ احکام کی صحت وافادیت پر ایسا یقین محکم پیدا کرنا ہے کہ اس کے برخلاف کوئی بھی اور کسی کا بھی حکم مخاطبین کے لیے ادنیٰ درجے میں لائق التفات نہ رہے۔

(د) اور حکمت سے مقصدِ حیات کی یاددہانی کے ساتھ، دنیوی زندگی کے علمی، عملی منافع عامہ کو حاصل کرنے کے لئے الدنیا مزرعة الآخرة کے تحت کامیابی کے تمام ضروری وسائل کو استعمال کرنے پر یہ کثیر الجہات کلمۂ حکمت مشیر ہے۔

پس حضرت الامامؒ نے انہی قرآنی نقاطِ طیبہ پر اپنی قیادت کی بنا قائم فرما کر اپنے ذوقِ اتباع کتاب وسنت پر انمٹ شہادت قائم فرمادی۔

۶۔ حضرت الامامؒ کی یہ قیادتِ اسلامیہ جس کی صحت پر وقت کی نزاکت من جانب اللہ مُہر تصدیق ثبت کرچکی تھی اس کی عملی تشکیل میں بے سروسامانی کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انگریزوں نے برصغیر کی حکومت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے اپنے غاصبانہ اقتدار کی تاراجی

ممکن نہ تھا بلکہ اس کے لیے عمل کی زبان درکار تھی۔ انھوں نے اساتذہ سے درخواست کی کہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کریں کیونکہ انسان کی فطرت درس کے مقابلے میں ایک اسوۂ حسنہ سے نسبتاً جلد سبق آموز ہو سکتی تھی۔ انھیں اپنی زندگی میں خلوص و ایثار، حق پسندی اور تقویٰ کی ایسی مثالیں پیش کرنی چاہئیں جو آئندہ طلبہ کے لیے چراغ ہدایت کا کام دے سکیں۔

قیادت کا یہ نظریہ ہمیں قدیم ہندستان میں روایتی اساتذہ کی یاد دلاتا ہے جو وہی تعلیم دیا کرتے تھے جس پر وہ خود عمل پیرا ہوتے تھے۔ ملک کو اپنی جدوجہد آزادی میں اساتذہ کی ضرورت تھی جس کی فراہمی جامعہ ملیہ ہی سے متوقع تھی۔

طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے حکیم صاحب نے انھیں مبارکباد دی کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جس سے ہندستان اور ہندستانی قوم گزر رہے تھے انھوں نے اس قدر پامردی اور بلند حوصلگی سے کام لیا۔ ان میں سے اکثر کو مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور اکثر طلبہ کو اپنے اعزہ کے ہاتھوں برے سلوک کو بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ بہت سے لوگ جیل خانوں کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ یہ ساری مصیبتیں چند روزہ تھیں۔ اگر وہ اپنے اعلا مقاصد اور ارادوں پر قائم رہے تو یہ مشکلیں سہل ہو جانے والی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ انسان کے لیے دنیا میں حقیقی مسرت اور شادمانی کا وجود اسی وقت ممکن تھا جب اس کے مقاصد میں رفعت ' اس کے خیالات میں علو اور اس کے مطمح نظر میں وسعت ہو۔ وہ اپنے دل کے اندر نوع انسانی کی محبت کے جذبہ صادقہ کے لیے جگہ رکھتا ہو اور دنیا میں باطل کے فنا اور حق کے قیام کو اپنے وجود کی غایت جانتا ہو۔ اس کے مقاصد کی بلندی اور اس کی مساعی کا خلوص اسے مادی علاقوں سے ایک گونہ بے نیاز کر دیتا ہے۔

حکیم صاحب نے طلبہ کو اس خطرے سے متنبہ کیا کہ کہیں وہ اپنی آزادی کے معنی بے راہ روی اور مطلق العنانی نہ سمجھ لیں کیونکہ حقیقی آزادی کی پہچان یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنی مرضی سے اپنے مقاصد کو مد نظر رکھ کر کسی آئین محکم کے ماتحت لے آئے۔ اس لیے طلبہ کے لیے لازم ہے کہ وہ کہیں غلطی سے حریت کو بے اصولی کا مترادف نہ سمجھ لیں۔ سند پانے والے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:-

> "تم میں سے جن کو آج جامعہ کے آخری امتحان کی سند مل رہی ہے نہ سمجھیں کہ ان کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو گیا۔ درحقیقت اب ان کی تعلیم کا زمانہ شروع ہوتا ہے جب وہ دنیا کے مکتب میں زندگی کی ابجد سیکھیں گے۔ ان سے

کے بارے میں انگریز اگر خائف تھا تو صرف مسلمانوں ہی سے تھا اسی خطرہ وخوف کے تحت اس نے ۱۸۵۷ء میں مکمل تسلط کے بعد مسلمانوں کے برخلاف قتل وغارت گری، لوٹ مار اور جائیدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کو اپنے ظالمانہ اقتدار کی برقراری کا واحد ذریعہ قرار دے کر ان کو دانہ دانہ کا محتاج بنادیا، لیکن دین وایمان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے، اور حریت طلبی کو قومی، ملکی اور سیاسی ضرورت سے آگے بڑھ کر مذہبی اور دینی فریضہ باور کرنے والے قائلین: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کو بے تحاشا ظلم وستم کی یہ گرم بازاری...... آزادیٔ وطن کے لئے جرأت مندانہ اقدامات سے روکنے میں حکومتِ وقت کو ذلّت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، جس کا انگریز نے ایک دانا دشمن کی حیثیت سے گہرا جائزہ لیکر اس حقیقت کو پالیا کہ مسلمانوں کے آزادیٔ وطن کے جذبۂ صادق کو ناقابل شکست قوت وطاقت دینے والے صرف یہ مدارس دینیہ ہیں جن کا ناقابل شمار تعداد میں ملک بھر کے اندر جال پھیلا ہوا ہے۔

مسلمانوں میں ان دینی تعلیمی سرچشموں سے اسلامی غیرت وحمیّت اور جذبۂ حرّیت طلبی کی آبیاری کے راز کو پالینے کے بعد شاطر دشمن انگریز نے قتل وغارت گری کی پالیسی کو ناکام دیکھ کر اپنی عیارانہ سیاست سے امن عام کا اعلان کر دیا لیکن اس سے زیادہ مسلم کش بلکہ اسلام کش دوسری نئی پالیسی کے تحت مدارسِ اسلامیہ کو محور انتقام بنایا اور ملک بھر کے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر لیا کہ جو اُس دور میں مدارس دینیہ کی بقاء کا واحد ذریعہ تھے اور دوسری جانب مسلمان اپنی اقتصادی بدحالی کے باعث ان دینی مراکز کو سنبھالنے کے قابل رہے نہیں تھے۔ اس لئے اس خطرناک صورتحال کے نتیجے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ لاتعداد مدارس دینیہ میں تالے پڑ گئے۔

پھر یہ ہی نہیں بلکہ اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک کے درج ذیل تین اسلامی مکاتبِ فکر کہ جو پورے ملک کے مدارس دینیہ کے دینی اور علمی محتسب کا وقیع کردار ادا کر رہے تھے وہ بھی وقت کی اس قہرمانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ کر ختم ہو گئے۔

ان میں اوّلین ''مکتب فکر ولی اللّٰہی'' دہلی میں تھا جس نے دین کے مصدر ثانی ''علم حدیث'' کو شرح کتاب اللہ کی حیثیت سے پیش کرنے کا اس دور میں اہم فریضہ اس وقت ادا کیا کہ جب حتمی اور قطعی اور یقینی مرادات ربّانی کو واضح کرنے والی حدیث رسول اللہ سے کتاب اللہ کو علماء سوء نے یکسر

اس وقت میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ زندگی کی کسی رہ گزر میں اپنے کو پائیں لیکن اس پیام حق کو نہ بھولیں جس کی تبلیغ واشاعت ان کے وجود کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ وہ دنیا سے اگر کچھ سیکھنے جائیں تو اس کے عوض اسے نجات کا واحد راستہ سکھانے کی کوشش بھی کریں۔ وہ سمجھ لیں کہ وہ دنیا میں ایک خادم اور داعی حق کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں اور کسی گروہ یا فرقہ کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ نوع انسانی کی خدمت کے لیے کیونکہ وہ اس تعلیم کے حامل ہیں جو دنیا سے نسب و نسل کے امتیازات مٹانے اور انسان کے 'سر دامن' کو 'گرد وطن' سے پاک کرنے کے لیے آئی تھی وہ اپنے کو حقیر اور بے یار و مددگار نہ سمجھیں کیونکہ جس نے ایک خدائے قہار کے آگے اپنے سر نیاز کو خم کیا وہ کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں۔۔۔"

حکیم صاحب کا یہ پورا خطبۂ صدارت ان اعلا قدروں اور آدرشوں کا آئینہ دار ہے جن کے لیے جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ اس قومی تعلیم کے نظریہ کا اظہار تھا جس کی پاسداری جامعہ نے اپنے ذمہ لی تھی۔ سرکاری تعلیم گاہوں اور اس کی اعانت یا نگرانی میں چلائے جانے والے تعلیمی اداروں سے اس قسم کی تعلیم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس کے حصول کی امید ملک اپنے طلبہ سے کرتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب علی گڑھ میں قدیم کالج اور مجوزہ جامعہ زیر بحث تھے تو اجمل خاں نے قومی تعلیم کے پروگرام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک مخصوص قسم کے لوگوں کو تیار کرنے کی ضرورت پر اصرار کیا جو اسلامی تسلسل کا تیقن کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں جامعہ ایسے مسلمانوں کو تیار کرنے کا نصب العین رکھتی تھی جو "اپنے مذہب سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس پر سختی سے عامل بھی ہوں۔ جو اپنے ماضی سے بخوبی آشنا اور اپنے مذہب کے مبلغین کی صف میں ایک مفید فرد کی حیثیت سے شامل ہو سکیں۔ وہ جدید علوم سے ضرور واقف ہوں لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرز زندگی کا۔ وہ اپنی روزی کمانے میں کسی کے دست نگر نہ ہوں اور ایک خوددار مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔۔۔"

تقسیم اسناد کے جلسے میں حکیم صاحب کے خطبۂ صدارت کو ذہن نشیں کرتے ہوئے اگر ہم جامعہ کے نصاب کا تجزیہ کریں تو اس میں قومی روح کو جیتا جاگتا پائیں گے۔ اس نصاب کو ممتاز رہنماؤں اور نامور ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی نے مرتب کیا تھا جن کا مقصد طلبہ کو قومی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ یہ کمیٹی ڈاکٹر سر علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق،

منقطع کر کے اور کتاب اللہ کو اپنی زرطلبی اور جاہ طلبی کی حقیر و ذلیل اغراض فاسدہ کے لیے ایسا قوی وسیلہ بنا رکھا تھا کہ اس کے برخلاف آواز اٹھانا دعوت مبازرت کے مترادف بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ ہی مکتب فکر ولی اللٰہی تھا کہ جس نے ایسے شدید ترین صبر آزما احوال وحوادث سے دوچار ہونے کے باوجود حدیث رسول اللہ کو معتبر شرح قرآن کی حیثیت سے پیش کیا اور صحیح مرادات ربانی کی مدلل توضیحات سے ملت کو آشنا بنانے کا زبردست فریضہ انجام دیا۔ جس کے نتیجے میں علم دین کے معتبر و مستند ہونے کے لئے ''فن حدیث'' کی لازمی ضرورت سے واقفیت عام ہوئی اور مکتب فکر ولی اللٰہی سے اس مصدر ثانی یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض عظیم حاصل کرنا فضلائے مدارس کا ذوق عام بن گیا۔

دوسری جانب ''لکھنؤ'' ''فقہ اور اُصول فقہ'' کا ملک گیر مکتب فکر تھا اس لئے فقہی ذوق رکھنے والے فضلاء لکھنؤ سے مستفید ہوتے تھے۔

اور تیسرا منطق و فلسفہ کا معقول مکتب فکر ''خیر آباد'' تھا اس لئے معقولات سے مناسبت رکھنے والے خیر آباد کا رخ کرتے تھے ان تینوں مکاتب فکر کے ختم ہو جانے کے بعد اس نازک اور خوفناک صورتحال نے دردمندان دین متین کو عمومی طور پر بے چین بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن حضرت الامام النانوتویؒ کا قلب و ذہن مبارک، پیش آمدہ صورتحال کی وحشت ناکی کے احساس کے ساتھ اس کی امکانی تلافی پر مرکوز تھا جو ایک نئے مرکز علم و دین کی تاسیس کے بغیر ممکن نہیں تھی لیکن جس وقت دشمن اسلام و مسلمین انگریز حکومت کی پوری معاندانہ سیاسی قوتیں مستقل پالیسی کے تحت مدارس اسلامیہ کو تاراج کرنے پر لگی ہوئی ہوں ایسے وقت میں کسی نئے مرکز علم دین کی تاسیس کا تصور جس درجہ خطرناک ہو سکتا تھا وہ کسی وضاحت کا طالب نہیں ہے۔

لیکن حضرت الامامؒ کا یہ عزم الہام خداوندی سے مؤید تھا اس لئے آپ اپنے اس عزم صمیم کو اپنی فراستِ ایمانی سے اس طرح معرض وجود میں لائے کہ ''دیوبند'' جیسی چھوٹی سی بستی میں ایک چھوٹی سی مسجد جو ''مسجد چھتہ'' کے نام سے معروف ہے اس میں ایک انار کے درخت کے نیچے صرف ایک استاد محمود اور ایک شاگرد محمود کے ذریعہ اس عالمگیر مرکز علم و دین کی تاسیس فرمائی۔

مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولوی صدر الدین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شبیر احمد عثمانی، پرنسپل ایس۔ کے۔ رودرا، پرنسپل گڈوانی، پروفیسر سہوانی، چارلس فریرانیڈ ریوز، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسی نامور شخصیتوں پر مشتمل تھی۔ غرضیکہ جامعہ کے قومی نصاب پر ممتاز ماہرین نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

نصاب کی رو سے مسلمان طلبہ کے لیے اسلامیات اور ہندو طلبہ کے لیے ہندو اخلاقیات کا مطالعہ لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح جن طلبہ کی مادری زبان اردو تھی ان کے لیے ہندی اور جن طلبہ کی مادری زبان ہندی تھی ان کے لیے اردو سیکھنا لازمی تھا۔ عربی اور انگریزی کی تعلیم چوتھی جماعت سے شروع کی گئی تھی۔ ہندو طلبہ کے لیے سنسکرت ایک لازمی مضمون تھا۔ اسی طرح درجہ پنجم سے حرفت کو بھی ایک لازمی مضمون کی حیثیت حاصل تھی۔ خوش خطی کو نصاب کا حصہ قرار دیا گیا تھا۔ جامعہ والوں سے کھدر کے استعمال کی توقع کی جاتی تھی جسے سبھی نے اپنالیا تھا۔

حکیم صاحب ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے تھے انھیں مسلمان بچوں کو غیر صحت مند ماحول میں، غریبی کی حالت میں رہتے ہوئے گالی گلوج کی زبان استعمال کرتے ہوئے دیکھ کر شدید تکلیف ہوتی تھی اسی طرح دہلی میں تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی تعداد کو قلیل دیکھ کر انھیں صدمہ پہنچتا تھا اس لیے انھوں نے اپنے فرقے کے لوگوں مین تعلیم کو عام کرنے کی فوری ضرورت کے سلسلے میں اپنے ہم مذہبوں کو اپنا ہمنوا بنانا ہی زندگی کا مشن بنالیا تھا۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے بچوں کو ناخواندہ نہ رکھے۔ سر سیّد احمد خاں کی طرح وہ بھی تعلیم کو جدید معاشرے کے تمام امراض کا علاج تصور کرتے تھے۔ ان کا یہی وہ جذبہ تھا جس نے انھیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ کے معاملات میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔

حکیم صاحب تعلیم کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ایسے تمام اداروں اور تنظیموں سے وابستہ کر لیا تھا جو کسی نہ کسی طرح مسلم فرقے کی تعلیمی ترقی سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے دہلی میں ندوۃ العلماء کی کانفرنس کی صدارت کی تھی اور علما سے عصر جدید کے مطالبات کے مطابق عمل پیرا ہونے پر اصرار کیا تھا اور مسلمانوں میں گروہ بندی اور ان کے مابین فضول مباحث کی مذمت کی تھی۔ انھوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے نصاب کو تبدیلی سے ہم آہنگ کرتے ہوئے فرقے کے لوگوں کو ایسی تعلیم سے

حضرت الامامؒ کا یہ تاسیسی عمل ایک طرف آپ کی سیاستِ اسلامی اور فراستِ ایمانی کا بایں معنی مظہر تھا کہ اس مدرسہ کو ظاہری طور پر ایک معمولی مکتب کی متواضعانہ صورت دے کر دشمن مدارس حکومت وقت کی نظر میں ناقابل التفات بنائے رکھا اور دوسری جانب من جانب اللہ بلا تشہیر برصغیر کے بیشتر علمی اور دینی حلقوں نے حضرت الامامؒ کی کتاب وسنت پر مبنی عالمگیر علمی عظمت، فکری وسعت اور کلامی ندرت کی معروف صفات کی بدولت اس دارالعلوم کو ضبطی اوقاف سے پیدا شدہ نقصانِ عظیم کی تلافی کا ذریعہ تسلیم کیا، چنانچہ پہلے ہی سال میں اس مرکز علم و دین میں ملک کے دور دراز مقامات سے علماء اور طلبا کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پس حضرت الامامؒ کے بیشمار امتیازات میں یہ امتیاز سب سے فائق تر قرار دیئے جانے کا مستحق ہے کہ آپ نے اپنے قائم فرمودہ بلند معیار ''حدیثی مکتبِ فکر دارالعلوم دیوبند'' میں ملک کے اہم ترین منتشر و مندرس مکاتب کو سرزمین دیوبند پر جمع فرما کر حسب تقاضائے وقت ایک جامع ترین علمی اور دینی مجموعہ مکاتب فکر ملتِ اسلامیہ کو عطا فرما دیا اور اس طرح آپ نے نہ صرف عظیم نقصان کی عظیم ترین تلافی ہی فرما دی بلکہ ہندوستان میں اسلام کا نام تک ختم کر دینے کے انگریزی ناپاک عزائم کو بھی ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا۔

دارالعلوم دیوبند کی یہ ہی وہ علمی فکری اور قاسمی جامعیت ہے کہ جو طرّہ امتیاز کی حیثیت سے دارالعلوم کو چار دانگ عالم میں بلا استثناء تمام صحیح العقیدہ دینی مدارس و معاہد کی مرکزیت کا حامل بناتی ہے۔

۷۔ اس عالمگیر مرکز علم و دین کا کتاب وسنت سے ماخوذ درج ذیل تاسیسی فکر بھی حضرت الامامؒ کے عظیم امتیازات میں ایک ایسا بیش قرار اضافہ ہے کہ جو مقبولیت عند اللہ کی بدولت نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دنیا میں تاسیس مدارس کے لیے آج اُسوۂ عمل بن چکا ہے اور وہ یہ کہ حسب روایت حدیث حق تعالیٰ نے پشت آدم علیہ السلام سے کل اولاد آدم کو نکالا اور تمام حجابات اٹھا کر اپنی ذات سراپا جمال وکمال کی جلوہ نمائی کے ساتھ: السستُ بربکم کا سوال فرمایا اور اس سراپا عمل حکمت کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے بھوکے قلب کو اپنے جمال کے ذریعہ ''سوزِ عشق''، کیف علم کے تحفۂ غذا

آراستہ کریں جو بدلتے ہوئے وقتوں سے مناسبت رکھتی ہو۔ دوسری مرتبہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کان پور میں دوبارہ ندوۃ العلما کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ندوۃ کو ایسے علما تیار کرنے چاہئیں جو عصری تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ان سے اپیل کی تھی کہ وہ تعلیم کو جدید خطوط پر چلائیں اور بنک کے سودی کاروبار، پردہ کے نظام، تعلیم نسواں اور نصاب میں اصلاح جیسے معاشی اور سماجی مسائل پر بحث و مباحثہ کر کے ان کا حل تجویز کریں۔

اسی طرح ۱۹۱۷ء میں حکیم صاحب نے اپنے آدرش کو عملی شکل دینے کی غرض سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی ممتاز شخصیتوں سے مشورہ کیا جنھوں نے ان کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ان اقدامات نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں اپنے پیغام کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس لیے حکیم صاحب کے خاکے کے مطابق مقامی رہنماؤں نے دہلی میں ایک مسلم کالج کے قیام کا فیصلہ کیا۔ چندے کی فراہمی کے لیے ایک اپیل جاری کی گئی جس کے نتیجے میں حکیم صاحب ڈیڑھ لاکھ روپے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے جبکہ اخراجات کا تخمینہ ساڑھے چھ لاکھ روپیوں سے کم نہ تھا۔ حکیم صاحب نے جگہ جگہ جلسے منعقد کیے، اپنے ہم مذہبوں سے خطاب کیا، اپنے فرقے کی زبوں حالی پر اظہار افسوس کیا اور دہلی میں ایک مسلم کالج کے قیام کی ضرورت پر اصرار کیا۔ انھوں نے لوگوں کو ان کے بچوں کو تعلیم سے بہرہ مند کرنے کی ذمہ داری سے آگاہ کیا کیونکہ وہ اس حقیقت میں یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کی جانب سے پہلو تہی اسلام اور انسانیت کے روشن نام کو داغدار کرنے کے عمل کے مترادف تھی۔ ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> "گزشتہ تاریخ کی تفصیلات میں جانے کے بجائے ہم محض حالیہ وقتوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں شاہ ولی اللہؒ جیسی نابغۂ روزگار شخصیت موجود تھی جن کی تحریروں نے مصر جیسے دور دراز ممالک میں مقبولیت حاصل کی۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیزؒ جیسے نامور عالم کی علمیت حقیقت بن کر روشن ہوئی جن سے آنے والی صدیوں تک لوگ اکتساب کرتے رہیں گے۔ یہیں مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور شاہ کلیم اللہؒ جہاں آبادی جیسے عظیم صوفی تھے جن کی زندگی مردہ جسموں میں جان ڈال سکتی تھی۔ اسی طرح حکیم شریف خاں اور حکیم ارزانی جیسے عظیم معالج گزرے ہیں جن کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی۔ دہلی کے اسی شہر میں ایسے عظیم شاعر اور فنکار موجود تھے، تاریخ

عنایت فرما کر آسودہ فرمایا اور سوال کے ذریعہ جھو کے دماغ کو ''کیف علم'' کے تحفۂ غذا سے سیری مرحمت فرمائی۔

یہ دو ازلی خدائی تحفے اس طرف مشیر ہیں کہ انسانیت، ارتقاءِ مطلوب کی منزل مراد تک صرف اسی نظام کے ذریعہ باریاب ہوسکتی ہے کہ جو بیکراں وسعتیں رکھنے والے انسانی دماغ کو علوم بے نہایت عطا کرے اور عروج الی اللہ کے دانائے راز قلب انسانی کو سوزِ عشق سے راہِ عروج کی راہ نمائی بخش سکتا ہو اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ انسانی نظامِ حیات میں علم و عشق کی یہ بہم آمیزی، عقل انسانی نہیں صرف خالق انسان کی قدرت بے نہایت ہی کر سکتی ہے اور بواسطۂ انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت کی جانب سے دین اسلام جیسے علم و عشق سے مرکب نظام کامل و مکمل پر انسان کو عمل کا مخاطب بنایا جانا اس اعلان کو کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں بننے دیتا کہ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرنے کے باوجود یہ دین فطرت انسان کو مقنن تسلیم نہیں کرتا۔

نیز اسی سے یہ ناقابل انکار انکشاف بھی برملا سامنے آجاتا ہے کہ نہ تنہا ''علم''، مسائل انسانیت کا حل ہے اور نہ تنہا ''عشق'' کیونکہ یہ امر مشاہد اہل علم کے لیے مسلم حقیقت ہے کہ شرک و کبر نے جب بھی جنم لیا تو وہ ''علم بے عشق'' ہی کے بطن سے جنم لیا ہے اور بدعت جب بھی معرض وجود میں آئی ہے تو ہمیشہ اس کا ذریعۂ تخلیق ''عشق بے علم'' ہی بنا ہے۔

لہٰذا علم و عشق کی بہم آمیزی کے معنی یہ ہیں کہ عشق، علم کو تواضع آمیز کر کے صحت و پُر تاثیری عطا کرتا ہے اور علم اتباع سنت کی راہ نمائی کے ذریعہ عشق کو وسیلۂ قرب و معرفت بناتا ہے اور ماضی کی طرح آج بھی ملت اسلامیہ میں علم بے عشق جو فتنے جگا رہا ہے اور ایسے ہی عشق بے علم کی کوکھ سے جن نو ایجاد بدعات کی روز بروز تولید ہو رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

پس بانی دار العلوم حضرت الامامؒ النانوتوی نے اپنے رفیع القدر اتباع سنت پر مبنی ذوق کے تحت اس مرکز کے نظام میں علم و عشق کو اس طرح بہم آمیز فرمایا کہ درسگاہوں میں طلبہ کو دورانِ درس اساتذہ سے علمی تحقیق پر مبنی ہر قسم کے سوالات کی اصولاً آزادی عطا فرما کر اور اساتذۂ کرام کو اطمینان بخش جواب دہی کا مکلف بنا کر طلبہ کے دماغوں کو زیادہ سے زیادہ غذائے علم سے آسودگی کا موقعہ مہیا

میں جن کا کوئی ثانی نہ تھا۔"

اپنے دور کی دردناک صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"۔۔۔وہی شہر جس میں ایسی عظیم اور ممتاز شخصیتیں قیام پذیر تھیں اب وہاں نہ تو کوئی ولی ہے اور نہ ہی محدث، نہ کوئی صوفی ہے اور نہ ہی مقرر۔ بہار کی جگہ خزاں نے لے لی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دہلی میں ایک اسلامی کالج کے قیام کی شدید ضرورت ہے۔"

حکیم صاحب نے مزید فرمایا کہ:

"اگر ہم پانچ برس پہلے کالج کو قائم نہ کر کے ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو اگلے پانچ سال تک اس کا قیام عمل میں نہ لا کر اس سے دوگنا گناہ کے مرتکب قرار دیے جائیں گے"۔

تاہم قومی سیاست میں حکیم صاحب کی بے پناہ مصروفیت کے سبب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور انھوں نے وہ ساری رقم جو اس مقصد کے لیے جمع کی گئی تھی چندہ دہندگان کو واپس کر دی لیکن جلد ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا جس کے بانیوں میں ان کا نام سر فہرست رہا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں حکیم صاحب کو آل انڈیا کانگریس کے احمد آباد میں منعقدہ اجلاس کی صدارت کا فخر حاصل ہوا۔ اپنے خطبہ صدارت میں انھوں نے حالات حاضرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ترک موالات کو عام کرنے کی اپیل کی۔ اسی اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے "آزادیٔ کامل" کا ریزولیوشن پیش کیا جسے گاندھی جی نے مسترد کرانے میں بڑی محنت کی۔ اسی سال حکیم صاحب نے ہندو مہاسبھا کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے تاریخی شواہد سے مسلم حکمرانوں کی رواداری کے حوالے دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم کرنے کی اپیل کی۔ وہ واحد مسلمان رہنما تھے جنھیں ہندو مہاسبھا کی مجلس استقبالیہ کا صدر ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ یہ حقیقت حکیم صاحب کی ہر دلعزیزی کا ثبوت مہیا کرتی ہے ۱۹۲۲ء میں حکیم صاحب کانگریس کی عدم تعاون سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے اور Pro-Changer کہلائے بعد ازاں وہ سوراج پارٹی کے بانیوں میں شامل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے ساتھ مل کر یونٹی کانفرنس کا انعقاد کروایا جو گاندھی جی کے برت رکھنے کے سلسلہ میں تھا۔ اسی طرح انھوں نے انڈین یونین کے بانی کی حیثیت سے پنڈت موتی لال نہرو کی مدد کی۔

فرمایا اور طلبہ پر درس گاہوں سے باہر "ماحول مدرسہ" میں احترام کامل کے ساتھ اساتذہ کی بلا چون وچرا ایسی اطاعت وفرماں برداری پر مامور فرمایا جیسی خانقاہوں میں مرید اپنے شیخ کی اطاعت کرتا ہے اور اس ذریعہ سے سوز عشق سے حصہ یابی کی طرح ڈال کر حضرت الامامؒ نے خانقاہی مقصد سے بھی طلبہ کو مانوس کرنے کی معقول وموثر تدبیر فرمادی۔

بالفاظ دیگر علم وعشق کی باہم آمیزی کی ضرورت وعظمت پر مشتمل معروف دانائی آمیز مقولے "ہر طالب علمے کہ چون وچرا نہ کند، وہر طالبے کہ چون وچرا کند ہر دورا در چراگاہ باید رسانید" کو حضرت الامامؒ نے اُصولی حیثیت دے کر شامل نظام تعلیم وتربیت فرمادیا۔

پھر علم وعشق چونکہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ظہور وبروز کے طالب ہیں پس مذکورہ پرداز تعلیم وتربیت پر تاریخ شاہد ہے کہ اس مرکز علم ودین کے وابستگان کے ذوق علم کو عشق آمیز تواضع نے شرک وکبر سے نہ صرف دور بلکہ نفور بنادیا ہے اور داعیۂ عشق کو، علم کی رہنمائی کتاب وسنت نے تمام نوایجاد بدعتوں سے پورے طور پر تحفظ عطا کردیا ہے اور آج بحمداللہ ملک وبیرون ملک میں لاتعداد مدارس اسلامیہ حضرت الامام علیہ الرحمہ کے جاری فرمودہ اسی علم وعشق آمیز نظام پر نہایت کامیابی کے ساتھ مصروفِ خدمت ہیں۔

۸۔ اسی جامع ترین اسلامی فکر قاسمی کا وہ بنیادی نقطۂ امتیاز جس کو ہر دور میں وارثین فکر قاسمی کے اکابر واصاغر نے بقوت سنبھالا ہے وہ ملت اسلامیہ میں ناصواب مکاتبِ فکر کی تولید پر چراغ پا نہ ہوکر ان کی اصلاح کی جدوجہد کرنا ہے۔

جس کی قرین عقل وجہ اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ جس امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کو ظاہر وباطن میں سراپا علم وحکمت کتاب قرآن عظیم کی صورت میں مرحمت فرمائی گئی اور: انا خاتم النبیین لا نبیَّ بعدی کے ذریعہ عالمگیر اعلان ختم نبوت اور: اُوتیت علم الاولین والآخرین کے عالمگیر اعلان اور علم عظیم وکثیر کا منفرد دعویٰ لیکر آنے والی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پیکر علم وعرفان ذات مقدسہ عطاء فرمائی گئی ہو اس بے حساب کثرتِ علم کے بعد یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ مکاتب فکر کی کثرت وہیں ہوسکتی ہے جہاں علم کی کثرت ہو پس بلا امتیاز حق وباطل

جامعہ کو جاری وساری رکھنے کے لیے حکیم صاحب کو کئی دشواریوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ایک طرف تو جامعہ کے روزمرّہ کے اخراجات کے لیے وسائل کی فراہمی کی جستجو کرنا پڑتی تھی تو دوسری طرف حکومت نواز عناصر کی جانب سے جامعہ کے خلاف کی جانے والی سرگرمیوں کا سدِباب کرنا پڑتا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ علی گڑھ کالج کے ارباب اختیار اس سلسلے میں اس قدر اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے کہ انھوں نے تہذیب واخلاق سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے صفحات بدگوئی سے پُر رہنے لگے اور انگریزی اور دیسی زبانوں کے اخبارات کی خدمات بھی اس مقصد کے لیے حاصل کر لی گئی تھیں لیکن حکیم صاحب اس نوزائیدہ ادارے کی تعمیر کے سلسلے میں باوقار طریقے سے ثابت قدم رہے۔

ابتدا میں خلافت کمیٹی جامعہ کی کفالت اور اس کے لیے رقوم کی فراہمی کے لیے ذمہ دار تھی اس لیے اس کے بجٹ کے پیش نظر کمیٹی نے دس ہزار روپے منظور کیے تھے لیکن یہ رقم ناکافی ثابت ہوئی۔ حکیم صاحب سیاسی جماعتوں سے چندوں کی فراہمی کے حق میں نہیں تھے اس لیے انھوں نے طے کیا کہ جامعہ کو ایک خود کفیل ادارہ بنانے کے لیے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے جگہ جگہ جاکر لوگوں کو جامعہ کی رفتار ترقی سے واقف کرایا، جامعہ کو والیان ریاست اور معاشرے کے اعلا طبقوں سے روشناس کرایا اور قومی رہنماؤں کو جامعہ میں مدعو کر کے اس کے لیے رقومات فراہم کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ انھوں نے نومبر ۱۹۲۰ء ہی میں خلافت کمیٹی سے یہ قرارداد منظور کرالی کہ جامعہ ایک آزاد تعلیم گاہ ہوگی جو کسی جماعت کے تئیں جواب دہ نہیں تھی۔ تاہم خلافت کمیٹی نے بھی قومی تعلیم کو فروغ دینے کے خیال سے جامعہ کی مالی امداد کے لیے ایک تعلیمی فنڈ قائم کرنے اور ایک ایسے ادارے کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے نظریے سے قراردادیں منظور کیں جو تحریک ترک موالات کے نتیجہ میں قیام پذیر ہوا تھا۔ جامعہ کو ایک آزاد تعلیمی دانش گاہ اور متحد ہندوستان میں مستقبل کی مسلم ثقافت کے مرکز کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ بڑی حد تک نظر انداز کیے جانے اور شدید مخالفتوں کے باوجود جامعہ نے محض دو برس کے قلیل عرصے میں ترقی کی وہ منزلیں طے کرلیں جن پر کوئی بھی ادارہ خود پر فخر کر سکتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس قومی ادارے کے لیے دس لاکھ روپیوں کی فراہمی کے لیے ایک اپیل جاری کی گئی اور یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ضلع کی سطح پر ہر خلافت کمیٹی اس یونیورسٹی کے لیے کم از کم بیس روپے چندہ دے یا ہر صوبہ کے اضلاع کی تعداد کے تناسب سے صوبائی خلافت کمیٹیاں ایک مناسب رقم مہیا کریں۔

اور بلا فرق خطا و صواب مکاتب فکر کی بکثرت تولید صرف اسی امت میں ہو بھی سکتی تھی اور اسی امت میں ہوئی بھی ہے دیگر تمام مدعیانِ علم امم و اقوام میں چونکہ یہ کثرت علم نہیں ہے، اس لئے نتیجتاً کثرت مکاتب فکر بھی نہیں ہے۔

چنانچہ دعویٰ علم کے باوجود یہودیت میں اسلام سے بہت قدیم ہونے کے باوجود کوئی بھی دینی اور مذہبی مکتب فکر معروف و معلوم نہیں ہے ایسے ہی دنیائے عیسائیت ''پروٹسٹنٹ'' اور ''کیتھولک'' کے ناموں سے موسوم صرف دو بنیادی مکاتب فکر پر منقسم ہے جو بذاتِ خود اس کی دلیل ہے کہ یہودیت و عیسائیت میں مذہبی اساس پر تقلیل مکاتب فکر کی وجہ قلّتِ علم کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

۹۔ اس کے برخلاف کتاب اسلام ''قرآن کریم'' اور ''نبی اسلام'' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سرمنشاء علوم بے نہایت ہیں۔ اس لئے عہد نبوت ہی سے علمی بنیادوں پر خطا و صواب کے جزوی اختلافات پر مبنی مکاتب فکر کی تولید کا آغاز ہو گیا تھا پھر علمی ارتقاء کے ساتھ کتاب و سنت میں مکنون و مستور بے نہایت علوم و معارف کی تخریج نے مخالفین اسلام کی رگ حمیّت و جاہلیت کو جھنجھوڑا اور ان باطل پسندوں نے کتاب اللہ کی سنت رسول اللہ سے مؤید متبادر مرادات و مدلولات میں تاویلاتِ باطلہ کر کے اپنے زیغ قلبی کے تحت تعلیماتِ اسلام سے یکسر منحرف باطل مکاتبِ فکر کے انبار لگا دیئے، لیکن مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے یہ فتنہ کوئی نئی چیز نہیں تھا کہ اس کی پیشین گوئی نبی کریم صلعم بہت پہلے اس طرح فرما چکے تھے کہ یہود و نصاریٰ تو بہتر فرقوں میں بٹے تھے اور میری امّت تہتر فرقوں میں بٹے گی جن میں میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقہ پر چلنے والے طبقہ کے سوا باقی سب جہنمی ہوں گے۔ بہتر کا عدد مطلقاً کثرت کی جانب مشیر ہوتا ہے پس یہ روایت اس حقیقت کو واشگاف کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس امت میں ایک حق کے بالمقابل باطل مکاتب فکر بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہیں گے کیونکہ یہ سب باطل فرقے قطعی طور پر ثابت شدہ حقائق کے منکر ہونے میں شریک ہوں گے البتہ ان کی تاویلات باطلہ کے پرداز میں فرق ہوگا اس لئے ان سب کے مقابلے میں بلا تامل اول مرحلہ میں ایک حق صریح کو مدلل پیش کر دینے کے بعد دفاع عن الاسلام کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہوتا بھی رہا ہے۔

حکیم صاحب کی کوششوں سے مالی طور پر جامعہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو گئی اور خلافت کمیٹی نے اس کے لیے بجٹ پاس کرنا بند کر دیا۔

۱۹۲۴ء میں جامعہ ایسے شدید مالی بحران سے دوچار ہوئی کہ اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء ہی میں واپس لے لی گئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے خلافت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں تحریک کے تئیں قومی رہنماؤں کا جوش و خروش بھی سرد پڑ گیا۔ سیاسی جماعتوں کو بھی ملکی حالات سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایسے حالات میں جامعہ بھی مفلس ہو گئی اور مالی بحران اس قدر شدید ہو گیا کہ اسے بند کر دیے جانے تک کی تجویزیں پیش کی جانے لگیں لیکن حکیم صاحب اور ان کے رفقا یعنی ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ نے بروقت یہ فیصلہ کیا کہ اسے بند نہیں کیا جا سکتا۔ مہاتما گاندھی نے بھی حکیم صاحب اور ان کے رفقا کی ہمنوائی کرتے ہوئے یہ پیش کش کی کہ اگر روپیوں کی ضرورت جامعہ کی راہ میں حائل تھی تو وہ خود اس کے لیے بھیک مانگنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

اس وقت ذاکر صاحب جرمنی میں قیام پذیر تھے جہاں وہ عارضی طور پر جامعہ سے رخصت لے کر اپنی ریسرچ کی تکمیل میں معروف تھے۔ جب انھیں جامعہ کو بند کیے جانے کی تجویز سے متعلق اطلاع ملی تو انھوں نے تار کے ذریعہ حکیم صاحب کی خدمت میں یہ پیغام ارسال کیا کہ

"میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"

اس پیغام کے موصول ہونے کے بعد جامعہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے ایک وفد نے حکیم صاحب سے ملاقات کر کے ان سے درخواست کی کہ وہ ذاکر صاحب کی واپسی تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ انھوں نے حکیم صاحب کو یقین دلایا کہ وہ جامعہ کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے بغیر کسی معاوضہ کے اس کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ ان یقین دہانیوں کے پیش نظر حکیم صاحب نے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جہاں وہ بہتر طریقہ پر اس کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ یہ مسئلہ مجلس امنا کے جلسے میں زیر بحث آیا تو حکیم صاحب نے جامعہ کے دہلی منتقل ہو جانے کی صورت میں اس کی تمام تر ذمہ داری اپنے آپ پر لے لی۔ مولانا محمد علی اور بہت سے اراکین کو جامعہ کے دہلی منتقل کیے جانے کی تجویز سے اختلاف تھا۔ وہ اس تجویز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس عمل سے خود ادارے کا خاتمہ بھی ہو سکتا تھا تاہم جامعہ کو جاری رکھنے کے سوال پر ایک ذیلی کمیٹی

لیکن دوسری جانب صواب کے بالمقابل وہ خاطی مکاتب فکر ہوں گے کہ جو اسلام کے اُمور کلیہ کے اقرار میں تو شریک ہوں گے لیکن امور جزئیہ میں تاویلات غیر صحیحہ کی وجہ سے افہام و تفہیم کے مستحق ہوں گے اور ظاہر ہے کہ یہ خاطی مکاتب فکر، باطل مکاتب فکر کے مقابلہ پر بدرجہا تعداد میں ہمیشہ زیادہ ہوں گے اور طلب حق کی مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے: المجتهد یخطئ ویصیب کے تحت ماجور ہوں گے۔

لیکن اس کے برخلاف کتاب و سنت کے علم صحیح سے مستفید و ترجمان علماء کرام کا یہ ایک دائمی اہم ترفریضہ ہوگا کہ وہ ہر زمانہ میں باطل مکاتب فکر کے بالمقابل متصلّب ہوں اور خاطی مکاتب فکر کو برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل اور وسیع الحوصلہ ہوں کیونکہ یہ مکاتب فکر ضروریات دین سے منحرف نہیں ہیں۔ لیکن ان کی جزئیات غلط تاویلات قابل تصحیح و اصلاح ہونے کے باوجود ان کے دین پر قائم رہنے کے جذبہ کی یقین دہانی کے لئے کافی ہیں۔

اس لئے خاطی مکاتب فکر کے بارے میں اس تحمل پسندی اور وسعت حوصلہ کو دارالعلوم دیوبند کا اجتماعی دینی مزاج بنا دینا حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کا افراط و تفریط کے مابین اسلامی اعتدال کا وہ بیش قرار نمونہ ہے کہ جس کو حضرت الامام کا ممتاز ترین امتیاز قرار دینا عین انصاف ہوگا۔

اسی معتدل مزاجی کا یہ خوش آئند نتیجہ ہے کہ بعض طبقات نے علماء دیوبند کو اپنی قلت علم اور حق ناشناسی کی بنا پر ہدف تکفیر بنایا لیکن اسی اعتدالی جماعتی مزاج سازی کے تحت اکابر و علماء دیوبند مکفّرین کی ضروریات دین کے مُقِر ہونے کی بنا پر ان کے اس سراسر غیر اسلامی ایذا رساں حملے کو برداشت کر کے انہیں درس خیر خواہی سے نوازتے رہے اور صحیح تعلیمات اسلام کے تحت ان کی تکفیر سے ہمیشہ ممکن احتراز فرماتے رہے۔

۱۰۔ حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے امتیازات میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کا امتیاز بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس ذوقِ عظیم و سلیم سے بھی حق تعالیٰ نے آپ کو وہ حصہ وافر عطا فرمایا تھا کہ جو اس دور میں بھی عوام میں تو آج کی طرح مضمحل ہو ہی چکا تھا خواص میں بھی صرف اخص الخواص ہی ذوق جہاد سے آشنا تھے۔

میں تفصیل سے بحث و مباحثہ ہوا جو اسی مقصد کے لیے تشکیل کی گئی تھی اور حکیم اجمل خاں، علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور عبد المجید خواجہ پر مشتمل تھی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ جامعہ کے وجود کو قائم رکھا جائے۔ مزید برآں ١٧ر مارچ ١٩٢۵ء کو حکیم صاحب کی صدارت میں فاؤنڈیشن کمیٹی نے اپنے جلسے میں یہ فیصلہ کیا کہ جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔ اس فیصلہ پر مہاتما گاندھی نے بھی اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

اب جامعہ کے مستقبل کی تمام تر ذمہ داری حکیم اجمل خاں کے کاندھوں پر آ گئی کیونکہ اسے دہلی منتقل کرنے کے سلسلے میں انھوں نے ہی پہل کی تھی۔ ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ میں جامعہ کی حالت ایک دم توڑتے ہوئے مریض کی سی تھی جسے مسیحا انتہائی مایوس کن حالات میں اپنے گھر لے گیا۔ دہلی میں جامعہ کو قرول باغ میں طبیہ کالج سے ملحق کرایہ کی ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اب یہ حکیم صاحب کے ذمہ تھا کہ وہ دونوں اداروں کی نگرانی کریں۔ مولانا محمد علی نے بالکل صحیح خیال کا اظہار کیا تھا کہ "طبیہ کالج حکیم صاحب کی جوانی کی اولاد تھی اور جامعہ ملیہ ان کے بڑھاپے کی اولاد تھی۔" اور یہ کہا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی اولاد کے لیے باپ کی محبت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال درپیش تھی کہ جامعہ کے لیے ان کی محبت اس حد تک پہنچ گئی کہ انھوں نے اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جائداد کا ایک حصہ تک فروخت کر دیا اور اپنے زیورات کو فروخت کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ جامعہ کے طالب علم ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں "حکیم صاحب کے ذاتی تعلقات اس قدر وسیع تھے کہ وہ جامعہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کہیں نہ کہیں سے روپیہ فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ خود جامعہ کے لوگ بھی اس حقیقت سے ناواقف رہتے تھے کہ وہ کہاں سے رقومات کی فراہمی کرتے تھے۔۔۔۔ یہ حکیم صاحب کا اَن دیکھا ہاتھ ہی تھا جس نے ہمیشہ جامعہ کے لوگوں کی تقدیر کو سنوارا۔" اسی طرح انھوں نے والیان ریاست سے بھی جامعہ کے فنڈ میں دل کھول کر چندہ دینے کی اپیلیں کیں اور جواب میں اچھی خاصی رقومات حاصل کیں۔ ادارے کے لیے چندے کی فراہمی میں ان کے ذاتی اثر و رسوخ کارفرما رہے۔ حکیم صاحب نے خود بھی مختلف مقامات کے دورے کیے اور جامعہ کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ ان کی ذاتی آمد کے سبب لوگ زیادہ سے زیادہ چندہ دیا کرتے تھے۔ ایسے سفر کے دوران وہ نہ صرف جامعہ کے لیے مالی امداد حاصل کرتے تھے بلکہ لوگوں کو تعلیم کی ضرورت اور اس کے اصل مقصد سے واقف کراتے ہوئے قومی تعلیم کے کاز کو فروغ دینے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ انھوں نے

اسلام میں جہاد کی غیر معمولی عظمت واہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہونے والے جہاد پر عظیم اجر وثواب کا وعدہ فرما کر اس کو مہتم بالشان عباداتی حیثیت واہمیت عطا فرمائی ہے۔

کسی مذہب کی دعوت یا کسی مخصوص نظریۂ حیات کی پیشکش کی صورت میں مخاطب کو اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے مکمل اختیار کا دیا جانا ایک ایسا مسلم اور نا قابل اختلاف متین ضابطہ ہے کہ تمام معقولیت پسند انسانی طبقات میں کبھی اور کہیں بھی یہ ضابطہ دورایوں سے دوچار نہیں ہوا اس ضابطہ مسلمہ کو جذباتیت یا غیظ وغضب یا جہالت کے تحت قبول نہ کرنا وہیں سر اُبھارتا ہے کہ جہاں مدعی کا فکر وذہن اپنے دعاوی پر یا دلائل قویہ سے خالی ہو یا طریق اثبات کی قوی اور مسکت صلاحیت سے عاری ہو۔

حضرت الامام النانوتویؒ کے فکر وذہن کو حق تعالیٰ نے کمالِ علم وحلم کے ساتھ اپنے دعاوی پر مسکت دلائل قویہ قائم کرنے کی ایسی منفرد صلاحیت عظیم سے نوازا تھا کہ احباب واغیار ہی نہیں بلکہ اعدا بھی ان کی استدلالی قوت پر بصد اعتراف سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

مباحثہ شاہجہانپور حضرت الامام النانوتویؒ کی امتیازی قوت استدلال پر ایک ایسی نا قابل انکار شہادت ہے کہ جس سے مؤرخ صرفِ نظر کر کے اپنے اوپر تنگ نظری اور حقائق ناشناسی کا الزام لینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔

۱۱۔ میدانِ شاملی میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کی تیاری کے دوران، جماعت میں ایک افتراق انگیز اختلاف پیدا ہوا جس کے سدّ باب میں حضرت الامامؒ کی عالمانہ وعارفانہ ذہانت کی یہ امتیازی کارفرمائی بھی تاریخ کا ایک اہم باب بنی کہ انگریزوں کے برخلاف جنگ کے منصوبے پر علماء وقت کے بھرپور اتفاق کے باوجود جماعت کے ایک مسلّم بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اس رائے کی وجہ سے ہمنوا نہیں تھے کہ مسلمان جنگ کی قرار واقعی تیاری سے بے سروسامان ہیں اس بے سروسامانی میں جنگ ہلاکت وتباہی کے سوا کسی دوسرے نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی، حضرت موصوف کی اس رائے کی وجہ سے ان کے وابستگان کی معتد بہ تعداد کے عدم اتفاق کا خطرہ یقینی تھا اس کے پیش نظر مؤثر وممتاز علماء متفرقاً اور مجتمعاً معتد بہ تعداد میں حاضر ہو کر عرض ومعروض کرتے

قومی اداروں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے اور انھیں منظم کرنے کی سمت میں بھی کوششیں کیں تاکہ اعلا تعلیم کے مقصد کی کامیابی کے ساتھ حصولیابی ممکن ہو۔ انھوں نے تعلیم کو اولین ترجیح دی اور اپنے ہم مذہبوں میں شادیوں اور دوسرے سماجی رسم و رواج پر اسراف بے جا کی سخت مخالفت کی اور خود اپنی بیٹی کی شادی کے بجٹ کا ایک حصہ جامعہ کی نذر کر کے ایک مثال قائم کی اور دولھا کے گھر کے لوگوں سے بھی ایسا ہی کرنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے جامعہ کی مالی دشواریوں کو حل کرنے کی غرض سے مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ سے بھی مدد لی۔ مہاتما جی نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ جامعہ کے فنڈ میں زیادہ سے زیادہ چندہ دے کر اس ادارے کی مدد کریں۔

یہ تمام حقائق جامعہ کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے سلسلے میں حکیم صاحب کی پُر خلوص کوششوں کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرے قومی اداروں کے مقابلہ میں جامعہ کا بجٹ بہت کم تھا اس لیے دہلی کا ایک واحد گروہ بآسانی اس کی مالی ذمہ داریاں اپنے سر لے سکتا تھا۔ اس عمل سے جامعہ ایک دو برس ہی میں خود کفیل ہو سکتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے جامعہ کے مالی استحکام پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کی۔ انتظامی، تعلیمی اور اشاعتی میدانوں میں بھی انھوں نے بہت سے لوگوں کا تعاون حاصل کیا تاکہ جامعہ ایک مثالی ادارہ کی حیثیت اختیار کر سکے۔

جب ۱۹۲۵ء میں حکیم صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے ساتھ یوروپی ممالک کا سفر کیا تو ذاکر حسین ان سے ملاقات کی غرض سے برلن سے پیرس پہنچے۔ جو جرمنی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد جامعہ کی خدمت کا عہد کر چکے تھے اور اپنے اس فیصلہ سے وہ پہلے ہی تار کے ذریعہ حکیم صاحب کو مطلع کر چکے تھے۔ ذاکر حسین نے اپنے عہد کو دہراتے ہوئے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کو یقین دلایا کہ وہ وطن واپسی کے بعد اپنی خدمات جامعہ کے لیے وقف کر دیں گے۔ بعد ازاں ذاکر صاحب نے عابد حسین، محمد مجیب، برکت علی قریشی اور خواجہ اے۔ حمید کو تاکید کی کہ وہ سب بھی حکیم صاحب سے ملاقات کے لیے جائیں اور جامعہ کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کرنے کے فیصلہ کا یقین دلائیں۔ چنانچہ یہ چاروں ہندستانی نوجوان ویانا پہنچے جہاں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ان دنوں قیام پذیر تھے۔ حکیم صاحب اپنے وطن سے دور دراز مقام پر ایسے گرم جوش نوجوانوں سے مل کر بہت خوش ہوئے جو ایک قریب المرگ ادارے کی خدمت کے لیے تیار تھے۔ بعد ازاں ویانا میں حکیم صاحب سے اس ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کے۔ اے۔ حمید۔ نے لکھا:

رہے لیکن ان کی رائے نہ بدلوا سکے۔

اور وقت کے تمام بزرگ بخطرۂ اختلاف حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی تائید کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے مشوش تھے جب کوشش کے باوجود ان کی ہمنوائی سے مایوسی ہوگئی تو جماعت کے حضرات کی آخری کوشش کے طور پر "حضرت الامامؒ" نے بموجودگی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ وغیرہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب سے ملاقات فرمائی اور آغازِ گفتگو اسی پرداز سے فرمایا جس پر اب تک بیشتر علماء کرام فرما چکے تھے اور ان کا جواب بھی وہی تھا کہ جو دوسروں کو دے چکے تھے اس پر حضرت الامامؒ نے سوال فرمایا کہ حضرت کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ یہ سن کر سب سے پہلے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے خود فرمایا کہ بس اب الحمدللہ شرح صدر ہو گیا اسی پر اختلاف ختم ہو گیا اور جنگ کی تیاری شروع ہو گئی پس جس خطرۂ اختلاف کو بزرگانِ جماعت محسوس کر کے غیر معمولی خدشہ محسوس فرما رہے تھے وہ حق تعالیٰ نے حضرت الامامؒ کے صرف ایک توکل علی اللہ پر مبنی سراپا دانش سوال کے ذریعہ ختم فرما کر جماعت کو اختلاف سے محفوظ فرما دیا۔

۱۲۔ حضرت الامامؒ کی علمی وسعت پر درج ذیل ایک مزاحی جملے کا عرفانی تجزیہ بھی شاہد ہے کہ ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی کے چیلنج پر تاریخ مناظرہ طے کرنے کے لیے حضرت الامام النانوتویؒ کی جانب سے دو تلامیذ خصوصی مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور ایک معتمد شیخ نہال احمد صاحب اس وقت روڑکی پہنچے کہ جب پنڈت جی کے لیے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا ملاقات کے کمرہ سے باہر ان حضرات کی موجودگی میں پنڈت جی کے لیے کھانا اتنی بڑی مقدار میں تھا کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے کافی ہوتا لیکن گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ تنہا ہی پنڈت جی نے کھانا کھایا ہے، واپسی میں شیخ نہال احمد صاحب نے اپنے رفقاء سے مزاحاً کہا کہ علم میں مناظرہ ہوگا تو پنڈت جی ایک منٹ بھی ہمارے حضرت کے سامنے ٹھہر نہ سکیں گے۔ لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو کیا ہوگا کیونکہ حضرت الامام اتنے کم خوراک تھے کہ اکثر اوقات تو نصف روٹی پر ہی بس فرما دیتے تھے۔ دیوبند واپس آنے کے بعد شیخ نہال احمد صاحب کا یہ مزاحی جملہ حضرت الامامؒ کو پہنچا تو آپ نے شیخ نہال احمد صاحب کو بلایا وہ بہت گھبرائے لیکن جواب دینے کے لیے ان کی زبان سے

"۱۹۲۵ء میں کسی وقت حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری یورپ آئے۔ ذاکر حسین نے پیرس میں ان سے ملاقات کی اور جامعہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا یقین دلایا۔ ذاکر حسین نے عابد حسین، محمد مجیب، برکت علی قریشی اور مجھ سے بھی ویانا جا کر ان دو عظیم رہنماؤں سے ملاقات کرنے کے لیے کہا۔ ذاکر حسین ہمارے ساتھ نہیں جا سکے کیونکہ وہ اپنے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

"ہم چاروں ویانا گئے۔۔۔۔ اور وہاں ہوٹل اسٹوریا پہنچے جہاں اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری قیام پذیر تھے۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے حکیم صاحب کو یورپی طرز کے لباس میں ملبوس دیکھا۔ ہم نے جامعہ کے بارے میں ان سے کئی سوالات کیے اور اپنی وفاداری کو ان عظیم رہنماؤں کی خدمت میں پیش کرنے کا عہد کرتے ہوئے ان کے تئیں اظہار ممنونیت کیا کہ انھوں نے جامعہ کے وجود کو برقرار رکھا تھا۔ ہم نے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کو یقین دلایا کہ ہندستان واپس ہو کر ہم جامعہ کے لیے کام کریں گے۔۔۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے قول کے پکے تھے، اگلے ہی برس وہ محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ ہندستان واپس ہو گئے اور ان تینوں نے جامعہ کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا اور ۱۹۴۷ء میں ملک کے حصول آزادی تک اس کی خدمت میں منہمک رہے۔ اس باوقار مثلث کے آتے ہی اپنے وجود کے چھٹے برس میں جامعہ ملیہ نے زندگی میں نیا قدم رکھا۔ علی گڑھ سے دہلی میں منتقلی، سیاست سے اس کی علاحدگی، اور مغربی تعلیم سے آراستہ لوگوں کے ذریعہ اس کی خدمت کے عہد نے تبدیلیوں کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ذاکر صاحب نے ادارہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی باگ ڈور سنبھالی، ڈاکٹر عابد حسین اس کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور محمد مجیب تاریخ کے پروفیسر بنائے گئے۔ ڈاکٹر عابد حسین اس کی مطبوعات کے نگراں اور "جامعہ" اور "پیام تعلیم" کے ایڈیٹر بھی مقرر کیے گئے۔

حکیم اجمل خاں کی امارتِ جامعہ کے دور میں اس دانش گاہ نے غیر معمولی ترقی کی۔ دہلی منتقل ہو جانے کے بعد وہ اپنی زندگی کے دوسرے مگر نازک دور میں داخل ہوئی۔ اگرچہ دہلی منتقلی نے بیمار جامعہ کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ اس میں کل اسی طلبہ اور اساتذہ رہ گئے تھے لیکن حکیم صاحب کی توجہ اور انتھک کوششوں نے اسے روبصحت کر دیا۔ جامعہ نے اپنی عمارت میں

حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ اس کا ایک جواب الزامی تو یہ ہے کہ کیا ہر مناظرہ کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں، کھانے میں مناظرہ ہوا تو تم مناظرہ کروگے۔ پھر فرمایا تمہارے ذہن میں کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ نہ کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں نہ پیدا ہوا، کیونکہ کھانا بہیمیت کی علامت ہے جس کا تعلق بے کمال سے ہے اس میں مناظرہ کے لئے ہم بیل، بھینس اور ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھانے میں ان کا مقابلہ کرو اور نہ کھانا ملکیت کی خصوصیات میں سے ہے جو کمال سے تعلق رکھتا ہے فرمایا کہ ہمیں اور پنڈت جی کو کھانا کھلا کر الگ الگ دو کمروں میں بند کر کے تالا لگا دو اور چھ مہینے بعد نکالو جو زندہ نکلے اسے برحق قرار دیا جائے اور تحدیث نعمت کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ الحمدللہ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت نہیں ہے صرف اتباع سنت اور اظہارِ عبدیت کے لیے کھاتا ہوں۔

حضرت الامامؒ کے کمال اتباعِ سنت کے نتیجے میں اس صفت ملکیت سے ہر حصہ یابی کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ ''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت'' کا مصداق تھے۔

۱۳۔ حضرت الامامؒ کے روحانی ومعنوی امتیاز پر یہ ایک واقعاتی شہادت ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند علم حدیث میں باامتیاز اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، جو حضرت الامامؒ اور حضرت گنگوہیؒ سے عمر میں کم تھے اور دونوں کے استاذ زادے بھی تھے اس لئے دونوں حضرات نہایت ادب واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب کے قلب میں اپنی جلالِ شان کے ساتھ ایک سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ انہی دونوں بزرگوں نے مجھے یہاں دارالعلوم میں طلبہ کے ساتھ تعلیم میں مشغول کر دیا جس کی وجہ سے میں ریاضت ومجاہدات کے ذریعہ روحانی ترقیات سے محروم ہو رہا ہوں۔ اسی فکر کے نتیجے پر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ آپ کی روحانی ترقی بمشیت اللہ اس تعلیم دین ہی میں مضمر ہے اسے سن کر سکوت تو فرمایا لیکن اور روحانی ترقی کے جذبۂ صادق کے تحت حسب عادت اچانک حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کچھ روز غائب رہے۔

کچھ روز کے بعد واپس تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ اجمیر شریف گئے تھے اور وہاں

تعلیم بالغان کے لیے ایک شبینہ اسکول قائم کیا جس میں پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی طرح دہلی کے باڑہ ہندوراؤ کے علاقے میں بھی اسکول کی ایک شاخ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ "جامعہ" نامی ادبی جریدہ تو ۱۹۲۳ء ہی سے شائع ہو رہا تھا مگر اب پندرہ روزہ "پیام تعلیم" کی اشاعت بھی پابندی سے عمل میں آنے لگی جو اسکول جانے والے بچوں کے خبر نامہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ تعلیمی دلچسپیوں سے متعلق مختلف موضوعات پر اردو کتابوں کی اشاعت اور توسیعی خطبات کے انعقاد کے لیے ایک اردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے سکریٹری ڈاکٹر عابد حسین تھے۔ جامعہ اسکول میں پروجیکٹ طریقہ تعلیم رائج کیا گیا جس نے غیر ملکی ماہرین تعلیم کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ صحافت اور کامرس کے نئے مضامین شروع کیے گئے اور بچوں کو تجارت کے میدان میں عملی تربیت دینے کی غرض سے بچوں کی دکانیں قائم کی گئیں جن کا انتظام بچوں ہی کے ذمہ ہوتا تھا۔ جامعہ کا اپنا باورچی خانہ اور اس کی اپنی اقامت گاہ تھی جہاں ہاؤز سسٹم رائج کیا گیا۔ اسکاؤٹنگ کا آغاز ہوا اور کئی کھیل بھی شروع کیے گئے۔ ایک مرکز صحت بھی قائم کیا گیا جس میں ایک کل وقتی میڈیکل آفیسر کا تقرر عمل میں آیا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے علاوہ جامعہ کو بہت سے دوسرے نامور اساتذہ کی خدمات حاصل تھیں۔ ان میں مولانا عبدالحیٔ (تفسیر) مولانا محمد علی شاہ (حدیث وفقہ) مولانا محمد اسلم جے راج پوری (اسلامی تاریخ) پنڈت جوالا پرساد ایم اے، ایل ایل بی (ہندو اخلاقیات) مولانا محمد علی سواتی (عربی) مولانا شرف الدین ٹونکی (اردو)، محمد عبدالعزیز انصاری ایم اے، ایل ایل، بی، اور سید رؤف پاشا، بی اے (انگریزی)، معظم علی خاں، بی اے (آکسفورڈ) اور ای جی کیلاٹ ایم اے (کیمبرج) (تاریخ و سیاسیات)، وحید اللہ بی۔اے آنرز، (ساجیات) عبدالمجید خواجہ بی اے (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لا (قانون)، اے اے قریشی، بی اے (جغرافیہ) کے اے حمید اور ایل این گپتا، ایم ایس سی (علم کیمیا) ڈی این مکرجی، ایم اے (ریاضی)، آر این سلوم، بی اے (کیمبرج) (علم طبیعیات)، ڈاکٹر محمد عظیم خاں، ایم بی (علم نباتات)، ڈی بی ایسن، ایف ایس ماسٹر بی اے (صحافت) اور اگروال بی اے (کامرس) جیسے اساتذہ شامل تھے۔ ان میں سبھی اپنے اپنے مضمون کے ماہر تھے اور انھوں نے اپنے اپنے میدانوں میں ناموری حاصل کی تھی۔

ایک قومی ادارہ ہونے کے سبب جامعہ نے مہاتما گاندھی کے تعمیری پروگرام کو اپنایا۔ چرخہ اور تکلی جامعہ والوں کے لیے روزمرہ استعمال کی چیزیں بن گئے جن سے ان کے اندر خود کفیل ہونے اور اپنی مدد آپ کرنے کے جذبہ کو تقویت ملی۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ سے ان دونوں بزرگوں کا یہ ہی شکوہ کیا کہ خود مجاہدات سے روحانی ترقی کررہے ہیں اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ تیری ترقی تعلیم دین ہی کے ذریعہ ہوگی، اس پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہ سے القائی جواب یہ ہی ملا کہ وہ دونوں صحیح کہتے ہیں آپ کی ترقی روحانی عنداللہ اسی تعلیم میں مضمر ہے۔

دیوبند واپسی کے بعد یہ تفصیل کسی کو نہیں بتائی اس کے باوجود بوقتِ ملاقات حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ وہی بات جب بڑی سرکار سے بھی سامنے آئی تو اب تو یقین ہوگیا ہوگا کہ ہم خدام جو کچھ عرض کرتے تھے وہ سراپا اخلاص وخیر خواہی پر مبنی تھا۔

حضرت الامامؒ کے اس جملہ پر جہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا چہرہ اعتراف کا اظہار کررہا تھا، وہیں یہ جملہ حضرت الامامؒ کے عرفانی ارتقاءِ عظیم پر شاہد عدل بھی بن رہا تھا۔

۱۴۔ حضرت الامامؒ کی مقدس زندگی کے آخری لحات میں یہ ہی امتیاز بھی آپ کی ولایت کاملہ کا مکمل مصداق بن کر سامنے آیا کہ عالم نزع میں متوسلین ومحبین نے تلقین شروع کی۔ لیکن حضرت الامامؒ انقباض کے ساتھ کبھی چہرہ داہنی جانب پھیر لیتے اور کبھی بائیں جانب، جس سے تلقین کنندگان تشویش وحیرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھے اور حضرت الامام کے اس انقباض کی کوئی توجیہ نہیں کر پارہے کہ اس وقت حضرت الامام کے بحر معرفت کے شناور رفیق لبیب فقیہ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تشریف لے آئے اور تلقین بند کرا کے خود حضرت الامام کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ گئے، چند لمحے بعد وقت موعود آپہنچا اور حضرت الامام رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

اس کے بعد متوسلین نے بوقتِ تلقین حضرت الامام کے انقباض کے بارے میں استفسار کیا تو حضرت فقیہ الاسلام نے فرمایا کہ میرے بھائی اپنی قوت معنوی سے مسمّیٰ تک یعنی ذات بابرکات حق تک واصل ہو چکے تھے اور آپ لوگ تلقین کے ذریعہ اسم کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کررہے تھے تو یہ عروج سے نزول کی طرف لانا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسے موجب انقباض ہونا ہی چاہئے تھا وہی ہوا۔ تلقین بند کرنے کے بعد انقباض ختم ہوگیا اور ان شاء اللہ وہ مقبولیت کے ساتھ اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

جامعہ عدم تعاون اور جلیان والا باغ اور خلافت کی تحریکوں کی پیداوار تھی۔ اسی لیے جامعہ والوں نے ہر سال ۶ر سے ۱۳ر اپریل کی درمیانی مدت کو قومی ہفتہ کی شکل میں منانے کا معمول بنالیا تھا کیونکہ ۱۹۱۹ء میں رولٹ قانون کی مخالفت میں ستیہ گرہ کیا گیا تھا اور امرت سر کے جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر نے سیکڑوں ہندستانیوں کو گولیوں کا نشانہ بنادیا تھا۔ یہ حقیقت بھی جامعہ کے لیے باعث افتخار تھی کہ مہاتما گاندھی کے سوراج فنڈ میں سب سے پہلا چندہ بھی جامعہ ہی کے طلبہ اور اساتذہ نے دیا تھا۔ جامعہ کے لوگوں نے آزادی کی قومی تحریک میں عملی حصہ لیا جس کے نتیجے میں وہ گرفتار بھی ہوئے۔

قومی رہنماؤں پر جامعہ کی ترقی اور حصولیابیوں نے بڑے اچھے اثرات مرتب کیے۔ وہ جامعہ سے اس قدر متاثر تھے کہ ہمیشہ وہاں جانے کے لیے مواقع کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ گاندھی جی کے بیٹے دیوداس گاندھی نے جامعہ میں مدرسی کے فرائض انجام دیے۔ اسی طرح ان کا پوتا رسک لال یہاں کا طالب علم رہا۔ کہا جاتا ہے کہ سبھاش چندر بوس بھی جامعہ کی خدمت کرنے کے خواہاں تھے مگر بنگال میں ان کی موجودگی نے انھیں یہاں پہنچنے سے باز رکھا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی نے جامعہ کے لیے سی ایف اینڈریوز، جے بی کرپلانی اور دوسری ممتاز شخصیتوں کی خدمات کی پیش کش کی تھی۔

حکیم صاحب کے ذاتی اثرات کا نتیجہ تھا کہ قومی رہنماؤں کو جامعہ آنے اور اس کی کارکردگی دیکھنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ان کی امارت کے دوران پی سی رے، ایم، مرماڈیوک پکتھال، وٹھل بھائی پٹیل، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، بیگم سلطان جہاں والیِ بھوپال، سیٹھ جمنالال بجاج، مہادیو دیسائی جیسی نامی گرامی شخصیتوں نے مختلف مواقع پر جامعہ کے جلسوں اور اجتماعات میں شرکت کی، اس کی خدمات کو سراہا اور اس کی ترقی پر اپنی مسرت و طمانیت کا اظہار کیا۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں جامعہ کا معائنہ کرنے کے بعد صدر کانگریس سری نواس آینگر نے کہا تھا کہ "دوسرے قومی ادارے بے جان ہوچکے ہیں لیکن میں جامعہ کو زندگی سے پُر پاتا ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں"۔ اسی طرح ۲ر نومبر ۱۹۲۷ء کو مہاتما گاندھی نے وائسرائے لارڈ اِرون سے ملاقات کی تو اسی روز وہ جامعہ بھی آئے جامعہ میں ان کی یہ آمد حکیم صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس وجہ سے یادگار تھی کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی حیات میں جامعہ میں یہ ان کی آخری آمد تھی۔ چونکہ مہاتما گاندھی جامعہ میں ایک طویل مدت کے بعد آئے تھے اس لیے حکیم صاحب نے جامعہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

۱۵۔ اختتام کلام پر وفات کے بعد کے اس عظیم قرینۂ مقبولیت پر ایک خاص واقعہ کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس کا بھی اس وقت کوئی جاننے والا موجود نہیں ہے۔ یہ واقعہ میرے نانا خسر جناب شیخ حامد حسن صاحب مرحوم نے غالباً ۱۹۵۴ء میں بطور خاص مجھے بلا کر بالمشافہ سناتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دیکھنے والوں میں شاید میرے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور حضرت الامام کی وفات کے وقت میری عمر چودہ سال کی تھی وفات کی اطلاع پر پورے شہر کے ہر مسلمان گھرانے میں ماتم کی کیفیت تھی۔ میں نماز جنازہ اور تدفین میں بھی حاضر رہا۔ قبرستانِ قاسمی کی زمین پر سب سے پہلی قبر بھی حضرت الامام ہی کی بنی تھی۔ جنازہ جب قبرستان میں پہنچا تو قبر سے ایک عجیب وغریب دل لبھانے والی حیرتناک نہایت تیز خوشبو پورے قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی جس کے بارے میں تمام لوگوں کی زبانوں پر یہ ہی الفاظ تھے کہ قبر کی یہ حیرتناک اور دلکش خوشبو حضرت الامام کی عنداللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے اس غیر معمولی خوشبو کی وجہ سے لوگوں نے قبر سے نکلی ہوئی مٹی مٹھیاں بھر کر لے لیں تو میں بھی مٹھی میں وہ مٹی لے کر گھر واپس آیا اور اپنی والدہ کو سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا کہ تو بھی مٹی لایا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ لایا ہوں۔ وہ مٹی میں نے دی تو انہوں نے اُسے اپنے دوپٹہ کا پلا پھیلا کر بڑے احترام سے لیا اور فوراً اس کو اندر لے جا کر صندوق میں محفوظ کر دیا۔ میرا بچپن تھا۔ البتہ کانوں میں پڑی یہ بات یاد پڑتی ہے کہ والدہ صاحبہ نے اس مٹی کو اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کسی کو کی تھی۔

احقر کے لیے ایک زائر حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ سے ملاقات ایک سعادت کبریٰ ہے جس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

حرف از زبان یار شنیدن چہ خوش بود یا از زبانِ آنکہ شنید از زبانِ دوست

☆☆☆

"جامعہ ملیہ گوکہ تحریک عدم تعاون کی یادگار ہے اور اس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں رکھی گئی تھی جبکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان طلبہ کے لیے تعلیمی آسانیاں مہیا کی جائیں جو مہاتما گاندھی کے اعلان پر سرکاری مدارس چھوڑ کر آئے تھے۔ مگر جامعہ نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ قوم کے بچوں کو صحیح قومی تعلیم دی۔ سرکاری مدارس میں آجکل جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں قومی مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ صرف ان ہی لوگوں کے لیے مفید ہے جو سرکاری ملازمتوں میں جاتے ہیں اور باقی لاکھوں ہندستانیوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ جامعہ اس ضرورت کو محسوس کر کے قائم کی گئی تھی"۔

جامعی حضرات سے خطاب کرتے ہوئے مہاتما جی نے کہا:۔

"حکیم جی نے آپ کو اس یادگار دن (۱۱/ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کی یاد دلائی جب ہندو اور مسلمانوں نے اپنے اختلافات کو بھلا کر ہمیشہ کے لیے متحد ہونے کا عزم کیا تھا اور جب ہندستان بھر کے طلبہ کو ان اداروں سے باہر نکل آنے کی دعوت دی گئی تھی جو سرکاری تحویل میں تھے۔ مجھے علم ہے کہ اس دعوت میں میرا بڑا ہاتھ تھا لیکن اس تمام عرصے میں مجھے کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ میں نے ان طلبہ کو ان کی تعلیم گاہوں سے کیوں بلایا اور پختہ یقین ہے کہ جن طلبہ نے اس آواز پر لبیک کہا تھا انھوں نے اپنے وطن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندستان کا آیندہ مورخ ان کے ایثار اور قربانی کو نہایت جلی حروف میں لکھے گا۔"

حکیم اجمل خاں کی زندگی کے آخری ایام بڑی حسرت و یاس میں گزرے اگر چہ وہ طبیہ کالج کے مستقبل سے مطمئن تھے لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے اُنھیں اطمینان نہیں تھا۔ وہ ہر وقت اسی کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے کیونکہ اس کے لیے وافر مقدار میں رقم موجود نہیں تھی اور وہ بحرانی دور سے گزر رہی تھی۔ وہ یہی تمنا کرتے تھے کہ اگر چند برس اور زندہ رہ جائیں تو اسے بھی طبیہ کالج ہی کی طرح مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ انھیں ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے سلسلے میں اپنی کوششوں میں ناکامی کا بھی بہت ملال تھا جو ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ مختلف جگہوں پر بار بار فرقہ وارانہ فسادات کے بھڑک اٹھنے سے وہ ایک مایوس شخص بن گئے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایسی معمولی باتوں پر لڑ رہے تھے جو سماجی

مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ

حضرت مولانا نانوتویؒ کی سیرت ایک نظر میں

دارالعلوم اور مدرسہ شاہی کی تاسیس

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اعلی اللہ درجاتہ ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالی نے علوم کثیرہ وافرۃ نافعۃ اور اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ سے بھرپور طریقہ پر نوازا تھا آپ کی زیادہ شہرت بانی دارالعلوم دیوبند ہونے کی وجہ سے ہوئی اور آپ کے علوم کا کچھ حصہ آپ کی کتابوں سے اُمت تک پہنچا، آپ کی کتابوں کا سمجھنا چونکہ بہت مشکل تھا علماء تک مشکل سے سمجھ پاتے تھے اس لئے آپ کی تالیفات زیادہ معروف و مشہور نہ ہوئیں۔ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آب حیات (حضرت مولانا نانوتوی کی تصنیف) وغیرہ میں نے حضرت سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ آب حیات کے کچھ اوراق حضرت نے خود نکال دیئے تھے کہ انھیں کوئی نہیں سمجھے گا۔

آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں کعبہ شریف کی چھت پر ہوں اور میرے پاؤں کے نیچے سے نہر جاری ہے جو کوفہ کی طرف سے آ رہی ہے اس خواب کی تعبیر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس سے ظاہر ہوئی۔ کوفہ کی طرف سے نہر آنے میں حنفی مذہب کی تائید کی طرف اشارہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا فیض پورے عالم میں پہنچ گیا اور پہنچ رہا ہے۔ مدرسہ مذکورہ سے ہزاروں علماء خطباء مدرسین و مبلغین نکل کر پورے عالم میں پھیلے اور جہالت کی اندھیری کو دور کر کے علوم اسلامیہ اور اعمال صالحہ کی شمع روشن کی، نہ صرف محدثین اور فقہا اور مفتی کثیر تعداد میں مادر علمی دارالعلوم کی گود سے نکلے اور پلے اور

اور مذہبی زندگی میں انتہائی غیر اہم تھیں۔ ۱۹۲۴ء سے قبل حکیم صاحب نے امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام کے سلسلے میں جب بھی کوشش کی تو وہ کامیاب رہے تھے لیکن ملتان کے فساد کے بعد انھیں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ انھیں اس امر کا بھی شدید افسوس تھا کہ ملک سے فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے ان کی بہترین کوششوں کے باوجود ہندستانی سماج کے ایک طبقہ نے انھیں بھی فرقہ پرست کہنا شروع کردیا تھا۔ تاہم اپنی محرومیوں کے باوجود وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سے غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

۱۹۲۷ء کے وسط دسمبر میں افغانستان کے شاہ امان اللہ خاں بمبئی کے سفر پر آنے والے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی علالت کے باوجود شاہ سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انھیں بمبئی کے سفر سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ شاہ سے ذاتی طور پر مل کر ان کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے ایک سپاسنامہ پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ بیماری کے عالم میں بمشکل بمبئی پہنچ کر ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو انھوں نے شاہ افغانستان کے ساتھ بند کمرے میں بڑی طویل گفتگو کی۔ ۱۶ر دسمبر کو انھوں نے شاہ کی خدمت میں سپاسنامہ، مولانا محمد علی نے ایک صندوقچہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ کی مطبوعات کا ایک سیٹ پیش کیا۔ سپاسنامہ فارسی زبان میں تھا جسے حکیم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے اردو متن کے اقتباسات کا ایک حصہ مندرجہ ذیل ہے:

> "ملک معظم! آپ کی محنت سے آج افغانستان عالم اسلام کا اہم مرکز بن گیا ہے اور شاہراہ ترقی پر تیزی سے گامزن ہے۔ اگرچہ آپ کو افغانستان کا زبردست مصلح ہونے کا شرف حاصل ہے تاہم آپ کی کوششوں کے اثرات محض آپ ہی کے ملک تک محدود نہیں ہیں۔ ہم ان کے اثرات پورے عالم اسلام پر محسوس کر رہے ہیں۔ ہم تو یہ تک محسوس کرتے ہیں کہ افغانیوں کا تہذیبی عمل اپنے آپ میں ایک بڑی خدمت ہے جس پر انسانیت کو فخر ہے۔ ہم ان عظیم کوششوں سے باخبر ہیں جو آپ نے تعلیم کے میدان میں انجام دی ہیں اور جو تمام تر ترقیات کی بنیاد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے متعلق کچھ حقائق پیش کرنا چاہتے ہیں جسے قوم پروری کو فروغ دینے کی خاطر اور اپنے ذہنی افق کو وسیع کرنے کی غرض سے مسلمانان ہند نے علی گڑھ میں قائم کیا تھا۔ اب سے سات برس

بڑھے بلکہ بڑی وافر تعداد میں مصنفین بھی پورے عالم میں پھیلے ان مصنفین میں مفسرین بھی ہیں اور شراح حدیث بھی، کتب فقہ کے شارحین بھی، ادب عربی کے فضلاء بھی اور معقولات کے مؤلفین بھی۔ ان حضرات کی تالیفات کو شمار کیا جائے تو اندازہ ہے کہ ہزاروں تک پہونچے گی۔ تنہا حضرت حکیم الأمت تھانوی قدس سرہ کی تالیفات و مطبوعات اور مواعظ کو جمع کیا جائے تو ایک ہزار کی لگ بھگ انھیں کی تعداد ہوجائے گی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے چن لیا اور مفتاح الخیر بنادیا حدیث شریف میں ارشاد ہے: طوبی لمن کان مفتاحاً للخیر و مغلاقاً للشر. دارالعلوم کے فضلاء سے پورے عالم میں خیر بھی پھیلی اور پھیل رہی ہے جہالت ڈوبی، شرک مٹا، بدعات بھی کافور ہوئیں۔

۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی تاسیس ہوئی پھر چھ ماہ بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور قائم کیا گیا اس کے بانی مولانا سعادت علی سہارنپوری فقیہ تھے، مولانا محمد مظہر صاحب رحمہ اللہ علیہ نانوتوی کے نام پر (جو حضرت حجۃ الاسلام کے استاذ بھی تھے) اس کا تاریخی نام سن تاسیس کے دس سال کے بعد مظاہر علوم تجویز کیا گیا۔ یہ نام تاریخی بھی ہے جس سے ۱۲۹۲ کے عدد ظاہر ہوتے ہیں اور مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار کی طرف بھی اشارہ ہے اس کے بعد جامعہ قاسمیہ مرادآباد عرف مدرسہ شاہی کی بنیاد پڑی۔

۱۲۹۶ھ میں حضرت مولانا عالم علی محدث کے انتقال کے بعد مرادآباد کے باخیر حساس قلوب میں ضرورت مدرسہ کا احساس پیدا ہوا، حضرت نانوتوی قدس سرہ مرادآباد تشریف لائے ہوئے تھے سب نے مل کر حضرت مولانا کی خدمت میں عرض داشت پیش کی کہ مرادآباد کی سرزمین دولت علمی سے خالی ہوچکی ہے، اگر چندے یہی حالت رہی تو دینی جذبات ختم ہوجائیں گے، حضرت دعا فرمادیں کہ خداوند کریم اہل مرادآباد کو دوبارہ علمی فیوض وبرکات سے متمتع فرمائے، حضرت نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیئے، ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ اجابت درحق کے سامنے آئی اور کام بن گیا۔ حضرت نے حاضرین سے فرمایا کہ بطرز دیوبند غریبوں سے تھوڑا تھوڑا چندہ مقرر کرالیا جائے اور اصحاب ثروت بھی اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں تو ان کو بھی شامل رکھا جائے، چنانچہ چندہ کی اپیل کی گئی، کہا جاتا ہے

پہلے جامعہ کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ تعلیمی معاملات میں منزل مقصود کے حصول کی خاطر لوگوں کو صحیح راستہ پر گامزن کیا جاسکے۔۔۔۔۔

"آپ پر یہ حقیقت واضح ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس عہد کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ وہ سیکولر اور مذہبی دونوں قسم کے مضامین کی تعلیم حاصل کریں۔ اب تک ملک میں مروجہ نظام تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو محض سرکاری ملازمتوں کے حصول تک محدود رکھا تھا جس کے سبب ان کی سماجی سرگرمیاں بھی محدود ہو کر رہ گئیں۔ اسی لیے جامعہ نے سادگی پسندی اور بلند خیالی کے آدرش کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہوئے نوجوانوں کو دوسرے پیشے اپنانے کی جانب راغب کیا۔ اس حقیقت کا احساس کرتے ہوئے کہ غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم کا حصول ذہنی توانائی کے لیے ایک بڑے نقصان کا سبب ہوتا ہے' جامعہ نے اردو کو اپنا وسیلۂ اظہار قرار دیا۔۔۔"

حکیم صاحب نے جامعہ کی خاطر دہلی سے بمبئی تک کا دشوار ترین سفر طے کیا تھا کیونکہ جامعہ ہی اب آخری دنوں میں ان کے لیے امید کی ایک کرن تھی۔ یہ وہ پودا تھا جسے خود انھوں نے ۱۹۲۰ء میں لگایا تھا اور جس نے اب ایک درخت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ان کے سپاسنامے نے شاہ امان اللہ پر بڑے مثبت اثرات مرتب کیے۔ سپاسنامہ کے جواب میں والی افغانستان نے کہا کہ حکیم اجمل خاں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سرگرمیوں کی تفصیلات سے مطلع کر کے انھیں بہت متاثر کیا۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی صحیح خطوط پر تعلیم کو فروغ دے رہی ہے اور وہ اس سے متفق ہیں۔ ان کی رائے میں یہ صحیح قسم کی تعلیم تھی جو نوجوان مسلمانوں کو جامعہ ملیہ میں دی جا رہی تھی تاکہ وہ قومی کاموں اور اسلام کی خدمت میں تربیت یافتہ ہو سکیں۔ اپنی تقریر کے اختتام پر شاہ نے کہا کہ وہ اپنے ملک اور اسلام کے فروغ کے کاز کے سلسلے میں یورپ کے دورہ پر روانہ ہو رہے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ اپنے مشن کی کامیابی کے سلسلے میں انھیں اپنے ہم مذہبوں کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی۔

شاہ افغانستان نے حکیم صاحب کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی جسے انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ انھیں شاہ سے جامعہ کو متعارف کرانے کی بڑی خوشی تھی۔ کچھ روز بمبئی میں قیام کرنے کے بعد جامعہ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے انھوں نے پالن پور کا سفر کیا اور پھر وہاں سے ۲۶ر دسمبر کو دہلی پہنچے۔ چند گھنٹے دہلی میں قیام کرنے کے بعد اسی رات

کہ سب سے پہلے جس نے چندہ پیش کیا وہ ایک بہشتی تھا جس نے ایک پیسہ دیا جو نہایت خوشی کے ساتھ قبول کیا گیا (یہ بہشتی ایک پیسہ میں کسی کے گھر پانی کی مشک ڈال کر آیا تھا)[۱] چند ہی روز میں تیس پینتیس روپیہ ماہوار کا انتظام ہو گیا اور حسب ہدایت حضرت اقدس حضرت کے تلمیذ رشید جامع محاسن صوری و معنوی حضرت مولانا سید احمد حسین قدس سرہ امروہوی کا بہ مشاہرہ ۳۵ روپیہ تقرر عمل میں آیا۔ یہ جامعہ قاسمیہ مراد آباد کی ابتدائی روداد ہے جو مدرسہ شاہی کے نام سے مشہور ہے۔

شانِ تواضع

حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ تواضع سے نوازا تھا اپنی ذات کو مٹا کر رکھے تھے لباس میں کوئی ایسی شان ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ شخص عالم ہوگا، کھدر کے کپڑے، دھوتر کا لباس سردی میں سر پر کنٹوپ، چال ڈھال میں سادگی اور ساتھ ہی مجلس میں سب ساتھیوں کے ساتھ ایک عام شخص کی طرح بیٹھنا، مجلس میں کوئی امتیازی شان ظاہر نہ ہونے دینا یہ تواضع کی خاص شان تھی۔ ایک موقع پر فرمایا کہ میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے۔ اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا پتہ نہ چلتا۔ جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے میرے یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا ونعم ما قیل:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند- جام وسنداں باختن

انگریزوں نے ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۳ھ میں میلۂ خدا شناسی کے عنوان سے ایک مجلس منعقد کرائی تھی جس میں تمام مذاہب کے قائدین کو بلایا تھا۔ یہ مجلس شاہ جہاں پور میں منعقد ہوئی تھی اس مجلس کی شرکت کے لئے آپ شاہجہاں پور میں تشریف لے جا رہے تھے کوئی خادم ساتھ نہ تھا استقبال سے بچنے کے لئے ایک اسٹیشن پہلے اتر گئے اور پیدل چل کر شاہ جہاں پور پہونچے، راستے میں ایک ندی پڑتی تھی

---

(۱) مولانا سید محمود احمد صاحب (جو محلہ اصالہ پورہ مراد آباد کے رہنے والے تھے اور مدرسہ شاہی میں ۱۸ سال تک مہتمم رہے تھے) نے کلکتہ کے زمانہ قیام میں احقر کو بتایا تھا کہ بہشتی نے جو ایک پیسہ دیا تھا وہ آج تک مدرسہ شاہی کے خزانہ میں محفوظ ہے۔

وہ رام پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ اس میں خواجہ عبدالمجید بھی ان کے ہم سفر رہے۔ دہلی کے اسٹیشن پر انھیں رخصت کرنے کی غرض سے چند احباب جمع تھے۔ رام پور روانگی سے قبل انھوں نے مدیر "الامان" مولانا مظہر الدین سے کہا کہ وہ انھیں لارڈ ہیڈلے کے رام پور کے دورے کی تاریخوں سے مطلع کر دیں جو کچھ روز بعد دہلی آنے والے تھے۔

حکیم صاحب کچھ عرصہ پیشتر درد قولنج میں مبتلا رہ چکے تھے اور بمبئی کے سفر سے قبل دل کے دورے سے بھی دوچار ہو چکے تھے۔ انھیں دل کا پہلا دورہ ۱۹۰۴ء میں عراق کے سفر سے کچھ روز پیشتر پڑ چکا تھا۔ یہ حملہ ان پر بمبئی میں بھی ہوا۔ ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو وہ رام پور میں مصروف رہے اور یہ دونوں دن انھوں نے نواب صاحب کے ساتھ بلیرڈ اور تاش کھیلنے میں گزارے۔ ۲۸ کی شب میں انھیں بھوک کی قطعی خواہش نہیں ہوئی۔ رات میں دس بجے وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ ایک گھنٹہ بعد نواب صاحب نے انھیں یاد کیا تو وہ بڑے اضطراب کے عالم میں تھے۔ یہ معلوم کر کے نواب صاحب خود ان کے کمرے میں آئے اور دونوں حضرات نصف شب تک باتوں میں مشغول رہے۔ اس کے بعد نواب صاحب چلے گئے لیکن حکیم صاحب کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے ملازم سے گرم پانی منگوایا مگر وہ وقت پر فراہم نہیں کیا جا سکا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ آخری سانس لے کر اچانک اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ایک نہایت ہی شریف اور ممتاز شخصیت ختم ہو گئی جو عمر بھر ملک و قوم کی خدمت میں وقف رہی تھی۔

حکیم اجمل خاں کی وفات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ دہلی کے محلہ بلیماران میں واقع شریف منزل پہنچنے لگے جو ان کی سیاسی اور طبّی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے وہ اپنے مسیحا کے آخری دیدار اور اس کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اکٹھا ہوئے جس نے ہمیشہ ہندو مسلم ہم آہنگی کے قیام کی خاطر کوششیں کی تھیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکیم صاحب کا جسد خاکی رام پور سے دہلی لایا گیا۔ جنازہ ان کی رہائش شریف منزل سے روانہ ہوا جہاں ساٹھ برس قبل انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور چاندنی چوک سے گزرا جہاں رولٹ بل کے خلاف تحریک کی یادیں اب تک ان سے منسوب تھیں۔ جامع مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی جہاں مختلف موقعوں پر انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے خطاب کیا تھا۔ آخر کار ان کے جسد خاکی کو پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی پر واقع درگاہ سید حسن رسول نما کے

اسے پار کیا تو پاجامہ بھیگ گیا جو گاڑھے کا تھا اس کی جگہ چادر باندھ لی اور پاجامہ کو لاٹھی پر ڈال کر کاندھے پر لٹکا کر چلتے رہے تاکہ سوکھ جائے، شاہجہاں پور پہونچے تو ایک سرائے میں جا کر مقیم ہوگئے، وہاں اپنا نام خورشید حسن لکھوادیا، جو آپ کا تاریخی نام تھا ادھر تو یہ ہوا اور اُدھر استقبال کرنے والے اسٹیشن پر پہونچے پوری ریل چھان ماری کسی ڈبہ میں پتہ نہ چلا افسوس کرتے ہوئے واپس لوٹے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہر فرقہ کے مناظر آگئے ہمارا مناظر نہیں آیا حیران ہو رہے تھے کہ مقابلہ کے وقت کیا ہوگا؟ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا ذرا سرائے میں چل کر تو دیکھیں وہاں پہونچے تو رجسٹر لکھنے والے سے پوچھا کہ محمد قاسم نام کا کوئی آیا ہے اس نے کہا کہ اس نام کا تو کوئی شخص نہیں آیا، جو لوگ تلاش میں نکلے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا ذرا مجھے رجسٹر تو دکھاؤ، جب مندرجہ نام دیکھنے لگے تو ان میں ایک نام خورشید حسن لکھا تھا حاضرین میں سے بعض افراد جانتے تھے کہ یہ آپ کا تاریخی نام ہے کمرہ نمبر معلوم ہونے پر جا کر دیکھا تو حضرت تشریف رکھتے تھے سب کی جان میں جان آگئی اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ (۲)

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا اس زمانہ میں صرف لیتھو پریس کا رواج تھا (اب تو کمپیوٹر نے سب طریقے بھلادیئے) مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود ہی کتابوں کے حواشی لکھتے تھے اور خود ہی شائع فرماتے تھے۔ جلالین شریف، ترمذی شریف، مشکوۃ شریف کے جو حواشی رائج ہیں اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کا حاشیہ لکھنے کے بجائے انھوں نے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح ہر صفحہ کے ذیل میں چھاپ دی۔ ہندو پاک میں مسلم شریف آج تک اسی طرح چھپ رہی ہے۔ بخاری شریف کا حاشیہ بھی ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ۲۵ پاروں تک تو انھوں نے لکھا ہے اور پانچ پاروں کے حواشی قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے لکھوائے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا۔ مخلصین کی بھی کیا شان ہے۔ (دور حاضر کے محشی حضرات کو دیکھ لیجئے ہر ہر صفحہ میں کئی کئی دفعہ نام اور علمیت جتانے کا پروگرام سامنے رہتا ہے)

(۲) اس کے ہم معنی ارواح ثلاثہ میں ایک اور حکایت بھی ہے (دیکھئے حکایت: ۲۸۴)

کے احاطے میں ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

حکیم اجمل خاں کی اچانک وفات سے پورے ملک میں غم و درد کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے سفر آخرت نے انڈین نیشنل کانگریس کو شدید صدمہ سے دوچار کیا جس کا اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں مدراس میں منعقد ہو رہا تھا۔ جب وفات کی خبر ڈاکٹر انصاری تک پہنچی تو وہ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک اخباری بیان میں انھوں نے کہا:

"میں اس عظیم قومی غم اور ناقابل تلافی ذاتی نقصان تلے دب کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں۔ ہندستان کا ایک عظیم سپوت نہیں رہا۔ متزلزل ہونے والوں کو اب کبھی ان کی ثابت قدمی سے حوصلہ میسر نہیں ہوگا۔ ان کے دانشورانہ مشورے اب کبھی غیر متحمل اشخاص کو صبر و تحمل فراہم نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی جنگ آزادی کی رہنمائی کے لیے اب ان کا وجود کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ تاہم ان کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی اور ملک کے تئیں ان کا کام ثمر آور ہوگا۔ دہلی میں طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہمیشہ ان کے تعمیری پہلو کی یادگاریں رہیں گی۔ خوش نصیبی سے طبیہ کالج کی مالی بنیادیں مستحکم ہیں تاہم جامعہ ملیہ کے ساتھ ایسا نہیں ہے جو ان کی عزیز ترین اولاد ہے۔ حکیم اجمل خاں کے آخری ایام اسی کو استحکام بخشنے کی کوششوں میں صرف ہوئے۔ ان کی آخری خواہش یہی تھی کہ جامعہ ملیہ کی مالی بنیادیں مستحکم ہو جائیں لیکن افسوس صد افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔"

ماؤنٹ کارلو سے ڈاکٹر انصاری کے نام ایک برقیہ کے ذریعہ تعزیتی پیغام میں پنڈت موتی لال نہرو نے لکھا:

"مجھے حکیم اجمل خاں کی افسوسناک خبر سے شدید صدمہ پہنچا ہندستان نے ایک انتہائی عقیدت مند سپوت کھو دیا جس کی جگہ پُر ہونا ممکن نہیں وہ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر جیے اور اسی کے لیے مرے۔ ان کی بے لوث قربانیوں کے سبب دونوں فرقے ان کی احسان مندی کے گہرے قرض میں بندھے ہوئے ہیں، اس لیے انھیں چاہیے کہ وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی سمت میں فوری اقدامات کریں۔"

اسی طرح اپنے تعزیتی پیغام میں سروجنی نائڈو نے کہا کہ "حکیم اجمل خاں کو اپنے وطن سے محبت تھی اور انھوں نے اس کی آزادی کے حصول کی سمت میں کوششیں کیں۔ تمام لوگ

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے اور حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے بھرپور حصہ ملا۔

زہد وقناعت اور استغناء

حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ میں شان تواضع تو نمایاں تھی ہی زہد اور استغناء بھی بہت تھا۔ جب دارالعلوم دیوبند قائم کیا اس وقت میرٹھ کے ایک پریس میں تصحیح کا کام کرتے تھے، دس روپئے تنخواہ تھی۔ مدرسہ قائم کر کے اس کی سرپرستی تو فرمائی لیکن نہ تنخواہ دار مدرس بنے نہ مجلس شوریٰ کے رکن ہوئے، نہ صدر بنے۔ اسی زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علم حاصل کیا۔

میرٹھ کے ایک رئیس رومال میں بہت سے روپئے باندھ کر حاضر ہوئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوا رہے تھے اول تو حضرت نے ان کی طرف سے تغافل برتا پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا آہا شیخ صاحب ہیں؟ مزاج اچھا ہے انھوں نے سلام عرض کیا اور رومال میں جو روپئے بندھے ہوئے تھے حضرت کے قدموں میں ڈال دیئے "اس زمانہ میں روپیہ چاندی کا ہوتا تھا" حضرت نے وہ روپیہ اپنے قدموں سے ہٹادیا وہ بڑی منت سے قبول کرنے کی درخواست کرتے رہے لیکن حضرت نے قبول نہ فرمایا۔ وہ آپ کی جوتیوں میں ڈال کر چلے گئے۔ حضرت جب اٹھے تو نہایت استغنا کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا حضرت نے جوتے پہن لئے اور حافظ انوار الحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی ہم بھی دنیا کماتے ہیں اور اہل دنیا بھی دنیا کماتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیا دار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انھیں ٹھکراتی ہے اور یہ فرما کر روپیہ وہیں تقسیم فرمادیا۔ (۳)

جس زمانہ میں میرٹھ کے مطبع سے دس روپئے تنخواہ ملتی تھی انھیں دنوں نواب صدیق حسن خان صاحب رئیس بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپئے ماہانہ کی پیش کش کی گئی آپ نے جانے سے انکار کردیا ایک بے تکلف ساتھی نے کہا کہ تم کیوں نہیں چلے جاتے؟ جواب میں فرمایا کہ وہ مجھے باکمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے تو کیسے جاؤں؟ ان کے سبق کے ساتھی اور دوست اور

(۳) ارواح ثلاثہ: حکایت: ۲۶۶

ایک محب وطن کا ماتم کر رہے ہیں اب انھیں ان کی یاد میں ایک یادگار قائم کرنی چاہیے اور وہ یادگار یہ ہے کہ انھیں تمام اختلافات کو بھلا دینا چاہیے۔" ونشا پٹیٹ نے "ایک بے لوث کارکن، عظیم محب وطن اور عظیم ہندستانی" کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ جمناداس مہتہ نے کہا کہ "وہ شخص اپنے کیریر سے بھی زیادہ عظیم تھا اور اسے تمام فرقوں سے جو محبت تھی وہ تاریخ میں یادگار رہے گی" سر عبداللہ ہارون کے نزدیک "ہندستان نے محض ایک بڑا معالج ہی نہیں کھویا بلکہ وہ ایک اول درجہ کے محب وطن سے بھی محروم ہو گیا جو ہندو مسلم اتحاد کا زبردست علمبردار تھا" ایک برقی پیغام میں نواب صاحب رام پور نے کہا تھا: "اس بے لوث رہنما اور ہندستان کے محسن کی ناوقت موت پورے ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔" جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "کانگریس کے ایک سابق صدر کی حیثیت کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ تھے اور کانگریس کی قیادت میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب لے آئے تھے اور دونوں فرقوں کے لوگ ان کا یکساں احترام کرتے تھے اور ان کی مثال سے متاثر تھے۔"

بعد ازاں حکیم صاحب کے تئیں اہم ترین خراج عقیدت "ینگ انڈیا" کے کالموں میں مہاتما گاندھی نے پیش کیا اس میں کہا گیا تھا:

"حکیم اجمل خاں کی وفات سے ملک نے ایک بڑا سچا خادم کھو دیا۔ حکیم صاحب مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ محض ایک معالج ہی نہیں تھے جو اپنے فن کو امیروں اور غریبوں دونوں کے لیے یکساں طور سے استعمال کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا وقت امراء کے درمیان گزرتا تھا لیکن وہ پوری طرح جمہوریت پسند تھے۔ وہ جتنے بڑے مسلمان تھے اتنے ہی بڑے ہندستانی بھی تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں محبت کرتے تھے اور یہ دونوں فرقے بھی ان کا یکساں احترام کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد ان کی سانس کے مترادف تھا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ہمارے اختلافات کے سبب تلخ ہو گئے تھے لیکن انھوں نے نہ کبھی اپنے ملک میں اور نہ ہی اپنے لوگوں میں اعتماد کو گنوایا۔ ان کا خیال تھا کہ اخیر میں دونوں ہی فرقے متحد ہو کر رہیں گے۔ اس ناقابل تبدیلی یقین کے ساتھ انھوں نے کبھی اتحاد کے لیے کام کرنا ترک نہیں کیا۔ اگرچہ انھیں وقت ضرور لگا لیکن آخر کار انھوں نے اپنے آپ کو عدم تعاون کے حامیوں کے حوالے کر دیا اور اپنی عظیم ترین تخلیق

ہم وطن مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے (جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے) کسی نے کہا کہ آپ چلے جائیے، فرمایا: بابا مجھے دس روپے تنخواہ ملتی ہے پانچ روپے میرے گھر کا خرچ ہے۔ پانچ روپے طالب علموں کو دے دیتا ہوں اللہ ان کا بھلا کرے کہ سامنے پڑ جاتے ہیں، ڈھونڈنا نہیں پڑتا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سوچنا کہ اس کا کیا کروں یہ دھندہ میرے بس کا نہیں:

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنا یا جریر المجامعُ

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے کے) گھر میں برکت ہو اور ہمارے لینے کو ہمارا احسان سمجھے اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے اگر چہ وہ چند پیسے ہی ہوں۔ (۴)

مناظرے

انگریزوں نے جب ہندوستان میں نامبارک قدم رکھے تو ان کے بُرے عزائم میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنالیا جائے چونکہ انھوں نے مسلمانوں ہی سے ملک لیا تھا اس لئے مسلمانوں ہی سے خطرہ تھا عیسائیت پھیلانے کے لئے انھوں نے مشن قائم کئے اور اپنے پادریوں کو مناظرے کرنے کے لئے تیار کیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اکبر آباد میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا تین دن تک مناظرہ ہونا طے پایا تھا لیکن وہ تیسرے دن نہ آیا اس نے ہندوستان سے راہ فرار اختیار کی اور ترکی میں جاکر یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمان عیسائی ہوگئے اور مسجدیں گرجاؤں میں تبدیل ہوگئیں اس وقت ترکی کی حکومت حرمین شریفین میں بھی تھی انگریزوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کی جائیداد ضبط کرلی اور وہ کسی طرح چھپتے چھپاتے یمن سے گزرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہاں شیخ الحرم احمد زینی دہلان سے ملاقات ہوگئی انھوں نے انکا درس شروع کرادیا۔ جب فنڈر نے ترکی میں یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستانی مسلمان العیاذ باللہ نصرانی ہوگئے۔ سلطان بن عبد العزیز نے ترکی کے شیخ کے پاس قاصد بھیجا کہ اس بات کی تحقیق

(۴) ارواح ثلاثہ: حکایت: ۳۲۵۔

یعنی طبیہ کالج کو بھی پریشانی میں ڈالنے سے نہیں ہچکچائے۔ وہ اس کالج سے ایک ایسے جذبہ کے ساتھ محبت کرتے تھے جس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو ان سے واقف تھے۔ حکیم جی کی موت سے میں نے محض ایک دانشمند اور صاف گو ساتھی ہی کو نہیں کھویا بلکہ میں ایک ایسے دوست سے بھی محروم ہو گیا جس پر میں ضرورت کے وقت اعتماد کر سکتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے معاملہ میں وہ میرے مستقل رہنما تھے۔ ان کا فیصلہ بڑا صائب ہوتا تھا۔ سنجیدگی، علم اور انسانی فطرت نے انھیں صحیح فیصلے کرنے کی قوت عطا کی تھی۔ ایسا شخص کبھی مرا نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ گوشت پوست کی شکل میں ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی روح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی اور اپنے مخلصانہ فریضہ کی ادائیگی کے لیے وہ اب بھی ہمیں پکار رہی ہے۔ ان کی یاد میں کوئی یادگار اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم ہندو مسلم اتحاد کے مقصد کا حصول نہیں کر لیتے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کی وفات ہی سے وہ سب کچھ سیکھ جائیں جو ہم ان کی زندگی سے نہیں سیکھ سکے۔

"لیکن حکیم جی محض خواب ہی نہیں دیکھا کرتے تھے وہ اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں بھی یقین رکھتے تھے۔ جس طرح انھوں نے ادویات سے متعلق اپنے خواب کو طبیہ کالج کی تعمیر سے شرمندۂ تعبیر کیا اسی طرح وہ اپنے سیاسی خواب کو جامعہ ملیہ کے ذریعہ شرمندۂ تعبیر کرنے میں کامیاب ہوئے جب یونیورسٹی قریب المرگ تھی تو انھوں نے تقریباً تنہا اس ادارہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن منتقلی کا مطلب ان کے لیے اور بھی پریشانیوں سے دوچار ہونا تھا۔ انھیں خود پر اعتماد تھا اس لیے کالج کے مالی استحکام کی خصوصی ذمہ داری نباہنے کی غرض سے انھوں نے خود ہی قدم آگے بڑھایا۔ وہی اہم ترین شخص تھے جنھوں نے اس کے لیے یا تو خود اپنی جیب سے رقم صرف کی یا پھر اپنے ذاتی احباب سے چندے اکٹھا کیے۔"

اسی طرح اپنے امیر جامعہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک تقریر میں کہا:

"۔۔۔ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی خبریں تمدن اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھل بھی شرما جاتے

کرے۔ شیخ نے جواب دیا کہ یہ خبر جھوٹ ہے جس بزرگ نے عیسائی مناظر کو شکست دی تھی وہ ہمارے پاس مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مکہ میں مقیم رہے پہلے محلہ شامیہ میں کرائے کا کمرہ لے کر مدرسہ کا افتتاح کیا اس کے بعد صولت النساء بیگم بنگال کی جن نے مدرسہ کے لئے حارۃ الباب میں جگہ خرید کر دے دی لہٰذا محلہ شامیہ سے مدرسہ وہیں منتقل ہو گیا اور آج تک وہیں ہے پہلے مدرسہ کا نام مدرسۃ الشیخ رحمۃ اللہ تھا مذکورہ جن کی مالی سخاوت کے بعد مدرسہ صولتیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مناظرے کرنے پڑے عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی پاؤں نکالے اور انھوں نے بھی مناظروں کا سلسلہ چلایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شاہجہاں پور میں تمام مذاہب کے عوام اور خواص کے سامنے زبردست تقریر کی۔ سب سے اسلام کا لوہا منوالیا کسی کو مجال نہ تھی کہ اُف بھی کرے اور کچھ بول سکے۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی زبردست تقریر فرمائی کہ سب دم بخود رہ گئے۔ نصاریٰ کے پادری بھی لاجواب اور آریوں کے پنڈت بھی عاجز، یہ مجلس میلۂ خداشناسی کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے حق واضح ہو کر رہا اور: **لیظھرہ علی الدین کلہ** کا خوب مظاہرہ ہوا لیکن نہ عیسائیوں نے اسلام قبول کیا اور نہ ہندوؤں نے اور اس دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے حق کو جانتے ہوئے نہ ماننا نسلی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے باطل پر جمے رہنا ضد اور عناد والوں کی پرانی عادت ہے۔ یہودیوں کا حال تو معلوم ہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے کئی سو سال پہلے مدینہ منورہ میں آپ کی آمد کے انتظار میں آ کر بس گئے تھے اور انصار کے قبیلوں سے کہتے تھے کہ نبی آخر الزماں آئیں گے ہم اُن سے مل کر تمہارا ناس کھودیں گے لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو انصار کے دو قبیلے اوس اور خزرج مسلمان ہو گئے لیکن یہودی مسلمان نہ ہوئے، سورہ بقرہ میں اللہ نے ارشاد فرمایا: **وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ علی الکافرین**۔ (اور آپ کی آمد سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی خبر دے کر کافروں کے مقابلے میں آپ کے ذریعہ

تھے۔ ہر شعبۂ تمدن میں چاہے طب ہو کہ علم سیاسیات ہو کہ معاشرت، مذہب ہو یا فنونِ لطیفہ ہوں وہ سب میں مقلد بھی تھا اور مجتہد بھی۔ پچھلے جو دے سکتے تھے وہ سب اس نے لے لیا لیکن یہ خیال کبھی ذہن سے نہیں ہٹا کہ اگلوں کو کچھ اور دے بھی جائے۔ اس کی غیور طبیعت کو کبھی یہ گوارہ نہ تھا کہ قرض بلا معاوضہ حال کی گردن پر رہے اس لیے اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر تھی۔ طبیہ کالج کو دیکھو' ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اس کے خطبہ صدارت کو پڑھو' جامعہ ملیہ کے تخیل سے آگاہی پیدا کرو جو مرحوم کے پیش نظر تھا اور جس کی تکمیل میں اس کی آخری سانسیں گزریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دماغ محض کسی بڑے طبیب یا عالم یا سیاسی آدمی کا دماغ نہ تھا بلکہ ایسا دماغ تھا جو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن سے قدرت مستقبل کی تعمیر کراتی ہے۔ آج اجمل خاں ہم سے جدا نہیں ہوئے ہندستان اور مسلمانوں کے مستقبل کا سب سے بڑا معمار ہم میں سے اٹھ گیا۔ پرانی نسل اجمل خاں میں اپنے آخری کامل نمونہ کو رو رہی ہے اور نئی نسل اپنی دنیا کے خلاق اور اپنی ممکنات مضمر ایک تشکیل دینے والے کے لیے نوحہ کناں ہے"۔

ذاکر صاحب نے مزید فرمایا:۔

"دنیا میں بڑے بڑے مرنے والے واقعی مر جاتے ہیں جب ان کا رشتہ صرف ایک نسل سے ہو لیکن ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتہ رکھنے والے نہیں مرتے اور اجمل خاں بھی نہ مرنے والی ہستیوں میں ہیں جب موجودہ زمانے کے فن طب کا بڑا حصہ نامکمل اور ناقص ثابت ہو چکا ہوگا (اور کونسا فن ہے کہ جس کا نقص زمانہ ثابت نہیں کرتا) تو دہلی کے ایک دور افتادہ گوشہ میں ایک طبیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ ایک نئے فن طب کی تدوین و تخلیق میں مصروف ہوں گے اور ان کے کالج کے در و دیوار اور خود ان کی زبان پر حکیم اجمل خاں کا نام ہوگا جب 'تعلیم جدید' کے حامی اپنی کوششوں کی مضرت سے واقف ہو چکے ہوں گے تو ملک میں متعدد تعلیم گاہیں اور ادارے ایسے ملیں گے جو اپنی کوششوں میں قدیم و جدید کا وہی امتزاج چاہتے ہوں گے جو اجمل خاں کی زندگی میں نمونہ کے طور پر موجود تھا۔ ملک کے بہت سے خود غرض لیڈر جب قوم کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر اور اپنی جبیں جھکا کر اس دنیا

فتح یابی کی خبر دیا کرتے تھے سو جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر)

نصاری نجران آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مباہلہ کی بات طے ہو گئی پھران کے پادری نے کہا کہ دیکھو کہ اگر تمہیں ہلاک ہونا ہے تو مباہلہ کرلو ورنہ چلے چلو چنانچہ وہ لوگ فرار ہو لئے۔ سامنے نہ آئے کافروں کی عادت رہی ہے کہ حق واضح ہونے پر بھی حق قبول نہیں کرتے دشمنان اسلام کی دشمنی کے باوجود بھی اسلام پھلا پھولا اور پھیلا اور الحمد للہ پھیل رہا ہے۔ یہود ونصاری کی طرح روافض اور قادیانیوں کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ بار بار مناظروں میں ہارتے ہیں لیکن اسلام قبول نہیں کرتے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں شیعوں نے بھی سر اٹھا رکھا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اعتراضات کے بھی مسکت اور دندان شکن جوابات دیئے اور ان کی ہدایت اور خیر خواہی کے لئے ''ہدیۃ الشیعہ'' تحریر فرمائی، شیعہ ہمیشہ سے تقریری اور تحریری مباحثات میں لاجواب ہوتے رہے ہیں انھیں بھی ضد اور عناد نے بے راہ کر رکھا ہے نہ صرف کہ باطل کے پیرو ہیں بلکہ اہل حق کو طرح طرح کی جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچانے کے حق میں رہے ہیں کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے حق کو جاننے کے بعد حق کو قبول کیا اور شیعیت سے تائب ہوئے۔ ایک مرتبہ شیعوں کو کیا سوجھی کہ آپ کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے کے لئے کہنے لگے کہ آپ ہمارے جنازے کی نماز پڑھا دیں ان لوگوں نے ایک نوجوان کو کپڑا اوڑھا کر لٹا دیا تھا اور اُسے یہ سبق پڑھایا تھا کہ حضرت جب دو تکبیریں کہہ لیں تو اٹھ کر بھاگ جانا اول تو حضرت نے نماز پڑھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے پڑھانے سے تمہاری نماز جنازہ کیسے ادا ہو گی؟ جب وہ لوگ اصرار ہی کرتے رہے تو آپ آگے بڑھے اور نماز شروع کر دی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے ''ہونہہ'' کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سسکاری دی مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا'' دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا اور بجائے

سے گذر چکے ہوں گے اور دنیا، جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے، ان معلموں کو بھول چکی ہو گی تو اجمل خاں ہی کے نام لیواؤں میں ایسی جماعت ملے گی جو مسلمانوں میں گھر گھر صحیح تعلیم کی روشنی پہنچائے گی، جب مسلمانوں کو ان کی تعدادی نسبت سے ملازمتیں دلوانے والے خود بڑی کرسی پر پہنچ کر اپنی جدوجہد کو بھول جائیں گے تو حکیم اجمل خاں کے یاد کرنے والے بھی اس بد نصیب قوم کو "الکاسب حبیب اللہ" کی بھولی ہوئی یاد دلا کر ان کی معاشی حالت کو درست کرنے میں ساعی نظر آئیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اجمل خاں کی تحصیل جس قدر وسیع تھی تعمیر و تخلیق کا جذبہ بھی اتنا ہی ہمہ گیر تھا اور یہی نہیں کہ ان کی تعمیری جدوجہد محض خیالات کی دنیا میں ہو، انھوں نے اپنے کاموں کا پورا نقشہ بنیاد کے لیے بھی بنا دیا ہے بس کاموں کی بنیاد ہی وہ اپنے ہاتھ سے رکھ گئے ہیں اور اس کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ نئے معمار کمزور ہاتھوں ہی سے رک رک کر آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ان بنیادوں پر وہ عمارت ضرور کھڑی کر دیں گے جو اس معمار قومی کی نظروں میں ہر وقت رہتی تھی اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کے نمونہ سے اپنی محنت سے، اپنی نظر کے فیض سے ان معماروں کے دل میں یقین کا ایمان کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے۔"

ذاکر صاحب نے اخیر میں کہا:

"جو لوگ مرحوم سے اپنی کسی جسمانی مرض کا نسخہ لینا چاہتے تھے، جو کسی ملازمت کے لیے سفارش کے خواہاں تھے، جنھیں اپنے کسی عزیز کی شادی کے لیے روپیہ درکار تھا، جس بیوہ کی روٹی مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی، جس یتیم کی تعلیم کے لیے اس کے خزانہ سے روپیہ آتا تھا، اور ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی تو افسوس ہزار افسوس کہ ان سے اجمل خاں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے لیکن طب قدیم کا مجدد اور مسیحا، معاشرتی اصلاح و مذہبی رواداری کا علمبردار، قومی تعلیم کا رہنما "اجمل خاں" زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اس کی مثال پیدا کر سکے گا لیکن جو اجمل خاں زندہ ہے وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔!!"

حضرت والا کی سبکی کے خود سبکی موت آ گئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر شیعوں میں سے بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔ (۵)

جہاد ۱۸۵۷ء میں حصہ

۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں انگریزوں سے جہاد ہوا۔ حاجی کی جماعت بھی حرکت میں آ گئی حضرت حاجی صاحبؒ کے رفقائے کار میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد تھانویؒ اور حافظ ضامن تھانوی شہیدؒ شامل تھے۔ جہاد کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا تو مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ نے بے سروسامانی کا ذکر کر کے جہاد آزادی میں حصہ لینے سے گریز کرنے کی تجویز پیش کی۔ مولانا نانوتویؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ فقرہ سنا تو تڑپ اٹھے اور فرمایا کہ اب ''الحمد للہ انشراح ہو گیا'' اور جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی، حاجی امداد اللہ امیر، مولانا نانوتوی سپہ سالار، مولانا گنگوہی قاضی مقرر ہوئے اور تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔ میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ چھڑ چکی تھی آپؒ نے اپنے امیر کی قیادت میں جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تھانہ بھون بھی شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے قصبہ تھانہ بھون خاکستر کا ڈھیر بن گیا۔ فسادیوں نے یہ کام کیا لیکن انگریزوں کی طرف سے حضرت حاجی صاحب اور آپ کے رفقاء کار پر الزام تھا کہ تھانہ بھون کے فساد میں پیش پیش تھے اس بناء پر وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے لیکن حضرت نانوتوی کو پولیس گرفتار نہ کر سکی۔ سی آئی ڈی بھی پہونچے۔ پولیس بھی پیچھے لگی، لیکن آپ ہمیشہ بچ کر نکلتے رہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ آپ مسجد میں باہر فرش پر کھڑے تھے پولیس نے آپ ہی سے پوچھا کہ مولوی قاسم کہاں ہے ایک دو قدم آگے بڑھ کر فرمایا ابھی تو یہیں تھے پولیس والے یہ سمجھ کر یہ کوئی دوسرا شخص ہے چھوڑ کر چلے گئے۔

وارنٹ نکلنے کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ صرف تین دن پوشیدہ رہے اس کے بعد باہر

(۵) حاشیہ سوانح قاسمی جلد اول ص: ۱۷

آ گئے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن غار ثور میں رہے تھے ہم نے اس کا اتباع کرلیا آپ کے دوست خاص اور مصاحب قدیم مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی وارنٹ نکلے تھے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شرکت کی تھی۔ پولیس گرفتار کر کے سہارنپور لے گئی پھر کچھ عرصہ کے بعد مظفر نگر کی جیل میں منتقل کردیا۔ جب پولیس آپ کو مظفر نگر لے جا رہی تھی تو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ راستہ میں کھڑے ہو گئے اور دور ہی سے آپس میں سلام کی نوبت آئی اور اشاروں سے اظہار محبت جانبین سے کردیا گیا۔(۶)

حاولن تفديتي وخفن مراقبا   فوضعن أيديهن فوق ترائبا

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ چھ ماہ جیل میں رہے انگریز حاکم نے دریافت کیا تم نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں تسبیح تھی تسبیح اٹھا کر دکھائی اور فرمایا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ دیکھو جھوٹ بھی نہیں بولا اور یوں بھی نہیں کہا کہ ہم نے ہتھیار نہیں اٹھایا حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ کما فی الحصن الحصین اپنے اس ہتھیار کا اقرار کرلیا۔

بیعت اور منازل سلوک

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت قاسم العلوم والخیرات نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما سبق کے ساتھی تھے کئی سال دہلی میں گزارے تھے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاذ رحمۃ اللہ علیہ (غالباً مولانا مملوک علی صاحبؒ) سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی اس لئے انکار فرماتے تھے بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے یہ منظور ہوگیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آ نکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب معہ تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی حاجی صاحب آ گئے اور حضرت مولانا نے مجھ سے

(۶) تذکرۃ الرشید ص:۸۴۔

مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی

۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۸ء

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے قومی اور سیاسی تحریکوں کے بطن سے جنم لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بانیوں میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، شیخ الہند مولانا محمود حسن، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ ہی مہاتما گاندھی کا نام بھی شامل ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی ۲/اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پور بندر (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والدین کی چار اولادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد کرم چند اُتم چند پور بندر راجکوٹ کے دیوان تھے۔ ان کے دادا بھی پور بندر اور جوناگڑھ کے دیوان رہ چکے تھے۔ ان کی والدہ پتلی بائی بڑی مذہبی خاتون تھیں۔ گاندھی جی پر ان کا اثر زندگی بھر رہا۔

موہن داس نے ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۷ء تک اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور جس سال انھوں نے اسکول میں داخلہ لیا اسی سال ان کی شادی کستور بائی سے ہو گئی جو پور بندر کے ایک تاجر کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے گاندھی جی کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ چند ماہ کالج میں گزارنے کے بعد وہ ستمبر ۱۸۸۸ء میں انگلستان روانہ ہو گئے اور قانون کی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۸۹۱ء میں وطن واپس ہوئے۔ یہاں انھوں نے ایک بیرسٹر کی حیثیت سے وکالت کا پیشہ اختیار کیا مگر کامیاب نہ رہے اس لیے ۱۸۹۳ء میں وہ جنوبی افریقہ چلے گئے جہاں کے سیٹھ عبداللہ نامی تاجر نے اپنی فرم کے قانونی معاملات کے سلسلے میں انھیں بلایا تھا۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو ہندستانیوں اور کالے لوگوں کے ساتھ گوروں کے وحشیانہ سلوک کا تجربہ ہوا ان ہی دنوں انھیں ٹالسٹائی کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا جن سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۴ء تک ہندستانیوں اور کالے لوگوں کو ان کے حقوق دلانے کے لیے گورے لوگوں کے نسلی امتیاز کے خلاف تحریکیں چلائیں جو بہت کامیاب رہیں۔ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں اپنی تحریک کے ترجمان "انڈین اوپی نین" کا اجرا کیا اور فینکس کے آشرم کی بنیاد رکھی ان کے یہ تجربات رسکن کی تحریروں سے متاثر تھے۔

۹/جنوری ۱۹۱۵ء کو گاندھی جی وطن واپس ہوئے اور اسی سال مئی میں انھوں نے

مخاطب ہو کر فرمایا کہ لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ ''بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا'' مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا: بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں ایسے ہیں ''ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے''۔ (۷)

حضرت حاجی صاحب فارغ التحصیل عالم نہیں تھے لیکن ایسے ایسے اکابر ان سے بیعت ہوئے جو علم کے پہاڑ تھے، پھر حاجی صاحب ہی کے ہو رہے اور اسی کو مونڈنے سے تعبیر فرمایا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا حضرت حاجی صاحب مولوی نہ تھے؟ فرمایا مولوی گر تھے، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں علوم ہی کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد ہوا ہوں۔ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور بہت جلدی ہی خلافت سے نواز دیئے گئے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دونوں حضرات سے بہت محبت اور عقیدت تھی ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

> ''جو آدمی اس فقیر امداد اللہ سے محبت وعقیدت وارادت رکھتا ہے، مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری اور باطنی کو جامع ہیں بجائے میرے بلکہ مجھ سے بھی بڑھ کر شمار کرے۔ اگر معاملہ برعکس ہے وہ بجائے میرے اور میں بجائے ان کے ہوتا ان کی صحبت غنیمت جاننی چاہیے کہ ان جیسے آدمی اس زمانہ میں نایاب ہیں''۔

ضیاء القلوب میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کا یہ ملفوظ بھی ہے:

> ''اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لے کر آیا تو میں رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں''۔

آخر کوئی تو وجہ تھی کہ ان دونوں حضرات نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور مرید ہونے کی ضرورت محسوس کی، بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ قلب منیب بھی ہونا چاہیے جو لوگ اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتے وہ علم کے غرور میں صاحب نسبت حضرات سے دور

(۷) تذکرۃ الرشید۔

احمد آباد میں ایک آشرم قائم کرلیا جہاں ان کے فینکس کے ساتھی رہنے لگے۔ ۱۹۱۷ء میں اس آشرم کو دریائے سابرمتی کے کنارے منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان انھوں نے چمپارن (بہار) اور کیرا (گجرات) میں کسانوں کے لیے تحریک چلائی اور احمد آباد میں مزدوروں کے مسائل حل کروائے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا جس میں اتحادیوں کے خلاف جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے ترکی بھی شامل ہو گیا۔ اس واقعہ سے ہندستانی مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا کیونکہ اس صورت میں ان کے مقامات مقدسہ اتحادیوں کے حملہ سے دوچار ہو سکتے تھے لیکن وائسرائے اور وزیر ہند نے مسلمانوں کو یقین دہانی کرائی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ جنگ کے بعد حکومت کی جانب سے ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کی جگہ نئی قانون سازی کے سلسلہ میں رولٹ بلوں کو پیش کیا گیا جو ہندستانیوں کی آزاد شہری زندگی پر حملہ آور ہوتے تھے گاندھی جی نے ان بلوں کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کا اعلان کیا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف یوں تو پورے ملک میں ستیہ گرہ تحریک نے کامیابی حاصل کی لیکن پنجاب میں اس کا اثر شدید رہا۔ امرت سر میں ۱۹۱۹ء میں اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف جلیان والا باغ میں احتجاجی جلسہ میں شریک ہونے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلمان اور سکھ پہنچے تو جنرل ڈائر نے گولیوں سے ان لوگوں کو بھون ڈالا۔ اس کے نتیجے میں سیکڑوں لوگ شہید اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ اس سال دسمبر میں ہندستان کی سیاسی جماعتوں یعنی انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، سینٹرل خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء نے اپنے سالانہ اجلاس امرت سر میں منعقد کر کے شہیدوں کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

جنگ کے بعد فتح یاب اتحادیوں نے دولت عثمانیہ کے ٹکڑے کرکے اس کے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فعل سے ہندستانی مسلمانوں کو شدید تکلیف پہنچی اور گاندھی جی کے مشورے سے انہی کی قیادت میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ انھوں نے رولٹ قانون، پنجاب کے مظالم اور خلافت کے حل کو قومی مطالبات میں منتقل کر دیا اور تحریک ترک موالات کے پروگرام کو کلکتہ اور ناگ پور کانگریس کے اجلاسوں سے بھی منظور کرا لیا۔ ان اجلاسوں کے بعد متفقہ طور سے وہ کانگریس، خلافت اور ہندستانی قوم پروری کے سب سے بڑے رہنما تسلیم کیے جانے گئے۔ غیر ملکی حکومت سے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی تحریک کی تجویز کا ملک کے ہر طبقے نے خیر مقدم کیا۔ ان کے سات نکاتی پروگرام میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ان تمام تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے جنھیں حکومت کی سرپرستی یا مالی امداد میسر تھی۔ اس سلسلے میں قومی رہنماؤں کا پہلا قدم

بھاگتے ہیں اور محروم رہتے ہیں یہ تو ماضی قریب کی باتیں ہیں ماضی بعید میں حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شمس تبریز کے مرید ہوئے اور پھر ان ہی کے ہو رہے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہ ہی واقعہ پیش آیا۔ بہت بڑے عالم تھے صاحب جاہ تھے بڑا مرتبہ تھا لیکن انھوں نے ضرورت محسوس کی اور اپنے باطن کو انابت الی اللہ سے خالی پایا، نفس کا مراقبہ ومحاسبہ کیا۔ اپنے مرشد کی طرف رجوع ہوئے اور اصلاح باطنی کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ نہ صرف اپنا بھلا کیا بلکہ قیامت تک کے لئے علماء کو بیدار کر دیا منجیات ومہلکات سے آگاہ کیا اور رہتی دنیا تک کے لئے احیاء العلوم دنیا میں چھوڑ گئے۔

جو لوگ تصوف وسلوک سے راضی نہیں وہ کسی صاحب نسبت سے قریب ہی نہیں ہوتے کہ اس لائن کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوں: الناس اعداء لما جھلوا تصوف وسلوک کے فوائد سے بے خبر ہیں اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور مصنف تھے شہرت میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے لگ بھگ مقام رکھتے تھے انھوں نے تعلق قائم کیا تو ان کے متعلقین میں سے ایک بڑا حلقہ معترض ہوا، بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اتنے بڑے علامہ نے ایک ملا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ حضرت علامہ نے جواب دیا کہ علم محض سے کام نہیں چلتا، علم کے ساتھ قلب منیب کی بھی ضرورت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ ایک طرف تو علامہ کہتے ہیں اور دوسری طرف معترض ہو رہے ہیں اس سے تو اور عبرت لینی چاہیے کہ جب اتنے بڑے علامہ کو اصلاح نفس کے لئے کسی مرشد ومصلح کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو کم علم کو کیوں کر اس کی ضرورت نہ ہوگی۔

جو حضرات صاحب نسبت ہیں۔ جس کو تعلق مع اللہ کی دولت حاصل ہے وہ کچھ نصیحت کرتے ہیں تو دل میں اترتی چلی جاتی ہے اور جن کو یہ دولت نصیب نہیں ان کے پاس صرف علم ہی علم ہے۔ وہ بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں لوگ ان کی تقریریں کانوں کی عیاشی کے لئے سن لیتے ہیں دل پر کسی کے کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ تجرباتی باتیں ہیں۔ تجربہ بڑی دلیل ہے اور شاہد عدل ہے۔
مدارس میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اساتذہ اور تلامذہ میں ذکر وفکر کی شان پیدا

علی گڑھ کی جانب اٹھا اور علی برادران کے مشورے پر گاندھی جی نے طلبہ کے والدین کے نام ایک اپیل جاری کرتے ہوئے ان سے حکومت کے تئیں عدم تعاون کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنی اپیل میں کہا کہ ”آپ کے بچے علی گڑھ میں زیر تعلیم ہیں۔ آپ کو اپنے بچوں کے سلسلہ میں جو فکر لاحق ہے اس میں میں بھی آپ کا شریک ہوں کیوں کہ میں خود چار بچوں کا باپ ہوں اور مجھے اس سلسلے میں والدین کے فرائض کا احساس بھی ہے لیکن میں ان سب پر اس فرض کو ترجیح دیتا ہوں جو خدا کا حق ہے۔ میں نے مختلف مقامات پر ہزاروں والدین سے خطاب کیا اور کسی نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی کہ ان کے بچے ان تعلیمی اداروں سے باہر نکل آئیں جو حکومت کے زیرِ نگرانی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں آپ کی مرضی کے خلاف آپ کے بچوں سے یہ کہوں کہ وہ اپنے اسکول اور کالج کو خیر باد کہہ دیں تو آپ کے جذبات کو صدمہ نہیں پہنچے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ کے طلبہ کے والدین بھی دوسری جگہوں کے والدین ہی کی طرح اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے یا حکومت سے امداد پانے والے اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکال لیں جس نے مسلمانوں کے خلاف غداری کر کے اور پنجاب میں اپنے ظالمانہ سلوک سے پوری قوم کی توہین کی ہے۔ کاش آپ کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہو تا کہ وطن عزیز کی قسمت ہم والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا ہم اپنے بچوں کو غلامی کی اس لعنت سے نجات نہیں دلائیں گے جس نے ہمیں اپنے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا ہے؟۔۔۔ اگر وہ آزاد بچوں اور بچیوں کی طرح تعلیم حاصل کریں تو اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا“۔

اگرچہ لوگوں کی خاصی تعداد پر اس اپیل کا اثر ہوا مگر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے انتظامیہ نے اس کی زبردست مخالفت کی اور عدم تعاون کی تجویز کے خلاف قرار داد منظور کر کے صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، تاہم کالج کے طلبہ کی دعوت پر گاندھی جی علی برادران کے ساتھ علی گڑھ پہنچے اور ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو انھوں نے یونین کلب میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انھیں عدم تعاون یا ترکِ موالات کا پیغام دیا، اس تحریک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور انھیں سمجھایا کہ حکومت کے زیر اثر مجوزہ یونیورسٹی مسلمانوں کے تعلیمی و تہذیبی مسائل کو حل نہیں کر سکتی اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے کو حکومت کی پابندیوں سے آزاد کرالیں۔ اگرچہ گاندھی جی کی تقریر سے بیشتر طلبہ متاثر ہوئے مگر وہ اپنے کالج کو خیر باد کہنے کے سلسلے میں ان سے کوئی وعدہ نہیں کر سکے۔

گاندھی جی کے علی گڑھ سے واپس چلے جانے کے بعد وہاں کے طلبہ اور علی برادران نے

ہو۔تزکیۂ باطن، تربیت نفس، کثرت ذکر، مراقبہ ومحاسبہ ہر فرد کے اندر ہونا چاہیے ان کاموں کے لئے مرشد ومربی کی ضرورت ہوتی ہے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں اکابر دیوبند کے خلفاء موجود ہیں، اہل طلب ان سے رجوع فرمائیں علم بھی حاصل کریں اور عملی زندگی بھی سدھاریں، ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوں۔قرآن وحدیث کا علم تو آج کل مستشرقین کے پاس بھی ہے اسلامیات پر کتابیں بھی لکھتے ہیں۔سب کچھ پڑھتے ہیں لیکن گمراہ ہیں۔ایمان ویقین، علم وعمل ظاہر و باطن کی اصلاح، خدمت دین، فکر آخرت، سب ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔

ترک موالات کے سلسلے میں گاندھی جی کی آواز پر لبیک نہ کہنے والوں پر لعن طعن کیا اور غیرت دلائی کہ انھوں نے اس شخص کی مخالفت کی جو خود مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لیے برسر پیکار تھا انجام کار ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کالج سے ذاکر حسین کی قیادت میں باہر نکل آنے والے طلبہ پر مشتمل جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آگئی اور کالج کی مسجد میں اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں اس کا افتتاح بھی عمل میں آگیا۔ حکیم اجمل خاں امیر جامعہ، مولانا محمد علی شیخ الجامعہ، حاجی موسیٰ خاں معتمد اعزازی اور تصدق احمد خاں شیروانی اس کے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ فوراً ہی گاندھی جی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے متعلق اطلاع دی گئی۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سبھی رہنماؤں کو مبارک باد دی اور اس کے بعد گاندھی جی ہمیشہ کے لیے اس دانش گاہ سے وابستہ ہوگئے اور ہر موڑ پر انھوں نے اسے جاری رکھنے کے سلسلے میں عملی اقدامات کیے۔

مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کے مشورے اور فاؤنڈیشن کمیٹی کے فیصلے کے مطابق گاندھی جی نے شاعر مشرق علامہ اقبال کو لکھا کہ مسلم نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) انھیں آواز دے رہی ہے، اگر وہ اس کی سربراہی قبول کرلیں تو اس ادارے کی کامیابی اور ترقی میں کوئی شبہہ نہیں رہ جائے گا مگر علامہ نے خرابی صحت کے سبب اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کردی۔ اسی لیے مولانا محمد علی شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز رہے اور جب وہ جیل چلے گئے تو عبدالمجید خواجہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی کو جامعہ کا وزیٹر منتخب کیا گیا۔

جامعہ ملیہ کا نصاب مرتب کرنے کے سلسلے میں بھی گاندھی جی کے مشوروں کو دخل رہا۔ انھوں نے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا کہ اس کے نصاب میں دینیات کو بھی ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا اور جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جامعہ میں ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا انتظام بھی کیا جانا چاہیے تو گاندھی جی نے مشورہ دیا کہ جامعہ ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کے لیے محض ایک کمرے کا انتظام کردے اور اس تعلیم کے لیے وقت کا تعین کردے مگر اپنی مذہبی تعلیم کے لیے اہل ہنود پروفیسر کا انتظام خود کریں۔ البتہ جب جامعہ میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہوجائے تو اس وقت جامعہ بھی اس کا انتظام کرسکتی ہے۔ ویسے اہلِ ہنود کے لیے جامعہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں۔

گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات میں کھدّر کو بڑی اہمیت حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ جامعہ میں بھی اسے خاصی اہمیت حاصل رہی۔ اس کے دستورالعمل میں واضح کردیا گیا تھا کہ

مولانا محمد اسلم قاسمی*

حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ

مادرِ گیتی تاریخ کے ہر دور میں اپنے سینے سے انسانی قالب میں لعل و جواہر نکالتی رہی۔ انگنت بے مثال ہستیوں نے اس عروس دنیا کو اپنے فکر و علم سے سنوارا۔ اُن کے علمی و فکری احسانات سے انسان کبھی سر برآ نہیں ہوسکتا۔ ان عظیم ہستیوں کی صف میں اولین درجہ تو اللہ کے سچے پیغمبروں کا ہے جنہوں نے انسان کو مقصد حیات بتلایا، اُن کی رہنمائی نے پیدائش سے موت تک زندگی کے ایک ایک حرکت و سکون کے نوک پلک کو سجایا، بندے کا تعلق خدا سے قائم کیا، جہل و سرکشی کے عفریت پر ضرب لگائی، راہ سے بھٹکے ہوؤں کو منزل مراد بتلائی اور آدم کے شوریدہ سر فرزندوں کو پروردگار کے پُر جلال چوکھٹ پر جھکا دیا۔ پورا عالم انسانیت اللہ کے ان برگزیدہ ترین بندوں کا ہمیشہ احسان مند رہے گا۔

پھر اس کے بعد وہ مشہور شخصیتیں ہیں جو کسی علم و فن یا ہنر میں اپنا نام پیدا کر گئیں یا وہ سلاطین ہیں جو اپنی مسلسل فتوحات کے ذریعہ صفحاتِ تاریخ پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ غرض زندگی کے ہر میدان میں تاریخ کا سفینہ اپنی بیشمار اور مایۂ ناز شخصیات کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔

تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی نے شخصیات کی اس کہکشانی لڑی میں ایک ایسے دُرِ آبدار کا اضافہ کیا جن کی چمک دمک نے صرف اپنے عہد کو ہی نہیں آنے والی صدیوں کو بھی روشن کر دیا۔

یہ گراں مایہ شخصیت حضرت الامام حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم النانوتوی کی ہے۔ حضرت نانوتوی ولی اللّٰہی سلسلۂ علم و روحانیت کی وہ قدآور شخصیت ہیں جن پر خود زمانہ فخر کرتا ہے۔ آپ حق تعالیٰ کی عطا کردہ گوناگوں صلاحیتوں کا ایک نادر نمونہ تھے۔ اگر علمی لحاظ سے آپ غزالی

---

* استاذ تفسیر و حدیث، وقف دارالعلوم دیوبند

"تمام ارکانِ جامعہ سے توقع ہے کہ وہ کھدر کا استعمال کریں گے۔ تقریبات کے موقع پر کھدر کا سبز چغہ جس کی آستینوں پر زرد کنارہ ہو استعمال کیا جائے گا۔ طلبہ کو اس چغہ کا استعمال جماعت میں، شیخ الجامعہ کی خدمت میں، اپنے اُستادوں اور دیگر اراکینِ جامعہ سے ملنے کے وقت نیز شہر اور اسٹیشن جانے کے وقت استعمال کرنا ضروری ہے۔" بعد ازاں تنکلی کا استعمال بھی جامعہ میں عام کر دیا گیا۔

جامعہ کے ابتدائی دور میں اس کے اخراجات کا بار مرکزی خلافت کمیٹی پر تھا تاہم جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو ہندوستان میں بھی خلافت تحریک کا جوش سرد پڑ گیا تو جامعہ کی حالت دگرگوں ہو گئی اور اس کا جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ تاہم جامعہ کے رہنماؤں نے اس کے لیے ایک قومی فنڈ قائم کر دیا تاکہ جامعہ کو کسی کا دست نگر نہ رہنا پڑے مگر دشواریوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایسے حالات میں جب کہ جامعہ بحرانی دور سے گزر رہی تھی اور اُسے بند کر دیے جانے کی تجویز زیرِ غور تھی ذاکر صاحب نے (جو ان دنوں ریسرچ کے سلسلے میں جرمنی میں مقیم تھے) بذریعہ تار فاؤنڈیشن کمیٹی سے درخواست کی کہ "میں اور میرے کچھ ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ کیا جائے"۔ اسی قسم کی درخواست طلبہ کے ایک وفد نے بھی امیر جامعہ سے کی کہ ذاکر صاحب کی واپسی تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔ اس درخواست پر غور کرنے کی غرض سے جنوری ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں نے دہلی میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ جامعہ کو ہر قیمت پر جاری رکھا جائے اور مشکلوں اور مالی پریشانیوں کے باوجود اسے قائم رکھا جانا چاہیے خواہ اس کے لیے انھیں بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے، مگر جامعہ کا جاری رکھنا اب اسی صورت میں ممکن تھا جب اسے علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا جاتا کیوں کہ ہر ہفتہ حکیم اجمل خاں کے لیے علی گڑھ جانا اور جامعہ کے معاملات کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ گاندھی جی کے مشورے سے جون ۱۹۲۵ء میں جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔

اگرچہ جامعہ کے دہلی منتقل ہو جانے سے اس کی پریشانیوں میں کمی واقع نہ ہوئی تاہم اسے گاندھی جی سے قربت کے مواقع فراہم ہو گئے اور حکیم اجمل خاں کی مستقل نگرانی کا شرف حاصل ہو گیا۔

فروری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب بھی محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ برلن سے دہلی آ پہنچے اور انھوں نے جامعہ کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس کے چند ماہ بعد موقع ملتے ہی

ورازی کی سندِ معقول کے صدر نشین تھے تو روحانی اعتبار سے آپ اپنے وقت میں بوذری فقر و بوریہ نشینی کی یادگار رہتے تھے۔ ایک طرف آپ تبلیغ اور ابلاغ دین کے شہسوار تھے تو دوسری طرف بدعات وخرافات کے ابتر ماحول میں آپ ایک عظیم مجدد کے مقام پر نظر آتے ہیں۔ آپ کے قلم البرز شکن نے اصول دین کو کلامی اور عقلی و معقولی انداز میں اس طرح مدلل کیا کہ آپ کے فلسفیانہ استدلال نے ارسطو کے زندیقی فلسفہ کے تاروپود بکھیر دیئے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر اپنے پیش رووں میں بعض اکابر سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بہت کچھ اشکالات جنہیں امام رازی نے بالتفصیل اٹھایا لیکن بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گئے اُن کے مدلل جوابات حضرت نانوتوی کے یہاں ملتے ہیں۔ علمی میدانوں میں آپ کی تگ وتاز کی بلند پروازی اگر شاہین وعقاب کے مانند ہے تو دوسری طرف مجاہدہ وریاضت کی دوڑ میں آپ کی شکستگی اور ظاہری سراپا سے بے نیازی سنتِ بوذری کی ایک تابندہ مثال ہے جو آج بھی دلوں کی ایمان افروزی کا ذریعہ ہے۔ حضرت نانوتوی علم وفکر کے اعتبار سے اسرار وحکم کے راز کشا تھے۔ آپ نے اصولِ دین پر مخالفین کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات کا دفعیہ تحریر کے ساتھ ساتھ اپنی مناظرانہ تقریری صلاحیتوں سے بھی کیا اور برجستہ خطابات میں اس طرح معقولی استدلال کئے کہ مخالف کو فرار کے سوا چارۂ کار نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف آپ کے مواعظ نے دین میں کئے گئے اضافات واختراعات کو مٹایا اور مسائل دین پر سے وقت کے غبار کو اڑا کر اُس کے رُخ روشن کو نمایاں کیا، اس طرح حق تعالیٰ نے آپ کی شان مجددیت کو بھی آشکار کیا کہ دین میں لوگوں کے اختراعات سے جو اس کی شکل بدل گئی تھی حضرت نانوتوی کی مساعی نے اُن بدعات کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر اُس کے صحیح خدوخال واضح کئے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی کی شکل میں ایک جامع الصفات شخصیت کو نمودار کیا جس کے ہمہ جہتی کارناموں نے علمی وعملی طور پر ملتِ اسلامیہ کو نشاۃ ثانیہ دی۔ آپ کی ذات نے اس امت محمدی میں جو زوال کے زخموں سے چور اور نڈھال ہو رہی تھی اپنی مسیحا نفسی سے نئی زندگی کی روح پھونکی اور اس بیجان قالب کو پھر سے متحرک کیا۔

حضرت نانوتوی نے رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں اس بزم ہست وبود کو رونق بخشی۔ یہ دور بالعموم پورے ملک اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے لئے انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ جس میں مغلیہ

ذاکر صاحب اپنے ان دونوں ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں مہاتما گاندھی کی خدمت میں سابر متی آشرم پہنچے۔ ذاکر صاحب اپنے جرمنی کے قیام کے دوران جرمن زبان میں گاندھی جی پر ایک کتاب شائع کر چکے تھے جو وہاں بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے جرمنی کے مختلف شہروں میں گاندھی جی پر تقریریں کی تھیں اور اخبارات میں مضامین بھی قلمبند کیے تھے تاہم گاندھی جی سے یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے تاثر کی تفصیل خود ذاکر صاحب کی زبانی سنیے:

"گاندھی جی نے جس طرح گفتگو کی اس سے یہ صاف عیاں تھا کہ وہ سچائی کی تلاش میں ہیں۔ سچائی جس سے جامعہ ملیہ سے ان کا تعلق متعین ہو گا۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ کی جڑیں مضبوط ہوں، جامعہ ترقی کرے تاکہ اس سے اس تصور کی ترجمانی ہو جو اس سے متعلق ان کے ذہن میں بالکل واضح تھا۔ انھیں جامعہ کی فکر ہو گی وہ اس کی رفتار ترقی پر نظر رکھیں گے 'وہ اس کے پھلنے پھولنے کے آرزومند ہوں گے 'لیکن وہ اس کی ایسی کوئی مدد نہیں کریں گے جس میں اس کا خطرہ ہو کہ جامعہ ملیہ اپنی انفرادیت 'شخصیت اور شناخت کے ارتقا کی آزادی سے محروم ہو جائے۔ انسانوں کی طرح ادارے بھی ہوتے ہیں جنھیں وہی سب کچھ ہو جانا چاہیے جو وہ بننا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس سے میں بہت متاثر ہوا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے خیالات ان کی پوری شخصیت کے آئینہ دار تھے۔ ان کی شخصیت عالم فطرت کا کوئی سانحہ یا موروثی تمدن کی پیداوار نہ تھی۔ اسے ایک اخلاقی ڈیزائن کے مطابق انھوں نے خود بُنا تھا۔ ایک دست کار کی طرح برسوں صبر و استقامت سے انھوں نے اس پر کام کیا تھا اور اب بھی وہ اس سے مطمئن نہ تھے۔۔۔۔ ان کا انداز گفتگو ایسا نہ تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جو کام کرنا چاہتے تھے 'وہ ختم ہو چکا ہے بلکہ وہ اس طرح بات کرتے تھے جیسے وہ کام ابھی جاری ہے اور اس میں ان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں' اوزاروں پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو سکتی ہے 'ارادے کمزور پڑ سکتے اور قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ فکر اور عمل میں کامل ہم آہنگی یکایک نہیں پیدا ہو جاتی 'یہ سعی پیہم چاہتی ہے 'مسلسل خود احتسابی کی خواہاں ہوتی ہے اور اس عمل

سلطنت کا چراغ زندگی ٹمٹما رہا تھا۔ مسلمانوں کی گزشتہ سطوت کی بساط الٹتی جا رہی تھی اور ایک با اقتدار فرقہ غیر ملکی قوم کے دبدبے سے پستا جا رہا تھا۔

ہندوستان میں آٹھ نو سو سال حکومت کرنے والی قوم نے اپنے دورِ اقتدار میں جہاں وطنِ عزیز کو تہذیب و تمدن کی رونقیں دیں وہیں بعض فرمارواؤں نے اُن اسلامی اقدار کو تباہ کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا جو اُن کے پیشرووں نے پورے اخلاص سے قائم رکھی تھیں۔ حکمرانوں کی غلط کاریوں پر نکیر کرنے والے علماء کو دورِ انحطاط میں بھی اپنے فرمانرواؤں کی دینی غیرت سے تقویت حاصل رہی اور وہ نہی عن المنکر کا فریضہ برابر انجام دیتے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ دورِ اکبری میں اُن تمام نقوش کو مٹانے کی کھلی چھوٹ مل گئی جو دینی دردمندی کے طفیل ماضی میں ثبت کئے گئے تھے۔ تاہم اکبر کے جانشینوں نے مغلِ اعظم کی غلط کاریوں کا ازالہ کرنے میں قدم بڑھایا اور ایک بار پھر اسلامی قدریں زندہ ہوئیں۔ دوسری طرف مغلوں کے عروج و اقتدار کا سورج جو اپنے نصف النہار پر پہونچ چکا تھا روبہ زوال ہونے لگا، دورِ جہانگیری میں عیش و طرب اور کیف و مستی نے قوتِ کار کو مضمحل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ تدریجی انحطاط شاہی خاندان کی باہمی آویزشوں اور محلاتی سازشوں کی صورت میں ابھرا۔

انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ دورِ اکبری میں ان لوگوں پر بادشاہ کی نظرِ کرم رہی اور یہ شاہی نوازشوں کے سائے میں پھل پھول رہے تھے۔ پھر جہانگیر کے بعد جب شاہجہاں تختِ شاہی پر رونق افروز ہوا تو وہ یورپین اقوام کی جسارتیں برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے اُن کے خلاف تادیبی کارروائیاں کیں، یہاں تک کہ عہدِ عالمگیری میں ان کو ملک بدر بھی کیا گیا تاہم پھر اُن کو تجارتی سہولتیں دے دی گئیں۔ عالمگیر کی حکومت اپنی وسعت کے اعتبار سے مغلوں میں سب سے بڑی سلطنت رہی مگر یہ بسترِ مرگ پر پڑے مریض کا آخری سنبھالا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب نے جونہی دم توڑا سلطنتِ مغلیہ کے تین سو سالہ استحکام میں شگاف پڑ گئے۔ مختلف فرقے جو مناسب وقت کے منتظر تھے ایک دم چاروں طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرہٹوں روہیلوں وغیرہ نے اپنے علاقوں کا رشتہ مرکز سے توڑ کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ادھر شیعہ سُنی فتنے نے پوری شدت سے سر اٹھایا۔

اس ابتری کے دوران سفید فام قوموں نے افراتفری کے ماحول کو اپنے لئے نیک فال سمجھا،

میں خلوص اور انکسار کی کیفیت ایک خاص ندرت کی حامل بن جاتی ہے
گاندھی جی کا خلوص نہ صرف یہ کہ ظاہر تھا بلکہ میرے لیے ایک چیلنج تھا
کہ مجھ میں بھی انھیں کی طرح اور اتنا ہی خلوص اور سچائی ہو اور میں نے یہ
بھی محسوس کیا کہ مجھے اپنے کام کو ایک احترام کے جذبے سے کرنا ہے اور
اپنے اندر تواضع وانکسار پیدا کرنا ہے اس لیے کہ جتنا بڑا کام ہوتا ہے اسی
قدر اس کے مطالبات مشکل اور محنت طلب ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو ہمہ
وقت اور ہر لحاظ سے اپنے کام کا اہل ہونا چاہیے۔"

اس طرح ذاکر صاحب کو مہاتما گاندھی سے جو روشنی ملی اُس نے ان کے متذبذب ذہن سے شکوک و شبہات کے جالے دور کردیے۔ اس کے بعد ذاکر صاحب اکثر و بیشتر مہاتما گاندھی سے ملتے رہے اور جامعہ کے سلسلے میں تبادلۂ خیالات کر کے اس ادارے کو استحکام بخشتے رہے۔

نومبر ۱۹۲۶ء میں حکیم اجمل خاں اور ذاکر صاحب کی دعوت پر جامعہ کے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد مہاتما گاندھی پہلی بار جامعہ آئے تو اس کے طلبہ نے ان کی خدمت میں کھدر کے کام کے لیے ستر روپے کی تھیلی نذر کی۔ ان کے ساتھ مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی' حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، سیٹھ جمنالال بجاج اور مہادیو دیسائی بھی تھے۔ جلسہ کے دونوں طرف طلبہ تکلی چلا رہے تھے۔ جامعہ کی جانب سے گاندھی جی کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا اس میں کہا گیا تھا:۔

'مہاتما جی، آج آپ نے جامعہ میں تشریف لا کر ہمارے دلوں کو خوشی
سے بھر دیا ہے۔ آپ کے تشریف لانے سے ہماری ہمتیں بڑھ گئی ہیں
اور ہمارے ارادے بلند ہوگئے ہیں۔ ہم آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتے
ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دیس کی خدمت کے لیے
آپ کو بہت دن قائم رکھے۔

"آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑہ
اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک
بندے، اپنے دیس کے سچے خادم اور سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے
والے بن جائیں وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ ہم اپنے علم و ہنر سے اپنے
اخلاق کو سنواریں، محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے

یہ لوگ اگرچہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے مگر ہندوستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے میں یہ سب یورپین ہم خیال تھے۔ ملک کی ابتری سے سب سے زیادہ فائدہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھایا، بنگال کو کمپنی نے اپنی سازشوں اور فوجی طاقت کا مرکز بنایا اور وہاں کے حکمراں کو ختم کر کے کمپنی نے حاکمانہ صورت اختیار کر لی۔

ادھر امام الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ اس افراتفری سے ملول ہی نہیں تھے بلکہ انقلابی انداز فکر سے اس کا حل ڈھونڈ رہے تھے مگر اسی دوران اُن کے لئے قضاء وقدر کا فرمان آ گیا۔ پھر ان کے خلف الرشید حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ متوفی ۱۸۲۴ء اور پھر ۱۸۳۱ء میں حضرت سید احمد شہید کے رخصت ہو جانے کے بعد اس امانت کے صحیح وارث حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے علمی و روحانی شاگرد و متوسلین بنے۔ علماء و صلحاء کا یہ مجمع جن شخصیات پر مشتمل تھا وہ قدرت کی عطا کردہ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا نام نامی ہے جو ایک ایسے بے مثال عالم تھے کہ اگر ایک طرف مسند منقول و معقول پر رونق افروز تھے تو دوسری طرف ایک بے بدل مفکر اور مناظر و مصنف بھی تھے۔ اس اعتبار سے فکرِ ولی اللّٰہی کے امین اور دہلوی مکتب فکر کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اگر کوئی نام اکابر دیوبند کے مجمع میں نمایاں ترین نظر آتا ہے تو وہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا ہے۔ پھر قدرتی طور پر بھی شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی حکمت کو زندہ رکھنے کا اولین سہرا اسی شخصیت کے سر ہوا۔ حضرت نانوتوی کی عبقری شخصیت نے اس تحریک کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ وقت کے مطابق اس کے نوک پلک کو سنوار کر آگے بڑھایا۔ حکمتِ ولی اللّٰہی کے اسی جدید قالب کو قاسمیت سے تعبیر کیا گیا جو آج دنیا بھر میں مسلک دیوبند یا تحریک دیوبند کے نام سے متعارف ہے۔

بالاکوٹ کے معرکے میں وہ سرزمین حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے لہو سے سرخرو ہو چکی تھی۔ ہندوستان انگریزی سازشوں کی بھٹی میں تپ رہا تھا اور مغلیہ حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ مسلمان اپنے مستقبل کی طرف سے مضطرب تھے مگر تاریخ اسلام کے لئے یہ نشیب و فراز نئے نہیں تھے۔ یہ قوم ایسے ہچکولوں سے ہمیشہ دوچار ہوتی آئی ہے۔ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی اچانک غیبی

حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے کوشش کریں۔

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانہ کی ہوا ہمارے خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں جس سے پیار و محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنھیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے جگر کے خون سے سینچا تھا اگر سوکھ بھی جائیں تو ان کے بیج برباد نہیں ہو سکتے وہ ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان سے پھر نئے پودے نکلیں گے اور زہریلی ہواؤں سے بچ کر مضبوط اور تناور درخت بن جائیں گے۔

"ہم آخر میں پھر نہایت ادب سے آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ عزت ہمیں جلد جلد حاصل ہوا کرے گی"۔

مہاتما گاندھی نے بچوں کے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"جو لڑکے میرے پاس بیٹھے ہیں وہ میرے ایک پرانے دوست اور رفیق کار کے پوتے ہیں جن کا نام احمد محمد کاچلیہ ہے۔ انھیں میں اپنے حقیقی بھائی کے برابر سمجھتا تھا اور ان بچوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہو جانا ایک بالکل قدرتی امر تھا۔ ان ہی بچوں کے سلسلے میں کچھ باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ جس زمانہ میں میں نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کا آغاز کیا تھا، اس وقت وہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں کاچلیہ سے بڑھ کر باہمت اور مستقل مزاج کوئی آدمی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کی عزت و آبرو کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ انھوں نے نہ تو اپنے کاروبار اور مال و دولت کی کوئی پروا کی اور نہ اپنے دوست احباب کا خیال کیا بلکہ بلا کسی تامل اور اندیشے کے انھوں نے اپنے آپ کو ہی اس کشمکش میں ڈال دیا۔ اس وقت بھی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلافات گاہے گاہے پیدا ہو جاتے تھے لیکن کاچلیہ نے دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ قائم رکھا اور ان پر بیجا حمایت اور پاسداری کا الزام کبھی نہ لگا۔

"انھوں نے حب وطن اور رواداری کی خصوصیات نہ کسی اسکول

مدد نے سہارا دیا اور یہ ڈوبتی ہوئی کشتی طوفان کے تھپیڑوں سے نکل کر آسودۂ ساحل ہوئی۔ اب بھی بدترین حالات میں مشیت خداوندی آخری دین اور ملتِ بیضاء کی حفاظت کا سامان شروع کر چکی تھی۔

نانوتہ۔ دیوبند کے مغرب میں ایک چھوٹی سی کوردہ بستی ہے۔ اس غیر معروف دیہاتی علاقے کی جغرافیائی نقشوں میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مگر قدرت کو اس سرزمین پر پیار آ گیا۔ رمضان ۱۲۴۸ھ م ۱۸۳۲ء میں نانوتہ کے اس ویرانے میں بہار آئی اور یہاں ایک ایسا پھول کھلا جس کی خوشبو رفتہ رفتہ ہندوستان کی فضاؤں سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے کو معطر کر گئی۔ اس بستی کو حق تعالیٰ نے وہ سرفرازی عطا فرمائی کہ یہ گمنام سا قصبہ پورے ملک کے لئے سرمایۂ ناز بن گیا۔ نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جس کا نام محمد قاسم تجویز ہوا اسم با مسمّٰی ہو کر ''قاسم العلوم والخیرات'' بنا۔ آثار سعادت بچپن سے ہی رونما ہونے شروع ہو گئے۔ ذہانت و ذکاوت آپ کو خاندانی ورثہ کے طور پر ملی، رسم بسم اللہ اور کچھ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی، اس کے بعد کچھ مقامی حالات کے پیش نظر آپ کو دیوبند میں مکتبی تعلیم کے لئے بھیجا گیا، پھر کچھ عرصہ سہارنپور میں ابتدائی عربی و فارسی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کو تکمیل علوم کے لئے دہلی بھیج دیا گیا۔

دہلی میں آپ کو استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے تلمذ اور تحصیل علوم کا شرف حاصل ہوا جو اپنے وقت کے جید عالم ہی نہیں بلکہ استاذ العصر بھی ہیں، مولانا مملوک علی صاحب اٹھارہویں صدی کے اُن بے مثال علماء میں سے ہیں جن کے فیضِ علم سے انیسویں صدی کے اکثر وبیشتر مشاہیر اہل علم بہرہ ور ہوئے جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت گنگوہی، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولوی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، ڈپٹی نذیر احمد صاحب مترجم قرآن، مولانا محمد احسن نانوتوی مترجم احیاء العلوم، مولانا محمد مظہر صاحب بانی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہم۔ سر سید نے مولانا کی غیر معمولی مدح سرائی کی۔ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں آپ دہلی جاتے ہوئے اپنے صاحبزادے مولانا یعقوب صاحب کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتوی کو بھی تعلیم کی غرض سے لے کر دہلی آ گئے، حضرت الامام نے ۱۲۶۰ سے ۱۲۶۷ھ تک اپنے شفیق و فاضل استاد سے فیض علم حاصل کیا، ۱۲۶۷ھ میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب کا مرض

میں رہ کر حاصل کی تھیں اور نہ انگلستان جا کر' بلکہ انھوں نے یہ سب خود اپنے گھر میں سیکھا تھا، اس لیے کہ وہ گجراتی زبان بھی مشکل سے ہی پڑھ سکتے تھے۔ مقدمات کی پیروی میں جس طریقے سے وہ دلائل کا جواب دیتے وکلا اور بیرسٹر بھی اسے سن کر دنگ رہ جاتے اور بعض اوقات ان سے خود ان کے کاموں میں بھی بڑی مدد ملتی رہتی تھی۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام علی تھا اور جسے وہ میرے سپرد کر گئے تھے۔ گیارہ سال کا یہ لڑکا سچا اور پکا مسلمان تھا۔ رمضان کے مہینے میں وہ کبھی ایک روزہ بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر بھی اسے ہندو ساتھیوں سے کوئی نفرت نہ تھی۔ آج کل ہندو مسلمان دونوں ہی میں مذہبیت کے معنی دوسرے مذاہب سے نفرت و حقارت کے ہیں۔ علی میں اس قسم کی نفرت و حقارت کا کوئی جذبہ نہ تھا بہر حال بیٹے اور باپ دونوں کے نام آج میرے لیے انتہائی مسرت و خوشی کا باعث ہیں اور ان کی یہ مثالیں آپ کے لیے تقلید اور رہنمائی کا سبب ہیں۔

"اُس زمانے میں جبکہ ہندو اور مسلمان ایک ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کے لیے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار تھے میں نے طلبہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑنے کی دعوت دی تھی۔ اس تمام عرصے میں مجھے کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ میں نے ان طلبہ کو ان کی تعلیم گاہوں سے بلایا اور یہ پختہ یقین ہے کہ جن طلبہ نے اس آواز پر لبیک کہا تھا انھوں نے اپنے وطن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندستان کا آیندہ مورخ ان کے ایثار اور قربانی کو نہایت جلی حروف میں لکھے گا۔"

جب جامعہ دہلی منتقل ہوئی تو اس کے طلبہ کی تعداد اسی سے زائد نہ تھی' اس کا ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:

"میں اس قابلِ فخر زمانہ کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہے کہ آپ اس جھنڈے کو بلند رکھنے کے لیے اپنی پوری محنت اور جانفشانی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی کبھی بہت نہیں ہوتے ہیں۔

یرقان میں انتقال ہوگیا۔

حضرت نانوتوی نے علوم وفنون کی کتابیں مولانا مملوک علی صاحب سے مکمل کرنے کے بعد محدث کبیر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی (تلمیذ رشید حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی) کے سامنے تحصیل حدیث کے لئے زانوئے ادب طے کیا اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ دہلی کے اسی زمانۂ طالب علمی میں دنیاوی علوم مثلاً علوم ریاضی، اُقلیدس اور قواعد حساب میں بھی دستگاہ حاصل کی اور کچھ عرصہ ایک سرکاری مدرسہ میں بھی پڑھتے رہے۔ اس طرح دہلی میں آپ نے صحاح ستہ کے علاوہ ادب، ہیئت، ریاضی، منطق وفلسفہ اور منقولات میں تفسیر واصولِ فقہ اور معانی کی کتابیں پڑھیں، ان علوم میں سے اکثر میں مولانا مملوک علی صاحب ہی آپ کے استاد ہیں۔ تکمیل علوم کے بعد آپ نے کچھ عرصہ معمولی ملازمتیں بھی کیں جن کی آمدنی اکل حلال پر التزام رکھنے کے لئے بس ضرورت بھر تھی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپ علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ تعلیم سے فراغت ۱۲۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ اسی سال آپ کو منازل سلوک طے کرنے کے لئے مرشد کی تلاش ہوئی۔ اُس وقت کے صاحبِ نسبت بزرگوں میں ممتاز ترین اور مرجع خاص وعام ذات حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تھی۔

حضرت حاجی صاحب ابن حافظ محمد ابن فاروقی ان باکمال بزرگوں میں سے ہیں جن کے مریدین ومسترشدین میں عرب وعجم ہر جگہ کے حضرات شامل تھے، آپ رسمی طور پر تو عالم دین نہیں تھے کیونکہ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے تھے مگر رموزِ دین اور علم شریعت کی گہرائیوں پر حق تعالیٰ نے آپ کو وہ نظر عطا فرمائی تھی جو ایک عارف اور مرشد کو حاصل ہونی چاہئے۔ آپ ایک صاحبِ کشف وکرامت بزرگ اور خاندانِ چشتیہ صابریہ کے انتہائی ممتاز مشائخ میں سے تھے جن کی ذات پر مختلف ذوق اور مشرب کے لوگ مجتمع تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے اکثر حضرات حاجی صاحب کے دامنِ روحانیت سے وابستہ نظر آتے ہیں جس طرح حضرت الامام کے استاد اور علمی مربی حضرت مولانا مملوک علی صاحب اُس دور کے استاذ الاساتذہ ہیں اور اکثر مشاہیر وقت مولانا کے ہی شاگردانِ رشید ہیں اسی طرح حضرت نانوتوی کے روحانی مربی اور شیخ طریقت یعنی حاجی صاحب بھی اپنے وقت کے

میں آپ کو بھی نصیحت کروں گا کہ قلتِ تعداد کا آپ کچھ خیال نہ کیجیے بلکہ
اس بات کو پیشِ نظر رکھیے کہ ملک کی آزادی کا انحصار آپ پر ہے۔
آزادی کا آپ کے پڑھنے لکھنے یا تکلی چلانے سے بہت کم تعلق ہے۔
ہندستان کی آزادی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ
دو ہیں' خدا کا خوف اور انسان یا انسانوں کی جماعت سے جس کا نام حکومت
یا سلطنت ہے بے خوف ہونا ہے۔ ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی اس
درس گاہ میں نہیں ہو سکتی ہے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر اور کس درس گاہ میں
ہو سکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ
ان دو چیزوں کی تعلیم یہاں ضرور ہوتی ہے"۔

جامعہ جس مالی بحران کا شکار تھی گاندھی جی اس سے بخوبی واقف تھے' کیوں کہ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف وسائل سے رقومات اکٹھا کی تھیں مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس مالی پریشانی سے طلبہ پریشان ہوں اس لیے انھوں نے طلبہ میں خود اعتمادی اور خدا پرستی کے جذبات بیدار کرنے کی غرض سے کہا:

"مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے بلکہ
واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے میں خوش ہوں کہ آپ عسرت اور تنگ دستی کی
زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنے خالق کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے
گی اور آپ ہمیشہ اس کی یاد اپنے دل میں محفوظ رکھیں گے"۔

فرقہ وارانہ فسادات نے گاندھی جی کو بے چین کر دیا تھا تاہم انھیں ظلمت کے اس ماحول میں جامعہ ہی روشنی کی ایک کرن بن کر دکھائی دیتی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا:

"حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ میرے لیے دہلی آنا بہت
دشوار تھا لیکن آپ کے یہاں آکر مجھے انتہائی مسرت اور اطمینان
حاصل ہوا۔ میں آپ کی خوشی کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے
آپ کو خوش کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں ایک ذاتی غرض کو یہاں لے
کر آیا ہوں اور مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمان
ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں کا گلا کاٹنے پر تیار ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو
اس سے متاثر نہ ہونے دیں۔ اپنے خالق کو کبھی نہ بھولیں اور اپنے
دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا نہ ہونے دیں۔ اس اُمید پر

شیخ المشائخ اور اکثر مشاہیر علماء کے پیر ہیں۔ چنانچہ ان مشاہیر میں حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب صاحب، حکیم ضیاء الدین صاحب، حضرت تھانوی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری جیسے نمایاں ترین حضرات شامل ہیں۔

حضرت نانوتوی کی نگاہِ بصیرت نے اس روحانی کمال کو پہچانا اور اُن کی نگاہِ انتخاب اسی مرشد کی ذات پر آ کر ٹھہر گئی۔ یوں بھی حاجی صاحب سے حضرت نانوتوی کا تعلق بچپن کے زمانے سے قائم تھا۔ چنانچہ دہلی کے زمانۂ تعلیم میں وطن آتے جاتے آپ کا تھانہ بھون ٹھہرنے کا معمول تھا جو صرف حاجی صاحب کی زیارت کی وجہ سے تھا۔ اُدھر خود حضرت حاجی صاحب جب کبھی دہلی جاتے تو مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے۔ دہلی میں شاہی خاندان کے بعض افراد حاجی صاحب سے بیعت واصلاح کا تعلق رکھتے تھے، وہاں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی وغیرہ زیرِ تعلیم تھے۔ اس طرح دہلی میں بھی حضرت نانوتوی کو اس شیخ وقت کی زیارت وخدمت کا موقعہ ملتا رہا۔ چنانچہ آپ جب ۱۲۶۸ھ میں تعلیم سے فارغ ہوئے تو اس کے فوراً بعد حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے۔ حضرت الامام کے کچھ دنوں بعد حضرت گنگوہی بھی حاجی صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کے درمیان دوستی کا تعلق دہلی کے زمانۂ تعلیم میں قائم ہو چکا تھا جو طبیعتوں کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔ دونوں کے فراغ تعلیم وتعلم، اخلاصِ قلب، ملی دردمندی اور بلند فکری کے اعتبار سے ہم رنگ تھے۔ لہٰذا ان دونوں اکابر کا یہ تعلق انتہائی مضبوط اور مخلصانہ تھا جو حضرت نانوتوی کی وفات تک قائم رہا۔ ان دونوں حضرات کی گونا گوں صلاحیتوں اور ان کے چہروں سے نمایاں ہونے والے مخلصانہ جذبات واحساسات کو حضرت حاجی صاحب کی نگاہیں تاڑ چکی تھیں۔ چنانچہ حاجی صاحب کے وسیع حلقۂ ارادت میں نانوتہ اور گنگوہ کے افق پر طلوع ہونے والے یہی دونوں ستارے اُن کے سب سے زیادہ چہیتے اور مقرب مرید تھے جن پر خود شیخ کو غیر معمولی ناز تھا جیسا کہ سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے۔ لہٰذا مقامِ تعجب نہیں کہ جس جوہر قابل کو حاجی صاحب نے ان دونوں میں پہچانا تھا اُسی کی بدولت دونوں حضرات نے تمام منازلِ سلوک ایک ایک چلّے میں ہی طے کر لیں۔ چنانچہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کو بیعت کے بعد چند ہفتوں میں ہی حاجی صاحب کی طرف سے خلافت اور اجازتِ بیعت حاصل ہو گئی حالانکہ دونوں حضرات اُس وقت جوان العمر تھے۔ گویا اس مصرعہ کے

میں آپ کے یہاں آیا ہوں"۔

کھدر اور تکلی گاندھی جی کو دل و جان سے عزیز تھے۔ جامعہ کے بچوں کو اس کام میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے کہا:

"آپ نے دیکھا ہو گا کہ میں نے کھادی اور تکلی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بنیادی چیزوں کے آگے جو میں نے آپ کو ابھی بتائی ہیں کھادی اور تکلی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ آپ ہزار تکلی چلائیں اور کھادی پہنیں لیکن اگر آپ ان باتوں پر عمل نہ کریں جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہیں تو آپ کی یہ کھادی اور تکلی کسی کام کی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب نے کھدر پہننے کی جو ضرورت جتائی ہے اسے آپ ہرگز نہ بھولیں گے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ کھادی کے ذریعے آج ہم ساٹھ ہزار سوت کاتنے والوں کو روزی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔ جلاہے دھوبی اور دوسرے پیشے والے اس سے بالکل علاحدہ ہیں یاد رکھیے کہ ان میں بہت سے مسلمان بھی ہیں۔ اگر چرخے کا رواج نہ ہوتا تو بہت سی جگہوں پر مسلمان عورتیں بھوکوں مر جاتیں۔ غریب ہندو اور مسلمانوں سے اپنے آپ کو قریب کرنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ کھادی پہنیے"۔

اخیر میں بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"علاوہ اس کے ہمیشہ پاک و صاف رہیے۔ پاکی اور صفائی نہ صرف ظاہری اور جسمانی ہو بلکہ اندرونی اور دل کی ہو۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس سے میری کیا مراد ہے۔ اپنے وعدوں کو پورا کیجیے خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن آئے اور ان باتوں کو ہمیشہ اپنی یاد میں تازہ رکھیے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں"۔

مہاتما گاندھی کی تقریر کے ان اقتباسات میں جامعہ کے طلبہ کی کردار سازی سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا وہ ان کے دل میں جامعہ کے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ان خیالات کو پیش کیا تھا۔ چرخہ اور تکلی گاندھی جی کو بہت عزیز تھے اور وہ اپنی تقریروں میں ان سے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کرتے

مصداق تھے:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبر یست

حضرت نانوتوی کی عمر ۱۲۶۷ھ میں ۱۹ سال کی تھی اور حضرت گنگوہی کی ۲۳ سال۔ اس طرح گویا حق تعالیٰ کو امام نانوتوی سے ان کی مختصر سی مہلت عمر میں جو عظیم الشان کام لینے تھے ان کے لئے کم سنی ہی میں ان کو علمی وروحانی کمالات سے آراستہ فرمادیا تاکہ آنے والے تیس سال کا وقفہ جو حضرت کی عملی زندگی کا عرصہ ہے اس عظیم نصب العین کو سمیٹ سکے جس کے لئے قدرت نے آپ کو اس عالم ناسوت میں بھیجا تھا۔

فطری طور پر حضرت الامام کے مزاج میں تواضع اور اپنے نفس سے بے نیازی کا رجحان تھا۔ اپنے سراپائے ظاہر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ یہاں تک کہ حقیقتاً گدڑی پوش بن کر زندگی گذاری۔ چنانچہ تعلیم کے بعد معاش کے لئے جو کام شروع کیا وہ نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں وقیع نہ تھا بلکہ آمدنی کے لحاظ سے بھی ناقابل ذکر تھا۔ مفتی آزردہ نے اُسی زمانے میں ایک بار حضرت گنگوہی سے پُوچھا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں۔ جب جواب میں یہ سنا کہ آٹھ دس روپیہ پر ایک مطبع میں تصحیح کرتے ہیں تو سناٹے میں آگئے اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا کہ قاسم ایسا سستا! قاسم ایسا سستا!

دنیا سے بے رغبتی اور نمود ونمائش سے غیر معمولی حد تک کراہت آپ کی طبیعت کا جز تھی۔ اسی گمنامی کی طلب میں بسا اوقات ایسے جملے آپ کی زبان سے نکلے کہ... "لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔" یا مثلاً ایک موقعہ پر نمود وشہرت سے انتہائی بیزاری کو آپ کا یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ "اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا۔" (سوانح قاسمی)

حضرت مولانا کا تعلیم سے فراغت اور حاجی صاحب سے وابستگی کے بعد کا زمانہ ۱۸۵۱ء کا ہے جبکہ انگریز ہندوستان پر اپنے پنجے پورے طور پر گاڑ چکے تھے، حریت وطن کے جذبے سے سارا ہندوستان سرشار تھا، علماء وصلحاء جہاد حریت میں پیش پیش تھے اور اپنے خون سے خاکِ وطن کو سینچ رہے تھے، حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء جو اس صورتِ حال سے حد درجہ پریشان ومضطرب تھے جنگ آزادی میں سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے، مغل حکومت کے زوال کے بعد جب برطانیہ نے

رہتے تھے' یہی وجہ تھی کہ جامعہ کے بچوں کی تکلی میں دلچسپی نے انھیں مسرت بہم پہنچائی۔
چرخے کے فروغ کا ان کے نزدیک اقتصادی مقصد تھا۔ وہ اس کے ذریعے ایک طرف تو غیر ملکی
کپڑے کی بر آمد کو صدمہ پہنچانا چاہتے تھے اور دوسری طرف چرخے کے رواج کو عام کر کے
اپنے ہموطنوں کو خود کفیل بنانے کے خواہشمند تھے۔

مہاتما گاندھی نے اپنے بیٹے دیوداس کو جامعہ میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے کی
ہدایت کی تھی۔ دیوداس کی آمد سے جامعہ میں کھدر کو فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے اس کے
چلن کو عام کرنے میں جامعہ کی بڑی مدد کی۔ مہاتما گاندھی نے اپنے پوتے رسک لال کو بھی
جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ جامعہ میں اس کی علالت
کے دوران جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے جس طرح رسک لال کی تیمارداری اور دلجوئی کی اس
نے مہاتما گاندھی کو بہت متاثر کیا۔ ۲۱ر فروری ۱۹۲۹ء کے "ینگ انڈیا" میں انھوں نے لکھا کہ
"موت کے وقت رسک لال کی عمر سترہ سال تھی اور شروع ہی سے وہ قومی خدمات میں
مصروف رہنے لگا تھا اور دہلی جا کر دیوداس کی مدد کرنا چاہتا تھا جو جامعہ میں ہندی اور کتائی کے
استاد تھے" دیوداس نے بعد ازاں مہاتما جی کو بتایا تھا کہ رسک کے مسلمان دوستوں نے ہمیشہ اس
کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا۔ "ڈاکٹر انصاری ؒ نے اس کے ساتھ نہ صرف ایک درجہ اول کے
معالج کا کردار ادا کیا بلکہ اسے باپ کی شفقت سے نوازا۔ جامعہ کے اساتذہ نے بھی اس کے
سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔" انھوں نے مزید یہ لکھا تھا کہ دراصل رسک لال کی موت نے
انھیں مسلم دنیا سے قریب تر کر دیا تھا اس سانحہ کے بعد جب وہ جامعہ آئے تو انھوں نے کہا کہ
"میرا غم دور کرنے کے لیے یہ بچے بہت ہیں"۔ مہاتما گاندھی جب بھی جامعہ آتے تھے یا کسی
سے اس کے بارے میں گفتگو کرتے تھے تو یہی کہا کرتے تھے کہ "جامعہ کو مسلمانوں کی زندگی کا
صحیح نمونہ ہونا چاہیے۔ اگر کسی غیر مسلم کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنی ہوں
تو وہ بس جامعہ میں ملنی چاہئیں۔" وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے بہت خوش ہوا کرتے تھے۔
جب ایک مرتبہ مالی بحران کے پیش نظر ان کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ اگر "جامعہ ملیہ
اسلامیہ" میں سے لفظ "اسلامیہ" حذف کر دیا جائے تو اہلِ ہنود بھی اس کی مالی امداد میں کبھی کمی
نہیں کریں گے تب گاندھی جی نے کہا تھا کہ اگر اس کے نام میں سے لفظ "اسلامیہ' حذف کر دیا
گیا تو وہ اس ادارے سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ ان کے نزدیک جامعہ ملیہ اسلام کی
تعلیمات کا صحیح نمونہ پیش کرنے والا تعلیمی ادارہ تھی۔

مہاتما گاندھی جامعہ کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے کیوں کہ اس کی باگ ڈور

ہندوستان پر مکمل طور سے قبضہ کرلیا تو ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کے خون سے ایسی بھیانک ہولی کھیلی جو رونگٹے کھڑے کردینے والی ہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان آزادی وطن کے لئے متحدہ طور پر اٹھے، انہوں نے جان و مال ہی نہیں عزت و ناموس تک کو خطرے میں ڈال کر ایسی بے مثال قربانیاں دیں جو ہمیشہ سنہری حروف میں تاریخ کے صفحات پر نقش رہیں گی۔ اسی دوران علاقہ تھانہ بھون کے بعض بااثر لوگوں کو مخبری کی بنیاد پر انگریزوں نے بلا تحقیق پھانسی دے دی جس سے پورے علاقے میں بے چینی اور اشتعال پھیل گیا، بعض لوگوں نے انگریزی دستوں پر گھات لگا کر حملہ کیا اور گولہ بارود چھین لیا۔ انگریزوں کے مظالم نے صورتِ حال کو حد درجہ سنگین بنادیا۔ اُس وقت حاجی امداداللہ صاحب اور ان کے رفقاء جہادِ حریت کے جذبے سے جمع ہوئے۔ یہ سب لوگ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے ولولۂ جہاد سے سرشار تھے۔ اس میٹنگ میں نمایاں حضرات یہ تھے: حضرت حاجی صاحب، حافظ ضامن صاحب، مولانا شیخ محمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی، حضرت گنگوہی، مولانا مظہر نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی۔ یہ اجتماع انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لئے ہوا۔ مولانا شیخ محمد صاحب نے اسباب و وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اعلانِ جہاد کی مخالفت کی تو حضرت الامام نانوتوی نے جو سرتا بقدم جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اُن کو جواب دیا کہ کیا ہماری قوت اور اسلحہ اصحابِ بدر سے بھی کم ہے۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب لاجواب ہوگئے غرض کچھ دیر بحث مباحثہ کے بعد جہاد کا فیصلہ کیا گیا۔ برطانوی حکومت کا جُوا اتار پھینکنے کا اعلان کر کے ایک عبوری حکومت قائم کردی گئی جس کا امیر و سربراہ حاجی امداداللہ صاحب کو بنا کر انہیں بیعت دی گئی۔ اس دوران تیاریاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک انگریزی دستے کے ساتھ شاملی کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوگئے۔ اگرچہ یہ معرکہ بھی بالاکوٹ کی لڑائی کی طرح نتیجے کے لحاظ سے ناکام ہی رہا لیکن انگریزی حکومت پوری طرح ہشیار ہوگئی۔ ان حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے۔ حضرت نانوتوی دیوبند اور قرب و جوار میں تین دن روپوش رہے۔ گرفتار نہیں ہوسکے لیکن مولانا گنگوہی گرفتار ہوگئے اور چھ مہینے مظفر نگر جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کے بعد ہندوستانی مسلمان ایک نئی مگر خطرناک صورتِ حال

حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی شخصیتوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن جب ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کا انتقال ہو گیا تو وہ شدید صدمے سے دوچار ہوئے۔ دراصل مہاتما گاندھی کو حکیم صاحب پر مکمل اعتماد تھا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ وہ گاندھی جی کے دست راست اور مشیر خاص تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی وفات پر مہاتما گاندھی کے جو بیانات اخبارات میں شائع ہوئے اور انھوں نے جو تعزیتی مضمون اپنے پرچے میں قلمبند کیا ان سے ان کے دلی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

نومبر ۱۹۲۹ء میں جب گاندھی جی حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد یوپی کا دورہ کرنے کی غرض سے دہلی پہنچے تو انھوں نے اپنا سفر جامعہ ہی سے شروع کیا جہاں انھیں پانچ سو روپے کی تھیلی پیش کی گئی تاکہ کھدر کو فروغ دیا جاسکے۔ انھوں نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو سوامی شردھانند کے قتل اور ہندو مسلم فسادات کے سبب عجب خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو ان کے نزدیک ہمیشہ حکیم اجمل خاں اور شردھانند کی دہلی رہی لیکن افسوس کہ اب ایسا نہیں ہے۔ بہر صورت گاندھی جی نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز جامعہ ملیہ سے کیا ہے، دہلی میں جس کی موجودگی کا سبب حکیم صاحب کی ذات تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے جامعہ کے طلبہ سے بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ انھیں امید تھی کہ جامعہ کے طلبہ فرقہ وارانہ جذبات اور عصبیت سے دور رہیں گے۔ حکیم صاحب کی یاد برقرار رکھنے کے سلسلے میں طلبہ سے کم از کم اتنی توقع تو کی جاسکتی تھی۔ اسی طرح جامعہ کے طلبہ کی کردار سازی کے سلسلے میں اس کے اساتذہ کے ایثار اور قربانی سے بھی انھیں بڑی امید تھی اسی لیے جب امیر جامعہ کی حیثیت سے حکیم صاحب کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو ان کی نظر انتخاب حکیم صاحب کے رفیق خاص اور محبِ وطن مختار احمد انصاری پر ٹھہری اور انھوں نے جامعہ اجمل فنڈ کے قیام کا مشورہ دیا جو ان کے نزدیک حکیم صاحب کے تئیں بہترین خراجِ عقیدت تھا۔ اس فنڈ کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپیل شائع کی کہ ہندستان کے گوشے گوشے سے لوگ رقومات بھیج کر جامعہ کی امداد کریں۔ انھوں نے اہلِ ہنود سے بھی اس فنڈ میں خاصی رقم جمع کرائی اور انجمن تعلیم ملی کے قیام کے سلسلے میں ڈاکٹر انصاری کی مدد کی۔

انجمن تعلیم ملی کے قیام کے بعد جب اساتذہ نے اپنی تنخواہوں میں از خود کمی کر لی تو مجیب صاحب کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے والد نے ان کی مالی امداد بند کر دی تھی اس سلسلے میں مہاتما گاندھی نے امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری سے گفتگو کی جنھوں نے مجیب

کا مقابلہ کررہے تھے۔ مشرق کے عروج وسطوت کا چراغ مغرب کے اُفق میں جا کر بجھ گیا اور مغربی سامراج کا آفتاب ایک بھیانک صبح کے ساتھ مشرقی افق میں طلوع ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے قدیم تمدن کے کھنڈروں پر اپنی جدید تہذیب کی عمارت اٹھائی۔ اسلامی طرزِ فکر کو فرسودہ اور دینی قدروں کو دہقانیت قرار دیا جانے لگا۔ انہوں نے صرف اپنا نظام حکومت ہی نہیں بلکہ اپنا مکمل دستورِ حیات غلام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ انگریزوں کا اولین حملہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر تھا جو پورے اسلامی معاشرے کی بنیاد تھا۔ مدارس اور مکاتب جو سرکاری سرپرستی میں چلتے آرہے تھے اس انقلاب کی نذر ہو گئے۔ اُن کے مقابل بدیسی حکومت نے برطانوی نصابِ تعلیم جاری کر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کا آغاز کیا جہاں ظاہری رنگا رنگی بھی تھی اور فراغت کے بعد سرکاری ملازمتوں کی دلفریبی بھی، ناپختہ کار نوجوانوں کے لئے ان اداروں میں غیر معمولی کشش تھی۔ ابتدائی اسکولوں میں یونیفارم کے نام پر جدید لباس بھی ضروری تھا۔ ظاہر ہے بچپن سے جس لباس اور طرزِ زندگی کی عادت ڈالی گئی وہ عمر بھر کی وضع قطع کے لئے تمہید بنایا گیا تھا۔ غرض معاشرتی طور پر رہن سہن اور کھانے پینے کے طریق سے لیکر پہننے اوڑھنے، آدابِ مجلس، زبان اور طریقِ زندگی غرض ہر بات سات سمندر پار سے ہندوستانیوں کے لئے درآمد کی گئی جس سے ذہن وفکر بدلنے لگا۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس انقلاب کو نہ صرف ایک خوش آیند تبدیلی تسلیم کر رہا تھا بلکہ اس کو مسلم نوجوانوں کے لئے ترقی کا زینہ قرار دیکر اس کی ترویج کے لئے کوشاں بھی تھا۔ چنانچہ جدید تعلیم اور اس کا طریق کار تیزی کے ساتھ شہر شہر اور قریہ قریہ میں رواج پانے لگا۔ پختہ کار لوگ اس پر کڑھ رہے تھے۔ ناپختہ ذہن اس جدید معاشرت کو اندھا دھند قبول کر رہے تھے مگر علماء اور ملی درد رکھنے والے حضرات کی ایک جماعت اس انقلاب سے بے چین تھی۔ یہ حضرات حیران تھے کہ بے دینی پھیلانے والے اس انقلاب کی راہ کو روکنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مغربی تہذیب کا جو طوفان نوجوان دل ودماغ کو متاثر کرتا ہوا بڑھا آرہا ہے اس پر باندھ لگانا تو ضروری ہے لیکن تدبیر کیا ہو اس پر ذہن راہ یاب نہیں تھے۔ مسلم اقتدار کا چراغ گل ہو جانے اور فرنگی سامراج کا پرچم لہرانے کے ساتھ ہی دوسرا طوفان ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی صورت میں آیا۔ انہوں نے عیسائیت کے فروغ کے لئے جہاں اپنا تبلیغی لٹریچر تقسیم کیا وہیں دوسری طرف خود مسلمانوں کے جتھوں میں گھوم گھوم کر اُن کے سامنے نصرانیت کو ایک اعلیٰ اور

صاحب کے والد محمد نسیم سے جو لکھنو میں وکیل تھے، مجیب صاحب کی امداد کو دوبارہ جاری کروانے کے بارے میں گفتگو کرنے کا وعدہ کیا۔ بعد ازاں مہاتما گاندھی نے اس سلسلے میں علی گڑھ میں مجیب صاحب کے بڑے بھائی پروفیسر محمد حبیب سے بھی بات چیت کی جو نامور رہنما عباس طیب جی کے داماد تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ حبیب صاحب نے بھی وعدہ کیا کہ وہ مجیب صاحب کی مدد کریں گے۔ انھیں تو خود اس بات پر فخر تھا کہ مجیب صاحب جامعہ کی خدمت میں مصروف تھے۔ گاندھی جی نے انھیں بتایا کہ مجیب صاحب کو اپنے اخراجات کے لیے ایک سو پچاس روپے کافی ہوں گے لیکن بعد ازاں دیوداس گاندھی نے انھیں بتایا کہ مجیب صاحب کے لیے یہ رقم ناکافی تھی۔

مہاتما گاندھی نے بھی مجیب صاحب کے والد محمد نسیم کو لکھنو خط لکھ کر انھیں حقائق سے آگاہ کیا اور لکھا کہ جامعہ مالی بحران سے گزر رہی تھی اسی لیے بہت سے اساتذہ نے اپنی تنخواہوں کو پچھتر روپوں تک محدود کر لیا تھا جن میں مجیب صاحب بھی شامل تھے۔ مہاتما گاندھی نے مجیب صاحب کی مالی امداد بند کر دینے کے نسیم صاحب کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کرتے ہوئے جامعہ میں مجیب صاحب کی خدمات کو داد تحسین پیش کی۔ انھوں نے نسیم صاحب کو لکھا کہ "مجیب صاحب ان انتہائی صاف ذہن نوجوانوں میں سے ایک ہیں جن سے وہ واقف ہیں اور یہ کہ وہ جامعہ کے لیے وقف ہو چکے ہیں اگر وہ اس غریب ادارے کی خدمت کا بیڑہ نہ اٹھاتے ہوتے تو ان کے والد ان کی مالی امداد بند کرنے میں حق بجانب ہوتے، لیکن یہاں تو ایک نازو نعم میں پلے ہوئے بیٹے ہی کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی مالی امداد کا مسئلہ بھی درپیش تھا جس میں اس کی خدمت کا جذبہ موجود تھا اور جسے ان کے بھائی نے بھی امداد بہم پہنچانے کا وعدہ کیا تھا"۔

غرضیکہ گاندھی جی جامعہ کے اساتذہ کے انفرادی معاملات کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ ان کی مدد کرتے تھے۔ جامعہ کے اساتذہ بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے گاندھی جی کی خودنوشت کا "تلاش حق" کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔

جب مارچ ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے اپنے تاریخی نمک ستیہ گرہ کا اعلان کیا تو جامعہ کے کئی اساتذہ اور طلبہ نے بھی اس میں شمولیت کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تقریر میں کہا:

"اب تک ہندستان میں جتنی سیاسی تحریکیں اٹھیں وہ زیادہ تر شہر ہی سے

شائستہ مذہب حق کے طور پر پیش ہی نہیں کیا بلکہ مالی امداد اور بے آسرا لوگوں کی خدمت وتعاون سے بھی اُن کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ان مبلغین نے مشن اسکولوں کا جال پھیلا کر مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے ان کے والدین کو رجھایا اور دامِ فریب میں پھنسایا۔ ساتھ ہی مشن ہسپتالوں کا سلسلہ جاری کر کے بیماروں اور دکھی لوگوں کی خدمت سے اُنہیں پر چایا۔

اس سیلاب بلا پر سب سے زیادہ پریشان وہ علماء تھے جو دبستان ولی اللٰہی کے خوشہ چیں تھے اور اس خانوادہ کے چشمۂ فکر وخیال سے مستفید تھے۔ اُنہیں ہر وقت مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی بے راہ روی کا خدشہ تڑپا رہا تھا اور ان کی ذہنی توانائیاں اس کے سد باب کی تدابیر پر مرکوز تھیں۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک ایسے مسیحائے قوم کی ضرورت تھی جو اس کے تن مردہ میں جان ڈال سکے۔ یہ دین خیر دین ہے اور یہ امت خیر الامم۔ اس کی نگہبانی خالق دو جہاں خود فرما تا رہا ہے کہ اس امت کو جب اور جیسے حالات سے سابقہ پڑا تو ان حالات کے مناسب شخصیات کو نمودار فرمایا جنہوں نے ان ناسازگاریوں کو امت کے لئے سازگار بنایا۔ چنانچہ اس ہوشربا ماحول میں جب کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار کی باگ ڈور چھن چکی تھی اور وہ غیر ملکی ہی نہیں غیر مذہب قوم کے زیر نگیں اپنی قدریں پامال ہوتے دیکھ رہے تھے حق تعالیٰ نے حجۃ الاسلام حضرت امام نانوتوی کو اس ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا بنا کر کھڑا کیا۔ اس نبض شناس شخصیت نے مرض کی صحیح تشخیص کی اور اس کا مداوا کیا۔

یوں تو اُس دور کے یہ سبھی اکابر ملکی حالات اور مسلمانوں کی قومی ابتری سے پریشان تھے مگر اس مجمع میں حضرت نانوتوی کے فکر رسا نے اس کا حل تلاش کیا جو اُن حالات میں واحد تعمیری طریق تھا اور قوم کو ذہنی غلامی سے نجات دلانے کا کیمیا اثر نسخہ تھا۔ حضرت نانوتوی انگریزی استعمار کے اس طول طویل منصوبے سے مضطرب تھے جس کے تحت وہ اپنا تعلیمی نظام ہندوستان میں رائج کر رہے تھے۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں کے اُس تہذیبی ورثے کو مٹانا تھا جو مذہب کی بنیاد پر قائم تھا، اہلِ وطن کو اُن کی تاریخ، اُن کے مذہب اور اُن کے تمدن سے بیگانہ بنا کر جب اُنہیں جدید مغربی افکار کا خوگر بنا دیا جائے گا تو اُن کا اپنا تشخص مٹ جائے گا اور وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے مقاصد کو پورا کرنے میں پیش پیش ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت جن مسلمانوں نے جدید تعلیم حاصل کی اُن کا اندازِ فکر مایوس کن حد تک تبدیل ہو چکا تھا اور وہ نام نہاد آزادی رائے کے علمبردار بن کر اپنے اُس ماضی کو

متعلق تھیں۔ یہ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں ہوا کہ گاندھی جی نے ایک ایسی تحریک اٹھائی جو ہندستان کی اصل آبادی یعنی دیہات کے لوگوں سے تعلق رکھتی تھی۔۔۔۔ بہرحال اب پورے دس سال بعد وہ تحریک پھر اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو رہی ہے۔۔۔۔ جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ تو خود جنگ آزادی کے لیے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ صحیح تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے۔ کارکنانِ جامعہ کی یہ چھوٹی سی جماعت اس کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب اس کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی اس سیاسی تحریک میں شرکت کے لیے بے تاب ہوں' وہ اپنی خدمت کے جذبے کا سب سے بہتر اظہار شاید اس طرح کر سکتے ہوں کہ انھیں ضرور اس تحریک میں شریک ہونا چاہیے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لیے پہلے جامعہ سے انھیں اجازت لے لینی چاہیے تاکہ جامعہ پہلے اپنے کام کا انتظام کر سکے"۔

مہاتما گاندھی نے ذاکر صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جامعہ تحریکِ آزادی کے تعلیمی محاذ پر صف آرا تھی' اس لیے اس کے کام میں کسی قسم کی مزاحمت مناسب نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے دیوداس گاندھی کو ۱۵ر فروری ۱۹۳۰ء کے اپنے خط میں لکھا کہ اگر وہ تحریک سول نافرمانی میں شرکت کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ذاکر صاحب سے باقاعدہ طور پر اجازت حاصل کریں تاکہ ان کی جگہ جامعہ میں کسی اور استاد کا انتظام ممکن ہو سکے۔ اس طرح جامعہ کے جن اساتذہ اور طلبہ نے اس تحریک میں حصہ لیا ان میں دیوداس گاندھی کے علاوہ شفیق الرحمٰن قدوائی' حافظ فیاض احمد' حسین حسان' کنک چندر ڈیکا اور کرشنا نائر کے نام شامل تھے۔ تحریک میں شرکت کے سبب ان افراد کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ نمک ستیہ گرہ سے پہلے گاندھی جی دہلی آئے تو جامعہ بھی گئے۔ اس موقع پر یہاں کے طلبہ اور اساتذہ نے کھدر کے کام کے لیے ان کی خدمت میں پانچ سو ایک روپے کی تھیلی پیش کی۔ اس موقع پر گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے جامعہ کے کام کو سراہا اور کہا کہ "میں جب بھی یہاں آتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے ہی گھر میں ہوں"۔

فراموش کر چکے تھے جو ملت کے لئے قابل فخر سرمایہ رہا ہے۔ جدید مسلم دانشور مسلمانوں کے مستقبل سے پریشان ضرور تھے مگر برطانوی شاطرین اُن کے دل و دماغ کو تہذیبِ جدید اور سائنسی کرشمہ کاریوں کے ذریعہ مسخر کرتے جا رہے تھے۔ جو لوگ اس ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوئے وہ بے چین تو تھے مگر کوئی پروگرام یا مستقبل کا لائحہ عمل اُن کے پاس نہیں تھا جس کے ذریعہ ملتِ اسلام کا فکری اور عملی تحفظ کیا جا سکے۔ حقیقت میں اُس وقت میں اگر کوئی طبقہ واقعی وقت اور حالات سے نبرد آزمائی کا عزم لئے ہوئے اس پر پوری سنجیدگی اور دردِ دل کے ساتھ سوچ رہا تھا تو وہ بوریہ نشیں علماء کا طبقہ تھا۔ یہ حضرات اجتماعی اور انفرادی طور پر اس طوفان سے قوم کو نکالنے کے لئے کوشاں تھے۔

اس نازک وقت میں توفیقِ خداوندی سے جس شخص کے ذہن رسا کو راہ یابی ملی اور قوم کی کشتی کو اس بھنور سے نکالنے کے لئے مشیت نے جس کو چنا وہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کی ذات بابرکات تھی۔ حضرت موصوف بدعات و رسوم کے خلاف مجددانہ جدوجہد تو کر ہی رہے تھے لیکن ملت کے اس آزمائشی وقت میں حضرت الامام نے ملت کی جو مسیحائی کی وہ یقیناً ایک الہامی چیز تھی جس کے لئے حق تعالیٰ نے آپ کو چنا۔

جدید تہذیب کے ان منفی اثرات کا توڑ کرنے کے لئے سب سے پہلے حضرت نانوتوی کا ذہن علاج بالمثل کی طرف منتقل ہوا کہ اس جدید تعلیم کے اثر کا جواب تعلیم کے طریق سے ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر مغربی تعلیم تاریخ اور اسلاف سے بیگانہ بنا رہی ہے تو اسی تعلیمی راہ سے مسلمانوں کو اس زہر سے بچایا جا سکتا ہے اور دینی تعلیم کے مراکز قائم کر کے مسلم بچوں میں اسلام پسندی اور اسلامی اقدار کے احترام کا جذبہ بیدار کیا جا سکتا ہے۔

اس بنیادی تصور کے ساتھ حضرت کا ذہن اس راہ کی مشکلات پر بھی غور کر رہا تھا کیونکہ مغلیہ سلطنت تک تمام گذشتہ مسلم حکومتوں کے عہد میں مدارسِ دینیہ قائم تھے اور ان کے جملہ مصارف کا بار حکومت پر رہتا تھا۔ اس طرح دینی تعلیم کا فروغ سرکاری سرپرستی میں جاری رہا۔ اب مغل سلطنت کی بساط لپٹ چکی تھی اور فاتح انگریز ہندوستان کے حکمراں بن چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے طوفان نے ہندوستانیوں کو بے دست و پا بنا دیا تھا اور سب بڑے چھوٹے مراکز اس افراتفری میں دم توڑ چکے تھے۔ نہ اب مدارس کی سرپرستی کرنے والی حکومت تھی اور نہ ایسے منظم اوقاف رہے تھے جن کے بل پر

اسی طرح ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو مہاتما گاندھی نے جامعہ کا دورہ کیا تو اپنی تقریر میں کہا کہ انھوں نے جیل میں رہ کر خاصی اردو سیکھ لی تھی اور اگر وہ پھر کبھی جیل گئے تو اردو کا اسکالر بن کر ہی نکلیں گے۔ انھوں نے جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اسلام دوسرے مذاہب کے تئیں رواداری کا درس دیتا ہے۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ دوسرے مذاہب جھوٹے ہیں۔ دراصل وہی شخص سچا ہوتا ہے جو دوسروں کی بھلائی کرتا ہے۔ یہی اصول قرآن کا ہے اور یہی دوسرے مذاہب کی تعلیمات ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ کے طلبہ اتحاد و ملت کے پیغام کو ملک بھر میں عام کر دیں گے۔ میں دو مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان دلوں کے ملاپ کا آرزو مند ہوں تاکہ مادر وطن آزادی سے ہم کنار ہو سکے"۔

اسی طرح ۱۹۳۴ء میں جب مہاتما گاندھی جامعہ آئے تو طلبہ نے ان کی خدمت میں اپنے باغ کی سبزی اور کھدر کے ساتھ ایک سو ایک روپے کی تھیلی بھی پیش کی۔ الغرض جب بھی گاندھی جی دہلی آتے تو جامعہ کو دیکھنے اور اس کے طلبہ اور اساتذہ سے ملنے کی غرض سے جامعہ ضرور جاتے۔ جامعہ کے لوگ بھی ان سے ملنے کی خاطر اور ان سے مشورہ کرنے کے لیے خود بھی سیوا گرام جایا کرتے تھے۔ گاندھی جی کو جامعہ سے بڑی توقعات تھیں۔ ان کے نزدیک یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت تھی۔ ۱۹۳۵ء کے اوائل میں ذاکر صاحب نے اوکھلا میں جامعہ ملیہ کی نئی عمارتوں کا سنگِ بنیاد عبدالعزیز نامی ایک بچے کے ہاتھوں رکھوایا تو مہاتما گاندھی نے ایک خط میں ذاکر صاحب کو لکھا کہ "یہ ایک عظیم خیال ہے کہ جامعہ کی عمارتوں کا سنگِ بنیاد ایک بچے کے ہاتھوں رکھا جائے۔ میں اس خیال کے انوکھے پن پر تم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ کا مستقبل روشن ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا پودا ایک بڑا اور چھتناور درخت بن جائے گا۔"

۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات میں کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہو گئی اور ان صوبوں میں اسے حکومت سازی کا موقع ملا تو گاندھی جی نے تعلیم کے مروجہ ڈھانچے میں تبدیلی کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں وردھا میں ایک آل انڈیا نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے ماہرین تعلیم اور کانگریسی وزراء نے شرکت کی۔ مدعوئین میں ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسکولوں کے نصاب میں چرخے کی تعلیم کو شامل کرنے پر اصرار کیا اور ابتدائی تعلیم کی مدت کو

دینی مدارس چلائے جاسکیں۔لہٰذا حضرت الامام دینی مدرسوں کے قیام سے متعلق اپنے بنیادی فکر کے ساتھ اُن کے چلانے کی صورتوں پر بھی غور کررہے تھے۔حکومت سے اس مقصد کے لئے ایڈیا گرانٹ مل سکتی تھی مگر اس کے ساتھ پھر حکومت کا مدرسے کے نصاب میں دخل بھی ضروری ہوتا۔اب اگر سرکاری دخل اندازی کو انگیز کیا جائے تو فکر قاسمی کی اصل روح ہی متاثر ہوجاتی کہ حکومت پھر جدید علوم کی تعلیم کو بھی نصاب کا لازمی جز قرار دیتی جبکہ حضرت کا مقصود ہی ایک مدرسے سے یہ تھا کہ طالبِ علم خالص دینی ذہن لے کر نکلے اور قوم کی کشتی کو جو منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے آسودۂ ساحل کرسکے۔یہ تبھی ممکن ہے جب مدرسے آزادانہ طور پر قوم کو وہ علوم سکھلاسکیں جن پر ان کی مذہبی پہچان موقوف ہے۔

یہیں سے حضرت نانوتوی کے ذہن رسا نے توفیقِ خداوندی سے آزاد تعلیم کے لئے آزاد ذریعۂ آمدنی کا نکتہ تلاش کیا، یعنی ایسی آمدنی کا ذریعہ جس میں دینے والا مدرسہ کو اپنے احسان کا زیر بار نہ سمجھے اور اُس کے تعلیمی وانتظامی طریق کار میں مداخلت نہ کرے۔چنانچہ فکر قاسمی کا یہی بنیادی نقطہ ہے کہ عوامی مدرسے کے مصارف عوامی چندہ سے پورے ہوں جو سرتا سر اخلاص پر مبنی ہوگا اور دینے والا اپنا پیسہ احسان بنا کر نہیں دے گا بلکہ اس کو توشۂ آخرت سمجھ کر دے گا اور اس طرح خود ہی پیسہ دے کر خود کو مدرسہ کا احسان مند قرار دے گا کہ اس انفاق وامداد کی وجہ سے اُس کی آخرت سنور سکتی ہے۔حکومت سے ایڈ وغیرہ حاصل ہوگی تو بصورت احسان ہوگی جبکہ عوام امداد کے طور پر جو کچھ پیش کریں گے اس کی قبولیت پر مدرسہ کو اپنا محسن قرار دیں گے۔

اسی بنیادی فکر کے ساتھ حضرت نانوتوی نے دوسرے اکابر سے اس بارے میں مشورہ کیا۔یہ سب ہی حضرات برطانوی سامراج کے عزائم اور ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مستقبل کی طرف سے پریشان تھے۔اس تجویز پر سب کا اتفاق قدرتی تھا۔ان اکابر کا مقصود صرف ایک مدرسہ قائم کرنا نہ تھا بلکہ ایک ایسے مرکز کا قیام تھا جو مسلمانوں کو علمی وذہنی تربیت دے کر علم وعمل اور بلند فکری جیسے اوصاف کا اہل بنائے کہ امت ایک طرف حُب دین سے سرشار ہوکر اسلام پر کئے جانے والے حملوں کا عملی واستدلالی جواب دے سکے تو دوسری طرف حب وطن سے سرشار ہوکر اُس کو فرنگیوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے برادرانِ وطن کے ساتھ عملی اقدامات کرے۔اس طرح قوم استبدادی

چار سے سات برس کردینے کا مشورہ دیتے ہوئے ہاتھ کے کام کی اہمیت پر زور دیا۔ شرکاء میں سے کسی نے بھی مہاتما گاندھی کے خیالات سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں واضح کردیا کہ گاندھی جی کا یہ خیال درست نہیں کہ وہ تعلیم کو ایک نئی شکل دے رہے ہیں۔ انھوں نے ان کی مجوزہ اسکیم سے اختلاف کیا اور اس سلسلے میں ٹھوس دلائل پیش کیے۔ گاندھی جی ذاکر صاحب کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے ذاکر صاحب کو تعلیمی کمیٹی کا سربراہ مقرر کردیا اور اس طرح بنیادی تعلیم کا سلسلہ جامعہ سے قائم ہو گیا جسے تری پورہ کانگریس کے اجلاس میں منظور کر کے کانگریسی حکومتوں نے اپنا لیا مگر ۱۹۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں نے دوسری عالمگیر جنگ میں ہندستانی رہنماؤں کی رائے معلوم کیے بغیر ہندستان کو جھونک دینے کے برطانوی حکومت کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا اور پھر یہ اسکیم کبھی عمل کی منزل تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تعلیم کے معاملے میں ہر مسئلے پر ہمیشہ ذاکر صاحب ہی سے مشورہ کیا اور ان کی رائے کی قدر کی۔ ذاکر صاحب اور مہاتما گاندھی کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ مئی ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر انصاری کی وفات کے بعد گاندھی جی ذاکر صاحب ہی کو ہمیشہ ڈاکٹر انصاری کا روحانی جانشین سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کے نام اپنے ایک خط میں ذاکر صاحب نے لکھا تھا کہ :۔

> "میں کانپ اٹھتا ہوں جب آپ مجھے ڈاکٹر انصاری کا روحانی جانشین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ میں کانپ اٹھتا ہوں اس لیے کہ جس ذمے داری کے انجام دینے کی آپ مجھے دعوت دیتے ہیں وہ بہت بڑی ہے اور میں ایک عجیب قسم کی افسردگی کے احساس سے اس لیے بھی کانپ اٹھتا ہوں کہ کاش ڈاکٹر انصاری کا جانشین کوئی ایسا شخص ہوتا جو واقعی اس کا اہل ہوتا"۔۔۔

ذاکر صاحب پر گاندھی جی کی شخصیت کی گہری چھاپ تھی۔ صدر جمہوریہ بننے کے بعد اپنی ایک تقریر میں ذاکر صاحب نے کہا تھا:

> "ترک موالات کی تحریک سے اس کے تعلیمی شعبے میں وابستہ ہونے کے ساتھ اور اس سے پہلے مجھ پر سیاسی دنیا کی بعض غیر معمولی شخصیتوں کا اثر پڑا جن میں سب سے اوپر میں گاندھی جی کا نام لیتا ہوں"۔

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں کے جانشین تھے، مہاتما گاندھی مختلف امور پر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ حکیم صاحب کی وفات کے بعد جامعہ کو

قوتوں سے ہر دو میدان میں پنجہ آزمائی کے قابل ہو سکے۔ حضرت نانوتوی کے اس عبقری فکر نے وہ راہ دکھادی جس کی تلاش میں یہ حضرات سر گرداں تھے۔

دیوبند میں دارالعلوم کی بناء سارے ملک کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو اس پریشان خاطری میں ایسی رہنمائی فراہم کرنا تھا جو ان کے مستقبل کی ضامن بن سکے۔ دارالعلوم دیوبند کا وجود اُسی الہامی رہنمائی کی خارجی تصویر بن کر سامنے آیا۔

ہر ادارہ اپنے بانی کے افکار و رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کے طرزِ تعلیم و تربیت میں بھی فکر قاسمی کا عکس نمایاں ہے۔ چنانچہ فضلائے دیوبند کے علمی و عملی کارنامے اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس مادرِ علم و فکر کے سپوتوں نے تصنیف و تالیف کی راہ میں آبلہ پائی کی تو ہر موضوع پر علم و تحقیق کے انبار لگا دیئے۔ فضلائے دیوبند نے اپنے بانی کے فکر کی ہمیشہ ایک قیمتی امانت کی طرح حفاظت کی اور ایک بیش بہا میراث کی طرح اس کا حصہ رسد اس کے حقداروں تک پہونچاتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند حضرت الامام کی وہ علمی وراثت ہے جو سوا سو سال سے ہند و بیرون ہند میں علوم اسلامی کی دولت بانٹ رہی ہے۔

دارالعلوم کی بناء ایک تحریک کی بناء تھی جس نے ایک خوابیدہ قوم میں بیداری و زندگی کی روح پھونکی اور جو مایوسیاں گورے اقتدار اور مغربی استعمار نے اس قوم کو دی تھیں اُن کی جگہ دارالعلوم کی تحریک نے امیدوں کے چراغ جلائے۔ یہ تحریک دوہرے مقاصد کی حامل تھی ایک طرف اس ادارہ کے ذریعہ ملّی تشخص اور انفرادی و اجتماعی وقار کا تحفظ ہو رہا تھا تو دوسری طرف برادرانِ وطن کے ہمدوش اُس بیرونی غلامی کا جُوا کاندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے ایک نیا ولولہ بھی اسی قاسمی تحریک کی دین تھی۔ تحریک دیوبند اسلام کے بنیادی عقائد و افکار کی ترجمان اور محافظ بنی اور ساتھ ساتھ حال کے تاریک ماحول میں بہتر عروسِ مستقبل کا تابناک رُخ بھی دکھا رہی تھی۔

دہریت و بے دینی کے برخلاف تعلیم کتاب و سنت اور مسلک حق کا سب سے بڑا محاذ یہی دارالعلوم ثابت ہوا۔ یہاں سے اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے دعوتِ اسلامی کے علمبردار ہزاروں ہزار کی تعداد میں نکل کر ایک عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور دنیا کے چپے چپے پر انہوں نے دینی مدارس

مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر انصاری ہی نے بند ہونے سے بچایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد گاندھی جی کے مشیر خاص کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے اپنے فرائض انجام دیے۔ گاندھی جی کو ذاکر صاحب پر اس قدر اعتماد تھا کہ حصولِ آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی وہ وزارت تعلیم سے متعلق افسروں کو ذاکر صاحب سے مشورہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ان دونوں کے گہرے تعلقات نے جامعہ کی بنیادوں کو بھی گہرا اور پائدار کر دیا تھا۔ بنیادی تعلیم کے پیش نظر جب اگست ۱۹۳۸ء میں استادوں کے مدرسے کا افتتاح ہوا تو مہاتما گاندھی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس موقع پر ایک پیغام میں امید ظاہر کی کہ نیا ادارہ ان کی توقعات پر پورا اترے گا۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی گئی تو اس میں ہر سیاسی جماعت کے رہنما شریک ہوئے مگر مہاتما گاندھی نہ آسکے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ "ایک اچھے شخص کی اچھائی بذاتِ خود اس کی سچی جوبلی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا عظیم کارنمایاں ہی ان کی سچی عظمت ہے"۔ جوبلی سے قبل اپریل میں مہاتما گاندھی دہلی آئے تو بالمیکا آشرم میں مدعو کیے گئے۔ وہاں تقریر کرنے کے بعد جب وہ اپنے مستقر کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چند اساتذہ اور طلبہ نے ان سے ملاقات کی اور انھیں کسی وقت جامعہ آنے کی دعوت دی۔ گاندھی جی ان کے خلوص سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کی دعوت قبول کرتے ہوئے کہا کہ "کسی وقت کا مطلب اسی وقت ہونا چاہیے۔ یہاں تک آنے کے بعد میں آپ لوگوں سے ملے بغیر واپس نہیں جاسکتا"۔ اور وہ ان جامعی حضرات کے ساتھ جامعہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جامعہ میں ان کا مخلصانہ خیر مقدم کیا گیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ "بغیر کسی اطلاع کے جامعہ میں آکر میں نے اس کنبہ بھر سے اپنی رکنیت کا حق ثابت کر دیا ہے"۔ اس موقع پر جامعہ کے ایک طالب علم نے ان سے سوال کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں طلبہ کیا کام کر سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا:

> "اس کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ اگر تمام ہندو شر پسند بن جائیں اور تمھیں برا بھلا کہنے لگیں تب بھی تم انھیں اپنا بھائی کہنا نہ چھوڑو۔۔۔ آج سارا ماحول زہریلا ہو چکا ہے۔ اخباروں نے طرح طرح کی افواہیں اڑا رکھی ہیں اور لوگ انھیں خاموشی سے پی رہے ہیں۔ ہیجان برپا ہے اور ہندو مسلمان دونوں ہی انسانیت کو بھول کر ایک دوسرے کے لیے درندہ ثابت ہو رہے ہیں۔ انسانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شرافت کا سلوک کریں

ومکاتب قائم کر کے اسلام کے دفاعی مورچے تیار کیے۔ آج فضلائے دارالعلوم اور منتسبین دارالعلوم کی تعداد دنیا بھر میں لاکھوں لاکھ ہے۔

۱۹۸۰ء میں بہ موقعۂ اجلاسِ صد سالہ، دارالعلوم کا جلسۂ دستار بندی تقریباً ۷۰ سال بعد ہوا جس میں چھ ہزار سے زائد فضلائے دارالعلوم کو دستارِ فضیلت دی گئی جبکہ اس ستر سالہ مدت میں ہزاروں ہزار فضلاء وہ ہیں جو پیوند زمین ہو چکے اور جن کی دستار بندی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نیز جن فضلاء کی دستار بندی پچھلے جلسوں میں ہوئی وہ بھی ان سے الگ ہیں اور جن حضرات نے اجلاس صد سالہ کے بعد سند فضیلت حاصل کی وہ بھی علیحدہ ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد اب تقریباً ہر سال دورۂ حدیث میں شامل طلبہ کی تعداد قریباً ایک ہزار اور اب حالیہ سالوں میں ایک ہزار سے بھی زائد ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ان گذشتہ بیس سالوں میں تعدادِ فضلاء بیس ہزار تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر اس عدد میں اُن مستفیدین کو شامل کر لیا جائے جنہوں نے دارالعلوم میں داخلہ لیکر پڑھا مگر دورۂ حدیث تک پہونچنے سے پہلے گھریلو مجبوریوں کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے طلبہ کی تعداد بھی قابل لحاظ حد تک کافی بڑی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت طولانی فہرست اُن منتسبین کی ہے جنہوں نے دارالعلوم کے کسی ایک شعبہ کی تعلیم مکمل کی اور واپس چلے گئے۔ مثلاً شعبۂ تجوید وقرأت، شعبۂ حفظ، شعبۂ ناظرہ، شعبۂ اردو دینیات، شعبۂ فارسی، شعبۂ خوشخطی اور جامعہ طبیہ، کوئی وجہ نہیں کہ ان کو دارالعلوم کے مستفیدین کی فہرست سے الگ رکھا جائے۔ لہٰذا جن حضرات نے براہ راست دارالعلوم دیوبند سے کسی درجے میں گذشتہ زائد از سوا سو سال کی تاریخ کے دوران استفادہ کیا ہے اُن کی مجموعی تعداد عجب نہیں کہ ایک لاکھ سے اوپر پہنچ جائے۔

اِس شجرۂ طوبیٰ کی جڑوں کو کیسی دعاہائے سحر گاہی نے سینچا اور کیسے گریۂ نیم شبی کا پانی ملا کہ یہ پودا اُگنے کے ساتھ ہی مسلمانِ عالم کی محبت وعقیدت کا مرکز بن گیا اور اطراف واکنافِ عالم سے اس کی طرف رجوع عام ہونے لگا۔ علومِ الٰہی کا یہ سرچشمہ اس تیزی کے ساتھ پھلا پھولا کہ مغربی استعمار کی ساری سازشوں کا تار و پود بکھر گیا۔

حضرت الامام النانوتوی اپنے علمی فضل وکمال، زہد وتقویٰ اور بلندیٔ فکر کے اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کی صورت میں نمودار ہوئے۔ آپ کے علمی، فکری اور تجدیدی کارناموں نے ملتِ اسلام

اس امتیاز کے بغیر کہ دوسرے جانبین کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں۔ اگر کوئی شخص شرافت کا جواب شرافت سے دیتا ہے تو یہ سودے بازی ہے کیونکہ چور اور ڈاکو بھی یہی کرتے ہیں اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ انسانیت، نفع اور نقصان کا تخمینہ کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے وہ تو ہر شخص سے شریفانہ سلوک کی توقع رکھتی ہے۔ اگر ہندو میری بات پر کان دھریں یا مسلمان میری بات سنیں تو ہندستان میں ایسا امن قائم ہو سکتا ہے جسے نہ تو خنجر اور نہ لاٹھیاں متزلزل کر سکتی ہیں۔ اگر انتقام نہ لیا جائے اور جذبات کو بھڑکنے نہ دیا جائے تو شرپسند شخص چھرا گھونپنے کے افسوس ناک فعل سے جلد ہی اوب جائے گا۔ ایک اَن دیکھی طاقت اس کے اُٹھے ہوئے ہتھیاروں کو تھام لے گی اور اسے اس کے برے ارادے سے باز رکھے گی۔ اگر تم سورج پر خاک ڈالو تو اس سے اس کی روشنی میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس کی روح کو صبر و اعتماد کی گرفت میں لے لو خدا بہت اچھا ہے اور وہ شر کو ایک متعینہ حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا"۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے کہا:

"جامعہ ملیہ کی تعمیر میں میرا ہاتھ بھی رہا ہے، اسی لیے تمہارے سامنے دل کی بات کہنے میں مجھے خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے یہی باتیں ہندوؤں سے بھی کہی ہیں۔ خدا کرے تمہاری روشن مثال ہندستان اور دنیا کے لیے تابناک ثابت ہو"۔

گاندھی جی کا بغیر کسی پروگرام کے اس طرح جامعہ آجانا ان کے خلوص کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ جامعہ کو اسلامی تعلیمات کا مرکز اور سیکولر اقدار کی علامت تصور کرتے تھے اور اس کے کام کو سراہتے تھے یہی وجہ تھی کہ انھیں ہمیشہ جامعہ سے محبت رہی اور وہ جب بھی دہلی آتے تو جامعہ ضرور جایا کرتے تھے۔

آزادی کا سورج طلوع ہوا تو مہاتما گاندھی قیام امن کے سلسلے میں بنگال میں مقیم تھے۔ وہاں سے ۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو ان کی واپسی ہوئی تو دہلی اسٹیشن پر پہنچتے ہی انھوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ "کیا ذاکر حسین خیریت سے ہیں؟ کیا جامعہ ملیہ محفوظ ہے؟" اور دوسرے ہی دن وہ اپنے اطمینان کی خاطر جامعہ جا پہنچے اور یہ معلوم کر کے شدید صدمے سے دوچار ہوئے کہ اگست میں

میں پیدا ہونے والی مایوسیوں کو کافور کیا۔ آپ کے نصب العین کا اساسی مقصد امت میں تعلیمی نہضہ برپا کرنا تھا تاکہ ماضی کی سطوت وشوکت ختم ہوجانے کے بعد قوم احساسِ کمتری کا شکار ہونے کے بجائے علمی و تحقیقی میدانوں کو سر کرے۔ حکومت و سیاست کی بساط اگرچہ اُلٹ گئی لیکن قوم تعلیم و تعلم کے ذریعہ اس کی تلافی کر کے علمی و اخلاقی راہوں سے اپنا امتیاز اور تفوق برقرار رکھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے تعلیمی راہ سے دہریت والحاد کے اُس سیلاب کو روکا جو مغربی تہذیب کے نام پر وطن عزیز میں درآیا تھا۔ یہ ادارہ جو آج ایک بین الاقوامی اسلامی دانشگاہ ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوا اور آج دنیا بھر میں اسلامی علوم کا ایک بے مثال مرکز اور حقیقی مزاجِ شریعت کا ترجمان بن کر اپنی انفرادیت قائم کیے ہوئے ہے۔

☆☆☆

کشمیر جاتے ہوئے ذاکر صاحب اپنی جان بچا کر بمشکل جالندھر سے دہلی پہنچے تھے۔ اگر وہاں کے کچھ سکھ ان کی جان نہ بچاتے تو وہ کبھی وہاں سے زندہ واپس نہیں آسکتے تھے۔

اسی شام اپنی پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی نے کہا:

''میں جامعہ ملیہ پہنچا۔ اس ادارے کی تعمیر میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میرے عزیز دوست ہیں۔ انھوں نے بڑے دُکھ کے ساتھ مجھے اپنے تجربات سے آگاہ کیا لیکن ان کے دل میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی۔ حال ہی میں انھیں جالندھر جانا پڑا۔ اگر سکھ کپتان اور ریلوے کا ایک ہندو افسر وقت پر ان کی مدد نہ کرتے تو اپنی دیوانگی میں کچھ سکھ انھیں مسلمان ہونے کے سبب ختم کر دیتے۔ اپنے تجربات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان لوگوں کے تئیں اظہار ممنونیت کیا۔ ذرا سوچیے کہ وہ قومی ادارہ جہاں بہت سے ہندوؤں نے تعلیم حاصل کی خوف زدہ ہے کہ کہیں شرنارتھی اور وہ لوگ جو انھیں بھڑکاتے ہیں اس پر حملہ نہ کر دیں۔ میں ان پناہ گزینوں سے بھی ملا جو کسی نہ کسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطے میں رکھے گئے ہیں۔ جب میں نے ان سے ان کی دُکھ بھری داستانیں سنیں تو میرا سر شرم سے جُھک گیا''۔

۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی کی جامعہ میں آخری آمد تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی اس ادارے تک نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ وہ دہلی میں امن وامان کے قیام اور مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کی کوششوں میں مصروف رہے اور جب حالات قابو سے باہر ہوتے نظر آئے تو انھوں نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے آخری برت کا اعلان کر دیا۔ ان کے اس اعلان سے جامعہ ملیہ میں کھلبلی مچ گئی اور ان کی صحت کے لیے دعائیں کی جانے لگیں۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک بیان جاری کیا۔ بیان میں گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

''اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی رہنما آپ کی بصیرت ہے اور آپ نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے دلوں کی تطہیر کے لیے صحیح وقت پر پکارا ہے۔ خدا نے آپ کو وہ اعتماد اور استقامت بخشا ہے کہ اس کا اثر ہو کر رہتا ہے اور وہ یقین و ایمان عطا کیا ہے جو ناساز گار حالات میں بھی متزلزل نہیں ہو سکتا۔ خدا آپ کے ساتھ ہے۔ آپ ضرور کامیاب ہوں گے اور ہم

مفتی نسیم احمد قاسمی (مرحوم)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
خدمات اور کارنامے

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا فیصلہ

انگریز حکمرانوں نے اسلامی شناخت اور تہذیب کو مٹانے اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے نصاب تعلیم کو تبدیل کرنا ضروری سمجھا، لارڈ میکالے نے انگریزی تعلیم اور نصاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

حضرت نانوتوی اور ان کے رفقا نے انگریزوں کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایسے مراکز دینیہ اور مدارس اسلامیہ کے قیام کا فیصلہ فرمایا، جن کی چہار دیواری میں شریعت اسلامی کو تحفظ حاصل ہو کتاب وسنت کے علوم کی ترویج و اشاعت ہو اور ایسی نسل تیار ہو جو دل و دماغ اور فکر و نظر کے اعتبار سے اسلامستانی ہو۔ جو قیادت و سیادت کی مطلوبہ صفات اور صلاحیتوں سے متصف ہو، چنانچہ حضرت نانوتوی نے اعلان فرمایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندستانی ہو مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور اسلامستانی ہو، اس طرح دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم اور اس طرز پر چلنے والے مدارس اسلامیہ کے لئے اصول ہشتگانہ مرتب فرمایا، یہ رہنما اصول ہیں جن سے مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو بہتر اور زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

- اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں،

ہیں کہ شرم سے گڑے جاتے ہیں کہ آزاد ہندستان کے پاس آپ کو دینے کے لیے تلخی، مصیبت اور پریشانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔
خدا کرے آپ امن اعلا آزادی کی طرف رہنمائی کے لیے زندہ رہیں جس کے لیے آپ نے عمر بھر جدوجہد کی ہے اور ہماری تمام ناعاقبت اندیشیوں اور بداعمالیوں کے باوجود آپ اب بھی ہمیں اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر کسی چیز سے ہماری قلب ماہیت ہو سکتی ہے تو وہ آپ کا یہ اعتماد و یقین ہے کہ آخر کار ہماری بنیادی اخلاقی خوبیاں اپنا اثر دکھا کر رہیں گی"۔

اگر چہ مہاتما گاندھی نے چند روز بعد سماج کے مختلف طبقوں کے اصرار پر برت توڑ دیا مگر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام میں پانچ بج کر سترہ منٹ پر ایک مذہبی جنونی کے ہاتھوں وہ شہید کر دیے گئے۔ اُس روز جامعہ کا ہر فرد سوگوار تھا ہر آنکھ اپنے اس محسن کی یاد میں اشکبار تھی جس نے جامعہ کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا اس سلسلے میں جامعہ کے تعزیتی جلسہ میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا:

"انجمن جامعہ ملیہ کا یہ جلسہ مہاتما گاندھی کی شہادت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی جی کی وفات عام طور پر سارے ملک بلکہ پورے عالم انسانیت کے لیے اور خاص طور پر قومی خدمت کے اداروں کے لیے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ جامعہ ملیہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تحریک اور دعوت پر قائم ہوئی۔ ستائیس برس تک ان کی ہدایت و رہنمائی سے فائدہ اٹھاتی رہی۔ مرحوم جامعہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور جامعہ ان کے سایۂ عاطفت کو سایۂ پدری جانتی تھی۔ جامعہ کے لیے ان کا صدمہ داغ یتیمی سے کم نہیں۔ انجمن جامعہ ملیہ اس موقع پر کارکنان جامعہ کی طرف سے عہد کرتی ہے کہ خدمت اور ایثار کی اس روح کو جو مہاتما گاندھی جی نے جامعہ کے اندر پھونکی تھی، قائم رکھنے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی دل و جان سے کوشش کرے گی۔"

اس سانحے کے چند روز بعد مدراس کے ایک جلسے تقسیم اسناد میں گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا:

"دنیا سے اٹھنے سے پہلے خدا کا یہ بندہ ہماری قوم ہی کی نہیں ساری انسانیت کے ضمیر کی آواز بن گیا۔ بے لاگ، بے میل، کڑوی، ستانے والی بے کل

اوروں سے کرائیں خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی کا امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی، اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ ہے۔
- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔
- تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا۔

ان اصول کو بار بار پڑھئے، اس کا ہر اصول الہامی نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ حضرتؒ نے نور ایمانی اور فراست ایمانی سے یہ اصول طے فرمائے ہیں۔ صوبہ بہار میں وہ مدارس جو حکومت سے منظور شدہ ہیں ان میں تعلیم و تربیت کا معیار ختم ہو رہا ہے اور ملت کا عظیم الشان سرمایہ تباہی کے دہانے پر ہے اور اس کی وجہ انہیں اصول سے اعراض وانحراف ہے اور عوامی چندہ کے بجائے سرکار پر اعتماد ہے۔

دیوبند کے بعد صنعتی شہر مرادآباد میں مدرسہ قاسم العلوم، سنبھل میں مدرسہ عربیہ، امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد، گلاؤٹھی میں مدرسہ قاسمیہ، سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم، دربھنگہ میں مدرسہ امدادیہ اور انبہٹہ اور تھانہ بھون اور ملک کے دیگر حصوں میں مدارس ومکاتب قائم کیے گئے، ان مدارس اسلامیہ کی کوکھ سے نامور علماء، ائمہ اور مجاہد آزادی پیدا ہوئے۔

عیسائیت اور آریہ سماج کے فتنہ کی سرکوبی

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد عیسائیت اور آریہ سماج کے فتنوں کی سرکوبی مولانا نانوتوی کا سب سے بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے ہندستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پادریوں اور عیسائی مبلغین کو عام اجازت دیدی، برطانوی دارالعلوم کے ممتاز رکن سیگلس نے ۱۸۵۷ کے آغاز میں ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ”خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن اس لئے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت زیرنگیں رہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان

رکھنے والی مگر جی میں گھر کرنے والی آواز ـــــ بڑی بھول میں ہے وہ جو سمجھتا ہے کہ یہ آواز چپ ہو گئی ہے۔ نہیں یہ ہماری قومی زندگی کے رونگٹے میں بس گئی ہے۔ سچ کے راستے پر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں گے تو یہ ہمیں للکارے گی، ظلم کے لیے جب ہمارے ہاتھ اٹھیں گے تو یہ ان کو روکے گی، ہم ضرور کبھی کبھی اس آواز کو دبانا چاہیں گے، اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر اس کے سننے سے بچیں گے مگر یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی، یہ کانٹا بن کر ہمارے دل میں کھٹکے گی، ہماری نیند حرام کر دے گی اور اپنے کو سنوا کر منوا کر رہے گی اور اگر کہیں ہم نے اُسے دبا دیا، ہمارے کان اس کے لیے بہرے ہو گئے تو ہم چاہے کچھ اور بن جائیں دنیا میں ایک اچھی سچی، نیک قوم نہ بن سکیں گے۔ خدا نہ کرے ہم کبھی اس آواز کو دبا سکیں"۔

مہاتما گاندھی کے لیے جامعہ کی طرف سے اس سے بہتر خراجِ عقیدت اور کیا ہو سکتا تھا!!

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لئے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے، اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہئے۔ (۱) چنانچہ عیسائی مبلغین اور پادریوں نے ہندوستان پر ہلہ بولا اور ملک کے طول وعرض میں پھیل گئے، صرف بہار کے چھوٹا ناگپور علاقے میں ۱۲ ہزار سے ۴۵ ہزار تک عیسائی تھے اور ۱۸۷۲ء تک ہندوستان کے پانچ سو بائیس مقامات پر مشن قائم کئے جا چکے تھے، ان حالات میں سب سے اہم تقاضہ عیسائیت کے سیلاب کو روکنا تھا چنانچہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقا نے عیسائیت کے حملوں کو روکا اور اسلام کے تحفظ کا اہم ترین فریضہ انجام دیا، مختلف مقامات میں عیسائی مبلغین اور پادریوں سے مناظرے کئے اور ان کو لاجواب کیا ۱۲۹۲ھ میں پادری تاراچند سے مباحثہ کر کے اسے لاجواب کیا، نیز ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں قصبہ چاند پور کے میلہ خداشناسی میں حقانیت اسلام، ابطال تثلیث، تردید شرک اور اثبات توحید پر محققانہ تقریر فرمائی، اس میلہ میں عیسائی مبلغین اور پادریوں نے حضرت نانوتوی کے اعتراضات کے جواب نہیں دئے، اسی طرح آپ نے مختلف مقامات میں فتنہ آریہ سماج کی بیخ کنی فرمائی، اس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اور اس کے ہم خیال پنڈتوں سے مناظرہ کئے، حضرت مولانا محمود احمد صاحب نستوی تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ حضرت امام انور شاہ کشمیری نے دوران درس فرمایا کہ:

”حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے عقائد پر اتنا کچھ لکھدیا ہے کہ آئندہ سو سال تک کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں“۔

علوم دینیہ کی ترویج واشاعت، فرقہ باطلہ کی تردید، عیسائیت اور فتنہ آریہ سماج کی سرکوبی کے علاوہ آپ نے مختلف موضوعات پر قیمتی کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، جن میں آب حیات، تقریر دل پذیر، ہدیۃ الشیعہ، انتصار الاسلام، حجۃ الاسلام، توثیق الکلام، قبلہ نما، مباحثۂ شاہ جہاں پور، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے مختصر عمر پائی اور صرف ۴۹ سال کی عمر میں ۴/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۸۸۰ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور مزار قاسمی دیوبند میں ہدایت ورشد کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

(۱) بحوالہ PANJAB-AND- SIND- MISS- NSS-P-294

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر

۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء

مولانا محمد علی ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور میں ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعلی خاں نواب رام پور یوسف علی خاں کے مصاحب تھے دو برس کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری ان کی والدہ پر آگئی جن کی عمر بیوگی کے وقت ستائیس برس تھی۔ جب خاندان کے افراد نے انھیں دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا تو انھوں نے اپنے بچوں کے حوالے سے ازراہ مذاق یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا کہ "پہلے تو انھیں صرف ایک خاوند کا اتنے عرصے تک خیال رکھنا پڑا لیکن اب انھیں پانچ خاوندوں اور ایک بیوی کا خیال رکھنا ہوگا"۔

محمد علی نے اپنی والدہ کی نگرانی میں قرآن کریم ختم کیا، اس کی آخری سورتیں حفظ کیں اور فارسی کی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا جن میں گلستاں' بوستاں' رقعات عالمگیری' سکندر نامہ شاہ نامہ جیسے شاہکار شامل تھے۔ بعد ازاں انھوں نے مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور بریلی کے ایک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے پہلے خاندانی روایات کے خلاف ان کی والدہ اپنے دو بیٹوں کو بریلی کے ایک اسکول میں داخلہ دلا چکی تھیں اگرچہ وہ خود تعلیم یافتہ نہیں تھیں تاہم انھوں نے انتہائی روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلوائی۔ اس کے لیے انھیں اپنے زیورات تک رہن رکھنے پڑے تھے۔ بریلی اسکول میں کچھ وقت گزارنے کے بعد محمد علی نے ایم اے او کالج علی گڑھ کے اسکول میں داخلہ لے لیا جہاں ان کے دونوں بڑے بھائی یعنی ذوالفقار علی، شوکت علی بھی داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے "الفاروق" اور ایسی ہی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا جو ان کے نصاب میں شامل نہیں تھیں۔ ان کا علمی ذوق اسقدر قوی تھا کہ وہ چھپ چھپ کر مولانا شبلی نعمانی کا لکچر سنا کرتے تھے جو بڑی عمر کے لوگوں کے لیے تفسیر پر ہوا کرتا تھا۔ علامہ شبلی ان کے اس ذوق و شوق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے محمد علی کو اپنے لکچر سننے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح مولانا کو جب یہ علم ہوا کہ انھیں شاعری کا شوق بھی ہے تو انھوں نے محمد علی کا امتحان لیا جس میں وہ پورے اترے۔ اور مولانا شبلی نے ان تینوں بھائیوں کو اپنے مکان پر کھانے کے لیے مدعو کیا اس طرح علامہ شبلی کی

مولانا اختر امام عادل*

تحفظ دین کی مساعی جمیلہ

مولانا نانوتوی — عہد اور خدمات

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جس دور میں اپنی آنکھیں کھولیں وہ ہندوستانی تاریخ کا انتہائی پر آشوب دور تھا، ایک طرف آٹھ سو سالہ طویل اسلامی مملکت اپنی حیات مستعار کی آخری سانسیں لے رہی تھی، دوسری طرف ایک اجنبی سامراجی طاقت ملک میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کر رہی تھی، جس کے تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی یلغار سے ملی وتہذیبی وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا، اور اقتصاد، عدل وانصاف، مشرقی تہذیب وتمدن، مذہب وملت اور عزت وشرافت ہر چیز پر سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔

اقتصادی بدحالی

حضرت نانوتوی کے معاصر وہم درس، اس دور کے حالات کے ذاتی مشاہد، انگریزوں کے وفادار، مگر ملک وملت کے غمگسار سر سید احمد مرحوم کی شہادت شاید اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر مانی جائے، وہ اپنی مشہور کتاب ''اسبابِ بغاوت ہند'' میں اقتصادی تبدیلیوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''میں نہیں بیان کرسکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضگی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگیٔ معاش اس سبب سے ان کو تھی کہ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں جو ادنیٰ ادنیٰ حیلہ پر ضبط ہوگئیں ہندوستانی خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی، بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھی وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لی، پھر ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔(۱)

(۱) اسباب بغاوت ہند ۲۶۔

* جامعہ ربانی، منورواشریف، سمستی پور (بہار)

وساطت سے محمد علی کا تعارف قرآن پاک کے معانی و مطالب سے ہوا اور ان میں غور و فکر کا مادہ پیدا ہوا۔

محمد علی نے آٹھ سال علی گڑھ میں گزار کر الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی کیونکہ اس زمانہ میں ایم اے او کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے تھا۔ دوران تعلیم محمد علی نے اپنی ذہانت کا زبردست ثبوت فراہم کیا۔ بقول میر محفوظ علی وہ "کلاس میں لکچر سنتے' فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے"۔ شعر گوئی بھی ان کا محبوب شغل تھا۔ انہی دنوں ان کی شادی امجدی بیگم کے ساتھ ہو گئی جنھوں نے تحریک آزادی میں محمد علی کے شانہ بشانہ کام کیا۔ ان کی بی اے میں امتیازی حیثیت سے کامیابی سے متاثر ہو کر ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے روپیہ کا انتظام کر کے انھیں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ دلوادیا جہاں سے انھوں نے تاریخ جدید میں بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی اور اسلامی سلطنت کے آغاز و عروج پر مشتمل مسلمانوں کی تاریخ سے بڑا فیض پایا۔ لیکن اپنے خاندان کی خواہش کے مطابق وہ آئی سی ایس نہیں بن سکے اور چار سال انگلستان میں قیام کرنے کے بعد وطن واپس آکر رام پور میں مہتمم تعلیمات کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ بعد ازاں اس منصب سے مستعفی ہو کر وہ مہاراجہ بڑودہ کے یہاں ملازم ہو گئے جو ان کے آکسفورڈ کے ساتھی تھے لیکن وہاں سے بھی ۱۹۱۰ء میں انھوں نے ملازمت ترک کر دی۔ اسی سال وہ ایم۔ اے۔ او کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انگریزی اخبارات و رسائل میں ان کے بے شمار مضامین شائع ہوئے جن سے لوگوں کے دلوں پر ان کی انشا پردازی کا سکہ بیٹھ گیا۔ ان مضامین نے جہاں انھیں شہرت سے ہمکنار کیا وہیں خود اعتمادی سے بھی ہم آہنگ کر دیا اسی لیے انھوں نے کلکتہ سے ہفتہ وار "کامریڈ" کا اجرا کر کے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کر دیا۔ یہ محمد علی کی زندگی کا بڑا اہم موڑ تھا کیونکہ یہیں سے ان کی بھرپور سیاسی زندگی کی شروعات ہوئی۔ ویسے وہ ملازمت کے دوران ہی عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے چنانچہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے وقت وہ ملک کے نامور اور ممتاز مسلم رہنماؤں کے ساتھ ڈھاکہ میں موجود تھے اور اس واقعہ کی روئداد انھوں نے محسن الملک کی فرمائش پر The Green Book کے عنوان سے قلمبند کی تھی۔ تاہم مہاراجہ بڑودہ ان کا استعفیٰ منظور کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ بڑودہ میں دوران ملازمت ہی انھیں دو اور ریاستوں سے ملازمت کی پیش کش ہوئی جسے انھوں نے منظور نہیں کیا۔ انھوں نے اس ریاست کے اس تار کو اس وقت تک کھول کر نہیں دیکھا، جس میں انھیں ریاست کی وزارت کی پیش کش کی گئی تھی، جب تک کہ کامریڈ کا پہلا شمارہ شائع ہو کر

ابتداءِ عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہوگا جس میں تھوڑا بہت انتقال (رد و بدل) نہ ہوا ہو، ابتداء میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہوگیا۔ (ص:۲۸)

اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے، بالکل جاتا رہا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ (۲)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب فرماتے ہیں:

''پس یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ خونیں حادثہ —— مٹی ہوئی جاگیرشاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیرشاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکت مذبوحانہ تھی:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ بحث طویل ہے، اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے، تنخواہوں کا تفاوت، مال گذاری کا اضافہ، وصولیٔ مال گذاری کے لئے جائدادوں کا نیلام، نیلام کے دل آزارانہ توہین آمیز طریقے، سود اور سود در سود کا رواج وغیرہ، غرض ہر ایک باب داستان الم ہے (علماء ہند کا شاندار ماضی ۴/۲۷)

سر سید مرحوم نہایت جوش سے لکھتے ہیں:

''غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہوگیا تھا، اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آگئے تھے''۔ (۳)

شیخ محمد اکرام نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''اَوَر انڈین مسلمانز۔'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''اگر کوئی سیاست داں دارالعوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بنگال کے مسلمان خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کردے، یہی لوگ کسی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے، گھوڑے گاڑیاں نوکر چاکر موجود تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ ان کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں، پوتے اور پوتیاں، بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں، اور ان بھوکوں کے لئے ان میں سے

---

(۲) اسباب بغاوت ہند۔ (۳) اسباب بغاوت ہند ۳۶

بازار میں نہ چلا گیا۔

"کامریڈ" ایک انگریزی ہفت روزہ تھا جس کا پہلا شمارہ ۱۴؍ جنوری ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا محمد علی نے "ایک جواری کی طرح" وہ تمام روپیہ جو وہ کہیں سے بھی اکٹھا کر سکتے تھے داؤں پر لگادیا اور یہ "داؤں تھا ایڈیٹر اور پروپرائٹر بننے کا' جس نے بعد میں ایک غیر مقدس لیکن بہت ہی گراں' تثلیث 'یعنی ایڈیٹر' پروپرائٹر مع پرنٹر کی شکل اختیار کرلی"۔ محمد علی شروع ہی سے ملت کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے تھے' اگرچہ ان کے لیے باوقار ملازمتوں کی کمی نہ تھی' والیانِ ریاست ان کے لیے چشم براہ رہا کرتے تھے، اعلا مناصب ان کے ہم رکاب رہتے تھے لیکن انھوں نے ان تمام کو بالائے طاق رکھ کر صحافت کے پیشہ کو ترجیح دی۔ خود انھی کے الفاظ میں "صحافت ہی کے ذریعہ اپنی ملت کے مسائل کے سلسلے میں کام کر کے ملت کے لیے ایک حد تک مفید بھی ہو سکتا تھا اور اس طرح اپنی روزی بھی کما سکتا تھا۔۔۔۔ اس امر کے محرک زیادہ تر میری ملت کے دنیاوی مسائل تھے جنھوں نے اس وقت میرے منصوبوں کا رخ بدلنے کا مطالبہ کیا تھا"

محمد علی بڑے جذباتی انسان تھے۔ ان کے دل میں ملت اسلامیہ کا درد تھا اور وہ اس سے متعلق ہر اچھی بری خبر کا احساس کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک رات جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ بلغاری فوجیں قسطنطنیہ سے صرف پچیس میل دور رہ گئی ہیں جو پچھلی پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے مقدس تھا تو انھوں نے خودکشی تک کے ارتکاب کا ارادہ کرلیا۔ بعد ازاں جب جنگ بلقان شروع ہوئی تو انھوں نے ترکی میں ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبی مشن بھیجنے کے سلسلہ میں پہل کی اور اس کے بعد مچھلی بازار کان پور میں مسجد کے ایک حصہ کی شہادت کے مسئلہ کو سلجھانے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔

برطانوی حکومت نے جب کلکتہ کے بجائے دہلی کو ہندستان کی راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا تو محمد علی نے "کامریڈ" کا دفتر بھی ۱۴؍ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی میں منتقل کرلیا اور ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو یہیں سے "کامریڈ" کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ یہاں ان کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا کیونکہ کلکتہ کے مقابلے میں دہلی میں طباعت کی سہولتیں بہت کم تھیں اس لیے انھیں خود ایک پریس کا قیام عمل میں لانا پڑا۔ اس وقت تک حکومت کو "کامریڈ" کی پالیسی سے اتفاق تھا اس لیے اس نے محمد علی کو ضمانت داخل کرنے سے مستثنیٰ کردیا۔ انھیں یہ رعایت کلکتہ میں بھی حاصل رہ چکی تھی لیکن جلد ہی وہ حکومت کی نظروں میں مشتبہ ہو کر معتوب ہوگئے۔ اس دوران انھوں نے مسلمانوں کی آسانی کے پیش نظر "نقیب ہمدرد" نامی اردو پرچہ کا اجرا کیا جو بعد

کسی ایک کو زندگی میں کچھ کرنے کا موقعہ نہیں، وہ منہدم اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابل رحم زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ دھنستے جاتے ہیں۔حتی کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرض خواہ ان پر نالش کرتا ہے اور مکان اور زمینیں جو باقی تھیں ان کے قبضے سے نکل جاتی ہیں اور یہ قدیمی مسلمان خاندان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔(۴)

عدل اور انصاف کی صورت حال

عدل وانصاف کی صورت حال کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو نا قابلِ برداشت تھا۔(۵)

تعصبات، تنگ نظری، اور ناانصافی کے احوال ڈاکٹر ہنٹر کی زبانی سنئے:

مسلمانوں کی بد قسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا جا سکتا ہے، جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی، ۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے تینوں درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر، امیدواروں میں چار ہندو، دو انگریز اور مسلمان صفر، سب انجینئروں اور سپروائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان، اوورسیروں میں تریسٹھ ہندو اور دو مسلمان، اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم، وغیرہ۔

سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز تھی، ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اس کے بعد بھی ۱۸۵۱ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلاء کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی، لیکن ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوئی اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی بدل دیا گیا، ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان......

انہوں نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت نقل کی کہ — اب یہ حالت ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔ چند دن

(۴) موج کوثر ص: ۷۵۔ (۵) اسباب بغاوت ہند

میں روزنامہ "ہمدرد" میں منتقل ہو گیا اسی زمانہ میں انھیں ترکی سے ایک پمفلٹ ملا جو مقدونیہ میں بلقانی اتحادیوں کے مظالم سے متعلق تھا اور جس میں انگریزوں اور عیسائیوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ مقدونیہ آئیں اور ان کی مدد کریں۔ محمد علی نے اس کتابچہ کو تصویروں کے ساتھ "کامریڈ" میں شائع کر دیا اور اس کا ترجمہ "نقیب ہمدرد" اور "ہمدرد" میں بھی شامل کر دیا۔ ان کے اس صحافتی عمل سے پریس کی ضمانت ضبط ہو گئی لیکن ان کے وکیلوں نے اپنی ذمہ داری پر ان کی ضمانت کی رقم خود ہی جمع کرا دی کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ ضمانت کے سبب کہیں محمد علی اپنی صحافتی سرگرمیاں ختم ہی نہ کر دیں۔ یہ حقیقت "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی مقبولیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

تاہم یہ ضمانت اس وقت ضبط کر لی گئی جب محمد علی نے لنڈن ٹائمز میں چھپنے والے ایک مضمون کے جواب میں "کامریڈ" میں "ترکوں کی پسند" کے عنوان سے تقریباً پونے اٹھارہ کالموں پر محیط ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون پہلی عالمگیر جنگ میں اتحادیوں کے خلاف ترکی کے جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے شمولیت کی حمایت میں لکھا گیا تھا۔ یہ مضمون محمد علی نے اپنی علالت کے دوران قلمبند کیا اور شروع کرنے کے بعد انھوں نے اپنے قلم کو اس وقت تک نہیں روکا جب تک کہ مضمون ختم نہیں ہو گیا۔ وہ مسلسل چالیس گھنٹے تک بیٹھ کر لکھتے رہے۔ اس دوران نہ انھوں نے کھانا کھایا، نہ آرام کیا اور نہ ہی سوئے، بس لکھتے رہے اور تیز کافی کی پیالیاں یکے بعد دیگرے ختم کرتے رہے۔ اس کے پروف بھی انھوں نے اپنے رامپور کے سفر کے دوران خود ہی پڑھے جہاں وہ اپنے بہنوئی کی تدفین میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ ضمانت کے ضبط ہو جانے کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ سے ان کے پاس رقومات پہنچنی شروع ہو گئیں تاکہ زر ضمانت جمع کر دیا جا سکے لیکن محمد علی نے اپنے احباب کے مشورہ پر عمل کیا اور ضمانت داخل نہیں کی کیونکہ اب اگر ضمانت ضبط ہو جاتی تو پریس بھی ضبط ہو جاتا اسی لیے مجبوراً انھیں "کامریڈ" اور "ہمدرد" کو بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تاہم انھوں نے "ہمدرد" کو اوائل اپریل ۱۹۱۵ء میں دوبارہ شروع کر دیا۔

ان تمام ہنگامی حالات نے محمد علی کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ وہ مستقل بیمار رہنے لگے اس لیے ان کے معالجین یعنی حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے مشورہ دیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں ورنہ موت کی آغوش بڑی بے چینی سے ان کے انتظار میں تھی۔ اس لیے مجبوراً "ہمدرد" کو قاضی عبدالغفار اور سید جالب دہلوی کی نگرانی اور انتظامی معاملات کو اپنے بھائی شوکت علی کی ذمہ داری میں سونپ کر محمد علی رام پور چلے گئے۔ تاہم یہ آزادی بڑی مختصر ثابت

ہوئے کمشنر صاحب نے تصریح کردی کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوا کسی کو نہ ملیں گی۔(۶)

سماجی حیثیت کی پامالی

مسلمانوں کی عزت وشرافت کا حال کتنا ابتر تھا، اس کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی، اس نوکری سے تو گھانس کھودنی بہتر ہے۔

بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقار کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے، جیسی ایک چھوٹے یورپین کی(۷)

مذہبی وتہذیبی اقدار کو خطرہ

سب سے بڑا خطرہ مذہبی اور ملی تشخصات اور تہذیبی اقدار وروایات کو تھا، سرسید اس وقت کے عام احساسات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل وقابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم ورواج میں مداخلت کرے، اور سب کو، کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم ورواج پر لا ڈالے...... سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی، بلکہ خفیہ تدبیریں کر کے مثل نابود کر دینے علم عربی وسنسکرت کے اور مفلس ومحتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو ان کا مذہب ہے، اس کے مسائل سے ناواقف کر کے اور اپنے دین ومذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر، نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے...... ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں، جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے، پادری صاحبوں کا

(۶) موج کوثر ص: ۷۶۔ (۷) اسباب بغاوت ہند ص: ۴۲

ہوئی کیونکہ ۱۷ رمئی کو قانون تحفظ ہند کے تحت دہلی میں امن عامہ کے مفاد کی خاطر حکومت نے دونوں بھائیوں کو مہرولی میں قیام کرنے کا حکم جاری کردیا۔ محمد علی نے اس حکم کے موصول ہونے پر سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس پیغمبرانہ سنت کی ادیگی کے لیے اس نے انھیں منتخب کیا تھا۔

دونوں بھائیوں کو مہرولی سے لینسڈاؤن منتقل کردیا گیا اور پھر چھندواڑہ میں نظربند کردیا گیا لیکن بار بار معلوم کرنے پر بھی حکومت نے ان کی نظر بندی کا سبب ظاہر کرنے سے اجتناب کیا البتہ نومبر ۱۹۱۶ء میں دہلی کی انتظامی رپورٹ میں صرف اتنا کہا گیا کہ "اس ماہ مئی میں محمد علی اور شوکت علی کو نظر بند کرنا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت پر برا اثر ڈال رہی تھیں" مجلس قانون ساز میں اراکین نے بار بار ان کی نظر بندی کا معاملہ اٹھایا اور ان کے جرم سے متعلق سوالات کیے لیکن حکومت انھیں مطمئن نہیں کر سکی۔ اسیری کے دوران ان کی والدہ بی اماں ان کے ساتھ قیام پذیر رہیں جو خود بھی برطانوی حکومت کی شدید مخالف تھیں اسی لیے ایک بار جب علی برادران کی آزادی کا معاملہ زیر غور تھا اور مسٹر عبدالمجید سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے مشروط آزادی کا فارم خانہ پری کے لیے دونوں بھائیوں کی خدمت میں پیش کیا تو بی اماں جذبہ ملت پرستی سے بے تاب ہو گئیں اور ایک ولولہ انگریز جذباتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے فرمانبردار بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ مشروط آزادی کے فارم کو پُر کیے بغیر فوراً واپس کردیں ورنہ پھر "میں خداوند قدوس سے دعا مانگوں گی کہ وہ میرے کمزور اور نحیف ہاتھوں میں اتنی طاقت عطا فرمائے کہ میں تم دونوں کا اس وقت سے پہلے خاتمہ کردوں جبکہ تم راہ حق سے پھرو"۔

۸ رجون ۱۹۱۹ء کو علی برادران کو چھندواڑہ سے اسی میل کے فاصلہ پر واقع بیتول جیل میں منتقل کردیا گیا جہاں وہ مزید سات ماہ نظربند رہے۔ آخر کار ۲۵ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے ایک اعلان کے تحت تمام سیاسی قیدیوں کو عام معافی دے دی اس کے نتیجہ میں علی برادران بھی ۲۸ ردسمبر کو رہا کردیے گئے۔ دوسرے سیاسی نظربندوں نے تو اپنے گھروں کی راہ لی لیکن محمد علی اور شوکت علی براہ راست امرت سر جا پہنچے جہاں قومی جماعتوں کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔

راستے میں ہزارہا لوگوں نے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا۔ ۲۹ ردسمبر کو جب گاڑی امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو قومی نعروں سے ہزاروں ہندو مسلم افراد نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ اسٹیشن سے جلوس کانگریس کے پنڈال کی جانب روانہ ہوا اور جس وقت وہ جلیان

طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے تھانہ کا چپراسی جانے لگا، پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہونچتی تھی...... دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں......
جس گاؤں میں پرگنہ وزیر یا ڈپٹی انسپکٹر پہونچا اور گنواروں میں چرچا ہوا کہ ''کالا پادری'' آیا، عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرشانبنانے کو بٹھاتے ہیں......
یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ:
اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہیے، اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''
میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرستان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ (۸)

خوفناک سناٹا

خصوصاً اس وقت جبکہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بعد پورے ملک میں بالعموم موت کا سناٹا چھا چکا تھا۔ مشہور مبصر مولانا محمد میاں صاحب کے بقول:
اس دور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، البتہ یہ درست

---

(۸) اسباب بغاوت ہند ص: ۱۷ تا ۲۳۔

والا باغ پہنچا تو مولانا محمد علی نے شہیدوں کے اعزاز میں ننگے سر ہو کر ایک پُر درد تقریر کی۔ بعد ازاں کانگریس کے پنڈال کے گیٹ پر گاندھی جی، مدن موہن مالوی، مسٹر کھاپرڈے وغیرہ نے ان کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ ان کے پنڈال میں قدم رکھتے ہی تمام ہندو مسلمان تعظیماً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پندرہ منٹ تک تالیاں بجا کر انھیں خوش آمدید کہتے رہے۔ صدر کانگریس پنڈت موتی لال نہرو نے حاضرین اجلاس سے دونوں بھائیوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی قومی خدمات کا ذکر کیا۔ مالوی جی نے دونوں بھائیوں اور مولانا عبدالباری کو کانگریس کا اسپیشل ڈیلی گیٹ بنایا۔

تھوڑی دیر کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد دونوں بھائی مسلم لیگ کے اجلاس میں پہنچے جہاں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوا۔ حاضرین کے اصرار پر مولانا محمد علی نے ایک زبردست اور اثر انگیز تقریر کی جس میں انھوں نے اپنی نظر بندی کا ذکر کرتے ہوئے مصائب اسلام پر بحث کرتے ہوئے حاضرین جلسہ سے دریافت کیا کہ "تم جنرل ڈائر کی سزا کا تازیانہ اور رینگ کر چلنے اور اسی قسم کے ظالمانہ احکام سے ڈرتے ہو یا خدا سے؟" اس پر ہر طرف سے یہی آواز آئی کہ "صرف خدا سے" پھر مولانا محمد علی نے کہا کہ "دنیا میں سوائے خدا کی حکومت کے کسی کی حکومت نہیں اور ہمیں صرف اسی کی رعایا بن کر رہنا چاہیے۔ میں اپنی ضعیف ماں بچے، بیوی، بھائی اور خود اپنی ذات کو اللہ اور اس کے مقدس مذہب اسلام پر نثار کر دینے کے لیے تیار ہوں، میری رہائی کا کوئی مطلب ہے تو صرف یہ کہ میں خدا سے قریب تر ہو جاؤں اور میری زندگی کے تمام خواب پورے ہوں" جب تک مولانا محمد علی تقریر کرتے رہے تمام حاضرین روتے رہے۔

اس کے بعد مولانا محمد علی نے آل انڈیا خلافت کانفرنس میں مسئلہ خلافت پر ایک پُر جوش اور مدلل تقریر کرتے ہوئے برطانوی صاحبانِ اقتدار کی عہد شکنیوں پر بحث کی اور اس کے لیے جہاد یا ہجرت کو آخری چارۂ کار ٹھہرا لیا۔ خلافت کانفرنس کے اسی اجلاس میں یہ طے پایا کہ مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان جائے اور وہاں کے عوام اور ذمہ داروں کو اس مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کرے اور ان پر یہ واضح کر دے کہ تحریک خلافت کیا صورت اختیار کر سکتی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی مطالبات کیا ہیں۔

۲؍ جنوری ۱۹۲۰ء کو کانگریس کے اجلاس میں اردو اور انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا:

"۔۔۔۔ میں ابھی جیل سے آیا ہوں اور گورنمنٹ کے فعل پر نفریں بھیجتا

ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے، اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریزوں کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کر سکے جو کرنا چاہئے تھا، خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسنا کی جو قومی عظمت و وقار اور حیات اجتماعی کے لئے سرطان اور پلیگ سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں، اور جن کی بنا پر طوائف الملوکی عروج پاتی ہے، انہیں امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو اصم اور مدہوش بنا دیا تھا۔

فانها لاتعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کئے گئے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پجاری انگریزوں کو پہچانتے، سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سنی کو ان سنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں۔ کیونکہ وہ اغراض جن کے آب و گل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے ان کا تقاضا ہی یہ تھا ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے:

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا (۹)

علماءِ حق

اس ہیبت ناک سناٹے میں ایک علماء حق ہی کی جماعت تھی جو ہر دور میں بیدار اور متحرک رہی، انہوں نے مخالف آندھیوں کی پروا نہیں کی، وہ ہر زمانے میں حق کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں سے لڑتے رہے، اور جان و جگر سے دین و ملت کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

صف اول کے رہنما

حضرت نانوتویؒ اسی جماعت کی صف اول کے رہنماؤں میں شامل ہیں۔ بلکہ دفاعی محاذ پر بہتوں سے پیش پیش، اور مجموعی لحاظ سے بے مثل و بے نظیر، سر سید مرحوم آپ کے رفیق درس تھے، لیکن طریق تعلیم حالات کی نباضی، اور ملک و ملت کی مطلوبہ قیادت کے باب میں دونوں کے نقطۂ نظر میں سخت اختلاف تھا، انہوں نے حضرت نانوتوی کے انتقال پر اپنے مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں

(۹) شاندار ماضی ۴/ ۵۵۔

ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو دوبارہ جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ جلیان والا باغ کے حادثہ نے صرف جسمانی تکلیف ہی نہیں پہنچائی بلکہ روح کو بھی صدمہ پہنچایا ہے جس کا اثر یہ ہوا کہ ہندستانی قوم دنیا میں سب سے بڑی اور متحد قوم بن گئی۔ جو کچھ میں انگریزی اور اردو میں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ آج میں نے ایک ایسی مثال دیکھی ہے جو اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں بہت بڑے مجمع کو دیکھتا ہوں اسے میں مجمع نہیں کہوں گا یہ ایک انسانی سمندر معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ جب ڈائر رام باغ سے چلا تو اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ فائر کرے گا۔ لہٰذا اس نے مضبوطی کے ساتھ فائر کیے۔ لیکن اس نے صرف ان انسانوں پر فائر نہیں کیا جو وہاں جمع تھے بلکہ ہمارے دلوں پر بھی فائر کیا جس نے ایک نئی آگ پیدا کر دی اور جس سے آج یہ نئی قوم پیدا ہوئی جو آئندہ خدا نے چاہا تو سوائے خدا کے زمین پر کسی اور سے نہیں ڈرے گی۔۔۔۔ اب میں جیل ہو آیا ہوں اور تم سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں پھر جیل چلا جانا چاہیے۔ میرے بھائی رام بھج دت چودھری کو چاہیے کہ وہ پھر جیل چلے جائیں اور ڈاکٹر کچلو کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا جائے اگر ضرورت ہو، کیونکہ آخر ہمیں مرنا ہی ہے۔ خدا کے لیے تم اس بات کو نہ بھولنا اپنے اس ملک کے لیے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ جب تم اپنے دل میں حکومت کے مستقبل کے متعلق خیال کرتے ہو تو تم میں موجودہ نسل کے لیے نہیں بلکہ پیش نظر آئندہ کی سود بہبود ہو۔ میں واپس جیل جانے کو دوبارہ تیار ہوں اگر ضرورت ہو، بجائے اس کے کہ تمام ہندستان کو مقید و محبوس کیا جائے۔ ہمیں ایک ذلیل سے ذلیل ہندستانی کی آزادی کا خیال رکھنا چاہیے جسے ڈائر نے چھینا ہو یا اوڈائر نے، ماننٹیگو نے یا چیمسفورڈ نے یا کسی اور نے۔ میں کچھ گستاخی سے نہیں بول رہا ہوں۔ میں بعض شعور حیوانی کی وجہ سے ان معاملات میں قدامت پسند ہوں اور جمہوریت پر اعتقاد رکھتا ہوں۔

"میرا سردار کون ہے؟ میں کہتا ہوں کہ پہلے میرا سردار خدا ہے۔ خدا نے مجھے ٹھیک ویسا ہی بنایا ہے جیسا کہ اس نے شاہ جارج پنجم کو بنایا۔ اب اگر ان کا نائب ہندستان کے تمام آزاد مردوں اور عورتوں کے حقوق غصب کر لے تو کیا ہے۔ بہر حال تمہاری عورتوں کو پولیس کے آدمیوں نے تکلیف

جو تعزیتی مضمون لکھا، اس کے یہ اعترافات کتنے بروقت اور حقیقی تھے:

زمانہ بہتوں کو رو دیا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے...... لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع و مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس ولی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے......

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا'' (۱۰)

تین دفاعی محاذ

حضرت نانوتویؒ نے تحفظ دین کے لئے مختلف محاذوں پر کام کیا، اس دور کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ دور کیسے انتشار کا تھا، اور کتنے محاذ کھلے تھے جن پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

(۱) ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت کی بحالی، اور ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنے والی امت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا مسئلہ تھا۔

(۲) دوسری طرف غیر اسلامی جماعتوں سے نظریاتی جنگ درپیش تھی، آئے دن مختلف جہتوں سے اسلامی عقائد و احکام پر حملے کئے جا رہے تھے، اور اسلامی تصورات کی غلط تعبیرات پیش کی جا رہی تھیں، ضرورت تھی کہ ان حملوں کا بھرپور دفاع کیا جائے، اور اسلامی عقائد و احکام کے حقیقی خدوخال جدید سائنٹفک انداز میں پیش کئے جائیں۔

(۳) تیسری جانب ملک میں مسلمانوں کی جہالت و افلاس کی وجہ سے ذہنی ارتداد کی وبا

(۱۰) موج کوثر/ ۳۶۷-۳۶۸۔

پہنچائی اور ان کو مردوں نے ایسا کرنے کا حکم دیا جو یہ نہیں جانتے کہ حکم کو کہاں استعمال کرنا چاہیے۔ ہندستان کے حقوق کو ایسے آدمیوں کے لیے جو کہ انھیں مذاق سمجھتے ہیں کوئی کھیل نہ ہونا چاہیے۔ کوئی پروا نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ، ہمارے اہل و عیال کے ساتھ اور پورے ملک کے ساتھ کیا پیش آئے۔ تم اس لیے یہاں نہیں آئے ہو کہ جھک جاؤ اور کہو کہ ہم کو قید سے رہا کر دو اور اس چیز سے رہا کر دو جس سے ہم کو ڈرایا جاتا ہے۔ میں تم سے چند لوگوں کی آزادی کے لیے نہیں کہتا کہ باقیوں کو غلام چھوڑ دیا جائے۔ میں اس ملک کے لیے تم سے کہتا ہوں اور اس آزادی کے لیے کہ جو بہت سے آزادوں سے پیاری ہے۔ مسٹر تلک کو پھر تیسری مرتبہ جیل چلا جانا چاہیے۔ مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظر بند ہو جانا چاہیے اگر ضرورت ہو۔ مسز بیسنٹ کو ان کے سر کے بل پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جانا چاہیے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے"۔

اس کے بعد علی برادران ہندستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے رہے جہاں ہر جگہ ان کا زبردست خیر مقدم ہوا۔ ۹؍ جنوری ۱۹۲۰ء کو وہ دہلی آئے تو چاندنی چوک میں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے استقبالیہ پیش کیا اس میں انھوں نے کہا:۔

"۔۔۔دہلی کی سرزمین پر کتنے ہی عظمت و جلال والے تاجدار اور شاہزادے اور حکام بلند مقام آئے اور چلے گئے۔ اہل دہلی نے بڑے بڑے جلیل القدر اشخاص کے جلوس دیکھے اور خیر مقدم کے فرائض ادا کیے لیکن اگر خوشی، محبت اور عقیدت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے جو اس وقت ہمارے دلوں میں ہے تو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد سے آج تک اس خلوص و عقیدت کے ساتھ شاید ہی کسی شخص کا خیر مقدم کیا گیا ہو۔۔۔"

مولانا محمد علی نے اہالیانِ دہلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا :

"میں نے آپ کی کوئی خدمت ایسی نہیں کی جس پر ناز یا فخر کر سکوں۔ ہمارے رسول کا ارشاد ہے کہ ایمان یہ ہے کہ ہاتھ سے عمل کرو، زبان سے کوشش کرو، اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو کم سے کم دل سے اقرار کرو۔۔۔ میں آپ سے رخصت ہوتے وقت کلمۂ صداقت زبان پر نہ لا سکا تھا کیونکہ اس وقت زبان بھی بند تھی۔ اب زبان سے اسلام کی خدمت کر سکتا

پھیل رہی تھی، ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں ٹھوس دینی تعلیمات عام کی جائیں اور اس کے لئے پورے ملک میں دینی اداروں کا جال بچھایا جائے تا کہ یہ امت اپنے حقیقی دین پر پورے شرح صدر کے ساتھ قائم رہے، اور اسلاف کے علمی و دینی اثاثوں کی حفاظت کر سکے۔

حضرت نانوتویؒ کی انفرادیت

حضرت نانوتوی کی حقیقت آگاہ اور زمانہ آشنا نظروں نے تاریخ کے چہرے پر بکھرے ان مسائل اور تقاضوں کو پڑھا اور تینوں محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اور اس کے لئے دور رس منصوبے مرتب کئے۔

اس دور میں حضرت نانوتوی کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے ان تینوں محاذوں پر یکساں انداز میں کام کیا ہو، تاریخ کو ہر محاذ پر کام کرنے والے باصلاحیت افراد کی ضرورت تھی، جو جداگانہ ہر محاذ پر اپنی قوتیں خرچ کریں، لیکن اسے ایک ایسی شخصیت بھی درکار تھی جو ہر محاذ پر کام کرنے کی صلاحیت رکھے، جو ہر قسم کی دفاعی اور اقدامی قوتوں سے لیس ہو اور جس کی جامع شخصیت سے ہر محاذ کی قیادت کو فائدہ پہونچے۔

ایسی شخصیت حضرت نانوتویؒ کے سوا کوئی دوسری نہیں تھی، حضرت نانوتوی نے نہ صرف یہ کہ دین کے تحفظ و دفاع کا تاریخی کارنامہ انجام دیا، بلکہ انہوں نے اپنی خدمات سے ایک نئے عہد کو جنم دیا، انہوں نے تاریخ کا رخ پھیر دیا، اس دور کی شخصیات اور ان کی خدمات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نے تاریخ پر اتنے گہرے اثرات نہیں ڈالے جتنے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ڈالے۔

بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، واقعات آئینہ کی طرح تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں۔ ہم تینوں محاذوں پر حضرت نانوتوی کی دفاعی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد سوانحی حالات و واقعات کو جمع کرنا نہیں بلکہ ان کی اہمیت کا احساس دلانا اور ان کے سمت کی تعیین کرنا ہے۔

جنگی محاذ

۱۸۵۷ء کے جہاد میں قائدانہ کردار

اٹھارہویں صدی میں جب مسلمانوں پر سیاسی ادبار کا دور شروع ہوا، اور اس کی گرفت

ہوں کیونکہ اب وہ کھل سکتی ہے۔۔۔ہم بھولتے ہیں کہ ہم کو نظر بند کیا گیا' ہم فراموش کرتے ہیں کہ ہم کو قید کیا گیا۔ ہمارا بغض و محبت اللہ کے لیے ہے ہم دونوں بھائی تیار ہیں کہ گورنمنٹ کے ذلیل سے ذلیل ملازم کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیں، اس میں ہماری کچھ ذلت نہیں مگر ہم تیار نہیں کہ اسلام کی عزت پر حرف آئے۔ ہم اپنی حرم سراؤں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں مگر خدا کے حرم کو غیر کے قبضہ میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس پر ہماری اولاد' ہماری جان ہمارا مال سب قربان ہے۔۔۔"

غرضیکہ مولانا جہاں بھی گئے انھوں نے خلافت سے متعلق تقریریں کر کے مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو اس کی حمایت میں ہموار کیا۔

امرت سر میں منعقدہ خلافت کانفرنس کے فیصلے کے مطابق مولانا محمد علی کی سرکردگی میں خلافت وفد انگلستان گیا جس کے اراکین میں مولانا سید سلیمان ندوی، مسٹر سید حسن، مولوی ابوالقاسم شامل تھے۔ وفد کے سیکریٹری مسٹر حسن محمد حیات تھے۔ انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وفد کے اراکین کو بے شمار مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم محمد علی کی ثابت قدمی اور شاندار وکالت نے تمام پریشانیاں دور کر دیں۔ انھوں نے صاحبانِ اختیار سے مطالبہ کیا کہ خلیفہ کے ماتحت اسلام کے تمام مقامات مقدسہ برقرار رکھے جائیں' جزیرۃ العرب پر خلیفہ کا تسلط ہو اور وہاں اتحادیوں کا کوئی حلیف اور پٹھو حکمراں نہ بٹھایا جائے۔ خلیفہ کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی سلطنت سیاسی' اقتصادی' اور بحری اعتبار سے مستحکم ہو اس لیے انھوں نے مطالبہ کیا کہ دولت عثمانیہ کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے اور اس کے حصے بخرے نہ کیے جائیں۔ وفد نے وزیر اعظم برطانیہ ڈیوڈ لائڈ جارج اور ان کے رفقا سے بھی یہی باتیں کہیں لیکن انگلستان کے صاحبان اقتدار نے کوئی واضح اور مثبت جواب نہ دے کر منفی رویہ اختیار کر لیا۔ مولانا نے نہ صرف اپنی تقریروں سے انگلستان میں انگریزوں اور ان کی حکومت کے ضمیر کو خلافت کے مسئلہ پر بیدار کرنے کی کوشش کی بلکہ امریکہ اور اس زمانہ میں ہونے والی سپریم کونسل کی توجہ بھی خلافت کے مسئلہ کی جانب مبذول کرائی۔ وفد نے پیرس میں بھی خلافت کے مسئلہ سے وہاں کے لوگوں کو واقف کرلیا۔ روم میں انھوں نے اسقف اعظم سے ملاقات کی اور محسوس کیا کہ اٹلی کے لوگوں میں ترکوں اور مسلمانانِ عالم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور بے انصافیوں کا احساس حد درجہ موجود تھا۔

آٹھ ماہ بعد جب مولانا اپنے وفد کے ساتھ ہندوستان واپس ہوئے تو گاندھی جی کی

روز بروز مضبوط ہوتی چلی گئی، تو ان کی سیاسی قوت کی بحالی اور عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے آخری کوشش کے طور پر حضرت نانوتویؒ نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں حصہ لیا اور اس میں قائدانہ کردار ادا کیا ——— جہاد شاملی کے متعلق تمام لوگ متفق اور ہم زبان تھے سوائے مولانا شیخ محمد تھانوی صاحبؒ کے، ان کا خیال تھا کہ چوں کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں اس لیے نہ صرف یہ کہ جہاد فرض نہیں بلکہ جائز بھی نہیں ہے۔ لیکن جب حضرت نانوتوی نے بدر کی مثال پیش کی تو انھیں بھی شرح صدر ہو گیا اگرچہ یہ تحریک ناکام رہی۔

تحریک کی ناکامی کے بعد جب ان حضرات کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہو گئے اور قریب چھ ماہ جیل میں رہے، جبکہ حضرت نانوتوی اس سے محفوظ رہے، پولیس ان کا تعاقب کرتی رہی اور ان کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی، لیکن حضرت نانوتوی ان کی زد سے محفوظ رہے، حضرت گنگوہیؒ نے اس کی تکوینی توجیہ یہ فرمائی کہ چونکہ مجھے اس جہاد کی ضرورت میں ابتداءً کچھ تذبذب تھا، اس لئے مجھے جیل کی سزا کھانی پڑی، جبکہ مولانا محمد قاسم صاحب کو اس پر شروع سے پورا شرح صدر تھا، اس لئے اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ (۱۱)

ان واقعات سے حضرت نانوتوی کے جذبۂ جہاد، ذوقِ جاں فروشی، حق شناسی وحق آگہی، حالات کی نباضی، فکر وخیال کی رسائی، تحریک جہاد میں ان کی بنیادی اہمیت اور مجاہدین علماء میں ان کے امتیاز پر روشنی پڑتی ہے۔

عملی طور پر جہاد میں بھی حضرت نانوتوی کا کردار انتہائی سرفروشانہ تھا۔ آپ کے استاذ زادہ، سبق کے ساتھی، بعض کتابوں کے شاگرد اور نہایت مخلص عزیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی عینی شہادت بیان فرماتے ہیں:

> چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آئی، اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ، ایک بار گولی چل رہی تھی، یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی، ایک بھائی دوڑے، پوچھے، کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر، انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ

---

(۱۱) سوانح قاسمی۔

سربراہی میں تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا اس لیے مولانا اپنے مکان پر پہنچنے سے پہلے ہی گاندھی جی اور شوکت علی کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ خود مولانا کے الفاظ میں "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بہت سے مہینوں کے بعد بھی دو یا تین دن مستقل ایسے گزرے ہوں کہ ہم ایک جگہ رہے ہوں چنانچہ ریل گاڑی ہی میرا گھر بن گئی"۔ دراصل گاندھی جی نے مولانا کو ایک مخلص رہنما پایا۔ یوروپ میں وفد کے سفر سے واپسی پر گاندھی جی نے مولانا کا بمبئی میں استقبال کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مجھ کو محمد علی سے جو محبت ہے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ میں دہلی میں علی برادران سے پہلی دفعہ ملا۔ پھر علی گڑھ میں دونوں بھائیوں سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ اسی وقت یہ خیال آیا کہ یہ دونوں بھائی مسلمانوں میں وہی درجہ حاصل کریں گے جو مسٹر گوکھلے کو ہندوؤں میں حاصل ہے۔ مجھ کو خوشی ہے کہ جو کچھ میں نے خیال کیا تھا اب بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے۔" مولانا محمد علی کو بھی گاندھی جی سے بڑی محبت تھی دونوں بھائی انھیں باپو کہہ کر مخاطب کرتے تھے گاندھی جی تو علی الاعلان کہنے لگے تھے کہ "مولانا شوکت علی کی جیب میرا مسکن ہے"۔

تحریک خلافت نے ملک میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی اور ہر فرد کے دل میں علی برادران کے لیے محبت جاگزیں ہو گئی۔ اس تحریک نے انگریزی اسکولوں، کالجوں اور سرکاری نگرانی میں چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دینا فرض قرار دے دیا۔ چنانچہ تعلیمی محاذ پر ترک موالات کے لیے مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج سے پہل کی۔

اسی لیے مولانا محمد علی کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سرفہرست ہے۔ دراصل انہی کے ایما پر گاندھی جی نے علی گڑھ جا کر ترک موالات کے سلسلے میں طلبہ کو مخاطب کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مراد آباد میں خلافت کانفرنس کے جلسہ کا انعقاد ہو رہا تھا۔ رہنمایان قوم مراد آباد پہنچ چکے تھے۔ مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر انگلستان کے سفر سے بمبئی واپس آ چکے تھے اور جب وہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے براہ راست بمبئی سے مراد آباد پہنچ گئے تو ایم اے او کالج کے چند طلبہ نے ان سے ملاقات کی۔ مولانا محمد علی ان تمام سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے کہا کہ "میری خواہش ہے کہ مہاتما جی کو سب سے پہلے اپنے ہی کالج اور سب سے پہلے اپنے ہی طلبہ تک ترک موالات کا پیغام پہنچاؤں"۔ انھوں نے اس بارے میں ملاقاتی طلبہ کی رائے معلوم کی تو سبھی نے کہا کہ وہ تو خود اسی مقصد سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تاکہ درخواست کریں کہ ترک موالات کا سلسلہ ایم اے او کالج ہی سے شروع کیا جائے۔ ان طلبہ میں ارشاد الحق

بندوق ماری، جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ ڈاڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہونچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا۔ مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ (۱۲)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاریؒ کے حوالے سے نقل فرمایا کہ انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی، وہ مجاہدین کے ہجوم کو دیکھ کر تحصیل کی چہار دیواری میں محصور ہوگئی اور اندر سے فائر شروع کر دیئے، مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا، جہاں کوئی آڑ نہیں تھی، اس طرح مجاہدین کا جانی نقصان کافی ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر چھپر پر پڑی، چھپر اٹھوا کر تحصیل کے صدر دروازہ پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگادی گئی، جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر گھسنے کا راستہ کھل گیا، اب فوج میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، اس کے کچھ سپاہی کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے، کچھ مقتول ہوئے اور باقی گرفتار ہو گئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ (۱۳)

حضرت نانوتویؒ برطانوی فرعون کے لئے موسیٰ

۱۸۵۷ء کا جنگی جہاد بظاہر ناکام ہو گیا، مگر حضرت نانوتوی کا جہاد جاری رہا، پوری سامراجی قوت آپ کے درپے آزار رہی، مگر وہ آپ کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہونچا سکی اور مظلوم و مقہور ہندوستان کے لئے آپ کا تحریکی تسلسل جاری وساری رہا۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے خوب لکھا ہے:

الزام غدر یا اس الزام کے شبہ میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں، ظلم وستم اور وحشت و بربریت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کام میں لائی جا چکی ہیں، مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کیا کرتی ہے، وہ عجیب وغریب انداز سے ان کی حفاظت کر رہی ہے، جو فرعون برطانیہ کے مقابلے میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی انہیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرت خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلے میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی تھی۔ (۱۴)

---

(۱۲) ص:۱۱۳ اسوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب۔ (۱۳) سوانح قاسمی ۲/۔ (۱۴) شاندار ماضی ۴/۲۹۶۔

صاحب بھی شامل تھے جو بعد ازاں جامعہ کے رجسٹرار کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔اس ملاقات کی تفصیل خود ارشاد صاحب ہی کی زبانی سنیے:

"صبح کو مولانا سے ملنے کا وقت مقرر ہوا تھا۔ وقت مقررہ پر ہم لوگ ان کے پاس گئے، بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ان کو اپنی مادر علمی سے جو عشق تھا وہ سب جانتے ہیں۔ کالج کا حال پوچھا پھر فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مہاتما جی کو سب سے پہلے اپنے کالج لاؤں اور سب سے پہلے اپنے ہی طلبہ کو ترک موالات کا پیغام پہنچاؤں۔ تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ ہم لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ تو اسی لیے آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سے درخواست کریں کہ سب سے پہلے آپ ہمارے ہی یہاں تشریف لائیں اور مہاتما جی کو ساتھ لائیں۔ اس پر ہم لوگوں نے اطمینان دلایا کہ کافی تعداد ایسے طلبہ کی ہے جو کالج سے نکلنے کے لیے تیار ہیں اور ہم لوگ جو یہاں حاضر ہوئے ہیں وہ تو سب پکے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد انھوں نے ہم لوگوں کو رخصت کیا۔ دوسرے دن مہاتما جی کو لے کر علی گڑھ آنے کا وعدہ کیا اور یہ ہدایت کی کہ کالج پہنچ کر جلدی سے جلسہ کا انتظام کرو اور کوشش کرو کہ سب طلبہ جلسہ میں شریک ہوں۔ مولانا محمد علی کو خود اسکی توقع نہیں تھی کہ کالج سے زیادہ طلبہ نکل سکیں گے وہ جانتے تھے اور' جیسا کہ خود فرمایا کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کا زہر تمام طلبہ میں سرایت کر چکا ہے۔ چنانچہ وہ متفکر سے تھے"۔

دوسرے دن یعنی ۱۲ر اکتوبر کو حسب پروگرام اور حسب وعدہ مولانا محمد علی مہاتما گاندھی کے ساتھ علی گڑھ پہنچے جہاں جلسہ گاہ میں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ مولانا شوکت علی اور سوامی ستیہ دیو بھی ان کے ساتھ تھے۔ جلسہ میں ہنگامہ اور گڑبڑ کرنے کے لیے ڈاکٹر ضیاءالدین نے پہلے ہی اپنے آدمیوں کو تیار کر لیا تھا لیکن مولانا محمد علی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ جلسہ کی صدارت انجمن اتحاد کے صدر سید نوراللہ نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں برطانوی حکومت کے مظالم اور خلافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے بعد طلبہ سے درخواست کی کہ وہ ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو جائیں۔

مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں مسئلہ خلافت کی حمایت کی وجوہات کو واضح کیا اور مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی اور سوامی ستیہ دیو کے ساتھ طلبہ سے اپیل کی وہ اپنی مادرِ علمی کو خیرباد کہہ کر ترک موالات کی تحریک میں شمولیت اختیار کرلیں۔ جلسہ میں ضیاءالدین کے

نظریاتی محاذ

ہتھیار کی جنگ کے بعد افکار کی جنگ کا آغاز

حضرت نانوتوی شمشیر وسنان کی جنگ میں ہار گئے، لیکن اسی سے نظریاتی جنگ کی راہ ہموار ہوئی، جنگ کا میدان سر کرنے والی "سامراجی قوم" فتح کے نشہ میں میدانِ مناظرہ میں اتر پڑی، شمشیر وسناں کے طویل جنگی تجربات سے انگریزوں نے محسوس کیا کہ وہ جدید ترین ہتھیاروں سے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا صفایا کر سکتے ہیں (جبکہ وہ بھی آسان نہیں ہے) مگر ان کے ایمان کا صفایا نہیں کر سکتے اور یہ سخت جان امت اپنی جان دے سکتی ہے مگر اپنا ایمان نہیں گنوا سکتی، جبھی تو سخت سے سخت اذیتیں سہنے کے باوجود ایک بھی مسلمان اپنے دین و مذہب سے منحرف نہیں ہوا اور انہوں نے مکہ کی مظلوم تاریخ کی یاد تازہ کردی، مگر کسی نے اپنے دامن ایمانی پر کوئی داغ آنے نہیں دیا۔

یہیں سے انگریزی سیاست کا رخ تبدیل ہوا، مسلمان یوں بھی بالکل کمزور اور نہتے ہو چکے تھے۔ ان کے جسم وجان کی ساری قوتیں یہ ظالم پہلے ہی نچوڑ چکے تھے، ایک ایمان کے سوا ان کے پاس کوئی دوسری پونجی نہ تھی، برطانوی قزاقوں نے ان کی یہ پونجی بھی اڑا لینے کا پروگرام بنایا۔ اور ملک کے طول وعرض میں فضول مناظروں اور بے جا مباحثوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنے ساتھ اس کوشش میں ہندو پنڈتوں کو بھی شامل کر لیا۔ ان کے مذہبی رہنما پورے ملک میں گھوم گھوم کر اسلامی نظریات کے خلاف غلط فہمیاں پھیلاتے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے فریب دینے کی کوشش کرتے۔

اس نظریاتی محاذ پر بھی طبقۂ علماء میں حضرت نانوتویؒ ہی تھے، جنہوں نے سب سے آگے بڑھ کر اس محاذ کو سنبھالا اور اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ مخالف نظریات وشبہات کے دندان شکن جوابات دیئے۔ چناں چہ انھوں نے عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں سے مناظرے کئے اور عوام پر اسلام کی حقانیت واضح کی۔

اسی لئے حضرت نانوتوی کو ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے اس عہد کی مناسبت سے ان کو وہ خاص علوم عطا کئے گئے، جو کسبی نہیں بلکہ سراسر الہامی اور عطائی تھے۔ جو نہ اس عہد کے علماء میں کسی کو ملے اور نہ اس سے قبل کی کسی کتاب میں ان کا سراغ ملتا ہے۔

آدمیوں نے بہت سے سوالات کیے جن کے جواب مولانا محمد علی نے دیے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ کالج چھوڑنے کے بعد طلبہ کیا کریں گے تو مولانا نے جواب دیا کہ وہ خلافت کا کام کریں گے۔ اس سوال کے جواب میں کہ تعمیری کام کی اسکیم کیا ہوگی؟ مولانا نے کہا کہ "تعمیری اسکیم نہ ہونے کی صورت میں بھی مسلمانوں کو مذہب پر سب کچھ قربان کردینے میں تامل نہ ہونا چاہیے" ان سے پوچھا گیا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں کیا ہوگا تو مولانا نے جواب دیا کہ خلافت مسلمانوں کا مسئلہ ہے اس لیے یہ سوال بے محل ہے۔ صدر جلسہ سید نوراللہ نے بھی طلبہ سے اپیل کی کہ وہ ترک موالات کو اپنالیں لیکن طلبہ نے اپنے رہنماؤں سے درخواست کی کہ انھیں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے۔

دوسرے دن یعنی ۱۳ر اکتوبر کو انجمن اتحاد کا جلسہ پھر منعقد ہوا جس میں موافق اور مخالف تقریریں ہوئیں چند تجویزیں بھی پیش ہوئیں جن میں ایک تجویز یہ تھی کہ کالج کے ٹرسٹیوں سے کہا جائے کہ وہ حکومت سے مدد لینا بند کریں اور سرکاری یونی ورسٹی سے کالج کا الحاق ختم کردیں۔ ٹرسٹیوں کو یہ الٹی میٹم بھی دیا گیا کہ اگر وہ ۲۹ر اکتوبر سے پہلے حکومت کی امداد ترک کر کے الحاق ختم کرنے پر رضامند نہ ہوئے تو طلبہ وہ تمام ذرائع استعمال کریں گے جو ان کے اختیار میں ہیں اور کالج کو خلافت کمیٹی کی نگرانی میں دے کر ایک قومی تنظیم کی شکل دے دیں گے۔ ایک اور تجویز میں خطاب یافتہ اساتذہ سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت کے اعزازی عہدوں سے مستعفی ہو جائیں اور وظیفہ پانے والے طلبہ وظیفہ ختم کردیں؛ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انکا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ اس طرز عمل کی سخت مذمت کی گئی جو حکومت برطانیہ نے ترکی کے خلاف اختیار کر رکھا تھا اس سلسلہ میں خلافت کمیٹی کی تجویز کی دل سے تائید کی گئی۔ ان تمام قراردادوں کی تائید میں حاضرین نے قسمیں کھائیں اور ان کی تکمیل کے لیے حلف تک اٹھائے۔ اس سلسلے میں اخبار "انڈی پینڈنٹ" نے لکھا کہ "کالج میں صورت حال بہت ہی امید افزا ہے۔ طلبہ میں بڑا جوش ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد روزانہ ہر بورڈنگ ہاؤس میں قومی ترانہ گایا جاتا ہے اور خلافت کے لیے بڑے جوش و خروش سے چندہ جمع کیا جارہا ہے۔"

ان سرگرمیوں کے پیش نظر ڈاکٹر ضیاء الدین نے طلبہ کے والدین کو خطوط لکھ کر اور تار کے ذریعہ اطلاع دے دی کہ "حالت بہت نازک ہو چلی ہے اس لیے وہ اپنے بچوں کو کالج سے لے جائیں"۔ اخبار "ٹریبون" کی ۲۳ر اکتوبر کی اشاعت میں بتایا گیا کہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور قاضی عبدالغفار نے خلافت کمیٹی کے اراکین سے

تعلیمی محاذ

خاموش دفاع

تیسرا محاذ مثبت اقدام یا خاموش دفاع کا تھا، وہ یہ کہ مسلمانوں میں علوم اسلامیہ کی اشاعت کی جائے اور ان کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کیا جائے، تاکہ سیاسی قوت کے زوال کے بعد بھی ان کی علمی، فکری اور شعوری قوت زوال پذیر نہ ہو، ان میں منصوبہ بند اقدامات کی صلاحیت باقی رہے، وہ اسلام پر ہونے والے حملوں کی اصلیت جان سکیں، افواہوں اور غلط فہمیوں سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین وملت کے وقیع اثاثوں اور اسلاف کے قیمتی سرمایوں کی حفاظت کر سکیں، ہندوستان میں بکھرے ہوئے اسلامی شعائر وآثار کو آباد اور محفوظ رکھ سکیں اور ہندوستانی اقدام کی صحیح اخلاقی وفکری قیادت کر سکیں۔

اس محاذ پر بھی سوائے حضرت نانوتوی کے کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا، جس نے اس قدر منصوبہ بند طور پر کام کیا ہو، حضرت نانوتویؒ نے اس کے لئے چند علماء ومشائخ کے تعاون سے ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی، جو ۱۸۵۷ء کی جنگی سیاست کا نعم البدل تھا۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب فرماتے ہیں:

> حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد منیر صاحب اور ان کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب کو ہندوستان چھوڑا گیا اور ابھی شہیدوں کا خون خشک ہونے نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے حلقے قائم کر دیئے، جنہوں نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کیا، مگر دین ومذہب (جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا) اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدے کے مطابق وطنی سیاست اور جدوجہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔(۱۵)

چنانچہ دارالعلوم دیوبند اپنے نصب العین اور مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ ایک طرف اس نے امت کو انتہائی قیمتی رجال کار دیئے، جنہوں نے ملک وملت کی کشتی ساحل سے ہمکنار

---

(۱۵) شاندار ماضی ۴/ ۲۸۷۔

ملاقات کر کے اپنے قومی تعلیمی ادارے سے متعلق منصوبہ کا اعلان کر دیا جس کے تحت مولانا محمد علی اس کے پرنسپل ہوں گے' مولانا آزاد صدر شعبہ دینیات ہوں گے اور یہ کہ نیشنل مسلم یونیورسٹی ۲۹/ اکتوبر سے اپنا کام شروع کر دے گی جس میں کالج اور ہائی اسکول کے تمام درجات کی تعلیم دی جائے گی جن میں علوم شرقیہ کو اہمیت حاصل ہو گی۔

انجام کار ۲۹/ اکتوبر کو بروز جمعہ ایم اے او کالج کی مسجد میں بعد نماز جمعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں ادا ہوئی۔ ان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ جگر بڑھ گیا تھا' بخار مستقل رہتا تھا تاہم انھوں نے جامعہ کی تاسیس کے جلسہ کی صدارت کے لیے دیوبند سے علی گڑھ آنا قبول کر لیا تھا۔ حکیم اجمل خاں نے نہایت معنی خیز تقریر کی اور شیخ الہند کی صدارت کی تجویز پیش کی اور حاضرین پر واضح کیا کہ کس طرح انھوں نے حکومت کے ہاتھوں شدید اذیتیں برداشت کیں اور مالٹا میں اسارت کی مدت گزاری۔ حاجی موسیٰ خاں نے صدارت کی تجویز کی تائید کی۔ جلسہ سے پہلے مولانا سے استدعا کی گئی کہ وہ کمرے میں جا کر آرام کریں لیکن انھوں نے جلسہ میں موجود رہنے کو ترجیح دی البتہ شیخ الہند کی علالت کے سبب ان کا خطبہ صدارت ان کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا جس میں مولانا نے فرمایا:۔

> "اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔۔۔"

خطبہ کے اختتام کے بعد شیخ الہند ناظم دینیات کے کمرہ میں تشریف لے گئے اور صدارت کی ادائیگی مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے کی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے خطبہ کے بعد "مولانا محمد علی کھڑے ہوئے، بڑے وقار کے ساتھ۔ نورانی چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ آواز میں رقت تھی۔ پھر تقریر شروع کی بڑی زبردست اور حد درجہ موثر تقریر تھی تمہید کے بعد یونیورسٹی (نیشنل مسلم یونیورسٹی) کے اغراض و مقاصد سمجھائے اس کا تاریخی پس منظر پیش کیا۔ ایک آزاد درسگاہ کے تصور کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ سر سید کی پالیسی کی بڑی قابلیت سے وضاحت کی اور اس کی حمایت میں سر سید کے جانشینوں کی مذمت کی کہ انھوں نے سر سید کو غلط سمجھا اور ان کی پالیسی کی غلط تعبیر کی۔ اچھی تعلیم کی خصوصیات بتائیں۔ موجودہ

کرنے کی کوشش کی، تو دوسری طرف اس نے ملک وبیرون ملک علمی فضا کی تشکیل کرنے اور دینی مدارس ومکاتب کا جال بچھانے میں بنیادی رول ادا کیا، اگر دارالعلوم دیوبند کا موجودہ نظام تعلیم اور مدارس ومکاتب کا موجودہ سلسلہ اس ہندوستان میں نہ قائم ہوا ہوتا، تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ نئے ہندوستان کا نقشہ کیا ہوتا اور غیر اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی، سیاسی اور علمی ڈھانچا کیا تیار ہوتا؟

ڈاکٹر اقبال ان مدارس کو ہندوستان میں دین کا سب سے مضبوط دفاعی محاذ اور تحفظ اسلام کا سب سے مستحکم قلعہ قرار دیتے ہیں۔

انہوں نے اپنے ایک نیاز مند حکیم احمد شجاع کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا، جو تم چاہتے ہو، انقلاب، ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔

یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ —جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اس طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ (۱۶)

جو نکتہ ڈاکٹر اقبال نے تجربہ کے بعد سمجھا تھا وہ حضرت نانوتوی کی نگاہ دوررس نے پہلے ہی پالیا تھا اور ملت ہندیہ کی بقاء وتحفظ کے لئے اس جانب وہ پہلے ہی قدم اٹھا چکے تھے، اللہ ان کو ساری امت کی طرف سے جزائے خیر سے نوازے آمین۔

اس مختصر سے مضمون میں تحفظ دین کے لئے حضرت نانوتوی کی جملہ مساعی جمیلہ کو بیان کرنا ممکن نہیں، یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا اس کی حیثیت محض ایک نذرانۂ عقیدت سے زیادہ نہیں۔☆

---

(۱۶) اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۳۷۴، ۳۷۵

تعلیم کے نقائص کھل کر بیان کیے۔ آخر میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے جو مظالم اس دور میں طلبہ پر ہوئے تھے (مثلاً پانی بند کر دینا، کھانا موقوف کر دینا، روشنی سے محروم کر دینا وغیرہ) ان کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جیسے کوئی ذاکر حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا اور کربلا کے واقعات کا ذکر کر رہا ہو۔ تمام جلسہ مجلس عزا بن گیا۔ ہر طرف سے رونے اور سسکیاں لینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حاضرین پر رقت طاری تھی اور آنکھیں اشک بار تھیں۔

اس کے بعد ایک فتویٰ سنایا گیا جو علی گڑھ کے ان طلبہ کے سوالات کے جواب میں تھا جو انھوں نے اپنے والدین کی جانب سے کیے تھے۔ فتوے میں کہا گیا تھا کہ ہندو بھائیوں کی ہمدردی کا جواب اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر خلافت کا تحفظ، پنجاب کے ساتھ انصاف اور سوراج کا حصول عمل میں لایا جائے۔ یہ خواہش ترک موالات سے ذرا بھی متصادم نہیں تھی کیونکہ حکومت نے علی الاعلان اسلام اور خلافت کی مخالفت کی تھی اس لیے اسلام کے معاملے میں والدین کی بات بھی نہ ماننا درست تھا۔

مولانا محمد علی اور جامعہ کے اولیں طلبہ اولڈ بوائز لاج میں مقیم تھے مگر انھیں اپنے مستقر سے باہر نکل جانے کے احکامات جاری کر دیے گئے اور انھیں باہر نکال دینے کے لیے پولیس کی مدد لی گئی۔ اس کی تفصیل ایک طالب علم کی زبانی ہی سنیے:۔

"آخر میں وہ دن بھی آیا جب ہم لوگ کالج کی چہار دیواری سے نکالے گئے۔ وہ بھی ایک یادگار دن تھا۔ ایک صبح کو ہم سو کر اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسلح پولیس ہزاروں کی تعداد میں کالج کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ سپاہی بندوقیں تانے سنگین لگائے اٹینشن کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ جانتے تھے کہ ایک دن ایسا ہونے والا ہے۔ اس لیے گھبرائے نہیں بلکہ خوشی سے اور جوش سے معمور تھے۔ طلبہ اپنے کمروں سے نکل کر سپاہیوں کے قریب جاتے، بندوق چومتے اور سنگینوں کو اپنے سینے سے لگاتے اور کہتے کہ کاش یہ میرے سینے کے پار ہو۔ پولیس والے بھی طلبہ کے اس جذبہ کو دیکھ کر متاثر ہوتے، لیکن خاموش رہتے۔

"ہم لوگ ایک جلوس کی شکل میں مارچ کرتے ہوئے جب کالج کے احاطے سے نکلے تو وہ بھی عجیب اثر انگیز منظر تھا۔ ہم لوگوں کے دلوں کی جو کیفیت تھی وہ تو تھی ہی، سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہزاروں آدمی تماشائی تھے۔ ان سب پر رقت طاری تھی۔ آنکھیں اشکبار تھیں اور سسکیاں

◄◄ دوسرا باب ►►

آراءوافکار

بندھی ہوئی تھیں۔ مولانا محمد علی سالار قافلہ تھے۔ ہم لوگ ان کے پیچھے
قدم سے قدم ملائے ایک فوج کی طرح مارچ کر رہے تھے یہ قافلہ "مکہ" سے
"مدینہ" کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اس وقت دلوں کی جو کیفیت تھی وہ
عجیب تھی، ناقابل بیان تھی۔ جوش تھا، خوشی تھی، سرور تھا اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ہم لوگ کوئی بہت بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہیں۔ محض "مکہ" ہی
فتح کرنا نہیں ہے بلکہ سارا ہندوستان فتح کرنا ہے۔ یہ ایک خواب تھا' لیکن خدا
نے اس کو سچ کر دکھایا۔ بالآخر ہندوستان فتح ہوا۔ ملک آزاد ہوا۔ طلبہ کا ترک
موالات کرنا اور اپنی مادری علمی کو چھوڑنا اس وقت بڑی حماقت سمجھی جاتی تھی
لیکن یہ اسی حماقت کا نتیجہ تھا کہ ستائیس برس بعد فتح عظیم حاصل ہوئی"۔

حکیم اجمل خاں جامعہ کے اولین امیر جامعہ' مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ، حاجی موسیٰ خاں اس کے سیکریٹری اور تصدق احمد شیروانی جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ مولانا محمد علی جامعہ کی ہر اہم کمیٹی کے رکن تھے وہ مجلس امنا' مجلس انتظامیہ' نصاب کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے جامعہ سے وابستہ ہوئے تاہم جب سیاست نے انھیں بری طرح الجھالیا تو عبدالمجید خواجہ شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اولین ابتدائی سال بے یقینی اور ہنگامی حالات میں گزرا اس کے باوجود تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا لیکن یہ تعلیم کسی نصاب کے مطابق نہیں تھی بلکہ غیر نصابی سلسلہ پر مشتمل تھی جس میں اپنے وقت کے مسلم الثبوت ماہرین تعلیم درس دیا کرتے تھے۔ دراصل بانیان جامعہ کے ذہنوں میں جامعہ کا کوئی مستقل نقشہ موجود نہیں تھا اور مولانا محمد علی تو اسے مستقل ادارے کی شکل میں تبدیل کرنے کے سراسر خلاف تھے۔ وہ اس نئی دانش گاہ کے قیام کو محض وقتی اور عارضی تصور کرتے تھے ان کا یہ فیصلہ تھا کہ ایم اے او کالج کی حیثیت کو تبدیل کرنے کے بعد ایک دن جامعہ کے لوگوں کو وہیں مراجعت کرنا ہے، تاہم ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مولانا محمد علی نے ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں یہ تجویز منظور کرائی کہ جب تک نیا نصاب تعلیم تیار ہو کر نہیں آجاتا مجوزہ نصاب ہی کو اصلاح و ترمیم کے ساتھ جاری رکھا جائے اور اس میں دینیات کے مضمون کا اضافہ کر دیا جائے اسی جلسہ میں نیا نصاب مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر سر محمد اقبال' مولوی عبدالحق' مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولوی

صدر الدین، ڈاکٹر انصاری، محی الدین، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولوی عنایت اللہ، پرنسپل ایس کے رودررا، پرنسپل گڈوانی، پروفیسر سہوانی، سی۔ ایف اینڈریوز، جواہر لال نہرو، راجندر پرساد اور سید سلیمان ندوی شامل تھے۔ مولانا محمد علی کو نصاب مرتب کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا اندازہ خود انہی کے الفاظ سے ہوگا جو انھوں نے نصاب کے مقدمہ میں تمہید کے طور پر قلم بند کیے تھے:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس بنائیہ کا پہلا جلسہ علی گڑھ میں بتاریخ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء منعقد ہوا جس میں ایک چھوٹی سی جماعت جامعہ ملیہ و نیز مدارس ملحقہ کے واسطے ایک نصاب تعلیم بنانے کے لیے مقرر کی گئی۔ میں اس جماعت کے مختلف ارکان سے وقتاً فوقتاً ملا اور ان سے اس کام کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا جو اس جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن بسلسلہ تحریک ترک موالات اس قدر مصروفیات رہیں کہ ممبران جماعت کی باضابطہ یک جائی دشوار ہو گئی۔ تاہم ایک مجلس کا انعقاد آخر مارچ میں بمقام بنرواڑہ قرار پایا جس میں ان ممتاز ماہرینِ فن کو دعوت دی گئی جو تحریکِ ترکِ موالات کے کاموں میں یا قومی درس گاہوں کے کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ گو اس جلسہ میں بھی حسب منشا ہم تبادلۂ خیالات کو اختتام تک نہ پہنچا سکے تاہم ان لوگوں سے جو اس جلسے میں شریک ہوئے اکثر ان تعلیمی مباحث پر گفتگو ہوئی جن پر کسی قابل اطمینان نتیجہ پر پہنچے بغیر کوئی مناسب نصاب تعلیم تیار نہیں ہو سکتا۔ خوش قسمتی سے اس جلسے میں ہم کو گجرات ودیا پیٹھ (یونی ورسٹی یا دارالعلوم) احمد آباد کے نظام عمل سے جو سری جت گڈوانی صاحب پرنسپل اور سری جت کلیکر صاحب ہیڈ ماسٹر کے زیر انتظام سے آگہی ہوئی۔ آخر کار جلسہ کا خاتمہ اس فیصلہ پر ہوا کہ جہاں تک ہو سکے شروع مئی میں ایک مجلس پھر منعقد ہو جس میں وہ احباب جو ان درسگاہوں سے متعلق ہیں فنونِ مختلفہ کے لیے کار آمد ہوں شرکت فرمائیں اور گجرات ودیا پیٹھ کے موجودہ نصاب تعلیم کو مبحث قرار دے کر متفقہ طور پر ایک عام خاکۂ تعلیم تیار کیا جائے جس پر تمام قومی درس گاہیں بعد ضروری ترمیمات کے جو مقامی حالات کے لحاظ سے کسی درس گاہ کے لیے ناگزیر سمجھی جائیں کار بند ہوں۔ بد نصیبی سے یہ مجلس بھی بوجہ غیر معمولی ضروریات تحریکِ

ڈاکٹر شمس تبریز خاں*

فکرِ قاسمی کے چند اساسی رجحانات

عوامل و محرکات:

فکرِ قاسمی یا حکمتِ قاسمیہ کے بنیادی عوامل و محرکات کچھ اسی قسم کے تھے جو فتنۂ تاتار کے نتیجے میں تباہی بغداد اور خلافت عباسیہ کے خاتمے کے بعد اسلامی ثقافت کے احیائے نو اور نشاۃ ثانیہ کے لیے فکر مند علماء و مشائخ اور مسلم مفکرین و قائدین کے دلوں اور دماغوں میں کارفرما تھے، فتنۂ تاتار کی شدت ہندستان کی مغل حکومت کے خاتمے کے مقابلے میں اس لیے کم تھی کہ وہاں تاتاری صنم خانے سے ہی کعبہ کے پاسبان اور پشتی بان میسر ہو گئے اور تاتاریوں نے مسلمان ہو کر خلافتِ عثمانیہ، کی شکل میں ملت اسلامیہ کو خلافتِ عباسیہ کا نعم البدل فراہم کر دیا اور اسلامی اقتدار کو وی آنا Vianna کی فصیلوں تک پہنچا دیا تاتاری حملہ ایک وحشیانہ حملہ تھا جس سے اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار و نقوش کو نقصان پہنچا مگر اسلامی علوم و فنون اور اسلامی فکر و دانش کا اتنا نقصان نہیں ہوا کیونکہ تاتاریوں کے پاس اسلامی فکر و فن کے مقابلے میں کوئی فکری و ثقافتی طاقت نہ تھی جبکہ ہندستان میں برطانوی اقتدار کے ساتھ مغربی مذاہب و تہذیب، اور مغربی فکر و فلسفہ، مغربی صنعت و حرفت بھی جارحانہ عزائم کے ساتھ سرگرم عمل تھی اور ہندستانی عوام خاص طور سے ہندستانی مسلمانوں کو مغربی استعمار کے ہمہ گیر سیاسی و تہذیبی، فکری و علمی، دینی و مذہبی جارحیت کا سامنا تھا۔ اس لیے ہمارے بزرگوں، خاص طور سے اکابر دیوبند کو دوہری مشکلات سے عہدہ برآ ہونا اور مسلمانوں کی سیاسی محرومی، تہذیبی و مذہبی تباہی، اور علمی و فکری بربادی کے کھنڈر اور ملبے پر کم از کم مذہبی و تہذیبی اور علمی و فکری فصیلیں اور شہر پناہیں تعمیر کرنا تھیں جن میں دین و مذہب اور اسلامی ثقافت کے سرمائے کی حفاظت اور ممکن حد تک اشاعت کی جا سکے۔

اکابر دیوبند کو ہندستان سے مسلم اقتدار کے خاتمے کا جو صدمہ تھا وہ انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات اور عملی اقدامات" سے واضح تھا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت

---

* استاذ شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

ترک موالات کے اب تک منعقد نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن سری جت گڈوانی صاحب، سری جت کلکر صاحب جنھوں نے اس خاکہ تعلیم اور نصاب کی، جس پر گجرات ودیا پیٹھ سر دست کاربند ہے پوری تشریح کی۔ تصدق احمد خاں صاحب شیروانی بی اے (کیمبرج) موجودہ سیکریٹری جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولوی محمد علی صاحب بی اے (کیمبرج) سابق پرنسپل حبیبیہ کالج کابل، ان کے والد ماجد مولوی عبدالقادر پریزیڈینٹ پنجاب خلافت کمیٹی و نیز ان کے بھائی مولوی محی الدین صاحب قصوری سے مجھے تبادلہ خیالات کا ایک موقع پھر مل گیا۔ چنانچہ بمشورۂ احباب متذکرہ بالا وبہ امداد تجاویز خواجہ عبدالمجید صاحب بی۔ اے (کیمبرج) موجودہ پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ و نیز دیگر اساتذۂ جامعہ ایک خاکہ نصاب تعلیم کا ایسا تیار کیا گیا ہے جو جلد بغرض غور و فکر و مباحثہ ماہرین فن کو دیا جائے قبل اس کے کہ جامعہ ملیہ اور اس کے ملحقہ مدارس کے لیے وہ ایک مستقل نصاب تعلیم قرار پائے۔"

اس نصاب تعلیم میں مولانا محمد علی نے قرآن کریم' دینیات اور تاریخ کو فوقیت دی۔ ایام اسیری میں چھندواڑہ میں قیام کے دوران وہ قرآن کریم کے باقاعدہ اور بلاناغہ مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے اور انھیں اس کی تعلیمی افادیت کا احساس ہو چکا تھا اسی لیے انھوں نے اس کی تعلیم کو لازمی جزو قرار دیا اور جامعہ کے نصاب میں اسے اولیت دے کر تاریخ اور سائنس کی تعلیم کو بھی ضروری ٹھہرلیا۔ تعلیم دینیات کا نصاب مرتب کرنے کے لیے مولانا محمد علی کا نام تجویز ہوا اور مولانا آزاد سبحانی، مولانا سلامت اللہ' مولانا صدرالدین' مولانا عبدالقیوم' مولانا داؤد غزنوی' مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالقادر' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی پر مشتمل کمیٹی کو اس کی ترتیب کا اختیار دیا گیا۔

مضامین میں آرٹس کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا' ابتدائی، ثانوی اور اعلا درجات میں صنعت و حرفت کو اہمیت دی گئی۔ قفل سازی، الکٹرو پلیٹنگ، پالش' صحافت' کپڑا بننا' جلد بندی' لیتھو اور ٹائپ کی طباعت، تصویریں' لائن اور ہافٹون بلاک بنانے، کاپی رائٹنگ' شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا، اس نصاب میں سائنس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کو درس میں داخل کیا گیا، ریاضی اور ڈرائنگ کے مضامین کے بارے میں بھی نصاب میں گنجائش رکھی گئی تھی۔ تدریس کے طریقوں میں تبدیلی پر اصرار کیا گیا تھا۔ اور ریڈرس کی تیاری پر زور دیا گیا ایک گریجویٹ کے تحصیل علم کو ایم اے کی ڈگری کے

مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ روایات کے امین اور ان کے جانشین ہونے کے سبب ان اکابر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی قیادت کی، اور یہی جذبات ورجحانات ان کے جانشینوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ وغیرہ کے حصے میں آئے اور دارالعلوم دیوبند مغرب کے فکری وسیاسی اقتدار کے لیے چیلنج بنا رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بقول ''دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کی تلافی کے لئے قائم ہوا تھا'' اور اسے ان مجاہد علماء نے قائم کیا تھا جنہوں نے شاملی کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے عتاب کا نشانہ بنے تھے، اس طرح سیاسی شکست کے بعد انگریز حکمرانوں سے مورچہ لینا اور دین ومذہب کو علمی وعملی طور پر قائم رکھنے کے لئے سازگار فضا اور ماحول بنانا بلاشبہ ایک انقلابی وتعمیری، تجدیدی واجتہادی کارنامہ تھا جس کے اثرات وثمرات سے برصغیر اور دیگر ممالک کے مسلمان اب تک مستفید ہو رہے ہیں اور حکمت قاسمیہ اپنی اصالت وصلابت کی بدولت طاقت کا سرچشمہ بن کر مسلمانوں میں مذہبی وتہذیبی زندگی اور فکری وثقافتی سرگرمیوں کی محرک بنی ہوئی ہے۔

بنیادی عناصر ورجحانات

اسلامی فکر کے کسی بھی دبستان کی طرح 'فکر قاسمی' یا 'حکمت قاسمیہ' کے بنیادی عناصر میں بھی کتاب وسنت کی تعلیمات اور توحید ورسالت اور آخرت کے ابعاد ثلاثہ روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی فکری وعملی سرگرمیوں کا مصدر ومحور بنے ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اسلام کے ہمہ گیر فکری وثقافتی، سیاسی ومعاشرتی، مذہبی وتہذیبی غلبہ واقتدار کے تصور پر مبنی ایک عملی فلسفہ اور نظام حیات ہے جو اپنے تاریخی وتہذیبی تسلسل کے ساتھ اکابر دیوبند تک پہنچا ہے، دین کا جو جامع وکامل تصور شاہ ولی اللہؒ نے پیش کیا تھا۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے اسی کی تجدید کرتے ہوئے علمی وعملی سطح پر اس کے نفاذ اور اس کی ترویج واشاعت کی کوشش کی۔ فکر قاسمی کا بنیادی عنصر اسلام کے اصول ومبادی اور اس کی اولیں روایات کی اصلیت واصالت کی حفاظت وصیانت اور بدعت وتحریف، اور ترمیم وتبدیلی سے گریز کے ساتھ زمان ومکان کی رعایت، عصری مشکلات ومطالبات کو پیش نظر رکھنا ہے جس کی بدولت دین اپنی اصلیت وماہیت کو بدلے بغیر اپنی روایت کو تجدیدی واجتہادی تسلسل کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ایک جامع اور مثالی وعملی نظام حیات فراہم کرتا ہے۔

مساوی بنانے کے لیے نصاب میں اضافے کیے گئے۔ اسی طرح ہندوستان کی جامعات ملیہ اسلامیہ کے لیے نصاب تعلیم بھی مرتب کیا گیا۔ اس نصاب اور تعلیم کی اس اسکیم کو مولانا محمد علی نے خود مرتب کر کے ۹ر جون ۱۹۲۱ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے بمبئی میں پیش کیا تھا۔

مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کے قیام کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اس ادارہ کے مقاصد اور طریقۂ تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:۔

"ہمارا مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں۔ جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سمجھا کر دی جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بنا پر منزل ابتدائی سے آگے پڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو قرآن مقدس صرف ناظرہ ہی پڑھ لے"۔

اس سلسلے میں مولانا نے مزید تحریر کیا کہ:

"بچوں کے دل میں یہ بخوبی واضح کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات، عقائد اسلامی کی صداقت' احکامِ اسلام کی عملی سودمندی اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرنے پر مبنی تھے۔ اور ہم اگر پھر اپنی گمشدہ عظمت کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کاربند ہو جائیں اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلیں"۔

اس تفصیل سے نصاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کس قدر دلچسپی تھی اور وہ تعلیم کو مسلمانوں کی زندگی میں کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

یہ مولانا محمد علی کی مقناطیسی شخصیت ہی تھی جس نے بہترین اساتذہ کو جامعہ میں

'فکر قاسمی' کوئی فلسفیانہ مکتب فکر نہیں بلکہ کتاب وسنت کی جامع تعلیمات کے علم اور اس کے مطابق نظام فکر وعمل کا نام ہے جس میں کلامی طور سے اہلسنت وماتریدیت، فقہی طور سے حنفیت اور وقت ضرورت دوسرے مسالک فقہ سے استفادہ، وجدانی طور سے احسان وتصوف اور سیاسی طور سے اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دین اسلام کے عناصر ور جحانات نمایاں ہیں۔(۱)

'فکر قاسمی' کا ایک امتیاز اس کی عملیت اور زندگی میں قابل نفاذ ہوتا ہے۔ جو فلسفیانہ خیال آرائی وموشگافی کے بجائے ایک واضح نظام فکر وعمل ہے، جس کی روح اتباع سنت اور جس کی مثالی شخصیتیں صحابہ وتابعین وسلف صالحین ہیں اس کا مقصد ومنہاج دین کی روایت کو پوری امانت و دیانت کے ساتھ آئندہ نسلوں اور زمانوں تک پہنچانا ہے، اس لیے اس میں مصلحت ومصالحت، مداہنت ومفاہمت پر مبنی رویے سے گریز وپرہیز بہت نمایاں ہے، اس میں مجاہدہ بھی ہے اور جہاد بھی، اس میں تزکیۂ نفس اور اصلاح وتربیت بھی ہے اور سلطنت وحکومت بھی اس میں دنیا کی امامت بھی ہے اور خلافت بھی غرض اس میں دین و دنیا، مذہب وسیاست دوش بدوش ہیں اور جدت وقدامت کا خوشگوار امتزاج موجود ہے۔

دین کی کاملیت وجامعیت کا یقین اتباع سنت، دین کی ابدیت اور ہر مقام اور ہر زمانے کے لیے اس کی صلاحیت پر اعتماد اور اہل سنت والجماعت کے فرقۂ ناجیہ کی خصوصیات وصفات اپنائے رہنے کی سعی پیہم اور جہد مسلسل، سیاسی اقتدار نہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت اور شیرازہ بندی، اور کتاب وسنت کی تعلیمات سے تمسک، طاقت ووسعت بھر دین کی عملی پیروی، اسلام کے فکری وثقافتی؛ تہذیبی ومعاشرتی، عائلی واجتماعی، شرعی واخلاقی نظام کو عملی طور سے برتنے، غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت وپیغام کو پہنچانے کی انفرادی واجتماعی اور امکانی کوشش اور غلبۂ دین و اعلاء کلمۂ حق کی تمنا بھی 'فکر قاسمی' کے اصول وفروع میں شامل ہے۔

موضوعاتِ فکر ونظر

ہندستان پر برطانوی اقتدار کے عروج کے ساتھ عیسائی مشنری سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ اسلام کے مذہب وتہذیب کو بھی معاندانہ اعتراضات کا نشانہ بنایا

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "عقائد علمائے دیوبند" از مولانا محمد طیب صاحب"

لا کھڑا کیا۔ ان میں عبدالمجید خواجہ تھے جو مولانا کی عدم موجودگی میں شیخ الجامعہ کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے اور جب مولانا کو پوری طرح سیاست نے اپنالیا تو وہی ذاکر صاحب کی جامعہ میں آمد تک اس کے شیخ الجامعہ رہے اور ڈاکٹر انصاری کی وفات کے بعد تاحیات امیر جامعہ رہے۔ اسی طرح کیلاٹ صاحب، طاہر صاحب اور دیگر اساتذہ تھے جو اپنے اچھے اور تابناک مستقبل کو خیر باد کہہ کر مولانا کے جامعی قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔

جامعہ میں نصاب تعلیم کے مرتب ہونے سے پہلے ہی مولانا محمد علی نے "اسلام اور اسلامی زندگی" کو اپنے لکچروں کا موضوع بنالیا تھا۔ انھوں نے ان لکچروں کا آغاز ان ابتدائی دنوں ہی سے کر دیا تھا جب جامعہ ملیہ علی گڑھ میں خیمہ زن تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین ان دنوں کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

> "مولانا محمد علی جب بولتے تھے تو فصاحت و بلاغت کا دریا بہادیتے، گھنٹہ، دو گھنٹہ چار گھنٹے متواتر تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ سننے والے ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سننے سے سیری ہوتی ہی نہیں۔ صبح ناشتے کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا تو ڈیڑھ دو بج جاتے۔ لکچر دینے والے اور لکچر سننے والے ایسا لگتا تھا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ یہ دنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علی لکچر دینے کے دوران اقبال کی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کے اشعار کی توضیح کرتے۔ لڑکے ہیں کہ نوٹ لکھ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا نے جو فرمایا اس میں سے کچھ رہ جائے لفظ بلفظ نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ لکچر کے بعد آپس میں مقابلہ کر کے اپنے نوٹ مکمل کر لیتے۔ بعض طلبہ زود نویس تھے جن کی تحریروں کی بڑی مانگ ہوتی۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ مولانا کی تقریر میں سے ایک لفظ بھی چھوٹ نہ جائے...... مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا پڑ جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے"۔

مولانا اپنے لکچر کے دوران ایک شعر پڑھتے اور گھنٹوں تک اس کی تفسیر کرتے رہتے تھے۔ درمیان میں قرآن کریم کی آیات تلاوت کرتے اور احادیث کے حوالے دیتے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول "ان کے دینی جذبہ کا اخلاص غیر مشتبہ تھا اس لیے ان کی ہر بات دل میں اثر کرتی تھی۔ مولانا کی تعلیم و تربیت سے ہر نوجوان میں ایک خاص لگن پیدا ہو گئی جس کی مثال ملنی دشوار ہے"۔

جانے لگا، پھر ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت انگریزوں کے اشارے پر دیانند سرسوتی اور آریہ سماج کے دیگر پنڈتوں نے اسلام پر اُلٹے سیدھے اور مضحکہ خیز اعتراضات شروع کر دیے جن کے بہت سے مضحک نمونے ''ستیارتھ پرکاش'' اور آریہ سماجی لٹریچر میں دیکھے جاسکتے ہیں جن میں اسلام اور اسلامی تہذیب پر سطحی، طفلانہ بلکہ جاہلانہ اعتراضات کیے گئے ہیں جو مغالطہ دہی اور تمسخر و استہزاء اور کینہ وعناد کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں، اس کے علاوہ دیانند جی کی ان تحریروں میں خود ہندو پنڈتوں کے خیال کے مطابق ویدوں کی تعبیر وتشریح میں پرانی روایت سے انحراف اور تحریف کا انداز نمایاں ہے جس سے کام لے کر اور سناتن دھرمی اصول سے ہٹ کر ہندوازم کی وہ ایسی تعریف وتعبیر کرتے ہیں جس میں جارحانہ قوم پرستی کی جھلک موجود ہے۔

اس وجہ سے حضرت نانوتویؒ نے عیسائیت کے ساتھ آریہ سماجی ہندوازم کے اعتراضات کے دفاع اور جواب کی طرف توجہ کی اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے انہیں لاجواب کر دیا۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنے جواب میں صرف دفاعی انداز نہیں اختیار کیا بلکہ ضرورت کے تقاضے سے اقدامی اور الزامی سوال وجواب بھی دیے ہیں۔ پھر مغربی انداز فکر اور سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی تعلیمات، توحید ورسالت اور آخرت سے جو بے زاری وبے توجہی اور الحاد پسندی پیدا ہو رہی تھی اس کی طرف بھی حضرت نانوتویؒ نے توجہ کی اور مذہب وغیبی حقائق کے لیے عقلی ومنطقی دلائل وبراہین پیش کیے جو الحاد ودہریت اور نیچریت سے متاثر ذہنوں کے لیے چشم کشا اور بصیرت افزا ثابت ہوئے۔

عیسائیت اور ہندوازم کے بعد انھوں نے تشیع، بدعت، اور بعض فقہی وکلامی واختلافی مگر ضروری مسائل کی توضیح وتشریح کو اپنا موضوع بنایا مگر اہل قبلہ اور کلمہ گو حضرات کے جواب دیتے ہوئے انھوں نے اختلاف کو مخالفت کا رنگ دینے سے شعوری طور پر پرہیز کیا ہے اور مناظرانہ انداز سے بچتے ہوئے علمی وتحقیقی مباحث تک اپنے کو محدود رکھا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے جس فراست ایمانی، حمیت دینی، بالغ نظری اور اولوالعزمی سے کام لے کر عیسائیت اور آریہ مت کے جارحانہ عزائم کو شکست دی اس کا اعتراف بہت سے اہل نظر نے کیا ہے لیکن ان کے معاصر عالم اور اہم تذکرہ نگار مولوی رحمٰن علی صاحب کی یہ شہادت بہت اہمیت رکھتی ہے کہ:

''حضرت مولاناؒ نے مباحثۂ مذہبی میں پادری تاراچند کو ساکت کر دیا، اور ۱۲۹۳ھ میں چاندا پور ضلع

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہی کے الفاظ میں:

"مولانا کے درسوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ نوجوان قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے جیسے کوئی مدتوں سے بھولی ہوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہو۔ صبح فجر کی نماز کے بعد پابندی سے قرآن کی تلاوت ہوتی۔ ترجمے اور تفسیریں پڑھی جاتیں۔ نماز اور روزے کی پابندی خوش دلی سے کی جاتی نہ کہ جرمانے کے ڈر سے۔ ان سب باتوں میں چاہے کسی کو رومانیت نظر آئے لیکن ان کا اخلاص غیر مشتبہ ہے' جس سے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس دینی جذبہ کا مقصد نمائش نہ تھا بلکہ اپنی ذات کی اصلاح اسلامی تعلیم کے ذریعے تھی۔ بعض نوجوان جو ایم اے او کالج میں 'چہ غم' کے اصول کے ماننے والے کھلنڈرے مشہور تھے راتوں کو اٹھ کر نمازیں پڑھتے اور مسجدوں میں گڑگڑاتے۔ یہ منظر مسلمان نوجوانوں کی اجتماعی زندگی میں بھلا کاہے کو دیکھنے میں آئے گا۔"

جامعہ کے قیام کے بعد مولانا محمد علی جامعہ سے متعلق سرگرمیوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ خلافت کے مسائل و معاملات میں الجھے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جامعہ کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکے اور لیلائے سیاست کے اسیر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس کی صدارت کا بار ان کے کاندھوں پر آیا تو انھوں نے اس میں ایک تجویز پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ:

"مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کی خاطر گورنمنٹ کی ملازمت ترک کر دیں کیونکہ اس ملازمت میں رہ کر انھیں مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں اور چند سکوں کی خاطر اپنے ہاتھوں اپنے مقدس مقامات کو تباہ کریں۔ یہ امور شریعت اسلامیہ کے منافی ہیں۔ قرآن مجید میں صاف و صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ من قتل مومناً معتمداً فی جزاؤہٗ جہنم (جس کسی نے جان بوجھ کر اپنے مسلمان بھائی کو قتل کیا اس کی جزا جہنم ہے) لہٰذا مسلمان احکام خداوندی کی خلاف ورزی کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کریں"۔

ہندوستان کے علماء و فضلا نے اس تجویز کی زبردست تائید کی اور قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا کہ برطانوی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ تھا۔ کانفرنس کے ہر گوشہ سے اس کی تائید و حمایت کی گئی ستمبر ۱۹۲۱ء میں جب مولانا مدراس جا رہے تھے تو کراچی کانفرنس کی اس

شاہجہاں پور کے میلۂ خداشناسی میں جہاں ہر مذہب کے علماء جمع تھے مولانا علیہ الرحمہ نے علی رؤس الاشہاد ابطال تثلیث وشرک اور اثبات توحید کا ایسا بیان فرمایا کہ موافق ومخالف تمام حاضرین جلسہ کے دہنوں پر مہر سکوت لگ گئی، اور ۱۲۹۴ھ میں انہوں نے وجود باری وتوحید پر دیانند سرسوتی اور عیسائیوں کے تحریف انجیل پر بحث کی جس پر پنڈت مذکور سر بگریباں ہو گئے اور عیسائی پادریوں نے کتابیں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اس سلسلے میں رسالہ حجۃ الاسلام مشہور ہے''(۲)

ردآریہ ورد عیسائیت میں ''مباحثہ شاہجہانپور'' ''انتصار الاسلام'' ''حجۃ الاسلام'' اور ''قبلہ نما'' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ''حجۃ الاسلام'' بنیادی کلامی مسائل اور اسلامی اصول ومبادی کے دفاع کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جس کی روشنی میں مختلف ومتنوع سطح کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکتا ہے، اس میں وجود باری اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے اثبات کے ساتھ اسلامی عبادات کے فلسفہ سے بھی اچھی بحث ہے۔ اور اثبات وضرورت نبوت پر تو بالکل منفرد اور اچھوتے انداز سے کلام کیا گیا ہے اور اس کے لیے نئے طرز کے دلائل وبراہین اپنائے گئے ہیں جن کو بعد کے لوگوں نے بھی اسلام کے دفاع کے سلسلے میں اپنایا اس طرح حضرت نانوتویؒ نے نبوت محمدیہ کے دلائل میں اضافہ بھی کیا اور بعد والوں کے لیے مزید علمی امکانات بھی پیدا کر دیے۔

حضرتؒ نے نبوت محمدیہ کی افضلیت پر روایتی انداز سے ہٹ کر اس کی علمی واخلاقی برتری سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات علمیہ اوروں کے معجزات عملیہ سے افضل ہیں اور ان کی پیشگوئیاں بھی دوسروں سے بڑھ کر ہیں، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق میں بھی سب سے اعلیٰ تھے، اور قرآن شریف، فصاحت وبلاغت کے علاوہ علوم کثیرہ پر حاوی ہونے کے سبب بھی افضل ہے اور پھر اس نکتے پر زور دیا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے جبکہ دوسری آسمانی کتابیں کتاب الٰہی ہیں جن میں تحریف ہوگئی ہے۔ پھر حضرت مولاناؒ نے یہ دکھایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معجزات عملیہ میں بھی دوسرے انبیاء سے بڑھے ہوئے ہیں۔ (۳)

---

(۲) تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی ص ۲۱۱ (لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

(۳) حجۃ الاسلام ص ۹۲۔۱۱۸ (دیوبند، ۱۹۶۷ء)

تقریر و تجویز کے لیے بغاوت کے جرم میں انھیں والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا ان کے ساتھ مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجددی، مولانا نثار احمد کان پوری اور شنکر آچاریہ کو بھی گرفتار کر کے کراچی بھیج دیا گیا کیونکہ یہ حضرات بھی خلافت کانفرنس میں شریک تھے۔ ان پر ترغیب تشدد اور ترغیب بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا لیکن سبھی نے کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ ترک موالاتی ہونے کے سبب وہ اپنی پیروی کرنے کے مجاز نہیں تھے تاہم مقدمہ کی کارروائی کے اختتام پر مولانا محمد علی نے مندرجہ ذیل بیان دیا:۔

"اسلام میں صرف ایک ہی بادشاہت تسلیم کی گئی ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کی بادشاہت ہے جو غیر مشروط، غیر منقسم اور غیر منتقل ہے۔ اگر ہندوستان کے لوگ حکومت سے تصفیہ کرنے کے لیے ذرا بھی موثر قوت ہوتی تو احکام اسلامی کی رو سے حکومت کے خلاف وہ اعلان جہاد کر دینے پر مجبور ہوتے اور موجودہ قضیہ کا تصفیہ خالق دینا ہال کے بجائے کسی اور جگہ ہو رہا ہوتا۔ اگر ایسی قوت نہ ہو، جو ایک قابل افسوس امر ہے تو (مسلمانوں کو) ایسی جگہ ہجرت کرنی چاہیے جہاں ان کو مذہبی عقائد کی بنا پر کوئی وکیل سرکار ستانے یا پریشان کرنے والا نہ ہو..."

بہر حال جب مقدمہ سیشن کے سپرد کر دیا گیا تو مولانا محمد علی نے اس عدالت میں بھی بے باکی اور بڑی دلیری سے اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے کہا:۔

"میں مجرم ہوں اور جو الزامات مجھ پر لگائے گئے ہیں ان سے کہیں زیادہ میں نے جرم کیے ہیں، میں ان سب کا اعتراف کرتا ہوں۔ عدالت جو سزا چاہے تجویز کرے"۔

اس بیان کے بعد عدالت نے مولانا محمد علی کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ کے تحت دو برس قید با مشقت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ شنکر آچاریہ کے علاوہ دوسرے سبھی رہنماؤں کو بھی سزا یاب کیا گیا۔

کراچی مقدمہ کے فیصلہ سے تحریکِ موالات کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مولانا محمد علی کی جس تجویز پر انھیں سزایاب کیا گیا اس تجویز کو قوم نے ملک کے ہر گوشہ میں بار بار دہرا لیا۔ تاہم فروری ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے مقام پر تشدد کے ایک واقعہ کے بعد گاندھی جی نے تحریکِ ترکِ موالات کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں مولانا کو بیجاپور جیل میں منتقل

''قبلہ نما'' دیانند سرسوتی کے کعبہ پرستی کے لغو و بے بنیاد الزام کے جواب میں عین حالت مرض میں وفات سے چھ ماہ پہلے لکھی گئی جس میں حجۃ الاسلام ہی جیسی وسعت و جامعیت، نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی، دقت فکر و نظر اور فہم و بصیرت نمایاں ہے غالباً غالب کے اس شعر سے اس کا نام رکھا گیا تھا:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود　　قبلہ کو اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

''قبلہ نما'' پورے اسلامی لٹریچر میں منفرد حیثیت رکھتی ہے خانۂ کعبہ کی اہمیت و حقیقت اور مظہر محبوبیت ہونے پر اتنی باریک بینی و نازک خیالی کے ساتھ شاید ہی کبھی کچھ لکھا گیا ہو اور اس کے تجلی گاہِ حق اور مرکز عالم ہونے پر اس تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہو اور کعبہ سے متعلق کتاب و سنت کے اسرار و رموز کی اس انداز سے پردہ کشائی کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ذات و صفاتِ باری، اور نبوت محمدیہ کی مرکزیت وشان محبوبیت و خاتمیت پر بھی بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے۔

''آب حیات'' بھی عجیب و غریب، حیات بخش و حیات آفریں، روح پرور اور روح افزا، الہامی و وجدانی کتاب ہے جس کا موضوع حیاتِ نبوی کے روحانی و جسمانی دونوں پہلوؤں کا اثبات ہے۔ اسلامی علم کلام و عقائد میں حیات نبوی ایک عقیدہ تو رہا ہے لیکن اس کے جسمانی پہلو پر زور، اس کی تحقیق و تدقیق، تفصیل و تشریح اور اس کے دلائل و براہین سے ایسی بحث بہت کم ملتی ہے، حضرت نانوتویؒ نے :النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے روحانی رشتے اور قربت و ابوّت پر استدلال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ابوت روحانی، ابوت جسمانی سے زیادہ قوی اور مؤثر ہوتی ہے حیات نبوی سے انھوں نے دوہرا استدلال کیا ہے اور باغِ فدک میں میراث نبوی کے جاری نہ ہونے کا بھی اسے سبب بتایا ہے کہ آنحضرتؐ چونکہ زندہ سلامت ہیں اس لیے بھی ان کی وراثت کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے ان کی ازواج مطہرات سے نکاح بھی جائز نہیں۔ (۴) حیاتِ نبوی کا عقیدہ تشریحات قاسمیہ کی روشنی میں امت محمدیہ کے ایمان و یقین، فکر و عمل، اور نفسیات و عزائم کے لیے طاقت و قوت کا سرچشمہ ثابت ہوسکتا ہے اور اس کے حال و استقبال کے لیے زوردار محرک اور فعّال عنصر بن سکتا ہے اور اس کے حوصلے Morale کو بلند کرسکتا ہے۔

---

(۴) آب حیات: صفحات ۱۸، ۳۱، ۱۴۹، ۱۵۵ (ملتان ۱۴۱۳ھ)

کر دیا گیا جہاں سخت مشقت اور حکومت کے مظالم نے انھیں مختلف عوارض میں مبتلا کر دیا۔ دو سال کی اسیری کے بعد جب مولانا رہا ہوئے تو فوراً بھوالی پہنچے جہاں ان کی بیٹی آمنہ بیگم دق میں مبتلا ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہی تھی۔ اگرچہ یہ رہائی مخفی رکھی گئی تھی لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا اور وہ جامعہ کے افراد کو لے کر مولانا کے خیر مقدم کے لیے جھانسی پہنچ گئے۔ چند روز بھوالی میں قیام کرنے کے بعد وہ پھر قومی کاموں میں مصروف ہو گئے کیونکہ مہاتما گاندھی اور بیشتر رہنما جیلوں میں محبوس کر دیئے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

"میں ایک چھوٹی جیل سے نکل کر بڑی جیل میں آ گیا ہوں۔ مجھے بڑودہ جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کرا سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔"

اسی سال مولانا کو کوکناڈا کے کانگریس اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مولانا کا خطبۂ صدارت بڑا طویل تھا جس میں انھوں نے ماضی اور حال کی سیاست کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ:

"انڈین نیشنل کانگریس سے میرا تعلق حال ہی کا ہے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ میں کانگریس میں پہلی مرتبہ ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور اس وقت بھی میری شرکت معمولی ضابطے کے مطابق نہ تھی ... اب تک اس کرسی صدارت کو وہی بزرگ زینت دیتے رہے ہیں جو کانگریس کی خدمت میں عمریں صرف اور بال سفید کر چکے تھے تو ایسی صورت میں کیا ایک ایسے شخص کا جو کانگریسی ہونے کے اعتبار سے ابھی کل کا بچہ ہے آپ کے اس غیر معمولی اعزاز کے لیے شکریہ ادا کرنا محض رسمی قرار دیا جا سکتا ہے"۔

انھوں نے مہاتما گاندھی کی اسیری پر اظہار افسوس کیا، مسلمانوں کی سیاست پر تبصرہ کیا اور سر سید پر اظہار رائے کیا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں بھی مولانا نے جامعہ ملیہ کا حوالہ ان الفاظ میں دیا:۔

"... میں کس منہ سے یہ دعویٰ کروں کہ علی گڑھ کا یہ بڑا باغی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا جبکہ علی گڑھ میں ایک ایسی مسلم یونیورسٹی جو گورنمنٹ کی سند، اعانت اور نگرانی، امراء کی عطا کردہ سرمایہ کی فراوانی اور اساتذہ و طلبہ کی

حکیمانہ وداعیانہ طرز خطاب

حکمت قاسمیہ کا ایک بڑا امتیاز اس کے لہجے اور طرز خطاب کی عمومیت وعالمیت اور ہمہ گیری بھی ہے جو کتاب وسنت کے اسالیب کی پیروی کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہے، کتاب وسنت میں خاص فرقوں کو کسی ضرورت سے ہی خطاب کیا گیا ہے ورنہ ان کا خطاب عام طور سے دنیا کے سارے انسانوں ہی سے ہوتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے لیے جامع دستورِ حیات اور ایک عام ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے اس کی دعوت حق میں انسانوں کے لیے فطری کشش اور اپیل موجود ہے۔ عہد مغلیہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کتاب وسنت کے اس طرز وخطاب کو اپنایا اور پھر ان کے حلقۂ فکر میں حضرت نانوتویؒ نے ان کے طرز فکر ونظر کو اپنایا اور اس کا خیال رکھا کہ ان کی حکمت ودعوت بغیر کسی مذہبی ونسلی اور گروہی وطبقاتی بندش کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور عوام وخواص اسلام کے ان اصول وآفاقی حقائق سے متعارف ہوں جو انسانیت کی مشترکہ میراث وسرمایہ ہیں۔. ''تقریر دل پذیر'' کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد گنہ گار، شرمسار، ہیچمداں، بندۂ خیر خواہ خلائق، سب ہندو مسلمان، نصاریٰ، یہود، مجوس آتش پرست کی خدمت میں بہ نظر خیر خواہی اپنے چند خیالات پریشاں کو جمع کر کے عرض کرتا ہے اور امیدوار ہے کہ سب صاحب اپنے تعصب مذہبی اور جی لگی باتوں کی محبت سے الگ ہو کر میری بات کو سنیں، اگر پسند آئے تو قبول کریں نہیں تو اصلاح فرمائیں۔''(۵)

اور اس کتاب میں جو اہم مباحث آئے ہیں وہ بھی عام نوعیت مگر عمومی دلچسپی کے ہیں جیسے دنیا کے لیے صانع کا ہونا ضروری ہے (ص ۲۵) وحدانیت کا ثبوت (ص ۲۹) ابطال تثلیث (۳۱) ہندوؤں کے نزدیک بھی درحقیقت خدا ایک ہی ہے (۴۵) خدا کی ذات لافانی، ابدی اور ازل ہے (۶۴) عقل کی حقیقت اور اس کے مراتب (۱۱۴) ضرورتِ نبوت (۱۷۲) صفات خداوندی لاعین ولا غیر ہیں، زمانے کی ازلیت ناممکن ہے (۳۴۴) زمانہ کیا ہے (۳۷۴) ان تمام بنیادی سوالات کے جوابات ایسے دل نشیں ودل پذیر طرز میں پیش کیے گئے ہیں جنہیں تعصبات اور تنگ نظری سے خالی دل ودماغ آسانی کے ساتھ قبول کرسکتا ہے۔

---

(۵) تقریر دل پذیر ص: ۲۴ (دیوبند ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء)

کثرت کے اعتبار سے تو کامیاب ہے لیکن مقاصد عالیہ سے محروم اور قومی توقعات کے جذبات سے یکسر معرّیٰ اور جس کے دوش بدوش ایک دوسری یونیورسٹی بھی ہے جو بجز مقاصد عظیمہ اور مطامحِ عالیہ کے ہر اعتبار سے مفلس و نادار ہے اور جس میں تین سال قبل میرا قدیم کالج تبدیل ہوتا معلوم ہوتا تھا"۔

مولانا نے جنگ عظیم کا ذکر کیا' تحریک خلافت پر اظہار خیال کیا، کانگریس لیگ کے اتحاد کی تاریخ بیان کی اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر اصرار کیا اور اس کے ساتھ ہی مستقبل کے لیے ایک تعمیری پروگرام بھی پیش کیا۔ خطبہ کے آخری حصہ میں انھوں نے کہا:۔

"......۱۹۲۱ء میں ہم نے گورنمنٹ کو بھی ایک سال کی مہلت دی تھی اور اپنے کو بھی۔ لیکن معاہدہ کی شرائط اپنی طرف سے پورا کرنے میں ہم نے کوتاہی برتی اس لیے اپنے ناتمام کام کی قیمت میں سوراج کا مطالبہ نہ کر سکے آؤ! ایک بار پھر ناگ پور کی طرف قدم اٹھائیں' اپنے خالق پر اعتماد کریں اور اس کے حضور میں گڑگڑائیں کہ ہمیں ہمت و دانش' ثبات و استقامت کی توفیق عطا کرے اور اس کام کو پھر از سر نو شروع کر دیں جس کا نقشہ ہمارا سردار اعظم ہمارے لیے کھینچ گیا ہے اگر ہم اس کے اتباع کی کچھ بھی اہلیت رکھتے ہیں تو ہم اپنی گمشدہ آزادی حاصل کر کے رہیں گے..."

۱۹۲۴ء کا سال مولانا کے لیے بڑی آزمائشوں کا سال ثابت ہوا۔ اسی سال ان کی چہیتی بیٹی آمنہ بیگم نے ان کا اور دنیا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ادارہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے خلافت کے سینہ پر موت کا بھرپور وار کیا۔ اسی سال مولانا کی والدہ بی اماں نے انتقال کیا۔ ان تمام آلام و مصائب کے باوجود انھوں نے فرمایا:۔

"قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا..."

مسلم لیگ، کانگریس' خلافت کمیٹی اور سوراج پارٹی کے مناقشوں نے مولانا کی الجھنوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ فسادات روزمرہ کا معمول بن گئے اور ہندو مسلم اتحاد کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔ ایسے عالم میں انھوں نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دوبارہ اجرا کیا اور کسی نہ کسی طرح ان دونوں اخبارات کو سوا سال تک جاری رکھا لیکن ۱۹۲۶ء میں "کامریڈ" بند کر دینا پڑا اور اپریل ۱۹۲۹ء میں "ہمدرد" بھی بند ہو گیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں ایک وفد خلافت کے

اس کتاب کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کی دوسری کتابوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا طرز اظہار وابلاغ معروضی (Objective) ہے یعنی کسی مسئلے پر اپنے جذبات ومحسوسات سے الگ رہ کر خالص عقلی وفکری اور منطقی انداز سے بحث کرنا اور غیر جانبدارانہ طور سے غور وفکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا، اسی وجہ سے نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ خالص منطقی اور عقلی مباحث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور حکمت وفلسفہ کی اصطلاحوں سے کام لینے لگتے ہیں۔

ہنود ونصاریٰ کے ساتھ غیر جانبدارانہ انداز بحث کے ساتھ حضرت نانوتویؒ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور جماعتوں: بریلوی، اہل حدیث اور شیعوں سے بھی مناظرانہ ومخاصمانہ طرز بحث کے بجائے روادارانہ ومصالحانہ طرزِ گفتگو اپناتے ہیں جس سے ان کا یہ عندیہ ورجحان سامنے آتا ہے کہ وہ ملّی اتحاد واتفاق اور ملّی وحدت واجتماعیت کو اولین ترجیح دینا چاہتے ہیں اور امت کے شیرازہ کو حتی الامکان منتشر ہونے سے بچانا چاہتے ہیں اور اختلاف کو مخالفت ومخاصمت کا رنگ دینے سے گریز کرتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے قائلین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریباں نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکانِ خطا سے منزہ نہیں کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ ہی صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے فعل کی وجہ نہ سمجھے ہوں، اس امر میں تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں اور دو چار ہم بھی سُنائیں، پر آیہ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما اور احادیث منع نزاع مانع ہیں۔''(٦)

شیعہ فرقہ کے جواب میں ''اجوبۂ اربعین''اور''ھدیۃ الشیعۃ''میں بھی مناظرانہ ومعاندانہ طرز بحث سے بچتے ہوئے عالمانہ اور بے تعصبانہ انداز استدلال اپنایا گیا ہے۔ اور آیات و روایات سے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور طنز وتعریض سے بڑی حد تک گریز کیا گیا ہے۔

---

(٦) الدلیل المحکم علی قرأۃ الفاتحۃ للمؤتم ص:١٧ (دیوبند، غیر مؤرخ)

ساتھ مولانا نے فریضۂ حج کی سعادت حاصل کی اور اگلے سال وہ سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۲۸ء میں وہ اپنے علاج کے لیے یورپ گئے اور واپسی پر انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ جمعیۃ علماء سے اختلافات ہو جانے پر انھوں نے "علماء کانفرنس" قائم کر لی اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں کان پور میں اس کے اجلاس کی صدارت کی۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے کبھی غافل نہیں رہے اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی حمایت میں مضمون لکھتے' تقریر کرتے اور اس کے لیے چندہ جمع کرتے تھے۔ دراصل ان کی سیاسی، مذہبی اور قومی مصروفیتوں نے انھیں یکسوئی سے جامعہ کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جب جامعہ ملیہ کو دہلی منتقل کرنے کے سلسلہ میں فیصلہ کیا گیا تو مولانا محمد علی نے اس کی بھرپور مخالفت کی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ایم۔ اے۔ او کالج خود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ضم ہو جائے گا لیکن علی گڑھ سے جامعہ کی دہلی منتقلی سے ان کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

مولانا محمد علی جامعہ کی طرف سے یوں بھی مطمئن رہنے لگے تھے کہ ایک علاحدہ ادارہ کی حیثیت سے اس کا قیام عارضی تھا اور دوسرے اس کے نگراں حکیم اجمل خاں تھے جو اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ جامعہ کی نذر کر دیا کرتے تھے لیکن اس وقت مولانا کو شدید دھکا پہنچا جب ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو رام پور میں حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔

مولانا محمد علی کو حکیم اجمل خاں کی وفات کی خبر کلکتہ کے "بسومتی" نامی اخبار سے کھڑگ پور کے اسٹیشن پر اس وقت ملی جب وہ کلکتہ جا رہے تھے۔ اس خبر نے انھیں اور ان کے تمام ساتھیوں کو سکتے میں ڈال دیا۔ اس بارے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اخبار "ہمدرد" کی ۶ر جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

> "...اس وقت ہم مسافروں کے دلوں پر صدمہ کا نہیں بلکہ حیرت اور استعجاب کا تسلط تھا۔ سکتہ کا سا عالم تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا نام تک نہ تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا آنسوؤں کا سیلاب دل سے نکل کر آنکھوں کی طرف بڑھتا گیا اور اب تھمنا نہیں جانتا۔"

حکیم صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے کہا:۔

> "...ایسا آج کون ہے جس نے بلا مبالغہ اگر نہ کیا ہو گا تو پچاس ساٹھ لاکھ انسانوں کا مفت علاج کیا ہو گا اور جس نے پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کو قیمتی سے قیمتی دوائیں مفت دی ہوں گی۔ مسلمانوں میں نہیں، ہندوستان میں

مولانا مناظر احسن گیلانی حضرت نانوتویؒ کی کتاب ''هدية الشيعه'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تصنیفی سلسلہ میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے''(۷)

اسی طرح بریلویت اور اہل بدعت کے خلاف بھی حضرت نانوتویؒ مناظرانہ ومخاصمانہ رویہ کے بجائے معقول ومعتدل رویہ اپنانا چاہتے تھے اور ہر نئی بات کو بدعت اور ہر بدعتی کو کافر ومشرک قرار دینے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ ''عقائد کے تغیر وتبدل کو ہم راس البدعات کہتے ہیں اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدل کو ہم بدعت کبریٰ قرار دیتے ہیں... اعمال جزئیہ کی کمی بیشی کو ہم 'بدعت صغریٰ' کہتے ہیں.... بالجملہ ہم تغیر وتبدل عقائد کو جیسے شیعہ وخوارج ومعتزلہ نے کیا 'راس البدعات' اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ وماتم داری کو بدعت کبریٰ اور کمی بیشی صدر جزئیہ کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں۔ برائی کی کمی وزیادتی بدعات میں بقدر چھوٹائی و بڑائی بدعات کے سمجھتے ہیں...وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہیے بیشتر فرقہائے باطلہ مثل شیعہ وخوارج میں پائے جاتے ہیں اور کمتر بعض جماعات اہل سنت میں نظر آتے ہیں''۔(۸)

عقلی ومتکلمانہ طریقۂ کار

عالم اسلام میں مغربی طرز فکر کے غلبے سے پہلے یونانی منطق وفلسفہ کے اسالیب ہی میں علمی وفکری موضوعات پیش کیے جاتے تھے جو صدیوں تک عصری وعلمی اسالیب بیان سمجھے جاتے تھے، اور اسی لیے اسلامی نصاب تعلیم میں یونانی معقولات داخل نصاب رہیں، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت بھی ضرورتِ وقت کے تحت انہیں شامل نصاب کیا گیا، اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر انگریزی اور ہندی کے لیے بھی آمادگی اور پسندیدگی ظاہر کی گئی ہندستان میں عہد مغلیہ سے معقولات کا رواج کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا اور میر سید شریف، محقق طوسی، میر زاہد، اور تفتازانی کی کتابوں پر شرح یا

(۷) سوانح قاسمی از مولانا گیلانی ۲/۶۴ (دیوبند، ۱۳۹۵ھ)

(۸) سوانح قاسمی از مولانا گیلانی ۲/۳۶ بحوالۂ فیوض قاسمیہ

نہیں ساری دنیا میں۔ بتاؤ وہ کون سا شخص ہے جس نے اتنے انسانوں کی سفارش کی ہو جتنے انسانوں کی اس کریم النفس شخص نے جو خلق مجسم تھا کی تھیں؟ کون تھا جو مریض سائل یا سفارش کا طالب ہو کر ان کے دروازے تک گیا اور ان کے فیض سے اپنا دامن بھر کر نہ لوٹا۔"

جامعہ کے حوالے سے انھوں نے لکھا:۔

".......یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جسے حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ عبدالمجید ہم میں سے بعض کی رائے کے خلاف علی گڑھ سے دہلی لے آئے تھے۔ اس نے رفتہ رفتہ دہلی کے دل و دماغ پر اپنا سکہ ضرور بٹھا دیا ہے اگر حکیم صاحب دو چار سال بھی اور زندہ رہتے تو خود دہلی ہی اس کی کفیل ہو جاتی۔ لیکن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دہلی کا طبیہ کالج ہندوستان کے جسمانی امراض کے علاج کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک عالم کے روحانی امراض کے لیے قائم کی گئی ہے اور اس کا نہ صرف دہلی پر یا ہندوستان پر بلکہ ایک عالم پر حق ہے۔ حکیم صاحب مرحوم بمبئی بھی اس علالت کے باوجود تشریف لے گئے تھے تو زیادہ تر اس غرض سے کہ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان' خدا ان کو اور ان کے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے' ان کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے سپاسنامہ پیش کریں اور تمام عالم اسلام کو اس کے ذریعہ سے جامعہ سے روشناس کرائیں"۔

جامعہ کی صورت حال اور حکیم صاحب کی وفات کے پیش نظر مولانا نے مزید لکھا:۔

"......کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جس پر حکیم صاحب مرحوم نے احسان کیا ہو وہ بلا کسی دست سوال دراز کیے ہوئے حکیم صاحب کے بڑھاپے کی اولاد کی مدد کرے... اگر ہم کو ان احسانات کا ذرا بھی احساس ہے جو حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ادنیٰ سے ادنیٰ انسان سے لے کر بڑے سے بڑے نوابوں اور مہاراجوں پر کیے تھے تو ہم آج ہی سے ان احسانات کے بوجھ سے ایک حد تک ہی سہی سبکدوش ہونے کی کوشش کریں گے اور پیسہ دو پیسہ سے لے کر لاکھوں تک سے جامعہ کی امداد کر کے حکیم صاحب رحمۃ اللہ

حاشیہ نگاری فضیلت علمی کی معراج سمجھی جاتی تھی، اس کے اثر سے ہندستان میں علوم عقلیہ کے متعدد دبستاں قائم ہو گئے تھے اور خیرآباد، جونپور، عظیم آباد، الہ آباد، فرنگی محل اور رامپوران کے بڑے مراکز سمجھے جاتے تھے جن کے منطقی وفلسفیانہ طرز فکر کے نتیجے میں معقولی طرز عصری و علمی اسلوب بن گیا تھا جس کی رعایت اور جس سے مطابقت ضروری تھی اور ویسے بھی عقلی وفکری مباحث کے لیے منطقی وفلسفی انداز بحث ضروری ہوتا ہے، پھر آریہ سماج وعیسائیت کے اعتراضات بھی عقلی انداز کے تھے اس لیے انہیں عقلی سکّوں میں ادائیگی ناگزیر تھی اور **کلموا الناس علی قدر عقولھم** کا تقاضا بھی۔ اسی وجہ سے حضرت نانوتویؒ نے مولانا برکات احمد ٹونکی کو دعا دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس کو علم معقول میں کمال عطا فرمائے'' اور پھر اس کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ:

''دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کیے بغیر دشوار ہے''(۹)

عصری علوم کی رعایت

حضرت نانوتویؒ کی فکر وحکمت میں ''حکمت دینیہ'' کو اپنے زمانے کی بہتر، مقبولؒ ومعقول طرز واسلوب میں پیشکش کو فطری طور سے ترجیح حاصل تھی اسی لیے دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ طالبان علوم دینیہ کے لیے علوم جدیدہ کو باعث کمال سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ/۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس کے بعد اگر طلبہ مدرسۂ ہٰذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی (اور) زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سببؔ علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے''(۱۰)

حضرتؒ کے ان خیالات وبیانات کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ آج کے زمانے میں جدید مغربی علوم اور سائنس وفلسفہ سے استفادہ اور حکمت وعلوم دینیہ کو جدید اسالیب واصطلاحات میں پیشکش کو بھی اپناتے اور اس طرح جدید علم کلام کا ایک مکتب فکر قائم کر دیتے۔

یورپی اقتدار، سائنس ومادہ پرستی اور نیچر پر غیر معمولی زور کو دیکھتے ہوئے حضرت نانوتویؒ

(۹) سوانح قاسمی ۲/۲۹۸

(۱۰) سوانح قاسمی ۲/۲۸۳

علیہ کی اس بہترین یادگار کو ایک مستحکم مالی بنا پر قائم کرکے دم لیں گے... میں خود تہیہ کرچکا ہوں کہ ہر والیٔ ملک کے سامنے دستِ سوال دراز کروں گا لیکن میں اپنے ہی جیسے مفلوک الحال غریب بھائیوں سے استدعا کرتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ حکیم صاحب کے احسانات سے ایک حد تک ہی سہی سبکدوش ہونے کی کوشش کریں اور غریب سے غریب شخص جس نے ایک بار بھی اپنا ہاتھ حکیم صاحب کے ہاتھ میں نبض دکھانے کے لیے دیا ہو اس ہاتھ کو اپنی جیب میں ڈالے اور پیسہ دو پیسہ آنہ دو آنہ، روپیہ دو روپے جو کچھ جیب سے نکال سکے نکالے اور لمحہ کا توقف کیے بغیر شیخ الجامعہ قرول باغ کے پتے سے ارسال کرنا شروع کردے۔ اگر یہ کام اس طرح شروع کردیا گیا تو چند ماہ ہی میں لکھوکھا روپیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بقا اور دوام کے لیے جمع ہو جائے گا اور دنیا میں ایک عجیب یادگار اس شخص کی قائم ہو جائے گی جس کے دستِ شفا نے اتنے انسانوں کو ممنون احسان بنا کر چھوڑا کہ کسی اور فرد واحد نے آج ساری دنیا میں اتنے انسانوں کو ممنونِ احسان نہ بنایا ہوگا۔ جیسے خود اس کی کرم گستری بے نظیر تھی ویسے ہی ہماری احسان مندی کا اظہار بھی بے نظیر ہونا چاہیے۔ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان"۔

ان الفاظ سے جامعہ کے لیے مولانا کے دلی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۵ء میں انھوں نے "ہمدرد" کے صفحات پر پانچ قسطوں میں جامعہ کے اغراض و مقاصد پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور اس کے تعلیمی مشن سے عوام کو متعارف کرایا تھا جنھیں وہ بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں ظاہر کرتے رہے تھے۔

ان کا پہلا مضمون بعنوان "جامعہ ملیہ کا مقصد کیا ہے" "ہمدرد" میں ۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مولانا نے تعلیم کے اس خاکہ کا ذکر کیا تھا جو جامعہ اور جامعہ والوں کے شایان شان تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص مقصد ہے اور وہ خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندستانی پیدا ہوں۔ رہا اس کا تعلیمی پروگرام اور اسکیم، وہ بھی بالکل متعین اور ایسی ہے جو اس مقصد کے لیے مدد اور معاون ثابت ہو"۔ آگے چل کر مولانا نے تحریر فرمایا:

"...... جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور تلامذہ کے قوائے

نے وجود باری، اور اسلام کے اصول ومبادی میں توحید ورسالت اور آخرت کے عقلی دلائل سے زیادہ تر بحث کی جو اس وقت کے اسلامی علم کلام کے لیے ضروری و ناگزیر تھے۔

تقاضائے وقت کے تحت حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت نانوتویؒ نے جو عقلی و منطقی اور فلسفیانہ و حکیمانہ طرز واسلوب اپنایا اس کی توجیہ کرتے ہوئے حکیم الاسلام حضرت مولاناؒ قاری محمد طیب قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب نے بالہام خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل و روایت سے عقیدت مندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہو گیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑ گئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جارہی ہے تا آنکہ لوگ مغیبات کو بھی عقل ہی کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں، اس لئے جب تک منقول دین کو معقول کا لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے ان ھذا الا اساطیر الأولین کہہ کر نا قابل التفات ٹھہرادیں گی اور دین سے محروم ہو جائیں گی اس لیے شاہ صاحبؒ نے بالہام خداوندی اس جامع منقول ومعقول مکتب فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تا کہ پورا دین جیسے نقل و روایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل و درایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو اور کسی بھی عقل پرست یا درایت دوست انسان کے لیے نا قابل التفات نہ ہونے پائے اس لیے یہ نادر روزگار کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی''(۱۱)

حضرت نانوتویؒ کے زمانے تک زمانے کی تعقل پسندی کے ایسے ہی رجحانات باقی تھے بلکہ ان میں کچھ اور اضافہ ہی ہو گیا تھا اس لیے حضرت نانوتویؒ کو بھی افہام وتفہیم دین کا ولی اللٰہی انداز کچھ تھوڑے سے فرق سے اپنانا پڑا، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اس ولی اللٰہی خاندان کی پانچویں علمی پشت میں ایک فرد اٹھا جس نے اس مذکورہ نہج پر دین ومذہب دینی عقائد اور دینی اصول وکلیات کو اسی الہام ربانی کی تحریک سے ابتداء ہی قرآن وحدیث یا مذہب وملت کا نام لیے بغیر حقائق قرآن وحدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرز بیان سے

(۱۱) تاریخ دارالعلوم از سید محبوب رضوی ۱/۱۴۲ (دیوبند ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء)

داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے۔ اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو حق دوست اور حق پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندستانی بنایا جائے... جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو 'جامعہ' اور 'ملیہ' ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور نہ تو وہ دیوبند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے۔ پھر یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے گو دیگر مذاہب کے پیرووں کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔ وہ اسلام کو صحیح تفسیر حیات سمجھتی ہے اور اسلام کے اصولوں کی اس لیے تعلیم دیتی ہے کہ وہ اسرار زندگی سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی لیے نصاب جامعہ میں سب سے خاص بات جو رکھی گئی وہ یہ کہ عربی لازمی ہو اور نثر کا تمام تر کورس قرآن کریم ہو، تاکہ طالب علم اس قدر عربی سیکھ لے کہ قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کو کم از کم اس طرح سمجھ سکے جس طرح ایک اُمّی عرب رسول کریمؐ کے زمانے میں سمجھ سکتا تھا تاکہ اسے اپنی مذہبی ضروریات کے لیے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا پڑے اس طرح جامعہ مسلمان طلبہ کو ان کے دین سے آگاہ کرتی ہے تاکہ وہ دنیا کو صحیح طور سے برت سکیں، پھر دوسری طرف مسلمان کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو..."

اس کے بعد مولانا نے دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ جامعہ کا مقصد یہ بھی بتایا کہ طلبائے جامعہ کو اکل حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق کے لیے کوئی دستکاری ایسی سکھائی جائے جس سے وہ اپنی روزی خود پیدا کر سکیں۔

"... یاد رکھنا چاہیے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہونے کا بھی دعویٰ کرتی ہے۔ ہم ہندستان کے مسلمان 'مسلمان' ضرور ہیں مگر ہندستانی

زمانہ کے سامنے پیش کیا جیسے وہ اس زمانہ کے حسب حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے، جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلان مذہب ہے نہ اطلاع غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدہ غیب ہے مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہوسکتی ہے اس لیے اس نے ایک نئے حسیاتی فلسفہ وحکمت کی بنیاد ڈالی ہم اسی شخصیت کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں"۔ (۱۲)

☆......☆......☆

(۱۲) تاریخ دار العلوم از سید محبوب رضوی ۱/۲۱

بھی ہیں۔ اس میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آباد ہیں اور ان کے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں اور انھیں کی کثرت ہے۔ جامعہ کے بانیوں پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس ملک کی آزادی کے لیے (اور ایک مسلمان کے لیے آزاد ہونا لازمی ہے اس لیے وہ سوائے خدا کے کسی کا عبد و غلام نہیں ہو سکتا) مسلمانان ہندستان کا اپنے ہمسایہ بھائیوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط قائم کرنا لازمی و لابدی ہے اس لیے ایک طرف تو جامعہ نے اپنا دروازہ ہر اس ہندستانی کے لیے کھول دیا جس کو جامعہ کی فضا میں رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تعصب نہ ہو۔ دوسرے جامعہ کے ہر طالب علم کے دل میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ملک کی محبت اور اغیار و اجانب کی غلامی سے نفرت پیدا کرنا جامعہ نے پہلے ہی دن سے اپنا وظیفہ سمجھا اور جامعہ کی فضا کو غلو اور تعصب سے پاک صاف رکھا، اس لیے حقیقی معنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نیشنل یونیورسٹی ہے۔"

جامعہ کے اغراض و مقاصد اور اس پر قومی درسگاہ کی حیثیت سے روشنی ڈالنے کے بعد مولانا نے فرزندانِ قوم کی توجہ اس کی جانب مبذول کراتے ہوئے انھیں ان کا فرض یاد دلایا اور لکھا:۔

"جامعہ اب تک بھی ایک خواب ہے مگر یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر خود تفسیر حیات ہے اور اس خواب کو عالم خواب و خیال سے نکال کر عالم عمل میں لانا اور اس خواب کی تعبیر کرنا کارکنان جامعہ کا اور مسلمانان ہند کا فرض ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ خواب صحیح معنوں میں تفسیر حیات ہے یا نہیں اگر یہ واقعی تفسیر حیات ہے تو پھر ملک و قوم کا فرض ہے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔"

"ہمدرد" کے ۸ر جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں مولانا محمد علی کا دوسرا مضمون بعنوان "جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے کیا" شائع ہوا۔ اس میں مولانا نے پہلے امیر جامعہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جامعہ کو مرحوم کی بڑھاپے کی اولاد سے تعبیر کیا اور اس کا بانی قرار دیا جو انھیں اپنے بیٹے حکیم جمیل خاں اور طبیہ کالج سے کسی طرح کم عزیز نہ تھی۔ اور تحریر کیا کہ "ہمارے تمام امراض کا علاج اسلام اور صرف اسلام ہے اور اسی بنیاد پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر ہوئی ہے۔" مولانا نے انکشاف کیا کہ حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ کسی طرح ایک

مولانا ندیم الواجدی*

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
کی فکری بصیرت اور دورِ حاضر میں اس کی معنویت

دارالعلوم دیو بند کا نام آتا ہے تو اس کے بانی حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتویؒ کی عہد ساز شخصیت اور ان کے لازوال کارناموں کا ذکر ضرور آتا ہے، اسلامی تاریخ کے دامن میں بے شمار شخصیتیں محوخواب ہیں جنھوں نے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لئے اپنی بیش بہا خدمات کے خوب صورت نگینوں سے تاریخ کے صفحات کو زینت بخشی ہے، لیکن ایسی شخصیات بہت کم ہیں جنھوں نے اپنی فکری بصیرت سے تاریخ کو ایک نئی سمت عطا کی اور جن کی عملی جدو جہد نے آنے والی صدیوں تک اپنا دائرہ وسیع کیا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے انھیں برصغیر کے پریشان حال، مظلوم اور مایوس مسلمانوں کا مسیحا بنا کر پیدا کیا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر آج برصغیر ہندو پاک وبنگلہ دیش کے آسمان پر اسلام کا آفتاب روشن ہے اور اپنی کرنوں سے سارے عالم کو منور کر رہا ہے تو یہ حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت اور ان کی عملی جدوجہد کا فیضان ہے، آج اللہ نے دارالعلوم کے فیض کو صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ افریقہ یورپ اور امریکہ تک عام کر دیا ہے، دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں دارالعلوم دیو بند کا فیض یافتہ موجود نہ ہو اور جو اپنے علم کے نور سے اُجالے نہ پھیلا رہا ہو۔

آیئے حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت، عملی جدوجہد اور دور حاضر میں اس کی اہمیت اور معنویت کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں:

حضرت نانوتوی کا عہد اور تعلیم

حضرت نانوتویؒ کی پیدائش ۱۸۳۲ء میں ہوئی، آپ نے جس وقت ہوش سنبھالا سلطنت مغلیہ کا زوال مکمل ہو چکا تھا، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، ان کی اخلاقی اور روحانی حالت

* دارالکتاب دیو بند (یوپی)

عرب کی خدمات حاصل کر کے جامعہ کے طلبہ کو روزمرہ عربی میں گفتگو کرنے کی مشق کرائیں اور انھیں اس زبان سے واقف کرالیا جائے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اس طرح وہ عربی میں تحریر و تقریر کی اس قدر مہارت پیدا کرلیں جس قدر کہ انگریزی مدارس کے طلبہ انگریزی سے واقف ہوتے ہیں۔

جامعہ پر اپنے تیسرے مضمون بعنوان "جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چند اور خصوصیات" میں جو ہمدرد کے ۹ر جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا مولانا نے تحریر کیا کہ "جامعہ ملیہ کی سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہاں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے"۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا تھا:

> "... جامعہ کے بانی کو تجربہ ہو چکا تھا اور اسی لیے اس نے جامعہ میں تحصیل علوم کے لیے صرف مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ میں کم از کم دو سال صرف ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کی معلومات دوسری درسگاہوں کے طلبہ سے اس قلیل عرصہ میں بھی زیادہ ہوتی ہیں..."

مولانا کا چوتھا مضمون "ہمدرد" کے ۱۶ر جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح۔" اس مضمون میں انھوں نے پچھلے مضامین کے حوالے سے جامعہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جامعہ میں دین اور دنیا دونوں کی تعلیم دی جاتی ہے" اور یہ کہ یہاں مادری زبان یعنی اردو ذریعہ تعلیم ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا تھا کہ یوں تو اردو کے نام نہاد حامی کروڑوں ہیں لیکن اس کے حقیقی حامی نظام الملک آصف جاہ تھے جنھوں نے "جامعہ عثمانیہ میں اردو ہی کو تحصیل علوم کا ذریعہ بنایا اور دارالترجمہ قائم کر کے اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ تحصیل علوم کا ذریعہ بن سکے یا جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کی اکادمی کے کارپرداز ہیں جو باوجود اپنی بے بضاعتی کے نظام الملک آصف جاہ کی تقلید کر رہے ہیں۔ آج بھی اس کی اکادمی کے پاس دس کتابیں ایسی موجود ہیں جن کو وہ طبع اور شائع کر سکتی ہے اور اپنے مکتبے کے ذریعہ سارے ملک میں پھیلا سکتی ہے مگر افسوس کہ اس کا کیسہ دینار کیا درہم تک سے خالی ہے ورنہ یہ کتابیں آج اردو دانوں کے ہاتھوں میں ہوتیں"۔ مولانا نے مزید تحریر کیا کہ "مذہب کا نام لینے والے کروڑوں ہیں لیکن جامعہ مذہب کا نام ہی نہیں لیتی اس کی صحیح معنوں میں خدمت بھی کر رہی ہے۔ اردو کے حامی بھی کروڑوں ہیں لیکن جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی اردو کی سچی حمایت کر رہی ہیں۔"

مولانا نے مسلمانوں کی اقتصادی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جامعہ ہی

ناقابل بیان حدتک روبہ زوال تھی، ان کے عقائد درہم برہم ہورہے تھے، جاہلانہ رسوم ان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں دور تک سرایت کرچکی تھیں، اسلامی مدارس برائے نام باقی رہ گئے تھے، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علوم نبویہ کی جو شمع دہلی کے ایک مدرسے میں روشن کی تھی وہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جارہی تھی، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوئی جہاد کا اثر ختم ہو چکا تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح بالاکوٹ کے میدان میں دم توڑ چکی تھی، ہر طرف مایوسی کے گھنے بادل تھے، اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔

حضرت نانوتویؒ نے ایسے ہی مایوس کن حالات میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے منطق، فلسفہ، کلام وغیرہ فنون کی کتابیں پڑھیں اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی درسگاہ حدیث میں حاضر ہوئے اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مجددیؒ سے حدیث کی مشہور ومتداول کتابوں کی سند حاصل کی۔ ۱۷ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ذریعۂ معاش کے طور پر مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کیا، اسی دوران بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے حواشی بھی تحریر کئے، یہ ۱۸۵۲ء کا زمانہ ہے، اور اس وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس برس تھی۔

۱۸۵۷ء کے جہاد میں شرکت

دہلی میں قیام کے دوران حضرت نانوتویؒ اپنے وطن نانوتہ تشریف لاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ وطن آئے ہوئے تھے کہ انھیں میرٹھ میں فوجی بغاوت کی اطلاع ملی، اس بغاوت کا سبب چربی لگے کارتوس تھے۔ ہندو فوجی اس لئے ناراض تھے کہ عیسائی حکومت انھیں گائے کی چربی لگے ہوئے کارتوس دے رہی ہے، مسلمان فوجی اس لئے برہم تھے کہ ان کو جو کارتوس فراہم کئے جارہے ہیں وہ خنزیر کی چربی سے آلودہ ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ اس طرح عیسائی حکومت دونوں قوموں کا مذہب اور عقیدہ خراب کررہی ہے۔ یہ افواہ کیا پھیلی، فوجی بیرکوں میں بغاوت پھیل گئی، ہندو اور مسلمان فوجیوں نے اپنے افسران کے خلاف بندوقیں اٹھالیں اور چھاؤنی کے ایک ایک افسر کو چن چن کر قتل کرڈالا، یہ مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ فوجیوں کی بغاوت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، مغربی یوپی کے اکثر

سمجھتی ہے کہ اس درجہ زبوں اقتصادی حالت کی اصلاح کس طرح کی جائے ... مسلمانوں کی زبوں اقتصادی حالت کی اصلاح کے صرف دو طریقے تھے' ایک یہ کہ ان کی ضروریات زندگی کو یوروپ والوں کی طرح بڑھانے کے بجائے گھٹایا جائے اور دوسرا یہ کہ اور جو کچھ بھی ان کو سکھایا جائے لیکن اتنا تو ضرور سکھادیا جائے کہ دستکاری میں کوئی عیب نہیں ہے' اس کے ذریعے سے بھی کسب معاش ممکن ہے اور "الکاسب حبیب اللہ"۔ چنانچہ جامعہ نے اپنے طلبہ کے اخراجات کی جو اسکیل مقرر کی ہے وہ اس اصول کے مطابق مقرر کی ہے ... اس کے علاوہ جامعہ میں تاریخ و فلسفہ' ادب اور سائنس پر مضمون کے پڑھنے والے کے لیے یہ بھی لازمی کر دیا گیا ہے کہ ہفتہ میں چند گھنٹے کسی نہ کسی دستکاری کی نذر کیے جائیں' اس لیے کہ اگر ایم۔ اے کو بھی ضرورت پڑے تو اکلِ حلال کو چھوڑ کر حرام خوری پر مجبور نہ ہو جائیں ... جامعہ نے اسی اصول پر عامل ہو کر اپنے طلبہ کے دست و دماغ دونوں کو بر سر کار لگا دیا ہے تاکہ فقط ایک ہی سے کسب معاش کا کام نہ لیا جائے بلکہ دونوں سے حسب ضرورت یہ کام لیا جاسکے"۔

جامعہ میں بچوں کی دکان اور بنک کے ذریعہ تجارت کے میدان میں عملی تربیت کے سلسلہ میں مولانا نے تحریر کیا کہ اگرچہ جامعہ کو بنکوں میں سرمایہ جمع کرا کے سود کھانا نہیں سکھایا جاتا تاہم انھیں اپنی دکان لگانا سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی ضروریات کی چیزیں خود فروخت کر سکیں۔ مولانا نے بتایا کہ جلد ہی ان کا ایک بنک بھی کھلوا دیا جائے گا جس میں ان کا جیب خرچ جمع ہو سکے اور حسب ضرورت نکالا جاسکے' اور ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاسکے۔ انھیں کپڑے دھونے، کھانا بنانے' کپڑے سینے اور نان بائی کا کام سیکھنے کی مشق کرائی جائے گی۔ انھوں نے طلبہ کے ناشتہ' کھانے' لباس' رہنے' تعلیم' ورزش' صحت وغیرہ پر ہونے والے اخراجات کا تخمینہ دے کر ان کے لیے دستکاری کو از بس ضروری قرار دیا جو جامعہ کی خصوصیات میں شامل تھی۔

اپنا پانچویں اور آخری مضمون مولانا نے "جامعہ کی ایک اور خصوصیت ـــــ خدا پرستی ملت پروری' وطن دوستی" کے عنوان سے ہمدرد کے ۱۸/ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا اس میں انھوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اس فارسی سپاسنامے کے اقتباسات پیش کیے تھے جسے شاہ افغانستان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ جامعہ اپنے طلبہ کو دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ رہنے کی تعلیم دیتی ہے۔ انھوں نے مزید لکھا تھا:۔

"... جامعہ کے بانیوں نے اس کو بھی ملحوظ رکھا کہ جس ہندستان میں ہم

شہر اس کی لپیٹ میں آگئے، تھانہ بھون جہاں حضرت نانوتویؒ کے پیرو مرشد حاجی امداد اللہ مقیم تھے انگریزوں کے خلاف جہاد کا مرکز بن گیا۔

علماء کی ایک بڑی جماعت جس میں حضرت نانوتویؒ پیش پیش تھے مسلمان مجاہدین کی قیادت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، سب سے پہلے انھوں نے اپنے مربی اور مرشد حضرت حاجی امداد اللہ سے مشورہ کیا اور درخواست کی کہ جس طرح آپ دینی معاملات میں ہمارے سربراہ ہیں اسی طرح دنیاوی معاملات میں بھی ہماری سربراہی فرمائیں۔ اور امیر المؤمنین کا منصب قبول فرمائیں۔(۱) چنانچہ تھانہ بھون میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم کی گئی جس کا سپہ سالار حضرت نانوتویؒ کو مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو قاضی بنایا گیا(۲) حضرت حاجی امداد اللہؒ نے نظم مملکت کے قیام اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے انتظام کے لئے جو شوریٰ تشکیل دی اس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا حافظ محمد ضامن اور حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ بھی شامل تھے، اپنے وقت کے ان سربرآوردہ اور غیور علماء کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی، شاملی کے میدان نے یہ نظارہ دیکھا کہ علماء صرف قلم ہی نہیں چلاتے بلکہ تلوار اور بندوق بھی چلا سکتے ہیں، اس شدید معرکہ آرائی کے دوران انگریز فوجوں سے توپخانہ چھین لیا گیا۔ حضرت مولانا حافظ ضامن اس جنگ میں شہید ہوئے اور مولانا قاسم نانوتویؒ گولی سے زخمی ہوئے۔(۳) اسی دوران سقوط دہلی کی اطلاع ملی، مجبوراً ان مجاہدین کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے، شاملی کے جہاد کی وجہ سے تھانہ بھون انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنا، انھوں نے اس قصبے کو تباہ و برباد کرڈالا۔(۴)

وہ علماء بھی انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے جو اس جہاد میں شریک تھے، چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور مخبرین کے لئے گراں قدر انعامات کا اعلان کیا گیا۔(۵) حضرت حاجی امداد اللہ نہایت خاموشی کے ساتھ انجان اور غیر مانوس راستوں سے ہوتے ہوئے مہینوں کی مسافت

---

(۱) تذکرۃ الرشید ج۱ص:۷۴ (۲) نقش حیات ص:۴۳۰ (۳) موج کوثر ص:۱۹۶ (۴) علماء ہند کا شاندار ماضی ج۴ص:۲۸۱ (۵) تذکرۃ الرشید ج۱ص:۷۷

مسلمان ۷ کروڑ کی تعداد میں رہتے ہیں اس میں اور ملتیں بھی آباد ہیں۔ اگر ہمارے کچھ حقوق ہیں تو ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ اگر ہمارے حقوق کی حفاظت کی جانی چاہیے تو ان کے بھی حقوق اسی حفاظت کے متمنی ہیں۔ اگر ہماری ناحق دلآزاری جرم ہونی چاہیے تو ان کی ناحق دلآزاری بھی جرم ہونی چاہیے۔ بہر حال اسلام دنیا میں دلآزاری سے نہیں پھیلایا جاسکتا اور تسخیر ملوک مسلمانوں کا شعار نہیں ہے بلکہ تسخیر قلوب ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سات سوا سات برس کی زندگی خود اس کا ثبوت ہے کہ اس نے جہاں اپنی خدا پرستی اور ملت پروری کو اپنا شعار بنایا وہیں اس نے وطن دوستی کو بھی اپنے طلبہ کی زندگی کا ایک ولولہ انگیز جذبہ سمجھا اور اس کو ہمیشہ ابھارا..."

اس مضمون میں مولانا نے اعلان کیا تھا کہ "ہمدرد" کی اگلی اشاعت میں وہ اس موضوع کو جاری رکھ کر جامعہ کے اساتذہ کی قابلیت' ان کے ایثار اور ان کی محبت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جامعہ کی مالی حالت کا نقشہ پیش کریں گے۔ انھوں نے یہ اطلاع بھی دی کہ اب تک جتنے مضامین لکھے جاچکے تھے وہ رائگاں نہیں گئے تھے کیونکہ لوگوں نے ان کا مثبت جواب جامعہ کو مالی امداد فراہم کر کے دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مولانا کا یہ آخری مضمون کبھی منظر عام پر نہیں آسکا۔

غرضیکہ مولانا اخیر وقت تک جامعہ سے وابستہ رہے۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں رہی وہ مستقل وہیں قیام پذیر رہے اور جب دہلی لائی گئی تو انھوں نے اس منتقلی کی زبردست مخالفت کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک دن جامعہ ملیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر قابض ہو جائے گی اور ان کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا جو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں دیکھا تھا تاہم دہلی میں بھی ان کا ربط جامعہ سے قائم رہا۔ وہ اپنی بیشتر شامیں قرول باغ پہنچ کر جامعہ کے طلبہ کے ساتھ گزارتے تھے اور جامعہ کے بچوں کے ساتھ خود بھی بچہ بن جاتے تھے اور کہا کرتے تھے کاش میں اپنے سینگ کٹا کر خود بھی ان بچوں کے ساتھ شامل ہو سکتا۔ جب بھی کوئی رہنما جامعہ آتا تو مولانا ضرور اس کے ساتھ ہوتے۔ انھوں نے اپنی بیٹی گلنار کی شادی کی تقریب بھی جامعہ ہی کے ہوسٹل کی عمارت میں منعقد کی۔ جامعہ والے بھی ہمیشہ انھیں اپنا سرپرست سمجھتے تھے۔ مولانا نے ہمیشہ جامعہ والوں کی ہمت بندھائی' ان کی مایوسی دور کی اور انھیں امید کا پیغام دیا، اس کے کارکنوں کی ہمت افزائی کی۔ اساتذہ کے ساتھ علمی و ادبی بحث و مباحثہ کیے، بچوں کے ساتھ

طے کرنے کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے (۶) حضرت گنگوہی کو گرفتار کر کے پہلے سہارنپور پھر مظفر نگر جیل میں قید رکھا گیا (۷) آپ کے خلاف مقدمہ بھی چلا، حکام کی کوشش یہ تھی کہ ان کو پھانسی دے دی جائے، مگر خدا کے فضل و کرم سے کوئی کاغذی ثبوت ہاتھ نہ لگ سکا۔ اس لئے مجبوراً رہائی کے آرڈر ہوئے۔ (۸)

حضرت نانوتویؒ اپنے کمال شجاعت، بہادری اور ہمت کے باعث ہر قسم کے خطرات، ڈر اور خوف سے بے نیاز ہو کر کھلے عام پھرتے رہے، لیکن جب انگریزوں نے تلاش میں شدت اختیار کی تو اعزہ واقارب کے پیہم اصرار پر آپ کو روپوش ہونا پڑا، اس طرح انھوں نے تین دن مسجد چھتہ میں گزارے، لیکن تین دن مکمل ہوتے ہی مسجد سے باہر آ گئے اور فرمایا کہ روپوشی کی سنت پوری ہوگئی، اب میں زیادہ دن چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ (۹) استخلاص وطن کے لئے جدوجہد اور قربانی کی راہ میں علماء دیوبند نے جو سختیاں برداشت کیں اور اذیتیں جھیلیں اس مختصر تحریر میں ان کا احاطہ مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور کمزور کر دیا تھا کہ وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر تن بہ تقدیر بیٹھ گئے تھے (۱۰) اگر علمائے دیوبند بھی تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ یہاں صرف نام کے مسلمان رہ جاتے اور اسلام رخصت ہو جاتا۔

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا، دہلی، آگرہ لاہور، ملتان، لکھنؤ خیر آباد، بنگال، مدراس اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امراء کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا دار و مدار ان ہی جائدادوں پر تھا۔ ۱۸۸۳ء میں ایسٹ کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر لیا، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے بہ قول "مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ (۱۱)

دوسری جگہ وہ صاف لفظوں میں اوقاف کی تباہی کا اعتراف کرتا ہے، مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو

(۶) علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۹۳ (۷) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۰۱ (۸) ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغی علماء ص ۱۲۵ (۹) سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۷۲ (۱۰) علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱ ص: ۳۹ (۱۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص: ۲۰۰

ہمیشہ مشفقانہ سلوک کیا۔ ایک بار جب مولانا نے بیت المقدس کا سفر کیا تو وہاں مدرسہ کے بچوں کو قرآن کریم کی جلد سازی کرتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس کے نمونے کی ایک جلد جامعہ کے بچوں کے لیے بھی بھیجی تاکہ یہاں کے بچے بھی جلد سازی کے فن میں مہارت حاصل کر سکیں۔ وہ جامعہ آکر ہمیشہ خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ مولانا کو جامعہ کے تصنیفی کاموں سے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر حالات اور سیاست نے فرصت دی تو وہ اردو اکادمی کی سرگرمیوں میں حصہ لیں گے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد ان کا ذاتی کتب خانہ جامعہ کی نذر کر دیا جائے جس پر ان کی وفات کے بعد بیگم محمد علی نے پوری طرح عمل کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ اپنی سیاسی مصروفیات سے فارغ ہو جائیں گے تو جامعہ میں ہی قیام کریں گے اور اس کی خدمت کے لیے اپنی باقی ماندہ زندگی وقف کر دیں گے۔ لیکن سیاست نے انھیں کبھی فرصت نہ دی۔

انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی 'شاردا ایکٹ سے اختلاف کیا جمعیۃ علماء ہند سے علاحدہ ہو کر علما کانفرنس کی بنیاد رکھی 'ہمدرد کو دوبارہ جاری کیا 'ابن سعود کی موافقت و مخالفت کی۔ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا اور علاج کے ملیے یورپ کا سفر کیا غرضیکہ اپنی زندگی میں انھیں کبھی فرصت نصیب نہیں ہوئی۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئینی مسئلہ پر غور و فکر کے لئے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں ہندستان کے سرکردہ رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا محمد علی بھی مدعو کیے گئے۔ اپنی شدید علالت کے باوجود انھوں نے کانفرنس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کانفرنس میں کانگریس نے شرکت نہیں کی کیونکہ مہاتما گاندھی نمک ستیہ گرہ کے بعد جیل میں محبوس کر دئے گئے تھے۔ اگرچہ ملک کے مختلف گوشوں سے کانفرنس میں مولانا کی شرکت کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں لیکن مولانا کسی کی پروا کیے بغیر انگلستان کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انھیں اسٹریچر پر لٹا کر جہاز پر سوار کرایا گیا۔ راستہ میں ان کی حالت اسقدر ابتر ہو گئی کہ انھیں پیرس میں اتار لیا گیا اور علاج و معالجہ کے بعد وسط نومبر میں لندن بھیجا گیا۔

گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی نے ۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنی زندگی کی آخری تقریر کی جو اتنی زبردست تھی کہ ان کے مخالفین بھی ان کے زور بیان کے قائل ہو گئے۔ مولانا نے کانفرنس میں فرمایا کہ "میں آپ سے مستعمراتی درجہ کی حکومت مانگنے نہیں آیا ہوں اور نہ میں اس کے حصول پر یقین رکھتا ہوں۔ صرف ایک چیز جس کا میں عہد کر چکا ہوں وہ آزادی کامل

چھپانے سے کیا فائدہ؟ اگر ہم اس جائداد کو جو صرف اسی مصرف کے لئے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلا اور شاندار ادارے موجود ہوتے (۱۲) اس زمانے کی تعلیمی حالت کا اندازہ گاندھی جی کی اس تقریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا ''برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں ۳۰ ہزار ادارے تھے جن میں دو لاکھ طلباء تعلیم پاتے تھے آج حکومت دفتری بمشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے (۱۳) ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا گیا دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم رائج کی گئی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ تھی، سرکاری تعلیم گاہیں دراصل وہ کارخانے تھے جہاں سے مسلمان بچے الحاد اور لادینیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے، لارڈ ولیم بنٹنگ (۱۸۲۸ء/ ۱۸۳۰ء) کے عہد حکومت میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو شروع میں انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں ہونی چاہیے، لیکن انگریزوں کے انتہا پسند طبقوں نے جن میں پادری بھی شامل تھے اس کی مخالفت کی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا ان کا یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو عیسائیت سے قریب تر ہونے لگے، فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب وتمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ (۱۴)

انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک اہم رکن سر چارلس نے جو گورنر کے اہم منصب پر فائز تھے ایک مرتبہ کہا کہ: ''میں یہ امیدیں قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے'' (۱۵) برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

---

(۱۲) حوالہ سابق ص: ۲۰۷ (۱۳) اخبار مسافر آگرہ ۳ ردسمبر ۱۹۲۰ء (۱۴) ترجمہ خطبات گارساں دتاسی از ڈاکٹر حمید اللہ ص: ۳۷۸۔
(۱۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل ص: ۱۴۳

ہے۔"

مسلمانوں کی سیاست کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ "... مذہب میرے خیال کے مطابق حیات انسانی کی تشریح کا نام ہے۔ میرے پاس ایک تمدن ہے، ایک ضابطۂ اخلاق ہے۔ زندگی کا ایک نظریہ ہے اور حیات اجتماعی کے لیے ایک مکمل نظام ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔ خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اوّل مسلمان ہوں دویم مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان اور سوائے مسلمان کے کچھ نہیں ... لیکن جن امور کا ہندستان سے تعلق ہے۔ ہندوستان کی آزادی سے تعلق ہے، ہندستان کی فلاح و بہبود سے تعلق ہے، میں اول ہندستانی ہوں، دویم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندستانی ہوں اور ہندستانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں ان مساوی الجسامت دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جن کے دو مختلف مرکز ہیں ایک ہندستان اور اور دوسرا دنیائے اسلام"۔ مختلف امور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا:

"... میں امید کرتا ہوں کہ اپنی علالت اور امراض اور دنیا بھر کے جھگڑوں کے متعلق میری طویل تمہید کو آپ معاف کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جس مقصد واحد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے وطن کو میں صرف اس صورت میں واپس جانا چاہتا ہوں کہ ارمغانِ آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو۔ پس اگر ہندستان میں تم ہمیں آزادی نہ دو گے تو یہاں میرے لیے ایک قبر تو تمہیں دینی ہی پڑے گی"۔

اور ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ساڑے نو بجے صبح لندن کے ہائڈ پارک ہوٹل میں، جہاں ان کا قیام تھا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بانی، اس کا اولین شیخ الجامعہ، ہندستان کے صف اول کا رہنما اپنے وطن سے دور دیار غیر میں ابدی نیند سو گیا۔ مولانا کی وفات کی خبر دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ گئی اور ہر طرف صف ماتم بچھ گئی ہر شہر کے افراد نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی تدفین ان کے شہر میں عمل میں لائی جائے اگر مولانا کی وفات ہندستان میں واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تدفین یقیناً جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطہ میں عمل میں آتی لیکن بیت المقدس کے مفتیٔ اعلیٰ سید امین الحسینی کی خواہش کا احترام کیا گیا جنھوں نے مولانا کے جسد خاکی کو بیت المقدس میں دفن کرنے کی تمنا ظاہر کی تھی اور اس طرح مولانا کے مرحوم جسم کو ۲۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پیغمبروں کے مدفن اور قبلہ اول میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

یوں تو دنیا بھر کے رہنماؤں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا لیکن اپنے خیالات کا اظہار

''ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے''۔(۱۶)

انگریز سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان قرآن کریم پڑھتے رہیں گے اور جب تک وہ شریعت کے اس سر چشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے اس وقت تک انگریز ملک پر پوری طرح غالب نہیں آسکتے، چنانچہ برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم گیڈ اسٹون نے مجمع عام میں قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ:

''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی''۔(۱۷)

انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان قرآن کریم پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور جب تک وہ اس کتاب سے وابستہ رہیں گے کسی انگریز حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے، چنانچہ ہنری طامس کہتا ہے کہ:

''مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے''۔(۱۸)

لارڈ میکالے نے اپنے عزائم مخفی نہیں رکھے اور صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی''۔(۱۹)

اسلامی تہذیب و تمدن پر عیسائیت کے حملے

ایک طرف علما کو پھانسی کی سزا دی جارہی تھی اور ایک ایک وقت میں کئی کئی سو علما کو تختۂ دار پر چڑھایا جارہا تھا، انھیں پابند سلاسل کیا جارہا تھا یا جلاوطنی پر مجبور کیا جارہا تھا، دوسری طرف عیسائی مشنریز ملک کے طول و عرض میں اپنا جال پھیلا رہی تھیں اور کوشش کی جارہی تھی کہ ہندوستان پر عیسائیت کا جھنڈا بلند کر دیا جائے اور یہ امر یقینی بنا دیا جائے کہ اس ملک کا ہر شہری عیسائی ہو، اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے، مسلمانوں کو عیسائی بننے کی صورت میں ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا

---

(۱۶) حکومت خود اختیاری ص:۱۳۶ (۱۷) شیخ الاسلام کا خطبۂ صدارت ص ۱۵ پچاس سالہ اجلاس عام آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۱۸) حکومت خود اختیاری ص:۵۵ (۱۹) بحوالۂ مدینۂ بجنور ۲۸ر فروری ۱۹۲۷ء

کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا:۔

"محمد علی کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال اور مستقبل کی تفسیر کرنا ہے کہ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نمایندہ بھی۔ ایک بیدار ہونے والے ملک، ایک خواب گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بے تابی، سارا وفور شوق، ساری سرگرمی، ساری سرفراموشی، ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی۔ یہی نہیں اس کی ذات آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں، بے ترتیبیوں اور ہنگاموں کا مظہر بھی تھی۔ نامساعد حالات سے جنگ پیہم، بے سروسامانی، بے یاری و مددگاری، ہمرہوں کی خفتہ پائی، ہمنواؤں کی کج فہمی، غرض کونسی چوٹ تھی جس نے اس کی روح کے گوشہ گوشہ کو گھائل نہ کر دیا ہو۔ وہ ہماری قومی و ملی زندگی کی اجمالی تصویر تھا، مگر بس ایک خاکہ دھندلا سا اور نامکمل، اس کی تکمیل کا پورا حق بیسویں صدی میں اسلام اور ہندستان کی سرگزشت لکھنے والا مورخ ادا کر سکے تو کر سکے مگر اس نمایندہ اور قائد کے سینہ میں ایک آگ تھی، جس کی چنگاری سے خفتہ ملتیں بیدار اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ وہ آگ جو باطل دوستوں کے لیے بہت ناگوار شعلہ نوائی کی شکل میں ظاہر ہوتی، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی، اپنے سوز کے اس دفینۂ آتشیں سے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے سینہ میں کچھ چنگاریاں منتقل کر گیا ہے جو اس کے ان خوابوں کی تعبیر کی ضمانت ہیں جنھیں نادان سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ختم ہو گئے..."

گیا۔ جو لوگ سالہا سال کی جنگ اور بدامنی کے نتیجے میں غریبی کی سطح سے نیچے جا چکے تھے انھیں ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج دے کر عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا۔ بہ قول سرسید ''غریب آدمی کے لئے یہ اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ اس کے عوض بخوشی اپنی گردن کٹوانے پر تیار ہو جاتا تھا (۲۰) جو لوگ ملازمتوں اور مال و دولت کے جھانسے میں نہیں آتے تھے ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ عیسائی پادریوں اور مبلغوں کو اسلام کے خلاف زہر اگلنے اور اپنی جارحانہ تقریروں سے مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کی کھلی چھوٹ دی گئی، برطانیہ کی پارلیمنٹ نے طے کیا کہ ہندوستان میں اعلا مناصب پر ایسے پادریوں یا عالموں کو مقرر کیا جائے جو مناظروں سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ بھی کر سکیں، چنانچہ گورنری اور دوسرے عہدوں پر ایسے لوگ مقرر کئے گئے جنھوں نے اسلام کے خلاف دل آزار کتابیں لکھیں، اور اپنی نگرانی و سرپرستی میں اسلام اور عیسائیت کے خلاف مناظرے کرائے، عیسائی مبلغوں کو اس حد تک چھوٹ دی گئی کہ وہ بازاروں میں، مسجدوں کے دروازوں پر، اور ایسی جگہوں پر جہاں عام مسلمان اٹھتے بیٹھتے ہوں عیسائیت کی تبلیغ کریں اور اسلام کے خلاف زہر پھیلائیں۔

بلاشبہ عیسائی مبلغین نے اپنی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمانوں کے نامساعد حالات، جہالت، غربت، اور اقتدار سے محرومی وغیرہ کی بنا پر عیسائیت کی تبلیغ میں کامیابی حاصل کی، چنانچہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی لکھتا ہے ''انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انھیں خوب کامیابی مل رہی ہے، ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، (۲۱) ایک جگہ لکھتا ہے: ''ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے۔'' (۲۲)

عیسائیت کے طوفان کو روکنے کے لئے
حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کا عملی اقدام

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے اپنی زندگی کے ۳۰/۳۵ سال ایسے ہی ناگفتہ بہ اور غیر مساعد حالات میں گزارے، وہ اگرچہ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد کچھ دن گوشہ نشین بھی

(۲۰) اسباب بغاوت ہند ص: ۴۰ (۲۱) خطبات گارساں دتاسی ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ ج اص: ۳۰۳ (۲۲) حوالہ سابق ج اص: ۴۷۸

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء

مختار احمد انصاری کے اجداد محمد بن تغلق کے عہد میں سرزمین عرب سے ہندستان آکر یوپی کے ضلع غازی پور میں واقع یوسف پور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہیں ۲۰ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو ان کی پیدائش ہوئی۔ وہ اپنے والد حاجی عبدالرحمٰن کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ حاجی عبدالرحمٰن ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے وہ ضلع بلیا میں امین تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو روایتی تعلیم گھر کی چہار دیواری میں دلوائی۔ بعد ازاں انھیں الہ آباد بھیج دیا جہاں ۱۸۹۶ء میں مختار احمد نے میر سینٹرل کالج سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے نظام کالج حیدر آباد سے بی اے کی سند لی اور پھر نظام حیدر آباد کی اسکالر شپ پر اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر لندن روانہ ہو گئے۔

۱۸۹۱ء میں مختار احمد انصاری نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری کی ڈگریاں حاصل کیں اور لاک ہسپتال میں کلینکل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد ازاں ان کا تقرر ریزیڈینٹ میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے چیرنگ کراس ہسپتال لندن میں ہو گیا۔ ان کے اس تقرر کو انگلستان کے اخبارات نے بہت اچھالا اور انگریز ڈاکٹروں کے ساتھ شدید ناانصافی سے تعبیر کیا۔ وہاں ڈاکٹر انصاری کو شاہِ انگلستان کے اعزازی سرجن ڈاکٹر بائڈ کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہیں ان کی ملاقات حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے ہوئی جو زندگی بھر کی رفاقت میں بدل گئی۔ وہیں ان کی دوستی نامور شاعر محمد اقبال سے ہوئی اور وہیں سے انھوں نے ان پارٹیوں میں شرکت کی جن میں ہندستان کے ممتاز رہنما شریک ہوتے رہے تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کی شادی ۱۸۹۹ء میں شمس النساء بیگم کے ساتھ ہو گئی جنھوں نے آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر انصاری ۱۹۱۰ء میں انگلستان سے ہندستان واپس ہوئے تو انھیں میڈیکل کالج لاہور میں پرنسپل کے عہدے کی پیش کش ہوئی مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا کیونکہ وظیفہ کی شرائط کے تحت ان کے لیے کچھ مدت تک حیدر آباد میں ملازمت کرنا ضروری تھا۔ بعد ازاں

رہے، اور حج کے لئے بھی تشریف لے گئے، اور بسلسلۂ ملازمت میرٹھ میں بھی مقیم رہے، مگر عیسائیت کے پھیلتے ہوئے اثرات، ملک میں انگریزی اقتدار کے استحکام سے پیدا ہونے والے خطرات اور اندیشے ان کے دل ودماغ پر چھائے رہے۔

اس سخت اور جاں گسل صورت حال میں حضرت مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کرام کے سامنے ایک اہم سوال آیا اور یہ سوال ان کی فکری بصیرت کا امتحان تھا، سوال یہ تھا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا، جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدوجہد کی، جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کے لئے لاتعداد دانش گاہیں قائم کیں، دینی درسگاہیں بنائیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو جائے؟ اس سوال نے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کے ذہن وفکر کو متاثر کیا ۱۸۵۷ء کی شکست نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنی آزادی فنا کر چکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، جو ہماری سیاست پر ہی اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے، عام ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں، ہمیں اب مفتوح کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے، فاتح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا اہم سوال پیدا کیا، کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے حوالے کر دیں، اپنی تہذیب، ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کر دیں ضرورت تھی کہ کوئی مرد خدا کھڑا ہو اور اپنی فکری بصیرت سے اس سوال کا جواب ڈھونڈے اور اس مسئلے کا حل سوچے، اور اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے سامنے آئے۔

یہ ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا سوال تھا، شکست خوردہ قوم سر اٹھانے کے قابل بھی نہ تھی چہ جائیکہ وہ کچھ سوچ سکے، یا کوئی اقدام کر سکے، ۱۸۵۷ء کی بربادی پر چند ہی سال گزرے تھے اور اس کے لرزہ خیز مناظر دیکھنے والے بہ قید حیات تھے۔

اس مسئلے کے دو حل سوچے گئے، ایک علی گڑھ میں جو زمانی اعتبار سے مؤخر ہے مگر ہم اس کو پہلے ذکر کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا دیوبند میں، علی گڑھ میں جو حل سوچا گیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم پر

انھوں نے اپنے احباب اور رفقا کے مشورے پر دہلی میں مطب قائم کرنے کا فیصلہ کیا جہاں ان کی سرگرمیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہونے کے امکانات روشن تھے۔ انھوں نے مسجد فتح پوری کے ایک حصے میں مطب شروع کیا اور موری گیٹ کے قریب "بہشت" نامی ذاتی مکان میں سکونت اختیار کی۔ یہ مکان بڑی اہمیت کا حامل رہا کیونکہ اسے سی ایف اینڈ ریوز ای۔ ایم فاسٹر، سید راس مسعود جیسی شخصیتوں کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر انصاری دریا گنج میں منتقل ہوگئے اور اپنے ذاتی مکان "دار السلام" میں سکونت اختیار کرلی "دار السلام" کو تحریک آزادی کی تاریخ میں بڑا اہم مقام حاصل ہے کیونکہ ڈاکٹر انصاری کی وفات تک یہ ہندستانی رہنماؤں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا جہاں قوم پرور جماعتوں کے جلسے منعقد ہوتے تھے اور اہم فیصلے کیے جاتے تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے جہاں اپنی معالجانہ صلاحیتوں کے سبب شہرت حاصل کی وہیں سیاسی خدمات میں بھی ناموری پائی۔ اگر مریضوں کے سلسلے میں ان کی تشخیص فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی تو ملکی مسائل میں بھی ان کی رائے کو حرف آخر تصور کیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اخیر تک ان کی اعلا شخصیت قومی سیاست پر اثر انداز رہی اور قومی و بین الاقوامی سیاست میں انھیں ہمیشہ بلند مرتبہ حاصل رہا۔

اگرچہ ہندستان واپسی پر انھیں ملکی مسائل سے دلچسپی ضرور تھی لیکن ان کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب انھوں نے جنگ بلقان کے دوران ہندستانی معالجوں پر مشتمل ایک طبی مشن لے کر ترکی جانے کا فیصلہ کیا تاکہ میدان کارزار میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاسکے اور طبی امداد بہم پہنچا کر ترکوں کے حوصلوں کو بلند رکھا جاسکے۔ اُن دنوں ترکی فوج کی میڈیکل سروس کا قیام تازہ تازہ عمل میں آیا تھا اور وہ اس قابل نہ تھی کہ جنگ کی خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرسکتی جبکہ ترکی کے حریف کو مغربی طاقتوں نے نہ صرف وسیع پیمانہ پر جنگی ساز و سامان مہیا کیا تھا بلکہ اس کے زخمیوں کے لیے طبی امداد کا بھی معقول انتظام کردیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے اس مشن کی ترتیب میں مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں پیش پیش رہے۔ ڈاکٹر انصاری کے الفاظ میں "انگریزی حکومت کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اپنی اجتماعی حیثیت سے ہندستان سے باہر کے مسلمانوں کی اعانت کے لیے ایک وفد روانہ کیا تھا"۔ یہی سبب ہے کہ یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو وفد کو رخصت کرتے وقت دہلی کی جامع مسجد اور "اس کے سامنے کے میدان میں آدمیوں کے سروں کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی"۔ اور جب وہ دہلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو رخصت کرنے والوں کا ہجوم اس

ایک قوم تسلط حاصل کر چکی ہے، دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تا کہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے، اسی طرز فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی جسے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کہا جاتا تھا اور آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہا جاتا ہے، سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۶ء علی گڑھ میں فرمایا تھا:

''اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہو سکے ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں جو ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لئے ضروری ہیں سر برآوردہ ہوں''۔ (۲۳)

سرسید مرحوم برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے اور اس حکومت کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، بلکہ کسی حد تک ان کی تہذیب سے متاثر بلکہ مداح بھی تھے جیسا کہ گارساں دتاسی نے اپنے ایک لکچر میں لکھا ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے، اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خاں ہیں جو غازی پور میں ہیں (۲۴) اس میں شک نہیں کہ سرسید اپنی قوم کے تئیں مخلص، اور ان کی اصلاح و بقا کے لئے پُر جوش تھے، مگر وہ مذہب کے بجائے شخص کا تحفظ کرنا چاہتے تھے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم ہے، اسے فاتح قوم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے اور اپنی وفاداری سے اس کا دل جیتنا چاہیے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان پرانے علوم ترک کریں، نئے علوم حاصل کریں، پرانی روایات چھوڑیں، نئی تہذیب اختیار کریں، پستی سے بلندی کی سطح تک پہنچنے کے لئے اور معاشی تفوق حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم حاصل کی جائے اور خود کو جدید تہذیب کے سانچے میں ڈھالا جائے، سرسید اس نقطۂ نگاہ کی تبلیغ میں اس قدر پر جوش تھے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی تائید کے لئے قرآن و حدیث سے استدلال میں جرأت بیجا کا مظاہرہ شروع کر دیا، اس کا بہت کچھ اندازہ ان کے ان مضامین و مقالات سے ہوتا ہے جو ''تہذیب الاخلاق'' کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

سرسید مرحوم نے انگریزوں کے تئیں اپنی خدمات سے حکومت وقت کا جو اعتماد حاصل کر لیا تھا اس سے انھیں اپنے کام میں بڑی مدد ملی، شخصی طور پر بھی وہ اعزاز و اکرام سے نوازے گئے، یہاں تک

(۲۳) روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء علی گڑھ (۲۴) خطبات گارساں دتاسی ج ا ص: ۴۱۸

قدر کثیر تھا کہ مشن کے ممبروں کو اپنے ڈبہ تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ دراصل وفد کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں نے اپنی تمام تر آرزوئیں اور توقعات وابستہ کرلی تھیں، جس کا ثبوت مولانا ابوالکلام آزاد کے ان الفاظ سے ملتا ہے جو انھوں نے وفد کے اراکین سے خطاب کرتے ہوئے "الہلال" میں شائع کیے تھے۔ مولانا نے لکھا تھا:

"اے بلقان جانے والے غیور اور ہمدرد مسلمانو!

جب تم وہاں پہنچنا تب نہایت ہی احتیاط اور نرمی سے زخمی ترکوں کے زخم دھونا

دیکھنا! وہ دُکھنے نہ پائیں

کیونکہ وہ زخم ترکوں کے نہیں بلکہ قوم اسلام کے زخم ہیں

اسلام کے زخموں کو مرہم پٹی کی ضرورت ہے

ان زخموں کو اپنا زخم خیال کرنا اور نہایت احتیاط سے ان پر پٹیاں چڑھانا"۔

یہ الفاظ ہندستان کے مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو دولت عثمانیہ کے مرکز خلافت یعنی ترکی پر ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار تھے اور اس عظیم شخص کے قلم سے ادا ہوئے تھے جس کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے فرمایا تھا کہ "ہم صدیوں سے محو خواب تھے ابوالکلام نے ہمیں بیدار کردیا"۔ علامہ شبلی نعمانی تو اس سلسلے میں اتنے جذباتی ہو گئے کہ جب ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو طبی وفد کے اراکین لکھنؤ اسٹیشن سے گزرے تو انھوں نے ڈاکٹر انصاری کا بوٹ چوم لیا۔ طبی مشن ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے روانہ ہو کر ترکی پہنچا تو ترک عوام نے اس کا شایان شان خیر مقدم کیا اور اس کی آمد پر ہندستانی مسلمانوں کے تئیں اظہار تشکر کیا۔ اگرچہ طبی مشن کو اپنی خدمات کی انجام دہی میں خاصی دشواریاں پیش آئیں تاہم انھوں نے ان کی کبھی پروا نہ کی اور وہ مجروحین کے زخموں پر مرہم رکھتے رہے۔ اپنے قیام کے دوران کبھی کبھی تو انھیں محض پنیر اور ڈبل روٹی پر گزارا کرنا پڑا اور ہسپتال قائم کرنے اور خیمے نصب کرنے کے سلسلے میں بھی بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔

ڈاکٹر انصاری اور ان کے رفقاء ترکوں کی خدمت میں مشغول رہ کر دنیائے اسلام سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے اور جب وہ ۴ر جولائی ۱۹۱۳ء کو اپنے وطن عزیز واپس ہوئے تو ان کے ہم وطن ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھے۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے منظوم خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

کہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انھوں نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی ان کی توقیر کم نہ کر سکی بلکہ انگریزوں نے اس کتاب کو ایک مخلص کے خیالات سمجھ کر بڑی اہمیت دی، اور اس سے ان کی قدر ومنزلت میں بڑا اضافہ ہوا، یہ تھا سر سیدؒ کا نظریہ جو دار العلوم کی تاسیس کے بعد ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی تاسیس کا سبب بنا۔

دیوبند میں جو حل تجویز ہوا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہمیں حاکم وقت کی زبان اور اس کے علوم کے بجائے اپنے دینی علوم کی بقا اور تحفظ کے لئے کوشش کرنی چاہیئے، یہی فکر دار العلوم کی بنیاد کا سبب بنا، دار العلوم کے بانیوں کا مقصد اسلام کی حفاظت کے لئے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی تعمیر کرنا تھا تاکہ اسلام کو ہر خطرے سے بچایا جا سکے۔ اور جو چراغ ہزار برس تک اس ملک میں جلتا رہا وہ لادینیت کی تیز ہواؤں سے گل نہ ہونے پائے، قوم کے نونہال الحاد اور تشکیک کے کارخانوں میں جانے کے بجائے ان اداروں میں پلیں، بڑھیں اور پروان چڑھیں جہاں ان کو ان کے مذہب کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ ان کا دل، ان کا دماغ، ان کا کردار سب کچھ اسلام کے مطابق بنایا جا سکے، حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے اپنی ایمانی بصیرت سے اندازہ کر لیا تھا کہ اگر ان حالات میں مسلمانوں کے دین اور ایمان کی حفاظت اور تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہوا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان عیسائیت کے فریب میں نہ آجائیں اور خدانخواستہ ایمان کی دولت سے محروم نہ ہو جائیں، ان کی فراست ایمانی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ دین کا تحفظ ہے، خواہ اس کے لئے کتنے ہی افراد کیوں نہ کام آجائیں، اور خواہ اقتصادی اور معاشی میدانوں میں کتنے ہی پیچھے کیوں نہ ہو جائیں۔

مجموعی طور پر دیوبند تحریک نے اس وقت کے مایوس کن حالات میں امیدوں کے چراغ جلائے اور اس خوفناک ماحول میں دینی جدوجہد کا آغاز کیا جس نے مسلمانوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت بلکہ حالات کے آگے سر جھکانے پر زور دینے لگے تھے، دیوبند نے ان حالات کا رُخ موڑا اور ہندوستان کے مایوس و مجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، ان کے بے جان جسموں میں عزائم کی روح پھونکی، اور اس طرح اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں پر سخت پہرے بٹھا دیئے، حجاز مقدس میں جب دار العلوم کے قیام کی اطلاع حضرت

ہزاروں کوس جاکر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ خودداری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
تمہارے ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری
نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

چنانچہ ڈاکٹر انصاری جب "درد کی چنگاریاں" دل میں چھپائے وطن واپس ہوئے تو وہ ہر ہندستانی مسلمان کے دل میں دہکنے لگیں۔ ان کے مشن کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ پہنچا کہ ہندستان اور ترکی کے درمیان روابط قائم ہوگئے اور دنیائے اسلام ہندستانی مسلمانوں کے جذبات سے واقف ہوگئی۔ بین الاقوامی شہرت کی معراج پر پہنچنے کے بعد ڈاکٹر صاحب پر اعزازات کی بارش ہونے لگی اور ہر تحریک میں ان کی شرکت کو کامیابی کی ضمانت سے تعبیر کیا جانے لگا۔ انھوں نے حکیم اجمل خاں کے ساتھ قضیۂ کانپور کو حل کرنے میں مدد دی اور ہر اس آواز پر لبیک کہا جو ہندستان کے مختلف گوشوں سے ان کی امداد کے لیے بلند ہوئی۔

ڈاکٹر انصاری کی سرگرمیاں مسلمانوں کے مسائل کی حدود سے نکل کر باہر بھی پھیلتی گئیں اور ملک کی صورت حال کے پیش نظر پوری قوم پر محیط ہوگئیں۔ انھوں نے مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کی فیصلہ سازی میں اہم حصہ لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۱۷ء میں انھیں ہوم لیگ کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا جو اس وقت ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا کیونکہ اینی بیسنٹ کی قائم کردہ ہوم لیگ ہی وہ جماعت تھی جس سے وابستگی کے بعد ہی مستقبل کے بیشتر رہنماؤں نے کامیابی کی منزلیں طے کیں، اس کے بعد تو تقریباً سبھی سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں ڈاکٹر صاحب کی قیادت کی خواہش مند رہنے لگیں۔

۱۹۱۸ء میں دہلی میں منعقدہ مسلم لیگ کے گیارہویں اجلاس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری کا انتخاب عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بڑی بے باکی اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانوی حکومت کو ہندستانی امراض کا سبب بتایا، افسر شاہی کی مذمت کی اور میثاق لکھنؤ کے خطوط پر آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ خلافت سے

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو دی گئی تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکلی ''اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا''۔

دار العلوم کا قیام

اس الہامی تحریک کی ابتدا ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ہوئی، یہ تحریک اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ تھا، ہندوستان میں عربی مدارس اور دینی درسگاہوں کی کبھی کمی نہیں رہی، لیکن یہ مدرسہ عربی علوم وفنون کی تعلیم سے زیادہ اسلام کی اشاعت، اور اس کے تحفظ ودفاع کے لئے جدوجہد کا عظیم مرکز بن رہا تھا، ابتدا میں نہ اس کی کوئی مستقل عمارت تھی اور نہ ایسی کوئی باقاعدہ جگہ جہاں اس کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوسکتا، ایک چھوٹی سی قدیم طرز کی مسجد تھی، جو دیوبند میں مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے، یہی مسجد اس مدرسے کی سب سے پہلی عمارت تھی، درسگاہ کے نام پر انار کا ایک درخت تھا جو آج بھی موجود ہے، اسی درخت کے سائے میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا، ایک شاگرد اور ایک استاذ، قصبے کے ایک عالم ملا محمود نے پہلا سبق پڑھایا اور دیوبند ہی کے ایک طالب محمود حسن نے پہلا سبق پڑھا۔ بعد میں یہ طالب علم مدرسے کا شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بنا اور شیخ الہند کہلایا۔ جن لوگوں نے اس عظیم جدوجہد کا آغاز کیا اور جن مبارک ہاتھوں سے اس عظیم ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی ان میں حاجی سید عابد حسینؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین دیوبندیؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانی جیسی شخصیتیں تھیں۔

دار العلوم دیوبند کی تاسیس اور حضرت نانوتویؒ

یہ صحیح ہے کہ جس وقت ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو دار العلوم کا قیام عمل میں آیا اس وقت حضرت نانوتویؒ دیوبند میں نہیں تھے، بلکہ میرٹھ کے ایک مطبع میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، یہ بات بھی صحیح ہے کہ چندے کی تحریک اور اس کی ابتداء حضرت حاجی عابد حسینؒ نے کی اور دوسرے حاضرین نے ان کا ساتھ دیا، اور بہت جلد قصبے کے مخیّر حضرات سے ایک معقول رقم جمع کرلی گئی، جب یہ سب کچھ ہوگیا تو حضرت حاجی صاحب نے حضرت نانوتویؒ کو خط لکھا: ''کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہوگئے ہیں اور اب آپ تشریف لے آیئے (۲۵) حضرت نانوتویؒ نے اس پر جواب میں تحریر فرمایا:

---

(۲۵) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰

متعلق ڈاکٹر انصاری نے اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے پان اسلام ازم کا نام لے کر مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرانے والے فرقہ پرستوں کی مذمت کی۔ انھوں نے کہا:

"میں نے بعض دوستوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ 'ہندستان کا مسلمان جزیرہ نمائے گیلی پولی کی ایک انچ زمین کے بدلے سارے ہندستان کو قربان کردینے کے لیے تیار ہے' حضرات اس قسم کی باتوں سے جن کی تصدیق واقعات ہرگز نہیں کرتے حقائق کے چہرے کو مسخ کیا جاتا ہے۔ ہندستان کے ہر معرکہ میں ہم اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں شانہ بشانہ رہے ہیں۔۔۔ میرا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ سچا وطن پرست ہوگا"۔

اسلامی ممالک سے مسلمانوں کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"اگر ہم مسلمانانِ ترکی وایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرزِ عمل نے ثابت کردیا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت بھی کرتے ہیں جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں"۔

ڈاکٹر انصاری نے اپنی تعلیم انگلستان میں مکمل کی تھی۔ وہ وہاں کے طرزِ جمہوریت سے متاثر تھے اور اسی نظام کو ہندستان میں قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس طرزِ حکومت کو ہندستان میں رائج کرے۔ دراصل پہلی جنگ عظیم میں ہندستانیوں نے اسی توقع پر حکومت برطانیہ کی مدد کی تھی کہ جنگ کے بعد ان کے ملک کو بھی لباسِ جمہوریت سے آراستہ کردیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری نے کہا:

"یہی (جمہوریت) وہ دل نواز نظامِ عالم ہے جس کے قیام کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی غرض سے ہندستان نے اس قدر فیاضی کے ساتھ جان ومال سے مدد کی ہے۔ پس اب کہ دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کیا جارہا ہے ہندستان کے حقوق کسی طرح نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ فرزندانِ ہند کا خون براعظم یوروپ کی سرزمین پر ایشیا کے میدانوں اور افریقہ کے ریگستانوں میں اس لیے نہیں بہایا گیا ہے کہ غیر قوموں کو آزادی دلائی جائے مگر اپنے پاؤں کی زنجیروں کو گراں تر کردیا جائے"۔

ڈاکٹر انصاری کے خیالات کو برطانوی حکومت نے خطرناک سمجھتے ہوئے ان کے خطبۂ استقبالیہ کو ضبط کرلیا۔ خطبہ کی ضبطی نے انصاری کی مقبولیت میں مزید اضافہ کردیا اور عوام ان کی جرأتِ

''میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود کو پندرہ روپئے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔''(۲۶) اس خط و کتابت سے پتہ چلتا ہے کہ قیام دارالعلوم کے وقت حضرت نانوتویؒ دیو بند میں نہیں تھے، اور وہ کسی مصلحت کے باعث دیو بند تشریف نہیں لا سکے۔ لیکن انھوں نے ایک صاحب اختیار شخص کی حیثیت سے مدرس کا تقرر کیا اور تنخواہ مقرر کی، ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے خط میں یہ مضمون بھی تھا: ''وہ جو آپ کے اور ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہیے کیونکہ ایک سوال پوچھنے کے لئے آدمی کو سہارنپور بھیجنا پڑتا ہے، فقیر کے دل میں ایک دم خیال آ گیا اور چندے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر و مغرب کے درمیان تین سو روپئے ہوئے آپ تشریف لائیے''(۲۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کا قیام محض کسی ایک شخص کی تحریک یا خیال سے دفعۃً عمل میں نہیں آیا بلکہ بہت پہلے ممکن ہے کئی سالوں سے اس سلسلے میں مذاکرات ہو رہے ہوں اور جب حضرت نانوتویؒ دیو بند تشریف لاتے ہوں تو اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہو اور منصوبے تشکیل دیئے جاتے ہوں۔

ویسے بھی جب ہم حضرت نانوتویؒ کو دارالعلوم دیو بند کا بانی کہتے ہیں تو ہماری مراد اس مکتب سے نہیں ہوتی جو مسجد چھتہ میں قائم ہوا تھا بلکہ اس روحؒ سے ہوتی ہے جو بلاشبہ حضرت نانوتویؒ کی پھونکی ہوئی تھی اور اس فکر سے ہوتی ہے جو حضرت نانوتویؒ نے دیو بند کے مدرسے کو عطا کیا اور یہ ایک چھوٹا سا پودا تناور درخت بنا جس کی سایہ دار شاخیں آج دُور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسے کو دارالعلوم اور دارالعلوم کو ایک تحریک بنا دینا یہ حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت کا کارنامہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے اپنی فکری بصیرت سے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء اور اسلام کا تحفظ صرف مدارس اسلامیہ کے ذریعے ہی ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم ہی کے طرز پر مراد آباد، امروہہ، اور گلاوٹھی وغیرہ میں عربی دینی مدارس قائم کئے، اس حیثیت سے اگر حضرت نانوتویؒ کو بانی مدارس ہند کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

---

(۲۶) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰ (۲۷) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰، ص: ۲۹

اظہار کو نگاہِ تحسین سے دیکھنے لگے۔ دراصل اس اجلاس کو تحریکِ خلافت کے سنگِ بنیاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں ڈاکٹر انصاری نے پہلی مرتبہ علمائے ہند کو سیاسی امور میں شرکت پر رضامند کر لیا۔ انھوں نے علماء کو خوش آمدید کہتے ہوئے مذہبی امور میں ان کی رہنمائی کو سراہا اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ مسلم لیگ کی مستقل رکنیت کو قبول کر لیں چنانچہ ان کی کوشش اور حسنِ تدبیر سے علمائے ہند جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ملکی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے دوبارہ قومی سیاست کے میدان میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ علماء سے ڈاکٹر انصاری کی قربت کا سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے طبی مشن کی قیادت کی تھی اور ترکی کے مجروحین کے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے مغربی فضا میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان کی روح پر ہمیشہ مشرقیت ہی غالب رہی اور انھوں نے دنیا کے عوض کبھی دین کا سودا نہیں کیا۔ ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے حکیم اجمل خاں کے ساتھ دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ سے بڑا تعاون کیا تھا جس کے بانی مولانا عبید اللہ سندھی تھے جن کا تعلق براہِ راست علماء سے تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ محفوظ رہی کہ جب تک علماء کو مسجد و خانقاہ سے باہر لا کر سیاست سے ہمکنار نہ کر دیا جائے گا تب تک کوئی مذہبی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب تھا کہ علماء نے فتوے جاری کیے اور سیاست کے محاذ پر دوسرے رہنماؤں کے ساتھ صف بستہ ہو گئے۔

پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام پر ہندستانی عوام برطانوی حکومت سے جنگ میں بھرپور تعاون کے صلہ میں کسی گراں بہا عطیہ کے منتظر تھے لیکن مغربی حکمرانوں نے ۱۹۱۹ء میں انھیں رولٹ بل کی شکل میں سیاہ قانون سے نوازنے کا منصوبہ بنایا۔ اس موقع پر موہن داس کرم چند گاندھی جو افریقہ سے واپسی کے بعد عدم تشدد کی بنیاد پر بہار اور بمبئی میں ستیہ گرہ کی صداقت کا ثبوت دے چکے تھے میدانِ عمل میں اتر آئے اور انھوں نے سیاہ قانون کے خلاف ملک گیر سطح پر ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں عہد نامہ پر دستخط کرنے والوں میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ ڈاکٹر انصاری بھی تھے۔ ان کی مقبولیت اور شخصیت پر اعتماد اس درجہ کو پہنچا کہ انھیں دہلی کی ستیہ گرہ سبھا کی صدارت کا بار سونپ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قیادت میں ستیہ گرہ کو بخوبی انجام تک پہنچایا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ وہ دہلی میں سب سے نمایاں اور ممتاز ستیہ گرہی ثابت ہوئے۔ انھوں نے ستیہ گرہ کی حمایت میں تقریریں کیں اور اسے مقبول بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ستیہ گرہ کے طریقے کو تو خود پیغمبر اسلامؐ نے بھی پسند فرمایا تھا۔ ان کی کوٹھی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی

حضرت نانوتویؒ دیوبند تشریف لائے اور مدرسے کے آغاز ہی میں تشریف لائے، جیسا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے "سوانح عمری" میں لکھا ہے کہ: "مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس کے سرپرست ہوئے" (۲۸) انھوں نے دیوبند آکر کوئی نیا مکتب یا نیا مدرسہ نہیں بنایا بلکہ جو مدرسہ ان کے مشورے اور رائے سے قائم ہوا تھا اسی کو خلوص اور للّٰہیت کے جذبے سے ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا، اور اس کو ایک ایسا نظام، ایسا فکر اور طریقہ کار بخشا جس کی نظیر نہیں ملتی، انھوں نے اپنی فکری بصیرت سے دارالعلوم کو جو نظام عطا کیا تھا، اور جو اصول بخشے تھے آج ایک سو چونتیس سال گزرنے کے باوجود وہ اسی طرح تروتازہ، اسی طرح بامعنی، بامقصد اور اسی طرح مفید اور مؤثر ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے بڑی مختصر زندگی پائی ہے، دارالعلوم ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا اور ۱۸۸۰ء میں آپ رحلت فرما گئے، قیام دارالعلوم کے وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر صرف ۳۴ سال تھی اور جب انتقال ہوا تو ۴۸ برس کے تھے، اس طرح آپ کو صرف ۱۴ رسال خدمت کا موقع ملا، کسی تحریک کو بام عروج تک پہنچانے کے لئے یہ بہت معمولی مدت ہے، مگر اللہ نے چودہ سال کی اس مدت کو اس قدر وسعت بخشی اور اس میں اس قدر برکت عطا کی کہ جو کام برسوں میں بھی ممکن نہ تھا وہ بہت کم عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، دارالعلوم مسلمانوں کی آبرو بن کر ابھرا، اس کی شہرت مشک کی دلآویز خوشبو کی طرح دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لئے اس طرح لپکے جس طرح بے آب وگیاہ میدان میں پیاسے مسافر پانی کی طرف لپکتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے دارالعلوم کو کیا دیا؟

حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے دارالعلوم اور اس کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس کو جو گراں قدر تحفہ عطا کیا ہے وہ ان کے اصول ہشتگانہ ہیں، جو دارالعلوم کی بنیاد اور اساس کہے جا سکتے ہیں، یہ اصول جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں بانی دارالعلوم نے نہایت غور وفکر کے بعد تجویز فرمائے اور تاریخ نے ثابت کیا کہ ایک سو چونتیس سال پہلے بھی یہ نہایت اہم، مفید، مؤثر تھے اور اس وقت بھی ان کی افادیت اور اہمیت اسی طرح برقرار ہے۔ یہ آٹھ اساسی اصول ہیں، جن کا متن تاریخ

(۲۸) ص: ۳۹

جہاں جلسے منعقد ہونے لگے اور عمائدین قوم ان میں شریک ہونے میں فخر کا احساس کرنے لگے۔ ستیہ گرہ کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد دہلی میں احتجاجی جلسہ اسی کوٹھی کے احاطہ میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں ہندو مسلم عوام نے حصہ لیا۔ اسی کوٹھی کے صحن میں بدیسی چیزوں کے مقاطعہ کا عہد کیا گیا اور اسی کوٹھی کے میدان میں قومی تحریک کو مضبوط کرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ ان کی کامیاب قیادت اور باغیانہ روش کے پیش نظر حکومت کے چند افسران نے انھیں گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی لیکن اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے خوف سے وہ ایسا نہ کرسکے۔

رولٹ بل ستیہ گرہ کے بعد ڈاکٹر انصاری ملک کے مسلّم الثبوت رہنما تسلیم کیے جانے لگے۔ انھوں نے تحریک خلافت کے سلسلہ میں بڑی اہم خدمات انجام دیں اور تحریک عدم تعاون کو بڑا سہارا دیا۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے قریب آجائیں اور اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں کانگریس، لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء کے اجلاس بیک وقت منعقد ہو رہے تھے تو انھوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے حکیم اجمل خاں کی صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کریں۔ اگلے ہی سال ۱۹۲۰ء میں انھیں ناگپور میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع کو بھی ہندو مسلم اتحاد کے استحکام کے لیے استعمال کیا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے آئرلینڈ اور مصر کے مظلومین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے خلافت سے متعلق مسائل کا جائزہ لیا اور معاہدۂ سیورز سے پیدا ہونے والے اثرات ونتائج پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر انصاری تحریک عدم تعاون کے زبردست حامی تھے انھوں نے اس تحریک کو ملکی مسائل کے لیے نسخۂ کیمیا سے تعبیر کیا۔ وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہ تھے اس لیے انھوں نے اعلان کیا کہ:

> "۔۔۔۔ہندستان اب صدیوں کی خوابیدگی سے بیدار ہوچکا ہے، اسے اپنی عزت نفس، خود کفالت اور خود تنظیمی کا احساس ہے کیونکہ اب ہندستان نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ایسے تمام معاملات میں کسی "ثانوی حیثیت" کو تسلیم نہیں کرے گا جو اس کے بنیادی معاملات ہیں اور اس کے فرزندوں سے تعلق رکھتے ہیں۔"

مسلم لیگ کا یہی وہ تاریخی اجلاس تھا جس میں ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں مسلم لیگ کے

دارالعلوم دیوبند کے حوالے سے درج ہے:

(۱) ''اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آ جائے گا، القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو اگر چہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار متدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ

مقاصد میں کانگریس کے خطوط پر تمام تر پرامن اور آئینی ذرائع سے عوام کے ذریعہ سوراج کے حصول کو شامل کیا گیا۔ جس لیگ نے برطانوی حکمرانوں کی وفاداری کے عہد سے اپنا سفر شروع کیا تھا اس نے چودہ منزلیں طے کرتے ہی اپنا رخ بدل لیا اور بغاوت کے اس راستہ پر گامزن ہو گئی جسے عرف عام میں آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب لیگ اور کانگریس میں محض نام کا فرق رہ گیا تھا ورنہ مقاصد دونوں کے یکساں تھے۔ یہی سبب تھا کہ تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کی پشت پناہی کے لیے بیک وقت تمام جماعتیں یک جا ہو کر صف آرا ہو گئیں جن میں ہر فرقہ کے افراد شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے خلافت کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا اور جنوری ۱۹۲۰ء میں وائسرائے سے ملاقات کرنے والے خلافت کے وفد کی قیادت کی۔ بعد ازاں وہ اس وفد کے بھی رکن بنے جس نے مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے صوبائی اور قومی سطحوں پر منعقدہ خلافت کانفرنسوں کی صدارت کی۔ جب حکومت نے اتحادیوں کی فتح کا جشن منایا تو ڈاکٹر صاحب اس جشن کی مخالفت کرنے والی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ دہلی خلافت کمیٹی کے بھی سربراہ تھے انھوں نے علی برادران کے ساتھ خلافت کے پیغام کو عام کرنے کی غرض سے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور کاشی ودیا پیٹھ کے قیام کے سلسلے میں قومی رہنماؤں کی مدد کی۔

ڈاکٹر انصاری تحریک خلافت و عدم تعاون کے بہت بڑے ستون تھے اسی تحریک کے پروگرام کے تحت علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے بانیوں میں وہ خود بھی شامل تھے۔ جب ۱۹۲۲ء میں ضلع گورکھپور میں چوری چورا کے مقام پر تشدد کے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو منسوخ کر دیا تب بھی انصاری عدم تعاون ہی کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد جب حکومت کا جبر انتہا کو پہنچ گیا تو کانگریس نے حکیم اجمل خاں کی صدارت میں سول نافرمانی سے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کی جس کے اراکین میں صدر کے علاوہ پنڈت موتی لال نہرو، راجگوپال آچاریہ، وٹھل بھائی پٹیل اور کستوری رنگا آئنگر کے ساتھ ہی ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے کیم جولائی ۱۹۲۲ء سے اپنا کام شروع کیا اور چار مہینوں کی جانفشانی کے بعد ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس مدت میں کمیٹی کے ممبران نے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور تحریک سول نافرمانی کی تجدید کے امکانات کا جائزہ لیا اور اپنے مرتبہ سوالنامے کے ۴۵۹ جوابات موصول کیے اور ۱۳۶۶ افراد کی شہادتیں قلمبند کیں۔ اس کمیٹی کے کاموں میں ڈاکٹر انصاری نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ کمیٹی نے متفقہ طور پر سفارش کی کہ ایسی صورت میں جبکہ

الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔ (۲۹)

عوامی رابطہ

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں اصل میں حضرت نانوتویؒ نے مدارس اسلامیہ کو عوامی رابطے کی راہ دکھائی ہے، اور یہ بتلایا ہے کہ اہل مدارس عوام میں اپنی جڑیں جتنی گہری کریں گے اتنے ہی وہ اشاعت دین کے لئے مفید و مؤثر ثابت ہوں گے۔ حضرت نانوتوی نے مدارس چلانے کے لئے جاگیریں بنانے اور کارخانے کھڑے کرنے یا آمدنی کے یقینی ذرائع پیدا کرنے سے بھی روکا ہے۔ دراصل یہ دین کا کام ہے جس میں ایک طرح کی بے سروسامانی مطلوب ہے تاکہ فکر پیدا ہو، کیونکہ فکر سے توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے، اور توجہ الی اللہ سے اخلاص پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے امراء و حکام کی امداد کے بجائے عوام کے چندے پر زیادہ زور دیا ہے، عوام سمجھتے ہیں کہ یہ مدارس ان کے تعاون سے چل رہے ہیں، اس لئے وہ طبعی طور پر ان سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں، اگر امراء و حکام مدرسے چلائیں تو عوام سے ان کا تعلق اتنا حقیقی اور پرجوش نہیں رہتا جتنا مطلوب ہے خود ذمہ داران مدارس کو بھی عوام کی اصلاح کی فکر نہیں رہتی بلکہ وہ زیادہ وقت امراء کی چاپلوسی میں گزارنا پسند کرتے ہیں جو مدارس کے مقاصد کے خلاف اور علماء کی شان استغناء کے منافی ہے، تکثیر چندہ پر حضرت نانوتوی کے اس قدر اصرار اور تاکید کا مقصد بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مدارس کا تعلق مستحکم، مضبوط اور ہمہ جہتی ہو۔

---

(۲۹) تاریخ دار العلوم ج ۱ ص: ۱۵۳-۱۵۴

ملک بڑے پیمانہ پر تحریک سول نافرمانی کے احیاء کے لیے تیار نہیں تھا صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو محدود دائرہ میں اپنے طور پر تحریک کو جاری کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ کمیٹی کے اراکین نے متفقہ طور سے سرکاری تعلیمی اداروں، عدالتوں اور برطانوی اشیاء کے مقاطعہ کی سفارش کی لیکن حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور وٹھل بھائی پٹیل نے جب یہ سفارش کی کہ پنجاب کے مظالم اور خلافت سے متعلق حکومت کے رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے انتخابات میں حصہ لے کر کونسلوں میں داخل ہونا چاہیے تو ڈاکٹر انصاری نے اس کی شدید مخالفت کی۔ راج گوپال آچاریہ اور کستوری رنگا آینگر نے ان کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اکتوبر ۱۹۲۲ء کے بعد منعقد ہونے والے ہر جماعت کے اجلاس میں کونسل میں داخلہ کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے اس موقف کی حمایت میں رائے عامہ کو ہموار کیا۔ ان کے نزدیک اس مسئلہ کے دو پہلو تھے ایک اصولی اور دوسرا عملی۔ اصولی طور پر انتخاب میں حصہ لینے والے امیدواروں اور رائے دہندگان کو کچھ رسمی کاغذی کارروائی کی حدوں سے گزرنا لازمی تھا جو یقیناً تحریک عدم تعاون کے جذبہ کے خلاف عمل تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امیدوار اور رائے دہندگان، دونوں ہی حکومت سے تعاون کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں تک عملی پہلو کا تعلق تھا ڈاکٹر صاحب کے خیال میں کانگریس کے امیدواروں کے خلاف حکومت اور اس کے حمایتی امیدوار متحدہ محاذ قائم کر کے کثیر رقمیں خرچ کرتے تھے جس کے وہ خود متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور ایسے مقابلہ کا کانگریسی امیدواروں کی شکست میں منتج ہونا ناگزیر تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے ۱۹۲۲ء ہی میں گیا میں منعقدہ آل انڈیا خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے انتخابات میں حصہ لینے کو فضولیات سے تعبیر کیا اور یہ متبادل منصوبہ تجویز کیا کہ کونسلوں کے انتخابات کے دوران متوازی رائے دہندگی کے مراکز قائم کیے جائیں جہاں کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے لوگ ووٹ دے سکیں۔ یہ ایک نیا طریقہ تھا جو انھوں نے کونسلوں کے مقاطعہ سے متعلق تجویز کیا ویسے ان کی رائے یہی تھی کہ تعمیری کاموں میں حصہ لیا جائے اور ملک کو آزادی کی سمت میں آگے بڑھایا جائے۔ ڈاکٹر انصاری کے انہی خیالات نے انھیں No-Changer کے لقب سے ملقب کر دیا اور کونسلوں میں داخلہ کے حامیوں کو Pro-Changer کہا جانے لگا کیونکہ انھوں نے انتخابات میں حصہ لینے کی غرض سے سوراج پارٹی قائم کر لی تھی۔ دونوں گروہوں کی کشمکش جب حد سے تجاوز کرنے لگی تو ڈاکٹر انصاری نے اس مسئلے کو طے کرنے کی غرض سے ایک خصوصی اجلاس کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ کونسلوں میں داخلہ کی مخالفت کے سبب انھوں نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سے

شورائی نظام

دوسری اہم چیز جو حضرت نانوتوی کی فکری بصیرت سے دارالعلوم کو حاصل ہوئی وہ اس کا شورائی نظام ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کا نظام جمہوری بنیادوں پر رکھا ہے، یہاں روز اول ہی سے شوریٰ قائم ہے جو مہتمم مدرسہ کو مشورے دیتی ہے۔ اور فیصلے کرتی ہے۔ اس اصول کے تحت مہتمم کو اس قدر بااختیار قرار نہیں دیا گیا کہ کسی سے مشورہ لئے بغیر خود ہی اہم اور بنیادی فیصلے کرے، بلکہ اسے یہاں تک ہدایت دی گئی ہے کہ اگر بروقت مستقل اصحاب مشورہ دستیاب نہ ہوں تو وارد و صادر ذی عقل اور صاحب رائے سے مشورہ لے لے، اہل مشورہ کو بھی ہدایت دی گئی کہ وہ صرف اپنی رائے دیں، اس کی صحت پر اصرار نہ کریں۔ اصحاب شوریٰ کو چاہیے کہ وہ محض مدرسے کا مفاد ملحوظ رکھیں، اخلاص کے ساتھ مشورہ دیں، سننے والے نیک نیتی اور دردمندی سے سنیں اور قبول کریں۔

تعلیمی نظام

اصل نمبر (۴) میں مدرسین کے لئے ہم مشرب ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ مدرسے کے نظام میں خلل اور تعلیم و تربیت کے اسلوب میں اختلاف واقع نہ ہو، اصل نمبر (۵) میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مدرسہ کے اساتذہ متعینہ مدت میں مقررہ نصاب کی تکمیل کرائیں۔ اصول ہشتگانہ میں نظام تعلیم کے لئے یہی دو اصول ملتے ہیں، لیکن ہمیں حضرت نانوتویؒ کے چودہ سالہ دور کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی فکری بصیرت نے دارالعلوم کو ایک ایسا موثر، مضبوط اور مستحکم نظام عطا کیا ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

نظام تعلیم دراصل تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے، اساتذہ، نصاب تعلیم اور تربیت۔ اساتذہ کے سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی سوچ یہ تھی کہ مدرسے میں ایسے ماہر اساتذہ رکھے جائیں جو محض کتاب خواں نہ ہوں بلکہ صاحب فن ہوں، اپنے تلامذہ کے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے خود بھی اس ابتدائی مدرسے میں تعلیم دینا ضروری سمجھا جب کہ وہ اپنے ہم عصر علماء میں ایک انفرادی شان رکھتے تھے، طالب علمی کے دور ہی میں ان کی قابلیت اور علمیت کے چرچے دور دور تک پھیل گئے تھے، عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مناظروں نے اس شہرت میں اور اضافہ کر دیا تھا اور بخاری کے آخری چھ پاروں کے حواشی نے اہل علم

استعفیٰ دے دیا۔ ان کے ہم خیال دیگر رہنماؤں نے بھی ایسا ہی کیا جس کے رد عمل میں خود کانگریس کے صدر چترنجن داس بھی مستعفی ہوگئے۔ جب نئی ورکنگ کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو اس نے انتظامی امور کے لیے ڈاکٹر انصاری کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ انھی کی صدارت میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کی تجویز منظور ہوئی۔

ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کے صدر منتخب ہوئے اور مجلس استقبالیہ کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر انصاری نے انجام دیے۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ اب بھی اپنے اس نظریہ پر قائم ہیں کہ اسمبلیوں میں ہندستانیوں کے داخل ہونے کی کوشش بے سود ہے۔ لیکن انھوں نے اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ان کے مخالفین یعنی کونسلوں میں داخلہ کے موافق رہنماؤں کی دیانت داری اور خلوص پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں انھوں نے تجویز کیا کہ کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو دونوں گروہوں کو تسلیم ہو۔ آخر کار ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے سوراج پارٹی کے ممبروں کو انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اگرچہ ڈاکٹر انصاری بذات خود اس پالیسی کے مخالف تھے لیکن انھیں اپنے مخالفین کے جذبہ صادق پر بھی اعتماد تھا، اس لیے اس سلسلہ میں انھوں نے اعتدال پسندانہ روش اختیار کی۔

۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے خلافت کے صدیوں قدیم ادارہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اس سے ہندستانی مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ لیکن ڈاکٹر انصاری نے خلافت کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور ملکی و قومی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے انھوں نے اپنے ایک خط میں مولانا شوکت علی کو لکھا کہ "ایک ہندستانی کی حیثیت سے جس کی اولین وفاداری اپنی مادر وطن سے ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے سبھی فرقہ پرست تنظیموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں"۔ انھوں نے خلافت کے خاتمہ کے مصطفےٰ کمال کے فیصلہ کو درست ٹھہرایا۔

۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم فسادات کے مسئلہ پر گاندھی جی نے مولانا محمد علی کے مکان پر برت رکھ لیا تو ڈاکٹر انصاری نے حکیم اجمل خاں اور مولانا آزاد کے ساتھ مل کر ایک یونٹی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لا کر فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ۱۹۲۵ء میں وہ حکیم اجمل خاں کے ساتھ غیر ملکوں کے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں پیرس میں انھوں نے تحریک عدم تعاون کی افادیت پر لکچر دیے اور ہندستان کے بارے میں مختلف مکاتیب خیال کے افراد سے مذاکرات کیے۔ انھوں نے اٹلی اور آسٹریا کا دورہ بھی کیا اور بہت سے ہسپتالوں اور کلینکوں کا معائنہ کیا۔ بعد ازاں وہ قسطنطنیہ چلے گئے اور حکیم صاحب مارسلیز کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب وہ ۱۹۲۵ء

کو یہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف معقولات میں درک رکھتے ہیں بلکہ ان کو حدیث اور فقہ پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کے باوجود حضرت نانوتویؒ نے اس درسگاہ میں جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تھی مسند تدریس کو رونق بخشی اور حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کو بھی دارالعلوم میں تدریس کے لئے بلایا، ان حضرات کی موجودگی نے دارالعلوم کو عظمت وشہرت کی بلندیوں تک پہنچایا، اور بہت جلد یہ مدرسہ ایک ایسے کارخانے میں تبدیل ہو گیا جہاں سے مسلمان بچے اسلامی علوم وفنون کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے۔

نظام تعلیم کا دوسرا بنیادی پتھر نصاب تعلیم ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کے لئے جو نصاب تعلیم مرتب کیا وہ بہ ظاہر درس نظامی کے نام سے مشہور ہے، لیکن حقیقت میں یہ صرف درس نظامی ہی نہیں ہے جس میں معقولات کی کثرت تھی، اور اس زمانے میں معقولی ہونا ہی علم کی معراج تھی بلکہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامی کے مفید حصوں کو شامل کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی درسگاہ کے نہج پر حدیث شریف کی تعلیم کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، اس طرح ہندوستان میں ایک بار پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ چشمے رواں ہو گئے جو زمانہ کی ستم ظریفیوں سے خشک ہو گئے تھے۔ پھر حدیث شریف کو محض روایۃً نہیں پڑھا گیا بلکہ ہندوستان کے فقہی تناظر میں اس کے ذریعے حنفی فقہ کو مؤید کیا گیا، اس طرز تعلیم نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں حدیث شریف کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، یہی نہیں بلکہ یہاں سے فقہ حنفی کی تائید کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے آتے آتے اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا، اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے پورے اعتماد کے ساتھ اعلان فرمایا "میں نے حنفیت کو اس طرح مستحکم کر دیا ہے کہ انشاء اللہ سو سال تک اس کی بنیادیں غیر متزلزل رہیں گی"۔ (۳۰)

مدارس کا اقامتی کردار

نظام تعلیم کا تیسرا اہم جزء تربیتی نظام ہے، جو محض چند گھنٹوں کی تعلیم وتدریس سے ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ طلباء ہمہ وقت اپنے اساتذہ کی نگرانی میں رہیں، اور انھیں ایک ایسا

(۳۰) روایت حضرت مولانا یوسف بنوریؒ بحوالہ نقش دوام ص: ۱۷۳۔

کے اواخر میں وطن واپس ہوئے تو خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کو ایک دوسرے کا مخالف پا کر صدمات سے دوچار ہو گئے۔ کانگریس بھی اختلافات کا شکار تھی اور سوراج پارٹی میں بھی اختلافات رونما ہو گئے تھے لہٰذا انھوں نے اپنا تعلق صرف کانگریس کے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ سے بھی مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ سیاست کی مذمت کی اور سیکولر سیاست میں اپنے یقین کامل کا اظہار کیا اور اپنا پورا وقت ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوششوں میں صرف کرتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری کو ۱۹۲۷ء میں ان کی خدمات کے پیش نظر اس دور کے سب سے بڑے اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا جسے کانگریس کی صدارت سے موسوم کیا جاتا تھا۔ دراصل ان کا نام کانگریس کی صدارت کے لیے ۱۹۲۴ء ہی سے تجویز ہو رہا تھا اور اس کے محرک خود مہاتما گاندھی تھے۔ ۱۹۱۸ء کے خصوصی اجلاسِ کانگریس کی صدارت سر حسن امام بمبئی میں کر چکے تھے۔ ۱۹۲۱ء کے احمد آباد اجلاس کی صدارت کا بار حکیم اجمل خاں کے سپرد ہوا، ۱۹۲۳ء میں دہلی کے خصوصی اجلاس کی صدارت مولانا آزاد نے کی اور اسی سال کوکناڈا میں مولانا محمد علی نے کانگریس کی کرسی صدارت کو زینت بخشی اس لیے جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۴ء میں بیلگام میں منعقد ہونے والے کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری کا نام تجویز کیا تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ چار سال کی قلیل مدت میں وہ چوتھے مسلمان صدر ہوں گے اس لیے مناسب ہوگا اگر خود مہاتما گاندھی اس اعزاز کو قبول کر لیں۔ بہر صورت ۱۹۲۷ء میں جب مدراس کانگریس کے اجلاس کے لیے ڈاکٹر انصاری کا نام تجویز ہوا تو متفقہ طور سے اسے تسلیم کر لیا گیا۔ اس موقعہ پر گاندھی جی نے ایک خط میں سروجنی نائڈو کو لکھا کہ ڈاکٹر انصاری ہی ایسے شخص ہیں جو "ہندو مسلم معاہدہ کو کانگریس کی جانب سے تکمیل کے مرحلے تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا انتخاب عام طور پر قابل قبول ہوگا۔" ایک اور خط میں مہاتما جی نے پنڈت موتی لال نہرو کو لکھا کہ "فی الوقت ہمیں ڈاکٹر انصاری کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ذمہ داری کو سنبھالیں۔۔۔ وہ ہندو مسلم مسئلہ کی جانب خصوصیت سے توجہ دیں گے اور اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کر گزریں گے۔" مہاتما گاندھی نے کانگریس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری کے نام کی سفارش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> 'آیندہ سال کے لیے قومی اسمبلی کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری کا انتخاب ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ قومی سطح پر کوئی شخص ایسا نہیں جو اس

ماحول ملے جہاں وہ ہر طرح کے تفکرات سے آزاد ہو کر محض حصول علم میں مشغول ہو سکیں، اس مقصد کے لئے حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کو اقامتی کردار عطا کیا، دارالعلوم سے پہلے ملک میں اقامتی درسگاہوں کا تصور نہیں تھا، جہاں ہمہ وقت طلباء ایک مخصوص ماحول میں پرورش پاتے ہوں اور مدرسہ ان کی ضروریات زندگی یعنی طعام، لباس اور رہائش کا متکفل ہو، دارالعلوم سے پہلے کسی ایک مدرسے میں تمام علوم وفنون کی تعلیم بھی نہیں دی جاتی تھی، بلکہ طلباء اپنی دلچسپی کے علوم وفنون کی تحصیل کے لئے مختلف اساتذۂ فن کے یہاں حاضری دیتے تھے، بسا اوقات یہ اساتذۂ فن مختلف شہروں اور قصبوں میں مقیم ہوتے تھے، اور طالب علم ایک شہر سے دوسرے شہر کا دشوار گزار فاصلہ طے کر کے اپنی علمی پیاس بجھانے پر مجبور ہوتا تھا۔

حضرت نانوتویؒ نے ایک ہی چھت کے نیچے مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع کر کے طلباء کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ہر قسم کی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر حصول علم میں مشغول ہوں، اہل مدرسہ کے لئے لازم قرار دیا کہ وہ اپنے طلباء کی ضروریات کی فکر کریں اور ان کو ایک مکمل عالم بننے کے لئے پوری یکسوئی اور مکمل فراغت قلبی فراہم کریں۔

دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت کا شاہکار

دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتوی کی فکری بصیرت کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یوں تو ہر دور میں، ہر ملک میں مدارس اور جامعات قائم کئے گئے ہیں لیکن جو جاذبیت اور دلکشی علم کے اس تاج محل کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسرے ادارے کو نصیب نہ ہو سکی، بغداد کا مدرسہ نظامیہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اسے آج بھی یاد کیا جاتا ہے، جامعہ ازہر ہزار سال گزرنے کے باوجود مصر کی سرزمین پر قائم ہے اور علوم اسلامیہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مگر یہ جامعات حکومت وقت کی سرپرستی میں قائم ہوئے، اور اسی کی مالی مدد اور تعاون سے سرگرم عمل رہے، یہ فخر و امتیاز صرف دارالعلوم کو حاصل ہے کہ وہ اپنے قیام کے روز اول ہی سے غریب مسلمانوں کے چندے سے قائم ہے، اور ایک سو چونتیس سال گزرنے کے باوجود اسی تعاون کے سہارے اپنا سفر طے کر رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند آج صرف ایک مدرسہ ہی نہیں ہے جہاں ایک مخصوص نصاب پڑھنے

انتخاب پر معترض ہو سکے۔ ڈاکٹر انصاری جس قدر اچھے مسلمان ہیں اسی قدر اچھے ہندستانی بھی ہیں۔ ان کے متعلق تعصب کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ برسہا برس سے وہ کانگریس کے معتمد چلے آ رہے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ان کی جد وجہد سب پر عیاں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر بیلگام میں میں، کانپور میں سروجنی نائڈو اور گوہاٹی میں سری نواس آئنگر حائل نہ ہوتے تو ڈاکٹر انصاری ان میں سے کسی وقت بھی (صدارت کے لیے) منتخب ہو گئے ہوتے کیونکہ ان مواقع پر ہر بار انصاری ہی کا نام زبان زدِ خاص و عام تھا۔ مگر مخصوص اسباب ان کے انتخاب کو ٹالتے رہے تاکہ وہ ایسے وقت میں منتخب ہوں جب ان کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی جائے۔ اگر ہندو مسلم اتحاد سے متعلق کوئی ممکنہ تجویز دونوں جانب سے قابل قبول ہو تو بلاشبہ ڈاکٹر انصاری ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جو ایسی اسکیم کو کانگریس کی طرف سے پیش کر سکتے ہیں۔"

اس تحریر کے ہر لفظ سے ڈاکٹر انصاری میں مہاتما گاندھی کے اعتماد کا عکس موجود ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے صدر منتخب ہو جانے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مہاتما جی نے لکھا کہ:۔

"ڈاکٹر انصاری ایک سرجن ہیں اور ان کا شمار ان ماہر سرجنوں میں ہوتا ہے جنھیں ہندستان نے پیدا کیا۔ چونکہ وہ ایک سرجن ہیں اس لیے انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کے زخموں پر مرہم رکھیں گے۔۔۔ مگر ہمیں یہ فرض کر لینے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے کہ انھیں صدر منتخب کر لینے کے بعد ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ دراصل ایک مریض کا فرض اپنے علاج معالجے کے لیے سب سے عقل مند اور بہترین ڈاکٹر سے رجوع ہونے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے معالج کے ساتھ جان و دل سے تعاون کرے گا اور اس کی ہدایات پر عمل کرے گا۔۔۔ ہم مریض ہیں اور ڈاکٹر انصاری ہمارے سرجن، ہم ہی نے انھیں آواز دی ہے اس لیے جو کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے اگر ہم اس کی تکمیل کے سلسلے میں ان سے پورا تعاون نہیں کرتے تو غلطی ان کی نہیں ہماری ہوگی۔"

مہاتما گاندھی کے دل میں ڈاکٹر انصاری کے لیے جو جذبات موجود تھے یہ تحریر ان کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ دراصل مہاتما جی عملی انسان تھے۔ وہ لفظوں سے نہیں کھیلتے تھے بلکہ میدان

پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہو، بلکہ یہ ایک مستقل تحریک اور مدرسۂ فکر ہے۔ آج دیوبند ایک ایسی اصطلاح بن چکا ہے جس کا اطلاق صرف اسی سرزمین پر نہیں ہوتا جہاں دارالعلوم قائم ہے، بلکہ دنیا میں جہاں جہاں دارالعلوم کے طرز اور مسلک پر مدرسے قائم ہیں وہ سب دیوبندیت کے دائرے میں آتے ہیں، اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خود کو دیوبندی کہلانا فخر سمجھتی ہے۔

حرف آخر

گزشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست وریخت کے بعد مسلمانوں میں جو فکری اور دینی اضمحلال پیدا ہوا تھا حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے اس کے سدباب کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مدارس قائم کئے جائیں۔ چنانچہ دیوبند میں مدرسے کا قیام عمل میں آیا، اور اس کے بعد متعدد جگہوں پر مدارس کی بنیاد رکھی گئی، حضرت نانوتویؒ نے نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ مدارس قائم کئے بلکہ ان کو مؤثر، مفید اور مستحکم بنانے کے لئے ایک مخصوص نظام اور دستور العمل بھی عطا کیا۔ دارالعلوم کے قیام پر ایک سو چونتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن حضرت نانوتویؒ کا عطا کیا ہوا دستور العمل آج بھی دارالعلوم دیوبند کے نہج پر چلنے والے مدارس کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کے فضل سے ہندوستان کے مسلمان خواہ کسی بھی مکتب فکر سے وابستہ ہوں حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت سے روشنی حاصل کر رہے ہیں اور ان کے عطا کردہ زریں اصولوں کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان بھر میں کشمیر سے کنیا کماری تک مدارس کا یہ سلسلہ اور ان کے بڑھتے اور پھیلتے اثرات حکومت کے لئے چیلنج بن چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ حکومت کے ذمہ داران مدارس کو آئی ایس آئی کا اڈہ قرار دے رہے ہیں، اور کوشش کر رہے ہیں کہ مدرسے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کی حوصلہ شکنی ہو اور اسی طرح مدارس کے پھیلتے ہوئے اثرات کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اگر ہندوستان میں سیکولر طاقتوں کی پسپائی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے عروج کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ حکومت مسلمانوں کے ان مضبوط قلعوں کو برباد کرنے کی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائے۔ آج کے مشکل حالات میں حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت ہمارے لئے مشعل راہ ہے، اہل علم کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مدرسے قائم کریں تاکہ قوم کے

عمل کی آزمایشوں کو اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر انصاری کی صدارت پر اظہار مسرت کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی ان کی قیادت میں صحیح راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دیا۔

ڈاکٹر انصاری کا خطبہ صدارت اُس دور کی صورت حال اور سیاسی فضا کا آئینہ دار تھا۔ انھوں نے ڈیڑھ گھنٹے پر محیط اور تقریباً گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل خطبہ صدارت میں حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے استعماریت پسند برطانوی حکمرانوں کے ذریعہ ہندستانیوں کے استحصال کی داستانِ خونچکاں کے واقعات دہرائے اور مغربی مفکروں اور سیاست دانوں کے اقوال کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ سامراج کے استحکام کا بارِ گراں غریب ہندوستانیوں کے شانوں پر ہے لیکن انھوں نے اعلان کیا کہ ”آزاد اور خود مختار ہندستان ہی ایشیا کی آزادی اور امن عالم کے قیام کی ضمانت ہے“۔ ڈاکٹر انصاری خود مغربی ممالک کی سیاحت کر چکے تھے اور وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے ہمیشہ وہ ہندستان کے حالات کا موازنہ بیرونی ممالک سے کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ انھیں دنیا کے دوسرے اسیرانِ پنجۂ مغرب سے ہمدردی تھی تاہم انھیں یقین کامل تھا کہ ہندستان کی آزادی دوسرے غلام ملکوں کی آزادی کے سلسلہ میں معاون ثابت ہوگی۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ہندستان کے آزاد ہوتے ہی افریقی اور ایشیائی ممالک غلامی کی زنجیروں سے یکے بعد دیگرے نجات حاصل کرتے گئے۔

ہندستان کی آزادی کے حصول کی خاطر مختلف تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پہلے تو ہندستانیوں کے ذریعہ حکومت سے تعاون کی پالیسی کو اپنایا گیا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی بلکہ خود صاحبان اقتدار نے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد عدم تعاون کا حربہ استعمال کیا گیا اور پھر کونسلوں پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی عائد کردہ پابندیوں نے اس مکتب خیال کے لوگوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک اہم نکتہ یہ سمجھایا کہ ”قوت کی آزمایش میں اس وقت کامیابی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی جب آپ کا مخالف ہی خود منصف بھی ہو“۔ دراصل برطانوی حکومت مخالف بھی تھی اور منصف بھی تو ظاہر ہے کہ مخالفت کا انصاف پسندی پر غالب آجانا یقینی تھا۔ اسی بات کو ڈاکٹر صاحب نے نمایاں کر دیا جس کا مطلب واضح طور سے یہی تھا کہ حکومت سے کسی قسم کی توقع رکھنا بے سود تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ کونسلوں میں داخلہ کے مخالف تھے اور No Change Party کے زبردست رہنما رہے۔ ڈاکٹر انصاری نے مزید کہا کہ چالیس برس

نونہالانِ علم اور دین کے ساتھ اپنے رشتے مضبوط کرسکیں، ذمہ داران مدارس کو چاہئے کہ وہ عوام سے رابطے کو مزید مستحکم اور مفید بنانے کی کوشش کریں، عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مدارس کے ساتھ اپنی وابستگی کو اپنی دینی حمیت اور غیرت کی آزمائش سمجھیں، اس طرح ہم سب مل کر اس ملک میں مسلمانوں کو ان کے دین سے دور کرنے کی ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے گھٹاٹوپ اندھیرے میں، شدید آندھیوں کے درمیان جو شمع روشن کی تھی اسے ہر طوفان بادوباراں سے محفوظ رکھنا ہی حضرت نانوتویؒ کے تئیں ہمارا حقیقی خراج عقیدت ہوگا۔

ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے یہ مدارس فرقہ پرست اور اسلام دشمن طاقتوں کی آنکھوں میں عرصہ سے کھٹک رہے ہیں، چنانچہ انھیں الزام واتہام کے شکنجوں میں جکڑنے کے لئے مختلف حیلے اور بہانے ڈھونڈے جارہے ہیں۔ جن کے ذریعے ان کے ذمہ داروں کو بے حوصلہ اور ان کے اثرات کو کم کیا جاسکے۔

میں کانگریس تین تجرباتی ادوار سے گزر چکی تھی جو پینتیس سالہ تعاون، ڈیڑھ سالہ عدم تعاون اور چار سالہ کونسل میں داخلہ کے ذریعہ مزاحمت کی پالیسی کی مدت پر مشتمل تھا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس تعاون نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا اور کونسل میں مزاحمت کی پالیسی کے بھی کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اگرچہ عدم تعاون میں بھی اس درجہ کامیابی نہیں ملی جتنی کہ اس سے توقع کی گئی تھی لیکن اس معاملہ میں انھوں نے قصوروار سب ہی کو ٹھہراتے ہوئے کہا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ "عدم تعاون نے ہمیں ناکام نہیں بنایا بلکہ یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے عدم تعاون کو ناکام کردیا"...... دراصل یہ No Changer ڈاکٹر انصاری کے الفاظ تھے جنھیں یقین واثق تھا کہ عدم تعاون کی تحریک سے ملک میں جو فضا سازگار ہوئی تھی وہ حصول آزادی کے لیے معاون ثابت ہوسکتی تھی اسی لیے انھوں نے اسی فضا کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی کہ وہ خود کو قربانیوں کے لیے تیار کریں اور اپنے آپ کو نظم وضبط کے سانچے میں ڈھالیں۔

فرقہ واریت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ "اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہر تمدن کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرلیا جائے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور احترام کے جذبہ کو پروان چڑھلیا جائے اور ایسے قومی اداروں کے قیام سے ثقافتی یگانگت کو فروغ دینے کے کام کی حوصلہ افزائی کی جائے جن میں دونوں فرقوں کے بچے ایک دوسرے سے ملیں جلیں اور دونوں تہذیبوں کی تہہ میں موجود تصورات کو سمجھنے اور مطالعہ کرنے کے مواقع سے فیضیاب ہوں"۔۔۔۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ڈاکٹر انصاری نے جو نسخہ ۱۹۲۷ء میں تجویز کیا تھا در حقیقت آج ستر برس کے بعد بھی ملک کو اس کی ضرورت ہے۔ قومی اتحاد کے سلسلے میں انھوں نے کہا تھا کہ "ہم سب کو یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہمارے لیے یہ (اتحاد) موت وحیات کا معاملہ ہے اور ملک میں اتحاد کے حصول کی خاطر ہماری کوششوں کی کامیابی پر ہی ہندستان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔"

ڈاکٹر انصاری نے ہر فرقہ کے افراد سے اپیل کی وہ کانگریس میں شریک ہوں جو ہندستان کی تمام سیاسی تنظیموں کی ماں ہے۔ انھوں نے کہا کہ جماعتوں کی کثرت مقصد کی وحدت کے لیے مضرت رساں ہے۔ ان کے نزدیک جن نکات پر جماعتوں کا اتفاق تھا وہ بہت زیادہ تھے جبکہ اختلاف کا سبب ہونے والے نکات بہت کم تھے۔ اس لیے ایک ہی تنظیم کے دامن میں وہ بھی رفع ہوسکتے تھے۔ کانگریس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی*

نبی علیہ السلام کے لئے تکوینی اختیار اور حضرت نانوتویؒ کی آب حیات

مسلمانوں کی ایک جماعت نبی اکرم ﷺ کے بارے میں عطائی تکوینی اختیار کا عقیدہ رکھتی ہے اور وہ تکوینی دائرہ کو تشریعی دائرہ پر قیاس کر کے اس طرح کا عقیدہ قائم کرتی ہے۔

قرآن کریم نے حضورؐ کے بارے میں یہ تو فرمایا ہے کہ آپ حکمِ الٰہی کے تحت دنیا کے لئے مطاع و مقتداء بنا کر بھیجے گئے ہیں: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ (النساء:۶۴) ''اور ہم نے رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔'' لیکن کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا کہ خدا نے حضورؐ کو اپنی اجازت اور اپنے اختیار سے عالم کون و مکان کا مالک و مختار بنا کر بھیجا ہے۔

قرآن حکیم خدا کا اصولی اور کلی قانون ہے اور نبی ﷺ اس قانون الٰہی کی جزئیات اور عملی صورتیں واضح کرنے والے ہیں۔ یہ شرح و بیان بھی ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر صادر نہیں ہوتا تھا بلکہ ہدایتِ الٰہی کے تحت صادر ہوتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قرآن کے اصولی احکام وحی جلی کی صورت میں

پیش نظر عنوان کا تعلق بھی قرآن کریم کی ایک اہم آیت (سورہ احزاب ۶) سے ہے جس کی تفسیر حضرت نانوتویؒ نے اپنے خاص مذاق (عشق رسالت) کے مطابق کی ہے اور وہ تفسیر مولانا مرحوم کے دینی کلامی نظریات کی اہم کتاب (آب حیات) کا ایک خاص مسئلہ بن گیا اور پاکستان کے ایک سلفی عالم کو اس پر ایک مستقل تنقیدی کتاب لکھنے کی ضرورت پیش آگئی۔ اس کتاب کا نام ہے ''نبوت کی عجمی تعبیر''

پیش نظر مقالہ میں اس ناچیز نے اس تنقیدی کتاب کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور آب حیات کے اس خاص تفسیری مسئلہ کو دیوبندی مکتب فکر کے مسلمہ نظریات کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

* کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں، دہلی-۶

کہ میری رائے میں تو کوئی بھی فرقہ وارانہ جماعت یا جماعتیں اگر متحد و منظم کردی جائیں تب بھی وہ کانگریس پر سبقت نہیں لے جاسکتیں۔"

سائمن کمیشن کی آمد کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس کے تقرر پر "میں نہ تو مایوس ہوا ہوں اور نہ مجھے کوئی حیرت ہے، دراصل وہی ہوا ہے جس کی مجھے توقع تھی"۔ سفید فام اراکین پر مشتمل سائمن کمیشن پر انھیں اعتماد نہ تھا وہ انھیں اجنبی تصور کرتے تھے اسی لیے انھوں نے کہا کہ "اپنی ضرورتوں سے محض ہم خود ہی واقف ہیں اور ہمارے مستقبل کو طے کرنے کے سلسلہ میں صرف ہماری آواز ہی فیصلہ کن ہونی چاہیے" اس لیے انھوں نے اپیل کی کہ اس کمیشن کا بائیکاٹ ہونا چاہیے اور ہمیں اس کمیشن کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جیسا کے مصریوں نے ملنر کمیشن کے ساتھ کیا تھا۔ اس اپیل کے نتیجے میں قوم نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا اور ہر جگہ سیاہ پرچم سے اس کا خیر مقدم ہوا۔

غرضیکہ ڈاکٹر انصاری نے ایسی ہی صدارتی تقریر کی جیسی کہ ان سے توقع تھی۔ ان کے خطبہ میں سارے مسائل کی وضاحت تھی اور ہر مسئلہ کا حل بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے صدارت کے لیے ان کا نام تجویز کیا تھا کیونکہ ڈاکٹر انصاری مرض کی تشخیص کے ساتھ ہی اس کے لیے نسخہ بھی تجویز کرتے تھے۔ ان کے خطبۂ صدارت سے یوں تو سبھی متاثر ہوئے لیکن مہاتما گاندھی پر اس کا اثر کچھ زیادہ ہی ہوا۔ اس بارے میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ "ڈاکٹر انصاری کے صدارت کی خاص خوبی ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی شدید خواہش ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ ان ہی سے اس خواہش کے اظہار کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی فرد واحد یہ کام کر سکتا تھا تو وہ بلاشبہ انصاری ہی تھے۔ انھوں نے قوم کی طرف سے بطور تحفہ سب سے بلند اعزاز اس لیے قبول کیا تھا کہ انھیں اپنی قوم پر، نصب العین پر اور اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ بلاشبہ اپنی تمنا کے حصول میں انھوں نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔"

دراصل وہ عملی رہنما تھے۔ قول کے ساتھ عمل پر یقین رکھتے تھے۔ ان ہی کے زیر قیادت اور پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ہندستان کی دستور سازی کے لیے نہرو کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ بڑی محنت سے مرتب کی اور ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقدہ قومی کنونشن میں اسے پیش کیا۔ اس رپورٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری نے کہا تھا کہ نہرو رپورٹ کو ہر پہلو سے مکمل نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی یہ ہندستانی مسائل کے حل کے لیے حرف آخر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ "مجوزہ دستور اگر بیش نہیں تو کچھ کم بھی نہیں ہے۔" اس میں ہندستان کے لیے ڈومینین اسٹیٹس

نازل ہوتے تھے اور ان اصولوں کی تشریح وحی خفی کے مطابق صادر ہوتی تھی۔ جزئیات کی تشریح و بیان میں حضورؐ کو شریعت ساز کہا جا سکتا ہے اور یہ تشریعی اختیار کی ایک صورت ہے — مجازی صورت حقیقت میں شریعت ساز خدا ہی کی ذات قرار پاتی ہے۔ حقیقی شریعت سازی کے لحاظ سے قرآن کریم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى — وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ. (النجم: ۴، الحاقہ: ۴۴-۴۶)

''نبی علیہ السلام اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ وحی الٰہی کے مطابق کہتے ہیں اور اگر وہ ہماری طرف کوئی بات غلط طور پر منسوب کر دیتے تو ہم انہیں سختی سے پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کاٹ ڈال دیتے۔''

تشریع کے دائرہ میں یہ پابندِ وحی اختیار بھی آپ کو اس لئے عطا کیا گیا تھا کہ آپؐ کا منصب شہادتِ حق (قولی اور عملی تشریح) تھا — تکوینی معاملات سے نبی و رسول کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے تکوینیات میں نبی و رسول کے لئے کسی نوع کے اختیار کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے کہا: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ — وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا.

حکم و اختیار صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے اختیار میں شریک نہیں کرتا۔ (الانعام ۵۷، الکہف ۲۶) مشرکین عرب کے ''لبیک'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب اپنے بتوں اور باطل معبودوں کے لئے عطائی ملک و اختیار کا عقیدہ رکھتے تھے — مستقل بالذات اختیار کا عقیدہ نہیں: لبيك لا شريك لك لبيك الاّ شريكاً هو لك. ''تیرا کوئی شریک نہیں۔ سوائے اس شریک کے جسے تو نے خود شریک بنا لیا''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کا یہ عقیدہ اس وقت لوگوں کی نظروں میں ان کی کم علمی کی وجہ سے مشتبہ اور مشکوک ہو جاتا ہے جب وہ خدا کے خاص بندوں (حضرات انبیاء علیہم السلام) میں معجزانہ قوتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرات انبیاء و اولیاء سے غیر معمولی واقعات کا صادر ہونا ان لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خدا کے ان خاص بندوں کے اندر خدائی طاقت اور تکوینی اختیارات موجود ہیں اور یہ تصور کھلا شرک اور کفر ہے۔

(Dominion Status) کی بات کہی گئی تھی جبکہ ڈاکٹر انصاری آزادیٔ کامل میں یقین رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہرو رپورٹ کو اس لیے قبول کر لیا کہ Dominion کے بعد آزادی ہی کی منزل تھی۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کو برسوں کی گہری تاریکی میں روشنی کی کرن سے تعبیر کیا۔ ان کے الفاظ میں "نہرو رپورٹ ایک روشن ترین طلوعِ سحر کی نقیب" تھی۔ نہرو رپورٹ کے بارے میں انصاری کی خدمات کو سراہتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا کہ "ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جرأت اور سلیقہ سے انھوں نے مختلف جماعتوں کے پیروؤں کو متحد رکھا۔۔۔ کامیابی ناممکن ہوتی اگر ڈاکٹر انصاری ضرورت کے وقت نہرو کمیٹی کی حمایت کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔ مسلمانوں کو ان سے جو محبت تھی اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ کسی بھی ہندو کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان کے پرجوش جذبہ حب الوطنی کو چیلنج کر سکے۔ اس طرح وہ سبھی کا اعتماد حاصل کر سکے۔" لیکن رپورٹ اختلافات کا موضوع بنی رہی۔ نہرو رپورٹ کی حمایت کر کے انصاری نے علی برادران کے علاوہ بہت سے مسلمان رہنماؤں کو بھی اپنا مخالف بنا لیا اور حکومت کی عدم توجہی کے باعث ۱۹۲۹ء میں لاہور میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں 'آزادی کامل' کی تجویز پاس کرنے کے بعد اسے دریائے راوی میں غرقاب کر دیا گیا۔

اگرچہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے مسترد کر کے اس کے بارے میں غلط فہمیوں کی ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی تھی لیکن ڈاکٹر انصاری اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علاحدگی کا کبھی مشورہ نہیں دیا تاہم ۲۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو الہ آباد میں انھوں نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی جس کی صدارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد، نظامت کے لیے تصدق احمد شیروانی اور خازن کی حیثیت سے خود ڈاکٹر انصاری کا انتخاب عمل میں آیا۔ دراصل اس جماعت کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں اور کانگریس کے درمیان مفاہمت قائم رہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ مل سکے اور مسلمانوں کو فرقہ پرست اور رجعت پسند رہنماؤں کے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کی تشکیل میں ہندستان کے سربرآوردہ قوم پرور مسلم رہنما شریک تھے جن میں رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود، بیرسٹر آصف علی، سید عبداللہ بریلوی، خان عبدالغفار خاں، چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس پارٹی کے اجلاس مختلف اوقات میں ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتے رہے اور ہندستانی مسلمانوں میں قوم پروری کے جذبات کو فروغ دیتے رہے تاکہ وہ معقول طریقہ پر قومی جدوجہد میں حصہ لے سکیں اور اکثریت و اقلیت کے درمیان مفاہمت قائم ہوتی رہے۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے قیام کا مقصد ڈاکٹر انصاری کے نزدیک یہ تھا کہ

اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ سے پانچ سو برس پہلے اس گمراہی میں عیسائی قوم اس طرح گرفتار ہوئی کہ انجیل کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو اس انداز سے بیان کیا جیسے حضرت عیسیٰ کے اندر مردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو صحت مند کرنے کی ذاتی قوت و ذاتی تصرّف موجود تھا۔

موجودہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کے دو سو برس بعد حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے شاگردوں نے ترتیب دیں۔ ان شاگردوں نے اپنے استادوں (حواریین مسیحؑ) سے حضرت عیسیٰ کے حالات پر جو کچھ سنا اسے اپنے عقیدت مندانہ انداز میں نقل کر دیا اور عقیدت کے غلو و تشدد نے خدائی معجزہ دکھانے والے پیغمبر کو معجزہ پیدا کرنے والے خدا کے روپ و رنگ میں پیش کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جس ہستی میں مردوں کو زندہ کرنے اور مٹی کے پرندوں کو اصلی پرندہ بنا کر اڑانے اور کل کا کھایا پیا بتانے کی قوّت ہو اس کے لئے خدائی کا عقیدہ قائم کرنا عقل کے خلاف نہیں۔ لیکن کسی معجزہ دکھانے والے نبی و رسول نے یہ کہہ کر معجزہ نہیں دکھایا کہ میرے اندر یہ حیرت انگیز تصرّف واختیار موجود ہے بلکہ ہر ہر قدم پر اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ معجزہ یا کرامت نمودار کرنے کی قوت خدائے واحد کے اندر ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ خدائے قدیر غیر معمولی واقعات ظاہر کر کے ان کی صداقت پر دلیل دکھانا چاہتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے آخری کلام مقدس (قرآن کریم) کی لفظی اور معنوی تنزیل وتحفظ کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور تمام نبیوں کے معجزات کے وقوع کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب کیا۔ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے معاملہ میں تو اتنی احتیاط کی گئی کہ جب مخالفین کی طرف سے فرمائشی معجزات ونشانات کا مطالبہ کیا گیا تو آپؐ سے جواب دلوا دیا گیا کہ معجزہ اور نشان میرے ہاتھ میں نہیں، خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، میں تو صرف حق کا داعی اور مبلغ ہوں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ. قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا

مسلمانوں کو "آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد میں پر اثر طریقہ سے حصہ لینے کے لیے تیار کیا جائے یہ اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ چند مہینوں ہی میں ہندوستان ایسے اہم فیصلے کرے گا جو پورے ملک کو متاثر کریں گے اس لیے ایسا نہ کہا جائے کہ آزادی اور دلیری کی عظیم اسلامی روایات کے باوجود مسلمانوں نے مادر وطن کو اس کی تاریخ کے نازک مرحلہ پر نظر انداز کر دیا، اس لیے ضرورت ہے کہ عام مسلمان ایک مرکز پر اکٹھے ہو جائیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے تصدق احمد خاں شیروانی کو ۶ / جنوری ۱۹۳۰ء کے اپنے خط میں لکھا کہ "بمشکل تمام مسلم فرقہ پرستوں کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی تشکیل کر لی ہے اب اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام نہ کرنا انتہائی غیر دانش مندانہ فعل ہوگا۔ میرے خیال میں اب ہماری سرگرمیوں کے لیے یہی ایک مرکز رہ گیا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں کے اثر سے مسلمانوں کو علاحدہ کر کے انھیں قوم پروری کے سانچے میں ڈھالنے کی سمت میں موثر طور پر مہم چلائیں۔" ڈاکٹر انصاری نے اس پارٹی کا منشور تیار کرنے کے سلسلے میں بڑی محنت کی اور اپنی تمام تر مصروفیات اس کے استحکام کے لیے وقف کر دیں۔ انھوں نے مختلف مسلمان حلقوں کو متحد کرنے کے لیے شب و روز محنت کی اور ان تجاویز کو تسلیم کرنے پر اصرار کیا جو مخلوط انتخابات اور حق رائے دہندگی سے متعلق نیشنلسٹ مسلم پارٹی نے منظور کی تھیں لیکن اس پارٹی کو ہندو اور مسلمان دونوں ہی فرقوں کی مخالفت کا نشانہ بننا پڑا۔

حکیم اجمل خاں کی طرح ڈاکٹر انصاری بھی اپنے ملک کی فرقہ وارانہ فضا سے بہت مایوس ہو چکے تھے اگرچہ انھوں نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا، وہ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر، سکریٹری اور صدر رہے لیکن ۱۹۳۰ء میں انھوں نے کانگریس کی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دے دیا تاہم کانگریس سے علاحدگی اختیار نہیں کی کیونکہ ان کا یقین تھا کہ "کانگریس کو ترک کرنے کا مطلب سیاسی خودکشی کا مرتکب ہونے کے برابر تھا لیکن کانگریس کی مخالفت کرنا کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے مترادف تھا۔"

ڈاکٹر انصاری نے ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کے فیصلہ تحریک سول نافرمانی کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت ملک کسی بڑی تحریک کے لیے تیار نہ تھا۔ ان کے نزدیک ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون اور ۱۹۳۰ء کی مجوزہ تحریک سول نافرمانی کے حالات میں بڑا فرق تھا۔ انھوں نے مہاتما جی پر واضح کیا کہ ۱۹۲۰ء میں عالمگیر جنگ کے دوران انگریزوں کی وعدہ خلافی کے

بَشَرًا رَّسُوْلًا.(بنی اسرائیل:۹۰۔۹۳)

''اور منکرین نے کہا ہم اے نبی تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین میں ایک چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس ایک کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو اور اس باغ میں تم پانی کی نہریں جاری نہ کر دو یا جیسا کہ تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو یا خدا اور فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا نہ کر دو یا تمہارے پاس سونے کا ایک محل نہ ہو یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور اس چڑھنے کا ہم یقین نہیں کریں گے جب تک تم آسمان سے ایک کتاب ساتھ نہ لاؤ جسے ہم پڑھ سکیں ـــــ رسول اکرمؐ نے اس کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا سبحان اللہ (بڑا تعجب ہے) میں کون ہوں صرف خدا کا ایک رسول جو انسان ہے۔''

قرآن کریم نے حیرت انگیز اور دنیا کو عاجز کر دینے والے واقعات کو آیاتِ الٰہی، یعنی نشانیوں سے تعبیر کیا ہے، جو رسولوں کی صداقت کے لئے ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے حق میں اتمامِ حجت کے طور پر ظاہر کی جاتی ہیں: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللہ .(الانعام:۱۰۹)''کہہ دو! نشانیاں اللہ کے قبضہ میں ہیں''۔

قرآن کریم نے سابق قوموں کی گمراہی کے تجربہ کی روشنی میں معجزات کے بارے میں جس قدر احتیاطی اسلوب و انداز اختیار کیا، افسوس کہ آخری امت کے ایک طبقہ (مدعیان محبت) نے اس سے کوئی سبق نہ لیا اور اسی راہ سے گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو عیسائی قوم کے حوالہ سے عقیدت و محبت کے غلو و مبالغہ سے دور رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور فرمایا تھا:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ المسیح ابن مریم (حدیث)''مسلمانو! میری تعریف میں اس طرح مبالغہ آرائی نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں کی''۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے ایک پیشین گوئی بھی فرمائی تھی کہ:

لترکبنّ سنن مَن کان قبلکم (مشکوٰۃ ۴۶۵ بحوالہ ترمذی)''تم مسلمان ضرور (شرک کے کاموں میں) اگلوں کی پیروی کرو گے''۔

مشرکین عرب ایک درخت (ذات انواط) کی پرستش کرتے تھے اور اس پر تلواریں لٹکا کر

باعث لوگوں میں بڑا ہیجان تھا اور رولٹ ایکٹ، مارشل لا اور خلافت کے سبب ملک بے اطمینانی اور بے چینی کا شکار تھا جب کہ ۱۹۲۰ء میں عوام کی اکثریت برطانوی لیبر حکومت اور ہندستان میں اس کے وائسرائے کے خلوص پر اعتماد رکھتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ۲۰ء میں ہندو مسلم اتحاد اپنی معراج پر تھا جبکہ ۱۹۳۰ء میں اس اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ تیسرے یہ کہ سکھ فرقہ کے افراد تحریک عدم تعاون میں مکمل طور سے کانگریس کی حمایت میں تھے جبکہ مجوزہ سول نافرمانی کے موقع پر انھوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی تھی۔ چوتھے یہ کہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس میں مکمل طور سے اتفاق تھا جبکہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس اندرونی خلفشار کا شکار تھی اور پانچواں اور سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ تحریک عدم تعاون کے دوران مکمل طور سے عدم تشدد کے باوجود چوری چورا میں تشدد کا واقعہ رونما ہو گیا تھا جبکہ ۱۹۳۰ء میں ملک گیر پیمانہ پر تشدد کا دور دورہ تھا اور خود بہت سے کانگریسی رہنما تشدد میں یقین کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری نے انتہائی دیانت داری کے ساتھ مہاتما گاندھی سے اختلاف کرتے ہوئے تحریک سول نافرمانی کی تجدید کی مخالفت کی۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ مہاتما جی کو وائسرائے سے گفت و شنید کے دروازے بند نہیں کرنے چاہئیں اور وائسرائے کی جانب سے کیے جانے والے امن کے اقدام سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اس کے ساتھ ہی اقلیتوں کے مسئلے پر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے ہندو مسلم سکھ اتحاد کو عدم تشدد پر مبنی مہم سے وابستہ کیا جانا چاہیے۔ یہی خیالات تھے جن کے سبب ڈاکٹر انصاری نے خود کو کانگریس کی ذمہ داریوں سے آزاد کرلیا اور تحریک سول نافرمانی میں شرکت سے معذرت کرلی۔

مہاتما گاندھی نے ۶/ اپریل ۱۹۳۰ء کو نمک ستیہ گرہ شروع کر کے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں تمام سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا اور برطانوی حکومت نے اپنے مظالم کا دائرہ وسیع تر کرتے ہوئے ہندستانیوں کو بری طرح جکڑ لیا۔ ایسی صورت میں ولبھ بھائی پٹیل نے ۱۳/ جولائی ۱۹۳۰ء کو ڈاکٹر انصاری کو ایک خط میں صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے لکھا کہ اب "جبکہ کانگریس کے صدر اور سکریٹری گرفتار ہو چکے ہیں اور کانگریس کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے تو میرا فرض ہے کہ آپ تک پہنچ کر آپ کا تعاون حاصل کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ دوبارہ کانگریس کی مجلس عاملہ میں اپنی اصل نشست لے لیں تو کانگریس بڑی طاقت ور ہو جائے گی اور ضرورت کی اس گھڑی میں آپ قوم کی عظیم خدمت انجام دے سکیں گے۔" اس طرح ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی مجبوری کا احساس کرتے ہی ڈاکٹر انصاری کو آواز دی کیونکہ اس

اس کا طواف کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے ایک سفر میں اس درخت کو دیکھ کر حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے بھی آپ ایسا ہی درخت مقرر کر دیں اس پر حضورؐ نے بطور پیشین گوئی یہ فرمایا چنانچہ یہ طبقہ حضور ﷺ کے معجزات کو آپ کی ذاتی قوّت قرار دے کر آپ کو تکوینی اختیارات میں شریک ہونے کا عقیدہ کی تبلیغ کر رہا ہے۔

پاکستان کے ایک اہل حدیث عالم نے ''نبوت کی عجمی تعبیر'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے لئے تکوینی اختیار کے تصوّر کی تخلیق میں دیوبندی اور بریلوی علماء دونوں شریک ہیں اور اس تصوّر کی اساس شیخ ابن عربی کے وحدت الوجودی عقیدہ پر قائم ہے۔ لیکن مصنف محقق نے اس کی نسبت پورے دیوبندی حلقہ کی طرف کر کے انصاف کا خون کیا ہے۔ کیونکہ اس تصوّر کا ماخذ دیوبندی اکابر کی کتابوں میں صرف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مشہور کتاب ''آبِ حیات'' نظر آتی ہے اور بریلوی علماء کی کتابوں میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ کی کتاب **سلطنة المصطفى فى ملكوت كل الورىٰ** بنیادی کتاب ہے جس میں خان صاحبؒ نے تمام کائنات کو حضور ﷺ کے زیر فرمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دونوں کتابوں میں فرق صرف تعبیر و توجیہہ کا ہے، مولانا نانوتوی نے علمی اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے اور خانصاحب کے ہاں عوامی اسلوب ہے۔ مثلاً آبِ حیات میں حضورؐ کے لئے درجۂ دوم کی ملکیت کا تصوّر ہے اور خاں صاحب اسے عطائی ملکیت و اختیار کہتے ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے مولانا نانوتوی کی آبِ حیات رہی ہو کیونکہ خاں صاحب کی عمر مولانا نانوتوی کی وفات کے وقت ۲۵ سال کی تھی۔

مولانا نانوتوی کی ولادت ۱۲۴۸ھ - ۱۸۳۲ء) اور وفات بعمر ۴۹ سال ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء (۱۸۸۰ء) اور مولانا بریلوی کی ولادت ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) اور وفات بعمر ۶۸ سال ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) ہے۔

خاں صاحب نے سلطنت المصطفےٰ کتاب ۱۲۹۷ھ میں لکھی، جب آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔
مولانا بریلوی کے عوامی اور عامیانہ اسلوب کی ایک مثال یہ دو شعر ہیں جو خاں صاحب کے مجموعۂ کلام سے نقل کئے جاتے ہیں۔

وقت وہی ایسے رہنما تھے جو ملک و قوم کی رہبری کر سکتے تھے۔ سردار پٹیل نے اپنے خط میں اظہار مجبوری کرتے ہوئے مزید لکھا کہ "میں ہر قدم پر کمیٹی میں آپ کی عدم موجودگی کا احساس کرتا ہوں"۔۔۔اس لیے "اگر آپ براہ راست گفتگو کی ضرورت محسوس کریں تو جس وقت فرمائیں میں دوڑا چلا آؤں لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ آپ میری عرضداشت پر ضرور غور کریں گے"۔ ظاہر ہے کہ ضرورت کی اس گھڑی میں ڈاکٹر انصاری خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔۔انھوں نے سردار پٹیل کی دعوت قبول کرتے ہوئے اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تحریک سول نافرمانی کی آگ میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ملک کے عوام نے ان کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ اپنے مطمح نظر کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری نے سردار منگل سنگھ کو مبارکباد کے جوابی خط میں لکھا کہ "ایسے وقت میں جبکہ حکومت نے کانگریس کو مفلوج کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے کوئی سچا ہندستانی گوشہ نشینی اختیار نہیں کر سکتا"۔ مولانا آزاد کی گرفتاری کے بعد ڈاکٹر صاحب ہی کانگریس کے ڈکٹیٹر بنائے گئے اور انھوں نے جب تحریک کا بیڑہ اٹھایا تو حکومت نے انھیں بھی گرفتار کر کے گجرات جیل میں قید کر دیا۔ ان کے رفیق اسارت خان عبدالغفار خان کے الفاظ میں "ہم نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک پارلیمنٹ تشکیل دے لی تھی جس کے تحت ہم اپنی حکومت چلانے کے اصول سیکھتے تھے کیونکہ ہمیں جلد ہی حکومت سازی کرنے کی امید تھی" جیل میں ان کے رفیق زندانی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بیان ہے کہ "میں ڈاکٹر صاحب کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا ڈاکٹر صاحب اکثر بیمار رہا کرتے تھے لیکن انھوں نے کبھی ملکی آزادی کی خاطر اپنی خود کی ذات کی پروا نہیں کی اور صبر و شکر کے ساتھ ان ایام اسیری کو بھی برداشت کر لیا"۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں جب ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی رہائی عمل میں آئی تو ڈاکٹر انصاری بھی رہا کر دیے گئے۔ دل کے عارضے سے پریشان ہو کر ۱۱ر اگست ۱۹۳۲ء کو وہ تصدق احمد خاں شیروانی کی رفاقت میں یورپ کے لیے روانہ ہو گئے جہاں انھوں نے آرام کیا اور ویانا، لوزان، پیرس اور لندن میں قیام کرنے کے بعد ۱۴ر جنوری ۱۹۳۳ء کو جب وہ وطن واپس ہوئے تو اس شدید صدمے سے دوچار ہوئے کہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا جس کے وہ خود بانی تھے۔ اردو اخبارات نے انصاری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انھوں نے ملت کے مفادات کو نہرو رپورٹ کی بھینٹ چڑھا کر غداری کا ثبوت دیا ہے۔ جس وقت گاندھی اردن مذاکرات شروع ہوئے تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی حسب معمول سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی جہاں ہندستان بھر کے رہنما مہمان بن کر قیام کرتے

ان کی نبوت، ان کی ابوت ہے سب کو عام
امّ البشر عروس انھی کے پسر کی ہے!
ظاہر میں میرے پھول باطن میں میرے نخل
اس گل کی یاد میں یہ صدا بوالبشر کی ہے

(حدائق بخشش)

آبِ حیات کے استدلال کے لئے مولانا نانوتویؒ نے حسب ذیل آیت کو اساس بنایا ہے
اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُه اُمَّهَاتُهم (الاحزاب:۶)

اس کا ترجمہ دیو بندی مسلک کے مشہور رہنما مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حسب ذیل کیا ہے:''نبیؑ مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں''۔

اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''نفس انسانی اگر بُرا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ مومن کا بدخواہ ہوگا اور اگر اچھا ہے تب بھی وہ زندگی کی بعض مصلحتوں سے بے خبر رہتا ہے اور نبی کو خدا تعالیٰ نے انسانی فلاح و خیر کا ضروری علم عطا فرمایا ہے اس لئے نبیؑ ہر حال میں امت کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں۔'' (بیان القرآن، جلد۹ ص ۳۷)

مفسرین میں ابن جریر طبری (وفات ۳۱۰ھ) امام فخر الدین رازی (وفات ۶۰۶ھ) علامہ ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ) اور صاحب روح المعانی (وفات ۱۲۷۰ھ) اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی، سب نے آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اور لفظ اولیٰ کو اسی مفہوم میں بیان کیا کہ حضورؐ اپنی امت کے حق میں ان سے زیادہ مہربان ہیں آپؐ کی اطاعت اپنی خواہش نفس اور اپنے آباء و اجداد کی حکم برداری سے مقدم ہے۔

قاضی صاحب نے متقدمین مفسرین کی عبارتوں کا ان الفاظ میں حاصل نکالا ہے:

اولی فی نفوذ الحکم علیهم و وجوب طاعته علیهم فلا یجوز اطاعة الآباء والامهات بمعنی حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم. (مظہری جلد ۷ ص:۲۰۸)

بعض قرأتوں میں وهو ابٌ لهم (نبی ان کے باپ ہیں) بھی آیا ہے اس لئے امام مجاہد نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: کل نبی اَب لامته — ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے

تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے گاندھی اروِن مذاکرات کے دوران مہاتما گاندھی کے دست راست اور مشیر خاص کی حیثیت سے بڑی خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن معاہدہ عمل میں آگیا اور مہاتما گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونا قبول کرلیا تو شرائط میں یہ بھی شامل تھا کہ مدن موہن مالویہ اور سروجنی نائڈو کے ساتھ ہی ڈاکٹر انصاری بھی کانفرنس میں شرکت کریں گے لیکن برطانوی حکومت نے جس کی نیت اور ذہنیت قوم پرور مسلمانوں کے سلسلہ میں کبھی اچھی نہیں رہی، ڈاکٹر انصاری کو مدعو نہیں کیا۔ مہاتما گاندھی کو حکومت کے اس طرز عمل سے شدید صدمہ پہنچا اور انھوں نے وائسرائے لارڈ اروِن کے نام ایک برقی پیغام بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ "مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو شاید یہ یاد نہیں رہا کہ ہم نے ڈاکٹر انصاری کو گول میز کانفرنس میں مدعو کرنے کے سلسلے میں گفتگو کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مالویہ جی اور مسز نائڈو کے ساتھ اس بات کا بھی ذکر ہوا تھا کہ کانگریسی وفد کے علاوہ اہم قوم پرور مسلمان رہنما کی حیثیت سے ڈاکٹر انصاری کو بھی مدعو کیا جانا چاہیے۔۔۔ جیسا کہ اس وقت اکثر کیا جاتا تھا مذاکرات کا خلاصہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے اراکین کے سامنے پیش کردیا۔ انھوں نے اس بات کی توثیق کردی کہ میں جو کچھ کررہا ہوں مناسب ہے۔ اسی حقیقت کو یاد دلانے کی غرض سے میں یہ تار بھیج رہا ہوں کیونکہ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ کانگریسی وفد کے علاوہ ڈاکٹر انصاری کو بھی مدعو کیا جانا چاہیے۔"

مہاتما گاندھی نے دوسرے خط میں اروِن کے جانشین ہندستان کے نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کو بھی لکھا کہ ڈاکٹر انصاری کو فیڈریشن چیمبر آف کامرس کے نمایندہ کی حیثیت سے بھی کانفرنس میں مدعو کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ "جہاں تک ڈاکٹر انصاری کا تعلق ہے آپ جانتے ہیں کہ لارڈ اروِن یہ سمجھتے تھے کہ مجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر انصاری کو ضرور مدعو کیا جائے گا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سابق وائسرائے کے وعدہ کا سوال ہے جسے ایفا کیا جانا چاہیے۔۔۔ کانفرنس میں میری شرکت اس وقت تک مفید ثابت نہیں ہوگی جب تک ان لوگوں کا کوئی نمایندہ نہ ہو جن کی نمایندگی ڈاکٹر انصاری کرتے ہیں۔" مہاتما گاندھی نے ایک طرف تو ڈاکٹر انصاری کی شرکت پر اصرار کیا اور دوسری طرف وائسرائے پر یہ بھی ظاہر کردیا کہ ڈاکٹر انصاری کی شرکت کانفرنس میں کیوں ضروری تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے لارڈ ولنگڈن کو لکھا کہ "اگر گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم سوال پر یا تجارت سے متعلق کوئی موضوع زیر بحث آیا تو میں ان افراد کی مدد اور تعاون کے بغیر کچھ نہ

کیونکہ وہ امت کا مربی اور مشفق معلّم ہوتا ہے۔ حقیقی باپ جسمانی حیات کا کفیل ہوتا ہے اور نبی کی تربیت سے ابدی حیات حاصل ہوتی ہے۔

پس روحانی باپ ہونا حضور ﷺ کی خصوصیت نہیں، البتہ امّہات المؤمنین کا امت کی ماں ہونا خصوصیات میں سے ہے، دوسرے انبیاء کی ازواجِ مطہرات کا یہ درجہ نہیں۔ (روح المعانی، جلد ۷، ص: ۱۰۷)

ابن جریر طبری نے ابن زید کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں نبی اور امت کے باہمی تعلق کو آقا وغلام کے تعلق سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن وہ آقائی اور غلامی احکامِ شریعت کے نفاذ و اجراء کے معاملہ میں ہے نہ کہ جسمانی آقائی اور غلامی کے مفہوم میں: النبی اولیٰ کما انت اولیٰ بعبدك ما قضیٰ فیهم من امر جاز کلما قضیت علی عبدك جاز. (ابن جریر، جلد ۲۱، ص ۷۰)

علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح میں آیت: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ (النساء: ٦٥) نقل کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ نبی کے حکم سے مراد تشریعی حکم ہے، تکوینی حکم کا یہاں کوئی مفہوم موجود نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ کی یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے:

ما من مؤمن الا و انا اولی الناس به فی الدنیا و الاٰخرة اقرؤا ان شئتم النّبی اَولیٰ...... الخ

دنیا و آخرت میں ہر مومن کے ساتھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں میرا تعلق زیادہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر مرے تو اس ترکہ کے وارث اس کے حق دار ہوں گے اور اگر کوئی مسلمان قرض دار مرے یا بچے چھوڑ کر مرے تو ان کی کفالت میں کروں گا اور اس کا قرض میں ادا کروں گا۔

ابن کثیر نے آیت مذکورہ کے چند پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا حضور کو مسلمان مردوں اور عورتوں کا باپ کہنا صحیح ہے؟ حضرت عائشہؓ سے درست نہیں سمجھتی تھیں اور امام شافعی کا صحیح قول بھی یہی ہے“۔

ایک حدیث میں آپ نے اپنے لئے والد کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ معلّم اور مربی کے مفہوم میں ہے — فرمایا: انما انا لکم بمنزلة الوالد اعلمکم...... الخ

کر سکوں گا اور جس مقصد کے لیے مجھے لندن بھیجا جا رہا ہے وہ پورا نہ ہو سکے گا۔" مہاتما گاندھی نے وائسرائے کو یہ بھی تحریر کیا کہ اگر انھیں اختیارات نہ ہوں تو وہ وزیر اعظم برطانیہ کو ان کے خیالات سے مطلع کر دیں تاکہ جو غلطی سرزد ہو گئی تھی اس کا ازالہ ہو سکے۔ لیکن حکومت نے ڈاکٹر انصاری کو مدعو کرنے سے انکار کر دیا اور مہاتما گاندھی کو ان کے بغیر ہی لندن روانہ ہونا پڑا۔

ڈاکٹر انصاری کو خود اس سلسلہ میں حکومت کی نیت پر شک تھا۔ انھوں نے ۲۸؍ستمبر ۱۹۳۱ء کو شوکت اللہ انصاری کے نام ایک خط میں اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "مجھے یقین ہے کہ حکومت نے دانستہ طور پر گول میز کانفرنس میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی کو نمایندگی نہیں دی اُسے یہ منظور نہ تھا کہ اس کی مداخلت کے بغیر ہندو مسلم مسئلہ طے ہو جائے اور وہ اس امر سے بھی واقف ہے کہ اگر ہندستان میں کوئی جماعت ہندو مسلم اتحاد قائم کر سکتی ہے تو وہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی ہی ہے اس لیے اس جماعت کے نمایندوں کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینا ان کے مفاد کے خلاف ہے کیونکہ وہ ہندستان کی مختلف جماعتوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم کر دیں گے اور اس طرح حکومت کو ہندستان کے ان نمایندوں کے خلاف اپنی ترپ چال چلنے سے محروم کر دیں گے جو برطانوی اقتدار سے آزادی کامل کا مطالبہ کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مہاتما جی کی تمام تر کوششوں کے باوجود مجھے دانستہ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے افراد میں شامل نہیں کیا گیا اور مجھے یقین ہے کہ میں کبھی مدعو نہیں کیا جاؤں گا۔" ڈاکٹر انصاری کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کیونکہ مہاتما گاندھی کو گول میز کانفرنس سے خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا اور اس کے بعد جب مسلم لیگ نے تقسیم وطن کا مطالبہ کیا تو اس نے کانگریس کو خالصۃً ہندوؤں کی جماعت سے تعبیر کرتے ہوئے خود کو مسلمانوں کی واحد جماعت کی حیثیت سے متشخص کیا۔ چونکہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی جانب سے کوئی قوم پرور مسلم نمایندہ شریک نہیں ہوا تھا اور نہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کو نمایندگی کا حق دیا گیا تھا اسی لیے کانگریس پر ایسے الزامات عائد ہوتے رہے اور کانگریس کو مستقل طور پر اپنی صفائی پیش کرنے کا کام کرنا پڑا۔

دوسری گول میز کانفرنس سے مہاتما گاندھی کی ناکام واپسی کے بعد سول نافرمانی کی تحریک کا بازار از سر نو گرم ہو گیا اور دو برس تک جاری رہا اس تحریک میں ۸؍جولائی ۱۹۳۲ء کو انصاری پھر گرفتار کر لیے گئے۔ بعد ازاں اکتوبر ۱۹۳۲ء، اگست ۱۹۳۳ء اور مئی ۱۹۳۴ء میں انھیں دل کے علاج کے لیے ہر سال یورپ کا سفر کرنا پڑا مگر ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دسمبر

''میں تمہارے لئے باپ کی مانند ہوں تمہیں پیشاب پائخانہ کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہوں جس طرح ماں باپ بچوں کو سکھاتے ہیں''۔

حقیقی باپ کے لفظ کی نفی قرآن کریم نے خود کی ہے، فرمایا: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ. (ابن کثیر جلد ۳، ص ۴۶۸) ''محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں''۔

اردو فارسی کے تمام مترجمین نے اولیٰ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، شاہ ولی اللہ: سزاوارتر، شاہ عبدالقادر: لگاؤ، شاہ رفیع الدین: شفقت، مولانا مودودی: مقدم، ڈپٹی نذیر احمد: زیادہ حق رکھتے ہیں۔

اولیٰ، ولایت کے ایک معنی حکومت و تسلط کے بھی ہیں، جس طرح قرب اور دوستی کے ہیں، لیکن کسی مترجم و مفسر نے اس آیت میں اولیٰ کو حاکمیت و حکومت کے مفہوم میں نہیں لیا۔

مولانا نانوتوی نے آبِ حیات میں حضور ﷺ کی ملکیت درجہ دوم اور ذاتی حیات کے فلسفہ کی بنیاد اولیٰ کے اسی لغوی مفہوم پر رکھی ہے اور پھر مولانا احمد رضا خاں صاحب نے آبِ حیات کی تاویل کی روشنی میں اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے۔'' (کنزالایمان صفحہ: ۴۹۷)

تصرف کا لفظ شاہ ولی اللہؒ نے تشریحی طور پر اس طرح بڑھایا ہے: ''پیغمبر سزاوارتر است بتصرف در امور مسلمین از ذاتہائے ایشاں'' یعنی ''حضور ﷺ مسلمانوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا حق خود ان سے زیادہ رکھتے ہیں۔''

پھر اس مفہوم کو ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس طرح واضح کرتے ہیں:

''نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا چلتا ہے۔'' اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں اور اگر نبی حکم دے تو فرض ہو جائے۔''

تصرف سے مراد ان حضرات کی تشریعی تصرف ہے، جو بطور نائب خدا کے حکم و ہدایت کے مطابق امت کے دینی معاملات میں جاری ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث کے واضح نصوص اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ

۱۹۳۴ء میں انھوں نے بڑی بے بسی کے عالم میں شوکت اللہ کے نام ایک خط میں لکھا کہ "اگر یہی حال رہا تو میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہوں گا" انھوں نے قومی رہنماؤں سے بھی درخواست کی کہ وہ انھیں قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور نہ کریں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر انصاری نے سوراج پارٹی کی تجدید کی اور کانگریس کے پارلیمانی بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۶/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو انھوں نے بمبئی میں اسمبلی کے لیے انتخابات کی مہم کا افتتاح کیا۔ انتخابات میں ۸۸ منتخبہ نشستوں میں سے ۴۴ نشستوں پر کانگریس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن اس کامیابی پر ان کی کوششوں کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی اور وہ مارچ ۱۹۳۵ء میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔

ڈاکٹر انصاری فرقہ وارانہ فسادات اور کانگریس کے آپسی اختلافات سے شدید طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے لیے اب آخری پناہ گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی تھی جس کے وہ بانیوں میں تھے اور ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ کے قیام کے بعد ان سے اس کے آنریری سیکریٹری بن جانے کی درخواست کی گئی تھی لیکن انھوں نے اسے اس لیے منظور نہیں کیا کہ وہ مستقل طور پر علی گڑھ میں قیام نہیں کر سکتے تھے۲ اس کے باوجود وہ ہمیشہ جامعہ کی اہم ترین کمیٹیوں سے وابستہ رہے۔ وہ جامعہ کی سنڈیکیٹ، نصاب کمیٹی، جماعت امنا کے نظام اساسی سے متعلق کمیٹی کے رکن رہے۔ وہ ایک ایسی جامعہ کے حامی تھے جو حکومت کے اثر سے آزاد رہ کر قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو، اس کی تعلیم میں دینی اور دنیوی نصاب کے ساتھ ہی قدیم وجدید عناصر کا امتزاج ہو اور وہ اس کی اہل ہو کہ ہندستان کی آزادی کی عظیم جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ انھوں نے خلافت کمیٹی، کانگریس، مسلم لیگ، جمعیۃ علماء، نیشنلسٹ مسلم پارٹی اور دوسری تمام جماعتوں کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ جامعہ کے استحکام سے متعلق تجاویز منظور کرائیں اور اس کے لیے کثیر رقمیں فراہم کیں۔ جب اولین امیر جامعہ حکیم اجمل خاں نے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر انصاری ان کے ہموار رہے اور دونوں ہی کی سعی سے اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ دہلی میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کے کاموں میں بڑی دلچسپی لی جب وہ حکیم اجمل خاں کے ساتھ یورپ کے سفر پر تھے تو ذاکر حسین، عابد حسین اور محمد مجیب نے ان سے ویانا میں مل کر جامعہ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب جامعہ کے معتمد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب کے انتقال کے بعد وہی امیر جامعہ کی حیثیت سے سرگرم کار رہے اور آخری وقت تک اس منصب پر فائز رہے۔

ہدایت خداوندی سے بے نیاز ہو کر تشریعی امور میں دخل دینے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

محدثین وفقہاء نے وضاحت کی ہے کہ جو ہدایات رسولِ پاکؐ نے ایسی جاری فرمائیں جن کا ثبوت وماخذ کتاب اللہ میں واضح نہیں وہ ہدایات وحی خفی سے تعلق رکھتی ہیں، انہیں حضورؐ کی ذاتی ہدایات اور ذاتی احکام قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی لئے حقیقی مفہوم میں شریعت ساز صرف خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ حاصل یہ کہ حضورؐ کا تشریعی تصرّف بھی نائب خدا کے طور پر ہے، جو رسالت کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس میں تکوینی تصرف کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص کلامی اجتہاد کی تشریح کے بعد اس حقیقت کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ یہ تصوّرات جس دلیل پر مبنی ہیں وہ ایک باریک ولطیف شے ہے۔ اس لئے عام ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتی، لکھتے ہیں:

> ''رسول اکرم ﷺ کو اہل ایمان کے اموال ونفوس میں تصرف کا حق معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ واسطہ اور وسیلہ کا تعلق ایک لطیف اور مخفی شے ہے جو اہل بصیرت کے سوا کسی پر واضح نہیں بلکہ قرآن واحادیث کے اشارات سے بھی بدشواری سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے قانونِ شریعت کے عام قاعدہ کے مطابق آپ کے لئے نکاح ومہر اور عدل ومساوات کا فریضہ عائد کیا ہے۔''

اگر ملکیت کے اس حق کا لحاظ کیا جاتا تو عام خواتین آپؐ کے لئے مثل باندیوں کے حلال ہوتیں لیکن اس سے کم فہم لوگوں کو شہوت پرستی کی تہمت لگانے کا موقعہ مل جاتا۔'' (آبِ حیات ص ۲۰۷)

یہی وجہ ہے کہ علمائے دیوبند نے مولانا نانوتوی کے ان اجتہادی اور استنباطی تصوّرات کو عوام میں شہرت دینے سے گریز کیا اور عوام میں انہی عقائد کی تبلیغ وتشہیر کی جو عقیدہ توحید کے مطابق تھے۔

آبِ حیات کے تصوّرات

ذیل میں آبِ حیات کے تصوّرات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، یہ حضرت نانوتوی کے تفردات ہیں، جنہیں جماعتِ دیوبند کی طرف سے تسلیم کرنے کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

امیر جامعہ منتخب ہو جانے کے بعد ڈاکٹر انصاری نے سب سے پہلے یہ تجویز پیش کی کہ حکیم اجمل خاں، جنھوں نے قوم کے جسمانی علاج کے لیے یادگار کے طور پر طبیہ کالج کو اپنی زندگی ہی میں مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا تھا اب ان کی وفات کے بعد روحانی علاج کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ان کی یادگار کے طور پر ایک شکل دینے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں مہاتما گاندھی نے بھی قوم سے اپیل کی کہ وہ اس یادگار کو مستحکم کرنے کی سمت میں دستِ تعاون دراز کریں۔ فروری ۱۹۲۸ء میں دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں ملک کے ہر فرقہ کے سر کردہ رہنماؤں نے شریک ہو کر اس تجویز سے اتفاق کیا۔ صدر جلسہ پنڈت موتی لال نہرو نے کہا کہ حکیم صاحب ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ بھی ان کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں حصہ لیں" اس کے نتیجے میں "اجمل جامعہ فنڈ" کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر انصاری نے کہا کہ مذہبی تعلیم، رواداری، اخوت اور اردو کے ذریعے تعلیم دینا اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینا جامعہ کی خصوصیات میں شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ والے کرائے کی کوٹھیوں میں سرگرم کار ہیں اگر حکیم صاحب کی یادگار میں آٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں تو جامعہ کی اپنی عمارتیں تعمیر کرائی جا سکتی ہیں سبھی شرکاء نے اس تجویز کی تائید کی۔

۲۹ راپریل کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں فاؤنڈیشن کمیٹی نے یہ طے کیا کہ جامعہ کو مالی طور پر مستحکم کرنے کی غرض سے ایک منتخب جمعیۃ امنا کے سپرد کر دیا جائے جس کے ہاتھوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نظم و نسق ہو، اس طرح جمعیۃ امنا میں تیں اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ مجلس تاسیس نے ڈاکٹر انصاری کو مجلس امنا کی پہلی مجلس انتظامیہ کا صدر منتخب کیا اس کے معتمد ڈاکٹر ذاکر حسین، خازن جمنا لال بجاج، مستجل جامعہ ڈاکٹر عابد حسین منتخب ہوئے اور مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالمجید خواجہ اور محمد شفیع داؤدی کو رکن بنایا گیا اس جلسہ میں مجلس تاسیس کو ختم کر دیا گیا اور اس کی تمام تر ذمہ داریاں مجلس امنا کو منتقل کر دی گئیں۔

ڈاکٹر انصاری نے اپنے دور امارت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جامعہ کو مالی بحران سے نجات دلانے کی غرض سے "انجمن تعلیم ملی" کی بنیاد رکھی تا کہ جامعہ کو اس کے سپرد کر دیا جائے اس انجمن میں جامعہ کے ان اساتذہ کو شامل کیا گیا جنھوں نے ایک طویل مدت کے لیے ایک معینہ رقم سے کم پر جامعہ کی خدمت کرنے کا اقرار کیا اور موجودہ امنا سے کم سے کم چھے سو روپے سالانہ دینے یا دلانے کا اقرار کروایا۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (نبیرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی) کی بعض تحریروں میں ان تصورات کی جھلک نظر آتی ہے اوران کی حیثیت بھی مولانا کے ذاتی تصورات کی ہے۔

مولانا نانوتوی نے آبِ حیات میں حضورؐ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے:
النَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُه اُمَّهَاتُهُمْ. (الاحزاب)
''حضور ﷺ امت کے روحانی باپ ہیں۔'' روحانی باپ کا درجہ جسمانی باپ سے زیادہ ہے، اہلِ ایمان کی ارواح حضورؐ کی روح پاک سے تخلیق کی گئی ہیں۔

حضورؐ کی حیات ذاتی ہے۔ دوسرے مومنین کی حیات عرضی ہے۔ آپ کی حیات قابلِ زوال نہیں، البتہ موت کے وقت یہ حیات مستور (پردہ میں) ہوگئی اور اہل ایمان کی حیاتِ زائل ہوجاتی ہے۔

جیسے سورج گہن میں سورج کی روشنی حجاب (پردہ) میں ہوجاتی ہے، زائل نہیں ہوتی، بخلاف چاند گہن کے، اس کی روشنی زائل ہوجاتی ہے — حضورؐ کی موت کی مثال جیسے چراغ پر سرپوش ڈھانپ دیا جائے اور مومنین کی مثال جیسے چراغ کو بجھا دیا جائے۔

حضور ﷺ اور مومنین کے درمیان اتحاد واشتراک اور مثلیت کا تصوّر غلط ہے۔ اگرچہ شکل وصورت واحکام جسمانی مثلاً کھانے پینے وغیرہ میں مماثل کہا جائے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُم جس طرح آفتاب اوراس کی شعاعوں میں مثلیت ذاتی نہیں بلکہ آسمان وزمین کا فرق ہے، لاکھوں عکس بھی مثل آفتاب نہیں ہوسکتے، اگرچہ صورت اور رنگ میں نور آفتاب اور اصلی آفتاب میں مشابہت ہے لیکن برابری کا خیال باطل ہے۔

ازواجِ مطہرات آپ کی باندیاں تھیں، ان پر حضور کا حق: ما ملکت ایمانکم سے زیادہ تھا۔ مالک کی ملک عارضی ہوتی ہے، آزاد کرنے یا فروخت کرنے سے زائل ہوجاتی ہے مگر امتیوں پر آپ کا جو حق ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتا کیونکہ ارواحِ مومنین حضورؐ کی روح سے پیدا کی گئی ہیں۔

حقیقی مالک تو خدا ہے لیکن دوسرے درجہ میں رسول پاک کی ملکیت کو سمجھئے، کیونکہ حضور تمام عالم کے لئے وسیلہ اور واسطہ فی العروض ہیں جیسے ہاتھ اور قلم، اصل میں حرکت ہاتھ کو لاحق ہوتی ہے، قلم

انجمن تعلیم ملی کا مقصد ملک میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص قومی اور ملی اصول پر صحیح تعلیم پھیلانا قرار پایا اور اسے دو اصولوں کا پابند کر دیا گیا اولاً یہ کہ وہ حصول آزادی تک حکومت وقت سے نہ تو کوئی تعلق رکھے گی نہ اس سے کسی قسم کی امداد چاہے گی اور نہ قبول کرے گی دوئم یہ کہ انجمن تمام مذاہب عالم کے ساتھ رواداری برتے گی۔ اس کے مطابق انجمن کے مقاصد کی تکمیل کرتے ہوئے جامعہ کے کارکنوں نے جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری خود ہی سنبھال لی اور اپنی تنخواہوں میں جو پہلے ہی کم تھیں اتنی کمی کر دی کہ جن سے ان کی بنیادی ضرورتیں بھی بمشکل پوری ہو سکتی تھیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں "شعبۂ ہمدردانِ جامعہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ کے کارکنوں کے نزدیک جامعہ کی آمدنی کا پائدار اور قابل اعتماد مستقل انتظام یہ نہیں تھا کہ بنک میں سرمایہ جمع ہو یا حکومت کی جانب سے امداد فراہم ہو بلکہ یہ تھا کہ تمام مسلمانوں کے دل میں قومی تعلیم گاہ کے لیے جگہ پیدا ہو اور قطرہ قطرہ کر کے فیض و کرم کا دریا بہایا جائے جو بنکوں اور حکومتوں کے زوال کے بعد بھی جاری رہے۔ اس شعبہ کے مقصد کے تحت جن لوگوں نے چار آنے، آٹھ آنے 'ایک روپیہ' دو روپے یا اس سے زائد ماہوار دیے انھیں "حلقہ ہمدردانِ جامعہ" کارکن بنا لیا گیا۔ چندہ دینے والے افراد کو جامعہ کے کاموں سے باخبر رکھنے کی غرض سے اور رقوم کا حساب کتاب ہمدردوں کے سامنے پیش کرنے کے مقصد سے ماہوار رسالہ "ہمدرد جامعہ" کے اجرا کی تجویز بھی منظور ہوئی۔

انجمن تعلیم ملی اور شعبہ ہمدردانِ جامعہ کا قیام جامعہ کو مالی بحران سے نجات دلانے کی سمت میں مثبت اقدامات تھے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر انصاری اور دوسرے نامور رہنماؤں اور جامعہ کے اساتذہ نے چندوں کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے دورے کیے جن میں لنکا، مالدیپ اور برما بھی شامل تھے۔

۱۹۲۹ء میں قرول باغ میں "مدرسہ شبینہ" کے لیے کمروں کی تعمیر عمل میں آئی جو دہلی میں جامعہ ملیہ کی اپنی خود کی پہلی ملکیت تھی۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ جامعہ کی تعمیر و ترقی کا نقشہ بنایا گیا اور جب حیدر آباد سے مالی امداد فراہم ہو گئی تو ۱۹۳۱ء میں جمنا کے کنارے اوکھلا گاؤں میں جامعہ کے لیے زمین خرید لی گئی جہاں موجودہ جامعہ واقع ہے اس کے چار سال بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں جامعہ کی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سنگ بنیاد جامعہ کے سب سے کم عمر طالب علم عبدالعزیز نے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ رکھا۔ یہ بھی جامعہ کی جدت ہی تھی کہ نامور قومی اور غیر ملکی رہنماؤں کی موجودگی کے باوجود یہ رسم ایک جامعی بچے سے ادا کروائی گئی۔ اس موقع

کی حرکت ہاتھ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس ہر کمال میں حضور واسطہ ہیں۔ خاص کر ارواحِ مومنین کے لئے۔

آخرت میں آپ کو مقامِ وسیلہ کا دیا جانا اسی طرف اشارہ ہے: والعاقل یکفیہ الاشارۃ عجب نہیں کہ یہ روایت صحیح ہو۔

لولاکَ لما خلقتُ الافلاک "اگر اے نبی! تم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا" مضمون تو اس کا صحیح ہے۔ اس لئے مومنین کی ارواح کی قدر و قیمت اور فضیلت ایک حیثیت سے عرشِ اعظم سے بھی زیادہ ہے۔ (آبِ حیات ص:۲۲۴)

مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے نزدیک حضور علیہ السلام کی حیات "حیاتِ برزخی" ہے جو حیاتِ جسمانی سے زیادہ قوی التاثیر ہے، لیکن حضرت نانوتوی کے فلسفہ کے مطابق وہ حیات حقیقی ہے یعنی جسم روحانی تعلق کے ساتھ حیات ہے۔

دیوبند کے مشہور محدث مولانا انور شاہ کشمیری کے نزدیک حیات النبیؐ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی روحانی توجہات امت کی طرف مبذول ہیں، اسی کا اثر ہے کہ یہ امت بحیثیت مجموعی ہدایت پر قائم ہے۔ ماہر القادری صاحب نے اسی مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

یہاں سب سو رہے ہیں ایک تُو بیدار ہے ساقی
کبھی کا کاروانِ کیف و مستی لٹ چکا ہوتا

شہداء فی سبیل اللہ کی حیات کے بارے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حیات بھی حیاتی اثرات واعمال کے مفہوم میں ہے، جس کی طرف قرآن کریم نے یُرزَقُونَ (وہ رزق دیئے جاتے ہیں) سے اشارہ کیا ہے۔

اوپر علامہ ابن کثیر کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ حرمتِ نکاح کا تعلق، مقام نبوت کی عظمت و حرمت سے ہے، جو جمہور کا مسلک ہے اور آبِ حیات کے فلسفہ کے مطابق اس حرمت کا تعلق حضور کی حیاتِ حقیقی سے ہے۔

ہمارے اکابرِ دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ آپ پر محبت نبویؐ کا غلبہ تھا، اسی محبت کا اثر تھا کہ آپ تواضع و مسکنت کا پیکر نظر آتے تھے، آپ کے شیخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی آپ کو نصیحت کرتے تھے کہ مولانا قاسم صاحب! علم کے وقار کا خیال رکھو یعنی اتنی

پر اپنی تقریر میں امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کے کارکنوں اور اساتذہ کی بے لوث خدمات کا اعتراف کیا اور بڑی محبت اور شفقت سے ان کی حوصلہ افزائی کی انھوں نے کہا کہ "ہم ایک ایسے ادارہ کی تعمیر کے خواہاں ہیں جو اسلامی روایات پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ قومی نقطہ نظر کا حامل ہو" ترکی کی نامور ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے بھی اپنی تقریر میں جامعہ کے تابناک مستقبل کی پیشین گوئی کی۔

اسی طرح مروجہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کر کے نیا نصاب بنایا گیا اس میں کہا گیا کہ

"جامعہ کے کارکنوں کا ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا مقصد محض بچّہ کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے بلکہ اسکی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بچّہ کی خداداد قوتوں میں نشو و نما کا سامان پیدا کرے اور اس میں متمدن زندگی کے فرائض اور مقاصد سے لگاؤ پیدا کرے۔ جہاں تک کہ ٦ سال سے ١٢ سال تک کی عمر میں اس کا امکان ہے اسے اپنی قوتوں پر، محرکات عمل پر، جذبات پر رفتہ رفتہ قابو حاصل ہونے لگے کہ اخلاق اور ذہنی خط کی بنیاد اس سے پڑتی ہے۔ اس میں اپنے فرض کا احساس ہو اور اس کو پورا کرنے کا ولولہ' اس کا تخیل اور اس کی ہمدردیاں اس طرح وسعت پذیر ہوں کہ وہ اپنے فطری اور معاشرتی ماحول میں اجنبی نہ رہے بلکہ اسے سمجھے اور اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ جامعہ کی آرزو ہے کہ جن لڑکوں کی تعلیم اس کی نگرانی میں ہو وہ تندرست ہوں، ان کا چال ڈھال اچھا ہو، وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور وضاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ ان کی گفتار میں حسن اور وقار ہو' وہ صاف ستھرے رہتے ہوں، سچ بولتے ہوں۔ اپنے ماحول سے حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندستانی اور سچے مسلمان یعنی کامل انسان ہوں"۔

نئے نصاب میں مندرجہ بالا تمام مقاصد کی تکمیل کا اہتمام تھا۔ اس سلسلے میں اساتذہ کی ٹریننگ پر زور دیا گیا اور ہر سال جامعہ کے ایک استاد کو موگا کے ٹریننگ کالج بھیجنے کا انتظام ہوا تاکہ تعلیم کے جدید طریقوں سے انھیں واقف کرایا جا سکے۔

اسی کے ساتھ طلبہ کے لیے ماہرین تعلیم، نامور شخصیتوں اور ممتاز اسکالروں کی

تواضع اختیار نہ کرو کہ علم کی توہین ہونے لگے۔ مولانا نانوتوی کا لباس، ایک کھدّر کا موٹا تہبند، ایک کھادی کی نیم آستین نہ چغا، نہ عباء اور عصاء کے تکلفات۔

آپ کے مقابلہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (جو آپ کے ساتھی اور پیر بھائی بھی تھے) کی شان دوسری تھی، آپ پر اتباعِ سنّت کا رنگ غالب تھا، آپ قرآن وحدیث کے واضح نصوص کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے، جس میں محدّثانہ اور فقیہانہ احتیاط ہے اور عام مسلمانوں کے لئے یہی نجات کی راہ ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے ہفت مسئلہ سے آپ نے اتفاق نہیں کیا اور جب حاجی صاحب سے کہا گیا کہ مولانا گنگوہی کو ہفت مسئلہ سے اتفاق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا ''وہ بڑے عالم ہیں۔''

مولانا نانوتوی نے آب حیات میں آپ کے لئے رونقِ طریقت اور زیبِ شریعت کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جماعتِ دیوبند کا مسلک جن اکابر کے افکار پر قائم ہے۔ مولانا گنگوہی ان میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں مولانا محمد قاسم نانوتوی عاشقِ رسول کے طور پر مشہور ہیں۔

جماعت دیوبند کے عظیم فقیہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے کسی نے ایک سوال میں مختلف مصالح کے تحت بدعی افکار واعمال کی ترویج پر فتویٰ طلب کیا، مفتی صاحب نے احتیاط کی بناء پر تفصیل میں جانے کے بجائے اختصار کے طور پر لکھا: آہ! یہ سوال بہت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے، میں سردست اس کے جواب میں صرف ایک شعر پر اکتفاء کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

صلّی اللہ علیہ وسلّم تسلیماً کثیراً — محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی (کفایت المفتی جلد ۱ ص:۱۴۹)

جماعت دیوبند میں حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ علم حدیث وفقہ اور عملی تقویٰ اور احتیاط دانش مندی میں اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے۔

☆☆☆

تقریروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی، سروجنی نائڈو، پروفیسر گرمانس، پروفیسر نکر، مولانا آزاد سبحانی، شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن، قاضی عبدالغفار، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، ڈاکٹر جیرڈ، جیسی معروف شخصیتوں نے مختلف موضوعات پر تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا اہتمام انجمن اتحاد کی جانب سے ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اردو اکادمی نے بھی علمی مضامین پڑھوانے کا پروگرام شروع کیا جس میں نامور ہستیوں نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر انصاری نے ایک زبردست کام یہ شروع کیا کہ جامعہ میں توسیعی خطبات کی بنیاد رکھی۔ اس کے تحت ترکی کے ممتاز رہنما حسین رؤف بے نے "قدیم اور جدید ترکی" پر چار لکچر دیے جن میں سے دو جلسوں کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ ترکی کی ممتاز قومی رہنما اور ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے آٹھ لکچر دیے جو جنوری اور فروری ۳۵ء میں منعقد ہوئے پہلے لکچر کا موضوع "مشرق و مغرب کی خصوصیات" تھا اس جلسہ کی صدارت خود ڈاکٹر انصاری نے کی۔ خالدہ ادیب خانم سے ان کی ملاقات ۱۹۱۲ء میں قسطنطنیہ میں اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے طبی مشن کے قائد کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا تھا۔ لکچر سے پہلے خالدہ ادیب خانم کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ خالدہ نے "فوجی وردی زیب تن کی اور ایک شدید جنگ کے شور شرابے میں آگ اور دھوئیں کے درمیان قومی فوج کے صدر دفتر میں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے زندگی کو رسوم و ذولیات کی زنجیروں میں جکڑے جانے کے خلاف بغاوت کی اور اپنی قوم سے محبت کر کے اس کی خدمت کی تاکہ وہ وسیع تر انسانیت کو اپنا سکے۔ اگرچہ وہ اپنی قوم کی آزادی کی جدوجہد میں جان و دل سے شریک رہیں تاہم انھوں نے دنیا میں جاری شدہ اخلاقی اور ثقافتی کشمکش سے کبھی منہ نہیں موڑا۔۔۔"

دوسرے لکچر کا موضوع "بادشاہی نظام کی شکست" تھا۔ اس جلسے کی صدارت مہاتما گاندھی نے کی۔ تیسرا لکچر "نوجوان ترکوں کی حکومت" کے موضوع پر تھا اس کی صدارت کے فرائض مولانا شوکت علی نے انجام دیے۔ چوتھا موضوع "خلافت کا خاتمہ، نئی حکومت اور مذہب" تھا۔ اس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد ہوئی۔ پانچویں جلسے میں مقررہ نے "ترکی ادب" پر تقریر کی اس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر علامہ اقبال نے انجام دیے۔ چھٹا لکچر "حالات حاضرہ" پر تھا جس کی صدارت بھولا بھائی ڈیسائی نے کی۔ ساتویں لکچر کا عنوان تھا "ترک خواتین"۔ اس کی صدارت مسز سروجنی نائڈو نے کی۔ آٹھواں لکچر بھی خواتین ہی سے متعلق تھا جس کی صدارت ڈاکٹر بھگوان داس نے کی۔ ان تمام جلسوں میں ہر

مولانا بدر الحسن القاسمی*

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور جدید علم کلام

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دین کے بنیادی عقائد: وجود باری، توحید، صفات باری، رسالت، عقیدہ آخرت مسئلہ تقدیر، نبوت، معجزات اور فرشتوں کے وجود وغیرہ کے اثبات کے لئے استدلال کا جو انداز اختیار فرمایا ہے اور جس طرح عقلی دلائل کے ساتھ روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی تمثیلوں کے ذریعہ خالص غیبی حقائق کو عقل و وجدان سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں بے پناہ زور و قوت کے ساتھ ایسی جدت و ندرت بھی ہے جو دوسرے متکلمین اسلام کے یہاں نہیں ملتی اور اس میں حضرت نانوتوی کا خاص امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی کے متفرق رسالوں اور مکتوبات میں بکھرے ہوئے دلائل کو دیکھنے کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ ''اگر ذرا سا ان کا قالب بدل دیا جائے تو عصر حاضر کا بہترین علم کلام تیار ہو سکتا ہے''۔(۱) اور مولانا نانوتوی کے علوم و معارف کے محرم اسرار علامہ شبیر احمد عثمانی کی طرح ہمیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ:

> ''مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصنیفات میں جتنا غور کرو اتنا ہی ان کی وہبی دانش مندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہے اور سب کچھ کہہ دیں تو بے جا نہیں، یہ وہ فاضل ہیں جنھوں نے علم کلام کی ایک ایسی انوکھے طرز پر بنا ڈالی ہے جو انشاء اللہ قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوتا''۔(۲)

مولانا مناظر احسن گیلانی اور ان کے استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی دونوں کو اللہ نے مولانا محمد

(۱) دیکھئے سوانح قاسمی کی آخری جلد۔ (۲) دیکھئے رسالہ العقل والنقل

* ص.ب ۱۳، الصفات، کویت

قوم وفکر کے افراد شریک ہوئے اور انتظام جامعہ کے طلبہ نے ڈاکٹر عابد حسین کی نگرانی میں کیا تھا۔ اس طرح ان توسیعی خطبات کا اہتمام کر کے ڈاکٹر انصاری نے ملک کی مایہ ناز شخصیتوں کو جامعہ کی ترقی سے متعارف کرانے کا موقع فراہم کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے دور امارت میں "جامعہ" کی اشاعت نئی ترتیب سے عمل میں آئی "پیام تعلیم" کو خالصتہً بچوں کا پرچہ بنادیا گیا۔ بچوں کا کتب خانہ قائم ہوا، بچوں کا بنک شروع کیا گیا اور بچوں کی دکان کی شروعات ہوئی۔ یہ تمام اقدامات بچوں کو عملی تربیت دینے کی غرض سے کیے گئے۔ بنارس میں منعقدہ ایشیائی تعلیمی کانفرنس اور مسلم کانفرنس کی نمائش میں جامعہ نے بھی پہلی بار شرکت کی۔ اسی زمانے میں جامعہ کے تعلقات ندوۃ العلماء لکھنؤ اور شانتی نکیتن کے ساتھ قائم ہوئے۔ جامعہ میں پروجیکٹ میتھڈ اور مشترکہ پروجیکٹ کا آغاز ہوا۔ کھیلوں کو اہمیت دی گئی۔ ڈراموں کو رواج ملا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین' پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نے بڑے اچھے ڈرامے لکھے۔ انجمن ملازمین قائم ہوئی۔ مولانا محمد علی کی یاد میں 'جوہر ٹرافی' شروع کی گئی۔ دوسرے شہروں کے تقریری مقابلوں میں جامعہ کے طلبہ نے شرکت کی۔ عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو جدید تعلیم کے حصول کی خاطر انگریزی سکھانے کے لیے "درجہ خاص" کا قیام عمل میں آیا اور ان کے لیے نصاب اور قاعدے بنائے گئے۔ اساتذہ کا مدرسہ قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔

جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے گاندھی جی کے نمک ستیہ گرہ اور تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ انجمن طلباء قدیم کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ جامعہ کے طلبہ کا مصر کی جامعہ الازہر میں داخلہ ہوا۔ باغبانی کو فروغ دینے کی خاطر زمین خریدی گئی جس میں سبزیاں اگائی گئیں اور فروخت کی گئیں۔ بیت بازی اور مشاعروں کو فروغ ملا۔ مشاعروں میں ہندوستان کے نامور شعراء نے شرکت کی۔ مدرسہ ابتدائی میں کنڈر گارٹن جماعت شروع کی گئی۔ اس کے لیے مس گرڈ فلپس بورن عرف آپا جان ذمہ دار تھیں جن کا تقرر ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اقامت گاہوں میں اتالیق مقرر کرنے کے رواج کو عام کیا گیا۔ یوم والدین کے انعقاد کی بنیاد ڈالی گئی۔ "ایک دن کا مدرسہ" شروع ہوا جس کا تمامتر انتظام بچوں کے ذمہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ۱۹۳۴ء میں جامعہ کا پہلا میزانیہ پیش کیا۔ اسی سال لڑکوں کی عدالت قائم ہوئی جو آگے چل کر "بچوں کی حکومت" میں منتقل ہو گئی۔

اساتذہ کے لیے "اسٹاف کلب اور انجمن اساتذہ" کا قیام عمل میں آیا۔ "خواتین کے جلسوں" کا

قاسم نانوتوی کے علوم و معارف سے مناسبت بھی دی تھی اور منطق و فلسفہ کے ساتھ تصوف و علم کلام کی نازک اور مشکل اصطلاحات پر دسترس کے ساتھ زبان و بیان کی شیرینی اور تشریح و تعبیر کی بے پناہ قدرت بھی عطا کی تھی نیز عصر حاضر کے شکوک و شبہات اور تقاضوں پر بھی ان کی نظر تھی لیکن حضرت نانوتوی کی کتابوں کے قالب بدلنے اور عصر حاضر کے نئے علم کلام کی تدوین و ترتیب کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، اور اس طرح:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس مہم کو سر کرنے کے لئے اب نہ اس پایہ کے علماء ہیں اور نہ علمی حقائق کی عصری تعبیر و تشریح پہ قدرت رکھنے والے افراد تاہم ایک بچکانہ اور طالب علمانہ کوشش جو مدت ہوئی میں نے کی تھی اور جس کا بڑا حصہ انقلاب دارالعلوم کی نذر ہو گیا اور جس کے متفرق حصے عربی زبان میں شائع شدہ بھی تھے، مثال کے لئے صرف اس کا ایک نمونہ ذیل میں اس احساس کے ساتھ پیش خدمت ہے کہ یہ ایک ایسا قرض ہے جو قاسمی برادری پر مسلسل چلا آ رہا ہے، اس لئے کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے میدان میں آنا چاہیے۔

اس کام کے لئے اب جو خاکہ میرے سامنے ہے وہ یہ کہ ان دلائل کو عام فہم بنانے کے ساتھ جدید علمی تحقیقات سے ان کو اس طرح مربوط کر دیا جائے کہ نیا طبقہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے، حضرت نانوتوی کی کتابوں سے دور رہ کر یہ کام انجام نہیں پا سکتا، ممکن ہے مولانا محمد قاسم نانوتوی سیمینار میں پیش کئے جانے والے مقالات میں شاید اس پہلو پر زور دیا گیا ہو اور مستقبل میں اس کی راہ کھلے، ذیل کے مضمون میں ایک محض نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر حضرت نانوتوی کی مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر کسی ایک موضوع سے متعلق ان کے پیش کردہ دلائل اکٹھا کر کے اپنی زبان میں پیش کیا جائے تو اس سے دینی عقائد کو نئے انداز پر سمجھنے کی راہ کس طرح ہموار کی جا سکتی ہے اور وہ متخیل جدید علم کلام کس طرح وجود میں آ سکتا ہے جو ایک طرف قاسمی طریق استدلال پر مبنی ہو اور دوسری طرف جدید عصری اور علمی مؤیدات کو بھی اس میں نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ محض ایک کوشش ہے اور ایک ایسے شخص کی طرف سے جس کی علمی سرحدیں کشادہ نہیں ہیں اور جس کے سامنے اس وقت حضرت نانوتوی کی تصنیفات بھی نہیں ہیں تاہم جو دلائل یہاں جمع کئے گئے ہیں وہ کسی ایک کتاب سے نہیں بلکہ حضرت نانوتوی نے ”تقریر دل پذیر“، ”حجۃ الاسلام“،

انعقاد ہوا جن میں جامعہ کی بہتری کے لیے تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ ان جلسوں میں جامعہ کے اساتذہ اور قومی رہنماؤں کی بیگمات شریک ہوتی تھیں۔

بہار اور کوئٹہ میں زلزلہ کی تباہ کاری سے متاثرہ افراد کے دس یتیم و لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری جامعہ نے اپنے ذمہ لی۔ ڈاکٹر انصاری کے دور امارت کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ اس زمانے میں جامعہ میں قومی اور بین الاقوامی مہمانوں کی آمد کثرت سے ہوئی جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ، مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے، سری نواس آینگر، ستیہ مورتی، این سی کیلکر، ظفر الملک، اینی بیسنٹ، آصف علی، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، بیگم محمد علی، بیگم انصاری، مولانا آزاد سبحانی، شمس العلماء عبدالرحمٰن، مولانا شرف الدین، جواہر لال نہرو، قاضی عبدالغفار، خواجہ غلام السیدین، بیرسٹر آصف علی، علامہ اقبال، راجگوپال آچاریہ، عبداللہ یوسف علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی محمد محی الدین، ذوالفقار جنگ بہادر، سر عبدالرحیم، مہاراجہ سرکشن پرشاد، نواب صدر نواز جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر، مسز کیلے، بوڈاپیسٹ کے مفتی، چودھری خلیق الزماں، حافظ محمد ابراہیم، غلام محمد، منشی پریم چند، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں میں دنیا کے بہترین مقرر ڈاکٹر اینٹلی، مشہور سیاح مسٹر ایڈی، امریکہ کے مسٹر رچرڈ کیتھین، گلاسگو کی مس کوپ لینڈ، برلن کے ڈاکٹر ایرش ٹیلے، ترکی کے حسین رؤف بے، بیرن عمر ظلنتہ، ڈاکٹر کپ نس اور خالدہ ادیب خانم کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کانگریس کے باہمی اختلافات اور غیروں اور اپنوں کے غیر منصفانہ سلوک نے ڈاکٹر انصاری کو ایک شکستہ انسان بنادیا تھا۔ دل کے عارضہ نے انھیں اور بھی پسپا کر دیا جس کے علاج کے لیے انھیں بار بار یورپ کا سفر کرنا پڑا۔ اسی لیے انھوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا پورا وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ ۱۹۳۶ء میں "پیام تعلیم" کے خصوصی شمارہ کے لیے جو تاسیس نمبر تھا، بچوں کے نام اپنے پیغام میں انھوں نے کہا:۔

"سالہا سال سے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تمھیں یہ نصیحت کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس پر کاربند ہوئے تو تمہارا ذہن پوری طرح نشو و نما پائے گا اور تم بڑے ہو کر اچھے آدمی بنو گے۔ تمہاری سیرت پر ایسے پردے نہیں پڑیں گے جو اس کی اصلیت کو چھپائیں اور وہ نصیحت یہ ہے کہ تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ، اپنے کمرہ میں ہو یا مدرسہ میں

"مباحثہ شاہ جہاں پور"، "گفتگوئے مذہبی" اور "قبلہ نما" وغیرہ میں جو باتیں متفرق طور پر وجود باری سے متعلق کی ہیں ان کو ایک ترتیب و تسلسل کے ساتھ حضرت نانوتوی کے الفاظ کی پابندی کے بغیر اکٹھا کر دیا گیا ہے اور اس پر بقدر ضرورت ہی اپنی طرف سے حاشیہ آرائی کی گئی ہے، واضح رہے کہ حضرت نانوتوی کے دلائل لئے گئے ہیں، الفاظ کی پابندی نہیں کی گئی ہے اور حاشیہ کی توضیحات میری طرف سے ہیں ان سے حضرت نانوتوی کا کوئی تعلق نہیں اس لئے غلطیوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی ہوگی۔

وجود باری کا مسئلہ دنیا کے تمام ہی عقلاء اور فلاسفروں کے یہاں بنیادی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے، حضرت نانوتوی نے اس اہم مسئلہ کو عقلی انداز پر ثابت کرنے کی جس طرح کوشش کی ہے اس کا حاصل یہ ہے:

پہلی دلیل: مصنوع سے صانع کے وجود پر استدلال

۱- دنیا کے تمام عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کوئی بنانے والا، ہر نو پید چیز کو وجود بخشنے والا، ہر حرکت کے پیچھے کوئی محرک اور ہر نظام کے لئے کوئی منظم اور کارکن ہوا کرتا ہے۔

جب ہم کوئی گھر یا عمارت یا بلند منارہ دیکھتے ہیں تو بغیر کسی تردد اور خاص غور وفکر کے یہ باور کر لیتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا اور صانع ہے، یہ کسی کی کاریگری اور صناعی کے بغیر از خود وجود میں نہیں آ گیا، روئے زمین پر کوئی چھوٹا سا مکان بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر کسی بنانے والے کے وجود میں آ گیا ہو معمولی سی گھڑی جس سے ہم وقت معلوم کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی ہم ایک منٹ کے لئے یہ تصور نہیں کر سکتے کہ بغیر پیچیدہ اور باریک میکانیکی عمل کے وجود میں آ گئی ہے تو پھر کائنات کا یہ عظیم سلسلہ چاند سورج کے طلوع وغروب کا نظام زمین اور آسمان ستارے اور کہکشاؤں کا سلسلہ جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان حیرت واستعجاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گیا ہو اور ان کی تخلیق کے پیچھے کوئی عظیم طاقت کارفرمانہ ہو؟ (۳)

(۳) حضرت نانوتوی نے تقریر دل پذیر، حجۃ الاسلام، اور اپنے بعض دوسرے رسائل میں یہ انداز استدلال اختیار فرمایا ہے، مصنوع کو دیکھ کر صانع پر استدلال منطقی بھی ہے اور فطرت انسانی سے قریب بھی، یہ وہی بات ہے جس کا اقرار صحرا میں رہنے والا بدو بھی نہایت ہی سادگی سے ان لفظوں میں کرتا ہے: سبحان الله البعرة تدل على البعير واثر الاقدام ليدل على المسير فسماوات ذات ابراج وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج الا يدل ذلك على وجود اللطيف الخبير (سبحان اللہ جب مینگنی اونٹ کے گزرنے کا پتہ دے سکتی ہے اور قدم کے نشانات جانے والے کو بتلا سکتے ہیں تو برجوں والے آسمان اور گھاٹیوں ←

یا کھیل کے میدان میں ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ مچ تمہارا من چاہتا ہے۔
اپنی اصلی دِلی خواہشوں کو دباؤ مت۔ دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش
کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقالی نہ کرو۔ خود اپنی اپج سے کام کرو۔
ایسا کرو گے تو تمہارا ذہن' تمہاری سیرت' تمہارا جسم سب کے سب وہ اچھی
سے اچھی شکل اختیار کریں گے جس کے حاصل کرنے کی صلاحیت و قدرت
ان میں رکھی گئی ہے"۔

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ پیغام' جامعہ کے بچوں کے لیے ان کا آخری پیغام ثابت ہوا کیونکہ
۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کی نصف شب میں جب وہ مسوری سے نواب رام پور کا طبی معائنہ کرنے
کے بعد دہلی واپس ہو رہے تھے تو ٹرین ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور تاریخ کا حصہ بن
گئے۔ اور اسی دن جامعہ کی نئی نگری میں جہاں جامعہ آج واقع ہے' پیوند زمین کر دیے گئے۔ اسی
روز شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی ریڈیائی تقریر میں اپنے امیر جامعہ کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری' ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے
رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے اور
اَن گنت قدردانوں کو اس دیس کو' جس کی خاطر انھوں نے ہر طرح کی
سختیاں جھیلیں، ان مسلمانوں کو جن کی خدمت میں ساری عمر گزار کر ان کا برا
ہی سنا، ان ہندو مسلمانوں کو' جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لیے
خون پسینہ ایک کیا' ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب
تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر ان کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور
جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی
جو اِس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں۔ ہاں گھربار کو' بال بچوں کو' عزیزوں کو'
دوستوں کو' سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ
پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا
چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا' اس وقت
دیس کے ہر بچہ بچہ کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔
ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ چشمہ اپنے پرائے سب
کے لیے بہتا تھا۔ ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑنے پر سب کے کام

دوسری دلیل: انسانی وجود کے زوال سے موجود اصلی کے وجود پر استدلال

سب سے پہلی حقیقت جس سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے وہ اس کا اپنا وجود اور اپنی زندگی ہے، اس لئے سب سے زیادہ جو چیز قابل توجہ اور لائق تحقیق ہے وہ اس کا اپنا وجود ہے، ہم اپنے وجود پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے وجود کو ثبات و قرار نہیں ہے، نہ وہ ازل سے ہے اور نہ ابد تک رہنے والا ہے، ایک زمانہ ایسا گزرا کہ ہم پردۂ غیب و عدم میں تھے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمارا وجود ختم ہو جائے گا اور مٹ جائے گا اور ہم اس دنیا کو چھوڑ کر پھر پردۂ غیب میں جا چھپیں گے، اور ہم سے پہلے کتنی ہی خلقت ہے جو صفحۂ ہستی پر ظاہر ہوئی اور پھر راہی ملک عدم ہوئی اور لوگوں کی آنکھوں سے روپوش ہوگئی اور کتنی ہی قومیں ہیں جو ترقی اور شان و شوکت کے بعد صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئیں اور ان کا نام و نشان تک مٹ گیا؟

ہمارے وجود کا اس طرح سے زائل ہو جانا اور ہماری ذات سے علاحدہ ہو جانا اور ہمارا

← والی زمین اور موجوں والے دریا ایک پاک و خبیر ذات کے وجود کا پتہ نہیں دے سکتے)

سچ تو یہ ہے کہ اللہ کا وجود ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی شہادت انسان کے جسم کا رواں رواں دیتا ہے، اس کے لئے فلسفیانہ پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے؟ اسی لئے قرآن نے فلسفیانہ مقدمات قائم کرنے کے بجائے انسان کے وجدان کو خطاب کر کے اللہ کے وجود اور ایک علیم و خبیر ہستی کے خالق ہونے کا عقیدہ ذہنوں میں راسخ کیا ہے۔

بخت و اتفاق کا نظریہ تو پہلے ہی سے کسی علمی اساس پر قائم نہیں تھا، جدید علمی تحقیقات نے ان اوہام کی اور بھی قلعی کھول دی ہے، بعض نام نہاد دانشور ہوا پرستی پر قائم اپنے الحاد کی بنیاد اگر آج بھی اتفاق کے نتیجہ میں کائنات کی تخلیق کو بے جان مادہ اور طبیعت سے جوڑتے ہیں تو ان کے نظریہ کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ فلاں شعر جو موزونیت، تشبیہ اور نازک خیالی میں بے مثال ہے اس کا قائل کوئی شاعر نہیں ہے بلکہ کسی بچہ کے ہاتھ حروف تہجی سکھانے والا پیپر اڑ گیا تھا اور اس کے پرزے پرزے ہوگئے اور وہی حروف ایک مدت تک فضا میں اڑتے اڑتے موزوں شعر بن گیا اور اس میں تشبیہ اور نازک خیالی سب کچھ از خود پیدا ہوگئی، تو جس طرح عقل و ہوش رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا اسی طرح خالق کے وجود پر شاہد کائنات کے ذرہ ذرہ کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے بعد خالق کائنات کے وجود کا انکار کرنے والا عقل و ہوش سے محروم ہی کہا جا سکتا ہے، ورنہ قدیم زمانہ سے ہر صاحب ہوش نے اللہ کے وجود کی گواہی دی ہے، مشہور یونانی حکیم فرفریوس کہتا ہے:

''سب سے واضح اور روشن حقیقت جس کا انسان تصور کر سکتا ہے وہ عالم کے صانع اور خالق کا علم ہے اور جو شخص اتنی بڑی اور اہم حقیقت کا ادراک نہ کر سکے وہ حکیم اور فلسفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے''۔ (دیکھئے ابن مسکویہ کی الفوز الاصغر ص ۱۴)

موجودہ زمانہ کی فلاسفر بھی ببانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں، مشہور انگریز ماہر فلکیات ہرکل کہتا ہے:←

آتی تھی۔ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پر دکھی دلوں کو پناہ ملتی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدانِ عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا اس لیے کہ وہ نیک تھے' سچے تھے' مخلص تھے' فیاض تھے۔ ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ' تدبر خلوص' ایثار نے بہتیروں کو ان کا گرویدہ بنایا لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں' ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا' پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سائے میں رہتے تھے موت کی گھڑی سب کے لیے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن سال کے تھے۔ ان کے لیے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ مٹنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت' کچھ وصیت کر کے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ خیر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اسے منظور ہو۔ وہ اکیلے چل دیے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھیے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاریؓ کی اولاد ہیں جن کے گھر میں مکہ سے مدینے ہجرت کرنے والے قافلہ کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا۔ اس وقت جب مخالف اس حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے پھر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی اسی وقت سے سچائی کی مدد' مہمان نوازی' فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۸۷ء سے جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل

ہمیشہ ہمیش اس دنیا میں نہ رہنا بانگ دہل یہ اعلان کررہا ہے کہ ہماری ہستی اور ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے اوراسی طرح ہر مخلوق کا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ جو موجود اصلی ہے۔اس کا عطا کردہ اوراس کا فیض وانعام ہے۔

ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آگ سے قریب ہونے کی وجہ سے پانی گرم ہوجاتا ہے اور آگ کی گرمی اس میں سرایت کرجاتی ہے پھر جب آگ سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے تو اس کی ذاتی برودت لوٹ آتی ہے اور آگ کے قرب سے حاصل شدہ حرارت زائل ہوجاتی ہے۔

اسی طرح زمین آفتاب عالم تاب کی روشنی سے منور ہوجاتی ہے، پھر جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو زمین کی روشنی بھی آہستہ آہستہ سمٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ جب سورج غروب ہوجاتا ہے تو زمین کی ذاتی ظلمت اور تاریکی لوٹ آتی ہے اوراس کے اوپر رات کی گھٹاٹوپ اندھیری چھاجاتی ہے۔

بار بار یہ مناظر دیکھنے کی وجہ سے ہمیں اس کا یقین ہوگیا ہے کہ نہ تو روشنی زمین کی ذاتی صفت ہے اور نہ حرارت پانی میں ذاتی ہے بلکہ زمین سورج سے حاصل شدہ عارضی روشنی سے جگمگا اٹھتی ہے اور پانی آگ کی عطا کردہ حرارت سے گرم ہوجاتا ہے۔

اسی طرح ہمارے وجود کا دوعدموں سے گھرا ہونا واضح طور پر بتلاتا ہے کہ ہمارا وجود آگ کی حرارت اور سورج کی روشنی کی طرح ذاتی نہیں بلکہ زمین کی روشنی اور پانی کی حرارت کی طرح عارضی اور مستفاد ہے، چنانچہ جب اس ذات کی طرف سے فیض منقطع ہوجاتا ہے جو ہمیں وجود بخشے ہوئے

← ''جیسے جیسے علم کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے ایک ایسے خالق ازلی کے وجود کے ناقابل تردید دلائل وبراہین فراہم ہوتے جارہے ہیں جس خالق کی قدرت کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے، چنانچہ جیالوجی، ریاضیات، نیچرل سائنس اور فلکیات کے ماہرین سبھی علم کے قلعہ کو مستحکم کرنے میں مشغول ہیں جو درحقیقت صرف اللہ کی عظمت کا قلعہ ہے''۔(دیکھئے محمد فرید وجدی کی دائرۃ المعارف ۱/۵۰۳)

دراصل اللہ کے وجود کا مسئلہ اتنا بدیہی اور فطرت انسانی میں اس طرح راسخ ہے کہ فطرت سلیم ہو تو شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔افی اللہ شک فاطر السموات والارض؟(کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین وآسمان کا خالق ہے؟) انبیا نے اسی لئے اللہ کے وجود پر دلائل قائم کرنے کے بجائے توحید کی طرف لوگوں کو دعوت دینے پر زور دیا ہے، کیونکہ اللہ کے وجود کا مسئلہ شک اور شبہ سے بالاتر ہے:ولئن سالتھم من خلق السموات والارض لیقولن اللہ (اور اگر تم ان سے دریافت کروگے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے)اسی طرح: فاقم وجھك للدين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم.

اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہو کر ہندستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا ۱۹۰۱ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتح پوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریادلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لیے اپنی پریکٹس چھوڑ دی۔ گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو ہاتھ خالی، پھر پریکٹس شروع کر دی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو اپنا موٹر بیچ کر۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا۔ اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں۔ وہ کون سا سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا نہ دن چین سے گزرتے تھے اور نہ راتیں۔ ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھائے جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

"۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ اور بھی بے چین تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت اپنے سکھ اور چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے ان کا ذکر اس وقت کیا کروں۔ انھوں نے اس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا، ہمیں سب کو ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں۔ اس کے لیے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلے گی۔ اسی کام

ہے تو ہم ختم ہو جاتے ہیں اور عدم کے دبیز پردے میں جا چھپتے ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ جس طرح حرارت کا سلسلہ (دنیائے اسباب) میں آگ پر ختم ہوتا ہے اور روشنی کا سلسلہ سورج پر، چنانچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سورج سے اوپر کوئی چیز اس دنیائے اسباب میں ایسی ہے جس سے سورج کو روشنی ملتی ہے اور نہ آگ سے اوپر کوئی چیز ہے جس سے آگ کو حرارت ملتی ہے تو سورج کی روشنی اور آگ کی حرارت اصلی کہلائے گی، اسی طرح وجود کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی ایسی ذات پر ختم ہونا چاہیے جس کا وجود ذاتی ہو، کسی اور سے مستفاد نہ ہو، وہی موجود اصلی ہے جس نے ہم سبھوں کو وجود بخشا اور تمام موجودات اس کے فیض وجود کا کرشمہ ہے، اسی ذات کو ہم اللہ، رب اور مالک الملک کے نام سے جانتے ہیں۔ اور چونکہ اس کا وجود ذاتی ہے اس لئے جس طرح سورج سے روشنی اور آگ سے حرارت وابستہ رہتی ہے، جدا نہیں رہتی اور آگ کا حرارت کے بغیر اور سورج کا روشنی کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اللہ کی ذات بغیر وجود کے تصور نہیں کی جا سکتی۔

اس کی ذات اور وجود میں اسی طرح کی نسبت ہے جس طرح کہ دو کے عدد اور زوجیت میں ہوتی ہے، جو کسی حال میں جدا نہیں ہوتی، یہ ممکن نہیں ہے کہ دو کا عدد ہو اور زوجیت کا وصف نہ پایا جائے اسی طرح اللہ رب العزت کی ذات سے وجود کی علاحدگی مستحیل اور ناممکن ہے، لہٰذا وہ نہ کبھی معدوم تھا اور نہ کبھی معدوم ہوگا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا وجود ازل سے تا ابد قائم و دائم ہے۔

تیسری دلیل: اختلاف احوال سے اللہ کے وجود پر استدلال

۳۔ جب ہم اس عالم کی طرف دیکھتے ہیں اور اس میں موجود ہر مخلوق کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے، کسی چیز کو اپنی حالت پر ثبات و قرار نہیں ہے، ہر چیز سے ذلت و افتقار اور مجبوری و احتیاج ظاہر ہوتی ہے، جدھر بھی ہم نظر ڈالتے ہیں ہمیں پستی اور حقارت اور کمزوری اور مسکینی ہی ظاہر ہوتی ہے۔

ہم آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، چاند و سورج کو دیکھتے ہیں، ستارے اور کہکشاؤں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایک مسلسل اور ہمہ وقتی گردش اور حرکت نظر آتی ہے، اس عظیم کائنات میں یہ بڑی بڑی مخلوقات اور مظاہر قدرت بھی ذرۂ بے مقدار کی طرح معلوم ہوتے ہیں ان کی حیثیت اس تنکے

کی خاطر ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کرلی۔ اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی۔ اس لیے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے ایسے آدمیوں کی جو اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سیکھیں اور ان کی عزت کریں خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں۔ مانگیں ہی نہیں، دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جاکر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا۔ ان کے کام کرنے والوں سے کوئی آکر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ میں تمہارے لیے کچھ کام نہیں کر سکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آکر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں۔ پر اس دکھی دل کا دکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کچھ کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا۔ پھیلے گا، ہمیں ہزار دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔"!

جیسی نظر آتی ہے جو ہوا کے جھونکے میں ہو۔

چاند سورج ستارے سب اگتے اور ڈوبتے ہیں، اپنے طے شدہ ٹھکانے پر جاتے ہیں، وہ چڑھتے اور ڈھلتے پھر غروب ہو جاتے ہیں اور اگر چاند و سورج کو گہن لگ جائے تو ان کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور وہ بے نور ہو جاتے ہیں۔

آگ کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی بھڑکتی اور شعلہ برساتی ہے پھر بجھ جاتی ہے۔

ہوا کو دیکھتے ہیں تو وہ کبھی پورب جاتی ہے کبھی پچھم جاتی ہے، کبھی چلتی ہے، کبھی رک جاتی ہے، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی شمال و جنوب کا رخ کرتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے چاروں طرف سے بھگایا اور دھتکارا جا رہا ہے۔

پانی کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہوا کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بہتا پھرتا ہے۔

زمین کو دیکھتے ہیں تو وہ پستی اور حقارت کی آپ مثال پیش کرتی ہے، قدموں سے روندی جاتی ہے لیکن وہ اپنی طرف سے دفاع نہیں کر سکتی، لوگ اسے کھودتے ہیں، اس کے سینہ پر بول و براز اور دوسری غلاظتیں رکھتے ہیں، ہر طرح کی نجاستیں اس کے اندر دفن کی جاتی ہیں۔

نباتات کو دیکھیں تو ان کو بھی اپنی حالت پر قرار نہیں ہے، کبھی بیج سے ان کی کونپل نکلتی ہے پھر وہ بڑھتی ہے اپنے تنے پر کھڑی ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جب موسم بہار آتا ہے تو زمین خوشنما شاداب اور بارونق بن جاتی ہے، ہر طرف سرسبزی و شادابی کا منظر نظر آتا ہے اور کھیتوں اور باغات کا منظر دلوں کو موہ لینے لگتا ہے لیکن خزاں کا موسم آتا ہے تو گرم ہوا کے جھونکے اس کو خشک کر دیتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ تنکوں اور بھوسوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر طرف خشکی و ویرانی کا منظر نظر آنے لگتا ہے۔

پھر ایک ہی طرح کی زمین میں مختلف قسم کے درخت اور پودے اگتے ہیں اور ایک ہی پانی سے ان کی سینچائی بھی ہوتی ہے لیکن وہ الگ الگ رنگ اور ذائقے کے پھل اور پھول دیتے ہیں۔

جانداروں کے زمرہ میں آنے والی مخلوقات کو دیکھیں تو خاص طور پر انسانوں میں باہم توالد و تناسل کے طریقہ میں یکسانی کے باوجود ایک نوع اور دوسری نوع اور ایک فرد اور دوسرے افراد کے درمیان رنگ و نسل شکل و صورت اور اوصاف و خصوصیات کے لحاظ سے بے حد فرق پایا جاتا ہے، اور ہر

عبدالمجید خواجہ

۱۸۸۵ء تا ۱۹۶۲ء

عبدالمجید خواجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دوسرے شیخ الجامعہ اور تیسرے امیر جامعہ تھے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے انھیں مولانا محمد علی اور امیر جامعہ کی حیثیت سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے جانشین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ علی گڑھ کے ایک متمول خانوادے کے فرد تھے۔ وہ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ محمد یوسف علی گڑھ کی ممتاز اور مشہور شخصیت تھے اور سر سید احمد خاں کے قریبی احباب میں تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر کی چہار دیواری میں ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر انگلستان پہنچ کر کیمبرج میں داخل ہوگئے۔ جہاں سے انھوں نے بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کر کے پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے پہلے بیرسٹر کی سند بھی لے لی۔ کیمبرج میں انھیں جواہر لال نہرو کی رفاقت نصیب ہوئی یہی وجہ تھی کہ زندگی بھر وہ جواہر لال کے رفیق رہے۔

ہندوستان واپس آکر خواجہ صاحب نے پہلے پٹنہ میں بیرسٹری کی، پھر علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ ہندوستان میں انھوں نے وکالت کے ساتھ ہی کوچہ سیاست میں بھی قدم رکھا اور ۱۹۱۵ء میں کانگریس میں شامل ہوگئے پھر ہوم رول لیگ کے رہنما بن گئے دراصل ان دونوں تنظیموں کی رکنیت جواہر لال کی رفاقت کا نتیجہ تھی۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنے آپ کو جمعیتہ علماء سے وابستہ کر لیا جسکی تشکیل ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی اور تحریک خلافت میں شریک ہوگئے وہ اس وفد کے لئے بھی منتخب ہوئے جو مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت کی وکالت کے لیے انگلستان بھیجا گیا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے تحریک عدم تعاون میں شمولیت اختیار کرلی۔ ان کے مکان سمیع منزل کو سیاسی رہنماؤں کی قیام گاہ بننے کا فخر حاصل رہا۔ دراصل سمیع منزل کی علی گڑھ میں وہی حیثیت تھی جو دہلی میں حکیم اجمل خاں کی رہائش گاہ "شریف منزل" اور ڈاکٹر انصاری کے مستقر "دارالسلام" کو حاصل تھی۔

بعد ازاں خواجہ صاحب علی گڑھ میونسپلٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ اس حیثیت میں انھوں نے بڑی اہم سماجی خدمات انجام دیں۔

خواجہ صاحب کا جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلق بڑا گہرا تھا۔ وہ شروع ہی سے اس ادارہ

ایک کی خصوصیات پر نظر رکھی جائے تو کوئی دوسرے کے مشابہ نظر نہیں آتا اور ہر طرف سے:

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

کی صدا بلند ہوتی نظر آتی ہے۔

ذی روح مخلوقات طرح طرح کی مجبوریوں اور احتیاجات میں گھری ہوئی ہیں، بھوک، پیاس اور بول و براز کے احتیاج کے علاوہ درد وغم، لذت والم، بیماری اور موت، نفسانی خواہشات کا غلبہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو زندگی کو اجیرن کر دینے والی ہیں۔

خاص طور پر انسانوں پر تو حرص و آز اور خواہش نفس کا ایسا زور ہے کہ اس کی عقل و دانش مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کو دوسری مخلوقات پر جو شرف وفضیلت حاصل ہے اسے بھی پامال کر کے چھوڑتا ہے۔

دوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے کے محتاج ہیں ان کو خوشنما لباس اور عالیشان محلات کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اونچے مناصب اور اعلیٰ عہدوں کی حاجت ہے پھر کھانے میں بھی خوش ذائقہ اور بدذائقہ یا کھٹے اور میٹھے کی پروا نہیں ہوتی لیکن انسان کو ان چیزوں کے بغیر ایک لمحہ سکون نہیں مل سکتا۔

پھر آدمیوں میں جن کے درجے زیادہ بلند ہوتے ہیں ان کی مجبوریاں بھی اتنی ہی زیادہ بڑھی ہوتی ہیں، چنانچہ عام انسان کو اپنی زندگی کے کاموں میں کسی کی مدد درکار نہیں ہوتی، اپنی ضرورتیں وہ خود ہی پوری کر لیتا ہے، لیکن امراء وملوک اور زعماء وقائدین کو ہر لحہ نوکروں اور خدمت گاروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے گھریلو کام خود نہیں کر سکتے ان کی حفاظت کے لئے بھی پاسداروں اور حفاظتی دستوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس طرح:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں اختلاف ہے اور ان سے ذلت ومسکنت اور عاجزی وبیچارگی ظاہر ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی بڑی اور باعزت چیز کیوں نہ ہو۔

آسمان پر ہمیں چاند سورج اپنی روشنی کی وجہ سے بڑے اور باصلاحیت معلوم ہوتے ہیں اور زمین پر انسان سب سے عظیم اور اشرف ترین مخلوق ہے بلکہ انسان کو چاند سورج پر بھی فوقیت حاصل ہے کیونکہ اسے عقل جیسی نعمت سے نوازا گیا ہے، چنانچہ چاند سورج کی روشنی سے اگر زمین و آسمان کی

کے ساتھ وابستہ رہے اور اس کی تاسیس میں ان کا کردار بہت نمایاں رہا۔ مہاتما گاندھی کے زیر اثر وہ زبردست ترک موالاتی کہلائے۔ گاندھی جی کے عدم تعاون کا پروگرام جاری ہوتے ہی انھوں نے اپنی وکالت کو خیر باد کہہ دیا اور تحریک خلافت میں شامل ہو کر اپنا پورا وقت اس تحریک کو کامیاب بنانے میں صرف کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ جب قومی رہنماؤں نے علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے طلبہ سے باہر نکل آنے کی اپیل کی تو خواجہ صاحب نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ تمام قومی رہنما علی گڑھ میں ان ہی کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ جب گاندھی جی مولانا محمد علی اور سوامی ستیہ دیو کے ساتھ پہلی مرتبہ ایم اے او کالج کے طلبہ سے تحریک موالات میں شامل ہونے کی اپیل کرنے کے لیے علی گڑھ پہنچے تو وہ خواجہ صاحب ہی کے مہمان ہوئے اسی طرح جب شیخ الہند مولانا محمود حسن جامعہ کی رسم افتتاح کے لئے علی گڑھ تشریف لائے تو وہ سخت علیل تھے۔ وہ افتتاحی خطبہ کے لئے کالج کی مسجد میں ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو خواجہ صاحب کے مکان ہی سے لائے گئے تھے۔ خواجہ صاحب جامعہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں پٹنہ کے نمایندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور اس کے بعد تو وہ اس کی تقریباً سبھی اہم کمیٹیوں کے رکن رہے۔ وہ جامعہ کی مجلس انتظامی کے ممبر رہے اور مجلس تعلیمی کے بھی۔ ساتھ ہی وہ اس کی مجلس امنا کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ وہ اس کمیٹی کے بھی رکن تھے جسکے ذمہ جمعیۃ اُمنا (ٹرسٹیز) کا نظام اساسی مرتب کرنے کی ذمہ داری تھی۔ دراصل ان تمام کمیٹیوں کو ان کے ماہر قانون ہونے کا زبردست فائدہ پہنچا۔

یوں تو جامعہ کے ابتدائی دنوں میں مولانا محمد علی شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے رہے لیکن سیاست کی مصروفیات کے سبب انھیں اکثر و بیشتر علی گڑھ سے باہر رہنا پڑتا تھا اس لیے ان کی عدم موجودگی میں خواجہ صاحب ہی کو شیخ الجامعہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا تھا اور آخر کار ۲۹؍ اپریل ۱۹۲۱ء سے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کا باقاعدہ تقرر عمل میں آگیا۔ جب خواجہ صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے تو ڈاکٹر محمد عالم ان کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن خواجہ صاحب کی رہائی کے بعد ڈاکٹر عالم نے شیخ الجامعہ کے فرائض منصبی کا بار پھر خواجہ صاحب کو سونپ دیا۔ غرضیکہ خواجہ صاحب شروع ہی سے جامعہ کی انتظامی سربراہی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۲؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو حکومت نے انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اس کی اطلاع بیگم خورشید خواجہ نے گاندھی جی کو بذریعہ تار دے کر انھیں یقین دلایا کہ وہ خواجہ صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کام کو جاری رکھیں گی۔ جواب میں گاندھی جی نے بیگم خواجہ کو اتنی اچھی

فضا منور ہو جاتی ہے تو عقل کی روشنی سے کون و مکان روشن ہو جاتے ہیں، نور عقل کی بے مثال شعاعیں ازل سے ابد تک کو روشن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

سورج کی روشنی سے اگر شکلیں صورتیں نظر آتی ہیں تو عقل کی روشنی علمی حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے اور فنی حقیقتوں کی عقدہ کشائی کرتی ہے، ان تمام شرف و کمال کے باوجود عالم کی ہر چیز سے پستی اور عبودیت ظاہر ہوتی ہے، جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ پوری کائنات کسی عظیم قدرت وطاقت اور سطوت و جبروت رکھنے والی ذات کے زیر تصرف ہے جس نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو نوکروں اور غلاموں کی طرح خدمت پر مامور کر رکھا ہے، اور سب کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے، ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا ہوا ہے، پھر کسی کو ایک حال پر بھی نہیں چھوڑتا تا کہ ان میں خودسری نہ آئے اور کوئی اپنے آپ کو مستقل اور با اختیار نہ سمجھنے لگے، چنانچہ ہر چیز زبان حال سے ایک عظیم وبا اقتدار بادشاہ کے قبضہ میں ہونے کی گواہی دے رہی ہے، جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ اس کی عظمت اور اقتدار کا ہی کوئی ٹھکانہ اور حد ہے۔

اس لئے کائنات کے متغیر احوال کو دیکھنے کے باوجود صانع عالم اور خالق کائنات کے وجود کا اقرار نہ کرنا انتہائی درجہ کی غباوت اور آخری درجہ کی نادانی ہے۔

چوتھی دلیل: اکثریت کی رائے پر فیصلہ کے اصول سے استدلال

انسانی زندگی کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو اس کی رائے اپنائی جاتی ہے جو زیادہ ہوش مند، صاحب فکر اور اچھی اور بے لوث رائے رکھنے والا ہو، لیکن اگر عقلا بھی باہم کسی مسئلہ میں اختلاف کا شکار ہو جائیں تو پھر اختلاف کو مٹانے کے لئے اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اگر یہ طریقہ اس اہم مسئلہ میں اپنایا جائے تو خود بخود نزاع ختم ہو جائے گا، کیونکہ دہریوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ نوع انسانی کی اکثریت اللہ کے وجود کی قائل ہے، ہندو اور مسلمان، یہود و نصاریٰ، بت پرست اور مجوسی سبھی خدا کے وجود کے قائل ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کا بندہ تصور کرتے ہیں جس کے قبضہ قدرت میں سبھوں کی جان ہے۔ (۴)

(۴) مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے علاوہ فلاسفہ کی واضح اکثریت بھی اللہ کے وجود کو تسلیم کرتی ہے، خواہ وہ ارسطو اور ڈیکارٹ کے ماننے والے روح اور مادہ دونوں کے وجود کے قائل ہوں یا افلاطون اور برکلے اور برگسان کے ہم خیال تصوریت یا صرف روح کے وجود کے قائل ہوں، صانع عالم کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ←

اطلاع بہم پہنچانے پر مبارک باد پیش کی اور اپنے مضمون میں لکھا کہ "خواجہ صاحب بڑی آرام و آسائش کے ماحول میں بڑے ناز و نعم میں پلنے والے ایک بیرسٹر ہیں۔ میں انھیں ایک ایسے خوش صورت شخص کی حیثیت سے جانتا ہوں جو بازار میں فروخت ہونے والے بہترین یوروپی لباس میں ملبوس رہتا تھا مگر اب میں ان سے ایک فقیر کی حیثیت سے واقف ہوں۔ وہ ایک بے حد دلیر اور بڑے سچے مسلمان ہیں۔ وہ ہندستان سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی کہ اسلام سے۔ جب مولانا محمد علی نیشنل مسلم یونی ورسٹی میں مستقل طور سے قیام پذیر نہیں ہو سکے تو خواجہ صاحب نے پٹنہ سے اپنی وکالت ترک کر کے علی گڑھ میں بود و باش اختیار کر لی۔ میں جانتا ہوں کہ خواجہ صاحب عدم تشدد میں یقین رکھتے ہیں لیکن بے پناہ دلیری اور جرأت میں بھی ان کا ایقان ہے اور وہ مرنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔"

اس کے بعد گاندھی جی نے بیگم خواجہ کے بارے میں لکھا تھا کہ "جب ایک پاکیزہ خاتون اپنے آپ میں دلیری اور ماں کے تقدس کو شامل کر لیتی ہے تو وہ مقناطیس بن جاتی ہے جو مرد کے لیے ممکن نہیں۔ ڈاکٹر عالم ان کی عدم موجودگی میں طلبہ کا خیال رکھیں گے لیکن وہ (بیگم خواجہ) ان کے دلوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کر کے انھیں سونا بنا دیں گی اور جب طلبہ کتائی اور بُنائی میں ماہر ہو جائیں گے تو اس فن کو سکھانے کے لئے خورشید بیگم اپنے شوہر اور ڈاکٹر عالم سے بازی لے جائیں گی۔"

۱۹۲۲ء میں موتی لال نہرو نے خواجہ صاحب سے اصرار کیا کہ وہ کاؤنسل آف اسٹیٹس کے امیدوار کی حیثیت سے الکشن میں کھڑے ہو جائیں۔ خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو گاندھی جی کی خدمت میں پیش کر دیا جنھوں نے اس تجویز کے خلاف فیصلہ دیا۔ انھوں نے لکھا کہ "جامعہ کو مرنے نہیں دیا جائے گا دراصل اس کی ترقی کے لیے خواجہ صاحب کی یکسوئی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ محض اس کے سربراہ ہی نہیں بلکہ اس کی روح رواں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے منتظم بھی ہیں اس لیے میں کسی اصول کی بنا پر نہیں بلکہ پالیسی کے تحت منع کر رہا ہوں۔ لیکن اگر خواجہ الیکشن لڑنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں کسی انتہائی قابل شخص کو کالج کے لیے تلاش کرنا ہوگا۔"

عبدالمجید خواجہ کی انتظامی سربراہی کے دور میں جامعہ ایک سیاسی ادارہ سے تعلیمی ادارہ بن گئی جس میں مدرسہ اور کالج نے باقاعدگی اختیار کر لی اور جماعتیں مستقل درجوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ صنعت و حرفت نے ترقی کے مراحل طے کیے کیونکہ طلبہ کے لیے ذہنی اور دماغی ورزش کے ساتھ ہی ہاتھ کے کام کو بھی تعلیمی نصاب کا ایک حصہ بنا دیا گیا تھا۔ صنعتی

دہریوں کا یہ طریقہ کتنا قابل تعجب اور باعث افسوس ہے کہ گاؤں کی پنچائتوں اور علمی اور سیاسی مجلسوں میں تو اکثریت کی رائے پر فیصلہ کو اپنائیں اور صانع عالم کے وجود کے بارے میں اس بنیاد پر اس قاعدہ کو ماننے سے اعراض کریں کہ اللہ نظر نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ جب تمہارے نزدیک کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے دیکھنا ہی شرط ہے تو پھر:

دیوار کے پیچھے دھواں دیکھ کر آگ کا کیوں یقین کر لیتے ہو؟

گھر کے صحن میں شعائیں دیکھ کر سورج کے طلوع ہونے کو کس طرح باور کر لیتے ہو؟

سڑکوں اور گلیوں میں قدموں کے نشان دیکھ کر کس طرح کسی گزرنے والے کے اس راہ سے گزرنے کا یقین کر لیتے ہو؟

اگر یہ سارے آثار اپنے قدموں کا پتہ دے سکتے ہیں تو یہ سارا عالم جو ایک خاص نظام کے تحت بنایا گیا ہے اپنے صانع اور موجد کائنات کے خالق کے وجود کا پتہ کیوں نہیں دے سکتے؟

نام نہاد دانشوروں کی کیا یہ کھلی ہوئی بے دانشی نہیں ہے کہ عقل و دانش کا دعوی رکھنے کے باوجود اللہ کے وجود کا اقرار نہ کریں؟

یہاں صرف مثال کے طور پر وجود باری کے دلائل اپنے انداز پر مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح توحید، نبوت، اور عقیدۂ آخرت وغیرہ کے دلائل بھی حضرت نانوتوی کی کتابوں سے اخذ کر کے نئے انداز پر مرتب کر دیئے جائیں تو ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ سکتی ہے اور حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف کو لوگوں کے ذہن و دماغ سے قریب بھی کیا جا سکتا ہے، اس مہم کو سر کرنے کے لئے مدت سے حضرت نانوتویؒ کی روح پکار رہی ہے کہ:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

نہ جانے یہ سعادت کس خوش بخت کے لئے مقدر ہے، لیکن قسمت آزمائی تو سبھی کر سکتے ہیں کہ:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

☆☆☆

← منکرین میں صرف مادہ پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو حکیم دیمقراطیس کا ہم خیال ہے اور خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔

تربیت کے لیے پالش، صحافت، کپڑا بننے، جلد بندی و جلد سازی، قفل سازی، الیکٹرو پلیٹنگ، لیتھو اور ٹائپ کی طباعت، تصاویر، کاپی رائیٹنگ، شارٹ ہینڈ، ٹائپ رائٹنگ، لائن اور ہاف ٹون بلاک بنانے کی تعلیم کے انتظامات کیے گئے اور جامعہ ملیہ اپنے اولین چند برسوں ہی میں واقعتاً ایک ایسا آزاد ادارہ بن گئی جو قومی تعلیمی نظام کی حامل تھی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۲۳ء کے اخیر تک ملک کے سترہ تعلیمی اداروں کا الحاق اس کے ساتھ ہو چکا تھا جس میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا اسکول، بمبئی، قومی مسلم اسکول، ہردوئی، مدرسہ عالیہ قومیہ، پونا، آزاد مدرسہ عالیہ اسلامیہ اسکول، حضرو، آزاد اسلامیہ اسکول گجرات، راشٹریہ سرسوتی پاٹھ شالہ، جھانسی، مدرسہ عالیہ اسلامیہ بھٹکل، جامعہ اسلامیہ نیشنل کالج وانمباڑی، مدرسہ نصرت الاسلام پشاور، مدرسہ ملیہ سیال کوٹ، جامعہ ملیہ ہائی اسکول علی گڑھ، مدرسہ اسلامیہ چارسدہ پشاور، اسلامیہ نیشنل ہائی اسکول رنگون، مدرسہ عین الاسلام زیارت کاکا صاحب پشاور، مدرسہ اسلامیہ قادریہ سوابی پشاور، اے۔ وی۔ اسکول سورت، اور مدرسہ تعلیم القرآن مکھڈ شریف شامل تھے۔ صوبہ سرحد کے بیشتر مدرسے جامعہ کے الحاقی ادارے بن گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہاں کے لوگوں میں اسلام اور وطن کی خدمت کا جذبہ شدت سے موجزن تھا اور اس کے لئے بانی جامعہ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد ذمہ دار تھے جنھوں نے ریشمی رومال تحریک کے زمانے میں حاجی صاحب ترنگ زئی کے زیر اثر مدرسوں کی بھرمار کر دی تھی۔ ان الحاقی مدرسوں کے سلسلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک ناظر المعارف یعنی انسپکٹر آف اسکولس کا عہدہ قائم کرنا پڑا۔

خواجہ صاحب کے زیر نگرانی ہر مضمون کے لیے ایک استاد کا تقرر عمل میں آیا جو مختلف شہروں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح سائنس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ایک شعبہ تصنیف و تالیف قائم ہوا اور پریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے نتیجے میں جامعہ کے ترجمان کی حیثیت سے رسالہ "جامعہ" کی مستقل اشاعت ۱۹۲۳ء سے شروع ہوئی۔ "انجمن اتحاد" اور "بزم کمال" قائم کی گئیں جن کے ذریعہ مختلف پہلوؤں سے طلبہ کی تربیت ہوئی۔ اسکاؤٹنگ نے رواج پایا اور جامعہ کو مستقل تعلیمی ادارہ بننے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں جامعہ کا دوسرا جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی ملک کے نامور سائنس داں پی۔ سی۔ رائے تھے۔ صاحب صدر نے اپنے خطبۂ تقسیم اسناد میں مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے جامعہ کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یہ یونی ورسٹی ان محترم ہستیوں کے زیر سایہ یعنی مہاتما گاندھی اور مولانا

مولانا عبدالحفیظ رحمانی*

اسلام پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات

اور الامام النانوتوی کی استدلالی فکر

قل یا اهل الکتاب تعالَوْا اِلی کلمةٍ سواءٍ بَیْنَنَا وبَینکم اَلَّا نَعْبدَ اِلا اللهَ و لا نُشرِكَ بهٖ شیئًا و لایتخذَ بَعضُنا بَعضًا اربابًا من دونِ الله فَاِن تَوَلَّوا فقولوا اشهَدُوا بِاَنا مسلمون. (البقرہ:۶۴)

(آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ قبول کریں تو کہہ دیجئے کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)۔

اللہ نے اپنی آخری نازل کردہ کتاب قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کے خطاب سے نوازا ہے اور ان کو ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ اس کتاب میں ان دونوں اہل مذاہب کے عقائد واعمال کے جابجا تذکرے ہیں۔ توریت اور انجیل سے ان کا انحراف، ان کا آسمانی کتابوں میں حذف واضافہ اور تحریف وتبدل، عقائد واحکام میں شرک اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی جسارت، نیز نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آخری رسول کی مکمل علامات کو جان بوجھ کر تسلیم نہ کرنے کی جرأت اور علاماتِ نبوت کو قصداً دوسری شخصیت کا مصداق بتانا۔ یہ سب کچھ قرآن مجید میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے اس انکشاف کے بعد ہی دنیا کو یہود ونصاریٰ کی تحریفات و کج اعمالیوں اور اعتقادی خامیوں کا علم ہوسکا اور توریت وانجیل کی تحریفات موضوع بحث بنیں۔ لیکن تحریفات کا اعتراف کرنے کے باوجود اہل کتاب عناد وعداوت کی بنا پر شہادتِ حق سے محروم رہے۔

اسلام کو بے سروپا اعتراضات کا ہدف بنایا اور اسلام سے برگشتہ کرنیکی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ عیسائیوں کی یہ کوشش پہلی صدی ہجری سے آج تک برابر جاری ہے۔

* لوہرسن، سنت کبیر نگر (یوپی)

محمد علی کی تعلیمات کے زیر اثر ہے جن کی عزت سے ہمارے دل لبریز ہیں۔۔۔ خدا کرے ہندستانی قومیت کے ہیروز کے بے تعصبانہ طرز عمل، سچائی اور حقانیت کی جستجو، ان کے جذبہ وطن دوستی اور ان کے دیگر محاسن ہماری آیندہ ترقی کے راستہ پر مشعلِ راہ کا کام دیں اور اس دارالعلوم میں تعصب جہالت اور مذہبی و قومی تنگ نظری کو کوئی جگہ نہ ملے۔" انھوں نے اپنے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

"جب یوروپ کی دنیا بربریت کے حملوں سے زوال پذیر ہو کر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی اگر اس وقت اسلام کمک نہ پہنچاتا اور اعلا علوم کی تخم ریزی کر کے اس کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق و حریت کی جاں بخش آب و ہوا میں اس کی تربیت کر کے انھیں پھولنے پھلنے نہ دیتا تو میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کہاں ہوتی اور تہذیب جدید کا نشان کہاں ملتا؟ قرونِ وسطیٰ میں مسلمان اہل علم، اہل سائنس و فلاسفہ نے مشرق، مصر، یونان، کا تمام علم نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ کر لیا اور محفوظ ہی نہیں کر لیا بلکہ ان کی تہذیب و اصلاح میں اضافہ کیا اور ان کی تربیت دی۔۔۔"

جامعہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پی سی رائے نے کہا:

"۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ مادر وطن کے مسلمان ویسے ہی حقیقی سپوت ہیں جیسے کوئی بڑے سے بڑا ہندو۔ میں ان سے یہ گزارش کروں گا کہ مسلم جماعت میں اخوت اور حب وطن کا جذبہ ہمیشہ جاری رہے اور یہی وہ پیام محبت ہے جس کی تبلیغ واشاعت اس قومی یونی ورسٹی کو کرنی ہے۔ اس کو ہندستان کے سامنے اخوت اور بھائی چارہ کا نمونہ پیش کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے نصب العین کی تکمیل اس کے ان بانیوں کو خوش کرنے کا بہترین ذریعہ ہوگی جن کے لیے ہندو مسلم اتحاد بطور عقیدہ کے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی ابتدا بہت اچھی ہوئی ہے۔ جو سرگرمیاں اس تعلیم گاہ کی ہیں وہ بہت ہمت افزا ہیں۔ یہ کہنا اس کے لیے کافی ہوگا کہ یہاں کے طلبہ میں بہت سے ہندو طلبہ بھی ہیں اور اسٹاف کی فہرست میں بھی متعدد ہندو اساتذہ کے نام موجود ہیں۔ مزید برآں ہندو طلبہ کی مذہبی تعلیم کے لیے بھی خاص انتظام ہے اور خالص ہندو مدارس اس سے ملحق ہیں۔ خدا کرے کہ یہ برادرانہ جذبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔"

یہاں تک کہ اسلام کے دامن شفاف کو داغدار کرنے کیلئے عیسائیوں نے اسلامیات کے مطالعہ میں اپنی عمریں صرف کردیں اور کچھ نہ بن پڑا تو مستشرقین کے اس گروہ نے مسلمانوں کے عقائد میں تشکیک پیدا کرنے کی ناروا جسارت کی اور یہ تشکیک وارتیاب پیدا کرنا آج بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں نے عیسائیت کو فروغ دینے اور اس کو تسلیم کرانے کی وہ ناروا جدوجہد بھی کی ہے جس کو نوکِ قلم پر بھی نہیں لایا جاسکتا۔ عموماً عیسائی مبلغین اپنے مذہب کی اشاعت کیلئے دنیا کے وہ علاقے منتخب کرتے رہے ہیں جو افلاس زدہ اور علم کی روشنی سے کوسوں دور ہوں تاکہ ان کی جہالت اور غربت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عیسائیت کو اس علاقے کے گلے کا ہار بنادیں۔ خواہ وہ علاقے برّ اعظم افریقہ کے ہوں یا برّ اعظم ایشیا کے، عیسائی مبلغین کو اس طرح کے علاقوں کی مسلسل جستجو رہا کرتی ہے۔

ہندوستان کے غربت زدہ علاقوں کو مسیحی عیسائیت کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں اور غربت کی ماری ہوئی پسماندہ برادریاں عیسائیت کے دام تزویر میں آجاتی ہیں۔

لیکن اسی ملک کا ایک دور وہ بھی تھا جب اس پر انگریزی سطوت وحکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ انگریز حکومت کے نشے میں اس قدر چور تھے کہ وہ پورے ملک کو عیسائیت کے دریا میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔ عیسائیوں کا ایک سیل رواں تھا جو ہر گلی کوچے اور آبادی میں بہہ رہا تھا۔ عیسائی مبلغین برسرِ بازار اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور مسیحیت کی صداقت کا اعلان کرتے تھے اور مسلمان ہوں یا ہندو، اپنے مذاہب کی توہین، ظلم وجور کے خوف سے سننے پر مجبور تھے۔ اس دور میں عیسائی مبلغین نے نہ صرف یہ کہ عیسائیت کی تبلیغ واشاعت پر اکتفا کیا بلکہ مناظرانہ دعوے بھی کیے۔ عموماً مسلمان اسلامی خون کی گردش کے باوجود عیسائیت کے دعوے نظر انداز کرجاتے تھے مبادا فساد کی چنگاری بھڑک اٹھے اور مسلمانوں کو عظیم جانی ومالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے۔

مگر پانی سر سے اونچا جاچکا تھا اور مسلمانوں کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ چار وناچار مآل کار کی پروا کیے بغیر عیسائیت کے سیل رواں کو روکنے کیلئے میدان میں اتر آئے اور ایسا مضبوط ومستحکم بند باندھا کہ مسیحیت اس میں معمولی شگاف بھی نہ کرسکی۔

عیسائیوں کا جواب عام مسلمانوں نے بھی دیا اور متبحر علماء اسلام نے بھی۔ جہاں بھی عیسائی

پی۔ سی۔ رائے کے اس خطبہ میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ کو دل سے عزیز تھیں اور یہی وہ تعلیمات تھیں جنھیں وہ جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ میں فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس خطبہ نے ہر طالب علم اور ہر استاد کے دل کو چھو لیا خاص طور سے اس لیے کہ اسے ایک غیر مسلم سائنسداں نے پڑھا تھا۔

اسی طرح جامعہ کا تیسرا خطبہ جلسہ تقسیم اسناد محمد مارماڈیوک پکتھال نے ۹/مارچ ۱۹۲۴ء کو دیا۔ انھوں نے کہا کہ "ہمارے رسولؐ نے کہا ہے کہ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر لازم ہے۔ ان کی حدیث ہے کہ علم حاصل کرو چاہے وہ صرف چین ہی میں کیوں نہ ملتا ہو، اس طرح صاف صاف بتا دیا کہ علم سے ان کی مراد وسیع ترین مفہوم میں علوم سے تھی۔" پکتھال نے اسی موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے رسولؐ نے خیالات کی آزادی کے لیے مذہب کی ترویج کی جو روزانہ کی روشنی کے مذہب کی دن اور رات پیدائش اور موت، بھلائی اور برائی کے نہ بدلنے والے اصول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اصول کے اس انوکھے پن کی جانب جس میں کوئی استثنا نہیں۔ اصول جسے انسان نے نہیں بنایا اور جس میں کوئی فرد شمہ برابر بھی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اسلام کے دعوے کے ثبوت کے طور پر اللہ اکبر۔ خدا بڑا ہے، اللہ بڑا ہے، ہمیشہ عظیم تر ہے ہر اس چیز سے جسے انسان اپنے خیالات کی اعلا سے اعلا اڑان میں دیکھ سکتا ہے۔ یا اس کے بارے میں تصور کر سکتا ہے۔"

جامعی حضرات کو اس حوالے سے مشورہ دیتے ہوئے پکتھال نے کہا:

"قوم پرور بن جائیے اسی مفہوم میں جس میں مہاتما گاندھی قوم پرور ہیں اور اپنی نظر ہمیشہ آفاقی اخوت پر رکھیے۔ مسلمان بن جائیے ایسے نہیں کہ مسلمان قوم کی صحیح اور غلط ہر طرح کی مانگوں کی ترجمانی کرنے لگیں کیونکہ یہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ ایسے مسلمان بنیں جو سچے اسلامی بھائی چارہ کو خرابیوں سے پاک کر کے اسے اس کی اصل صورت پر بلائیے۔ مسلمانوں کے علم سے شغف کو دوبارہ زندہ کیجیے۔ خدا کے لیے شریعت کو اس کی تمام تر دور اول کی خالص اصلیت کے ساتھ آزادئ فکر اور آزادئ جستجو کی عبادت گاہ بنائیے اور مسلمانوں کو دوبارہ اس حیثیت پر لائیے جہاں سے وہ ایک بار پھر انسانی ترقی کے کارواں کی رہنمائی کر سکیں۔"

مبلغین اسلام کو اعتراضات کا نشانہ بناتے تو ان کو منہ کی کھانی پڑتی۔ مقابلے دونوں طرح جاری رہے زبانی بھی اور تحریری بھی۔ بحث و مباحثہ ہوتا اور چھوٹے بڑے رسالے اور کتابیں دونوں طرف سے منظر عام پر آتیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے تحریری دفاع اور عیسائیت کے اصلی چہرے کو بے نقاب کرنے کا تعلق ہے اس میں وہ کبھی پہلوتہی کر کے نہیں بیٹھے۔ جب بھی ضرورت ہوئی اور حالات نے تقاضا کیا تو علماء اسلام نے اسلام کی صداقت کو روز روشن کی طرح واضح کرتے ہوئے دیگر مذاہب کی خامیوں اور کمزوریوں کو پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عیسائیت کی تردید میں بہت سی مدلل، محققانہ اور بصیرت افروز کتابیں منصہ شہود پر آئیں۔ ان کتابوں نے ایوان عیسائیت میں ہلچل مچا دی اور اس کے پائے چوبیں ہل گئے۔ ان مصنفین کی فہرست بہت طویل ہے جن کی تحریریں عیسائیوں کیلئے سرمہ چشم بصیرت ثابت ہوئیں اور عیسائیوں کے قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔ ان مصنفین میں سے چند ایسے علماء اسلام کا ذکر نا گزیر ہے جنھوں نے انگریزی حکومت کے دور قہرمانی میں عیسائیت کے تارو پود بکھیر دیئے اور ان کی مدلل کتابوں نے عیسائی علماء کو سراسیمہ کر دیا۔ ان میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی علیہ الرحمہ سرفہرست ہیں۔

دنیائے عیسائیت کا مشہور مناظر عالم پادری فنڈر حکومت کی شہ پر انگلینڈ سے ہندوستان آیا اور جابجا اپنی تقریروں میں اسلام پر اعتراضات کئے اور مسلمان علماء کو مناظرے کی دعوت دی، حضرت مولانا کیرانوی رحمہ اللہ گویا منتظر بیٹھے تھے، چیلنج کو بصد مسرت قبول فرمایا اور اکبر آباد کے تاریخی مناظرہ میں پادری فنڈر کو ایسی شکست فاش دی کہ وہ منہ چھپا کر میدان مناظرہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور مصر جا کر دم لیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ تعاقب میں مصر جا پہونچے۔ اس نے تشریف آوری کی خبر سنی تو قسطنطنیہ روانہ ہو گیا اور حضرت مولانا کیرانویؒ مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مولانا کی معرکۃ الآراء کتاب ''اظہار الحق'' آج بھی ردّ عیسائیت میں اہم ترین کتاب ہے، عیسائیت کے موضوع پر قلم اٹھانے والا اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور نہ ''اعجاز عیسوی'' سے۔

اسی دور میں جب مولانا کیرانوی پادری فنڈر کو شکست دے کر اسلام کی صداقت و سربلندی کا پرچم لہرا چکے تھے۔ عیسائیوں نے فتنہ کا ایک نیا دروازہ کھولا تا کہ اپنی ہزیمتوں پر پردہ ڈال سکیں اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے ٹکرا کر عیسائیت کو ''آتشیں شریعت'' سے محفوظ رکھ سکیں۔

غرضیکہ پکتھال صاحب کے خطبہ میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو جامعہ کے مقاصد میں شامل تھیں اور جنھیں بانیانِ جامعہ نے ہمیشہ اولیت دی تھی اور جو عبدالمجید خواجہ کے خیالات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو علمی، تعلیمی اور مذہبی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ دوسری سرگرمیوں سے بھی ان کا شغف یکساں تھا۔ انھوں نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے طلبہ کی سرپرستی کی اور ان کے دلچسپیوں میں دلچسپی لی۔ انھوں نے "انجمن اتحاد" اور "بزم کمال" کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی، جامعہ میں کھدر کو رواج دیا اور سودیشی کو اپنانے پر اصرار کیا۔ اسی طرح انھوں نے تصنیف و تالیف کی حوصلہ افزائی کی اور اساتذہ کو کتابیں لکھنے کی جانب راغب کیا۔ ذاکر صاحب نے خواجہ صاحب کی دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے جرمنی سے دیوانِ غالب اور دیوانِ شیدا کے خوبصورت ایڈیشن شائع کروا کر بھیجے جن میں سے دیوانِ شیدا کو جو حکیم اجمل خاں کا مجموعہ کلام تھا، عبدالمجید خواجہ اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ کے نام معنون کیا گیا تھا۔

خواجہ صاحب کے دور میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا نصاب شائع ہوا جو عارضی تھا کیونکہ دوسرے مدارس سے آکر جامعہ میں زیر تعلیم طلبہ میٹرک اور سندی امتحانات میں شریک ہونے والے تھے۔ اس نصاب کو مجلس تعلیمی نے پاس کر کے رائج کر دیا۔

اس نصاب میں مسلمان طلبہ کے لیے دینیات اور ہندو طلبہ کے لیے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی۔ جو طلبہ زبان اول کے طور پر اردو پڑھنے کے خواہش مند نہیں تھے ان کے لیے ہندی کا نصاب ترتیب دیا گیا۔ ہندی کو زبان اول کی حیثیت سے پڑھنے والوں کے لیے اردو کی تعلیم لازمی ٹھہرائی گئی۔ اسی طرح عربی زبان اور انگریزی کی تعلیم کو چوتھی جماعت سے شروع کیا گیا اور ہندو طلبہ کے لیے سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ پانچویں جماعت سے حرفہ کا سیکھنا ضروری تھا اور خوشخطی کو نصاب کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔ بی اے (آنرز) کی تعلیم کو بھی رواج دیا گیا اور جماعت اور تجارت کے ڈپلوما کورسز بھی شروع کیے گئے۔ "مکتبہ جامعہ" کے تحت تصنیف و تالیف کو فروغ ملا۔ معیاری کتابوں کے ترجمے منظر عام پر آئے۔ رسالہ "جامعہ" "جوہر" "چمن" باقاعدگی سے شائع ہو کر طلبہ اور دیگر حضرات کی علمی، تعلیمی، سیاسی، سماجی تشنگی کو سیراب کرتے تھے اور "لوقان" اور "پنچ" مزاحیہ ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے تھے۔ طلبہ کی صحت کے نقطہ نظر سے جامعہ کا اپنا شفاخانہ تھا جس میں باقاعدہ معالج کا انتظام تھا۔ نادار طلبہ کے لیے امدادی وظائف اور ذہین طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے دیگر وظائف جاری کیے گئے تھے۔

چنانچہ ۱۸۷۶ء میں ایک انگلستانی پادری نولس نے موضع چاندا پور ضلع شاہجہاں پور کے ایک رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی کو نہ جانے کس طرح ایک ایسے عظیم جلسہ کے انعقاد پر آمادہ وتیار کرلیا جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے علماء کو اپنے اپنے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ ہر مذہب کے بلند پایہ علماء کو دعوت دی گئی اور بڑے پیمانے پر جلسہ کو مشتہر کیا گیا اور اس کا نام منشی پیارے لال نے ''میلۂ خداشناسی'' رکھا۔

خداشناسی کا پہلا میلہ ۷ رمئی ۱۸۷۶ء کو منعقد ہوا۔ اس میں بہت سے علماء اسلام شریک ہوئے، الامام النانوتوی حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی، حضرت مولانا احمد حسن امروہوی، حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا عبدالمجید، مولانا احمد علی بریلوی، امام فن مناظرہ اہل کتاب حضرت مولانا ابوالمنصور دہلوی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندو پنڈتوں میں پنڈت دیانند سرسوتی، منشی پیارے لال، منشی اندرمن اور عیسائیوں میں پادری نولس، پادری واکر، پادری اسکاٹ اور پادری محی الدین قابل ذکر ہیں۔

یہی ''میلۂ خداشناسی'' دوسرے سال ۱۹ر۲۰ر مارچ ۱۸۷۷ء میں منعقد ہوا، اس میں بھی وہ علماء شریک ہوئے، دیگر بہت سے علماء مباحثہ کی شہرت سن کر چاندا پور پہنچ گئے اور شائقین کا بے پناہ ہجوم ہوا، مفصل روداد کیلئے ''گفتگوئے مذہبی'' اور ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں پیش نظر الامام النانوتوی کی استدلالی فکر اور طرز گفتگو ہے، لیکن اس سے پہلے کہ الامام النانوتوی نے شاہجہاں پور کے میلہ خداشناسی میں کیا فرمایا اور آپ کی دیگر کتابوں کی استدلالی فکر اور محور کیا ہے؟ اس دور کے مباحثوں اور مناظراتی تحریروں کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ الامام النانوتویؒ کی عبقریت اور طرز استدلال کا امتیاز اور علمی مقام سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔

اس دور میں جب عیسائی مبلغین اسلام پر اعتراضات کر رہے تھے اور اپنی تقریروں میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نبوت پر رکیک حملے کر رہے تھے، علماء اسلام نے دقیق علمی بحثوں کے بجائے تورات اور انجیل کو اپنا ہدف بنایا اور قرآن کریم کے انجیل سے متعلق دعوائے تحریف کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دکھایا اور عیسائیوں کو تحریف تسلیم کرلینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح کی کاوشیں حافظ ابن قیمؒ سے لیکر مولانا عبدالحق حقانی تک جاری رہیں۔ یہی موضوع آنجہانی

۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ادارہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اس کے نتیجہ میں ہندستان میں خلافت کی تحریک بھی سرد پڑ گئی اور ہر اس امر میں جس کا تعلق تحریک خلافت سے تھا رہنماؤں اور عوام کا جوش خروش ختم ہو کر رہ گیا۔ ایسے حالات میں جامعہ کا مستقبل بھی خطرہ سے دوچار ہوتا نظر آنے لگا۔ بہت سے گوشوں سے اسے بند کر دئے جانے کے مطالبات بھی ہوئے لیکن ذاکر صاحب کی اس درخواست پر کہ "وہ اور ان کے ساتھی جامعہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں اس لیے ان کے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے" اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ گاندھی جی بھی اس کے لیے بھیک تک مانگنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری جب یورپ کے سفر پر تھے تو ذاکر صاحب نے ان سے پیرس میں اور مجیب صاحب، عابد صاحب خواجہ کے۔اے۔ حمید اور برکت علی قریشی نے ویانا میں ملاقات کر کے انھیں جامعہ کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی آخر کار حکیم صاحب نے تجویز پیش کی کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ فاؤنڈیشن کمیٹی نے جامعہ کو جاری رکھنے یا اسے بند کر دینے کا معاملہ ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس میں عبدالمجید خواجہ بھی شامل تھے اس سلسلہ میں جتنے جلسے منعقد ہوئے ان تمام میں خواجہ صاحب نے شرکت کر کے جامعہ کو دہلی منتقل کر دینے کی بھرپور تائید کی۔ انجام کار کثرت رائے سے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دینے کا فیصلہ ہو گیا اور جولائی ۱۹۲۵ء میں اس تجویز پر عمل آوری ہو گئی لیکن ساتھ ہی خواجہ صاحب نے بھی شیخ الجامعہ کے منصب سے مستعفی ہو کر اپنے فرائض کی انجام دہی کی ذمہ داری بیرسٹر عبدالعزیز کے سپرد کر کے سبکدوشی اختیار کر لی کیونکہ وہ خود علی گڑھ سے دہلی منتقل نہیں ہو سکتے تھے۔

خواجہ صاحب کی خدمات نے جامعہ کو خالصتہً ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا اور اسے ایک باقاعدہ آزاد تعلیمی دانش گاہ کی شکل عطا کر دی۔

خواجہ صاحب کے دور کی جامعہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے جامعہ کے ایک سابق طالب علم رانا جنگ بہادر رقم طراز ہیں:

> "اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ چاروں کوٹھیاں پھر رہی ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کا شاندار نظارہ پیش کرتی تھیں۔ ان کوٹھیوں میں ہمارا ہوسٹل تھا۔ ایک کوٹھی ہماری تندرستی کے محافظ ڈاکٹر صاحب کو ملی ہوئی تھی اور باقی کوٹھیوں میں لڑکے رہتے تھے۔ ان میں دس پانچ نہیں درجنوں طالب علم تھے۔ ہندستان کا شاید ہی کوئی ایسا صوبہ ہوگا جس کے نوجوان نمائندے ان

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین کا بھی رہا۔ مباحثۂ شاہجہاں پور میں بھی تحریف کا عنوان الامام النانوتوی زیر بحث لائے اور عیسائی پادریوں کو چارو ناچار تحریف کو مان لینا پڑا۔ اس کا ثبوت امام فن مناظرہ اہل کتاب مولانا ابوالمنصور دہلویؒ نے الامام النانوتویؒ کے اشارے پر پیش کیا اور بائبل کا وہ مرزا پوری نسخہ سامنے لاکر رکھ دیا جس میں تحریف کا کھلا ہوا اعتراف موجود تھا۔ آئندہ تحریفات کے عنوان سے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کا جائزہ لیں گے۔

الامام کی استدلالی فکر

اس تناظر میں الامام النانوتویؒ کا استدلالی رنگ اور طرز فکر سب سے جداگانہ تھا۔ الامام کی علمی بصیرت اور فکری وسعت نے ذیلی مباحث کے بجائے عقائد کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ کیوں کہ مذاہب کی صحت و تعمیر کا دارو مدار عقائد ہی پر ہے، اگر کسی مذہب کے عقائد کو عقل تسلیم نہیں کرتی اور عقل و شعور کی میزان میں وہ عقیدے ہلکے، اور بودے ہیں تو مذہب بھی اسی درجہ میں بے بنیاد اور نا قابل عمل ہوگا۔

اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے قابل توجہ یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے تمام مذاہب توحید کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا، پرمیشور صرف ایک ہے اور اس کائنات کا خالق وہی ہے۔ اس کے باوجود کسی مذہب میں ہزاروں معبود ہیں اور کسی میں تین خدا ہیں یعنی وحدت میں کثرت ہے اور کثرت میں وحدت ہے۔ الامام النانوتویؒ نے اپنی تقریروں میں علمی و عقلی استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ وحدت بھی حقیقی ہو اور کثرت بھی حقیقی ہو امر محال ہے۔ اس کو مثالوں کے ذریعہ عام فہم ثابت کر دیا کہ عقیدۂ تثلیث بالکل غلط اور نا قابل فہم ہے۔ اسی بحث میں الامام نے یہ بھی واضح کیا کہ وجود ذاتی کو کسی چیز کی احتیاج نہیں، وہ بے نیاز ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، شری رام اور شری کرشن کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آسکتا کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پاخانہ، پیشاب، مرض اور موت سے مجبور تھے۔

اس کے ساتھ انسان کے مقصد تخلیق کو واضح کرتے ہوئے عقل کی روشنی میں اطاعت کو لازمی قرار دیا پھر اطاعت کی شناخت کیلئے رسالت کو بنیادی ضرورت بتایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الامام کی مدلل تقریر، بصیرت افروز اور لاجواب ہوتی ہے۔ اس میں کسی طرح کے اعتراض اور سوال کی گنجائش نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ تقریر منصفانہ عقل و ہوش اور شہادت حق کیلئے سنی گئی ہو ورنہ اعتراض کرنا تو آسان کام ہے۔ چارو ناچار عیسائیوں نے خوبیٔ تقریر و استدلال کی داد تو دی لیکن وہ باتیں

طالب علموں میں موجود نہ ہوں آسام، بنگال، بہار، پنجاب، مدراس اور مہاراشٹر سبھی صوبوں کی قومیت کی پیاسی جوانی کا جامعہ کے پنگھٹ پر میلا لگ گیا تھا۔ ہوسٹل میں ہندو اور مسلمانوں کے باورچی خانے تو الگ الگ تھے مگر ساتھ کھانے پینے میں کسی قسم کا پرہیز نہ تھا۔ دعوتوں اور ضیافتوں میں سب کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھتے تھے اور ایک ہی جگہ سے چپاتی، دال، ترکاری اور گوشت لے کر کھاتے تھے۔ اسی کو بھائی چارہ اور دانت کاٹی روٹی کہتے ہیں۔۔۔ والی بال وغیرہ انگریزی کھیلوں کے ساتھ کبڈی اور دوسرے کھیل بھی برابر چلتے تھے۔ اس چہل پہل میں میل ملاپ خوب پھلتا پھولتا تھا۔ پوشاک میں بھی یکسانیت تھی۔ ہر شخص سفید کھدر کا کرتہ اور پاجامہ یا دھوتی پہنتا تھا۔ شلوار بھی دیکھنے میں آتی تھی۔ جو ذرا شوقین تھے وہ ذرا نفیس کھدر استعمال کرتے تھے، اوپر سے بڑھیا اچکن ڈالتے اور اپنے تنگ پائجامے کی چوڑیاں اچھی طرح چن کر چنبلی سی بناتے تھے۔ یہی نہیں وہ اپنی ٹوپی پر ذرا سی بھی شکن نہیں آنے دیتے تھے اور اسے پہنتے بھی تھے، ٹھسّے کے ساتھ، آخر تھے تو ان میں زیادہ تر وہی لوگ جو ابھری ہوئی شان و شوکت اور نکھری ہوئی لطافت و نزاکت کے گھر یعنی علی گڑھ یونی ورسٹی کو چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ جامعہ کے ہوسٹل کو بھی اپنے منجھے ہوئے مذاق کے مطابق انھوں نے سجایا مگر غالیچوں کی جگہ کھدر کی سفید چادریں بچھائیں۔ دروازوں کو بھی انھوں نے ننگا نہیں رہنے دیا۔ ان کی برہنگی کو پردوں میں چھپایا مگر وہ پردے کھدر ہی کے تھے، ہاں ان کے چھاپے میں سادہ پن نہیں بلکہ بھڑکیلا پن تھا۔ مگر وہ سودیشی کے اصول کو نہیں توڑتا تھا۔ سودیشی اور سودیشی پریم دونوں ہی کے جامعہ والے دل سے قائل تھے۔ دن رات انہی باتوں کا چرچا ہوتا رہتا تھا اور ہندو اور مسلمان طالب علم ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان استاد بھی ان چٹ پٹی باتوں میں بڑے شوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔۔۔ جامعہ میں ہندو طالب علموں ہی کی نہیں ہندو استادوں کی بھی خاصی بڑی تعداد تھی۔ ان میں زیادہ تر پروفیسر تھے جو سرکاری کالجوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ میرے رہتے رہتے ان میں سے دو ایک صاحب چلے گئے۔"

اس کے بعد رانا جنگ بہادر نے نہ صرف جامعہ کے اپنے اساتذہ سے متعارف کرا لیا بلکہ

دہرائیں جن کی گنجائش نہیں تھی۔

چنانچہ پادری نولس کو مسلمانوں کی توحید تو پسند آئی لیکن تثلیث کے بغیر توحید ان کیلئے ناقابلِ فہم تھی۔ ان کے الفاظ میں توحید بے تثلیث ممکن نہیں۔ اس کو سمجھاتے ہوئے پادری نولس نے کہا۔ دیکھو ہم ایک کا ہندسہ لکھتے ہیں اور اس میں طول بھی ہوتا ہے اور عمق بھی ہوتا ہے اور عرض بھی، وہ ہندسہ ایک ہے پر بے ان تین باتوں کے موجود نہیں ہوسکتا۔ آدمی کی روح ایک ہے مگر اس میں خواہش بھی ہے قوت خیالیہ بھی ہے، دیکھو روح ہے پر بے ان تین باتوں کے ہو نہیں سکتی۔ دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے شاخیں بھی ہیں پتے بھی ہیں وہ ایک ہے بے ان تین چیزوں کے نہیں ہوتا''۔

الامام کا استدلالی جواب ملاحظہ فرمائیے:

> آپ کا دعویٰ ہے کہ جیسے ہمارا خدا واحد حقیقی ہے ایسے ہی وہ باوجود وحدت حقیقی کے کثیر بھی حقیقی ہوتا ہے یعنی حقیقت میں تین بھی ہے سو آپ نے اجتماع وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی کیلئے جو دلیل بیان کی تو وہ کی جس سے کثرت حقیقی اور وحدت اعتباری کا اجتماع ثابت ہوتا ہے۔ (گفتگوئے مذہبی ص: ۲۸)

الامام نے اس کو مثالوں کے ذریعہ مبرہن کیا اور فرمایا کہ پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان کی ہیں سب اسی قسم کی ہیں۔ توضیح کیلئے ایک مثال عرض کرتا ہوں سنئے اگر ایک برتن میں شکر ہو، ایک برتن میں کیوڑہ ہو اور ایک برتن میں پانی ہو، پھر ان تینوں کو ایک کٹورے میں ڈال کر شربت بنالیا جائے تو گو دیکھنے میں فی الحال وہ تینوں چیزیں ایک نظر آتی ہیں مگر عقل صائب ہنوز ان تینوں چیزوں کو بدستور کثیر مختلف الحقیقت سمجھتی ہے۔

غرض ان تین چیزوں کو تین مزوں کیلئے ملایا ہے۔ اگر وہ تینوں شربت بن جانے کے وقت تین نہ رہیں تو وہ تین باتیں جو مطلوب تھیں یعنی شیرینی اور خوشبو اور تسکین حرارت یا یوں کہئے رفع تشنگی، کاہے کو حاصل ہوتیں کچھ اور ہی بات ہو جاتی۔ سو جیسے یہاں تین چیزیں ایک ظرف میں اکٹھی ہو گئی ہیں اور اس وجہ سے باوجود کثرت اور تثلیث حقیقی کے مشاہدے کے وقت ایک نظر آتی ہیں اور آنکھ سے ہر ایک جزو کو جدا جدا تمیز نہیں کر سکتے ایسے ہی پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان فرمائیں ان سب میں تین تین چیزیں ایک جا اکٹھی ہیں اور نظر سرسری اجمالی میں ہر جگہ وہ تینوں ایک نظر آتی ہیں اور باہم

ان کے عادات واطوار اور شخصی خصوصیات سے بھی واقف کرا یا ہے۔ طلبہ کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں رانا صاحب لکھتے ہیں:۔

"جامعہ کے طالب علموں کی انجمن کے جو جلسے ہوتے تھے وہ دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ میں الٰہ آبادیونی ورسٹی میں اچھے بولنے والوں میں گنا جاتا تھا لیکن یہاں کے جوشیلے مقررین کی تقریروں کے سامنے میری تقریر ایسی ہی لگتی تھی جیسے گنگا کے سامنے گومتی۔ ڈاکٹر اشرف کی آواز جب کمیونزم کا زور تھا کہاں نہیں گونجتی تھی۔ کچھ نوجوان جامعہ میں ایسے تھے جو دن رات دنیا کو چھان ڈالنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان میں کئی نے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنایا۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ جامعہ کی فضا میں وہ جادو تھا جس کے اثر سے جوانی کے پہلو میں چھپی ہوئی تمام خصلتوں کو کلیوں کی طرح چٹک کر کھلنے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے پھول ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں۔"

اس تفصیل سے خواجہ صاحب کے دور کی جامعہ کی مجموعی تصویر ابھر کر ہمیں بھی اسی ماحول میں پہنچادیتی ہے۔ خود خواجہ صاحب کے بارے میں رانا نے لکھا:۔

"ہم اپنے شیخ الجامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کی بھی بڑی عزت اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی نیشنلزم خالص دودھ کی سی تھی۔ وہ سدا ہنستے رہتے تھے اور ان کی ہنسی کی چاندنی میں ہم ہندو اور مسلمان سبھی طالب علم مزے لیتے تھے۔"

اسی طرح جامعہ کے ایک اولین طالب علم عبدالغفار مدھولی کے الفاظ میں:

"عبدالمجید خواجہ صاحب نے جامعہ کی بنیادوں کو ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے استوار کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں اس کے احسان سے جامعہ کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اپنی قابلیت، اپنے وقت اور اپنے مال سب سے اس کمزور پودے کی آبیاری کی تھی لیکن گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے وہ شیخ الجامعہ کے کام سے علاحدہ ہونا چاہتے تھے۔"

اگرچہ خواجہ صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ سے سبکدوشی حاصل کرلی لیکن وہ برابر اس کے کاموں میں شریک ہوتے رہے۔ مدیر "جامعہ" نے ستمبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں ان کی خدمات سے متعلق خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "خواجہ صاحب کو جامعہ ملیہ سے جتنی محبت ہے اور اس کے مقاصد کی جتنی قدر اُن کے دل میں ہے اس کا اندازہ ناواقف لوگ مشکل سے کرسکتے ہیں۔ موصوف نے اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے سبب سیاسی

متمیز نہیں ہوتیں ورنہ حقیقت میں سب مثالوں میں مضامین مختلف جمع ہیں۔

یہ تو تھے الامام النانوتوی کے الفاظ جو تثلیث کے نامعقول اور بدیہی البطلان ہونے کا ثبوت فراہم کررہے تھے، اگر پادری نولس کی مثال ایک کے ہندسے پر معمولی سی توجہ دی جائے تو اس مثال میں صرف طول، عرض، عمق، ہی نہیں ایک کے ہندسہ میں سیاہی کی چمک اور خوبصورتی بھی ہے اس لئے تثلیث کے بجائے تخمیس کو عقیدہ بنانے میں کیا مضائقہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اوصاف اور موصوف میں عیسائیوں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا حالانکہ ایک ہی چیز میں متعدد صفات ہوتی ہیں۔ ایک درخت میں سیکڑوں شاخیں اور بے شمار پتے ہوتے ہیں، ایک انسان میں کتنے اوصاف حمیدہ اور اخلاق ہوتے ہیں لیکن موصوف ایک ہے، ایک خدا میں کتنی صفات کمالیہ ہیں؟ تو کیا ان صفات کی بنیاد پر بے شمار خدا ہوں گے؟ عقل کثرت اجتماع حقیقی اور وحدت حقیقی کو محال تسلیم کرتی ہے۔ بیک وقت ایک ہی جگہ پر دھوپ بھی ہو اور سایہ بھی، ایک ہی چیز گرم بھی ہو اور سرد بھی، سراسر خلاف عقل ہے۔ اسی کا نام معقولیوں کی اصطلاح میں اجتماع الضدین ہے اور اضداد کا اجتماع عقل ومشاہدہ کی دنیا میں محال ہے۔

تقدیر پر اعتراض

> تقدیر کو تسلیم کر لینے پر بندہ بے گناہ اور خدا ظالم ٹھہرتا ہے اس لئے کہ پہلے ہی سے خدا نے بہت سے آدمیوں کو جہنم کیلئے تجویز کر لیا اور پھر اسی کے موافق کیا (ص: ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ مسیحی جب لاجواب ہو جاتے ہیں اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو تقدیر پر اس غلط فہمی کی بنا پر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان علماء ہمارے اس آخری حملہ کی تاب نہیں لاسکیں گے اور بہت سے مسلمان تشکیک میں مبتلا ہو جائیں گے، لیکن الامام النانوتویؒ کی استدلالی جودت فکر نے عیسائیوں کی یہ گتھی اس طرح سلجھائی کہ عیسائیت دم بخوردہ گئی، اگر مسیحی علماء نے سنجیدگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اختیار وتصرف اور مالکانہ حقوق پر غور کیا ہوتا تو مسئلہ تقدیر کی وہ پیچیدگی جوان کے ذہن میں درآئی تھی دور ہو جاتی۔ بلکہ اس سے فروتر ہو کر اپنے مالکانہ تصرف اور اختیارات پر غور کر لیتے تو بھی اعتراض کرنے کی نوبت نہ آتی۔ اپنا مکان اور اپنی چیزوں پر ہر شخص کو جو مالکانہ اختیار و تصرف حاصل رہتا ہے وہ سامنے کی بات ہے۔ چنانچہ الامام نے جو مشاہداتی تجربی اور عقلی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک شخص کے پاس ایک افتادہ زمین ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کو پیش نظر رکھتے

جدو جہد سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی ہے لیکن ملک و قوم کی تعلیمی ترقی سے ان کی دلچسپی بدستور قائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گی۔" وہ بارہا مختلف شہروں میں جاکر جامعہ کے لیے چندہ اکٹھا کرتے رہے۔ انھیں ۱۹۲۸ء میں مجلس امنا کا رکن بنایا گیا وہ مجلس امنا کی پہلی مجلس منتظمہ کے ممبر بھی بنائے گئے اور جب ۱۰ر مئی ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات ہو گئی تو انجمن تعلیم ملی نے ۲۳ر مئی ۱۹۳۷ء کو منعقدہ اپنے جلسے میں خواجہ صاحب کو اتفاق رائے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تیسرا امیر جامعہ منتخب کرلیا۔ دراصل جامعہ کی تاسیس اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے میں ان کا کردار بڑا ممتاز اور نمایاں رہا تھا۔ انھوں نے ایک ایسے نازک دور میں اس ادارہ کی سرپرستی کی جب اس کا وجود معرض خطر میں تھا یہی وجہ تھی کہ جامعہ کی فضا خواجہ صاحب کے تئیں محبت اور عقیدت سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اردو کے نامور مزاحیہ ادیب ملا رموزی نے اپنے ایک خط میں خواجہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "۔۔۔۔بس کچھ نہ پوچھیے کہ کس درجہ خلیق اور ملنسار بزرگ ہیں۔۔۔۔ سبحان اللہ خواجہ صاحب کھدر کا لباس تو اس درجہ سفید اور صاف پہنتے ہیں کہ دنیا کے گاندھی صاحب بھی ایسا صاف کھدر نہیں پہن سکتے اور صاحب ہم کو تو لباس کی صفائی ہی سے انسان کی ذہنی استعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان میں عمل کی قوت بیدار ہے اور عمل میں صدق اور سچائی بھی شریک ہے۔"

خواجہ صاحب نے امیر جامعہ کی حیثیت سے پہلی بار ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جامعہ نگر کی نئی بستی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطہ میں قدم رکھا تو جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ یوم تاسیس کے جلسہ میں انھوں نے اپنی تقریر میں طلبہ کے کاموں کو سراہا اور ان کی سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے ان کے خوش آیند مستقبل کی دعا اور کامیابی کی تمنا کی۔ اساتذہ اور بڑی عمر کے افراد کی استقامت اور ہمت کی داد دی اور جامعہ کی تعمیر میں ان کے روشن کردار کو خراج تحسین پیش کیا اور ان کے عزم، دلیری اور خلوص کے لیے دعائیں کیں۔

خواجہ صاحب کے دور امارت میں جامعہ میں نئے نئے پروجیکٹ چلائے گئے۔ وال پیپر جاری ہوا۔ طلبہ نے مصنوعات بنائیں اور جامعہ کیمیکل انڈسٹریز کے ذریعہ ان کی فروخت کا انتظام کیا۔ جامعہ کا اپنا بینڈ وجود میں آیا۔ انہی کے دور میں گاندھی جی نے نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کر کے ذاکر صاحب، مجیب صاحب، اور عابد صاحب کو اس میں مدعو کیا اور ذاکر صاحب کی بنیادی تعلیم کی اسکیم سے متعلق کمیٹی کا صدر نامزد کیا۔ بنیادی تعلیم کو کانگریسی

ہوئے ایک آرام دہ مکان کا خاکہ تیار کیا اور اپنے مرتب نقشے کے مطابق اس میں چھوٹے بڑے کمرے، وسیع ہال، دالان، پیشاب خانہ، پاخانہ اور غسل خانہ بنوایا۔ اس مکان تعمیر کرنے والے پر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتا کہ تم نے زمین کے ایک ٹکڑے پر غسل خانہ وغیرہ تعمیر کر کے اس قطعۂ ارضی پر ظلم کیا ہے اور اگر زمین کو قوت گویائی مل جائے تو وہ بھی یہ شکایت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی کہ اس کو اس مصرف کیلئے کیوں استعمال کیا گیا؟ اس لئے کہ زمین بزبان حال اقرار کر رہی ہے کہ میں دست بستہ خدمت کیلئے حاضر ہوں جس طرح میں کام آسکوں آپ ہی کا قبضۂ وتصرف ہے۔

اس زمین کو چند برسوں کے بعد وہ از سر نو دوسرے نقشہ کے مطابق کام میں لا سکتا ہے تو کیا وہ ذات پاک جو احکم الحاکمین اور وحدہ لاشریک لہ ہے اپنی مخلوقات پر اس طرح کی حکمرانی اور تصرف نہ کر سکے گا جبکہ اس کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ نظامِ عالم کی موزونیت اور اس میں تناسب کیلئے جس طرح کی خانہ پری درکار ہے کرے۔ بلاشبہ تخلیق کائنات سے پہلے حاکم مطلق نے اپنی تمام مخلوقات کا نقشہ بنایا ہوگا اور اسی کے مطابق کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ اسی مرتب خاکہ کا نام اسلامی عقائد کی اصطلاح میں تقدیر ہے۔

عصمت انبیاء

چوں کہ عیسائیوں کے معتقدات میں ایک عقیدہ یہ بھی شامل ہے کہ کوئی انسان گناہ کے ارتکاب سے محفوظ نہیں ہے اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کو بھی گناہ گار سمجھتے ہیں اور ان کی عصمت کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ بائبل میں حضرت لوط علیہ السلام پر اپنی بیٹیوں سے زنا کا الزام و حضرت داؤد علیہ السلام پر اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کا الزام، حضرت سلیمان علیہ السلام پر شرک و بت پرستی کا الزام آج بھی موجود ہے، مغربی ممالک میں اباحیت کو اسی عقیدہ کے نتیجے میں قانونی جواز حاصل ہے۔

اس کے برخلاف اسلام میں زنا بدترین قابل تعزیر جرم ہے جس کی سزا موت ہے اسلامی مزاج دواعی زنا کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور رہا مسلم معاشرہ میں کسی شریف آدمی کیلئے زنا کا تصور تو وہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

شرافت اور بدکاری میں اتنی بڑی خلیج حائل ہے کہ دونوں کا اجتماع ناممکن ہے۔ اسلام میں شرافت کا معیار ہی اسلامی احکام کی پابندی اور تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا

وزارتوں نے اپنایا اور اس کا کامیاب تجربہ جامعہ نے بھی کیا۔ استادوں کے مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا۔ انجمنِ طلبائے قدیم کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ رسالہ المصور کا اجرا ہوا۔ "شعبہ تعلیم وترقی" کا آغاز ہوا اور اس ادارہ نے شفیق الرحمان قدوائی کی نگرانی میں تعلیم بالغان کے کام کو چار چاند لگا دیے جامعہ میں نئی عمارتوں کا اضافہ ہوا۔

ان کے دور امارت کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انجمن تعلیم ملی کو ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ دستور اساسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو منظور کر کے ۱۹۳۹ء میں اسے رجسٹرڈ کرالیا گیا انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ ہندستانیوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص ایسی دینی اور دنیوی تعلیم کو رواج دینا جو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق اور صحیح اصول تعلیم پر مبنی ہو اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنا، ان کا انتظام کرنا اور ان کی نگرانی کرنا۔

۲۔ امتحان لینا، اسناد تقسیم کرنا اور تصدیق نامے جاری کرنا۔

۳۔ علوم کی اشاعت کرنا اور علمی تحقیقات کا انتظام کرنا

۴۔ تعلیمی تجربات کرنا

۵۔ انجمن کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں معاہدے کرنا، روپیہ قرض لینا اور دینا، جائداد حاصل کرنا، خریدنا یا فروخت کرنا۔

۶۔ انجمن کے مقاصد کے حصول کی خاطر ادارے چلانے کے لیے سرمایہ جمع کرنا

انجمن کو ایک خود مختار تعلیمی جماعت بنایا گیا جو نصاب مرتب کرنے کی مجاز تھی۔ اس کے امور میں حکومت وقت کی مداخلت انجمن کو گوارا نہ تھی۔ اس کی تعلیم گاہوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم ٹھہرایا گیا اور اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ہندستان کے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں باہمی رواداری اور دوستانہ تعلقات پیدا کرے۔

اس دستور کے مطابق مندرجہ ذیل عہدے دار مقرر کیے گئے:

۱۔ امیر جامعہ — عبدالمجید خواجہ

۲۔ شیخ الجامعہ — ڈاکٹر ذاکر حسین

۳۔ خازن — پروفیسر محمد مجیب

۴۔ مسجل — حافظ فیاض احمد

اسی دوران نامور عالم اور مجاہد آزادی مولانا عبیداللہ سندھی اپنی طویل جلاوطنی کے بعد مکہ مکرمہ سے دہلی آئے اور جامعہ میں مقیم ہوئے۔ مولانا اپنے چوبیس سالہ طویل

انتخاب رائے عامہ یا اہل الرائے کی صواب دید پر نہیں ہوتا بلکہ اس مقدس جماعت کا ہر فرد اپنے اخلاق حمیدہ کی بناء پر خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق ہر زاویہ سے انسان کامل کو تاج نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں اور اس منصب جلیل پر فائز کرنے کے بعد اس کو ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ نبی سے کبھی کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی گناہ کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں اور اس عظیم الشان منصب کو سنبھالنے کے بعد تو گناہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سطحی فکر و نظر کے لوگ انبیاء علیہم السلام کے زلات اور لغزشوں کو گناہ سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ مسیحی تو دونوں کو ایک گردانتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک نوزائیدہ جماعت بھی انبیاء علیہم السلام کو معصوم تسلیم کرنے سے ہی کتراتی ہے۔

حالانکہ یہ بات تو ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ دنیا کے حکمراں اور بادشاہ بھی اسی کو اپنا معتمد وزیر اور پیغام رساں بناتے ہیں جن کی اطاعت اور وفاداری میں ان کو یقین ہوتا ہے، ان سے کسی طرح کی حکم عدولی ان کے علم میں نہیں آئی ہے۔ تو کیا خالق کائنات جس نے نبوت و رسالت کیلئے اپنے خاص بندے کا انتخاب کیا ہے جس کی نظروں میں سب کچھ ہے۔ عدم بھی وجود بھی، حال بھی، مستقبل بھی، اعمال و اخلاق بھی اور اطاعت و فرمانبرداری بھی۔ اس کا انتخاب غلط ہو سکتا ہے؟ یہ منصب جلیل تو ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی کو سرفراز کرنے کے بعد معزول کر دیا جائے اور اس کی غلطیوں کو وجہ عزل بنایا جائے۔

اس عمل میں پہلے تو خدائے حکیم و خبیر مورد الزام ٹھہرے گا اور دوسری قباحت یہ سامنے آئے گی کہ احکام خداوندی کی تعمیل کوئی کر ہی نہیں سکتا ورنہ اس کے برگزیدہ بندوں سے گناہ کیوں سرزد ہوتے عقل اس کو تسلیم کرنے سے اباء کرتی ہے کہ واجب الوجود کو جامع صفات کمالیہ نہ مانا جائے۔

الامام النانوتوی فرماتے ہیں :

> اور ظاہر ہے کہ جس کا وجود کامل ہو اس کی کسی بات میں نقصان مقصود نہیں ورنہ وجود میں نقصان لازم آئے گا کہ جب اس کا علم کامل ہوا اور اس وجہ سے اس کو کسی کے موافق مرضی اور ظاہر و باطن مطیع سمجھنے میں غلطی ممکن الوقوع نہ ہوئی تو جن کو اس نے اپنا مقرب بنایا ہوگا ان کا معزول ہونا اور اپنے عہدۂ احکام رسانی سے موقوف ہو جانا بھی خلاف عقل ہوگا۔ الحاصل انبیاء میں کوئی ایسی بات

مشاہدے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہندستان کے تمام مسائل، خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی ہوں یا تہذیبی، ان کا حل شاہ ولی اللہ کے فلسفہ میں موجود ہے۔ مولانا کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کا قیام ملک میں از بس ضروری تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ولی اللٰہی تعلیمات پر عمل کیا جائے اسی لیے مولانا سندھی نے شاہ صاحب کے فلسفہ کی ترویج واشاعت کو اپنے پروگرام کا ایک نہایت ضروری جز و بنایا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مولانا نے یادگارِ شیخ الہند قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور جامعہ میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے "بیت الحکمۃ" نامی ادارہ قائم کیا۔

اس ادارہ کی تشکیل میں خواجہ صاحب نے مولانا کی بڑی مدد کی۔ خواجہ صاحب کو ہمیشہ تعمیری اور علمی کام کرنے میں لطف آتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن علی گڑھ میں قیام ہونے کے باوجود وہ سیاسی اور قومی معاملات اور اجتماعات کے سلسلہ میں دہلی آتے رہتے تھے اور جامعہ پہنچ کر جامعہ والوں سے ان کے حالات بھی معلوم کرتے رہتے تھے انھوں نے ہمیشہ اس کے مستقبل کو تابناک بنانے کی خاطر عملی کوششیں کیں۔ جامعہ والے ہمیشہ ان سے یہی درخواست کرتے تھے کہ وہ تمام سیاسی جھگڑوں سے آزاد ہو کر بس جامعہ کی رہنمائی اور سرپرستی کریں کیونکہ جامعہ کی نگرانی ہی ان کے نزدیک اصل سیاست تھی۔ لیکن سیاست تو خواجہ صاحب کی سرشت میں تھی۔ وہ جامعہ کا کام بھی کرتے رہے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیتے رہے۔

یوں تو خواجہ صاحب کٹر کانگریسی تھے لیکن موجودہ صدی کی دوسری دہائی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین اشتراک عمل کے دوران وہ لیگ کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس مولانا مظہر الحق کی صدارت میں منعقد ہوا تو خواجہ صاحب نے علاحدہ رائے دہندگی کے موضوع پر ایک قرارداد کے سلسلے میں ترمیم پیش کی تھی۔ انھیں مسلم لیگ نے اپنی اس کمیٹی کا ممبر بھی نامزد کیا تھا جو اصلاحات کی اسکیم کو مرتب کرنے کی غرض سے مقرر کی گئی تھی اور اسے اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اس مسئلہ پر کسی بھی تنظیم یا جماعت سے تبادلۂ خیال کر سکتی ہے۔

اسی طرح ۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تو خواجہ صاحب نے مقامات مقدسہ پر سے برطانوی قبضہ کو ختم کرنے سے متعلق قرارداد ترمیم پیش کی۔ علمائے کرام اور ارباب لیگ نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی ترمیم واپس لے لیں مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا البتہ وہ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے حکم پر ترمیم کو واپس لینے پر تیار ہو گئے۔

نہ ہوگی جو ناپسندیدۂ خداوندی ہو اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے تمام اخلاق حمیدہ کا ہونا اور تمام قوائے علمیہ کا برگزیدہ ہونا لازم آئے گا جس سے ان کی معصومیت کا اقرار کرنا پڑیگا۔ (گفتگوئے مذہبی ص:۱۵)

عرب میں آپ سے پہلے کون؟

قرآن مجید کی آیت وان من امة الا خلا فیھا نذیر اور لکل قوم ھاد. سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عظیم گروہ میں اللہ تعالیٰ نے ہادیٔ برحق بھیجے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبیٔ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کس نبی کی بعثت ہوئی ہے؟ یہ ایک سوال عیسائیت کی طرف سے اسلام پر ہے۔ غالباً مسیحی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب عرب میں کسی نبی کی بعثت نہیں ہوئی تو قرآن مجید کا دعویٰ غلط ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی نازل کردہ کتاب نہیں ہے۔ دوسرا مقصد اس سوال کے پس منظر میں یہ ہے کہ قبل بعثت آپ کے اعمال وافعال اللہ تعالیٰ کے احکام ومرضی کے مطابق نہ تھے اس لئے معصومیت میں رخنہ پڑیگا اور معصومیت ثابت نہ ہوگی۔

اس باب میں بھی الامام النانوتوی کا استدلالی رنگ اور طرز فکر وہی ہے جو اب تک پیش کیا جاچکا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے رسول وہادی مبعوث فرمائے اور اپنے احکامات ومرضیات کو اپنے بندوں تک پہونچایا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قرن اور ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہو کہ وہ اپنے دوسرے انبیا کی فہرست انسانی ہاتھوں تک پہنچادے۔ یہ تو انسانی جماعتوں اور قوموں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نبیوں کی تعلیمات اور اعمال کو محفوظ رکھیں اور ان کی تعلیمات کی رہنمائی میں اللہ کے احکام کی تعمیل میں کسی طرح کی غفلت نہ برتیں۔

اس کے برخلاف اگر کسی قوم نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کی سیرت کو محفوظ نہ رکھا اور مرور ایام کے ساتھ وہ تعلیمات صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئیں تو اس مجرمانہ غفلت کی ذمہ داری اسی قوم پر عائد ہوگی اور اس کو اس جرم کی قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔ لیکن وہ قوم جو اپنے آباء واجداد کی غفلت کوشیوں کے نتیجہ میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ناواقف اور بے بہرہ ہو انصاف یہ ہے کہ وہ مجرموں کے دائرہ سے باہر رہے۔ ہاں ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس قوم پر اپنے لطف وکرم کی بارش ضرور کرے گا اور وہ قوم جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر ہادی برحق کے دائرہ میں ضرور داخل ہوگی۔

۱۳ / مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور میں منعقدہ اپنے اجلاس میں دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ریاست کا مطالبہ کیا تو خواجہ صاحب نے اس کی شدید مخالفت کی۔ انھوں نے اپریل ۱۹۴۰ء میں منعقدہ آزاد مسلم کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں مسلم جماعتوں کی مدد کی جس کی صدارت سندھ کے وزیر اعظم خان بہادر اللہ بخش نے کی تھی۔ اس کانفرنس نے لیگ کی قرارداد کی مذمت کرتے ہوئے ایک علاحدہ مسلم ریاست کے اس کے مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ اس موقع پر جمعیۃ علماء کے نامی رہنما مولوی کفایت اللہ نے ایک قرارداد میں ہندستان کو جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں کے ساتھ ایک ناقابلِ تقسیم ملک قرار دیتے ہوئے اسے تمام ہندستانیوں کا مشترکہ وطن ٹھہرایا تھا۔ اس حقیقت کی روشنی میں مولانا نے آزادیٔ کامل کو ہندستانی مسلمانوں کا نصب العین قرار دیتے ہوئے ان کے مذہبی حقوق کے تحفظ کی ضمانت سے متعلق اظہار خیال کیا۔ انھوں نے تحریک آزادی میں مسلمانوں کی زبردست قربانیوں کی مثالیں پیش کیں اور اس الزام کی تردید کی کہ مسلمان آزادی کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں۔ یہ الزام برطانوی حکومت کے ایجنٹوں نے عائد کیا تھا اس لیے مولانا نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان فرض شناس ہیں اور ہندستان کی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس قرارداد پر بھی خواجہ صاحب نے ترمیم پیش کی لیکن رہنماؤں کے اصرار پر اسے واپس لے لیا۔

اسی طرح جولائی ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ میں منعقدہ یوپی آزاد مسلم پولیٹکل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے عبدالمجید خواجہ نے قیام پاکستان کے مطالبہ کی مذمت کی اور ہندستانی مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے احساسِ اقلیت پر غالب آجائیں۔ انھوں نے کہا:

> "پاکستان ان لوگوں کی بے بس چیخ ہے جو کمزور ہیں اور جنھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے۔ ہندستانی مسلمان محض ایک رقبہ تک اپنے آپ کو محدود کر کے ہندستان کی سکونت کو خیرباد نہیں کہہ سکتے جس کے ہر گوشہ پر ان کے اثرات کی مہر ثبت ہے۔ پاکستان کا احمقانہ مطالبہ پوری طرح کھوکھلا ثابت ہو رہا ہے۔ دراصل مسلمانوں کے تہذیبی اور سیاسی مسائل بھی وہی ہیں جو دوسرے ہندستانیوں کے ہیں۔ وہ اپنے مسائل کے علاحدہ اور مختلف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اس حقیقت سے کبھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ ہندستان کو مختلف مذاہب اور عقائد کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان عقائد کے پیرو اسی طرح ثابت قدم ہیں جس طرح کہ

قوم عرب بھی نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اسی طرح کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار اور محافظ تو سمجھتی تھی لیکن دینِ ابراہیمی کیا ہے؟ وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔ یہی حال دین موسوی اور دینِ مسیحی کا بھی تھا کہ یہ ادیان بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ تھے۔ نہ اصل کتابیں محفوظ تھیں نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مبارک سیرتیں۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جب احکام خداوندی معلوم کرنے کے سارے راستے مسدود ہوں اور انبیاء کی تعلیمات ضائع ہو جانے کی وجہ سے عقل وخرد کو فکری رہنمائی نہ مل رہی ہو اس تاریک دور کے لوگ احکام خداوندی بجانہ لانے کے مجرم کیوں کر ہو سکتے ہیں، یہ جرم تو اس وقت عائد ہوتا جب انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا وجود ہوتا اور ان سے واقفیت حاصل کرنے میں کوئی چیز سدِّ راہ نہ ہوتی۔

لیکن الحمدللہ اس تاریک ترین دور میں بھی نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہر طرح کے رذائل، شرک، بت پرستی اور کج اخلاقی سے پاک رہا اور آپ کی سلامتی فکر ونظر نے راہ حق کی تلاش میں غار حراء تک پہونچا دیا اور یہیں آپ کو خالق کائنات نے آخری اور عالم گیر رسالت عظمیٰ سے منتخب فرمایا اور ثمرۂ نبوت کے طور پر ایسے معجزات عطا فرمائے جو انبیائے سابقین کے معجزات سے عظیم وبرتر تھے۔

معجزات

یوں تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو معجزات عطا فرمائے لیکن معجزات مدار نبوت نہیں ہیں اور نہ کاروبار نبوت معجزات پر موقوف ہے، البتہ معجزات ثمرۂ نبوت ضرور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نبوت عطا کرنے کے بعد حسب ضرورت معجزات کے ذریعہ نبوت کی تائید وحمایت کرتے ہیں۔ ان معجزات سے انبیاء علیہم السلام کی ان صفات کا اظہار ہوتا ہے جو اس مقدس جماعت کو حضرت حق جل مجدہ اپنی صفات کمالیہ کا کوئی حصہ عطا فرما دیتے ہیں۔ معجزات کے ظہور سے اس غالب صفت کا اندازہ ہوتا ہے جو سرچشمۂ فیض سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا اور ید بیضا کی اعجوبہ کاری سے صفت تقلیب وتبدیل کا پتہ چلتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتیٰ اور مریضوں کی شفاء سے جان بخشی کے مضمون کا سراغ ملتا ہے لیکن الامام النانوتوی کے نظریۂ استدلال سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ نبیٔ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزات عطا ہوئے وہ انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام سے

مسلمان اپنے عقائد میں ثابت قدم ہیں۔ لوگوں کی معاشی ترقی مذہبی عقیدوں میں اختلاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ موجودہ اقتصادی نظام پر مبنی ہے جس کے لیے ہندستانی مسلمانوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مشترکہ کوششیں کی ہیں۔

"ہندستانی لوگوں اور بالخصوص مسلمانوں کی اقتصادی فلاح کا سوال آزادی کے مسئلہ کے ساتھ مربوط ہے۔ اس لیے ہندستانی مسلمان ان مسائل کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو برطانوی تسلط سے آزادی کا مل کے حصول سے ابھرے ہیں۔ بلاشبہ ہندستانی مسلمانوں کو ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا جن کا تعلق ان کے اپنے مذہب اور فرقہ سے ہے ـــ وہ مسائل جو کل کے ہندستان میں اجتماعی اور خصوصی کردار کے سلسلہ میں فکر کا سبب ہیں لیکن وقت کی رفتار ان کے مسائل کے حل کا انتظار نہیں کرسکتی ہندستانی مسلمانوں نے اس حد تک اپنے آپ میں اعتماد نہیں کھویا ہے کہ محض ناامید ہو کر وہ علاحدگی اختیار کرلیں۔"

خواجہ صاحب نے مسلمانوں کی وکالت کرتے ہوئے انھیں ان کے فرائض کی یاددہانی کرائی۔ مسلمانوں میں خوف کے جذبات کے عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے خواجہ صاحب نے کہا کہ ان کے دلوں کے اندر ایک اقلیت ہونے کا احساس برطانوی ایجنٹوں نے داخل کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا:

"ہندستان کے نو کروڑ مسلمان جو پانچ صوبجات میں انتہائی برتر حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ محض اپنے بل بوتے پر اپنے حقوق اور مفادات کا دفاع نہیں کرسکتے۔ دوسرے فرقوں کے ساتھ کیے جانے والے معاہدات بھی ان کی خواہش کے مطابق ان کے تحفظ کے سلسلے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اگر ہمت، استقلال اور خود کفالت کے جذبہ کے بجائے جو لوگ مسلمانوں میں خود شکستگی کے جذبہ میں اضافہ اور خود اعتمادی میں کمی کے احساس کو بیدار کرتے ہیں وہ اپنے فرقہ کے بدترین دشمن ہیں۔ اس لئے ہندستان کے مسلمان جتنی جلدی احساسِ اقلیت کو ترک کردیں اتنا ہی ان کے اور ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کو ان کے مذہب، تہذیب اور دوسرے حقوق سے محروم نہیں کرسکتی بشرطیکہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے

زیادہ حیرت انگیز اور فائق تھے۔ فرماتے ہیں:

''مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدلالت اعجاز قرآنی و کمال علمی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صفت علم سے مستفید ہیں اور بارگاہ علمی میں بار یاب ہیں''۔ (مباحثۂ شاہ جہاں پور: ص ۲۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم وہ عظیم صفت ہے جس کا عمل اور کارگزاری کسی دوسری صفت پر موقوف نہیں ہے بلکہ دیگر صفات اپنے عمل اور کاروبار میں صفت علم کی محتاج ہیں، علم کے بغیر اشیاء خورد و نوش بھی استعمال میں نہیں لا سکتے، کیونکہ کھانے پینے سے پہلے اس کا علم ضروری ہے کہ جس چیز کے کھانے یا پینے کا ارادہ کیا جا رہا ہے کیا واقعی وہ کھانے پینے کی چیز ہے یا نہیں۔ چار و ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ تمام صفات جن کا تعلق غیر سے ہوتا ہے ان میں صفت علم ہی سب سے بلند و بالا ہے۔ اس صفت سے جو شخص جس قدر متصف ہوتا ہے اور اس کی علمی حیثیت جتنی بلند ہوتی ہے اسی قدر وہ ممتاز اور قابل احترام ہوتا ہے۔

یہی حال انبیاء علیہم السلام کا بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز علمی مقام پر فائز ہوتے تھے لیکن معجزات کے تناظر میں ان کی دیگر صفات علم کی صفت سے فائق نظر آتے ہیں۔ لیکن نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقدس جماعتِ انبیاء میں سب سے زیادہ علوم کمالیہ عطا کئے گئے اس لئے آپ کے مراتب بھی سب میں زیادہ ہیں اور حق و انصاف یہ ہے کہ جس ذات نبوت کو نور علم سے منور کر دیا گیا ہو سرداری اسی کے شایان شان ہے اور خاتمیت بھی۔ چنانچہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین بھی ہیں اور سید المرسلین بھی۔ آپ کی صفتِ علم قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں ابدالآباد تک نور ہدایت کی روشنی سے منور کرتی رہے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور سرداری کی پیشین گوئی پہلے ہی کر چکے تھے کہ ''میرے بعد دنیا کا سردار آنے والا ہے۔'' راقم الحروف نے اپنی کتاب ''بائبل اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' میں تمام پیشین گوئیوں کو جمع کر دیا ہے تفصیل اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو صرف علمی معجزات سے نوازا گیا اور عملی معجزات سے آپ بہرہ مند نہ تھے بلکہ غور و فکر اور معجزات کے تقابل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ کے عملی معجزات بھی انبیاء سابقین کے معجزات سے زیادہ محیر العقول تھے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ

ہونے کا عزم رکھتے ہوں"

خواجہ صاحب نے کہا کہ فرقہ وارانہ تنظیمیں اتحاد کی کامیابی کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہیں جبکہ اتحاد قومی آزادی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ انھوں نے ایسے مشترکہ پلیٹ فارموں اور تنظیموں کو جنم دینے کی اپیل کی جو عوام کے مسائل پر توجہ مرکوز کر سکیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ انھوں نے اعلان کیا:

"ایسی واحد مشترکہ تنظیم جو قومی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے میں مصروف ہے وہ صرف انڈین نیشنل کانگریس ہی ہے اور مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں اس میں شمولیت اختیار کر لینی چاہیے۔ اگر کانگریس کی بالائی سطح پر کچھ عناصر نے اپنی تنگ ذہنی کے سبب مسلمانوں کو خفا کر دیا ہے تو یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جس سے ہندستانی مسلمان کانگریس کا تیاگ کر دیں۔ کانگریس کی ترقی کے لیے ہندستانی مسلمانوں نے بڑی حد تک کوششیں کی ہیں اس لیے اب ہم کیونکر اس قومی تنظیم کو ان تنگ ذہن عناصر کے ہاتھوں میں چھوڑ سکتے ہیں جو آج ہماری علاحدگی کے سبب اسے متاثر کر رہے ہیں؟"

اپنے خطبۂ صدارت میں خواجہ صاحبؒ نے صراحت کی کہ کانگریس میں شمولیت کے یہ معنی قطعی نہیں ہیں کہ ان تمام دوسری تنظیموں سے قطع تعلق کر لیا جائے جو مسلم فرقہ کے واضح مفادات کے دفاع اور فروغ کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ دراصل ان تنظیموں کو بھی مستحکم کیا جانا چاہیے۔

مسلم لیگ کی قرار داد لاہور کے جواب میں خواجہ صاحب کے خیالات اور ان کا ردعمل شدید تھا تاہم اس زمانے میں ایسے ہی جواب کی ضرورت تھی جو انتہا پسندی کی سرحد کو چھوتا تھا۔ خواجہ صاحب کٹر کانگریسی تھے اور اس کے رہنماؤں سے ان کے تعلقات اپنی تعلیمی زندگی ہی سے گہرے رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت پر اصرار کیا۔ آزاد مسلم کانفرنسوں میں خواجہ صاحب کی شمولیت اور رہنمائی نے قوم پرور مسلمانوں کے حوصلے بلند کر دیے جنھوں نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کے خیالات کی ترجمانی کی تھی۔

خواجہ صاحب آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم مجلس کے صدر بھی تھے۔ انھوں نے اس تنظیم کے ذریعہ بھی قیام پاکستان کے مطالبہ کی سخت مخالفت کی اور مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ایسے حالات میں نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی منائی گئی جو ایک یادگار

عصا بلاشبہ حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے لیکن اسطوانہ حنانہ اس سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ عصائے موسوی میں زندگی کے آثار اس وقت نمایاں ہوئے جب اس کا قالب بدلا اور لاٹھی سانپ بن گئی یعنی اس شکل میں آئی جس میں زندگی اور حرکت ہوتی ہے، اس کے برخلاف اسطوانہ حنانہ کا قالب نہیں بدلا اور نہ ہی نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خشک لکڑی پر اپنا دست مبارک اظہار معجزہ کیلئے پھیرا اور نہ ہی اس وقت معجزہ دکھانے کی ضرورت تھی۔ ہاں ایک مدت تک آپ اس تنے کا سہارا لیکر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس دست نبوت کی معجزانہ صفت نے اس میں زندگی کی حرارت پیدا کردی اور جدائی کے وقت وہ تنا انسانوں کی طرح بلبلا کر رو دیا۔ اس کیفیت کو مولانا جلال الدین رومی نے اس طرح واضح کیا ہے:

استن حنانہ از ہجر رسول　　　نالہ می کردے چوں ارباب عقول

گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستوں　　　گفت جانم از فراقت گشت خوں

اسی طرح دیگر معجزات کا مقابلہ کرنے کے بعد نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کی فوقیت اور برتری واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ حضرت مسیح علیہ السلام کی مسیحائی سے بہت سے بیمار شفایاب ہوئے اور بہت سے مردے زندہ ہوئے۔ یہ عظیم معجزات آپ کی نبوت کے واضح دلائل ہیں لیکن نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پھیرنے اور لعاب دہن لگانے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ ٹھیک ہو جانا اور آنکھوں کی تکلیف کا دور ہو جانا، معجزات مسیح علیہ السلام سے برتر دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال جسمانی کی برکت سے بیمار شفایاب ہو رہے تھے۔ دونوں میں جو واضح فرق ہے وہ سامنے ہے۔ یہ دو معجزات بطور استشہاد پیش کئے گئے ہیں ورنہ معجزۂ انشقاق قمر عملی معجزات میں سرفہرست ہے، انبیاء سابقین میں حضرت یوشع علیہ السلام کے اعجاز سے آفتاب ایک جگہ دیر تک ٹھہرا رہا اور ایک نبی کے اعجاز سے آفتاب غروب ہونے کے بعد لوٹ آیا۔ یہ دونوں معجزات اتنے حیرت انگیز نہیں ہیں جتنا محیر العقول معجزۂ انشقاقِ قمر ہے۔ کیوں کہ ہر جسم کا جسمانی تقاضا سکون ہے اور حرکت طبعی تقاضے کے خلاف ہے، اس لئے اگر کوئی جسم حرکت میں ہے پھر اس کی یہ حرکت بند ہوگئی اور سکون ہو گیا تو اس کا طبعی تقاضا ہی یہی تھا اس لئے سکون تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چیز آگے جاتی ہوئی پیچھے پلٹ آئی تو اس میں بھی اچنبھے کی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو حرکت معکوس کہیں گے،

تقریب بن گئی۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے امیر جامعہ کی حیثیت سے پہلے تو جامعہ کا پرچم لہرایا اور پھر مندرجہ ذیل تقریر کی۔

"اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گوناگوں مشکلات اور دشواریوں کے باوجود ہم آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں منانے کی ابتدا کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا کام مجھ جیسے عاصی پُر معاصی کے کمزور ہاتھوں سے شروع ہوا ہے۔ اس خدمت کی ادائیگی مجھے بہ حیثیت امیر جامعہ سپرد کی گئی ہے اور اس عہدہ پر میرا انتخاب خصوصاً مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جیسی شخصیتوں کے بعد صرف میرے پرانے رفقائے کار کی قدر دانی بلکہ ذرّہ نوازی ہے جس کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے جو کچھ میرے متعلق فرمایا ہے وہ اُن کی محبت اور ان کے خلوص کا کرشمہ ہے نہ کہ میری ناچیز خدمات کا اعتراف۔ پھر بھی میں شکریہ کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مخلص اور قوم وملت کے حقیقی محسن کو عرصۂ دراز تک زندہ سلامت رکھے اور ان کی زندگی کو ہماری قوم کے لیے نمونہ بنائے آمین۔

"بزرگو اور عزیزو! مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے ہر شخص میری اس دعا میں شریک ہوگا کہ اے خالق ہر بلندی و پستی جو پرچم تیرے نام پر آج میرے پست ہاتھوں نے بلند کیا ہے۔ اس کو ہمیشہ بلند رکھنا۔ یہ پرچم اس جھنڈے کی یادگار ہے جسے بعض تیرے مقدس بندوں نے جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، مسیح الملک حافظ حکیم اجمل خاں، امیر الہند ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہم کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے، آج سے چھبیس برس پہلے علی گڑھ میں بلند کیا تھا۔ ان بزرگوں کی حیات ہی میں اور ان کے ہم سے جدا ہونے کے بعد ہم پر بڑے بڑے سخت اور کٹھن وقت آئے اور ہم میں سے اکثر کے قدم ڈگمگائے مگر تیری توفیق شامل حال رہی۔ جب علی گڑھ میں جامعہ کا قیام دشوار ہو گیا تو تیرے ایک بندہ خاص کی ہمت سے یہ ادارہ ہندستان کے دارالسلطنت دہلی میں منتقل ہو گیا اور یہاں بھی تیرے چند خاص بندوں کی ہمت نے اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم فرما دیا۔ یہ پرچم تیرا ہے۔ اس پرچم کی حقیقی لاج تیرے

اس کے علی الرغم کسی جسم کا پھٹ جانا اس کی طبیعت کے خلاف ہے اس لئے حیرت انگیز بھی زیادہ ہے، الامام النانوتویؒ فرماتے ہیں:

پھٹ جانا تو ہر جسم کے حق میں خلاف طبیعت ہے اور سکون کسی جسم کے حق میں بحیثیت جسمی خلاف طبیعت نہیں بلکہ حرکت ہی خلاف طبیعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے اجسام کے پھٹ جانے کیلئے اور اسباب کی حاجت ہوتی ہے ایسے ہی حرکت کیلئے بھی اور اسباب کی ضرورت پڑتی ہے اور سکون کیلئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (مباحثہ ۲۸)

عملی معجزات کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کو حیرت انگیز عملی معجزات عطا کئے گئے تھے اور علمی معجزہ جو قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے اور بے شمار بندگان خدا کے سینوں میں محفوظ ہے وہ کسی نبی کو بارگاہ علیم وخبیر سے عطا نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی، یہی وجہ ہے کہ سابقہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہیں صرف ان کے تراجم دستیاب ہیں وہ بھی محرف اور حد درجہ مشکوک ہیں۔

اس کے برخلاف قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی تا کہ آخری رسالت کی تعلیمات سے دنیا ابد تک مستفید ہوتی رہے۔ اس موقعہ پر یہ اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم وہ لازوال علمی خزانہ ہے جس نے بے شمار عالی دماغ انسانوں کو سیکڑوں علوم وفنون ایجاد کرنے پر مجبور کر دیا۔ کسی نے اس کی ادبی خصوصیات کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے ذات وصفات پر بحث ونظر کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ کسی نے آخرت کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے احوال برزخ پر قلم اٹھایا۔ کسی نے علم اور اخلاق پر اپنے توسن فکر کو مہمیز کیا تو کسی نے قرآنی جغرافیہ پر نظر ڈالی۔ کسی نے قرآنی حیوانات کو موضوع تحقیق بنایا تو کسی نے نباتات قرآنی پر اپنی فکری توانائیاں صرف کیں۔ کسی نے شخصیات قرآنی پر نگاہِ تحقیق ڈالی تو کسی نے نظمِ قرآن کو اپنا موضوع بنایا۔ کسی نے قرآنی تاریخ کو موضوع تحقیق بنایا تو کسی نے حکمت وفلسفۂ قرآنی پر فکر وتدبر کیا۔ یہ علوم وفنون قرآن کریم کے اعجاز کی بجائے خود شہادت پیش کر رہے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ یہی کتاب کلام الٰہی ہے اور اسی کی تعلیمات پر عمل کرنا موجب نجات اور عقل کا تقاضا ہے۔

لیکن اس طرح کے دو اور دو چار کی طرح واضح استدلال اور معجزات کے تقابلی مطالعہ کی تاب

قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کو اس پرچم کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائیو اور جو اس کی لاج رکھے تو اس کی لاج رکھیو۔ آمین۔

"بزرگو اور عزیزو۔ میں ان چند لوگوں میں سے ہوں جو اس تعلیمی ادارے کی ذہنی سنگ بنیاد رکھتے وقت علی گڑھ میں موجود تھے جو آج جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نام سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس لیے نامناسب نہ ہو گا اگر میں اس پرچم کے متعلق کچھ وضاحت کروں۔ ہر چند کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ موقع کسی لمبی تقریر کا نہیں ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس پُر آشوب زمانے میں جب کہ پرچموں اور جھنڈوں پر بلا سوچے سمجھے فسادات تک ہو جاتے ہیں، اس پرچم کی حقیقت کی طرف آپ کی بلکہ دوست و اغیار کی توجہ مبذول کراؤں۔

"عُلم یا پرچم دراصل حکومت کا نشان ہوتا ہے مگر جب کوئی گروہ یا جماعت اپنی مروجہ حکومت سے ذہنی اور دماغی آزادی کا اعلان کرتی ہے تو کہا جاتا ہے اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ اسی طرح لڑائی کی حالت میں صلح و آشتی کے اظہار کے لیے پرچم بلند کیا جاتا ہے پرچموں میں کبھی محض رنگ سے کسی اصول کو ظاہر کیا جاتا ہے اور کبھی کچھ نشانوں سے تاکہ دیکھنے والے بیک نظر اس کا مفہوم سمجھ لیں۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم توحید بلند فرمایا تھا وہ بھی حکومت وقت کے خلاف تھا۔ کتب سیرت و حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے سیاہ و سفید رنگ پسند فرمائے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کی طرف اشارہ ہوں۔

"۱۹۲۰ء ایک مشہور پُر آشوب زمانہ تھا۔ اسی زمانہ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی بنیادوں پر حکومت برطانیہ کے زیر سایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی جا رہی تھی۔ مدرسۃ العلوم کو پہلے ہی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قرار دیا گیا تھا۔ وہ حکومتِ وقت کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا اس لیے اس کالج میں اکثر یونین جیک لہرایا کرتا تھا کالج کا کوئی علم نہ تھا مگر ایک کریسنٹ یا نشان تھا جس پر کھجور کا ایک درخت تھا جس کی ایک جانب ہلال بطور مسلم نشان کے اور دوسری طرف تاج برطانیہ جس میں سب سے اوپر صلیب کا

مسیحی علماء نہ لا سکے اور یہ اعتراض کیا کہ معجزات محمدی کا ثبوت آپ کو قرآن سے دینا تھا۔ قرآن سے آپ نے ثبوت نہیں دیا۔

الامام النانوتوی نے اس پورے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

اول تو (معجزات کا) قرآن شریف میں مذکور ہونا کوئی شرط ثبوت نہیں، روایت صحیح چاہئے، سو بحمد اللہ روایاتِ احادیث اسلام جن میں اکثر معجزات محمدی منقول ہیں ایسے صحیح ہیں کہ تورات و انجیل کی روایات اس کے ہم پلہ نہیں ہوسکتیں۔ علاوہ بریں معجزۂ انشقاق قمر اور پیشین گوئی خلافت وغیرہ قرآن شریف میں نہیں اور کاہے میں ہیں؟ (مباحثہ ۳۸)

الامام کا معارضہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ انبیاء علیہم السلام اور اوتاروں کے معجزات اور کرشمے بیان کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتابیں صحت و تواتر کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اس کے باوجود عیسائیوں اور ہندوؤں کا ان پر ایمان ہے، تو قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ میں جو معجزات بیان کئے گئے ہیں ان پر ایمان لانا از بس ضروری ہے۔ توریت اور انجیل کے صحیح ہونے کی سند آج کسی کے پاس موجود نہیں ہے۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ یہ کتابیں کس زمانے میں لکھی گئیں اور ان کتابوں کے راوی کون کون اور تعداد میں کتنے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن وحدیث کی صحت اور ان کے اسناد کا حال یہ ہے کہ ہم سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک راویوں کی تعداد معلوم، نسب اور سکونت معلوم، اس کے ساتھ ساتھ ان راویوں کے مفصل حالات، ان کی عدالت وثقاہت اور حافظہ کی کیفیت معلوم ہے، ایسی صورت میں تورات وانجیل تو معتبر ہوجائیں اور قرآن وحدیث کا اعتبار نہ کیا جائے ایک طرفہ تماشا ہی تو ہے۔

افضل کون؟

ایک اور اعتراض عیسائیوں نے درود ابراہیمی کا سہارا لے کر کیا ہے کہ اس سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ تشبیہ میں مشبہ بہ، مشبہ سے افضل ہوا کرتا ہے۔

اس اعتراض کی حیثیت ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سے زیادہ نہیں ہے۔ الامام نے عقلی دلائل کی روشنی میں یہ واضح کردیا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمالات علمیہ اور عملی معجزات کے پیش نظر افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اس مضبوط استدلال پر تو کسی مسیحی کو لب ہلانے کی جرأت نہ

نقشہ بنا ہوا تھا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو گورنمنٹ برطانیہ سے آزاد کرانے کے لیے ہمارے بعض دوستوں اور رہنماؤں نے کوشش کی۔ مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کوشش میں پیش پیش تھے اور وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو نیشنل مسلم یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ اور ہنگامی طور پر جب امناء یونی ورسٹی یا کالج نے گورنمنٹ برطانیہ سے آزادی کی تجویز کو کثرت رائے سے مسترد کر دیا تو مولانا محمد علی مرحوم نے بعض پُرجوش طلبہ کی مدد سے اس پر قبضہ بھی کر لیا اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کالج کی مسجد جامع میں اس کا اعلان کر دیا کہ اب یہ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی ہو گی۔ بعد نماز جمعہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ نے وہ خطبہ دیا جسے خطبہ تاسیس کہا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض بھائیوں نے حکومت برطانیہ کی مدد سے مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ساتھیوں کو کالج سے نکال دیا اور میرے احتجاج کے باوجود مجھے بھی اولڈ بوائز لاج سے بے دخل کر دیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جن مدرسین اور طلبہ نے علاحدگی اختیار کی وہ اس جامعہ کے خشت اولین کہے جا سکتے ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں ہمارے موجودہ شیخ الجامعہ ہیں۔ جو طلبہ پرانے کالج سے باہر آئے تھے ان میں سے اکثر کا اصرار تھا کہ ان کی تعلیم جاری رکھی جائے۔ اس لیے سرکاری یونیورسٹی سے نمایاں کرنے کے لیے قومی ادارہ کا نام نیشنل مسلم یونی ورسٹی رکھا گیا اور چونکہ اُس وقت پرانے کالج کے افسر اعلا تعلیمی کا عہدہ پرنسپل کا نام رکھتا تھا اس لیے خود مولانا محمد علی نے تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے آپ کو پرنسپل ہی قرار دیا۔ بعض احباب کا یہ خیال تھا اور علی برادران اسی خیال کے حامی تھے کہ ہمارا نیا قومی ادارہ کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ حکومت تبدیل ہونے پر ہم اپنے پرانے کالج یا یونیورسٹی پر جس کے ہم زیادہ حقدار ہیں قابض ہو ہی جائیں گے۔ ساری عمارتیں اور سارا سرمایہ ہمارے پاس ہو گا اس لیے درسگاہ کے قریب ہی ڈیرہ ڈال لینا کافی ہے۔ اور بجائے کتابی تعلیم کے قومی تحریک کے رضاکار اور مبلغ بنانا وقتی تقاضوں کی بنا پر زیادہ ضروری ہے اسی لیے زیادہ تر طلبہ اس خدمت کے لیے ملک کے ہر حصہ میں

ہوئی تشبیہ اور مشبہ بہ کی بحث چھیڑدی۔ بظاہر تو سوال طاقتور اور افضلیت کے حق میں قابل اعتنا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشبیہات مجازی میں مشبہ بہ کا افضل ہونا ضروری ہے، تشبیہات حقیقی میں مشبہ، مشبہ بہ کا وجہ شبہ میں برابر ہونا لازمی ہے۔ کوئی کسی سے کم یا زیادہ نہ ہو ورنہ تشبیہ غلط ہوگی۔ درود ابراہیمی میں تشبیہ مجازی نہیں تشبیہ حقیقی ہے۔ لیکن اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں مرتبے میں برابر ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تشبیہ فی النسبۃ میں نسبت کا مساوی ہونا تو ضروری ہے لیکن منسوب الیہ اور منسوب کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، جیسے ایک کو دو کے ساتھ جو نسبت ہے وہی ایک کروڑ کو دو کروڑ کے ساتھ نسبت حاصل ہے اور قاعدہ تشبیہ کے مطابق نسبت مساوی بھی ہے اس کے باوجود ایک کو ایک کروڑ کے ساتھ اور دو کو دو کروڑ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تشبیہ فی النسبت میں نسبت کا برابر ہونا ضروری ہے اطراف کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کی دوسری مثال سامنے رکھئے جو عام طور پر بولی جاتی ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ یعنی روح اچھی ہے تو رحمت کے فرشتے روح قبض کرنے آتے ہیں اور اگر روح بری ہے تو قبض روح کے لیے عذاب کے فرشتے آتے ہیں۔ اس مثال کو بولتے ہوئے سب یہ سمجھتے ہیں کہ کہاں انسان کی روح اور کہاں فرشتے۔ نسبت میں تساوی تو ہے لیکن مراتب میں نمایاں فرق ہے یہی کیفیت درود ابراہیمی میں بھی ہے کہ نسبت میں تساوی کے باوجود مراتب میں تفاوت ہے۔ اس استدلال کے ساتھ الامام النانوتوی ایک اور نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ نکتہ الامام کے الفاظ ہی میں ملاحظہ فرمائیے:

> سو اسی طرح درود شریف میں بھی خیال فرمالیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے درویشی اور طریقت کے سلسلے متعدد ہیں ایسے ہی نبوت کے سلسلے بھی متعدد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک سلسلہ میں ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سلسلہ میں ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے چلا اور دور تک چلا گیا۔ مگر سلسلۂ اول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم سمجھئے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بمنزلۂ درخت کامل سمجھئے جس میں شاخ و

چلے گئے۔ اسی کے ساتھ بعض بزرگوں اور دوستوں کا یہ خیال تھا اور اکثر طلبہ بھی یہی چاہتے تھے کہ ہمیں ایک بالکل نئی درسگاہ قائم کرنی چاہیے جس کی اساس اول ہی دن سے تقویٰ پر ہو اور جس کے بنیادی اصول پرانے کالج کی تاریخی آلائشوں سے بالکل جدا اور مبرا ہوں۔ کافی بحث و مباحثوں کے بعد اس جماعت کو جس کے سرگروہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب تھے کامیابی ہوئی اور بہ مصداق قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، اس ادارے کی تشکیل اور ترتیب کا کام مجھے سپرد کیا گیا اور میں نے اس کا یقین ہو جانے پر اس ذمہ داری کو قبول کیا کہ یہ درسگاہ حقیقی معنوں میں آزاد تعلیمی ادارہ ہوگی اس کام میں اول دن سے جن رفقا نے میرا ہاتھ بٹایا ان میں آپ کے موجودہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، آپ کے شیخ التفسیر اور ناظم دینیات خواجہ عبدالحی صاحب، آپ کے ناظم شعبۂ ہمدردان جامعہ حافظ فیاض احمد، آپ کے شیخ التاریخ اسلامی مولانا اسلم جیراجپوری، آپ کے اعزازی شیخ التاریخ مولانا سید سلیمان ندوی، آپ کے سابق استاد حکمت و سائنس ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب اور بعض دوسرے رفقا خوش قسمتی سے آج ہم میں موجود ہیں۔ ان ہی رفقا کی ہمت پر میں نے یہ بار اپنے ضعیف کاندھوں پر اٹھا لیا اور اس ادارہ کا مستقل نام جامعہ ملیہ اسلامیہ، اس کے افسر اعلیٰ کا نام امیر جامعہ، اس کے تعلیمی افسر کا نام شیخ الجامعہ اور اس کے پروفیسروں کا لقب شیخ قرار پایا۔ ان ہی اور دوسرے بزرگوں اور دوستوں کے مشورہ سے جامعہ کے لیے ایک پرچم تجویز کیا گیا جس پر دو کھجوریں رکھی گئیں تاکہ ہماری حجازی لے بلند آہنگ ہو۔ خلیفۃ المسلمین وقت کے جھنڈے سے ہلال لیا گیا تاکہ ہماری سیاست کا ایک پہلو روشن ہو۔ اس پر ایک ستارہ قائم کیا گیا تاکہ وہ ہماری بلند ہمتی کا نشان ہو اور اس میں اللہ اکبر لکھا گیا تاکہ اس نعرۂ توحید کی بلندیاں ہمیں اپنے سروں کو بلند رکھنے کے لیے عزم کی یاد دلاتی رہیں۔ اس میں ایک کتاب کی شکل رکھی گئی جس کا اشارہ الکتب لاریب فیہ کی طرف ہے اور اسی ام الکتب سے ایک فقرہ نقل کیا گیا۔ علم الانسان مالم یعلم۔ یعنی جو علم انسان کو نہ تھا وہ سب خدا ہی نے عطا فرمایا ہے۔ اس میں عالم الغیب والشہادۃ پر ایمان کا اعلان ہے اور اس علم کی طرف اشارہ ہے جس کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی

برگ، پھول پھل سب موجود ہوں۔علیٰ ہذا القیاس سلسلۂ ثانی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بمنزلۂ درخت کامل خیال فرمائیے اور پھر فرمائیے کہ باوجود امکان صحت تشبیہ تساوی کیوں کر لازم آتی ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کس طرح ہاتھ سے جاتی ہے؟(مباحثہ:۴۵)

یہ وہ چار اعتراضات تھے جن پر مسیحیوں کو ناز تھا، لیکن وہ کس قدر بے وزن اور کمزور تھے وہ جوابات کی روشنی میں سب کو نظر آ گئے ہیں، رہا مسلمانوں کا دیگر مذاہب کے بارے میں نقطۂ نظر وہ بھی بالکل واضح ہے کہ عہد حاضر کے مذاہب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے عقائد عقل وہوش کی دنیا میں سراسر بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہیں۔الامام النانوتوی رحمہ اللہ نے اپنی تقریروں میں مذاہب عالم کی ان بنیادی خامیوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔آپ کا اصرار تھا کہ اگر اثبات وتحقیقِ مذہب مقصد ہے تو پہلے ذات باری میں گفتگو ہونی چاہئے کہ وہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ایک ہے یا متعدد خدا ہیں۔اس کے بعد صفات باری کو موضوع تحقیق بنایا جائے کہ ذات باری کے مخصوص صفات کیا ہیں؟ کتنی صفتیں پائی جاتی ہیں اور ذات باری میں کتنی صفات درکار ہیں پھر تجلیات باری پر گفتگو کی جائے، ان پر سیر حاصل بحث وتحقیق کے بعد نبوت کو موضوع بحث بنایا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور کون نبوت سے سرفراز کیا گیا اور کون نہیں؟ نبوت کس طرح کے اعمال واخلاق کا تقاضا کرتی ہے؟ اس کے بعد احکام پر بحث کی جائے کہ کونسا حکم عقل تسلیم کرتی ہے اور کس سے انکار کرتی ہے لیکن احکام پر بحث وگفتگو بے سود ہے۔نبوت کے ثابت ہونے اور اس کے متعین ہو جانے کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ عقل نارسا کو احکام کی بھلائی اور برائی کو پرکھنے کیلئے استعمال کیا جائے۔مگر اصرار کے باوجود ہندو اور عیسائی علماء اس اصولی گفتگو پر آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ہر فریق سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا اور تقریر ہی کے کسی گوشہ کو موضوع بحث بنا لیا گیا۔الامام النانوتویؒ نے اپنی تقریروں میں اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا اور عقائد پر ایسی مدلل ومعقول تقریر فرمائی کہ اس پر کسی فریق کو اعتراض کی گنجائش نہیں ملی، البتہ الامام نے اپنی تقریروں میں ہندو اور عیسائی عقائد پر وہ اعتراضات کئے جو آج تک قائم ہیں۔ان کا کوئی جواب عیسائی دنیا اب تک نہیں دے سکی اور نہ درحقیقت ان کا کوئی جواب ہے۔ذیل میں الامام کے چند اعتراضات ملاحظہ فرمائیے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا کر کے ملائکہ کے روبرو اپنے اس فیصلہ کا اعلان فرمایا تھا انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ یعنی ہم زمین پر اپنا نائب مقرر کرنے والے ہیں اور ملائکہ کے استعجاب حیرت اور استفسار پر ان کی تشفی علم آدم الاسماء کلہا سے فرمائی تھی۔ اس طرح علم ہی کو آدمؑ کی ملائکہ پر فوقیت کی وجہ قرار دیا گیا تھا۔ یہی وہ علم ہے جو نہ صرف ہماری دینی بلکہ دنیوی زندگی کو بھی سنوارتا ہے وانتم الاعلون کی سند کا مستحق قرار دے سکتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ ہم اپنے خالق کو پہچان سکتے ہیں اور اسی کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کے ہر پہلو اور اسکے ہر شعبہ کی حقیقت اور زندگی کے فرائض اور ذمہ داری کو محسوس کر سکتے ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جو علم کا محتاج نہ ہو۔ صحیح علم ہی ہم کو بتا سکتا ہے کہ علم محض کسی کتاب کے پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ علم وہی ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو جائے جو ہمارے ہر نفس اور ہر قدم اور ہر حرکت کا جائزہ لے سکے۔ جس طرح محض فن کی کتاب پڑھ کر یا اس کو سچا سمجھ کر کوئی شخص معمار یا خیاط یا نجار نہیں بن سکتا اسی طرح ایک مسلمان محض کتابوں کو پڑھ کر یا ان کو سچا مان کر حقیقی مسلمان نہیں بن سکتا جب تک کتاب اللہ پر عمل نہ کرے۔ اسی لیے دین کی بنیاد علم پر اور اسکی تعمیر عمل سے تعبیر ہوتی ہے۔ کتاب اللہ پر عمل کر کے ہی ہم خلافت الٰہی کے مستحق، انتم الاعلون کے حقدار اور حسن الدنیا والآخرہ، کے مصداق بن سکتے ہیں۔

"جو تعلیمی ادارہ اللہ کی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کی تربیت دینے کے لیے اور اس کے ساتھ دنیاوی علوم سکھانے کے لیے قائم کیا اسی کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے اور اس پرچم کے نشانات ان ہی حقیقتوں اور ان ہی عزائم کی طرف اشارہ کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔"

جامعہ کے تاریخی پس منظر، اس کے مقاصد اور اس کے پرچم کی وضاحت کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا:۔

"حضرات۔ تعلیمی کام کے لیے سب سے زیادہ امن وسکون کی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیم دنیا کو امن کے پیغام ہی کا نام ہے۔ اس کو اتفاق کہیے یا اس سے ایک فال لیجیے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک پُر آشوب زمانہ میں

۱۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفارہ ہو جانا ممکن نہیں یعنی یہ بات جو عیسائیوں کے اعتقاد میں جمی ہوئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتیوں کی طرف سے ملعونِ خدا ہوئے نعوذ باللہ اور تین دین ان کی وجہ سے جہنم میں رہے ہر گز قرین عقل نہیں۔

۲۔تثلیث مخالف عقل ہے۔کسی مذہب میں ایسا مخالف عقل مسئلہ نہیں ہے۔

۳۔قرآن شریف میں بیشک تورات وانجیل کی تصدیق ہے مگر اُس تورات وانجیل کی تصدیق ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔وہ تورات وانجیل میں مذکور نہیں جو آپ صاحبوں کے ہاتھ میں ہے۔اس کا اعتبار نہیں کیونکہ اس میں تحریف یعنی تغیر وتبدل واقع ہو چکی ہے۔

الامام کے ان اعتراضات کا کوئی جواب عیسائی دنیا کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آیا۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تختۂ دار پر اپنی جان قربان کر کے اپنے امتیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔بائبل میں ہے کہ:

> مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔(گلتیوں:۱۳/۳)

الامام فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفارہ ہو جانا ممکن نہیں ہے اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ وہ ملعون ہوئے اور تین دن جہنم میں رہے قرین عقل نہیں ہے۔ایک طرف تو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا اور محبوب کہنا دوسری طرف ان کو ملعون ومعذب سمجھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔محبوب میں کوئی وجہ محبت ضرور ہوتی ہے اسی طرح دشمن میں سبب عداوت بھی ہوتا ہے۔مرحوم ہے تو اس میں وجہ رحمت بھی ہوگی اور ملعون ہے تو اس میں لعنت کا سبب بھی ہوگا۔یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسن وخوبصورتی تو کسی میں نظر آئے اور محبوب کسی بدصورت اور کریہ المنظر کو بنایا جائے۔اطاعت وفرماں برداری کوئی کرے اور اطاعت کا انعام نافرمان کو ملے۔بدصورتی کی بنا پر نفرت اور ہیبت جس سے ہونی چاہئے اس کے بجائے نفرت حسن خداداد سے ہو جائے عقل میں سمانے والی بات نہیں ہے۔اسی طرح مجرم کوئی اور ہو اور سزا بے قصور کو ملے عقل اس سے بھی اباء کرتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے مطیع وفرماں بردار

قائم ہوئی اور آج اس سے سخت تروپر آشوب زمانہ میں اپنا جشن سیمین منا رہی ہے۔ سیاسی غلامی، اقتصادی بے بضاعتی، ملی انتشار اور گوناگوں مشکلات ہماری راہ میں سنگ ہائے گراں رہے لیکن خدا کا فضل ہماری کوششوں سے زیادہ ہمارا دستگیر رہا۔ اس کے فیض کرم سے ہمارے ہمدردوں کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی کی عطا کی ہوئی توفیق نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقا کو استقامت بخشی اور جہاں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اپنے شیخ الجامعہ اور ان کے باہمت رفقا اور اپنے محسنوں اور ہمدردوں کے بھی شکر گذار ہیں کہ ہماری بہت سی مشکلات ایک حد تک آسان ہو گئیں۔ جیسا کہ شیخ الجامعہ نے اپنے دعوت نامے میں لکھا ہے ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہمدردان نہ صرف ہماری خوشی میں شریک ہوں، ہمیں ممنون فرمائیں بلکہ ہمدردانہ تنقید سے ہماری رہنمائی بھی کریں۔

"طلبۂ جامعہ! بانیانِ جامعہ کی آرزو تھی اور میری دعا ہے کہ جامعہ کا ہر فرزند دنیا کے کسی حصہ میں بھی جائے اور زندگی کے کسی شعبہ میں بھی قدم رکھے وہ اس پرچم کا خیال اور لحاظ اس طرح رکھے کہ اس ستارہ کی چمک جس میں اللہ اکبر کی جھلک ہے ان کی ساری زندگی کو منور کرتی رہے تاکہ جامعہ کا ہر ہلال بدر منیر بن کر دنیا کو منور کرے اور وہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش کرنے کہ ہر دیکھنے والا بیساختہ کہہ اٹھے۔

بالائے سرش زہوش مندی   می تافت ستارۂ بلندی

خواجہ صاحب کی دلی خواہش تھی کہ ملک کی تقسیم عمل میں نہ آئے اور ہندستان کی سالمیت برقرار رہے لیکن تمام قوم پرور مسلمانوں کی طرح ان کی یہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی اور ان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ تاہم خواجہ صاحب برابر دہلی جاکر مہاتما گاندھی سے ملتے رہے اور گاندھی جی بھی انہیں دلاسا دیتے رہے۔ ۱۲/جون ۱۹۴۶ء کو جب خواجہ صاحب دہلی پہنچے تو مہاتما گاندھی انھیں اپنے ساتھ پرارتھنا سبھا میں لے گئے اور اپنی تقریر سے پہلے انھوں نے خواجہ صاحب کو حاضرین سے متعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے بڑے پرانے اور بڑے عزیز دوست ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک بار علی گڑھ میں ان کے مہمان ہوئے تو سوامی ستیہ دیو بھی ان کے ساتھ تھے جو کٹر ہندو تھے اور کسی مسلمان کے گھر نہ تو کھاتے تھے اور نہ پیتے تھے اس لیے خواجہ صاحب نے ان کی خدمت کے لیے ایک برہمن کو ملازم رکھ لیا۔ ان

ہیں، کسی طرح کا کوئی گناہ ان سے سرزد نہیں ہوا اور مسیحیوں کے اعتقاد میں خدا کے بیٹے ہیں تو باپ بلا وجہ اپنے محبوب بیٹے کو سزا دے کر رسوا کیوں کرے گا۔ جبکہ مسیحی بھی خدا کو راستباز اور عادل و صادق مانتے ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کو نفرت شریروں سے ہے۔ امثال ۱۵/۹۔۲۶ میں ہے:

''برے منصوبوں سے خدا کو نفرت ہے'' ''شریروں کی روش سے خدا کو نفرت ہے (لاہوری نسخہ) یہ بھی مانتے ہیں کہ انسانوں کے گناہ کی وجہ سے خدا نظر نہیں آتا۔ وہ روپوش ہے۔ (دیکھئے یسعیاہ ۵۹/۲)

''تمھارے گناہوں نے اسے تم سے روپوش کر دیا'' وہ راستباز اور سچا ہے، اس کے فیصلے برحق ہیں۔ (دیکھئے زبور ۱۱۹/۱۳۷)

''اے خداوند تو صادق ہے اور تیرے احکام برحق ہیں''

اس کے باوجود کسی بے قصور کو سزا دینا یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ توریت وانجیل محرف ہیں ورنہ کلام خداوندی میں تضاد بیانی نظر نہ آتی۔ اسلامی اور مسیحی دونوں نقطۂ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ بے قصور کو سزا نہیں دیجاتی اور مسیحیت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا محبوب مانتی ہی ہے کیونکہ بائبل میں ''خدا کا بیٹا مجازی معنی میں مستعمل ہے یعنی محبوب۔ اس کا ثبوت خود بائبل فراہم کرتی ہے۔ دیکھئے۔

''سرائیل خدا کا بیٹا ہے'' ''اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے'' (لاہوری نسخہ زبور۔ خروج باب ۴ آیت ۲۲)

''داؤد خدا کا بڑا بیٹا ہے۔'' ''اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا'' (باب ۸۹ آیت ۲۶۔۲۷)

''سلیمان خدا کا بیٹا ہے''۔ (تاریخ اول باب ۲۲ آیت ۹۔۱۰)

''قاضی مفتی خدا کے بیٹے ہیں''۔ (زبور باب ۸۲ آیت ۶)

''سب بنی اسرائیل خدا کے بیٹے ہیں''۔ (رومیوں باب ۹ آیت ۴)

''تمام یتیم بچے خدا کے لڑکے ہیں''۔ (زبور باب ۶۸ آیت ۵)

''بدکار لوگ خدا کے لڑکے ہیں''۔ (یسعیاہ باب ۳۰ آیت ۱)

اسی طرح کتاب مقدس یہ ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصلاً انسان کے بیٹے ہیں خدا کے حقیقی بیٹے نہیں مجازی فرزند ہیں۔ چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔

کے اس عمل سے سوامی جی بہت متاثر ہوئے۔ مہاتماجی نے واضح کیا کہ خواجہ صاحب ان اولین لوگوں میں تھے جنھوں نے قومی تحریک میں شمولیت اختیار کر کے کھادی کو اپنایا اور تب سے اب تک وہ اس پر عمل پیرا تھے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر خواجہ صاحب کو پرارتھنا سبھا میں متعارف کراتے ہوئے مہاتماجی نے کہا کہ خواجہ صاحب خلافت کے زمانہ کے ہندو مسلم اتحاد کے عہد کی یادگار ہیں اور اب بھی قوم پرور مسلمانوں کے سربراہ ہیں۔ دوسرے قوم پرور مسلمان جنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا وہی اب جامعہ ملیہ کے مثالی کارکن ہیں۔ وہ صحارا کے ریگستان میں نخلستان کی مانند ہیں۔ اگر آج کوئی خواجہ صاحب کو شہید کر دے تب بھی وہ اس کا برا نہیں چاہیں گے۔۔۔"

جب ۳/ جون ۱۹۴۷ء کے ماؤنٹ بیٹن پلان کے تحت سیاسی جماعتوں نے ملک کی تقسیم منظور کر لی تو خواجہ صاحب مہاتما گاندھی کے پاس پہنچے اور ان سے یقین دہانی چاہی کہ اگرچہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ منظور کیا جا چکا ہے تاہم قوم پرور مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اس بارے میں گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا میں کہا کہ۔ "خواجہ صاحب ایک اچھے مسلمان ہیں اور خود کو ایک اچھا ہندو بھی تصور کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنے آپ کو ایک اچھا ہندو مانتے ہوئے بھی خود کو ایک اچھا مسلمان سمجھتا ہوں۔ ان کی خواہش ہے کہ علاحدہ رائے دہندگی کو ختم کر دیا جائے تاکہ ہم دنیا کے سامنے ہندستان کی یونین کو ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ قانون کی نظر میں خواہ ہم مختلف مذاہب کے پیرو ہوں لیکن ہم رہیں گے ہندستان ہی کے شہری اور جو بھی ہندستان کے تئیں وفادار رہے گا وہ دوسروں ہی کی طرح یکساں حقوق کا حامل ہوگا۔ میں خواجہ صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ یقیناً ان تمام حقوق کے حامل ہوں گے۔ کم از کم ہم دو اشخاص تو ایسے ہیں جو ایک دوسرے کو مذہب اور خیر سگالی کا آدمی سمجھتے ہیں۔" انہی دنوں خواجہ صاحب نے گاندھی جی کے ایک دوست سے ازراہ مذاق کہا کہ "باپو جی ہمیں اس بڑھاپے میں ہندستان سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں اس لیے جب ہندستان تقسیم ہو جائے گا تو میں تمہاری پناہ میں آجاؤں گا کیونکہ تم مجھے ہندوؤں کے ہاتھوں مرنے نہیں دوگے۔" گاندھی جی نے یہ سن کر کہا کہ "اگر تمہیں کسی مذہبی صوفی نے قتل کر دیا تو میں خوشی سے ناچ اٹھوں گا لیکن میری بدنصیبی یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے جیسے لوگ بہت نہیں ہیں جو فنا ہوئے بغیر دلیری کے ساتھ مر سکیں اگر میرے ساتھ نصف درجن تم جیسے لوگ ہوتے تو جو شعلے ہمیں آج دھمکیاں دے رہے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے بجھ جاتے اور

(۱) یسوع مسیح ابن داؤد بن ابراہیم (متی ۱/۱)

(۲) انسان کا بیٹا کھاتا پیتا آیا۔ (متی ۱۱/۱۹)

(۳) مسیح اپنے تئیں ابن آدم کہتا ہے۔ (متی ۸/۲۰)

(۴) مسیح ابن آدم (متی ۱۲/۸)

یہ محبوبیت اور عزت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت اور کفارہ کو بے بنیاد ٹھہراتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تختۂ دار پر ان یہودیوں نے سازش کے تحت لٹکایا تھا جو حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت پر ایمان نہیں لائے تھے، وہ پھانسی دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حضرت مسیح جھوٹے مدعی نبوت ہیں اور اپنے دعوی میں سچے نہیں ہیں۔ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا جبکہ توریت کہتی ہے:

''جو دار پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے۔'' (استثنا ۲۱/۲۳)

فیصلۂ شریعت کے مطابق ملعون نبی نہیں ہوسکتا۔ لیکن پولوس نے اس مصلوبیت کو کُفارہ کا رنگ دے دیا۔ یہی غلط فہمی آج تک چلی آرہی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کو غلط قرار دیتا ہے۔ الغرض الامام النانوتویؒ نے کفارہ کے اعتقاد کو عقل کی میزان میں بے وزن تو ثابت کیا ہی خود ان کی الہامی کتاب بھی کفارہ کو تحریف والحاق باور کراتی ہے یہی حال عقیدۂ تثلیث کا بھی ہے جس کا ثبوت محرف توریت وانجیل بھی بہم نہیں پہنچاتی۔

تثلیث

الامام النانوتوی کا عقلی استدلال اس عقیدے کے سراسر خلاف عقل ہونے پر گزر چکا ہے۔ اس موقعہ پر الامام کے اس دعوی کا بائبل سے ثبوت فراہم کرنا ہے کہ عقیدۂ تثلیث انجیل میں الحاقی ہے۔

یوحنا باب پانچ درس ۷ میں ہے کہ:

''تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں''۔

بحوالہ مباحثہ ۳۹

۱۸۷۰ء میں مرزاپور کی بائبل سوسائٹی نے جو اردو بائبل شائع کی اس میں اس درس کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے کہ...... ''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''

ہندوستان میں فوری طور پر امن قائم ہو جاتا۔"

ایک اور پرارتھنا سبھا میں خواجہ صاحب کے بارے میں بولتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا کہ "وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئے اب چونکہ ایسا ہو رہا تھا وہ اظہار افسوس کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم آنسو نہیں بہائیں گے اور میں نے انھیں ہنسا دیا۔"

تقسیم وطن کے ایک حقیقت بن جانے کے بعد دوسرے مسلمانوں کی طرح خواجہ صاحب کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تو گاندھی جی نے ایک خط میں لکھا "مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ ہم ملک کو تقسیم کر کے کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم غلطیوں کے بعد غلطیاں کرتے جا رہے ہیں۔"

کسی اور شخص کو ایک خط میں خواجہ صاحب کی زندگی کو خطرہ سے دوچار بتاتے ہوئے مہاتما گاندھی نے لکھا کہ انھیں اس اطلاع سے انتہائی دکھ پہنچا تھا "کتنا اچھا ہوتا کہ کوئی شخص خواجہ صاحب کو واقعی شہید کر دیتا اور وہ ایسے شخص ہیں کہ بڑی دلیری کے ساتھ خوشی خوشی اللہ کا نام لیتے ہوئے اپنی جان دے دیتے۔"

۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن سے جامعہ کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس کے دو ادارے جو شہر میں تھے یعنی ادارہ تعلیم و ترقی اور مکتبہ جامعہ بالکل برباد ہو گئے اور ان کا لاکھوں کا اثاثہ ضائع ہو گیا البتہ جامعہ نگر کے ادارے اس تباہی سے بچ گئے تاہم ان میں طلبہ کی تعداد خاصی کم ہو گئی لیکن امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ اور ان کے رفقاء کار اور کارکنوں کی اولوالعزمی اور ہمت سلامت رہی اور ان کے پائے استقامت کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی۔ ان کے نتیجہ میں جو کام بند ہو گئے تھے وہ پھر جاری ہو گئے۔ آزاد ہندوستان میں تعلیم و ترقی کے ایک مرکز کی جگہ پانچ مرکز قائم ہو گئے۔ مکتبہ جامعہ کو پانچ لاکھ روپے کے سرمایہ سے لمیٹڈ کمپنی بنا دیا گیا۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ترقی سے ہمکنار ہو گیا۔ ہوسٹل کی عمارت تعمیر ہو گئی اور دوسرے تمام تعلیمی ادارے بھی اپنی اصل حالت پر واپس آ گئے۔ جامعہ کی اسناد کو بیشتر یونیورسٹیوں اور حکومت نے تسلیم کر لیا۔

تقسیم وطن تک جامعہ کی آمدنی کے دو ذرائع تھے۔ دیسی ریاستیں اس کی امداد کرتی تھیں اور عوام اسے چندے دیا کرتے تھے لیکن اپریل ۱۹۵۱ء کے بعد چندوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اس کے باوجود عوام نے اپنی جانب سے اس کی مالی امداد کو ختم نہیں کیا۔ بعد ازاں حکومت نے جامعہ کو تنخواہیں دینے کے لیے امداد شروع کر دی اور ۱۹۵۴ء میں حکومت نے جامعہ کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لینے کا فیصلہ کیا بشرطیکہ جامعہ کی مجلس منتظمہ میں

پادری نولس نے اس فقرہ کو زائد تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے:

بے شک یہ فقرہ زائد ہے اور جو کچھ پادریان مرزاپور نے حاشیہ میں لکھا صحیح و درست ہے۔

(مباحثۂ شاہجہاں پور ص:۴۱)

ظاہر ہے کہ کسی ایک فقرہ کو الحاقی تسلیم کر لینے کے بعد بائبل مشکوک الصحت ہو جاتی ہے اور اس الحاق کی تائید ہوتی ہے کہ عقیدۂ تثلیث اضافہ ہے۔ (دیکھئے: یمتھیس باب ۲ درس ۵)

''کیونکہ خدا ایک ہے''۔

وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ (دیکھئے: یرمیاہ: ۲۳/۲۴)

کیا کوئی آدمی پوشیدہ جگہوں میں چھپ سکتا ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں، خداوند فرماتا ہے کیا زمین و آسمان مجھ سے معمور نہیں؟

خدا قادر مطلق ہے۔ ساری کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ (دیکھئے: متی ۱۹/۲۰ بحوالہ خوشحال زندگی کی راہ ص ۸ مطبوعہ نئی دہلی) وہ ہر چیز پر حاوی ہے ساری چیزیں اس کے قبضہ میں ہیں۔ خدا کے بیٹے یسوع مسیح نے خود کہا ہے خدا سے سب ہو سکتا ہے۔

خدا پر ہر چیز منکشف ہے اور وہ عالم الغیب ہے۔ (دیکھئے: امثال ۱۵/۳)

خداوند کی آنکھیں ہر جگہ ہیں اور نیکیوں اور بدوں کی نگراں ہیں۔

خدا ازلی و ابدی ہے اور وہی واجب الوجود ہے۔ (دیکھئے: زبور ۹۰/۲)

اس سے پیشتر کہ پہاڑ پیدا ہوئے یا زمین اور دنیا کو تو نے بنایا ازل سے ابد تک تو ہی خدا ہے۔

خدا کی ذات و صفات میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔ (دیکھئے: ملاکی ۳/۶)

میں خداوند لاتبدیل ہوں۔

پولوس رسول توحید کا اقرار کرتے ہوئے کہتا ہے:

اگرچہ فضا میں اور زمین پر ایسے ہیں جو خدا کہلاتے ہیں چنانچہ یوں بہتیرے خدا اور بہتیرے خداوند ہیں لیکن ہمارے نزدیک فقط ایک ہی خدا ہے یعنی باپ۔ (ا۔ کرنتھیوں ۸/۵)

اس سے آگے کہتا ہے:

جس کی طرف سے چیزیں ہمیں ملیں اور اسی کے ہم ہیں۔ (ا۔ کرنتھیوں ۸/۶)

وزارت تعلیم کا ایک نمایندہ شامل کیا جائے اور جامعہ کے حسابات کو جانچنے اور اس کے اخراجات کا یقین کرنے کی غرض سے مالیات کی کمیٹی کا قیام عمل میں آئے جس میں دو نمایندے جامعہ کے، ایک نمایندہ وزارت تعلیم کا اور ایک نمایندہ وزارت مالیات کا شریک کیا جائے۔

مدرسہ ابتدائی میں پہلی سے چھٹی جماعت تک تعلیم دی جاتی رہی۔ مدرسہ ثانوی میں ساتویں جماعت سے دسویں جماعت تک تعلیم جاری رہی اور کالج میں اسلامیات، اردو، ہندی انگریزی، معاشیات اور تاریخ وسیاسیات کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ ذریعہ تعلیم اردو ہی رہا۔ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ ایک مخصوص امتحان کے بعد داخلے کے مجاز ٹھہرائے گئے۔ مقیم طلبہ کی ماہانہ فیس ابتدائی سے کالج تک پینتالیس روپے طے ہوئی۔ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کے مقیم طلبہ سے تیس روپے فیس مقرر ہوئی۔

یونی ورسٹیز کمیشن نے جامعہ کو دیہی یونی ورسٹی بنانے کی سفارش کی اس لیے امیر جامعہ اور شیخ الجامعہ نے پروفیسر عاقل کو اس سلسلہ میں معلومات حاصل کرنے اور دیہی یونیورسٹی کی منصوبہ سازی کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان بھیجا وہاں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دیہی یونی ورسٹی کے لیے جس عملہ اور ساز وسامان کی ضرورت تھی اسے فوری طور پر فراہم کرنا ممکن نہ تھا اس لیے ایسے اداروں کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے جو ترقی کی منزلیں طے کرنے کے بعد خود ہی دیہی یونی ورسٹی بن جائیں۔ اس تحقیقی مطالعہ کے بعد اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے تین اداروں کی اسکیمیں بنا کر حکومت کو پیش کردی گئیں اور بعد ازاں ان میں سے پہلا ادارہ دیہی معاشیات اور اجتماعیات کا قائم ہوا۔ دوسرا ادارہ ادارۂ تاریخ وسیاسیات اور تیسرا ادارہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم ہوا۔ استادوں کا مدرسہ اور ادارہ تعلیم وترقی پہلے ہی سے ایسا کام کر رہے تھے جو دیہی یونی ورسٹی کا جزو تھے۔

تقسیم وطن کے بعد بہت سے گوشوں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ جامعہ کا نام بدل دینا چاہیے لیکن ارباب جامعہ نے اس تجویز کو کبھی منظور نہیں کیا اور یہ طے کیا کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی رہے گا۔ جامعہ نہ اپنا کوئی کام چھوڑے گی نہ اپنا نام ہی بدلے گی بلکہ کام کرنے والوں کے حوصلوں کے پیش نظر نئے نئے کام شروع کرتی رہے گی۔" اس میں اعلا تعلیم کا ایک شعبہ ہوگا جو دیہی یونی ورسٹی کے فرائض انجام دے گا۔" انھوں نے علی الاعلان یہ کہا کہ "ہم اپنا دینی نقطہ نظر نہیں بدلیں گے' قومی نقطہ نظر نہیں بدلیں گے۔ سیاست میں ہم آزاد رہیں گے اور اپنے اندرونی نظام میں بھی اسی طرح آزاد رہیں گے جس طرح اب آزاد ہیں۔ یعنی اساتذہ اور کارکنوں کو اپنے کام میں جو آزادی حاصل ہے اور جامعہ میں جو

پولوس رسول یہ بھی کہتا ہے کہ:

خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ میں ایک آدمی بھی درمیانی ہے اور وہ یسوع مسیح ہے جو انسان ہے۔ (ا۔ تیمتھیس ۲/۵)

توحید کی مزید وضاحت کرتا ہے:

سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔ (افسیون ۴/۵)

یہ چند حوالے عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید سے نقل کئے گئے ہیں جو خدا کی وحدت، وحدانیت اور بساطت کے ثبوت کیلئے کافی ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں تو بے شمار مواقع پر توحید اور باری تعالیٰ کی صفات کا اقرار کیا گیا ہے اور شرک و بت پرستی کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے بلکہ اس کی بھی صراحتیں موجود ہیں کہ بنی اسرائیل کو شرک و بت پرستی اور دیگر بداعمالیوں کے نتیجے میں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ راقم کی کتاب ''توریت اور یہود اپنے آئینے میں'' تفصیل کیلئے دیکھی جا سکتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تثلیث کے تعلق سے الامام کے چند فقروں کو سنا کر تحریف کا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ الامام النانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اب ذرا کان دھر کے سنئے! کہ نصاریٰ جیسے اس بات کے قائل ہیں کہ عالم کے خدا حقیقت میں تین ہیں، ویسے ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وہ تینوں حقیقت میں ایک بھی ہیں۔ اور اس بات کے اثبات کیلئے سوا اس کے کہ انجیل میں ہے یا ہم اپنے باپ دادوں سے سنتے چلے آئے ہیں، کوئی دلیل بیان نہیں کرتے۔ اور ادھر عقل کے نزدیک تین کا حقیقۃً ایک ہونا اور ایک کا تین ہونا ایسا ظاہر البطلان ہے کہ جیسا دن کا رات ہونا اور رات کا دن ہونا بلکہ اس سے بھی زیادہ، حتی کہ عقل کے نزدیک ظاہر البطلان ہونے میں اس سے زیادہ نہیں، یہاں تک کہ دو کے ایک ہونے کے محال ہونے میں اور اسی طرح چار، پانچ، چھ، سات وغیرہ کے ایک ہونے کے باطل ہونے میں نصاریٰ بھی سارے جہاں کے شریک ہیں۔ پر تین کے ایک ہونے میں انجیل کے مقابلے میں کسی کو تو کیا اپنی عقل کی بھی نہیں سنتے۔'' (تقریر دل پذیر ص ۳۲۔۳۳، مطبوعہ شیخ الہند اکادمی دیوبند)

جمہوریت موجود ہے وہ بدستور باقی رہے گی۔"

خواجہ صاحب کے دور امارت میں جامعہ کی شہرت بیرونی ممالک میں بھی عام ہوئی۔ اسی لیے ہندستان میں جب بھی کوئی بیرونی وفد یا تعلیمی ماہر آیا اس نے جامعہ کی سیر ضرور کی۔ ان میں چینی خیر سگالی وفد، ترکی پریس وفد، یوگوسلاویہ خیر سگالی وفد، ایرانی پریس وفد شامل تھے۔

۱۹۶۰ء میں جامعہ کے خلاف اخبارات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو پارلیمنٹ میں بھی بحث کا موضوع بن گیا تو خواجہ صاحب نے ایک کمیشن کے ذریعہ اس کی تحقیقات کروا کر سبھی مخالفین وناقدین کو مطمئن کر دیا۔

قاضی عبدالغفار جامعہ سے متعلق رقم طراز ہیں کہ

"جامعہ اپنے قیام کے وقت کاغذ کی ناؤ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی اور نئے نوجوان ملاحوں کا قافلہ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کشاکش سے نکال کر اسے ایک ایسی بندرگاہ تک لے آیا جہاں سے ہر سال مسلمانوں کی ایک نسل علم وعمل کا پیام لے کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل رہی ہے۔"

اور اس کے قافلہ سالار تھے عبدالمجید خواجہ۔ امیر جامعہ کی حیثیت سے انھوں نے جامعہ کے انتظامی معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کی بلکہ انھیں شیخ الجامعہ اور جامعہ والوں پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ انھیں ان پر پورا اعتماد تھا البتہ جب بھی ان سے مشورہ طلب کیا جاتا تو وہ بڑے خلوص کے ساتھ اس سے نوازا کرتے تھے۔ ان کے دور امارت میں جامعہ کو یونی ورسٹی کا درجہ ملا اور اس نے ترقی کی تمام تر منزلیں طے کیں۔ تاہم انھیں اصرار تھا کہ ان کی ضعیفی اور علالت کے پیش نظر انھیں جامعہ کے کاموں سے سبکدوش کر دیا جائے لیکن جامعہ والوں نے اسے کبھی منظور نہیں کیا آخر کار ۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو علی گڑھ میں ان کی شمع حیات گل ہو گئی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

خواجہ صاحب کے انتقال پر اخبارات میں جو تعزیتی اداریے لکھے گئے ان میں مرحوم کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے حالات زندگی کے متعلق لکھا۔ "علی گڑھ سے اخلاص ترکے میں پایا تھا، ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے، شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتداء تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ برابر کے سہیم وشریک تھے۔ علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے، کیمبرج سے بی اے کیا، لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے، واپسی پر

تحریف

الامام النانوتوی نے میلۂ خداشناسی میں انجیل کومحرف قرار دیا اور پادری نولس سے تحریف کا اقرار بھی کرایا۔اس مباحثہ کے علاوہ ''تقریر دل پذیر'' وغیرہ میں بھی الامام نے تحریف کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اور موجودہ اناجیل کو خدا کی کتاب ماننے سے گریز کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی شہادت کے ساتھ ساتھ بائبل کے اندرونی اختلافات اور متضاد عبارتوں پر الامام کی گہری اور وسیع نظر تھی۔گو ہمیں تحریری طور پر مفصل گفتگو دستیاب نہیں ہوسکی لیکن اناجیل کی تاریخ تدوین کے تعلق سے الامام نے جو سوالات پیش کئے ہیں وہ بجائے خود اس موضوع پر دستگاہ کامل کا پتہ دیتے ہیں۔ہم ذیل میں انھی سوالات کی روشنی میں سب سے پہلے مسیحی علماء کی تحریریں اختصار کے ساتھ عہد نامۂ جدید (اناجیل) کے تعلق سے پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنی مقدس کتابوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

پادری ڈبلو.ایچ گرڈز صاحب لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ انجیل یا کوئی کتاب مسیح پر نازل ہوئی وہ خود کلام تھا یہ نہیں کہ کلام اس کے پاس تھا۔'' (الہام:۵۰)

یہ مسئلہ تو صاف ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر کلام خداوندی نازل نہیں ہوا تھا اور رہی بات حضرت مسیح علیہ السلام کے سراپا کلام ہونے کی وہ اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کلام نہیں تھے کلام ان پر نازل ہوتا تھا۔(دیکھئے:یوحنا۱۵/۱۵)

اس لئے جو باتیں میں نے باپ سے سنیں وہ سب تم کو بتادیں۔

اسی یوحنا میں دوسرے موقعہ پر ہے کہ:

''میں نے تیرا کلام انہیں پہنچادیا۔'' (یوحنا۱۷/۱۴)

اسی یوحنا میں یہ بھی ہے کہ:

''کیونکہ جو کلام تو نے مجھے پہنچایا وہ میں نے ان کو پہنچایا''۔(یوحنا:۱۷/۸)

ان حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کلام نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنا کلام نازل فرمایا:

اس سے بھی زیادہ صاف وصریح اور غیر مبہم الفاظ یہ ہیں۔

بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں، اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ آخر میں سالہاسال سے پھر علی گڑھ آگئے اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہوگئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہاک صحت سخت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔"

روزنامہ قومی آواز نے لکھا:

"خواجہ صاحب بہت پکے مسلمان تھے اور اتنے ہی پکے قوم پرور بھی تھے۔ وہ اس زمانے کی بہت سی اصلاحوں اور آزادیوں کے خلاف تھے اور پرانی روایات اور اقدار کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی پابندیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور نئی نسل کو اسی راہ پر تربیت دینا چاہتے تھے۔"

ہفتہ وار ندائے ملت نے لکھا:

"تحریک خلافت کے علاوہ جنگ بلقان وطرابلس میں ترکوں کی حمایت کی تحریک اور آزادی کی جملہ تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جیل بھی گئے اور دوسری قربانیوں کے میدان میں بھی آگے رہے۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے اعلا عہدوں پر فائز رہے، ایک زمانے میں تو کانگریس کے سکریٹری بھی رہے آپ کی کوٹھی سمیع منزل ہمیشہ سیاسی اور علمی وادبی مجلسوں کا مرکز رہی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۷ برس تھی۔"

جامعہ میں خواجہ صاحب کی یاد میں جو تعزیتی جلسہ ہوا، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے ان کی قومی خدمات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"خواجہ صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھی تھے، پنڈت جی کی طرح خواجہ صاحب بھی ایسے باپ کے بیٹے تھے، جنھوں نے بڑی دولت چھوڑی تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنی یہ دولت آزادی پر نچھاور کر دی، مسلم لیگ کا اس زمانے میں مسلمانوں پر جادو چل گیا تھا، خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو سمجھتے تھے کہ اس سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا اور ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہوگی، اس لیے وہ تقسیم کی مخالفت کرتے تھے، خواجہ صاحب نے مسلم مجلس قائم کی۔ مسلمانوں کے بہت سے لیڈر مسلم لیگ کی مخالفت کیا کرتے تھے، مگر احتیاط کے ساتھ، لیکن خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو احتیاط کو جانتے ہی نہیں تھے، بے دھڑک اور بے لاگ کہتے تھے، ان کی تنقیدوں میں جوش اور غصہ نہیں ہوتا تھا مگر وہ بے لاگ ہوتی تھیں ـــ خواجہ صاحب کی خدمات میں جو زندہ رہیں گی ان میں جامعہ ملیہ ہے جو ان کے خلوص اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہے۔"

کیونکہ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کا حکم ہمیشہ کی زندگی ہے بس جو کچھ میں کہتا ہوں باپ نے جس طرح مجھ سے فرمایا ہے اسی طرح کہتا ہوں۔ (یوحنا ۱۲/ ۵۰۔۴۹)

اس جملہ معترضہ کے بعد انہی پادری ڈبلیو ایچ گرڈز کی تحقیق سماعت فرمائیے:

یوحنا کے مکاشفہ کے علاوہ ایک بھی کتاب انجیل میں نہیں ہے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس کے مصنف پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے یا اس کے مصنف کو خدا نے لکھنے کیلئے مامور کیا تھا۔ مقدس پولوس کے خطوط کی مانند چند کتابوں میں بے شک صفائی سے الٰہی ہدایت کے زیر اثر ہو کر لکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن دیگر کتابوں میں جن میں چند نہایت ضروری کتابیں شامل ہیں۔ مصنف نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ان کے مصنفوں نے یونہی یا اپنی مرضی سے حسب موقع ان کو تحریر کیا ہے۔ الہام ص ۴۴

ایک دوسرے پادری ڈاکٹر ایچ یوسٹینٹن صاحب لکھتے ہیں:

اناجیل اربعہ کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند مسیح کے بعض اقوال اور اس کی زندگی کے واقعات کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ (دیباچہ تغیر متی ص ۱۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ انجیل جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل کی تھی وہ ضائع ہو گئی اور موجودہ اناجیل اربعہ میں عرصہ دراز کے بعد سنے سنائے اقوال کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد مسیحیوں کے خیال میں اتنے ناخواندہ اور پسماندہ تھے کہ ان کو صحت کے ساتھ مرتب نہ کر سکے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے عقل بھی تھے۔ ملاحظہ فرمائیے پادری ڈاکٹر جیمس سٹاکر کے الفاظ:

(مسیح) جس کو وہ اپنے پیچھے اپنا قائم مقام ہونے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ وہ ناخواندہ چھوٹے تھے اور عموماً سب صاحب عقل نہ تھے۔ (حیات پولوس ص: ۶)

یہ خیالات اناجیل کے پورے مجموعے سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ اناجیل اربعہ، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا پر عیسائی محققین نے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان مصنفین کے حالات اور سن تصنیف لامعلوم ہیں۔ یہی حال عہد نامہ جدید میں شامل پولوس کی

کتاب اعمال اور اس کے خطوط کا بھی ہے جس میں کوئی تاریخی ترتیب نہیں ہے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ اس لئے اسی مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کرتے ہوئے چند اندرونی شہادتیں ملاحظہ فرمائیے جو تحریف وتبدل اور اختلاف وتضاد کی آئینہ دار ہیں۔

(۱) چونکہ بنی اسرائیل میں نسب نامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے متی نے اپنی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ تحریر کیا ہے۔ پہلے باب کے درس ۱۵ میں حضرت مسیح کے باپ یوسف کے باپ کا نام یعقوب بتایا ہے یعنی دادا کا نام یعقوب تھا۔ اس کے بالکل متضاد لوقا نے اپنی انجیل میں دادا کا نام عیلی بتایا ہے۔ (دیکھئے: لوقا ۳/۲۴)

(۲) متی نے اپنی انجیل میں لکھا ہے کہ سلیمان کی اولاد میں سے یوسیاہ پیدا ہوا اور اس سے یکونیا پیدا ہوا اس سے سیالتی ایل پیدا ہوا۔ متی ۱/۷۔۱۲ یعنی سیالتی ایل کا باپ یکونیاہ تھا اور اس کا باپ یوسیاہ لیکن لوقا کہتا ہے سیالتی ایل کا باپ نیری تھا۔ اس کا باپ ملکی تھا۔ (لوقا ۳/۲۷۔۳۱)

دونوں میں کس نسب نامہ کو صحیح مانا جائے اور کس کو غلط؟ کیا اس کے باوجود انجیل کو معتبر مانا جاسکتا ہے؟

(۳) متی ۱۹/۱۷ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت مسیح کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا ''اے نیک استاد میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟'' حضرت مسیح نے فرمایا تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک خدا''...... حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ جواب زبور (۱۱۹/۶۷) کے مطابق تھا کہ ''خدا نیک ہے'' کوئی انسان خدا کے حضور راستباز نہیں اور زبور (۱۴۳/۲) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن زبور کے اس حوالہ کو بائبل مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں یوں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ''نیک استاذ'' کی جگہ صرف ''استاذ'' نیک کو اڑا دیا گیا اور ''تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے'' کے بجائے یہ تحریف کی گئی کہ ''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے؟'' یہ تحریف کیوں کی گئی تا کہ تضاد رفع کیا جاسکے؟ لیکن اس تحریف سے مقصد رسالت ہی فوت ہو گیا۔

(۴) حضرت مسیح علیہ السلام کا متی اور مرقس میں ارشاد ہے کہ:

> جس نے میرے نام سے گھر بھائی یا بہن یا ماں یا باپ یا جورو کو چھوڑا سو گنا پاوے گا۔ (متی ۱۹/۳۰، مرقس ۱۰/۲۹)

ڈاکٹر سید عابد حسین

۱۸۹۶ تا ۱۹۷۸ء

سید عابد حسین ۲۵ رجولائی ۱۸۹۶ء بروز ہفتہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد حامد حسین ملازم تھے اور دادا سید مہدی حسین تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ دراصل ان کے اجداد ترمذ سے ہندوستان آکر دائی پور میں آباد ہو گئے تھے جو قنوج سے قریب واقع ایک گانو ہے عابد صاحب کا تاریخی نام منظور حسین تھا ویسے والدین انھیں پیار سے چنو میاں کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جہانگیریہ اسکول بھوپال میں حاصل کی جو اردو کے قاعدہ اور دوسری کتاب پر مشتمل تھی۔ ناظرہ قرآن اور ابتدائی عربی وفارسی کے اسباق گھر پر ایک مولوی صاحب نے پڑھائے۔

بچپن ہی میں ان پر چیچک کا شدید حملہ ہوا جس سے معالجوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں وہ بصارت سے محروم نہ ہو جائیں۔ اگرچہ بصارت تو محفوظ رہی لیکن صحت یابی کے بعد ان کے اعصاب اس درجہ کمزور ہو گئے کہ بات کرنے میں زبان اٹکنے لگی۔ علاج کے باوجود زبان کی لکنت باقی رہی جو زندگی بھر قائم رہی۔ اسی دوران انھیں ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنے آبائی وطن دائی پور جانا پڑا تو وہ وہیں کے ہو رہے اور ان کا داخلہ پرائمری اسکول میں کرادیا گیا۔ گیارہ برس کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ سانحہ ان پر اس قدر گراں گزرا کہ وہ تنہائی پسند ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ وہ گیارہ برس کے بچے تھے لیکن تنہائی کی زندگی کے ساتھ ساتھ شاید اپنے آپ میں ڈوبے رہنے کی عادت نے ان کے اندر بلوغ کے عمل کو قبل از وقت شروع کر دیا تھا۔ خود ان ہی کے الفاظ میں "اس لیے کہ مجھ میں ایک حد تک انفرادیت کا شعور اور کچھ مبہم سا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں سیلِ حیات میں محض ایک تنکا نہیں ہوں کہ بے حسی اور بے بسی کے عالم میں بہتا چلا جاؤں بلکہ میرے اندر یہ قوت موجود ہے کہ سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر اپنی زندگی کے

نئے ایڈیشنوں سے جورو کا لفظ نکال دیا گیا ہے۔ سو گنا جورو دیئے جانے پر بعد میں غور وفکر کیا ہوگا کہ اس طرح تو ہر شخص کو ایک کے بجائے سو بیویاں ملیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ نیقیہ کی کانفرنسوں سے لیکر یہ سلسلہ اب تک جاری ہے کہ ہر نئے ایڈیشن میں تحریف کی جاتی ہے اور عقائد میں بھی ردوبدل کیا جاتا ہے۔ اگر صرف مشینی دور کی تحریفات کی تفصیل پیش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی۔ چند تحریفات کا ایک نقشہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

	انجیل مطبوعہ ۱۸۹۵ء	انجیل مطبوعہ ۱۹۰۸ء	انجیل مطبوعہ ۱۹۴۷
۱	میں متی ۱۸/۱۱ آیت موجود ہے	یہ آیت غائب ہے،	میں دوبارہ ڈال دی گئی۔
۲	متی ۱۷/۱۱ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ ڈال دی گئی۔
۳	متی ۲۳/۱۴ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ قوسین میں لکھ دی گئی۔
۴	مرقس ۷/۱۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۵	مرقس ۹/۴۴۔۴۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۶	مرقس ۱۱/۲۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۷	لوقا ۲۳/۱۷ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۸	لوقا ۱۷/۲۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۹	یوحنا ۵/۴ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۱۰	اعمال ۸/۳۷ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔

یہ تحریفات صرف تین مطبوعات سے بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ چند ایڈیشنوں کا مزید مقابلہ کیا جائے تو تحریفات کی تعداد کتنی ہوگی نہیں کہا جاسکتا۔ الامام النانوتویؒ نے تحریف کے سلسلہ میں جو سوالات قائم کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کیلئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو کم وبیش ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ الامام النانوتوی کے سوالات کی الگ سے تحقیق پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔ سردست الامام النانوتویؒ کی استدلالی فکر کے زاویوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی پر اکتفا کرتے ہوئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ:

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے

بہاؤ کا رخ اور اس کی رفتار معین کروں...... میرا ماحول گھر کے باہر صرف گانو تک یا اسکول تک محدود تھا اور اس کے اندر جو تجربے مجھے ہوئے تھے ان کی بنا پر میری چشم تخیل کبھی مجھے ایک نہایت اچھے اور کامیاب کاشتکار کی شکل میں دیکھتی تھی اور کبھی ایک اعلا درجے کے معلم کی شکل میں۔"

عابد صاحب اپنے خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے کے باوجود ہر جماعت میں اول آتے رہے اور امتیازی نمبر پاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی تعلیم کا باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ہوا اور انھیں بھوپال کے جہانگیریہ اسکول کے پانچویں درجے میں داخل کرادیا گیا اور ۱۹۱۵ء میں جب وہ نویں درجے میں پہنچے تو ان کے دادا نے انھیں ٹائپ رائٹنگ سیکھنے کا حکم دیا تاکہ دو سال کے عرصہ میں وہ ایک مشاق ٹائپسٹ بن جائیں اور میٹریکولیشن پاس کرتے ہی کسی دفتر میں ملازم ہو جائیں لیکن اس سے پہلے ہی ان کے دادا کا انتقال ہوگیا اور ان کے والد نے انھیں ٹائپ رائٹنگ کے عذاب سے آزاد کردیا اس کے باوجود کہ وہ ہر جماعت کے مانیٹر مقرر ہوتے تھے اور اسکول میں ہاکی اور ٹینس کھیلنا ان کے مشاغل میں شامل تھا ان کی کم آمیزی اور خلوت گزینی کا وہ رجحان جو دائی پور کی دین تھا اور بھی قوی ہوگیا اور تنہائی کے تکلیف دہ احساس میں بھی اضافہ ہوگیا۔ تاہم انھوں نے ۱۹۱۶ء میں بیس برس کی عمر میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ اس سال پانچ ہزار طلبہ میں سے سترہ سو طلبہ ہی کامیاب ہوسکے تھے اور ان میں سے بھی صرف سات طلبہ اول ڈویژن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے ان ہی میں ایک عابد صاحب بھی تھے۔

میٹریکولیشن کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرلینے کے بعد عابد صاحب نے میور سینٹرل کالج الہ آباد میں داخلہ لے لیا جو شمالی ہند کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا تھا انھوں نے انٹرمیجیٹ میں انگریزی زبان وادب کے علاوہ کیمیا، طبعیات اور ریاضی کے مضامین لیے تھے اس لیے انھیں انٹرمیجیٹ کے امتحان میں اول درجے کے نہیں بلکہ دوسرے درجے کے نمبر ملے۔ لہٰذا انھوں نے بی اے میں اپنے مضمون بدل دیے اور انگریزی ادب کے ساتھ فارسی ادب اور فلسفہ لے لیا اس تعلیم کے لیے ریاست بھوپال سے انھیں تیس روپے ماہوار کا وظیفہ ملنے لگا جس سے ان کے ہوسٹل میں قیام کرنے کی

مولانا اسعد اسرائیلی (فاضل دیوبند)*

ہندوستانی غیر مسلموں کے اشکالات اور حضرت نانوتوی کے جوابات

نوٹ: یہ مقالہ محترم مولانا اسعد اسرائیلی کے وقیع وطویل مقالے کا ایک حصہ ہے جو اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکمل مقالے کو کتاب کی شکل میں بھی تنظیم کی طرف سے جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ (ادارہ)

اس مقالے میں ہندوستانی غیر مسلموں سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے دور میں ہندو دھرم کے پرچار کے لئے اسلام کی مخالفت کر رہے تھے، مسٹر تارا چند (جس سے حضرت نانوتوی کا پہلا مناظرہ ہوا) جیسے ہندستانی غیر مسلم جو یہاں عیسائیت کا پرچار کر رہے تھے اس مقالے کے موضوع سے خارج ہیں، اس اعتبار سے جہاں تک ہندستانی غیر مسلموں سے مباحثہ ومناظرہ کا تعلق ہے حضرت نانوتوی کا پہلا مباحثہ قیام دار العلوم دیوبند کے ۹ سال بعد ۷ رمئی ۱۸۷۶ء کو چاندا پور (شاہ جہاں پور) میں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل میلۂ خدا شناسی کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس واقعہ کا پس منظر اور واقعات مختصراً اس طرح ہیں۔

۱۸۷۵ء میں بنارس سے سوامی دیانند کی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" شائع ہوئی، اس سے قبل سوامی دیانند کا چرچا سارے شمالی ہندوستان میں ہو رہا تھا، اخبارات میں ان کے لکچرز اور بیانات شائع ہو رہے تھے، سوامی جی اسلام اور عیسائیت دونوں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے، ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں بھی دونوں مذاہب پر متعدد اعتراضات کئے گئے تھے، مسلمانوں کے بارے میں اُن کا یہ فقرہ مسلمانوں میں سخت اشتعال پھیلا رہا تھا کہ مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی اور جینی

---

* ہلالی سرائے، سنبھل ضلع مرادآباد (یوپی)

گنجایش نکل آئی۔ ہوسٹل کی زندگی اور دوستوں اور رفیقوں کی دلچسپ شرارتوں نے ان کے احساس تنہائی کو بہت حد تک کم کر دیا۔الہ آباد کے دوران قیام میں عابد صاحب کو پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائڈو، گاندھی جی اور اکبرالہ آبادی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے مواقع فراہم ہوئے۔اگرچہ اسکول کے زمانہ میں وہ برطانوی حکومت کے دل سے وفادار تھے لیکن جلیانوالا باغ کے المیہ کا حال پڑھ کر اور نہرووں کے خیالات سے متاثر ہو کر''اس وفاداری کی جڑیں ہل گئیں اور قوم سے وفاداری کا بیج دل کے کسی کونے میں پڑ گیا۔''

بی اے کے امتحان میں انھیں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی اور وہ اول نمبر میں پاس ہوئے۔دراصل اس سال بی اے میں صرف تین امیدواروں کو فرسٹ ڈویژن ملا تھا اور ان میں ایک عابد صاحب تھے۔کالج میں اپنی زندگی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ''میری زندگی ایک کھلی کتاب تھی اس لیے مجھے بے حد اہتمام کرنا پڑتا تھا کہ میرے قول وفعل پر کسی کو نکتہ چینی کا موقع نہ ملے۔چنانچہ عام طور پر چھوٹے بڑے سب مجھے حسن خلق کا نمونہ سمجھتے تھے اور ان دنوں میں بھی اپنے آپ کو ایسا سمجھتا تھا...''

بی اے میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر بھوپال کے پرنس حمید اللہ خاں کی توجہ عابد صاحب کی طرف مبذول ہوئی اور انھوں نے عابد صاحب کو بلا کر ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ ریاست کو اچھے انگریزی دانوں کی ضرورت ہے اس لیے وہ علی گڑھ کالج سے انگریزی میں ایم اے پاس کرلیں۔اس سلسلہ میں انھوں نے تیس روپے ماہوار کے وظیفہ کی پیش کش کی اور تیس روپے جو انھیں وظیفہ کے طور پر ملتے تھے انھیں بھی جاری رکھنے کا وعدہ کیا۔اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عابد صاحب نے علی گڑھ کے ایم۔اے او کالج میں ایم اے میں داخلہ لے لیا۔اس سلسلہ میں رشید احمد صدیقی نے ان کی بڑی مدد کی۔رشید صاحب ہی کے مکان پر انھوں نے پہلی بار ذاکر صاحب کو دیکھا اور ان کی صرف ایک ہی ملاقات نے ان کے دل کو موہ لیا۔عابد صاحب کے اپنے الفاظ میں''انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دل کش شخصیت کے بارے

چھوٹے بت پرست ہیں۔ یہ فقرہ آج بھی اُن کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں موجود ہے۔ پنڈت جی کے اس طرح کے اعتراضات والزامات سے مسلمانوں میں سخت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کتاب کا کوئی باقاعدہ جواب بھی نہیں آیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی طرف سے اس کا جواب ''حق پرکاش'' ۱۹۰۷ء میں منظر عام پر آسکا۔

ہندوستان میں اسلام پر اعتراضات کی شروعات سب سے پہلے مرادآباد کے ایک شخص پنڈت اندرمن نے کی، جو تھوڑی بہت اردو اور فارسی کے ذریعے اسلامی تعلیمات وروایات کا مطالعہ کر سکے تھے۔ پنڈت اندرمن نے اسلام اور مسلمانوں پر حملے شروع کیے۔ مرادآباد ضلع میں قصبہ بچھرایوں کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب اُن کے مقابلے میں ہندو مذہب کی تعلیمات وروایت کو موضوع بحث بناتے تھے۔ مولانا بچھرایونی کی کتاب سوط الله الجبار ہندوستان میں پہلی تصنیف تھی جس میں پنڈت اندرمن کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیا گیا تھا، اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں تحفة الهند ایک نومسلم بزرگ کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی، جو اسی موضوع پر تھی۔

پنڈت اندرمن اپنی کم علمی اور مفلسی کی وجہ سے اپنی تحریک کو زیادہ نہیں پھیلا سکے، وہ تقریر کی صلاحیت سے بھی محروم تھے، اس لئے جلسوں سے خطاب نہیں کر سکتے تھے۔ اہل مرادآباد کی کوشش سے پنڈت جی کی کتب پر پابندی بھی لگ گئی تھی اور ۵۰۰ روپے کا جرمانہ بھی حکومت کی طرف سے ہوا تھا، اس طرح اُن کا فتنہ دب گیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں ستیارتھ پرکاش کے منظر عام پر آنے کے بعد اسلام کے خلاف لکچروں اور تقریروں کا ایک ماحول بن گیا۔ پنڈت اندرمن بھی سوامی دیانند کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بلائے جانے لگے۔ اسی سال ۱۸۷۵ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں شائع ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ:

> پادری نولس صاحب پادری شاہ جہاں پور اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی موضع چاندا پور متعلقہ شہر شاہ جہاں پور نے مل کر ۱۸۷۶ء میں ایک میلہ بنام میلۂ خداشناسی موضع چاندا پور میں جو شہر شاہ جہاں پور سے ۶ کوس فاصلے پر لب دریا واقع ہے مقرر کیا اور تاریخ میلہ ۶ رمئی ٹھہرائی ہے۔

مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں پور کی اجازت کے بعد ۷ رمئی ۱۸۷۶ء کو سخت گرمی میں میلہ، جو در حقیقت عیسائیت، ہندوازم اور اسلام کا سہ طرفی مناظرہ تھا منعقد کیا گیا۔

میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے ان کی ذات میں ایک ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ چشم زدن میں بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطہ کو واضح کر دیتی تھی۔ ان کی تقریر پہلے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعہ دماغ کو قائل کر دیتی تھی۔ ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی۔ بحث و مباحثے میں ان کے چبھتے ہوئے طنز و مزاح کے تیروں اور بے پناہ قوت مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا کہ وہ ایک خوش باش لا ابالی مزاج رکھتے ہیں مگر ان کے سینے میں ایک پرخلوص، پرسوز اور پرجوش دل تھا اور اس دل میں محکم ایمان اٹل ارادہ اور انتھاہ ہمت و حوصلہ تھا۔ اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منور کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نورِ ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔" تاہم ان دنوں ملک کو تحریک خلافت اور عدم تعاون نے اپنی زد میں لے رکھا تھا اور ہر طرف ایک بے یقینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ بیشتر لوگ عدم تعاون کو ملک کے لیے اور خاص طور پر تعلیمی اداروں کے لیے مہلک سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں عابد صاحب نے لکھا ہے کہ "جب ہم لوگوں نے یونین ہال میں ملک کے سیاسی راہبروں کی حمیت خیز اور ولولہ انگیز تقریریں سنیں اور جامعہ ملیہ کی تاسیس کے جلسے میں، جو کالج کی مسجد میں منعقد ہوا تھا، شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کا بصیرت افروز، دل دوز اور جاں سوز خطبہ سنا تو ہم میں سے بعض کے دل و دماغ میں رد و قبول کی کشاکش نے ایک طوفان اور ہیجان برپا کر دیا" غرضیکہ عابد صاحب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے جلسے میں شرکت کا شرف حاصل ہوا اور وہ ذاکر صاحب کے جذبۂ ترک و ایثار سے متاثر ہوئے جنھوں نے ایم اے او کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی لہذا عابد صاحب نے بھی نہ صرف یہ کہ جامعہ ملیہ کے لیے ایم اے او کالج کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا بلکہ ارض وطن ہی کو خیرباد کہہ دیا۔

ہوا یوں کہ انھوں نے بھوپال کے پرنس حمید اللہ خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر تین ہزار روپے قرض لیے اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں بمبئی ہوتے ہوئے لندن کے لیے روانہ ہو گئے تاکہ اعلا تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ قرض انھیں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ تعلیم ختم

حضرت نانوتوی کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانے میں بریلی میں رہتے تھے، تحریر فرمایا کہ کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے مطلع کریں، شاہجہانپور کے مسلمانوں نے اس مناظرے کے لئے حضرت نانوتوی کو اصرار سے مدعو کیا تو حضرت پیادہ پا نانوتہ سے روانہ ہوئے، ایک شب دیوبند میں قیام فرمایا، ایک ایک رات راستہ میں مظفرنگر اور میرٹھ گزارتے ہوئے دہلی پہونچے۔

حضرت نانوتوی نے اس میلہ میں شرکت کے لئے دلچسپی کا جو اظہار فرمایا اس کی وجہ ظاہر تھی۔ پنڈت دیانند کی کتاب نئی نئی مارکیٹ میں آئی تھی۔ پہلی بار ایک مناظرے میں عیسائیوں کے ساتھ ہندو مذہب کے نمائندوں کے بھی آنے کی خبر تھی اور اعلان بھی ایک ہندو رئیس ہی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ میرٹھ جو حضرت کی راہ میں پڑا پنڈت سوامی دیانند کا مرکز تھا۔ آریہ سماج کا آرگن آریہ سماچار وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ مطابع میں تصحیح کے کام کے حوالے سے میرٹھ شہر سے حضرت کی وابستگی بھی رہی تھی۔ توقع تھی کہ پنڈت جی میلے میں آئیں گے، مگر باوجود توقع پنڈت سوامی دیانند سرسوتی اس میلے میں نہیں آئے، کچھ ناقابل ذکر ہندو نمائندے شریک ہوئے تھے جن کا نام میلہ کی روداد میں موجود نہیں البتہ ہندو حضرات کی طرف سے دو تحریریں ہندی میں پڑھی گئیں اور کسی نتیجہ پر پہونچے بغیر یہ میلہ ختم ہو گیا۔

اس موقعہ پر حضرت نانوتوی نے اسلام کی حقانیت وصداقت پر ایک تحریر بہت عجلت میں دن اور رات کے ایک حصے میں بیٹھ کر تیار کر لی تھی، اگرچہ میلے میں یہ تحریر پیش کرنے کی نوبت نہ آئی مگر اس تحریر کی مدد سے حضرت کے تلامذہ نے اس میلے میں ''صداقت اسلام'' پر جگہ جگہ تقریریں فرمائیں۔ بعد میں یہ تحریر حضرت کے تلمیذ خاص مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے ''حجۃ الاسلام'' کے نام سے طبع کرادی۔ غیر مسلموں کے اشکالات کے جواب میں خود حضرت نانوتوی نے وہاں ایک مدلل تقریر فرمائی جس نے سامعین کے دلوں کو نور ایمان سے بھر دیا۔ اس میلے کی روداد میرٹھ کے مطبع ضیائی کے ذمہ داروں: محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحبان نے مرتب کر کے واقعۂ میلۂ خداشناسی اور گفتگوئے مذہبی کے نام سے شائع کر دی تھی۔ وہاں حضرت نانوتوی نے جو تقریر فرمائی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

صداقت مذہب عقائد پر موقوف ہے احکام پر نہیں۔ چونکہ حاکم کو تو ہر حکم دینے کا حق ہوتا ہے

کرنے کے بعد لندن سے وطن واپس ہوں گے تو کم از کم تین سال تک حکومت بھوپال
کی ملازمت کریں گے اور جو کام بھی ان کے سپرد کیا جائے اسے انجام دیں گے۔ یہ رقم
بہت کم تھی اس لیے جلد ہی ختم ہوگئی اور عابد صاحب کو دیارِ غیر میں بڑی دشواریوں کا سامنا
کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ان کے والد سید حامد حسین رقمطراز ہیں کہ ''اس قرارداد کے
اوقات میں راقم الحروف بھوپال میں موجود نہ تھا اور نہ اس مسئلے کے متعلق کوئی مراسلت
میری نظر سے گزری ورنہ اس عالم اسباب پر میں ہرگز ایسی جسارت نہ کرتا۔ نہ اپنے
امکان بھر اس کو کرنے دیتا۔ ان ناتجربہ کاریوں کے نتائج میں خود نورچشم موصوف نے
نہایت تکالیف یورپ میں اٹھائیں۔ نورچشم موصوف کو دو سال لندن اور تین سال سے
کچھ زائد برلن میں قیام کرنا پڑا''۔

غرضیکہ عابد صاحب نے آکسفورڈ میں داخلہ لے کر تاریخ میں پریویس کا امتحان
پاس کرلیا۔ آکسفورڈ میں انھوں نے اردوداں طلبہ پر مشتمل ایک ادبی حلقہ قائم کرلیا تھا جس
میں علمی مضامین پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث وتمحیص ہوتی تھی۔ اس کے جلسے ہر اتوار
کو باری باری ممبروں کے مکانوں پر منعقد ہوتے تھے لیکن اب روپے ختم ہوجانے کے
سبب انھوں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کرلیا جہاں خرچ کم تھا اور جرمن مارک کی قیمت بھی
بہت گری ہوئی تھی اور تبادلہ میں بہت سستا پڑتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے برلن یونیورسٹی میں
داخلہ کے لیے درخواست دے دی اور آکسفورڈ میں بھی داخلہ قائم رکھا۔ جرمن زبان
سیکھنے کے بعد انھیں برلن یونیورسٹی میں باضابطہ داخلہ دے دیا گیا۔ اسی دوران مجیب
صاحب بھی برلن جا پہنچے کیونکہ ۱۹۲۲ء میں آکسفورڈ سے بی اے پاس کرلینے کے بعد وہ
طباعت کی تربیت حاصل کرنا چاہتے تھے لہٰذا مجیب صاحب اور عابد صاحب دونوں
ساتھ ساتھ رہنے لگے۔

عابد صاحب نے پی ایچ ڈی کے امیدوار کی حیثیت سے ممتاز عالم ڈاکٹر اشپرانگر
کی نگرانی میں ریسرچ کا کام شروع کردیا اور لکچروں میں حاضر رہنے لگے لیکن وہ مالی
پریشانیوں سے بدستور دوچار رہے اور قرض لے کر گزر بسر کرتے رہے۔ بعد ازاں ان
کے لیے بھوپال سے وظیفہ جاری ہوگیا۔ مجیب صاحب شہر کے مضافات میں شلاختن زی
نامی مقام پر پرائمری اسکول کے اساتذہ کی انجمن کے رئیس التحریر اور اس کے جرنل کے

ورنہ وہ مجبور و محکوم قرار پائے گا حاکم نہیں اور بنائے معبودیت صرف حکومت ہے۔ لہٰذا عقیدہ کی رو سے اگر دیکھیں تو اسلام ہی افضلیت نمایاں ہے، اس کا عقیدہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، جس کا جزو اول توحید ہے، جس سے کسی کو اختلاف نہیں، نہ عیسائی حضرات کو نہ ہندوؤں کو حتی کہ مشرکین مکہ کو بھی اس سے اختلاف نہ تھا، عقل سلیم بھی توحید پر شاہد ہے، چونکہ تمام اشیاء اپنے وجود میں ایک وجودِ اصل کی محتاج ہیں، وہی وجود اصلی ذاتِ باری ہے جس کو واحد واَحد ہونا ہی چاہئے، چنانچہ عقل ونقل دونوں کی بنا پر شرک ظلم عظیم ہے کہ اطاعت کے دونوں بنیادی سبب یعنی نفع کی امید اور نقصان کا اندیشہ ذات باری میں ہی پائے جاتے ہیں تو کسی اور کی اطاعت کیوں ہو جو خود اپنے وجود میں وجود اصل کا محتاج ہو۔

کوئی انسان معبود نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ خود محتاج ہے، کھانے، پینے، مرض اور موت سے مجبور ہے اور جب یہ طے ہوگیا کہ اطاعت وعبادت صرف ذات باری ہی کی ہونا چاہئے تو سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح ہو؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے احکام سے مطلع فرمائے۔ ہماری عقلِ نارسا تو ناکافی ہے اور خود ذات باری ہمارے پاس اپنا پیغام پہونچانے آئے گی نہیں، کیونکہ ایک معمولی بادشاہ تک اپنے احکام کسی قاصد ہی کی معرفت بھیجتا ہے، لہٰذا یہاں بھی ایک قاصد کی ضرورت ہے۔ البتہ قاصد کو بھیجنے والے کا مقرب ہونا چاہئے، انبیاء ورسل اسی لئے معصوم ہوتے ہیں کہ وہ مقربین ذاتِ باری ہوتے ہیں اور چونکہ مقرب ہوتے ہیں اس لئے بارگاہِ خداوندی میں ان کی سفارش سُنی جاتی ہے، لیکن سفارش اور کفارہ میں فرق ہے۔ کفارے کا نظریہ غیر معقول ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا اپنے گناہ گار بندوں پر تو رحمت کر رہا ہے اور عذاب ایک مقرب کو سہنا پڑ رہا ہے۔

اس مناظرے میں حضرت نانوتوی نے جو تحریر لکھی تھی اور جو بعد میں حجۃ الاسلام کے نام سے شائع ہوئی اس میں اگرچہ زیادہ حصے میں عیسائیوں کو مخاطب بنایا گیا ہے، لیکن اصولی مباحث کی افادیت عام ہے۔ اس تحریر کے آخری حصے میں معجزہ شق القمر کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان میں اس معجزے کے نظر آنے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ نیز اہل ہنود کے ایک مشہور اشکال کا رد کیا گیا ہے جو وہ گوشت خوری کے سلسلے میں کرتے ہیں اور اسے ہتیا اور جانوروں پر ظلم قرار دیتے ہیں۔

حضرت نانوتوی نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے عقلی ونقلی دونوں طرح کے دلائل دیئے ہیں جن کو درج ذیل نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ یہ دلائل اس قدر بصیرت افروز ہیں جن سے نہ

مدیر اعلا کے مکان میں عابد صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ عابد صاحب اس گھر میں صاحب خانہ کے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے رہا کرتے تھے اس لیے جب مجیب صاحب وہاں پہنچے تو انھیں بھی اس خاندان نے اپنے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ جب ان کا طباعت کا کورس شروع ہو گیا تو وہ ناشتہ کے بعد برلن شہر چلے جاتے تھے اور عابد صاحب اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے اور دونوں کی ملاقات شام کو کمرے ہی پر ہوا کرتی تھی۔ سال کے اخیر میں ذاکر حسین بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے برلن آ پہنچے تاکہ معاشیات میں ریسرچ کر سکیں۔ اس سلسلے میں عابد صاحب نے ان کی بڑی مدد کی۔ انھوں نے ذاکر صاحب کے لیے مکان تلاش کیا انھیں اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گئے۔ انھیں بتایا کہ کسی طرح پی ایچ ڈی کے امیدوار کی حیثیت سے داخلہ کرایا جائے، نگراں کا انتخاب کیونکر ہو، رجسٹریشن کی صورت کیا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ ذاکر صاحب نے اعلان کیا کہ ''اپنے طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا اُن کے لیے ممکن نہیں چنانچہ عابد صاحب انھیں اس مقام تک لے گئے جہاں سے شلا ختن زی اسٹیشن تک جایا جاسکتا تھا، پھر انھیں یونیورسٹی کا راستہ بھی سمجھایا'' لیکن اس پورے عرصہ میں عابد صاحب کی توجہ ریسرچ کی تکمیل پر مرکوز رہی۔ اسی اثنا میں ذاکر صاحب نے دیوان غالب، دیوان شیدا اور گاندھی جی کی تعلیمات پر ایک کتاب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا جس میں عابد صاحب اور مجیب صاحب نے ان کی مدد کی۔

۱۹۲۴ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں ایک شدید بحران سے دوچار ہوئی اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ دراصل عدم تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لے لی گئی تھی اور ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ادارہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں تحریک کے تئیں رہنماؤں کا جوش وخروش بھی سرد پڑ گیا۔ سیاسی جماعتوں کو بھی ملکی حالات سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایسی صورت میں جامعہ بھی مفلس ہو گئی اور بحران اس قدر شدید ہو گیا کہ اسے بند کر دیے جانے تک کی نوبت آ گئی لیکن حکیم اجمل خاں جو جامعہ ملیہ کے امیر جامعہ تھے اور ان کے رفقا یعنی ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ نے بروقت یہ فیصلہ کیا کہ اسے بند نہیں کیا جاسکتا۔ مہاتما گاندھی نے بھی حکیم صاحب اور ان کے رفقا کی ہمنوائی کرتے ہوئے پیش کش کی کہ اگر روپوں کی ضرورت جامعہ کی راہ میں

جانے کتنے ضمنی سوالوں کا جواب ہوتا چلا جاتا ہے۔

۱۔ ہم اللہ کی اجازت کے بغیر اگر جانوروں کو ذرا بھی ستائیں تو بے شک یہ چیز ظلم ہو سکتی ہے، لیکن اگر اللہ کی اجازت سے بھی یہ جانور حلال نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خداوندِ عالم کو جانوروں پر اختیار نہیں اور حقیقت میں ظلم تو یہ ہے کہ ایک مالک کو اپنی ہی چیز کا اختیار نہ ہو۔

۲۔ اگر جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہے تو ان پر سواری اور بار برداری اور اُن کا دودھ پی لینا کیا اسی دلیل سے ظلم نہیں ہے؟

۳۔ اگر مطلب یہ ہے کہ خدا کو اختیار تو ہے مگر انسان کے لئے جانوروں کا گوشت موزوں نہیں تو آخر کیوں؟ کیا انسان جانوروں سے بہتر نہیں؟ پھر ایک پرانے مکان کو گرا کر نیا عمدہ بنالیں تو کیا حرج ہے؟ انسان کے لئے گوشت مادۂ قریب ہے، حیوان کا گوشت جسم انسانی میں آ کر روحِ اعلیٰ کا آلہ بن جاتا ہے، یہ ایک جسم حیوانی کے لئے ترقی مدارج ہے۔

۴۔ انسان کو شیر اور چیتے کی طرح نوک دار دانت دیئے گئے ہیں، یہ خود اس کا اشارہ ہے کہ انسان کی خوراک گوشت ہے، کیوں کہ انسان کو یہ کچلیاں بے وجہ تو نہیں دی گئیں۔

۵۔ البتہ یہ تسلیم ہے کہ سارے حیوانات انسان کے لئے موزوں نہیں، بعض جانور انسان کے جسم یا اخلاق کے لئے نقصان دہ ہیں، جیسے شیر کا گوشت یا خنزیر کا گوشت، اُن کو ضرور ممنوع ہونا چاہئے۔ اسی طرح خون چونکہ جسمِ انسانی کا فضلہ ہے اس کو بھی ناجائز ہونا چاہئے۔

۶۔ بے ذبح اگر کوئی جانور مر جاتا ہے تو ناپاک خون گوشت میں جذب ہو جاتا ہے، لہٰذا اس مردہ جانور کو بھی کھانے کے لئے ممنوع ہونا چاہئے۔

۷۔ ذبح میں حلق کے کاٹنے کی وجہ یہی ہے کہ حلق میں ساری رگیں اکٹھا ہو جاتی ہیں اور سارا خون باہر نکل جاتا ہے۔

۸۔ بدن کے ساتھ روح کا چونکہ ایک مقناطیسی جیسا رابطہ ہے، اس لئے بدن اگر فاسد ہوتا ہے تو اس سے روح بھی فاسد ہوتی ہے اور اس روح سے ناپاک خیالات اور ناپاک خیالات سے ناپاک اعمال وجود میں آتے ہیں۔

۹۔ غلہ پھل اور نباتات پر انسانی زندگی منحصر ہے، لہٰذا اس کے استعمال کی اجازت تو واضح

حائل ہے تو وہ خود اس کے لیے بھیک مانگنے کے لیے تیار ہیں۔

اس وقت ذاکر صاحب جرمنی میں قیام پذیر تھے جہاں وہ عارضی طور پر جامعہ سے رخصت لے کر اپنی ریسرچ کی تکمیل میں مصروف تھے۔ جب انھیں جامعہ کو بند کیے جانے کی تجویز سے متعلق اطلاع ملی تو انھوں نے عابد صاحب اور مجیب صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ عابد صاحب کے الفاظ میں ''مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ تمھیں جامعہ میں کام کرنا چاہیے ...... اس وقت ہم لوگوں نے بھی (مجیب، ذاکر اور میں) عہد کرلیا کہ جامعہ ہی میں کام کریں گے۔ اس کے نتیجے میں ذاکر صاحب نے حکیم صاحب کی خدمت میں یہ برقی پیغام بھیجا کہ: 'میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔'' اس پیغام کے موصول ہوتے ہی حکیم صاحب نے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا جہاں وہ بہتر طریقہ پر اس کی دیکھ بھال کرسکتے تھے۔

جب ۱۹۲۵ء میں ذاکر صاحب اپنی تھیس کے سلسلے میں پیرس گئے تو انھوں نے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری سے بھی ملاقات کی جو یورپ کے دورہ پر آئے ہوئے تھے اور انھیں جامعہ کے لیے اپنی خدمات کا یقین دلایا۔ بعدازاں ذاکر صاحب نے عابد صاحب، مجیب صاحب، برکت علی قریشی اور خواجہ اے حمید کو تاکید کی وہ بھی حکیم صاحب سے ملاقات کے لیے جائیں اور جامعہ کے لیے اپنی خدمات کا یقین دلائیں۔ چنانچہ یہ چاروں ہندوستانی نوجوان ویانا پہنچے جہاں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ان دنوں قیام پذیر تھے۔ دونوں رہنماؤں نے اپنے وطن سے دور دراز مقام پر ایسے گرمجوش نوجوانوں سے مل کر خوشی کا احساس کیا جو ایک قریب المرگ ادارے کی خدمت کے لیے تیار تھے۔ بعدازاں اس ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خواجہ اے۔ حمید نے لکھا:

> ''۱۹۲۵ء میں کسی وقت حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری یورپ آئے۔ ذاکر حسین نے پیرس میں ان سے ملاقات کی اور جامعہ کے لیے اپنی زندگی وقف کردینے کا یقین دلایا۔ ذاکر صاحب نے عابد حسین، محمد مجیب، برکت علی قریشی اور مجھ سے بھی ویانا جاکر ان دو عظیم رہنماؤں سے ملاقات کرنے

ہے۔ البتہ حیوانات کا انسان کے لئے ہونا اتنا واضح نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے انسان کے ہاتھ پیر آنکھ کان ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا کی چیزوں سے استفادہ کرتا ہے، اسی طرح جانور میں بھی ہیں اور غلہ پھل ونباتات اُن کے بھی کام آتے ہیں۔ لہٰذا نباتات میں تو صرف اُن کا موجود ہونا ہی اجازت ہے، البتہ حیوانات کو اپنے استعمال میں لانے کے لئے انسان کو مالکِ حیوانات کی خصوصی اجازت کی ضرورت ہوگئی، اس کی اجازت کے بغیر استعمال اللہ کی مخلوقات میں تقرب بے جا کا ظلم ہوگا۔

۱۰۔ مالک اسی وقت اجازت دے سکتا ہے جب تصرف کرنے والا مالک کو مالک سمجھتا ہو، اس کا اعلان بھی کرتا ہو۔ لہٰذا بوقت ذبح اللہ کا نام لینا ضروری ہوگا اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا مالک کی ناخوشی کا سبب ہوگا اور ایسے جانور کا گوشت جائز نہ ہوگا۔

۱۱۔ ذبح کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی کی محبت میں اپنی قربانی دی جائے یا کسی ایسے جانور کی قربانی دی جائے جو ہمیں عزیز ہو یا ذات محبوب سے صاحب واسطہ ہو اور اس قربانی سے مقصد گوشت حاصل کرنا نہ ہو تو ایسی قربانی بھی محبوب اصل کے لئے ہونی چاہئے جو ذات باری ہی ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے جانور ذبح کیا جائے گا تو گویا غیر خدا کی محبوبیت تسلیم کی جائے گی اور محبت کے لئے اطاعت لازم ہے تو گویا غیر خدا کے لئے اطاعت تسلیم کی جائے گی اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، اس لیے اس نے عام ذبیحہ اگر اپنے استعمال کے لئے ہے تو قربانی کا ذبیحہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔

۱۲۔ قربانی کے گوشت کی بیع وشرا بھی اسی لئے منع ہے کہ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور گوشت کھا لینے کی اجازت منجانب اللہ صرف بمنزلۂ ضیافت ہے۔

۱۳۔ اس طرح واضح ہوا کہ حیوانات سے متعلق حرمت چار طرح کی ہے۔ ایک تو مردار کی حرمت، دوسرے خون کی حرمت، تیسرے ان حیوانات کی حرمت جو مضر اخلاق وصحت ہونے کی بنا پر حرام ہوں، چوتھے غیر خدا کے نام پر یا خدا کا نام نہ لینے کی بنا پر حرمت ہے، باقی سارے حیوانات کا گوشت حلال ہے۔ پھر اگر خدا کو مالک مانتے ہوئے صرف استعمال کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ صرف حلال ہے اور اگر براہ محبت خداوندی ذبح کیا جائے تو اس پر ثواب بھی انشاء اللہ ملے گا۔

گوشت خوری کے سلسلے میں یہ طرزِ استدلال کتنا عجیب ہے جس میں گوشت سے متعلق

کے لیے کہا۔ ذاکر حسین ہمارے ساتھ نہیں جاسکے کیونکہ وہ
اپنے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھے...... ہم چاروں
ویانا گئے اور وہاں ہوٹل اسٹوریا پہنچے جہاں اجمل خاں اور
ڈاکٹر انصاری قیام پذیر تھے۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش
ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے حکیم صاحب کو یورپی طرز
کے لباس میں ملبوس دیکھا۔ ہم نے جامعہ کے بارے میں ان
سے کئی سوالات کیے اور اپنی وفاداری کو ان عظیم رہنماؤں کی
خدمت میں پیش کرنے کا عہد کرتے ہوئے ان کے تئیں
اظہار ممنونیت کیا کہ انھوں نے جامعہ کے وجود کو برقرار رکھا
تھا۔ ہم نے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کو یقین دلایا کہ
ہندستان واپس ہو کر ہم جامعہ کے لیے کام کریں گے۔"

دسمبر ۱۹۲۵ء کے اخیر میں عابد صاحب نے ڈاکٹریٹ کا امتحان دیا اور بڑی امتیازی حیثیت سے پاس ہوئے انھوں نے ہربرٹ اسپنسر کے فلسفہ تعلیم پر تھیسس قلم بند کیا تھا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب بھی ریسرچ کے کام سے فارغ ہوگئے۔ عابد صاحب اور مجیب صاحب پہلے پیرس گئے جہاں ذاکر صاحب بھی ان سے جا ملے اور پھر یہ تینوں حضرات فروری میں ہندستان پہنچے جہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد ان کے لیے چشم براہ تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر جامعہ کے طلبہ کا ایک قافلہ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا اس میں معین الدین حارث بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس آمد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو ایک ڈبے سے یہ تینوں نوجوان باہر آئے۔ یہ تھے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم، ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اور پروفیسر مجیب...... قدرے بھاری جسم کے اور چہرے پر سیاہ داڑھی والے ڈاکٹر ذاکر حسین جو گھنی داڑھی کی وجہ سے اپنی عمر سے کچھ زیادہ کے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں اکہرے بدن کے ڈاکٹر عابد حسین اور ان دونوں کے مقابلے میں مختصر جثے کے پروفیسر محمد مجیب۔ یہ تینوں شخصیتیں پروقار تھیں۔ اور ان کے چہروں پر کچھ ایسا تبسم تھا کہ ان کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہونے والے دلوں کو انھوں نے موہ لیا۔ یورپ کی اعلا تعلیم سے

سارے اسلامی احکام کی نہ صرف حکمتیں ظاہر ہو جاتی ہیں بلکہ حلت و حرمت، حیوانات کا فلسفۂ حرمت کی تمام قسمیں، قربانی کی اہمیت اور متعلقہ مسائل، بسم اللہ کہنے کی ضرورت اور اللہ کے مالک حقیقی ہونے پر ایمان کی شرط ساری چیزیں بے حد مرتب اور دل نشیں انداز میں نقل ہوتے ہوئے بھی عین مقتضائے عقل محسوس ہونے لگتی ہیں اور یہی حکمتِ قاسمیہ کا امتیاز ہے۔

اگلے سال ۱۹/۲۰/مارچ ۱۸۷۷ء کو اسی میدان میں پنڈت دیانند سرسوتی آئے پنڈت اندرمن ان کے ساتھ تھے۔ سوامی جی ایک ہفتہ پہلے سے چاندا پور پہونچے ہوئے تھے اور مناظرہ میں پیش کئے جانے والے سوالات مرتب کر رہے تھے۔

مباحثہ میں کس ترتیب سے بحث ہو؟ اس کے بارے میں حضرت نانوتوی نے یہ رائے پیش فرمائی کہ اول ذاتِ باری میں گفتگو ہو کہ وہ ہے یا نہیں اور ہے تو ایک ہے یا متعدد، پھر صفاتِ باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا کیا ہیں؟ پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو، یعنی انبیاء کی ضرورت ہے یا نہیں اور کون ہے کون نہیں ہے؟ اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو۔

جو لوگ گفتگو کے فن سے آشنا ہیں اور جانتے ہیں کہ گفتگو کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے منصوبہ بند گفتگو کس طرح کی جاتی ہے وہ حضرت نانوتوی کی اس ترتیب کو ہی معقول قرار دیں گے، لیکن منشی پیارے لال نے سوامی جی کی ہدایات کے تحت لکھی گئی جو ترتیبِ نکات پیش کی وہ یہ تھی:

۱۔ دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

۲۔ پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

۳۔ پرمیشر عادل ہے اور رحیم بھی ہے۔ دونوں کس طرح؟

۴۔ وید، بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

۵۔ نجات کیا چیز ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

ظاہر ہے ان نکات میں کوئی استدلالی ترتیب نہیں ہے۔ خدا نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ اس کا سیدھا تعلق انسان کی غرض و غایت سے کیا ہے؟ وہ محیط کل ہے، عادل ہے، رحیم ہے، یہ سب ہی کو تسلیم ہے، پھر بحث کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ مناظرہ تھا کوئی مذہبی کلاس تو نہیں؟ حضرت نانوتوی کو خدا نے جو استدلالی فکر عطا فرمائی تھی اس کا اندازہ اُن کی قائم کردہ ترتیبِ نکات ہی سے بخوبی ہو جاتا ہے، جبکہ

مرصع ہو کر وطن واپسی کی خوشی تو انھیں یقیناً ہوگی مگر اپنے لیے وہ جو میدان طے کر چکے تھے، اس کی پہلی منزل پر پہنچ کر وہ غیر معمولی طور پر مسرور وشاداں نظر آرہے تھے۔ ادھر ان کا استقبال کرنے والے اس خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے کہ جامعہ کی اس کشتی کو جو ادھر دو تین سال سے جھکولے کھا رہی تھی، کھیون ہار مل گئے اور اب یہ امید کی جاسکتی تھی کہ جامعہ کی یہ کشتی اپنے ساحل تک پہنچ سکے گی"۔ جامعہ میں ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے، دعوتوں کا اہتمام ہوا اور 'جوہر' کا خصوصی نمبر شائع کیا گیا۔

ان اصحابِ ثلاثہ کی آمد کے بعد جامعہ کے دن پھر گئے کیونکہ تینوں حضرات کا تقرر ایک ساتھ عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ مقرر ہوئے، ڈاکٹر عابد حسین رجسٹرار بنائے گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ رسالہ "جامعہ" کے مدیر بھی مقرر ہوئے پروفیسر محمد مجیب کو تاریخ کے استاد کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اپنی آمد کے تیسرے مہینہ یعنی اپریل ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر عابد حسین کی نگرانی میں ایک پندرہ روزہ پرچہ "پیام تعلیم" کے نام سے جاری ہوا جس کے ذریعہ جامعہ کے کاموں کی تفصیل اور اس ادارہ کے مقاصد لوگوں تک پہنچائے جانے لگے۔ اس میں بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ مضامین کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک میں تعلیم کی رفتار پر تبصرے شائع ہونے لگے۔

عابد صاحب شعبہ "تصنیف وتالیف" کے ناظم بھی مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے رفقا عبدالعلیم احراری اور سعید انصاری کی مدد سے ایک ایسی تجویز پر عمل کیا جس سے ہر سال نئی نئی کتابیں پڑھنے اور رسالہ "جامعہ" اور "پیام تعلیم" کا مطالعہ کرنے کا شوق لوگوں میں پیدا ہو سکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ترغیب دلانے کی غرض سے یہ اعلان کیا کہ جو شخص ایک سال میں چوبیس روپے جمع کرائے گا اسے ہر تیسرے مہینے اس کی پسند کی نئی نئی کتابیں دی جائیں گی، رسالہ جامعہ مفت دیا جائے گا اور پیام تعلیم کی خریداری میں بھی رعایت کی جائے گی۔ عابد صاحب کی مقبولیت اور ان کے حسن کارکردگی نے سبھی سے خراج تحسین وصول کیا۔ انھیں فلسفہ پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور پانچویں جماعت کو اردو پڑھانے کے خدمت بھی سپرد کی گئی۔ انھوں نے جامعہ کے ذریعہ تعلیمی موضوعات پر اپنے مضامین کے ذریعہ زبردست خدمات انجام دیں اور ۱۹۲۶ء میں چار قسطوں پر مشتمل اپنے بڑے اہم مضمون "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ" میں

منتظمین مناظرہ اور سوامی دیانند کی بدنیتی ان کے مقرر کردہ سوالات سے صاف طور سے آشکار ہوتی ہے۔

مباحثہ میں پہلے کون بیان کرے اس سلسلے میں بے حد اختلاف رہا۔ حضرت نانوتوی کی دلیل معقول تھی کہ چونکہ ہمارا دین سب سے بعد کا ہے، اس لئے ہم سب سے بعد میں بیان کریں اور سب کے سوالات کے جواب دیں، لیکن دیگر حضرات کو اندیشہ تھا کہ جو شخص بھی پہلے تقریر کرے گا وہی سب کے اشکالات واعتراضات کا ہدف بنے گا۔ سارا دن اسی بحث میں گزر گیا۔ شام کے ۴ بج گئے، پادریوں، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں نے حضرت نانوتوی پر ہی بحث شروع کرنے کے لئے دباؤ ڈالا، چنانچہ عصر کی نماز کے بعد حضرت نانوتوی اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنی طے کردہ ترتیب نکات کے مطابق ایک مسبوط تقریر فرمائی جس کا حاصل یہ تھا کہ:

ہم پہلے اپنی ذات سے شروع کریں۔ ہم ایک شعلۂ مستعجل تھے، اب ہیں، آئندہ نہ ہوں گے۔ ہم آفتاب کی کرن کی طرح ہیں، کرنیں جاتی ہیں نئی کرنیں آتی ہیں، مگر آفتاب موجود رہتا ہے، ہم سب کی زندگی کا سرچشمہ بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وہی سرچشمہ ذات باری ہے، ہماری طرح ساری دنیا کی چیزوں کی یہی حالت ہے، ان کا وجود وعدم بھی آنی وفانی ہے، لیکن اسی کے ساتھ چیزیں الگ الگ بھی پہچانی جاتی ہیں کہ یہ درخت ہے وہ سمندر، یہ چیزیں جس بنا پر الگ الگ ہیں اسی کو حقیقت کہتے ہیں۔ ہر چیز میں وجودِ عارضی بھی ہے اور حقیقت بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ حقیقت نہ ہو مگر وجود ہو کہ یہ دونوں لازم وملزوم نہیں، البتہ یہ ممکن نہیں کہ وجود ہی معدوم ہو جائے۔ چونکہ اگر دو عدم ہو جائے تو وہ وجود ہی کہاں تھا کہ وجود تو کہتے ہی عدم عدم کو ہیں، یہی واجب الوجود ذاتِ باری ہے۔

اور جب ساری اشیاء اس واجب الوجود کے لئے وہ حیثیت رکھتی ہیں جو آفتاب کے لئے حرارت رکھتی ہے تو ظاہر ہے ساری اشیاء عدم سے وجود میں آئیں گی، کیوں کہ ان کا وجود اپنے آپ نہیں ہے اور جب عدم سے وجود میں آئیں تو وجود سے عدم میں بھی جائیں گی، کیوں کہ جب ان کے لئے پہلے عدم تھا تو بعد میں بھی عدم ممکن ہوگا، البتہ جس ذات کی وجہ سے یہ ساری رونق ہے تو اس کا وجود ازلی ابدی ہوگا، نہ پہلے عدم نہ بعد میں عدم اور جب وہ وجود لامحدود ہے تو اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کئی موجود اس جیسے نہیں ہو سکتے جو واجب الوجود ہوں، وہ تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو منبع وجود ہو وہی منبع اوصاف بھی ہو۔ لہٰذا ضرور ہے کہ تمام کائنات میں علم وادراک، قوت اور حس وحرکت

مسلمانوں کی تعلیم کو اہم ترین قومی مسئلہ سے تعبیر کیا اور مسلمانوں سے اصرار کیا کہ وہ اپنی نئی نسلوں کو اسلامی روایات پر مبنی اس طرح زیور تعلیم سے آراستہ کریں کہ وہ اپنے وطن اور دنیا والوں کے لیے مفید کارنامے انجام دے سکیں۔ انھوں نے لکھا کہ ''کسی بھی یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ کا خاص طور سے یہ فرض ہے کہ وہ تعلیم وامتحان اور نوجوانوں کو کسب معاش کے لیے تیار کرنے کے علاوہ تحقیقات علمی اور اشاعت علوم پر خاص توجہ دے''۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جامعہ میں ایک اردو اکادمی کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ ''اس تجویز کو ہم محتاج دلیل نہیں سمجھتے کہ جامعہ ملیہ کی تصانیف اور تالیف کی زبان اردو ہونی چاہیے اور یہ بھی مسلم امر ہے کہ تحقیق علمی کے لیے ایک مستقل ادارے کی ضرورت ہے جو اپنے اندرونی انتظامات میں خودمختار ہو۔ جو اساتذہ تصنیف وتالیف کی صلاحیت اور ذوق رکھتے ہوں چند رہنما وطلبہ اور چند بیرونی علما کے ساتھ مل کر ایک ادارہ قائم کریں جس کا نام 'اردو اکادمی' ہو۔'' بعدازاں جامعہ میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو عابد صاحب ہی کو اس کی سربراہی کا شرف حاصل ہوا۔

ابتدا میں عابد صاحب کا مشاہرہ، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب کے ساتھ تین سو روپے ماہانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب جامعہ کو مالی مشکلات پیش آنے لگیں تو ان تینوں حضرات نے اپنے مشاہرہ میں سے سو روپے کم کردئے اور دوسو روپے ماہانہ وصول کرنے لگے۔ حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد مالی دشواریوں کے پیش نظر ڈاکٹر انصاری کے دور امارت میں انجمن تعلیم ملی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے اراکین نے بیس برس تک ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر جامعہ کی خدمت کا عہد کیا اس کے مطابق مجیب صاحب اور عابد صاحب نے اپنے لیے سو سو روپے ماہانہ اور ذاکر صاحب نے پچھتر روپے ماہانہ مشاہرہ لینا قبول کیا تاہم کچھ عرصہ بعد عابد صاحب کے لیے سو روپے قطعی ناکافی معلوم ہونے لگے کیونکہ ان پر اپنے گھر کی ذمہ داریاں تھیں اور قرض کی ادائیگی کا بار بھی تھا۔ جب عابد صاحب نے اعلا تعلیم کے حصول کے بعد جامعہ کے ساتھ وابستگی اختیار کی تھی تو ان کے والد سید حامد حسین ان کے فیصلہ سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے خاندانی حالات سے متعلق تفصیل میں کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''نورچشم موصوف نے ملازمت جامعہ ملیہ کی اختیار کی جو فی الوقت تو بوجہ فوراً مل جانے کے میرے نزدیک

قلیل ہو یا کثیر ضرور ہو۔ (نوٹ: جدید سائنسی تحقیقات عین یہی بات ثابت کرتی ہیں۔)

جب سارے کمالات ذات باری میں ہیں تو وہ واجب الاطاعت ہوا، چونکہ اطاعت کے بظاہر تین اسباب ہیں۔ کسب نفع، دفع ضرر اور محبت، جن کو ایک لفظ میں ہم ملک کہہ سکتے ہیں کہ کسب نفع اور دفع ضرر کی توقع ہم اُسی سے کریں گے جس کو مالک سمجھیں اور محبت بھی اُسی سے کریں گے جو ہماری جان و مال کا مالک ہو تو سبب اطاعت صرف ایک ہوا اور وہ صرف ذات باری میں پایا جاتا ہے۔

اثبات رسالت

اطاعت کہتے ہیں دوسرے کی مرضی کے مطابق کام کرنے کو، جس کے لئے اطلاع کی ضرورت ہے، بادشاہ اپنے مقربوں کے ذریعہ اپنی مرضی کا اشارہ کر دیتے ہیں، خداوند تعالیٰ جن مقرب انسانوں کے ذریعے اپنی مرضی کا اشارہ کرتا ہے وہ پیغمبر کہلاتے ہیں۔

عصمت انبیاء

اور خدا کے مقرب وہ ہوتے ہیں جو اس کی ناراضی سے محفوظ ہوں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرتے ہوں اگرچہ بھول چوک ہو جائے، جن کا اخلاق پاکیزہ ہو اور ساتھ ہی عقل کامل ہو، کیونکہ اخلاق حمیدہ کا وجود عقل کامل کے بغیر ممکن نہیں۔

ذات محمدیؐ

اخلاق و علم میں ہم دیکھتے ہیں تو ذات رسالت مآبؐ سے زیادہ مکمل کوئی دکھائی نہیں دیتا، آپؐ علم میں کامل ہیں اخلاق میں کامل ہیں۔ اگر ان دلائل کی بنا پر آدم و ابراہیم و عیسیٰ خدا کے پیغمبر ہو سکتے ہیں تو آخر محمدؐ رسول اللہ کیوں نہ ہوں؟ بلکہ آپ تو کامل و اکمل ہیں، خاتم کمالاتِ انبیاء ہیں اور اسی سے آپ کی خاتمیت زمانی بھی لازم آتی ہے کہ جو سب سے اونچا ہوتا ہے وہ سب سے آخر میں ہوتا ہے، جیسے پارلیمنٹ تک کسی رافع کی نوبت سب سے بعد میں آتی ہے۔ رسول اقدسؐ کے معجزات خود ظاہر کرتے ہیں کہ آپ تمام پیغمبروں میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں، یہ معجزات ہم کو قرآن و احادیث جیسے مستند ذرائع سے بہم پہونچے ہیں جو یقیناً توریت و انجیل وغیرہ دیگر مذہبی کتب میں مذکور دوسرے پیشوایان مذاہب سے منسوب معجزات سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

سب سے آخر میں آپؐ کا آنا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اب آپ ہی کے اتباع میں

قابل داد اور قابل شکر بات تھی لیکن اب اس کے بعد بالکل اسی خیال میں ہمیشہ منہمک رہنا میرے خیال میں کسی طرح مناسب نہیں ہے کیونکہ ان کی موجودہ آمدنی زندگی اور اس کی انسانی ضروریات کی کفالت نہیں کر سکتی۔ نور چشم موصوف نے جو جامعہ کی ملازمت اختیار کی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ جو تنخواہ مقرر ہوئی ہے وہ ماہ بماہ نہیں ملتی ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ نور چشم موصوف جامعہ سے قطع تعلق کر کے اپنے لیے کوئی دوسری صورت اختیار کر لیں...... دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم ان کو ہدایت کرے۔"

مولانا عبد السلام ندوی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ "...... آگے چل کر جامعہ کی مالی حالت خراب ہوگئی اور تنخواہیں گھٹ کر تہائی رہ گئیں تو ان لوگوں کو جامعہ میں کام کرنا مشکل ہوگیا جن کے گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ عابد صاحب بھی انھیں لوگوں میں سے تھے جو سو سوا سو روپے ماہانہ پر گزر بسر نہیں کر سکتے تھے خصوصاً اس وجہ سے کہ یہ معمولی رقم بھی پوری نہیں ملتی تھی اور نہ ماہ بماہ۔ ایسے سبھی لوگ جامعہ سے الگ ہوگئے۔ مگر عابد صاحب کا جذبہ اتنا صادق، ان کی نیت اتنی پر خلوص تھی کہ تمام نا مساعد حالات کے باوجود اس کے باوصف کہ ان کو اچھی نوکری مل سکتی تھی انھوں نے خدمت کو نوکری پر ترجیح دی اور خندہ پیشانی سے مشکل اور نازک سے نازک دور کو گزار دیا۔"

تاہم اپنے قرض کی ادائیگی کی خاطر انھیں ۱۹۳۰ء میں جامعہ سے رخصت لے کر اورنگ آباد جا کر عارضی طور سے انجمن ترقی اردو سے وابستگی اختیار کرنی پڑی جہاں انھوں نے دو سو روپے ماہوار پر گوئٹے کے شاہکار فاؤسٹ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مولوی عبدالحق کے زیر تربیت انگریزی اردو لغت کی تیاری میں مدد دی۔ ایک سال بعد انھوں نے جامعہ سے بلا تنخواہ رخصت حاصل کر کے اورنگ آباد کے اپنے قیام میں توسیع کر دی۔ ۱۹۳۳ء میں وہ دہلی واپس ہوئے تو مولوی صاحب نے ان کے کام سے خوش ہو کر ان سے دہلی میں رہ کر ترجمہ اور لغت کا کام کرنے کی درخواست کی اور دو سو روپے ماہانہ کی پیش کش کی اور اس طرح ان کی مالی مشکلات کا ازالہ ممکن ہو سکا لیکن اس پورے عرصہ میں اپنے دوران قیام اورنگ آباد میں بھی وہ جامعہ کے خیال سے غافل نہیں رہے اور اس کی ترقی سے متعلق منصوبوں پر غور کرتے رہے جنھیں انھوں نے دہلی واپس ہونے کے بعد عملی جامہ پہنایا۔

رضائے الٰہی ہے، جیسے برسرِ کار گورنر کی موجودگی میں کسی سابق گورنر کے احکامات قابلِ تسلیم نہیں ہوتے حالانکہ سابق گورنر بھی گورنمنٹ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے جبکہ سابقہ مذہبی کتب میں یوں بھی بہت کچھ ردوبدل ہوا ہے۔

قرآنی احکامات میں بھی تو نسخ ہوا ہے۔ اس طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ جو تبدیل وتحریف تورات وانجیل میں ہوئی ہے وہ بتصرف بشری ہے اور قرآن میں تبدیلی بتصرف الٰہی ہے اور ہم بمنزلۂ یقین یہ بات جانتے ہیں کہ پہلے یہ حکم تھا اور اب یہ ہے، لہٰذا قرآن کو تورات وانجیل کی تحریف پر قیاس کرنا درست نہیں۔

مباحثہ کے دوسرے دن پادری اسکاٹ کی تقریر پہلے ہوئی، اس کے بعد سوامی دیانند اسٹیج پر آئے اور اپنا نشانہ اسلام اور قرآن کو زیادہ بنایا مگر ناقابل فہم سنسکرت زبان میں اُن کے بھاشن کو کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔

خدا نے کائنات کو کس شے سے پیدا کیا؟ اس کے جواب میں پنڈت دیانند کا کہنا تھا کہ مادہ اور ذات باری دونوں ہمیشہ سے ہیں، البتہ ترکیب مادّہ سے اس کائنات کو خداوند عالم نے ایجاد کیا ہے جس پر حضرت نانوتویؒ کا جواب تھا کہ اگر مادہ ہمیشہ سے خود بخود تھا تو وہی خدا تھا اور اگر نہ تھا تو وہ مخلوق ہوا، حادث ہوا اور قدیم نہ ہوا۔ دیانند نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر مادہ کو حقیقتِ وجود قرار دیا جائے تو مادہ کے نقائص بھی وجود باری کی طرف منسوب ہوں گے جس پر مولاناؒ نے ایک خوب صورت مثال دیتے ہوئے واضح فرمایا کہ مخلوقات مادی کو باری تعالیٰ کے وجود سے شعاعِ آفتاب کی سی نسبت ہے۔ دھوپ آڑی ترچھی ہو تو اس سے آفتاب کا آڑا ترچھا ہونا قطعاً لازم نہیں آتا۔

مباحثہ کے تیسرے دن بھی پادری اسکاٹ کی تقریر پہلے ہوئی اور ان کا موضوع سوالِ خامس یعنی ''مفہوم نجات کیا ہے اور کس طرح ممکن ہے'' تک محدود رہا، اس کے بعد پنڈت دیانند سرسوتی نے اسی موضوع پر تقریر کی۔ پنڈت دیانند کے بعد حضرت نانوتوی کھڑے ہوئے اور لفظ نجات کی تشریح کرتے ہوئے سیدھے اپنے ہدف تک پہونچ گئے۔ سوامی دیانند نے نجات کا مطلب گناہ سے بچنا بتایا۔ حضرت نانوتوی نے واضح کیا کہ نجات عذاب الٰہی سے بچنے کو کہتے ہیں۔ پنڈت جی گناہ سے بچنے کو نجات کہتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ گناہ کسے کہتے ہیں؟

انھوں نے اردو اکادمی کے تحت توسیعی لکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ضمن میں ترکی کے نامور رہنما حسین روف بے نے ''قدیم اور جدید ترکی'' پر چار لکچر دیے ان میں سے دو جلسوں کی صدارت کے فرائض شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے انجام دیے۔ اسی طرح نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم نے اکادمی کے زیر انتظام آٹھ توسیعی خطبات دیے۔ ان میں سے پہلے جلسہ میں مشرق و مغرب کی خصوصیات پر پہلا لکچر ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ دوسرا لکچر بادشاہی نظام کی شکست پر تھا اس کی صدارت مہاتما گاندھی نے کی۔ تیسرا لکچر نوجوان ترکوں کی حکومت پر دیا گیا جس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی۔ چوتھے خطبہ کا موضوع تھا'' خلافت کا خاتمہ، نئی حکومت اور مذہب'' اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے مولانا سید سلیمان ندوی نے۔ پانچواں خطبہ ترکی ادب پر تھا اس کی صدارت کی ڈاکٹر محمد اقبال نے۔ چھٹے خطبہ میں'' آج کل کے حالات'' سے بحث کی گئی تھی جلسہ کے صدر بھولا بھائی دیسائی تھے۔ ساتواں لکچر تحریک خواتین پر دیا گیا اور اس کی صدر تھیں مسز سروجنی نائڈو۔ آٹھواں اور آخری توسیعی لکچر بھی ''تحریک خواتین'' پر ہی تھا اس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر بھگوان داس نے انجام دیے۔ ان کے علاوہ دوسری نامور شخصیتوں کو بھی اردو اکادمی میں توسیعی خطبات کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اکادمی کے زیر انتظام کل ہند پیمانہ پر مشاعروں کا انعقاد عمل میں آتا تھا جس میں ممتاز شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ اکادمی مباحثوں کا اہتمام بھی کرتی تھی جن میں ہر مکتب فکر کے مشاہیر حصہ لیتے تھے۔

اردو اکادمی کتابوں کی اشاعت کا تعمیری کام بھی کرتی تھی۔ اگر چہ اس کام میں مشکلات قدم قدم پر مزاحم ہوئیں لیکن عابد صاحب نے ہمیشہ رجائی طرز فکر اختیار کیا اور عملی اقدامات کرتے رہے۔ اپنی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک خط میں خواجہ غلام السیدین کو لکھا:

> ''پچھلے تین مہینے ہم لوگوں پر بہت مصیبت کے کٹے۔ جامعہ میں بالکل پیسہ نہ تھا، تنخواہ بالکل نہ تھی خیر وہ زمانہ تو کسی طرح گزر گیا لیکن مجھے یہ فکر ہوگئی کہ اس صورت میں میرا کام کیسے چلے گا۔ کام سے مطلب روٹی کپڑا نہیں ہے۔ اس کے

یہ ایک ایسا نکتہ تھا جس نے گفتگو کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ اس لئے کہ گناہ کی پہچان کے لئے ہدایت الٰہی اور رسالت کی ضرورت کا اثبات خود بخود ہو رہا تھا اور یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ تھا جس سے سوامی دیانند اور پادری اسکاٹ دونوں بچنا چاہتے تھے۔ چونکہ رسالت کا تصور صرف اسلام کے یہاں ہے، عیسائیت اور ہندو دھرم میں یہ تصور سرے سے موجود نہیں ہے۔

دورانِ تقریر دیانند نے بے سروپا سوالات پریشان کرنے کے لئے اٹھائے، مثلاً کہا کہ یہ بہشت کہاں ہے؟ بعد میں یہ سوال جب آپ کے سامنے آیا تو آپ نے کہا کہ دنیا میں ہم عیش بھی دیکھتے ہیں اور تکلیف و مشقت بھی، اس کا مرکب ہے ہماری زندگی تو اس مرکب کے مفردات کا سر چشمہ بھی کہیں ہوگا۔ کہیں مرکز عیش ہوگا اور کہیں مرکز مشقت، پہلا مرکز جنت ہے اور دوسرا جہنم۔

شیطان و ملائکہ کے بارے میں بھی اسی قسم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ عیش و راحت ہی کی طرح اعمال میں خیر اور شر ہے، تو اعمال میں ایک جامع خاصیت شر ہوگا اور ایک جامع خاصیت خیر، پہلا ملائکہ ہے دوسرا شیاطین۔

خدا نے خیر کے ساتھ شر کو کیوں پیدا کیا؟ اس کو واضح کرتے ہوئے آپ نے مثال دی کہ جیسے مکان میں پاخانہ بھی تکمیل مکان کے لئے ضروری ہے، یا ابرو اور مژگاں کی بدرنگی چہرۂ روشن پر جا کر جمال بن جاتی ہے۔ اس عالم میں بھی ترکیب متضادین اسی طرح کے عمدہ نتائج پیدا کرتی ہے۔

اس مباحثہ کے بعد اکتوبر ۱۸۷۷ء میں حضرت نانوتوی حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں سے ۶ ماہ بعد واپسی ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۸ء میں آپ ہندوستان واپس تشریف لائے تو سوامی دیانند کے اسلام مخالف لکچرز کی دھوم ہر طرف تھی۔ حضرت نانوتوی سفر حج میں بہت علیل ہو گئے تھے، زیادہ دیر تک بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ سوامی دیانند نے رڑکی ضلع سہارنپور کو اپنی تحریک اور کدو کاوش کا مرکز بنا لیا تھا۔ اپنی کتاب قبلہ نما کے دیباچے میں حضرت نانوتوی نے تحریر فرمایا:

> ''سن بارہ سو پچانوے ہجری رجب (مطابق ۱۸۷۸ء ماہ جولائی) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آ کر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراضات کئے''۔

پنڈت دیانند کی اس حرکت سے مقامی مسلمان بے چین ہو گئے۔ اہل رڑکی حضرت نانوتوی کو رڑکی بلانے کے لئے بے حد مصر تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سوامی دیانند کہتے ہیں ''مولبی کاسم'' آئیں

متعلق مجھے مطلق ہراس نہیں ہے۔ میری ضرورتیں بہت کم ہیں۔ مجبوری کی صورت میں اور بھی کم ہو سکتی ہیں مگر فکر یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کا کام، رسالہ جامعہ، وہ کتابیں جو لکھی گئی ہیں اور جو لکھی جائیں گی، سب کا کیا انجام ہوگا۔ میری زندگی ان ہی چیزوں پر منحصر ہے۔ رات دن اس الجھن میں رہتا ہوں۔ پست ہمتی رائے دیتی ہے کہ عملی کام کو خیر باد کہوں لیکن ضمیر جو بد قسمتی سے ہمیشہ بلکہ متکلم رہتا ہے اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ سوچتے سوچتے اب یہ سوچا ہے کہ اگر اپنی ذاتی کوشش اور اپنے احباب کی مدد سے اردو اکادمی کے دو سو ممبر بنا سکوں جو کم سے کم دو روپے ماہوار چندہ دیں تو میرا کام جامعہ سے مستغنی ہو جائے گا (ممبروں کو رسالہ جامعہ اور اردو اکادمی کی مطبوعات جن کی تعداد کم سے کم چھے ہوگی، مفت دی جائیں گی) اب مقصد یہ ہے کہ دسمبر کی چھٹیوں میں کانپور، الہ آباد اور لکھنؤ جاؤں، دیکھوں اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔"

غرضیکہ انھوں نے کبھی شکست خوردہ ہو کر سپر نہیں ڈالی بلکہ عزم تازہ لے کر آگے بڑھتے رہے۔ اکادمی ہی کی طرح عابد صاحب نے مکتبہ جامعہ کے فروغ میں بھی دلچسپی لی اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ایک کامیاب مجلّی اور کامران خازن بھی رہے۔ بعض اوقات انھوں نے قائم مقام شیخ الجامعہ کے فرائض بھی کامیابی کے ساتھ انجام دیے۔ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کا پہلا میزانیہ مرتب کرایا اور آمدنی کے مقابلے میں خرچ زیادہ پا کر ایک کمیٹی اس کام کے لیے مقرر کر دی کہ اخراجات میں کمی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ پہلی مرتبہ میزانیہ کو مرتب کر کے پہلے مجلس منتظمہ میں اور پھر انجمن تعلیم ملی میں پیش کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔

عابد صاحب جامعہ کے حیاتی رکن، اس کی مجلس منتظمہ، مجلس تعلیمی اور جماعت اُمنا

گے تو بات کروں گا ورنہ نہیں۔"

غالباً پنڈت دیانند یہ سوچے ہوں گے کہ ایک لمبے سفر سے واپسی کے بعد بیماری اور نقاہت کے عالم میں حضرت آنے سے انکار کر دیں گے اور مجھے ایک بہانہ مل جائے گا، لیکن حضرت کے دل کو تو ایک لگن لگی ہوئی تھی۔ شروع شعبان میں شدید ضعف اور کمزوری کے عالم میں حضرت نانوتوی ایک بیل گاڑی سے سفر کر کے رڑکی پہونچ گئے اور وہاں مسلسل ۱۷ روز قیام فرمایا۔

حضرت نانوتوی کے رڑکی پہونچنے پر وہاں ایک کثیر تعداد لوگوں کی اکٹھا ہوگئی۔ حضرت والا چاہتے تھے کہ سوامی دیانند سے دو بدو گفتگو کریں، لیکن بقول مولانا وہ شخص کسی قیمت پر پکا نہ ہوا۔ منتیں کیں، غیرت دلائی، حجتیں کیں، مگر وہاں نہیں کی نہیں رہی، پہلے تو فساد ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کیا، مجسٹریٹ نے انتظام کا یقین دلایا تو شرط لگادی کہ ۲۰۰ افراد سے زیادہ نہ ہوں اور پھر یہ شرط لگادی کہ صرف میری قیام گاہ پر گفتگو ہوگی، جبکہ وہ جگہ بے حد تنگ تھی۔ پھر وقت کی شرط لگائی کہ شام ۶ بجے سے گفتگو ہوگی جب کہ پنڈت جی کی قیام گاہ شہر سے کافی دور تھی اور لطف یہ کہ یہ جگہ فوجی چھاؤنی میں تھی جہاں مذہبی بحث کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ چنانچہ پنڈت جی کے اندازے کے عین مطابق حکام نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے (سوانح قاسمی ۴۹۴ دوم) حضرت نے عیدگاہ میں گفتگو کی تجویز پیش کی، مگر پنڈت جی نے ایک نہ سنی، مجبور ہو کر حضرت نانوتوی نے مجمع عام میں پنڈت کے ۱۱ر اعتراضات کا تذکرہ کر کے ۳ر روز تک اُن کے جوابات دیئے۔

۲۳ر شعبان ۱۲۹۵ھ کو حضرت نانوتوی رڑکی سے واپس ہوئے۔ راستہ میں ایک روز منگلور رہے اور دوسرے روز دیوبند پہونچے۔ ۴،۲ دن بعد نانوتہ آئے اور پنڈت جی کے اعتراضات کے جواب لکھے جو کل گیارہ تھے، دس اعتراضات کے جواب الگ لکھے جن کو تلمیذ خاص مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے "انتصار الاسلام" کے نام سے شائع کر دیا۔ خانۂ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے پر پنڈت جی کا جو اعتراض تھا وہ تفصیل چاہتا تھا، اس کے لئے الگ سے ایک مفصل کتاب "قبلہ نما" مرتب فرمائی، بعد میں وہ کتاب بھی شائع ہوگئی۔

انتصار الاسلام

کتاب انتصار الاسلام میں پنڈت جی کے ۱۰ر اعتراضات اور ان کے جوابات کا خلاصہ

کے رکن تھے۔ ۱۹۴۹ میں جامعہ کالج کے پرنسپل کیلاٹ صاحب کی وفات ہوگئی تو ان کی جگہ عابد صاحب کا تقرر عمل میں آیا اور ۱۹۵۳ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور اردو کی تدریس بھی کرتے رہے اور فلسفہ بھی پڑھاتے رہے۔ بعض اوقات انھوں نے سیاست اور تاریخ سیاسیات کا درس بھی دیا۔ وہ ان معائنہ کمیٹیوں کے رکن بھی مقرر ہوئے جن کے ذمہ مدرسہ ابتدائی کے کاموں کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ وہ اس کمیٹی کے سربراہ تھے جس کے ذمہ ہندستان کے مختلف تعلیمی اداروں کی درخواست پر ان کے لیے نصاب مرتب کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مختلف اوقات میں انھوں نے مختلف موضوعات پر لکچر بھی دیے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ گاندھی جی کی وردھا اسکیم کے تحت بنیادی تعلیم سے متعلق کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ انھوں نے ''شریر لڑکا'' نامی ڈرامہ بھی لکھا جسے جامعہ میں اسٹیج کیا گیا۔

نومبر ۱۹۴۶ میں جامعہ ملیہ کی جوبلی کے موقع پر عابد صاحب نے مندرجہ ذیل پیغام جاری کیا:

''اس موقع پر جب جامعہ کی زندگی کے پچیس سال ختم ہو رہے ہیں ہمارے دلوں میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اتنے دنوں میں کیا کیا ہے اور اب ہمیں کیا کرنا ہے؟

''انسان کے لیے خود اپنے کاموں کا محاسبہ کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ ایک طرف افتخار کا جوش اس کی سعی و عمل کے نتائج کو بڑھا کر پیش کرتا ہے دوسری طرف انکساری کا جذبہ انھیں گھٹا کر دکھانا چاہتا ہے۔ اس مد و جزر کے درمیان کی حقیقت کی سطح پانے کے لیے اپنے کو غیر بن کر معروضی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کی کوشش کی تو مجھے جامعہ کی چوتھائی صدی کی زندگی کا ماحصل یہ نظر آیا:۔

''(۱) مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت کا

درج ذیل ہے۔ پنڈت جی کے ہر سوال کا جواب مولانا نے دو سطح پر دیا ہے، ایک الزامی سطح پر، دوسرا تحقیقی سطح پر۔

اعتراض ۱

اسلام کے مطابق خدا قادر مطلق ہے، تو کیا وہ خود کو مارنے اور چوری وغیرہ کرنے پر بھی قادر ہے؟

جواب الزامی

خدا کو قادر مطلق تو ماننا ہی ہوگا، اگر وہ قادر مطلق نہ ہوگا تو قادرِ مقید ہوگا یعنی محدود قوت وقدرت کا مالک ہوگا اور اگر خدا کو قادر مقید مان لیا جائے تو اس کے لئے ایک اور مطلق ماننا ہوگا۔ چونکہ ہر مقید کے لئے ایک مطلق ضرور ہوتا ہے جیسے انسان کے مقید مفہوم حیوانِ ناطق کے اوپر حیوان مطلق ہوتا ہے اور چونکہ مطلق مقید سے بڑا ہوتا ہے، اس لئے لازم آئے گا کہ وہ قادر مطلق خدا اس قادر مقید سے بڑا ہو کہ وہ جیسے اپنی موت وحیات پر قادر ہو اس دوسرے خدا کی موت وحیات پر بھی قادر ہو۔ اس صورت میں تو یہ خدائے مقید خدا ہی نہ رہے گا، چونکہ خدا وہ ہوتا ہے جس کا وجود حقیقی اور ذاتی ہو، وہ خدا ہی کیا جو اپنی زندگی اور اپنے وجود کا بھی مالک نہ ہو۔

جواب تحقیقی

ہر فعل کے لئے ایک فاعل چاہئے ایک مفعول۔ فاعل اثر انداز ہوتا ہے، مفعول اثر قبول کرتا ہے۔ یہ دونوں اگر اپنی صلاحیتوں میں کامل ہوں تو تاثیر وتأثر کی ایک مکمل شکل بنے گی، اگر کوئی ایک بھی اپنی صلاحیت میں نامکمل ہے یا محرومِ صلاحیت ہے تو قطعاً دوسری صورتیں بنیں گی اور یہ ضروری نہیں کہ فاعل یا مفعول میں سے کوئی اگر اپنی صلاحیت میں کامل ہو تو دوسرا بھی ضرور کامل ہو یا ایک ناقص ہو تو دوسرا بھی ضرور ناقص ہو۔ مثلاً سورج کا عکس آئینہ میں مکمل ہوگا، چونکہ سورج اور آئینہ دونوں اپنی صلاحیت میں مکمل ہیں، سورج اپنی تابش میں اور آئینہ اس کو قبول کرنے میں، لیکن ہم سورج کا عکس اگر پتھر میں دیکھیں تو وہ نامکمل ہوگا، چونکہ مفعول ناقص صلاحیت کا حامل ہے اور اس نقص کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ سورج اپنی صلاحیت میں ناقص ہے، اسی طرح آئینہ تو شفاف ہے لیکن اس میں عکس کسی دھندلے ستارے کا ہے تو عکس نامکمل ہوگا، مگر اس سے آئینہ کی صلاحیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

بنایا ہوا تعلیمی نظام ان کی حیات ملی کی تشکیل میں مدد نہیں دیتا بلکہ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ انھیں تعلیمی عمارت خود بنانی ہے اور کم وبیش اسی نقشہ کے مطابق جو جامعہ ملیہ نے پیش کیا ہے۔

''(۲) حکومت یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کو بغیر اس کی مداخلت کے اپنے بچوں کو اپنی اجتماعی مصلحتوں کے مطابق تعلیم دینے کا حق حاصل ہے۔

''(۳) دنیا پر ثابت ہوگیا ہے کہ مسلمان بھی قومی خدمت کے لیے ایثار کر سکتے ہیں اور صبر و استقلال کے ساتھ تعمیری کام انجام دے سکتے ہیں۔ کتنا بڑا کام ہے جو جامعہ نے کر دکھایا۔ مگر جو کچھ جامعہ کو کرنا ہے اس کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو اس نے صرف زمین تیار کی ہے اور ایک چھوٹی سی کیاری میں پود لگائی ہے۔ اب اس کو اس پود سے تعلیم ملی کا عظیم الشان باغ لگانا ہے اگر سوچیے کہ اس کے لیے کتنا وقت، کتنے وسائل، کتنی محنت چاہیے تو جی ڈوبنے لگتا ہے لیکن اگر اس کا خیال کیجیے کہ اچھے آغاز کو انجام تک نیک سعی تمام تک پہنچانے کا وعدہ اس خدا نے کیا ہے جس کی قوت وقدرت کی کوئی انتہا نہیں تو دل کے سوتوں سے امید کے چشمے ابلنے لگتے ہیں''۔

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو مہر آزادی طلوع ہوا تو ہندستانی مسلمانوں پر قہر ٹوٹ پڑا۔ ان کے جان و مال کا تحفظ ناممکن ہوگیا اور بیشتر جگہوں پر انھوں نے پاکستان جانے کو ترجیح دی۔ ایسے بے یقینی حالات میں مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا احساس جگا کر انھیں نئے حالات سے روشناس کرانے کی غرض سے انھوں نے ''نئی روشنی'' کے نام سے ایک ہفت روزہ پرچہ کا اجرا کیا جس کی پہلی کرن ۱۵؍جون ۱۹۴۸ء کو چمکی اور دو سال تک حالات کو منور کرنے کے بعد اگست ۱۹۵۰ء میں روپوش ہوگئی لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ عابد صاحب کی تحریروں نے مسلمانوں کے دلوں میں امید کی کرن جگائی اور ان

جس طرح سورج اپنی صلاحیت میں مکمل ہے، خدا بھی قادر مطلق ہے۔ لیکن ممتنعات جب موجود ہی نہیں ہیں تو گویا آئینہ موجود ہی نہیں ہے یا تاریک ہے۔ تب خدا کی قدرت کا اظہار کس طرح ہوسکتا۔ یہ مفعول کا نقص ہے نہ کہ فاعل کا۔ زنا، چوری موت خدا کی قدرت کا محل بننے سے یکسر عاری ہیں، اس لئے وہ مقدوریت کی صلاحیت سے محروم ہیں نہ یہ کہ خدا قادریت سے محروم ہے۔

اعتراض ۲

شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بقول اہل اسلام شیطان انسانوں کو بہکاتا ہے تو شیطان کو کس نے بہکایا؟ ظاہر ہے کسی نے نہیں تو گویا شیطان کا وجود ہی نہیں ہے؟

جواب الزامی

اگر ہمیں کسی چیز کا علم نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ بالفرض ہم شیطان کے بہکانے والے کو نہیں جانتے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ شیطان موجود نہیں ہے؟

جواب تحقیقی

ہر وصف کا ایک ذاتی مصدر ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت سی چیزوں میں پایا جائے مثلاً دھوپ کی روشنی سے بہت سی چیزیں روشن ہوتی ہیں، لیکن اس کا مصدرِ ذاتی سورج ہے جس سے یہ روشنی کبھی جدا نہیں ہوتی۔

وصفِ گمراہی کا بھی ایک مصدرِ ذاتی ہے جسے شیطان کہتے ہیں اور جیسے آگ خود گرم ہے مگر بہت سی چیزوں کو گرم کردیتی ہے مثلاً کمرہ گرم کردیتی ہے تو یہ گرمی آگ کی صفتِ ذاتی ہے، مگر کمرے کی نہیں۔ اسی طرح گمراہی شیطان کی صفت ذاتی ہے اور انسان اس کے اثر سے گمراہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیطان جب خود ہی گمراہی کا سرچشمہ ہے تو یہ سوال فضول ہوجاتا ہے کہ شیطان کو کس نے گمراہ کیا۔ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے یوں کہا جائے کہ سورج نے ساری چیزوں کو روشن کیا تو سورج کو کس نے روشن کیا؟

یہاں پھر بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ شیطان کا خالق تو بہر حال خدا ہے، للہٰذا اس کی گمراہی کا خالق بھی وہی ہے، تو اس کا جواب ہے کہ برائی کا پیدا کرنا عیب نہیں، اس کا صادر ہونا عیب ہے۔ خدا نے برائی کو اسی طرح پیدا کیا جیسا اور بُری اشیاء مثلاً بُری صورت، بُری آواز اور پاخانہ پیشاب وغیرہ پیدا کیا یا زہر کو پیدا کیا، ان چیزوں کے خلق میں بُرائی نہیں صادر ہونے میں بُرائی ہے جیسے زہر

کی صحیح رہنمائی کی۔

جون ۱۹۵۳ء میں امریکہ کی راک فیلر فاؤنڈیشن نے انھیں ان کی اپنی اردو تصنیف ''ہندستانی قومیت اور قومی تہذیب'' کو انگریزی کا قالب بخشنے کے لیے اور ''گاندھی اور نہرو کی راہ'' کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنے کی غرض سے مدعو کیا جسے انھوں نے منظور کرلیا۔

۱۹۵۴ء میں جب وہ جرمنی سے واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں عارضی پرنسپل کو عابد صاحب کے مستعفی ہوئے بغیر مستقل کردیا گیا تھا اس لیے انھوں نے شیخ الجامعہ کو اپنا استعفیٰ پیش کردیا اور جامعہ سے دو سال کے لیے بلا تنخواہ رخصت پر چلے گئے۔ مرکزی حکومت نے انھیں آفیشل لینگویجز کمیشن کا ممبر مقرر کردیا۔ جب ان کی رخصت ختم ہوئی تو جامعہ میں ان کی ملازمت کو تیس سال کی مدت پوری ہو چکی تھی اور وہ عمر کے ساٹھ سال پورے کر چکے تھے لہٰذا انھوں نے جامعہ سے سبکدوشی اختیار کرلی لیکن انھیں اعزازی پروفیسری کی پیش کش کی گئی اور وہ جامعہ کی مجلس منتظمہ کے ممبر منتخب ہوئے۔

جامعہ سے سبکدوشی کے بعد عابد صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی میں جنرل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسی دوران جامعہ کے چند مخلص افراد نے ان سے درخواست کی کہ وہ شیخ الجامعہ بن کر دہلی آجائیں لیکن انھوں نے تصنیف وتالیف کے کاموں میں مصروفیت کے سبب اسے نامنظور کردیا۔ تاہم جب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب ۱۹۶۱ء میں چند ماہ کے لیے ہندستان سے باہر گئے تو عابد صاحب نے ان کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کرنا منظور کرلیا۔

۱۸ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے عابد صاحب نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

> ''......جامعہ کی تاریخ قومی آواز کی اس تحریک کی تاریخ کے مانند، جس نے جامعہ کو جنم دیا، بحران کا ایک مستقل سلسلہ رہی ہے لیکن اس وقت شاید اپنی زندگی کے سب سے اندیشہ ناک لمحہ سے دوچار ہے ایک ایسا لمحہ جو عظیم امکانات کا حامل

میں برائی نہیں اس کے کھا لینے میں برائی ہے اور گمراہی بہر حال شیطان سے صادر ہوتی ہے خدا سے نہیں۔

اعتراض ۳

اسلام میں نسخ احکام کا نظریہ غیر معقول ہے، نسخ احکام کی ضرورت خطاء ونسیان سے مرکب انسان کو تو پیش آسکتی ہے خدائے علیم کو نہیں۔

جواب الزامی

کسی چیز کا حکم دینا اور کسی چیز کا ارادہ کرنا دونوں یکساں اہمیت کی چیزیں ہیں، لیکن ہم خدا کے ارادے کی تبدیلی ہر وقت دیکھتے ہیں، حیات وموت، صحت ومرض، فقر وغنا اور عزت وذلت سے انسان دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہ چیز ارادۂ خداوندی کی تبدیلی کا مظہر نہیں؟ تو کیا اس پر بھی اعتراض کیا جائے گا؟

جواب تحقیقی

کسی حکم کو صرف غلطی کی بنا پر نہیں بدلا جاتا، مصلحت تبدیل ہو جانے پر بھی بدل دیا جاتا ہے۔ ایک حکیم مریض کے نسخے تبدیل کرتا رہتا ہے اور کوئی شخص بھی اس کو حکیم کی ناسمجھی ونادانی پر محمول نہیں کرتا۔

اعتراض ۴

اگر خدا ہر وقت روحوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو کیا ضرورت ہے کہ وہ قبل از وقت ارواح پیدا کر کے اپنے یہاں جمع رکھے۔ خلقِ ارواح کی نسبت نظریۂ تناسخ زیادہ معقول ہے جس کی رو سے ساڑھے چار ارب ارواح گردش میں رہتی ہیں۔ خلقِ ارواح کا نظریہ مانیں تو کھرب ہا کھرب ارواح کا وجود تسلیم کرنا ہوگا۔ لہٰذا یہ نظریہ رد کر کے نظریۂ تناسخ کو مانیں تو نظریۂ حشر ونشر کی ضرورت نہ رہے گی۔

جواب الزامی

۱۔ اگر قبل از وقت کسی شے کا پیدا کرنا قابل اعتراض ہے تو پھر پھلوں، میووں اور اناج کے موسم بنانے کی جگہ خدا کو چاہیئے تھا کہ قبل از وقت چیزوں کو پیدا کرنے کی جگہ وقتِ ضرورت ہاتھ کے ہاتھ پیدا کر دیا کرتا تب لوگ سال بھر کے لئے چیزیں ذخیرہ کر کے نہ رکھا کرتے۔

۲۔ ساڑھے چار ارب روحوں کی بات بھی مضحکہ خیز ہے، سوامی جی اگر صرف ایک گاؤں

ہے اور ساتھ ہی عظیم خطرات کی زد پر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں تین برسوں کے لیے یو جی سی کی دفعہ ۳ کے تحت یونیورسٹی کا درجہ دیا جارہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری یہ آزمائش کی جارہی ہے کہ ہم ایک حد تک بنیادی تعلیم، اساتذہ کی تربیت اور سماجی کام کے سلسلے میں جو کامیابی حاصل کرچکے ہیں اس طرح اعلا تعلیم کے میدان میں بھی خود کو نمایاں کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں یا نہیں۔

"اس مشکل امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے ہمیں دو باتیں درکار ہوں گی۔ خود اپنی جگہ پر ایقان اور ارادے کی مضبوطی، سخت محنت کی توانائی اور سرکاری سطح پر یہ کہ ہمیں بروقت معاشی امداد مل جائے۔ اول الذکر کے سلسلے میں میں پُرامید ہوں لیکن آخرالذکر کی بات پر پُرامید نہیں ہوں۔ ہمارے اپنے تمام تر نیک اندیشوں کے ساتھ حکومت نے اس کام میں (اس وقت سے جب مولانا آزاد نے سب سے پہلے جامعہ کی منظوری کا سوال اٹھایا تھا) بارہ سال لگادیے کہ عارضی طور پر ہماری حیثیت متعین کی جائے۔ اب اسے ہماری معاشی ضرورتوں کے تعین یا ان کے باضابطہ تعمیل کے کام میں بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ قانون اور پالیسی کے متعدد پیچیدہ سوال اور ضوابط اس راستے میں آسکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور وزارت تعلیم کے مابین طے کرنا ہوگا۔ وقتاً فوقتاً وزارت تعلیم کی مدد بھی درکار ہوسکتی ہے۔ اس دوران میں تین سال بعد جامعہ کی ناپ تول کی جائے گی اور (شاید) اسے (اپنے منصب کا اہل) نہ پایا جائے گا۔"

اس خط کے آخری حصہ میں عابد صاحب نے جواہر لال

کے پھر گن لیں تو وہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے اور جب یہ بات مسترد ہو جائے گی تو نظریہ تناسخ خود بخود مسترد ہو جائے گا۔

۳۔ جزا و سزا کا یہ کون سا نظریہ ہوا کہ انسان اس جنم میں جانتا نہیں کہ وہ پچھلے جنم کے کس جرم کی سزا بھگت رہا ہے یا کس چیز کا انعام پا رہا ہے۔

جواب تحقیقی

۱۔ روح چونکہ سوار ہے، جسم سواری اور اعضاء و جوارح آلات سواری ہیں، قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے فاعل کا پھر مفعول کا پھر آلات فعل کا وجود ہوتا ہے، اس بنا پر پہلے روح کا وجود ہونا چاہئے تاکہ وہ جسم پر سوار ہو سکے پھر جسم کا اور پھر آلات فعل کا۔

جس طرح سوار اوپر اور سواری نیچے ہوتی ہے اسی طرح روح اوپر ہے اور جسم نیچے ہے، جس طرح سوار حاکم اور سواری اس کی پابند ہوتی ہے اسی طرح روح حاکم اور جسم محکوم ہوتا ہے۔

۲۔ پنڈت جی کو کھربوں روحوں کے وجود پر حیرت ہو رہی ہے، حالانکہ خدا کی طاقت و شوکت سامنے رکھیں تو کچھ بھی تعجب کی بات نہیں، مگر کنویں کا مینڈک کنویں سے زیادہ بڑی کسی جگہ کا تصور نہیں کر سکتا، اسی طرح پنڈت جی کو کائنات اتنی ہی چھوٹی نظر آ رہی ہے جتنی اُن کی بساط ہے۔ (نوٹ: دور جدید کے سائنس دانوں نے کائنات کی وسعت کے بارے میں جو حیرت انگیز تفصیلات پیش کی ہیں اگر اُن کو سامنے رکھیں تو پنڈت جی کا اعتراض بے حد احمقانہ نظر آتا ہے۔)

۳۔ نظریۂ تناسخ کو رد کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل عقلی موجود ہے نہ دلیل نقلی، جہاں تک اس نظریہ کے نقلاً ثابت نہ ہونے کی بات ہے حقیقت یہ ہے کہ چاروں ویدوں میں اس کا ذکر نہیں اور اگر کہیں ہو بھی تو ویدوں کا کلام الٰہی ہونا خود ثابت نہیں، اس کے لیے نہ کوئی داخلی شہادت موجود ہے اور نہ خارجی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ویدوں میں غیر خدا کی پرستش کا حکم موجود ہے، جبکہ خدا اپنے کلام میں کسی غیر مستحق کو اپنی جگہ مستحق عبادت کس طرح قرار دے سکتا ہے، لازمی طور سے وید یا تو کلامِ انسانی ہیں یا تحریف شدہ ہیں۔

جہاں تک نظریۂ تناسخ کے عقلاً ثابت نہ ہونے کی بات ہے ساڑھے چار ارب روحوں والی بات تو قطعاً غیر معقول ہے ہی، ایک بہت مشہور دلیل جو اس ضمن میں دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں

نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

''یہی وہ اندیشہ ہے جو ماضی میں ہماری خدمات کا اعتراف نیز مستقبل کے لیے کچھ کر دکھانے کا موقع فراہم کیے جانے پر ہماری مسرت کو ملیا میٹ کر دیتا ہے آپ کی طرف اس امید کے ساتھ نگاہ اٹھاتا ہوں کہ شاید آپ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں جو عام ضابطوں اور مناسب واسطوں کی پیچیدگی کو سلجھا سکے اور ہمیں مناسب وقت کے اندر وہ وسائل فراہم کر دیے جائیں جن کے بغیر نہ تو ہم خود کو اس حیثیت کا اہل ثابت کر سکتے ہیں جو ہمیں دی گئی ہے اور نہ ہی یہ دکھا سکتے ہیں کہ یونیورسٹی علم کا ایک مقصد ہونے کے ساتھ ساتھ خدمت کا ایک میدان بھی ہو سکتی ہے...اس خیال سے کہ میں موزوں ارباب حل وعقد کو پھلانگتا ہوا آپ سے براہ راست درخواست کرنے کی بے اصولی کا قصور وار نہ سمجھا جاؤں، یہاں یہ واضح کر دوں کہ اس خط میں آپ سے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ جامعہ کے یوم تاسیس سے تا حال جن ستونوں نے اسے سنبھال رکھا ہے اس کے آخری ستون کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔''

چنانچہ ۱۹/جون ۱۹۶۲ کو جامعہ کو Deemed University کا درجہ دے دیا گیا ۱۹۷۵ء میں جب یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے ترمیم شدہ تنخواہیں تمام سینٹرل یونیورسٹیوں میں نافذ ہو گئیں اور انھیں جامعہ میں لاگو نہیں کیا گیا تو عابد صاحب نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے اس سلسلہ میں عملی اقدام کرنے کی درخواست کی۔

اگلے سال انھوں نے جامعہ کے سلسلے میں ایک منصوبہ تشکیل دیا اور ذاکر حسین ٹرسٹ بنانے کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے حکومت سے اپیل کہ وہ جامعہ کو ایک مکمل اردو یونیورسٹی کی حیثیت عطا کرے جو ایک رہائشی یونیورسٹی ہو اور اس کا کام تعلیم دینے کے

بہت سے پرہیزگار دکھ کی زندگی گزارتے ہیں اور بہت سے بدکار عیش وعشرت کی، لازماً یہ اُن کے پچھلے جنم کے اعمال ہی کا پھل ہے۔

ا۔ اس دلیل میں سب سے کمزور بات یہ ہے کہ راحت و تکلیف کو جزا و سزا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ہم کسی مسافر کی مدد کرتے ہیں جبکہ وہ اس کے کسی عمل کی جزا نہیں ہوتی، ڈاکٹر مریض کو کڑوی دوا پلاتا ہے حالانکہ وہ سزا نہیں ہوتی، والدین اپنی اولاد کو ڈانٹتے ہیں حالانکہ وہ سزا نہیں تربیت ہوتی ہے۔

اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ نہیں اللہ تو راحت و تکلیف کو بطورِ جزا و سزا ہی پہونچاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے خدا سے بھی زیادہ ہوئے جن کے یہاں راحت و تکلیف، تعلیم و تربیت، سخاوت و مروّت اور اصلاح و تزکیہ کی بنا پر بھی ہوتی ہے، گویا بندے مربی بھی ہو سکتے ہیں اور سخی بھی لیکن خدائے تعالیٰ صرف ایک سخت گیر داروغہ ہے جو محض سزا یا جزا دیتا ہے۔

ب۔ نظریۂ تناسخ اس لئے بھی غیر معقول ہے کہ انسان کو جب یہ خبر ہی نہیں کہ اُسے کس چیز کی جزا یا سزا مل رہی ہے تو یہ کیا جزا سزا ہوئی اور اس سے اس کے اعمال کی کونسی اصلاح ہوئی جبکہ نظریۂ تناسخ کے تحت راحت و تکلیف کی معنویت ہی یہ ہے، اسلامی نقطہ نظر میں تو جزا و سزا کے وقت گزشتہ اعمال کا یاد رکھنا ضروری ہی نہیں ہوگا کیوں کہ وہاں تو جزا و سزا برائے تربیت نہیں مقصود بالذات ہے اور انتہائے اعمال کے بعد ہے۔

اگر کوئی شخص عہد الست کے بارے میں یہ سوال اُٹھائے کہ وہ بھی تو ہم کو یاد نہیں پھر اس سے کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نظریۂ تناسخ اور عہد الست میں فرق ہے، کیونکہ نظریۂ تناسخ میں راحت و تکلیف برائے تربیت ہیں اور عہد الست کے واقعہ کا تعلق تعلیم سے ہے اور تعلیم میں مقصود صرف حصولِ علم ہے، اس کے حصول کی کیفیت اور زمان و مکان کا یاد رکھنا ضروری نہیں ہے۔

ج۔ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کا اصل مقصد عبادت ہے، کائنات کی ساری اشیا عبادت کے اس عمل میں انسان کی معاون ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان تو سب چیزوں کا محتاج ہے مگر یہ چیزیں انسان کی محتاج نہیں گویا انسان کی حیثیت اصل عامل کی ہے، باقی اشیاء انسان کی خادم ہیں۔

اگر کائنات کی تمام اشیاء کا مقصد انسان کی خدمت ہے تو سوال یہ ہے کہ انسان کا مقصد کیا

علاوہ خط وکتابت کے ذریعہ تعلیم فراہم کرنا ہو جس میں ذریعہ تعلیم اردو ہو، جن کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہو وہ جامعہ سے الحاق منظور کرائیں، جو اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ قومی اتحاد واستحکام کے جذبہ کے ذریعہ سیکولر جمہوری نقطہ نظر پیدا کرے، جو پیشہ ورانہ کورسز شروع کرے اور جو عربی مدارس کے گریجویٹوں کے لیے خصوصی تعلیم کا انتظام کرے۔

عابد صاحب کا یہ پلان حقائق پر مبنی تھا اور یہ وہ آخری خدمت تھی جو انھوں نے جامعہ کے تئیں جامعہ سے باہر رہ کر انجام دی۔

عابد صاحب مختلف اداروں اور تنظیموں سے وابستہ رہے۔ وہ گاندھی اسمارک ندھی کے ٹرسٹی اور اس کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ ترقی اردو بورڈ کے رکن تھے۔ اور اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی اور دوسری کمیٹیوں کے کنوینر رہے۔ اس کے علاوہ وہ اردو انسائکلو پیڈیا اور اردو انگریزی لغت کے بورڈ کے چیئرمین بھی تھے۔

۱۹۶۰ء میں انھیں آل انڈیا ریڈیو کا ادبی مشیر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے Islam and Modern Age کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی نام سے ''اسلام اور عصر جدید'' کے عنوان سے اردو اور انگریزی رسائل جاری کیے۔

عابد صاحب صاحب طرز ادیب اور ممتاز مترجم تھے اور زود گو شاعر بھی۔ ان کی تصانیف اور تراجم کی تعداد چالیس سے زائد ہے اردو میں ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً دس ہے اور انگریزی تصانیف نو ہیں۔ اردو میں ان کی تصانیف ہندستانی قوم پروری، ثقافت اور عصری سماجی وسیاسی موضوعات پر ہیں۔ ان میں بزم'' بے تکلف'' '' ہندستانی قوم پروری اور ہندستانی ثقافت'' (تین جلدوں میں) ''مجموعہ مضامین'' ''ہندستان کی قومی ثقافت'' '' ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں'' اور ''مسلمان اور عصری مسائل'' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کے تراجم کی تعداد ۲۳ ہے۔ ان میں فلسفہ، سماجی علوم، ادب، سوانح وغیرہ کے ترجمے شامل ہیں انھوں نے گاندھی جی کی خودنوشت '' تلاش حق'' نہرو کی ''آپ بیتی'' اور '' دنیا کی جھلک'' کو اردو دانوں سے روشناس کرایا۔ حکومت ہند نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۶ء میں انھیں پدم بھوشن سے نوازا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب عابد صاحب الہ آباد میں زیر تعلیم تھے ان کی شادی اپنے چچا سید

ہے؟ ظاہر ہے یہی کہ وہ اپنے خالق کی عظمت کا اعتراف کرے، عجز و نیاز کا اظہار کرے کہ یہ چیز دوسری اشیاء سے ممکن نہیں اور چونکہ خدا کے پاس عجز و نیاز کے علاوہ سب کچھ ہے اس لیے اس کا مطلوب یہی ہے، کیوں کہ ہر ایک کو وہی شے مطلوب ہوتی ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔

چونکہ پوری کائنات فعل عبادت میں انسان کی معاون ہے، اس لیے یہاں کی راحت و تکلیف بھی منجملہ عبادت ہوگی جبکہ نظریہ تناسخ میں یہ جزا و سزا ہوگی اور یہ چیز محال ہے کہ ایک چیز عبادت بھی ہو اور اس کی جزا یا سزا بھی ہو۔

د۔ نظریۂ تناسخ کے غیر معقول ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ انسان بچپن سے بڑھاپے تک روحانی و جسمانی ارتقا کے متعدد مراحل سے گزرتا ہے یہاں تک کہ ایک انتہا پر پہونچ کر یہ سلسلہ رُک جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے کوئی چیز پھر اپنی ابتدائی حالت کی طرف آنا چاہے تو اُسے لازماً وہی مراحل طے کرنے چاہئیں جو اس نے ارتقاء کے وقت طے کیے تھے، اگر تناسخ کا نظریہ مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک روح اپنے ارتقائی سفر کے دوران جس آخری منزل تک پہونچی ہے وہاں سے اُسے واپسی کا سفر طے نہیں کرنا پڑتا اور یک لخت دوسرے جسم میں اپنی ابتدائی حالت میں آجاتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی آسمان میں ڈھیلا پھینکے اور ڈھیلا آخری اونچائی تک پہونچ کر نیچے گرے بغیر پھر پھینکنے والے کے ہاتھ میں آجائے، ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔

روح کو جو صفات عارض ہوتی ہیں اُن کا جسم سے ایک لخت جدا ہو کر نسیاً منسیا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً کوئی انسان حلیم و بردبار ہوتا ہے، کوئی غصیلا ہوتا ہے، کوئی بخیل، کوئی غنی اور کوئی فہیم و عقل مند۔ یہی حال علوم و کمالات کا ہے وہ اگرچہ روح کو عارض ہوتے ہیں مگر کسی جسم سے اس طرح ان کی یک بارگی جدائی ممکن نہیں جیسے چراغ کے ہٹاتے ہی دیوار سے روشنی غائب ہو جائے، کیوں کہ چراغ کی روشنی دیوار سے بالکل جدا ایک چیز ہے جب کہ روح کی صفات جسم میں پوری طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ ایک دم جدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ کہنا کہ بے ہوشی میں تو روح کمالات علمیہ سے جدا ہو جاتی ہے درست نہیں ہے، کیوں کہ بے ہوشی میں کمالات علمیہ زائل نہیں ہوتے بلکہ چھپ جاتے ہیں اور بے ہوشی کی چادر ہٹتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی وجہ سے نظریۂ تناسخ ایک غیر عقلی و غیر علمی نظریہ قرار پاتا ہے۔

مہدی حیدر کی بیٹی شفاعت بیگم کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لیے خاندان کے افراد اور اپنے والد کے اصرار پر وہ ۷/اپریل ۱۹۳۳ء کو ڈاکٹر غلام السیدین کی بہن مصداق بیگم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے جو دنیائے ادب میں صالحہ عابد حسین کے نام سے معروف ہوئیں۔

۱۹۷۴ء سے عابد صاحب علیل رہنے لگے تھے وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۷۸ء کی تیرہویں دسمبر کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ان کے انتقال پر جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے لکھا:

"ان کے اٹھ جانے سے سب کے لیے ایک برکت اٹھ گئی اور جامعہ کا ایک ستون گر گیا۔ آخری زمانے میں انھیں جامعہ کی جانب سے بڑی تشویش رہتی تھی جس کا اظہار اکثر اس گفتگو میں کرتے تھے جو میرے اور ان کے درمیان سر بستر بیماری ہوتی تھی۔"

ممتاز ادیب خواجہ احمد عباس نے لکھا:

"وہ نہ صرف ایک پکے اور سچے مسلمان تھے جنھوں نے ہمیشہ اسلام کے اصولوں پر چل کر دکھایا، وہ نہ صرف سچے اور پکے ہندستانی تھے جنھوں نے اپنی زندگی اور عمل سے یہ دکھایا کہ وطن سے محبت اپنے مذہب پر چل کر بھی کی جا سکتی ہے ......وہ ایک سچے انسان اور انسان دوست تھے انسانیت ان کی انسانیت پر ناز کر سکتی ہے۔"

اعتراض ۵

اہلِ اسلام کے بقول اگر کوئی مرد کسی کو روزہ افطار کرادے تو اسے ۷۰ حوریں ملیں گی اگر عورت کسی کو روزہ افطار کرادے تو اسے ۷۰ مرد ملنا چاہئیں۔ مگر اہلِ اسلام کے بقول ایسا نہیں ہوسکتا تو عورت اور مرد میں یہ امتیاز کیسا؟

جواب الزامی

ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے، لہٰذا اصولی طور سے یہ اعتراض ایک غلط بنیاد پر قائم ہے، البتہ جس طرح دنیا میں ایک مرد کو متعدد بیویاں رکھنے کا حق ہے مگر عورت کو متعدد شوہر رکھنے کا حق نہیں اسی طرح جنت میں ایک مرد کو متعدد حوریں مل سکتی ہیں، اس صورت میں یہ اعتراض وہی مشہور اعتراض ہے جو تعدد ازدواج کے تعلق سے غیر مسلموں کی طرف سے کیا جاتا ہے اور جس کے ہر گوشے پر علماء اسلام روشنی ڈال چکے ہیں۔

جواب تحقیقی

عورت کو اولاد کے حوالے سے وہی حیثیت حاصل ہے جو پیداوار کے حوالے سے کھیت کو حاصل ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ ایک کھیت کی پیداوار کئی کسانوں میں اس لئے تقسیم ہوسکتی ہے کہ وہ یکساں ہوتی ہے، مگر ایک عورت کی اولاد کئی باپوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی ہے، وجہ یہ ہے کہ اولاد میں صورت، شکل اور ذہانت وصلاحیت کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے، لہٰذا ایسی تقسیم باعث نزاع ہوگی، اسی طرح ایک عورت اگر کئی مردوں کے نکاح میں ہو اور بیک وقت سارے شوہروں کو یا کئی شوہروں کو جنسی ضرورت پیش آجائے تو ایک ساتھ اس کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ یہ چیز باعث نزاع بن جائے گی، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ایک عورت کے متعدد شوہر نہ ہوں۔

۲۔ جنت میں مردوں کو بہت سی حوریں ملنا اور عورت کو صرف اس کا شوہر ملنا ہی مناسب ہے، وجہ یہ کہ جنت انعام کی جگہ ہے اور انعام میں وہ شے دی جاتی ہے جو باعث راحت وعزت ہو، اسلام اگرچہ مرد وعورت دونوں کو یکساں حقوق دیتا ہے مگر ازدواجی رشتہ میں عورت چونکہ ماتحت ہوتی ہے اور مرد نگراں، ایک نگراں کے کئی ماتحت ہوسکتے ہیں لیکن ایک ماتحت کے کئی نگراں ہوں تو یہ چیز خود اس (عورت) کے لئے باعث اذیت نہ ہوگی؟ یہ کوئی جزا نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

۱۸۹۷ء تا ۱۹۶۹ء

ذاکر حسین ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد فدا حسین اپنے آبائی وطن قائم گنج کی سکونت ترک کر کے ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ وہاں انھوں نے پریس قائم کر کے قانون کی کتابوں کی اشاعت کے کاروبار کا آغاز کیا اور "آئین دکن" نامی جریدے کا اجرا کر کے خاصی دولت کمائی اور ایک شاندار مکان بھی تعمیر کر والیا۔ شدید محنت کے سبب ان کی صحت استقدر متاثر ہو گئی کہ وہ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اپنے وطن قائم گنج لوٹ آئے جہاں ۱۹۰۷ء میں ان کی وفات ہو گئی۔

فدا حسین کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے افراد قائم گنج ہی میں آباد ہو گئے۔ حیدر آباد میں ذاکر حسین نے ابتدائی تعلیم گھر کی چہار دیواری میں حاصل کی تھی۔ وطن واپسی کے بعد ان کا داخلہ پانچویں جماعت میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں کرادیا گیا جہاں وہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک زیر تعلیم رہے۔ اٹاوہ کے اسکول نے ان کے دل پر دیرپا نقوش مرتسم کیے۔ وہ اپنے شفیق صدر مدرس سید الطاف حسین اور نیجر مولوی بشیر الدین کی شخصیتوں سے بے پناہ متاثر ہوئے اور اپنی زندگی کے ہر دور میں ان کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان دونوں اساتذہ کے علاوہ ذاکر حسین کی شخصیت سازی میں ان کی والدہ کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔

ان کی والدہ کا نام نازنین بیگم تھا۔ ذاکر صاحب کی بیٹی سعیدہ خورشید نے لکھا ہے کہ "نازنین بیگم میں بڑی سادگی تھی۔ صبر و تحمل اور بردباری تھی۔ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتی تھیں، بڑی نیک دل تھیں۔ ان کی سخاوت اور خدا ترسی کا ذکر قائم گنج کی خواتین میں ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو دیتی لیتی رہتی تھیں۔ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ جس سے ملتیں تواضع اور انکسار سے ملتیں۔ نوکروں سے برابر کا سلوک کرتیں اور سب کی طرح ان کے آرام کا خیال رکھتیں۔ رکھ رکھاؤ ان کا ایسا تھا کہ سب ان کا دم بھرتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتی تھیں اور جب انھیں اندازہ ہوا کہ قائم گنج میں ان کی تعلیم کا اچھا انتظام ممکن نہیں تو انھوں نے اپنے جگر گوشوں کو اپنے سے دور بھیجنا گوارا کیا اور جب ان پر طاعون کا حملہ ہوا تو بچوں کی پریشانی اور ان کی تعلیم میں رکاوٹ کے خیال سے اپنی

اعتراض ٦

اسلام کی رو سے توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور گناہ گار سزا سے بچ جاتا ہے، حالانکہ یہ نظریہ غیر منصفانہ ہے۔ جس طرح ایک نیک انسان کو جزا سے نوازا جاتا ہے، ایک بدکار کو لازمی طور پر سزا ملنی چاہئے، نظریہ تناسخ کی رو سے اعمال کی جزا و سزا ایک ضابطہ کے تحت آجاتی ہے اس لئے یہی نظریہ معقول ہے۔

جواب الزامی

یہ عقیدہ تو خود ہندوؤں کی مقدس کتابوں مہابھارت وغیرہ میں موجود ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ سوا تھربن وید میں ذکر الٰہی سے گناہ معاف ہو جانے کا ذکر ہے، ظاہر ہے توبہ بھی ایک ذکر الٰہی ہی ہے جو احساساتِ ندامت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

جواب تحقیقی

حاکم اگر کسی کا حق دبا لے یا کسی مظلوم کو اس کا حق نہ دلوائے تو یقیناً قابل اعتراض ہے، لیکن اگر وہ اپنا حق چھوڑ دے اور معاف کر دے تو یہ ظلم نہیں بلکہ اس کی مہربانی ہے، البتہ یہ مہربانی صرف اُن بندوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے مستحق بن چکے ہوں۔ اس لئے توبہ کی مقبولیت کے لئے ایمان کی قید لگائی گئی اور جزا کے لئے عملِ صالح کی۔

اعتراض ۷

جانوروں کی حلت و حرمت کے بارے میں اسلامی نظریہ غیر معقول ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا تو جانور حلال ہو گیا، اس طرح تو اگر شیر اور چیتے کو بھی بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دیں تو اُسے حلال ہو جانا چاہئے اور اگر حلت موت سے آتی ہے تو جو بھی جانور مر جائے اس کو حلال ہونا چاہئے، چند جانوروں کی کیا تخصیص ہے۔

جواب الزامی

خود ہندوؤں کی مذہبی کتب میں یہی بات موجود ہے جس پر اعتراض کیا جا رہا ہے، مہابھارت میں ہے کہ جن جانوروں کے قتل کے وقت وید پڑھا جائے اُن کا گوشت پاک ہے، اسرب پنکھ رکھ وید میں یہ بھی تخصیص ہے کہ قابل خوراک جانور وہ ہیں جن کے نیچے کے دانت ہوں اوپر کے نہ ہوں۔

بیماری کی اطلاع تک نہ دی اور بچوں کو آخری بار دیکھنے کا ارمان دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں"۔ ان کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔ ان کے بارے میں خود ذاکر صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا "آج سب سے پہلے یاد آتی ہے اپنی ماں کی کہ ان سے جو پایا اس کا حساب ممکن نہیں"۔

والدہ کے ساتھ ہی ذاکر حسین پر جن شخصیتوں کے اثرات مرتب ہوئے ان میں حسن شاہ نامی ایک صوفی بزرگ کا نام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

اٹاوہ ہی میں ذاکر صاحب "الہلال" "کامریڈ" اور "ہمدرد" میں مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی کی تحریروں سے متاثر اور قوم پروری کے جذبات سے سرشار ہوئے انھیں دنوں جنگ بلقان کا آغاز ہو گیا اور ترکوں کو زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنا پڑا۔ ان واقعات سے ہندستان کے مسلمان شدید طور سے متاثر ہوئے۔ ذاکر صاحب نے گوشت خوری ترک کردی اور جو رقم اس سے پس انداز ہوتی تھی وہ اسے ترکوں کی مدد کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اخبار بینی کرتے تھے اور اس کی خبروں کو باآواز بلند اپنے حلقۂ احباب میں پڑھ کر سناتے تھے تاکہ ان کا شعور اور ضمیر بھی بیدار ہو سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا سیاسی شعور اس عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی زیادہ بالیدہ تھا۔ وہ ترکوں کی مظلومیت اور اٹلی کے مظالم پر تقریریں کرتے تھے اور ترکوں کی امداد کے لیے چندہ اکٹھا کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کی ترتیب کے سلسلے میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔

۱۹۱۳ء میں ذاکر صاحب نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور سائنس کی تعلیم کی تکمیل کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ لے لیا تاکہ وہ ڈاکٹر بن سکیں۔ اس کے بعد وہ لکھنو کے کرسچین کالج میں داخل ہو گئے لیکن بیماری کے سبب انھیں ڈاکٹر بننے کا اپنا ارادہ ترک کر دینا پڑا لیکن ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ میں بی۔ اے میں داخلہ لے لیا جہاں سے انھوں نے ۱۹۱۸ء میں امتیازی حیثیت سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ انھیں الہ آباد یونی ورسٹی کے اقبال میڈل کا مستحق بھی قرار دیا گیا۔ ان دنوں ایم۔ اے۔ او کالج کا الحاق الہ آباد یونی ورسٹی کے ساتھ تھا۔ وہ ایک پابند نمازی طالب علم تھے لہٰذا انھیں نماز میں حاضری کے سلسلے میں سنی دینیات کے انعام سے بھی نوازا گیا۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ان کی شادی ۱۹۱۵ء میں شاہ جہاں بیگم کے ساتھ ہو گئی۔

کالج میں انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ناموری حاصل کی۔ وہ اسٹوڈینٹس یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے اور مضمون نگاری میں طاق ٹھہرائے گئے۔ مترجم کی حیثیت سے

جواب تحقیقی

ہمیں سوچنا چاہئے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا صرف اجازت ہی اس کی وجہ ہوتی ہے تب اگر کوئی شخص اپنا بول و براز کھانے کی اجازت دیدے یا اپنی ماں بہن بیوی کے استعمال کی اجازت دیدے تو یہ چیزیں استعمال کے لئے جائز ہو جائیں گی، اجازت سے پہلے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اشیاء میں حلال ہونے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا بسم اللہ پڑھ کر صرف وہی جانور حلال ہوں گے جن میں حلال ہونے کی ذاتی صلاحیت موجود ہو۔

۲۔ خدا کے نام میں یہ تاثیر موجود ہے کہ ذبیحے کو حلال کر دے مگر اس تاثیر کا تعلق صرف اُن جانوروں سے ہے جن کو کھانے کی اجازت اسلام نے دی ہے، جن جانوروں کا گوشت استعمال کرنے کی اجازت نہیں ان میں بسم اللہ کی تاثیر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

اعتراض ۸

اسلامی عقیدے کے مطابق جنت میں شراب کی نہریں ہیں۔ آخر شراب جنت میں حلال کیوں ہو جائے گی اور جنت کی اُن نہروں کا طول و عرض کیا ہے؟ کہاں ہیں؟ بہاؤ کا رخ کیا ہے، اُن کی شراب سڑتی کیوں نہیں؟

جواب الزامی

ویدوں میں خود شراب کے حوض اور نہروں کا ذکر ہے، لہٰذا پنڈت جی کے یہ سارے سوالات خود اُن پر عائد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر اس طرح کے سوالات کو اہمیت دے کر جنت کی نہروں کے بارے میں ساری تفصیلات مہیا کر بھی دی جائیں تو اس کی افادیت کیا ہے؟

رہا یہ کہ جنت میں شراب حلال کیوں ہو جائے گی تو اس طرح کی چیزیں بھی خود مہابھارت اور ہندوؤں کی دیگر مقدس کتب میں موجود ہیں۔ مہابھارت کے پرب اول میں ہے کہ شراب پہلے زمانے میں برہمنوں پر حلال تھی اب حرام ہو گئی۔

۲۔ اگر جنت کی نہروں پر تب ہی ایمان لایا جائے گا جب اُن کا طول و عرض، مقام اور بہاؤ کا رخ معلوم ہو جائے تو اس اصول پر تو جنت کی نہریں دور رہیں خود دنیا کے حوضوں اور نہروں میں شاید ہی اس شرط پر کوئی پوری اُترے۔ کیا کوئی گنگا کا صحیح طول و عرض اور ہر جگہ اس کے عمق وغیرہ کی

بھی ان کا شمار ممتاز شخصیتوں میں ہونے لگا کیونکہ اسی زمانے میں انھوں نے افلاطون کی تصنیف "ری پبلک" کا ترجمہ شروع کر کے شہرت حاصل کی تھی۔ انھوں نے "رپ" (Rip) کے نام سے کالج میگزین میں مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ بعد ازاں ذاکر صاحب نے ایم۔اے۔ معاشیات کے ساتھ ہی ایل ایل بی میں بھی داخلہ لے لیا۔ ایم۔ اے کے فائنل سال میں انھیں کالج میں اسسٹنٹ لکچرار مقرر کر دیا گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ایم۔اے۔او۔ کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دیے جانے کے سلسلے میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا، مسلمان رہنما دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ان میں حکومت نواز رہنماؤں کا خیال تھا کہ حکومت کی سرپرستی یونی ورسٹی کے مستقبل کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک یونی ورسٹی کی حیثیت حکومت کے دائرے میں محدود نہ ہو کر ایک آزاد دانشگاہ کی ہونی چاہیے تھی۔ اس ضمن میں رہنماؤں نے سرسید کی فکر کو اتفاق اور اختلاف کا نقطہ قرار دیا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے الفاظ میں:

"ذاکر صاحب بنیادی طور پر سرسید کی فکر سے متفق تھے۔ وہ جس نصب العین کو لے کر اٹھے تھے اس کی عظمت اور ہمہ جہتی کی متوقع نتیجہ خیزی کے معترف بھی تھے۔ سرسید کا مقصد مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ تھا، یعنی اشاعت تعلیم کے وسیلے سے مسلمانانِ ہند کی مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاح و ترقی کا سامان کرنا تھا، شاید وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ آگے چل کر اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہو گی۔ ذاکر صاحب اس سطح پر سرسید کی دور اندیشی کو سراہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک بڑا کام تھا، اہم کام تھا اور ایسا کام تھا کہ اس کے لیے زندگیاں کھپا دی جائیں۔ لیکن ذاکر صاحب کو سرسید کی قیادت سے اگر کوئی شکایت تھی تو وہ یہ کہ انھوں نے اس عظیم نصب العین کا سودا بہت کم پر کر لیا اور ہاتھ آیا تو صرف کالج جو غلام ہندوستان میں انگریزی حکومت کو چلانے کے لیے ماتحت اور وفادار عہدہ دار پیدا کرتا ہے۔"

اپنے ایک انگریزی مضمون Eternity or Joy میں، جس کے اقتباسات پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے اپنی مشہور تصنیف "شہید جستجو" میں پیش کیے ہیں ذاکر صاحب نے لکھا تھا:۔

> "اس سلسلے میں جو بات بہت واضح ہے وہ تعلیم کو سیاست سے علاحدہ رکھنے کی احتیاط ہے جس کی سرسید برابر تلقین کرتے رہے اور علی گڑھ کے ذمہ دار آج تک اس کے قائل ہیں۔ اگر تھوڑا سا سوچ بچار کیا جائے تو اس نظریے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ انسانی جسم ایک جیتا جاگتا جسم نامی ہوتا ہے، اس لیے انسانی سرگرمیوں کو خانوں میں بانٹنا ایک ایسی بات ہے جسے سوچا بھی

تفصیلات مہیا کرسکتا ہے۔ تو کیا محض اس وجہ سے گنگا کے وجود پر یقین نہ کریں؟

۳۔ جہاں تک شراب نہ سڑنے کا سوال ہے تو خود پنڈت جی کے نزدیک بھی بہتی ہوئی شراب نہیں سڑتی۔ لہٰذا جنت کی بہتی نہروں کی شراب کیوں سڑے گی، جو خدا دنیا میں سینکڑوں نہروں اور جھیلوں کو سڑنے سے بچاتا ہے وہی جنت میں نہروں کو سڑنے سے بچائے گا۔

جواب تحقیقی

جنت کی نہریں آلودگی سے پاک ہیں غذاؤں کے متعفن مادے وہاں نہیں ہیں، آفتاب کی حرارت وہاں نہیں، زمین کی کدورت وہاں نہیں تو پھر وہاں نہریں کیوں سڑیں جو صفائی اور تنقیح کے اُن مراحل سے گزر رہی ہیں جن میں فضلہ کا نام ونشان تک نہیں اور اجزائے کثیفہ سے پاک ہیں۔

دنیا میں شراب جو حرام ہے وہ نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام ہے، یہ بات خود ہندو مذہب کی کتابوں مہابھارت وغیرہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ شراب سے اگر نشہ زائل ہو جائے تو وہ حرام نہیں رہتی۔ مثلاً سرکہ حلال ہے، جنت کی شراب میں نشہ نہیں ہے اس لئے وہ حلال ہے۔

۲۔ جنت کی شراب میں اگر نشہ ہو تب بھی وہ حلال ہونی چاہئے، چوں کہ نشہ انسان کے دینی واخلاقی فرائض کی ادائیگی میں حارج ہے اس لئے ممنوع ہے اور جنت میں آدمی تمام فرائض وواجبات سے سبکدوش ہوگا۔ لہٰذا جنت کی شراب اگر نشہ آور بھی ہو تو اس کے حلال ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

اعتراض ۹

دفن میت کا اسلامی طریقہ موزوں نہیں ہے۔ اس سے بہتر تو مردوں کو جلا دینا ہے، دفن کی صورت میں زمین مردے اور لاش کی آلائشوں کی وجہ سے ناپاک ہو جاتی ہے، جلانے کی صورت میں آلودگی کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔

جواب الزامی

دفن میں تو زمین کا اندرونی حصہ ہی آلودہ ہوتا ہے، جلانے میں تو زمین کا باہری حصہ اور ساری خارجی فضا آلودہ ہو جاتی ہے۔ ہوا مسموم ہو جاتی ہے جس سے انسانوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

جواب تحقیقی

انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے، روح جوہر لطیف اور جسم تو دۂ خاکِ کثیف ہے۔ اِس تضاد

نہیں جاسکتا۔ آپ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم آپ کو ساری چیزوں سے علاحدہ کر کے تعلیم دیں گے اور وہ چیزیں اپنا کام آپ کرلیں گی۔۔۔ اس لیے یہ بات کہ تعلیم کو سیاست سے الگ رکھا جائے جیسا کہ بظاہر سرسید چاہتے تھے نہ تو ممکن تھی اور نہ مناسب، اور یہ اس لیے کہ تعلیم کسی طرح بھی اتنی آسان چیز نہیں جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ سچی تعلیم کا مقصد چونکہ اچھے شہری پیدا کرنا ہے اس لیے تعلیمی وسیاسی کوششوں کو الگ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک ایسی دنیا کے افراد تیار کر رہے ہیں جن کا اس دنیا کی تشکیل میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ایسی غیر فطری علاحدگی ماحول سے بے تعلقی اور دوری پیدا کر دیتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے قدیم طلبہ کی صفوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنے بھائی انسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ ان خیالات سے حتمی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وقت آگیا ہے جب علی گڑھ خود اپنے کو جانچے، اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے اور مستقبل کے لیے ایک واضح نصب العین کا تعین کرے۔ یہ اس لیے کہ صحیح اور ٹھوس تعلیمی حکمت عملی کے لیے ایک واضح نصب العین ضروری ہے۔ ملی ضرورت یا ملت کی تقدیر کے لیے اگر کوئی ایسا نصب العین سامنے نہ رہا تو تعلیم ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے گی اور جب ہم سوچ سمجھ کر اور دیدہ ودانستہ کوئی ایسا نصب العین متعین کر رہے ہوں تو ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے کہ یہ نصب العین معمولی اور کمتر حیثیت کا نہ ہو۔ ایک کمتر درجے کے نصب العین کا حصول بعض اوقات بے قدری اور تنزل کا سبب بن جاتا ہے۔"

یہ خیالات اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ ذاکر صاحب کو یوں تو سرسید کی نیت اور ان کے عمل سے اتفاق تھا لیکن وہ ان کے نظریات سے متفق نہیں تھے۔ دراصل وہ ایک ایسی یونی ورسٹی کے قیام کے خواہاں تھے جس کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور جو قومی مقاصد کی تکمیل کرنے کی مجاز ہو۔ اور یہی خیالات تمام قوم پرور مسلمانوں کے بھی تھے جو علی گڑھ کو حکومت کے قبضہ اور اثر سے آزاد کر کے ہندستانی قومیت سے ہم آہنگ کرنے کے خواہش مند تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں حکومت مخالف خیالات کو انھی وجوہات نے ہوا دی جن میں مولانا آزاد اور محمد علی کی تحریریں، جنگ بلقان، تقسیم بنگال کی منسوخی، ڈاکٹر انصاری کا طبی مشن، مسجد

کے باوجود روح جو عالمِ علوی کا نور ہے، جسم کثیف میں بسیرا کرتی ہے اور جب اللہ کا حکم ہوتا ہے جدا ہو جاتی ہے۔ اس ملنے یا جدا ہونے میں روح یا جسم کسی کا دخل نہیں، لہٰذا روح و جسم کی علیحدگی کے بعد جسم کو کیوں سزا دی جائے؟ بہتر یہی ہے کہ اس کو اعزاز و اکرام کے ساتھ خاک ہی میں پہونچا دیا جائے۔

اگر دفن اس لئے ممنوع قرار دیا جائے کہ اس سے زمین آلودہ ہو جاتی ہے تو پھر تو بول و براز تک ممنوع ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس سے زمین کی آلودگی کہیں زیادہ ہوتی ہے، جبکہ بول و براز کا عمل تو اختیاری ہے موت تو غیر اختیاری عمل ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صورتِ حال برعکس ہے، زمین پاک ہے اور اس میں اشیاء کو پاک کرنے کی تاثیر ہے، لہٰذا دفن کے بعد تو زمین خود جسم میت کو پاک کر دیتی ہے اور کسی آلودگی و نجاست کا نام و نشان نہیں رہتا۔

جلانے کا طریقہ توہین آمیز اور اذیّت ناک ہے، اس سے خود مردہ کے اعزّہ اور دیگر جانداروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جلتے وقت مردے کے بدن سے نکلنے والی بدبو نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے، مردے کی مسخ شدہ صورت پر نگاہ پڑتی ہے، اس کے جراثیم فضا میں سرایت کرتے ہیں، اس کے برخلاف میت کو نہلا دُھلا کر عطر و خوشبو لگا کر سفید باوقار کفن میں اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کرنے سے مردے کی تکریم ہوتی ہے۔

۲۔ دفن کے ذریعہ میت کے عناصر اربعہ زمین میں جا کر اپنی اپنی اصل میں جا ملتے ہیں جس سے زمین کی قوت نمو میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ غور کریں کہ جب جسم کا فضلہ بول و براز تک زمین کی قوت نمو میں اضافہ کرتا ہے تو خود جسمِ انسانی اُس میں اضافہ کیوں نہ کرے گا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قبرستان اور اس کے قرب و جوار کے علاقے سرسبز و شاداب ہوتے ہیں، اپنے عناصر اربعہ کے ساتھ میت زمین میں جا کر اس طرح لیٹ جاتی ہے جیسے بچہ مادر مہربان کی آغوش میں سو جاتا ہے اور اس کی مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

اعتراض ۱۰

اسلام کے مطابق انسان مرنے کے بعد قیامت اور حساب کتاب کے مراحل سے قبل برزخ کی زندگی گزارتا ہے، جس میں اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو حوالات میں بیٹھا اپنے

کانپور کا خونین واقعہ، شیخ الہند کی ریشمی رومال تحریک، جیسے واقعات شامل ہیں۔

اسی زمانے میں پہلی عالمگیر جنگ اپنے اختتام کو پہنچی جس میں ترکی نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ جنگ نے ہندستانی مسلمانوں کو ایک غیر یقینی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا کیونکہ ترکی کا سلطان خلیفۃ المسلمین بھی تھا اور اتحادیوں کے خلاف جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر چکا تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر مسلمانوں کے تئیں اتحادیوں کے حملے سے مسلمانوں کے مقامات مقدسہ محفوظ نہیں تھے۔ لیکن وائسرائے اور وزیر ہند نے انھیں یقین دلایا تھا کہ مقامات مقدسہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی تاہم ۱۹۱۸ء میں جب جنگ کا خاتمہ ہو گیا تو دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے اتحادیوں نے اس کے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کر لینے کا منصوبہ بنالیا۔

رولٹ کمیٹی کی سفارشات پر جب ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کی جگہ دو بل مجلس قانون ساز میں پیش ہوئے تو ان کی مخالفت میں گاندھی جی نے ہندستان گیر مہم کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے ہر جگہ قوم پروروں کے مظاہروں، جلسوں اور جلوسوں کو اپنے مظالم سے کچل دینے کا تہیہ کر لیا جس کی بدترین مثال امرتسر کے جلیان والا باغ کے وحشیانہ قتل عام نے پیش کی جس کا مجرم جنرل ڈائر تھا۔

خلافت کے مسئلہ کو سلجھانے، ترکی کے انتشار کو ختم کرنے اور مسلمانوں کے جذبات کو حکومت کے خلاف ابھارنے کے سلسلے میں مرکزی خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا، علماء نے اپنی خانقاہوں کو تج کر گوشہ نشینی کی زندگی کو خیر باد کہہ کر جمعیۃ علماء کی بنیاد رکھی تو حکومت کے خلاف فتوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

ایسے عالم میں گاندھی جی نے حکومت سے، عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کا لائحۂ عمل تیار کیا تو سبھی مسلمانوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس پروگرام میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ سرکاری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ اس پروگرام کو قرارداد کی شکل میں انڈین نیشنل کانگریس کے ناگ پور اور کلکتہ کے اجلاسوں میں بھی بڑی اکثریت سے منظور کر لیا گیا۔

تعلیمی درسگاہوں سے متعلق شق پر عمل آوری کی غرض سے علی برادران نے گاندھی جی کے پروگرام کے آغاز کے لیے علی گڑھ کا نام تجویز کیا۔ ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے گاندھی جی نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں زیر تعلیم طلبہ کے والدین کے نام ایک اپیل جاری کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ کے طالب علموں کے والدین بھی دوسرے والدین کی طرح اس ضرورت کا احساس رکھتے ہوں گے کہ اپنے بچوں کو

بارے میں آخری اور حتمی فیصلے کا انتظار کرتا رہتا ہے، جبکہ انصاف یہ ہے کہ جزاوسزا میں تاخیر نہ ہو، عقیدۂ تناسخ ہی انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے جس کی رو سے انسان کو مرتے ہی اس کے اعمال کی جزا یا سزا مل جاتی ہے۔

جواب الزامی

۱۔ تاخیر تو عقیدۂ تناسخ کی رو سے بھی لازم آتی ہے، کیوں کہ انسان اِس عقیدہ کے مطابق اچھے یا برے اعمال کرنے کے بعد اپنی طبعی موت کا انتظار کرتا رہتا ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کی نوبت نہیں آتی۔

۲۔ جزاوسزا کا خدائی عمل کسی مزدور کی مزدوری ادا کرنے کا عمل نہیں ہے جس کی فوری انجام دہی ضروری ہو اور اگر اسے مزدوری ادا کرنے کا عمل بھی مان لیں تو یہ حقیقت ہے کہ مزدور کو مزدوری کام کے خاتمے پر ہی ملتی ہے۔ جیسے باورچی کو کھانا پکا لینے کے بعد اور درزی کو کپڑا سی لینے کے بعد ملتی ہے اور اگر کام اجتماعی ہو جیسے ٹھیکہ کا کام ہوتا ہے تب تو اور بھی تاخیر ہو جاتی ہے، لہٰذا ہر مزدوری کا بھی فوراً دینا ضروری نہیں ہے۔

۳۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جزاوسزا کے معاملے کو مزدوری کے معاملے پر قیاس کرنا ہی درست نہیں۔ عبادت تو بندے کا فرض ہے، خدا اس پر اگر انعام واکرام سے نوازے تو یہ اس کا فضل ہے، یہ اس پر قرض نہیں کہ اس کی فوری ادائیگی ضروری ہو۔ اسی طرح اگر سزا میں خدا تاخیر کرے تو یہ خلافِ عدل نہیں، عین مقتضائے عدل وکرم ہے۔

حقوق العباد میں جو کوتاہی انسانوں سے ہوتی ہے اس کے بارے میں صورتِ حال مختلف ہے، خدا نے ایک مشفق ومہربان کی طرح بندوں کے لئے یہ راہ نکال رکھی ہے کہ کل روزِ قیامت جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور لوگوں کے پاس خدا کی رحمت اور اپنے باقی ماندہ حقوق کے سوا کوئی سامانِ نجات نہ ہوگا تو اس سخت گھڑی میں یہ محفوظ سرمایہ ہی اُن کے کام آئے گا۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ قیامت آنے کی دلیل کیا ہے تو اس کے لئے بہت سے دلائل ہیں۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ مختلف الاغراض اجزا سے مرکب ایک شے لازمی طور پر تخریب کا شکار ہوتی ہے اور اس کے اجزا الگ الگ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہونچ جاتے ہیں۔ اس کائنات کے

گورنمنٹ کے یا گورنمنٹ سے امداد پانے والے اسکولوں اور کالجوں سے نکال لیں جس نے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی اور پنجاب میں اپنے ظالمانہ رویے سے پوری قوم کی توہین کی ہے۔ کاش آپ کو بھی اس کا احساس ہوتا کہ وطن عزیز کا مقدر ہم والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا ہم انھیں اس غلامی کی لعنت سے جس نے ہمیں اپنے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا ہے چھٹکارا نہ دلائیں گے؟۔۔۔ اگر وہ آزاد بچوں اور بچیوں کی طرح تعلیم حاصل کریں تو اس سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔"

جہاں ایک طرف گاندھی جی کی اس اپیل کے خلاف کالج کے صاحبان اقتدار نے قوم پروروں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا وہیں کالج کے طلبہ نے گاندھی جی اور مولانا محمد علی سے درخواست کی کہ وہ ایک جلسہ میں ان سے خطاب کر کے انھیں عدم تعاون کے سلسلے میں معلومات فراہم کریں۔ طلبہ کی دعوت پر گاندھی جی اور علی برادران نے ۱۲ر اکتوبر کو طلبہ سے خطاب کیا اور انھیں عدم تعاون کے پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ ذاکر صاحب گاندھی جی کی تقریر سننے کے متمنی تھے لیکن انھیں اسی دن ڈاکٹر انصاری سے اپنے طبی معائنے کے سلسلے میں علی گڑھ سے دہلی جانا پڑا۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جب ذاکر صاحب دہلی سے واپس ہوئے تو جلسہ کی تفصیلات سن کر انھیں بہت صدمہ پہنچا۔ پروفیسر مجیب نے اس بارے میں لکھا ہے کہ "اس دن اسٹیشن پر گاندھی جی کا توہین آمیز تذکرہ اس قدر وحشیانہ تھا کہ ذاکر صاحب شرم سے زمین میں گڑ گئے اور انھوں نے کہا کہ 'تعلیم' 'تہذیب' اور ہر وہ چیز جو اعلا اور پاکیزہ ہے سب کے خلاف طرز عمل، یہ انداز گفتگو ایک جرم تھا، مجھے خیال آیا کہ اس گناہ کا کفارہ تو ادا ہی کرنا ہوگا۔"

دوسرے دن ۱۳ر اکتوبر کو یونین ہال میں پھر جلسہ ہوا۔ ذاکر صاحب اپنے رفیق خاص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اس جلسے میں شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی نے زبردست تقریر کی پھر مولانا شوکت علی نے طلبہ کو مخاطب کیا۔ ان تقریروں کا اثر ذاکر صاحب پر اسقدر شدید ہوا کہ وہ زار و قطار رونے لگے۔ اس جلسہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں کہ "مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ مرشد (ذاکر صاحب) کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا یہ کیا ہوا؟ فرمایا 'رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا انجام کے بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور محمود کے حوالے کر دیجیے گا۔ کالج کے کاغذات ان کو واپس بھیج دیجیے گا'۔ میں نے کہا مرشد اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔ آپ اس طریقہ کار کے ایسے موید بھی نہ تھے۔ آخر یہ کیا ہوا؟ فرمایا 'تحریک غلط ہو یا صحیح اس کے بارے میں یقین

مختلف الاغراض اجزا پر مشتمل ہونے کی حقیقت اس کی ہر شے سے ظاہر ہے، لہٰذا اس کائنات کی شکست وریخت لازمی ہے جس کے بعد اس کے مختلف اجزا اپنی اپنی اصل میں جا ملیں گے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اسی واقعے کا نام حساب کتاب کے بعد جنت یا جہنم کے مراحل طے کرنا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ مجموعۂ کائنات کو جسم انسانی سے بڑی حد تک مشابہت ہے، جسم انسانی میں اگر تغیر وفساد رونما ہو جائے تو اُسے مرض یا علامتِ مرگ کہتے ہیں۔ کائنات کے مزاج میں تغیر وفساد رونما ہو جائے تو اسے علامات قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر جسم انسانی میں تغیر اتنا شدید ہو کہ اس کی روح اس سے الگ ہو جائے تو اُسے موت کہتے ہیں اور اگر کائنات میں تغیر اتنا شدید ہو کہ اس کی روح اس سے الگ ہو جائے تو اسے قیامت کہتے ہیں۔ پھر جیسے موت کے بعد انسان کے عناصر اربعہ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آگ آگ میں مل جاتی ہے اسی طرح کائنات کی موت کے بعد نیکی اور نیک جنت میں، برائی اور بروں کا طبقہ جہنم میں پہونچ جائے گا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کے لئے دنیا میں آیا ہے اور یہ مقصد جب پورا ہو جائے گا تو یہ دنیا بند ہو جائے گی، جس طرح کھانا پکانے کے بعد باورچی خانے کا چولھا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات اپنے آپ سمجھ میں آتی ہے کہ قیامت سے پہلے دین اسلام کا ساری دنیا پر چھا جانا ضروری ہے تاکہ اس کی عبادت کا عمل مکمل ہو سکے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ رات دن محض جسمانی وظاہری طور پر مصروف رہنے کا نام عبادتِ کاملہ نہیں بلکہ یہ اس مجموعۂ عجز و نیاز کا نام ہے جو خدا کی ہر صفت اور ہر کمال کے مقابلے میں مجملاً ظاہر کیا جائے اور یہ عمل صرف عبد کاملؑ کے ورودِ مسعود کے نتیجے میں کیفی طور پر پورا ہوا اور فیضان محمدیؐ کے نتیجے میں کمی طور، پر جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا قیامت قائم ہو جائے گی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ دنیا ہنوز نشو ونما اور اس کے بعد اشیاء کے ظہور کے مراحل سے گزر رہی ہے بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہ ناتمام کائنات جب مکمل ہو گی تو لازماً ایک بڑی تبدیلی سے دوچار ہو گی اور تبدیلی کے اِسی مرحلے کو قیامت کہا جاتا ہے۔

اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست وپا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایک ایسی تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں، پانسہ پھینکا جا چکا ہے، انجام جو کچھ ہو۔ اچھا خدا حافظ!"

اس کے بعد طلبہ نے مطالبہ کیا کہ اگر کالج کو خیر باد کہا ہے تو اس کے متبادل ادارے کا انتظام کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اس تجویز اور مطالبہ کی تائید کی اور ایک جداگانہ تعلیمی ادارے کے قیام کی معقولیت سے اتفاق کیا۔ انہی دنوں وہ معاشیات کے شعبہ میں اسسٹنٹ لکچرار مقرر ہوئے تھے اس لیے انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس لکچرار شپ سے مستعفی ہو رہے ہیں۔ اس طرح طلبہ کی ایک قابل لحاظ تعداد ان کی حامی بن کر ایم۔اے۔او۔ کالج کو خیر باد کہنے کے لیے تیار ہو گئی۔

ذاکر صاحب نے دہلی پہنچ کر حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کر کے انھیں اپنے اور دوسرے طلبہ کے فیصلے سے آگاہ کیا اور ایک جداگانہ تعلیمی ادارہ کے قیام پر اصرار کیا۔ اس کے نتیجے میں اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن سے درخواست گئی کہ وہ ایک نئی تعلیمی دانشگاہ کی رسم افتتاح انجام دیں جو انہی دنوں مالٹا سے رہا ہو کر ہندستان واپس ہوئے تھے۔ اسی دوران کالج کے صاحبانِ اختیار نے طلبہ کے والدین کو علی گڑھ بلا کر ان سے اپنے بچوں کو اپنے اپنے گھر لے جانے کی ہدایت کی اور طلبہ کو اعلا عہدوں کا لالچ دے کر تحریک سے قطع تعلق کے اظہار کی ناکام کوشش کی۔ ذاکر صاحب سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ اس تحریک سے منہہ موڑ لیں تو انھیں ڈپٹی کلکٹری کے اعلا منصب سے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ ذاکر صاحب تو آخری فیصلہ کر ہی چکے تھے اس لیے انھوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا کر تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے بعد کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کے ایم۔اے۔او۔ کالج کی تاریخی مسجد میں جہاں سرسید مدفون ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آگیا جس کی تعمیر کالج کے تقریباً تین سو طلبہ نے اپنی مادرِ علمی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر کی تھی۔ شیخ الہند نے اپنی علالت اور نقاہت کے باوجود اس میں شرکت کر کے جامعہ کی رسم افتتاح ادا کی اور اس طرح علی گڑھ کا دارالعلوم دیوبند سے رشتہ قربت استوار کر دیا۔ شیخ الہند اسقدر نحیف ہو گئے تھے کہ وہ اپنا خطبہ افتتاحیہ بھی نہیں پڑھ سکے جسے ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ خطبہ

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اس کائنات کا حاکم خداوند قدوس ہے، اس کی رعیت میں کچھ سرکش ہیں اور کچھ مطیع ومنقاد لوگ، تو ظاہر ہے سرکشوں کو ملیامیٹ کرنا اور وفاداروں کو انعام دینا ضروری ہے جس کے لئے خدا کائنات کے اس نظام کو درہم برہم کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا، اسی مرحلے کو قیامت اور حشر ونشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوامی دیانند کا گیارہواں اعتراض قبلہ پر تھا، اس اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کعبہ میں موجود ایک پتھر کی طرف رخ کر کے سجدہ کرتے ہیں، بت پرست بھی پتھر کے بت کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا مسلمان بھی بت پرست ہوئے اور الزام سے بچنے کے لئے جو جواب مسلمان دیں گے وہی جواب بت پرستوں کی طرف سے بھی دیا جا سکتا ہے۔

حضرت نانوتوی نے اس اعتراض کے جواب کے طور پر ایک مستقل کتاب ''قبلہ نما'' مرتب فرمائی جس میں اس اعتراض کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور الزامی وتحقیقی دونوں قسم کے جواب دئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

جواب الزامی

بت پرست لوگ استقبال کعبہ پر اعتراض نہیں کر سکتے اس لئے کہ استقبال کعبہ اور بت پرستی میں ۷رفرق بالکل نمایاں ہیں۔

پہلا فرق خود لفظ استقبال کعبہ اور لفظ بت پرستی سے ظاہر ہے، استقبال کعبہ کا مطلب ہے کہ صرف رُخ اس کی طرف کر لیا جائے، جبکہ بت پرستی کا مطلب ہے کہ بت کو معبود اور کارساز سمجھ کر اس کی پرستش کی جائے۔ دوسرا فرق نیت کا ہے، استقبال کعبہ کے لئے نیت کی ضرورت نہیں آدمی کا چہرہ کعبہ کی طرف ہو تو نماز درست ہو جائے گی، جبکہ بت پرستی کے لئے قصد واہتمام کی ضرورت ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ استقبال کعبہ کرتے وقت نمازی کے کسی بھی قول یا فعل سے خدائے واحد کی پرستش کے سوا کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا، جبکہ بت پرستی میں پجاری کے ہر ہر قول وعمل سے بُت کی تعظیم وتکریم ظاہر ہوتی ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ استقبال کعبہ میں صرف سمت کعبہ کی طرف رخ ہونا کافی ہے، کعبہ کی دیواروں کا تقابل ضروری نہیں، جبکہ بت پرستی میں بتوں کا سامنا ہونا ضروری ہے۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ اسلام میں کعبہ بیت اللہ (اللہ کا گھر) ہے اور ظاہر ہے کہ گھر میں مکین ہی مطلوب ومقصود ہوتا ہے،

کا یہ حصہ جامعہ کے بنیادی مقاصد پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ شیخ الہند نے فرمایا:-

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار مقاصد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یوروپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔"

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ ذاکر صاحب بھی قومی تعلیم اور قومی دانشگاہ کے سلسلہ میں ایسے ہی خیالات کے حامل اور ایک آزاد تعلیم گاہ کے قیام کے حامی تھے۔ اسی لیے جامعہ کے افتتاحی اجلاس کی یادیں ان کے ذہن و دل سے پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ زندگی بھر اپنی تقریروں اور تحریروں میں جابجا اس کے حوالے دیتے رہے۔ جب ۱۹۴۶ء میں جامعہ کا جشن سیمیں منعقد ہوا تو ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں اس افتتاحی جلسہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:-

"مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں --- ایک وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو! یاد رکھو وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی۔ وہ ایمان محکم اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ یوں اور فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔"

جامعہ میں ذاکر صاحب استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ مجلس منتظمہ کے رکن منتخب کر لیے گئے اور انھیں شعبہ تصنیف و تالیف کا افسر بھی مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت سے وہ

جبکہ بت پرستی میں بت ہی مطلوب و مقصود ہوتا ہے۔ چھٹا فرق مسلمانوں اور بت پرستوں کے نظریات کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے، مسلمان خدا کے علاوہ کسی کو معبود و مسجود نہیں سمجھتے حتی کہ محمدؐ رسول اللہ کو بھی، تو وہ کعبہ کو مسجود کس طرح سمجھ سکتے ہیں، جبکہ بت پرستوں کے نزدیک بت ہی معبود و مسجود ہیں، مسلمانوں کے لئے کعبہ صرف جہت سجدہ ہے۔ ساتواں فرق یہ ہے کہ استقبال قبلہ حکم خداوندی ہے، لہٰذا قبلہ کی طرف منہ کر کے درحقیقت خدا کی اطاعت کی جاتی ہے، جبکہ بت پرستی قطعاً حکم خداوندی نہیں جو مماثلت کا شبہ کہا جائے اور یہ کہنا کہ کعبہ ہی کی طرف رخ کرنا کیوں حکم خداوندی ہے تو اس الزامی جواب میں مختصراً صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ کعبہ چوں کہ جلوہ گاہِ تجلیات ربانی ہے، اس لئے اللہ نے اس جہت کو سجدہ کے لئے متعین کیا، کیونکہ عبادت اگرچہ اصلاً ایک روحانی امر ہے مگر اس کا اظہار جسمانی سطح پر بھی ہونا چاہئے ورنہ اس کی افادیت ظاہر نہ ہو سکے گی اور عبادت کا جسمانی اظہار جہت و مکان کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، جبکہ جہت کی تخصیص بندوں میں نظم و انضباط اور ایک سلیقہ پیدا کرے گی۔

رہا یہ سوال کہ بت پرستی کو خلافِ عقل کیوں سمجھا جائے اور استقبال قبلہ کو کیوں نہیں؟ تو جواب واضح ہے، استقبال میں اصل مقصود عبادتِ خداوندی ہے اور جہت کعبہ کی تعین محض رفع حرج اور نظم و سلیقہ پیدا کرنے کے لئے ہے، جبکہ بت پرستی کا مطلب خدا کے علاوہ بھی کسی اور کو جو مالکِ نفع و ضرر نہیں مستحق عبادت سمجھنا ہے اور حماقت کی انتہا یہ ہے کہ جسے مستحق عبادت سمجھا جا رہا ہے وہ صاحب شعور و اختیار تو کیا، ذی روح اور جاندار تک نہیں، محض ایک نام ہے جسے رکھ لیا گیا ہے اور اُسے مسمّٰی سمجھا جا رہا ہے۔

اگر کسی بت پرست کی طرف سے یوں کہا جائے کہ ہمارے نزدیک بت پرستی بھی حکم خداوندی ہے اس لئے واجب التسلیم ہے، وید میں برہما وغیرہ کی پوجا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو قبلہ اور بت میں کیا فرق رہا؟

جواب یہ ہے کہ استقبال کعبہ کا حکم قرآن میں ہے جس کا کلامِ الٰہی ہونا اور محمد رسول اللہ کا رسول برحق ہونا یقینی ہے، جبکہ وید کا کلامِ الٰہی ہونا یقینی نہیں جس کے لئے دلائل موجود ہیں۔

داخلی شہادت یہ ہے کہ ایسے کسی حکم کا خدا کی طرف سے ہونا ممکن ہی نہیں جس میں خدا کسی نااہل کو اپنا ہم سر قرار دے۔ محض اس حکم کی موجودگی کی وجہ سے ہی ویدوں کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ

جامعہ کی مجلس تعلیمی کے رکن بھی تھے۔ جامعہ سے "الرشید" نامی قلمی پرچہ نکالنے میں ذاکر صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں اس پرچہ کا نام "جوہر" رکھ دیا گیا۔ ذاکر صاحب نے پرچے کو دلچسپ بنانے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ انھوں نے "جوہر" میں جامعہ کے امتحانات کے نتائج کی تفصیلات دیں۔ جامعہ سے متعلق مسائل کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی لیکن وہ سیاسی امور میں کبھی دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور نہ جامعہ کو سیاسی مسائل میں الجھانا پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک جامعہ کو خالصتہً ایک آزاد تعلیمی ادارہ رہنا چاہیے تھا اسی لیے وہ اسے سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے رہنمایانِ وقت کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا۔

اسی دوران ذاکر صاحب کو اعلا تعلیم کے لیے ہندوستان سے باہر جانے کا موقع فراہم ہوا۔ اس سلسلے میں کے۔ اے۔ حمید نے ان کی بڑی مدد کی۔ اس مدد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے ۱۹۶۸ء میں خواجہ عبدالحمید کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر کے۔ اے۔ حمید نے "میرا، میرے حال اور میرے مستقبل کا چارج اپنے ذمہ لے لیا اور خود ہی یہ طے کیا کہ میں مزید تعلیم کے لیے جرمنی جاؤں۔ میرے اپنے موانع، میری اپنی مشکلات، میری سستی اور کاہلی کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے طے کر لیا تھا اور مجھے جانا تھا۔ فرار کی کوئی صورت نہ تھی انھوں نے میرا ٹکٹ خریدا اور میرے ساتھ بمبئی تک گئے تاکہ انھیں یہ اطمینان رہے کہ میں بخیریت جہاز پر سوار ہو گیا ہوں اور ان چند دنوں میں جب ہم دونوں بمبئی میں تھے انھوں نے مجھے شائستہ معاشرت کی مبادیات سکھائیں کہ کیسے اور کس طرح کے لباس پہنے جائیں۔ کیسے چھری اور کانٹے سے کھانا کھائیں اور کس طرح یوروپ کے ملکوں میں رہیں۔ ان کو مایوس نہ کرنے کے شریفانہ خیال سے میں نے وہ سب کچھ یاد رکھا جو انھوں نے مجھے سکھایا تھا، اور مجھے یقین ہے کہ میں تمام آزمائشوں سے بڑی حد تک کامیاب گزرا۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے بیرونی سفر کا سہرا خواجہ عبدالحمید کے سر تھا جنھوں نے اصرار کر کے انھیں باہر جانے پر مجبور کر دیا تاکہ وہ اعلا تعلیم کی تکمیل کر سکیں اور واپس لوٹ کر اپنے علم سے وطن عزیز کو بہرہ مند کر سکیں۔ اس سلسلے میں یو پی کے بورڈ آف ریوینیو کے ایک افسر فری مینٹل نے علی گڑھ کے ضلع کلکٹر سے سفارش کر کے ذاکر صاحب کے لیے پاسپورٹ کا حصول آسان اور ممکن کر دیا جو، ان جیسے ترک موالاتی کے لیے ناممکن امر تھا۔

ہو جاتا ہے۔

قرآن اور محمد مصطفیٰ کی صداقت پر متعدد دلائل موجود ہیں، ان دونوں کی صداقت لازم وملزوم ہے، قرآن نزول سے اب تک من وعن محفوظ ہے جیسا کہ اس کا دعویٰ تھا، محمد مصطفیٰ ؐ دیگر ادیان ومذاہب کے پیشواؤں سے علم وعمل، فہم وفراست، اخلاقِ حمیدہ، معجزات وخوارق عادت ہر شے میں ممتاز ہیں۔ محمد مصطفیٰ اور آپ ؐ کے اصحاب کا مسلسل کردار خود آپ کی صداقت کی دلیل ہے کہ کس طرح کے لوگوں میں کیسے عظیم اخلاق آپ نے پیدا کردئے، ان تمام کمالات پر وہ ذخیرۂ احادیث شاہد ہے جو معیارِ استناد کے اعتبار سے عام تاریخی روایات سے بہت زیادہ بلند ہے۔

اس الزامی جواب کو ختم کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے پنڈت دیانند کے اُن دو اعتراضات کا بھی ضمنی طور پر جواب دیا ہے جو اُنہوں نے معجزۂ شق القمر پر کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس واقعہ کا وقوع عملاً ممکن ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس واقعہ کی کوئی تاریخی شہادت بھی نہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس معجزہ کا خارقِ عادت ہونے کی وجہ سے انکار کیا جاتا ہے تو پھر ہر مذہب[۱] کے لوگ جن خوارقِ عادت ومعجزات کو اپنے پیشواؤں سے منسوب کرتے آئے ہیں اُن سب کا انکار کردینا چاہئے، دنیا کی اتنی بڑی تعداد کا خوارقِ عادت چیزوں پر یقین رکھنا خرقِ عادت کے وجود کا یقین دلاتا ہے، پنڈت جی خود وید کو کلام الٰہی مانتے ہیں جو برہما کے منہ سے نکلا ہے، کیا یہ خارقِ عادت نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، وہی خدا اپنے کسی فعل کے صدور کے لئے اپنے بندوں میں سے کسی کو واسطہ بنالے تو اس میں کونسا عقلی استحالہ ہے؟

پوچھا جاسکتا ہے کہ خوارقِ عادت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے تو یہ خدا کے پیغمبروں کے لئے خدا کی خصوصی مدد ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی حکومت میں وزراء کی مدد فوج کرتی ہے۔

معجزۂ شق القمر کے سلسلے میں سوامی دیانند کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ تاریخی طور پر ثابت نہیں، حالانکہ کئی وجوہ سے اس معجزہ کا ثبوت موجود ہے۔ خود قرآن میں جو تاریخی طور پر سب سے زیادہ مستند کتاب ہے اس معجزے کا تذکرہ موجود ہے، کتب حدیث میں موجود ہے جو اعلیٰ تاریخی معیار کی حامل ہیں۔

اب اگر کوئی شخص سورج کے طلوع کا صرف اس لئے انکار کرے کہ جنتری یا کیلنڈر میں اس کا تذکرہ

ذاکر صاحب کا پاسپورٹ یوں تو صرف انگلستان کے لیے تھا لیکن وہ جرمنی جانے کے خواہش مند تھے جو ایک دشوار گزار مسئلہ تھا کیونکہ پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی نے انگلستان اور اس کے حلیفوں کے خلاف حصہ لیا تھا اور اسے شکست ہوئی تھی اسی لیے ان کے جرمنی جانے کا امکان بہت کم تھا تاہم ذاکر صاحب نے انگلستان پر جرمنی ہی کو ترجیح دی۔ اس خبر سے کہ ذاکر صاحب جامعہ سے دور جا رہے ہیں ان کے رفیقوں اور طلبہ کو افسوس ہوا۔ "جوہر" کی ایک تحریر کے توسط سے ۱۹۲۲ء میں اس کا اظہار بھی کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ:

"ہمیں یہ سن کر کمال افسوس ہوا کہ سلک گوہر سے ایک بیش بہا موتی نکل گیا یعنی اسٹاف سے ہمارے کرم فرما جناب ذاکر صاحب علاحدہ ہو رہے ہیں اور بغرض تعلیم معاشیات جرمنی جا رہے ہیں۔ یوں تو عام طور پر ہر شخص کو لیکن بالخصوص ہمیں سب سے زیادہ افسوس ہے لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تحصیل علم کا پاک مقصد لے کر جا رہے ہیں تو ہمارے دل میں مسرت و خوشی کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ۔

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

اس تحریر سے ذاکر صاحب کی اپنے رفقائے کار اور طلبہ میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کی عدم موجودگی کا احساس یاران جامعہ کو شدید تھا لیکن وہ جس مقصد کی تکمیل کے لیے بیرون ہند جا رہے تھے وہ ان کے لیے طمانیت کا سبب بھی تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ذاکر صاحب کا پاسپورٹ صرف انگلستان کے لیے تھا لیکن ان کا مقصد جرمنی جانے کا تھا اس لیے وہ آسٹریا ہوتے ہوئے ٹرسٹ ویزا پر ۱۹۲۲ء میں جرمنی جا پہنچے۔ اس سلسلہ میں مسز سروجنی نائڈو کے بھائی چٹو نے ان کی خاصی مدد کی۔ ذاکر صاحب نے انسٹی ٹیوٹ آف فاریز زمیں جرمن زبان سیکھنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۳ء میں انھیں برلن یونی ورسٹی میں معاشیات میں ریسرچ کرنے کی اجازت مل گئی۔

جرمنی میں ذاکر صاحب نے ذرا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ بنیادی طور پر تو وہ ریسرچ اسکالر تھے اور ہندستان میں برطانیہ کی زرعی پالیسی کے موضوع پر تحقیق کر رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے دوسرے مشغلے بھی جاری رکھے۔ انھی دنوں عابد حسین اور محمد مجیب بھی آکسفورڈ سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد برلن پہنچے اور انھوں نے ذاکر صاحب کے ساتھ شلاختیین زی نامی مقام پر سکونت اختیار کی۔ وہیں ذاکر صاحب نے کاویانی پریس

نہیں ہے تو اس کا کیا علاج ہے؟

پنڈت جی کہہ سکتے ہیں کہ اس معجزے کا تذکرہ صرف اہلِ اسلام کی کتب میں کیوں ہے؟ تو اُن سے بھی سوال ہو سکتا ہے کہ وہ خوارق عادت جو وہ اپنے بزرگوں سے منسوب کرتے ہیں اُن کی خاص مذہبی کتب کے علاوہ ان خوارق کا تذکرہ کہیں اور کیوں مذکور نہیں؟

شق قمر کا یہ واقعہ جو رسولِ اقدسؐ کے اشارۂ انگشت سے ظہور میں آیا کچھ ایسے وقت پیش آیا کہ اہل عرب بلکہ اہلِ حجاز کے علاوہ کوئی اس کو نہ دیکھ سکا، ہندوستان میں اس وقت آدھی رات تھی اور غالباً موسم سرما کی رات تھی، مغربی ممالک میں طلوع سحر سے قبل کا ٹائم تھا، شمالی جنوبی ممالک میں خط زاویہ مخروطہ کی وجہ سے نصف ہی چاند نظروں کے سامنے آیا ہوگا۔ شق قمر کی یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی، لوگ سو رہے تھے، کتنے لوگ جاگ رہے ہوں، اُن میں کتنے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں، کتنے لوگ دیکھ کر بھی گردوغبار یا ابرو کہبار کی وجہ سے نہ دیکھ پائے ہوں۔ ایسی صورت میں اگر کثیر تعداد نے نہ دیکھا تو یہ فطری بات ہے، حالانکہ تاریخ فرشتہ میں موجود ہے کہ بھارت میں اودے پور کے راجہ نے اس اعجاز کا مشاہدہ کیا تھا، کیا یہ تاریخی شہادت نہیں ہے؟ مگر دنیا میں خاص طور سے عرب والوں میں اس وقت تک تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا، اسی لئے تاریخوں میں اس کا تذکرہ بہت زیادہ نہ آسکا۔

جواب تحقیقی (برائے اعتراض براستقبال قبلہ)

مسلمانوں کے نزدیک کعبے کی حیثیت مسجود و معبود کی نہیں، البتہ فضائے کعبہ میں جمال خداوندی عکس ریز ہے۔ فضائے کعبہ محض جلوہ گاہ ہے، مسلمان جب کعبہ کو رخ کر کے سجدہ کرتا ہے تو یہ کعبہ کی دیواروں کو سجدہ نہیں ہوتا، اس جمال الٰہی کو ہوتا ہے جو فضائے کعبہ میں عکس ریز ہے۔ اسی لئے ایسا بھی ہوا ہے کہ جب کعبہ کی عمارت منہدم ہوگئی تب بھی سجدہ اُسی سمت کیا جاتا رہا۔ بُت چوں کہ معبودِ حقیقی کی جلوہ گاہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے وہ معبودِ حقیقی کی عبادت کے لئے واسطہ و جہت بھی نہیں بن سکتے۔

کعبہ اسی طرح جلوہ گاہ خداوندی ہے جس طرح آئینہ سورج کی جلوہ گاہ ہے، دیگر چیزوں کو سورج کی روشنی سے وہ نسبت حاصل نہیں جو آئینہ کو ہے، اسی طرح کعبہ کو تجلیات باری سے جو نسبت حاصل ہے دنیا کی کسی چیز کو نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جمال خداوندی مبدأ وجود ہے اور فضائے کعبہ

میں کمپوزنگ سیکھی اور خود کمپوزنگ کر کے "دیوانِ غالب" کا پاکٹ ایڈیشن شائع کیا جو آپ اپنا جواب تھا۔ اس دیوان کو جامعہ ملیہ نے اپنے لیے عزت کا باعث تصور کیا۔ اسی طرح انھوں نے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں کے مجموعہ کلام کو "دیوان شیدا" کے عنوان سے شائع کیا جسے انھوں نے خواجہ عبدالمجید اور جامعہ کے اساتذہ کے نام معنون کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر ایرن ٹرائش کے ساتھ مل کر گاندھی جی کی شخصیت پر جرمن زبان میں ایک کتاب قلمبند کی جو جرمنی میں خاصی مقبول ہوئی۔ "دیوانِ غالب" اور گاندھی جی سے متعلق جرمن زبان میں کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں عابد صاحب اور مجیب صاحب بھی شریک رہے، اور انھوں نے ان کتابوں کی طباعت پر اپنی جیب سے خاصی رقم خرچ کی۔

جرمنی میں قیام کے دوران ہی ذاکر صاحب نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کا سفر کیا۔ جب اسٹاک ہوم میں ان کے پاس پیسے نہ بچے تو انھوں نے گاندھی جی پر ایک طویل مضمون لکھ کر اسے ایک اخبار میں گاندھی جی کی تصویر کے ساتھ شائع کروادیا۔ اس کے معاوضہ سے انھوں نے سفر خرچ ادا کیا۔ اسی طرح انھوں نے جرمنی کے مختلف شہروں میں گاندھی جی کی شخصیت پر بہت سی تقریریں کیں اور وہاں کے لوگوں کو ہندستان کے حالات اور گاندھی جی کی قیادت اور ان کے عدم تشدد کے اصول سے واقف کرایا۔

اس پورے عرصہ میں جرمنی میں قیام کے دوران جامعہ ملیہ سے ذاکر صاحب کا رابطہ قائم رہا۔ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ جامعہ ملیہ کے اپنے رفقاء کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھا اور اس کے ساتھ ہی جرمنی میں تعلیم کے مختلف طریقوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور تعلیم وتربیت کے مسائل اور اس کی مختلف جہتوں پر غور و فکر کیا۔ انھوں نے جرمن ماہرین تعلیم کرسٹن اسٹائز اور ایڈورڈ اشپرانگر کی تحریروں اور ان کے فلسفوں سے استفادہ کیا جنھیں وہ مستقبل میں جامعہ میں بروئے کار لائے انھوں نے جرمن قوم کے کردار سے سبق لیا جس کے فکر و عمل نے انھیں بے پناہ متاثر کیا کیونکہ جرمنی نے جنگ میں شکست خوردگی کے باوجود اپنی جدوجہد سے ایک نئے جرمنی کی حیثیت سے اپنی شخصیت کے اظہار و وجود کی زبردست مثال قائم کی تھی۔

ذاکر صاحب کی عدم موجودگی میں ہندستان سیاست کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتا رہا۔ ترک موالات کی تحریک دم توڑ چکی تھی۔ قومی رہنماؤں کو حکومت کے مظالم نے قید وبند کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں صلحنامہ سیورز کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے کے بعد یونانی افواج کو زبردست شکست سے دوچار کر دیا

مبدأ موجودات ہے کہ سب سے پہلے دنیا میں کعبہ ہی جسمانی طور پر موجود ہوا، تو جلوہ الٰہی کے ساتھ اس جلوہ گاہ کا ایک گونہ تقابل ہوا جیسے سورج و آئینہ میں ہوتا ہے۔ کعبہ کا مبدأ عالم اجسام ہونا معروف مذاہب کی معتبر مذہبی کتابوں میں متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

آئینہ اور سورج کی یہ مثال یہ بھی واضح کرتی ہے کہ فضاء کعبہ میں تجلی باری صرف منعکس ہوتی ہے محدود نہیں ہوتی جس طرح سورج کی روشنی آئینہ میں صرف منعکس ہوتی ہے آئینہ میں قید نہیں ہوتی۔ بت چوں کہ جلوہ گاہ ذات باری نہیں بن سکتے، لہٰذا وہ کعبہ کی طرح مسجود الیہ بھی نہیں بن سکتے۔

سفر میرٹھ

پنڈت دیانند رڑکی میں حضرت نانوتوی سے کسی قیمت پر مذہبی مباحثہ کے لئے تیار نہ ہوئے، مگر اپنے لکچروں کے ذریعے آس پاس اسلام کی مخالفت میں زہر افشانی کرتے رہے۔ رڑکی کے بعد وہ میرٹھ پہونچے، وہاں اُن کا مرکز بھی قائم تھا، اُن کا رسالہ بھی نکلتا تھا۔ میرٹھ میں پنڈت جی کے لکچر جب عوام میں پھیلے تو میرٹھ کے عوام نے حضرت نانوتوی کو یاد کیا۔ عوام کے اصرار پر آپ جولائی ۱۸۷۹ء میں میرٹھ تشریف لے گئے، میرٹھ میں آپ بسلسلۂ تصحیح کتب عرصہ دراز تک رہے تھے، میرٹھ کی گلیوں اور بازاروں سے بخوبی آشنا تے، اس لئے بنگلے پر پہونچ گئے جہاں پنڈت جی اکثر آیا کرتے تھے۔ وہاں نہیں ملے تو پنڈت جی کی دوسری قیام گاہ پر پہونچ گئے اور وہیں پنڈت دیانند سے ملاقات ہوئی، لیکن حسب سابق وہ وہاں بھی کسی گفتگو کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس دوران پنڈت جی کے ایک معتقد لالہ انندلال نے سوامی دیانند کے اخبار آریہ سماچار میں اسلام پر کچھ اعتراضات اُٹھائے تھے جس کا لہجہ بھی کافی گستاخانہ تھا، حضرت نانوتوی نے چاہا کہ اسی لہجے میں اس کا جواب دے دیا جائے۔ مولانا عبدالعلی میرٹھی اس کے لئے تیار ہو گئے اور حضرت کے ارشادات کی روشنی میں یہ کتاب مرتب ہوئی اور جواب ترکی بترکی کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو بعد میں مولانا اشتیاق صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے تسہیل کر کے براہین قاسمیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ پوری کتاب علم کلام کا شاہکار ہے، وجود باری اور صفاتِ باری کی دقیق بحثیں ہیں، آخر میں قرآن کو کتاب الٰہی ثابت کیا گیا ہے، انبیاء کی ضرورت، ان کا مقام و مرتبہ اور آخر میں سرور کائنات ؐ کے خاتم النبین ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔

تھا۔ اتاترک اور ترکوں نے بڑی محنت اور کوشش سے اپنے ملک کے وجود کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی تھی اس عمل میں ترکی کے سلطان نے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا جو مسلمانوں کا خلیفہ بھی تھا اور جس کے تحفظ اور بحالی وقار کی خاطر ہندستانیوں نے گاندھی جی کی قیادت میں خلافت کی تحریک چلائی تھی۔ انجام کار مصطفیٰ کمال نے پہلے تو ترکی سے شخصی حکومت کا خاتمہ کر کے اسے ایک جمہوریہ میں منتقل کیا اور پھر خلافت کو ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیا۔ ان اقدامات سے ہندستانی مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا اور خلافت کمیٹی کا وہ سارا جوش و خروش ختم ہو گیا جو تحریک خلافت کی بنیاد تھا۔ خلافت کمیٹی ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کفیل تھی اس لیے اب جبکہ خلافت کمیٹی خود ہی قائم نہیں رہی تو جامعہ بھی مالی مشکلات میں گھر کر رہ گئی۔ اس کی کفالت کی ذمہ داری کا بار اپنے سر لینے کی کسی میں سکت نہ تھی اس لیے بہت سے رہنماؤں نے جامعہ کو بند کر دینے کا مشورہ دیا۔ تاہم چند رہنماؤں کا خیال تھا کہ اسے قائم رہنا چاہیے۔ ایسے اوقات میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کو ذاکر صاحب کا خیال آیا۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ جامعہ کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں ان کا کیا مشورہ ہے۔ فوراً ہی ذاکر صاحب نے بذریعہ تار جواب دیا کہ "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے لیے تیار ہیں ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے"۔ ان کے اس خیال سے عابد صاحب اور مجیب صاحب کو بھی اتفاق تھا اور یہی وہ دونوں ساتھی تھے جو ذاکر صاحب کے ساتھ جامعہ کی خدمت کے لیے تیار تھے۔

ذاکر صاحب کے مثبت جواب نے اساتذہ اور طلبہ میں امید کی ایک نئی لہر دوڑا دی انھوں نے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں سے درخواست کی کہ وہ ذاکر صاحب کی واپسی تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ اس کے نتیجہ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ جنوری ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوا جس میں یہ طے پایا کہ جامعہ کو جاری رکھا جائے۔ خود گاندھی جی بھی اسے جاری رکھنے پر مصر تھے اور اس کے لیے بھیک تک مانگنے کے لیے تیار تھے۔ اسی سال مارچ میں علی گڑھ میں منعقدہ فاؤنڈیشن کمیٹی نے حکیم صاحب کی اس تجویز کو منظور کر لیا کہ جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق ۱۹۲۵ء میں جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا گیا اور طبیہ کالج سے ملحقہ مکانوں میں اس نے ایک نئے دور کی شروعات کی۔

اسی سال اپریل میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری بیرونی ممالک کے دورے پر پیرس پہنچے تو ذاکر صاحب نے ان سے ملاقات کر کے جامعہ کے مستقبل کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے جامعہ کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دینے کا دوبارہ یقین

کتاب کے آخر میں پنڈت جی کو ایک بار پھر مباحثہ کا چیلنج دیا گیا ہے اور اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حسبِ دستور پنڈت جی اس چیلنج کو بھی قبول نہیں کریں گے۔

کتاب "جواب ترکی بترکی" کی اشاعت کے چندماہ بعد ہی ۴۹ سال کی عمر میں حضرت نانوتوی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما کر اپنے ربّ جلیل کے حضور پہونچ گئے۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ پنڈت دیانند سے براہِ راست گفتگو کرنے کی یہ حسرت حضرت والا کے دل میں اتنی شدید تھی کہ

> کہنے والوں سے میں نے سنا ہے کہ بالآخر یہی قصہ عالمِ اسباب میں حضرت نانوتویؒ کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ (سوانح قاسمی جلد دوم ص ۵۱۵)

اور اس طرح وہ بے قرار ہستی قیامت تک کے لئے خاموش ہوگئی جس نے ہمیشہ اسلام کی عظمت کے خواب دیکھے، جس کا دل اسلام دشمنوں کو سرنگوں دیکھنے کا زندگی بھر خواہاں رہا، جس کے ارمان آخری سانس تک اسلام کی سربلندی کے لئے وقف رہے اور اپنی ذات کے لئے جس کے سینے میں کبھی کوئی ارمان نہ تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ.

ماخذ

۱۔ مباحثہ شاہجہاں پور — مولانا فخر الحسن گنگوہی — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۲۔ حجۃ الاسلام (تسہیل وتشریح) — مولانا اشتیاق احمد — مجلس معارف القرآن دار العلوم، دیوبند ۱۹۶۷ء
۳۔ تقریر دل پذیر — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۴۔ انتصار الاسلام — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۵۔ قبلہ نما (تشریح وتسہیل) — مولانا اشتیاق — شعبۂ نشر واشاعت دار العلوم، دیوبند ۱۹۶۹ء
۶۔ عظمت اسلام — خالد القاسمی — دار المؤلفین، دیوبند ۱۹۹۱ء
۷۔ افادات قاسمی — خالد القاسمی — دار العلوم حیدر آباد ۱۹۹۴ء
۸۔ جواب ترکی بترکی — حضرت نانوتوی — مجلس معارف القرآن، دیوبند ۱۹۶۷ء
۹۔ صداقت اسلام — خالد قاسمی — دار المؤلفین، دیوبند ۱۹۸۸ء
۱۰۔ مولانا قاسم نانوتویؒ — اسیر ادروی — شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند ۱۹۹۵ء
۱۱۔ تحفۂ لحمیہ — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۱۲۔ سوانح قاسمی جلد دوم — مولانا مناظر احسن گیلانیؒ — دفتر دار العلوم، دیوبند ۱۳۷۵ھ

دلایا۔ اسی طرح جب حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ویانا پہنچے تو ذاکر صاحب کے اصرار پر عابد صاحب، مجیب صاحب، خواجہ عبدالحمید اور برکت علی قریشی بھی ان دونوں ہندستانی رہنماؤں سے ملے اور ان سبھی نے جامعہ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس ملاقات کے بارے میں حکیم صاحب نے اپنی یادداشت میں تحریر کیا:۔

> "جامعہ ملیہ کے لیے ان عزیزوں نے جو برلن میں تعلیم پا رہے ہیں اور جامعہ کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں ایک تعلیمی خاکہ کھینچا تھا اس لیے انھوں نے برکت علی صاحب، خواجہ عبدالحمید صاحب، عابد حسین صاحب اور مجیب صاحب کو ہمارے پاس اس غرض سے بھیجا کہ ہم بھی اس تعلیمی اسکیم پر غور کرلیں اور اپنی رائے بھی ان پر ظاہر کریں۔ یہ سب لوگ ۱۰ر جولائی کو وی آنا پہنچے اور اپنی آرزوؤں کا ایک بڑا حصہ ہم لوگوں نے ان اعزہ کی نذر خوشی سے کردیا۔"

ان ملاقاتوں کے بعد ذاکر صاحب نے اپنی ریسرچ کی رفتار تیز کردی اور ۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو زبانی امتحان سے فارغ ہوکر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے مستحق ہوگئے۔ ان کے مقالہ کو ان کے ممتحنوں کے بورڈ نے جو پروفیسر زومبارٹ اور پروفیسر زیرنگ پر مشتمل تھا اپنی رپورٹ میں اسے ایک "بڑے علمی کارنامے" سے تعبیر کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے سبب جرمن دانشوروں نے ان کے اعزاز میں ان کے زبانی امتحان کے دسویں روز ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا اس جلسے میں جرمن زبان میں تقریر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے جرمن قوم کے کردار کی تعریف کی، جرمنی کے تعلیمی اداروں کو سراہا اور ہندستان اور جرمنی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے انگلستان کے گمراہ کن کردار کی مذمت کی۔

جرمنی میں تین سال سے کچھ زائد عرصہ گزارنے کے بعد ذاکر صاحب فروری ۱۹۲۶ء میں اپنے دونوں ساتھیوں یعنی مجیب صاحب اور عابد صاحب کے ساتھ وطن عزیز واپس ہوئے۔ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم معین الدین حارث نے ان کی دہلی اسٹیشن پر آمد سے متعلق لکھا ہے کہ۔ "جب ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو ایک ڈبے سے یہ تینوں نوجوان باہر آئے۔ قدرے بھاری جسم کے اور چہرے پر سیاہ داڑھی والے ڈاکٹر ذاکر حسین جو گھنی داڑھی کی وجہ سے اپنی عمر سے کچھ زیادہ کے معلوم ہو رہے تھے، ان کے مقابلے میں اکہرے بدن کے ڈاکٹر عابد حسین اور ان دونوں کے مقابلے میں مختصر جثے کے پروفیسر محمد مجیب۔ تینوں شخصیتیں پُروقار اور ان کے چہروں پر کچھ ایسا تبسم تھا کہ ان کے دیدار سے پہلی بار مشرف

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز*

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر اور جدید فلسفۂ وجودیت

وجود کیا ہے؟

وجود و موجودات کی حقیقت کا مسئلہ ہمیشہ ایک اہم سوالیہ نشان بن کر فکر انسانی سے نبرد آزما رہا ہے۔ انسان نے جب بھی فکر و نظر سے زندگی و موت اور حیات و کائنات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تو اس کے سامنے وجود و موجودات کا مسئلہ متعدد زاویوں سے توجہ طلب رہا:

(۱) زندگی اور موت یا وجود و عدم کی فی نفسہ حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا اس کارخانۂ حیات و کائنات کا کوئی خالق ہے یا خود بخود پیدا ہو گیا ہے اگر ہے تو اس کا اس کے پیدا کرنے سے کوئی مقصد و منصوبہ ہے یا بغیر مقصد کے اس کو پیدا کیا ہے؟

(۳) انسانی وجود کی حقیقت کیا ہے اور اس کا خالق اور دیگر مخلوقات سے کیا رشتہ و تعلق ہے؟

(۴) کیا خالق و مخلوق دونوں قدیم ولافانی ہیں یا دونوں فانی و حادث ہیں یا خالق قدیم اور مخلوقات حادث ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

وجود کی حقیقت جاننے کے سلسلہ میں جب تفلسف زیادہ گہرا ہوتا ہے تو انسان حیرت و درماندگی کا اسیر ہو جاتا ہے، اس کے تمام مشاہدے اور منطقی مفروضے شکست و ریخت اور خود تناقضی کا شکار ہونے لگتے ہیں اور وہ غالب کی زبان میں کہہ اٹھتا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
اور
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے! — کھائیو مت فریب ہستی

فلسفہ کی حیرت کسی حد تک اطمینان کا سانس اس وقت لیتی ہے جب اسے ایک درمیانی راہ نکلتی نظر آتی ہے کہ موجودات میں کچھ حقیقت ہے اور کچھ افسانہ، ہندو فلسفہ میں مایا کا تصور عجیب

* کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

ہونے والوں کے دلوں کو انھوں نے موہ لیا۔ یوروپ کی اعلا تعلیم سے مرصع ہو کر وطن واپسی کی خوشی انھیں یقیناً ہو گی، مگر اپنے لیے وہ جو میدان طے کر چکے تھے اس کی پہلی منزل پر پہنچ کر وہ غیر معمولی طور پر مسرور و شاداں نظر آ رہے تھے۔ ادھر ان کا استقبال کرنے والے اس خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے کہ جامعہ کی اس کشتی کو جو دو تین سال سے جھکولے کھا رہی تھی، کھیون ہار مل گئے اور اب یہ امید کی جا سکتی تھی کہ جامعہ کی یہ کشتی اپنے ساحل مقصود تک پہنچ سکے گی۔"

اس کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی رقمطراز ہیں کہ "ذاکر صاحب دہلی میں سیدھے جامعہ ملیہ پہنچے۔ اس کے بعد چند روز کے لیے وہ اپنے وطن قائم گنج گئے۔ جامعہ میں انھیں شیخ الجامعہ کے دفتر سے متصل ایک کمرہ دے دیا گیا اور انھوں نے بغیر کسی رسمی کارروائی کے وہ عہدہ قبول کر لیا جس کی مشکلات بے پناہ تھیں۔ یہ عہدہ پھولوں کی سیج نہ تھی، یہ ایک ایسا سفر تھا کہ یہ کار کوہ کنی ہے، یہ صحرا نوردی ہے۔ اس کی لذت جوئے شیر کی تمنائے مسلسل اور دوریٔ منزل میں ہے۔ یہ جو خیر مقدم کے مسرت زا جوش و خروش میں تم بھی خوش نظر آ رہے ہو اسے ایک عارضی وقفہ سمجھو، پھر تو تمہیں اس راہِ وفا میں برسوں سینے کے بل چلنا ہے۔ ہاں اس میں تمہارا زادِ راہ اگر ہے تو صبر و استقامت، تحمل و توکل اور اللہ کی رحمت پر کامل یقین۔"

الغرض یہ وہی جامعہ تھی جس کے بانیوں میں وہ خود بھی شامل تھے اور ایم اے او کالج کے طلبہ کو اپنی مادر علمی کو خیر باد کہنے میں خود انھوں نے ہی پہل کی تھی۔ جو علی گڑھ میں تقریباً دو سال تک حسن کارکردگی کے لیے ان کی رہین منت تھی اور جس نے تین سال سے زائد کی مدت ان کے فراق اور انتظار میں گزاری تھی۔ آج یہی جامعہ پھر انھیں خوش آمدید کہہ رہی تھی جس میں علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے پر صرف اسی طلبہ رہ گئے تھے۔ اس کے پاس نہ روپیہ تھا نہ وسائل اور نہ ہی کوئی مستقبل۔ اب تک حکیم اجمل خاں نے کسی طرح بیساکھی بن کر اسے چلایا تھا اور دہلی منتقل کر کے اس کا بار اٹھایا تھا۔ اب یہ بار ذاکر صاحب پر آ گیا تھا اور وہی اس کے کھیون ہار تھے۔ حکیم صاحب نے انھیں خوش آمدید کہا، ڈاکٹر انصاری نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مولانا محمد علی نے ان سے امیدیں باندھیں اور وہ جامعہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اب ذاکر صاحب کی زندگی اور جامعہ کی داستان دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر رہ گئیں۔ دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی۔ حکیم صاحب کی شفقت نے انھیں حوصلہ بخشا جو اپنی مصروفیت کے باوجود جامعہ کے لیے وقت بھی دیتے تھے اور روپیہ

وغریب ہے کہ ایک شئے بیک وقت موجود بھی ہے اور اسی لمحہ واہمہ وفریب بھی ہے، ایک ہندو فلسفی شاعر کہتا ہے:

بس یہ کہنے پر یاروں نے بے دین مجھے ٹھہرایا ہے
سب عین حقیقت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے سب مایا ہے

جب قدیم فلاسفہ کے یہاں یہ مسئلہ اٹھا تو پارمنی ڈس Parmenides (504-470-) نے پورے عالم کو ایک وجود مطلق سے تعبیر کیا جو کہ ازل سے قائم ودائم اور متصل و کامل ہے، ہرقلیطس (Heraclitus/525-475BC) نے اس وجود مطلق کو مسلسل حرکت میں اور بہتر سے مزید بہتر کی طرف متحرک بتایا۔ سقراط (Socrates/469-399BC) نے کہا کہ جو ماہیات خیر ہیں مثلاً رحم سچائی، علم اور عدل وانصاف وغیرہ ان کا وجود حقیقی ہے جو ازلی ابدی اور کامل و مستقل ہے باقی ان کے اضداد بدی کی صفات کا وجود عارضی اور غیر حقیقی ہے، افلاطون (Plato/427-347BC) نے اپنے بیشتر وفلاسفہ کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مفصل فکری نظام مرتب کیا اور کہا کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں، ایک عالم اعیان وامثال ہے اور دوسرا عالم محسوسات جو کہ دراصل عالم معانی وامثال کا سایہ ہے (اشباح واظلال ہے) عالم مثال دائمی اور مستقل ہے اور عالم محسوسات و اظلال مسلسل متغیر و متحرک ہے ، یہی افلوطین فلسفہ جب افلوطین (270-204ADPlotinus/plotine) کے ہاتھوں نوفلاطونی فلسفہ کی شکل میں سامنے آیا تو ہمارے متعدد عظیم اشراقی صوفیہ اس سے متاثر ہوئے۔ تجلیات وتنزلات پر مبنی ان کے کشف والہام نے حسب توفیق واستطاعت انہیں مذکورہ ماہیتوں کی حقیقت کا عرفان بخشا۔ افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو (Aristotle 384-322BC) نے موجودات کی تقسیم جواہر و اعراض کی شکل میں پیش کر کے اپنے مابعد فلاسفہ کے لئے فکر کا ایک مستقل مقیاس ومعیار عطا کیا۔ موجودات کی دس اجناس جنھیں مقولات عشر کہا جاتا ہے ان کی جنس الاجناس وجود وموجود ہی ہے۔ عہد اسلامی کے فلاسفہ نے ارسطوئی منہج و منطق کو تفلسف کا معیار تسلیم کرتے ہوئے موجودات کو دو قسموں پر تقسیم کیا واجب الوجود اور ممکن الوجود ، اس طرح فارابی اور ابن سینا وغیرہ کے یہاں وجودی استدلال (Ontological argument) معرض وجود میں آیا کہ وہ ذات جس کی ماہیت ہی وجود وبقا

بھی۔ لیکن اب ان کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کر کے جامعہ کے لیے روپیہ اکٹھا کرتے، لیکن ذاکر صاحب کی آمد کے بعد انھوں نے یہ ذمہ داری بھی ڈاکٹر صاحب کے کاندھوں پر ڈال دی اور ذاکر صاحب کو مختلف شہروں کے دورے پر بھیجا جن میں حیدر آباد، پٹنہ اور مدراس شامل تھے جہاں سے وہ خطیر رقمیں لے کر واپس ہوئے۔

ذاکر صاحب نے وطن واپسی کے بعد گاندھی جی سے بھی ملاقات کی جن کی اپیل پر ایم۔اے او کالج کے طلبہ نے اپنی مادر علمی کو خیر باد کہہ کر جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی تھی اور پھر اسے دہلی منتقل کرنے کے سلسلے میں حکیم صاحب کی مدد کی تھی۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے لکھا:۔

"۱۹۲۶ء کی ایک صبح تھی۔ میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میرے تین ساتھی (عابد صاحب، مجیب صاحب اور شفیق صاحب) گاندھی جی سے ملنے سابر متی آشرم پہنچے۔ ہم گزشتہ رات میں قدرے دیر سے پہنچے تھے اور جلدی جلدی میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ صبح ناشتہ گاندھی جی کی کٹیا میں ہوگا جہاں ہم چاروں ایک صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا رخ باورچی خانے کی طرف تھا اور باہمارے سامنے کھانا پروس رہی تھیں۔ یکایک پیچھے سے ہمارے کانوں میں آواز آئی "بہت خوب" ہم نے مڑ کر جو دیکھا تو گاندھی جی تیز قدموں سے ہماری طرف آرہے تھے۔ وہ آئے اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ محبت سے ہمیں دیکھ رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور اس طرح ہنس ہنس کر ہم سے باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ہمیں برسوں سے جانتے ہوں۔

"جرمنی میں ان کا بڑا شہرہ تھا جہاں روے رولاں کی کتاب کا جرمن ترجمہ بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوا تھا۔ میں نے خود جب میں وہاں تھا ان سے متعلق ایک کتاب شائع کی تھی اور ان کے عدم تشدد کے پیغام پر تقریریں کی تھیں، لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں ان سے مل رہا تھا اور ان کے روبرو تھا۔ آشرم میں میرا قیام دو تین دن رہا اور مجھے کھل کر ان سے گفتگو کا موقع ملا۔ جامعہ میں رہنے اور کام کرنے کا میں پہلے ہی عہد کر چکا تھا اور اس کی وجہ سے کئی ممتاز شخصیتوں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا

ہو واجب الوجود لذاتہ ہے اور چونکہ دیگر سارے وجود اس کے عطا کردہ ہیں اس لئے ممکن فی ذاتہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم یونانی فلاسفہ کے یہاں وجود کے سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس کی ماہیت میں وحدت ہے تو اصل موجودات کیا ہے؟ کسی نے کہا ہوا کسی نے کہا پانی، کسی نے ذرہ کو اصل بتایا اور کسی نے عناصر اربعہ کو اصل قرار دیا۔

وجود و وجودیت کا تصور عہد جدید میں

فکر و فلسفہ کے عہد جدید میں وجودیت (Existentialism) مغرب میں با قاعدہ ایک نظام فکر کے طور پر ابھری ہے جن مفکرین اور فلسفیوں کو وجودی کہا جاتا ہے ان کی آراء پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ان مغربی اہم فلاسفہ کے افکار پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے جن کی آراء نے وجودیت نو کی تشکیل میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes/1596-1650) کانٹ (Kant/1724-1804) ہیگل (Hegel/1770-1831) نطشے (Nietzsche/1844-1900)، برگسان (Bergson/1859-1941) جدید فلسفہ کے بانی ڈیکارٹ نے اپنے سواہر موجود کے وجود میں شک کیا اور فرض کیا کہ سارا عالم واہمہ ہے، میں چونکہ پریشان ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں اس لئے میں کوئی وجود یقیناً رکھتا ہوں اور جب کوئی چیز ہوں تو میرے گردو پیش کی دنیا بھی کوئی وجود رکھتی ہے چونکہ انسان کے مشاعر و حواس میں تذبذب و یقین کی کیفیتیں کار فرما رہتی ہیں اور خارجی محسوسات میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جو ایک نقص کی علامت ہے اور جب ہم نقص و ناقص کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کمال و کامل کا تصور خود بخود ابھرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی کامل ہستی بھی ہو اور وہ ذات الٰہی کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ (واضح رہے کہ ڈیکارٹ کے ان خیالات کی بنیاد امام غزالی کی بعض کتابوں میں پہلے سے موجود ہے) ڈیکارٹ کے مذکورہ بالا نظریات کے زیر اثر جدید فلسفے نے متعدد کروٹیں لیں اور موجودات کی حقیقت اور ان کی معرفت و ادراک کا مسئلہ مستقل زیر بحث رہا۔ بعض فلاسفہ نے کہا کہ ہم خارجی موجودات کا اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا ہمارے حواس و مدرکات ان کا تصور، تجربہ یا احاطہ کر سکتے ہیں، موجودات کی اصل حقیقت اور فی الواقع کنہ تک رسائی عقل انسانی کی دسترس میں نہیں ہے۔

اس گروہ کے سرخیل کانٹ ہیں جنھوں نے وجودی استدلال کی بھی نارسائی اور اس کا نقص

ابوالکلام آزاد سے میرے تعلقات ہو گئے تھے اور میں نے ان سے یہ جاننا چاہا تھا کہ مجھے اپنے کام میں ان سے کیسی رہنمائی اور کتنا سہارا ملے گا، اور یہ کہ اس سلسلے میں کام کا کیا طریقہ ہو گا کہ بہتر سے بہتر نتیجے برآمد ہوں۔ میں گاندھی جی کے پاس بھی اسی لیے آیا تھا۔ میں جامعہ ملیہ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات واحساسات معلوم کرنا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے چلانے اور ترقی دینے میں کتنی اور کس طرح ہماری مدد کر سکیں گے۔ ۱۹۲۴ اور ۱۹۲۵ کے اوائل میں جبکہ اس کے بااثر حامیوں کی ایک خاصی تعداد نے یہ کہہ دیا تھا یا وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب اس کا جاری رکھنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ممکن تو اس وقت انھوں نے ہی جامعہ کو ختم ہونے سے بچایا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اب وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

"ملک میں شک و شبہ اور تناؤ کی جو فضا تھی اس میں ایسا لگتا تھا کہ وہ جامعہ کے لیے کچھ زیادہ نہ کر سکیں گے لیکن انھوں نے جس طرح اپنی بات کہی اس کا میرے اوپر بڑا گہرا اثر پڑا اور اس سے میں نے بڑی تقویت اور فیض حاصل کیا اس سے کہیں زیادہ اگر وہ کسی اور طریقے سے وہ بات کہتے اور دل کھول کر مالی امداد کا وعدہ کرتے تو مجھے پیسے تو مل جاتے لیکن مجھے یہ خیال بھی ہوتا کہ جامعہ کی تعمیر و ترقی زر و مال ہی سے ہو سکتی ہے، آدمیوں سے نہیں۔ انھوں نے جس انداز سے اپنی باتیں کہیں اور کہتے وقت ہم نے ان کا جو عالم دیکھا اس سب سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ میں جذبات سے مغلوب نہیں ہوا، میں وہاں سے یہ خیال لے کر نہیں اٹھا کہ اب جامعہ ملیہ اور خود میرے لیے زندگی آسان ہو گی۔ ہاں اپنے لیے جو راہِ عمل میں نے طے کر لی تھی اس پر چلنے کے لیے میں نے اپنے اندر مضبوط تر عزم اور زیادہ قوت محسوس کی۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے لکھا تھا کہ:

"گاندھی جی نے جس طرح گفتگو کی اس سے یہ صاف عیاں تھا کہ وہ سچائی کی تلاش میں ہیں۔ سچائی، جس سے جامعہ ملیہ سے ان کا تعلق متعین ہو گا۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ کی جڑیں مضبوط ہوں، جامعہ ترقی کرے تاکہ اس سے اس تصور کی ترجمانی ہو جو اس سے متعلق ان کے ذہن میں بالکل واضح تھا۔ انھیں جامعہ کی فکر ہو گی وہ اس کی رفتارِ ترقی

ثابت کیا اور کہا کہ کسی علت اولی یا منبع فیاض کا ہم تصور تو کر سکتے ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع موجود بھی ہو مثلاً اگر میں اپنی جیب میں سوڈالر کا تصور کروں تو مجھے اس سے ان کا ذہنی وجود حاصل ہو جائے گا مگر کیا واقعی سوڈالر میری جیب میں آجائیں گے؟ اس مرحلہ پر ''برگساں'' ایک قدم آگے بڑھ کر قدرے مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں کہ عقل انسانی جن حقیقتوں کا ادراک یا احاطہ نہیں کر سکتی الہام اور وجدان (Intuition) سے ان کا عرفان ممکن ہے (یہ بات بھی امام غزالی اور دیگر متعدد اکابر صوفیہ کی تحریروں میں موجود ہے) کانٹ کے شاگرد ہیگل نے ایک عجیب فلسفہ پیش کیا جو کہ جدلیات (Dialectics) کے نام سے مشہور ہے جس کا مطلب ہے کہ موجود (Thesis) سے عدم (Antithesis) ٹکرا کر اسے آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے مگر اس تصادم کے بطن سے دوسرا موجود (Synthesis) جو کہ سابقہ موجود و عدم یا مثبت و منفی کا مرکب ہوتا ہے اور پہلے موجود سے افضل ہوتا ہے، جنم لیتا ہے (جیسے مرد + عورت = بچہ) اس طرح یہ کائنات جس کی سربراہی انسانی قافلہ کر رہا ہے بہتر سے مزید بہتر کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ کمال کی آخری منزل سامنے آجائے۔ اس نظریہ کی رو سے کانٹ کی علت اولی و ذات کامل اگر آج موجود نہ ہو تو کل یقیناً وجود میں آجائے گی فریڈرک نطشے چونکہ لاہوت اور مذہبی علوم کے طالب علم تھے انہوں نے اس کے برعکس نظریہ قائم کیا اور کہا کہ اس کائنات کا سفر ایک مافوق انسان (Superman) کی تلاش کے لئے جاری ہے اور خالق کائنات خدا کی (نعوذ باللہ) موت واقع ہو گئی ہے۔ حیات و کائنات میں مسلسل آویزش و کشمکش دراصل مافوق انسانی ہستی کو بروئے کار لانے کے لئے جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے مرد مومن کا تصور نطشے کے مرد مافوق کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوا جس کے لئے اقبال نے کہا ہے:

آیۃ کائنات کا معنی دیریاب تو ‏ ‏ ‏ ‏ نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب ‏ ‏ ‏ ‏ گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

(حالانکہ نطشے کے مرد مافوق اور اقبال کے مرد مومن میں زمین آسمان کا فرق ہے، نطشے کے مرد مافوق کی شکل سپرمین، ٹارزن اور کنگ کانگ جیسے عنوانات کے تحت اہل مغرب پیش کرتے رہتے ہیں جبکہ مرد مومن کا تصور خالص اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے)۔

اہل کتاب کی لاہوتی تعلیمات کے زیر اثر حضرت عیسیٰ کی جنھیں نصاریٰ ابن اللہ کہتے ہیں

پر نظر رکھیں گے، وہ اس کے پھلنے پھولنے کے آرزو مند ہوں گے لیکن وہ اس کی ایسی کوئی مدد نہیں کریں گے جس میں اس کا خطرہ ہو کہ جامعہ ملیہ اپنی انفرادیت، شخصیت اور شناخت کے ارتقا کی آزادی سے محروم ہو جائے۔ انسانوں کی طرح ادارے بھی ہوتے ہیں جنھیں وہی سب کچھ ہونا چاہیے جو وہ بننا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے خیالات ان کی پوری شخصیت کے آئینہ دار تھے اور ان کی شخصیت عالم فطرت کا کوئی سانحہ یا موروثی تمدن کی پیداوار نہ تھی۔ اسے ایک اخلاقی ڈیزائن کے مطابق انھوں نے بنایا تھا ایک دستکار کی طرح برسوں صبر واستقامت سے انھوں نے اس پر کام کیا تھا اور اب بھی وہ اس سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا اندازِ گفتگو ایسا نہ تھا جس سے ظاہر ہو کہ وہ جو کام کرنا چاہتے تھے وہ ختم ہو چکا ہے بلکہ وہ اس طرح بات کرتے تھے جیسے وہ کام ابھی جاری ہے اور اس میں ان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، اوزاروں پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو سکتی ہے، ارادے کمزور پڑ سکتے ہیں اور قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ فکر اور عمل میں کامل ہم آہنگی یکایک نہیں پیدا ہو جاتی، یہ سعئ پیہم چاہتی ہے، مکمل خود احتسابی کی خواہاں ہوتی ہے اور اس عمل میں خلوص اور انکسار کی کیفیت ایک خاص ندرت کی حامل بن جاتی ہے۔ گاندھی جی کا خلوص نہ صرف یہ کہ ظاہر تھا بلکہ میرے لیے چیلنج تھا کہ مجھ میں بھی انھیں کی طرح اور اتنا ہی خلوص اور سچائی ہو اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے اپنے کام کو ایک احترام کے جذبے سے کرنا ہے اور اپنے اندر تواضع وانکسار پیدا کرنا ہے، اس لیے کہ جتنا بڑا کام ہوتا ہے اسی قدر اس کے مطالبات مشکل اور محنت طلب ہوتے ہیں، ہر شخص کو ہمہ وقت اور ہر لحاظ سے اپنے کام کا اہل ہونا چاہیے۔"

ذاکر صاحب سے گاندھی جی کی اس ملاقات نے جامعہ کے نقشے میں نئی رنگ آمیزی کر دی۔ ذاکر صاحب ایک نیا عزم لے کر سابرمتی سے واپس ہوئے اور گاندھی جی بھی مطمئن ہو گئے کہ جامعہ کا مستقبل محفوظ ہے کیونکہ جس شخص نے اس کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا زبردست سفیر ہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکیم اجمل خاں کی وفات ہو گئی اور وہ بنیاد ہل گئی جس پر جامعہ کی

آمد (دوبارہ آمد) کے عقیدے کو نطشے نے غالباً اس فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جدید وجودی فلسفہ کا خلاصہ

انیسویں صدی عیسوی میں جن فلسفوں نے مغربی افکار کی نمائندگی یا قیادت کی ان میں چند کافی مشہور ہیں، ہیگل کی مثالی جدلیت، کارل مارکس کی اشتراکیت اور سماجی جدلیت، بنتھام کی نفع پرستی اور لذت کوشی، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور نطشے کی ملحدانہ قوت پرستی وغیرہ انہیں کے شانہ بشانہ ایک فلسفہ اور ابھرا جسے آج ہم وجودیت کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ داغ بیل ڈنمارک کی فلسفی کر کے گارڈ (Kierkegaard1813-1855) نے ڈالی جو ایک مذہبی ادیب تھا جدید وجودیت کا خلاصہ یہ ہے کہ موجود کی اپنی جگہ ایک منفرد و ممتاز حیثیت ہے۔ خدا انسان اور کائنات میں انسانی وجود، خدا کے بعد تمام موجودات سے افضل و اہم ہے۔ وجودی فلسفیوں میں دو قسم کے مفکر پائے جاتے ہیں، خدا پرست اور منکر خدا، لیکن انسانی وجود کی برتری اور اہمیت کے مسئلے میں سب متفق ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مثالیت اور کلیت کے ذریعہ ہم جزئیات تک نہیں پہنچتے بلکہ ہم جسے جانتے ہیں وہ جزئی اور فرد ہے اسی طرح جزئیات واشخاص کا وجود کلیات سے پہلے ہے۔ کلیات فرضی اشیاء ہیں جو تصورات کی حد تک موجود ہوتی ہیں ورنہ فی الواقع جزئیات واشخاص کا وجود ہی اصل ہے اور ہمیں انہیں کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے وجودی فلسفہ میں انسانی مبدأ و معاد اور حاضر و مستقبل کے مسائل ہی زیادہ تر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ کر کیگارڈ کے بعد جن فلاسفہ نے وجودیت کو اپنا مسلک اور مطمح نظر بنایا ان میں مارٹن ہیڈیگر (Heideggar/1889-1969)، کارل یاسپرس (Jaspers/1883-1969) اور جین پال سارترے (Sartre/1905-1980Jeanpaul) زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں ہیڈیگر اور سارترے ملحدانہ نظریات کے حامل ہیں جب کہ یاسپرس معتدل مابعد الطبیعاتی رجحان رکھتا ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت اہمیت اور وسعت سے متعلق بحث کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مادی اور روحانی تقاضے، اس کی معیشت و معاشرت، خوشی غم، انفرادی خاندانی اور عام اجتماعی سطح پر اس کے مسائل اس کی سعادت ونکبت، آزادی و پابندی، محدودیت ولامحدودیت اس کی کنہ کے ادراک کا امکان یا عدم امکان، خدا سے اس کے رشتہ کی نوعیت وحدود، عبادت کی حقیقت وغیرہ جیسے مسائل سے وجودی فلسفہ بحث کرتا ہے۔ کر کیگارڈ اور دیگر خدا پرست وجودیوں کا کہنا ہے کہ خدا سے ہر شخص کا تعلق جداگانہ ہے،

عمارت کا انحصار تھا۔ ذاکر صاحب اس روز جامعہ کے لیے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں مدراس میں تھے۔ انھوں نے یہ روح فرسا خبر سنی تو ان کا دل ڈوبنے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ تاہم انھوں نے خود کو سنبھالا اور گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری کی رہنمائی میں جامعہ کے کام میں انہماک سے مصروف ہوگئے۔ انھوں نے جامعہ اجمل فنڈ قائم کیا تاکہ اس میں جمع ہونے والی رقم کو حکیم صاحب مرحوم کی یادگار دانش گاہ یعنی جامعہ ملیہ کی ترقی کے لیے صرف کیا جاسکے۔ اسی طرح انھوں نے ۱۹۲۸ء میں انجمن تعلیم ملی کے قیام میں مدد کی۔ اس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر انصاری، معتمد ذاکر صاحب اور خازن جمنالال بجاج منتخب ہوئے۔ اس کے قواعد و ضوابط کی رو سے انھیں ۱۹۴۴ء تک صرف چالیس روپے تنخواہ ملنا تھی اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء تک صرف اسی روپے ماہانہ تنخواہ ملتی رہی۔

۱۹۳۰ء میں ذاکر صاحب کو ایک اہم فیصلہ کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ اس سال گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ شروع کرنے کا اعلان کیا تو اس میں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں نے بھی شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ شفیق الرحمان قدوائی، حافظ فیاض احمد، دیوداس گاندھی اساتذہ میں تھے جبکہ سی کرشنن نائر، کے۔ سی۔ ڈیگا، اور حسین حسان طلبہ میں تھے۔ لیکن ذاکر صاحب نے طے کیا کہ جو لوگ تحریک میں شریک ہونا چاہیں انھیں انگ سے اس کی اجازت لینی ہوگی اور عدم موجودگی کی مدت کے لیے جامعہ سے رخصت لینی ہوگی تاکہ جامعہ میں تعلیم کا نقصان نہ ہو اور وہ تحریک میں حصہ لینے والے اساتذہ کی جگہ کوئی متبادل انتظام کر سکے۔

ذاکر صاحب نے اپنے کام کو بہتر بنیادوں پر منظم اور جامعہ کی آمدنی کو مستقل کرنے کے سلسلے میں ایک اور اقدام کیا۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں شعبہ "ہمدردان جامعہ" قائم کیا اور اس کے ترجمان کی حیثیت سے "ہمدرد جامعہ" کی مستقل اشاعت شروع کی۔ اس شعبہ کی جانب سے مختلف شہروں میں چندوں کی فراہمی کے لیے وفود بھیجے جانے لگے۔ ان تمام مصروفیتوں نے ذاکر صاحب کی پہلے سے گرتی ہوئی صحت کو اور بھی متاثر کیا اور انھیں ضعفِ بصر کی شکایت ہوگئی۔ جب گلوکوما کا علاج دہلی میں نہ ہو سکا تو انھیں بمبئی جا کر آپریشن کرانا پڑا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۶ء میں ہندستان میں انتخابات ہوئے۔ اس کے نتیجے میں سات صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی اور اسے ان صوبوں میں حکومت سازی کا موقع ملا۔ کانگریس کی وزارت سازی کے پیش نظر گاندھی جی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ملک میں قومی تعلیم کی از سر نو تشکیل کی خاطر ماہرین تعلیم کو وردھا میں مدعو کیا۔ اس آل انڈیا نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس کے منتظم نامور گاندھی وادی شری من نارائن

خدا سے معروضی (Objective) تعلق ناممکن ہے بلکہ اس سے ہر شخص کا تعلق اپنی ذاتی معرفت و عقیدت اور ادراک کی وعرفانی صلاحیت وقوت کے اعتبار سے موضوعی انداز میں (Subjectively) پیدا ہوتا ہے۔ انسانی وجود کا سب سے بڑا امتیاز اس کو پسند ناپسند کی آزادی حاصل ہونا ہے دیگر مخلوقات و موجودات اپنی فطرت وجبلت کے پابند ہیں جب کہ انسان کو متعدد راہوں میں سے کوئی بھی راہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ گناہ کے بارے میں وجودی فلسفیوں کا کہنا ہے کہ نیکی کا راستہ ابدی سعادت کا راستہ ہے اس پر چلنے والا جب محدودیت، تناقض، تھکن اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سے محرومی کا شکار ہوتا ہے تو گناہ کا سہارا لیتا ہے، بعض وجودی فلاسفہ کی رائے میں ارتکاب گناہ سے کبھی کبھی نیا نشاط حاصل ہوتا ہے۔ انسانی وجود کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ روحانی، عقلی اور وجدانی مشاہدات وکمالات سے بہرہ ور ہے۔ سارترے ہیڈیگر کا شاگرد اور ملحدانہ افکار کا حامل ہے، نطشے کی طرح وہ بھی انسان کو خدا کا قائم مقام سمجھتا ہے، اس کے برخلاف جبریل مارسل (Marcel/1889-1973) کیتھولک عیسائیت کا نمائندہ فلسفی تصور کیا جاتا ہے وہ بعض امور میں یاسپرس کا ہمنوا ہے، اس کا خیال ہے کہ حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونے کا راستہ اخلاص اور وفا ہے جس کی بنیاد امید ور جا ہے اس کے نزدیک خدا کا عرفان عقل وادراک کے ذریعہ ممکن نہیں اس کو اخلاص پر مبنی عبادت اور آفاقی محبت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دراصل مغربی معاشرہ میں ایک طرف مجرد مثالیت پرستی اور دوسری طرف خالص مشینی مادی زندگی کے ماحول میں انسانی وجود کی انفرادی شخصیت گم ہوتی جارہی تھی تو ان دو انتہا پسندیوں کے بیچ میں انسان کی انفرادی اہمیت وعظمت کی طرف توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں وجودی فلسفہ کا ظہور عمل میں آیا۔ اسی کے لئے اقبال نے کہا تھا:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر

وجود و وجودیت کے بارے میں جب ہم بانئ دار العلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کی فکر کا جائزہ لیں تو یہ پیش نظر رکھیں کہ حضرت نانوتویؒ کی تمام تر فکر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن، حدیث اور ائمہ تجدید وعرفان کے اقوال وارشادات سے الگ انہوں نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی، ہاں اس کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتنسیق میں ان کی ایک انفرادی شان ہے۔ دراصل اس تعلق سے متکلمین اور

تھے جو آزاد ہندستان میں گجرات کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس کانفرنس میں جامعہ سے ذاکر صاحب' عابد صاحب اور مجیب صاحب نے شرکت کی۔ اپنے خطبہ میں گاندھی جی نے تعلیم سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پرائمری' مڈل اور ہائی اسکول کی سطحوں تک سات برسوں پر محیط ایسی تعلیم کے رواج پر اصرار کیا جس میں حرفے کی تعلیم ضروری تھی اور جس کا نصاب مرتب کرنا بھی ضروری تھا۔ انھوں نے دستکاری اور حرفے کو نصاب کا مرکز قرار دیا۔ تکلی اور چرخے کی اہمیت کا ذکر کیا۔ ان کے نزدیک یہ امر بھی اہم تھا کہ جو مدرسے شروع ہوں وہ اپنی کفالت بھی خود ہی کریں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حرفے سے پیدا ہونے والی اشیا کو فروخت کر کے اسکولوں کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ ان کے تئیں سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعہ نہیں بلکہ ہاتھ کے کام سے ممکن تھی۔

کانفرنس میں گاندھی جی کے عقیدت مندوں کی اکثریت تھی اس لیے کسی نے ان کے خیالات پر لب کشائی کی جرأت نہ کی لیکن ذاکر صاحب نے' جن پر جرمنی کے تعلیمی فلسفوں کے اثرات غالب تھے اور جو اب جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ تھے بڑی دلیری اور صاف گوئی سے کہا کہ "گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں ہے اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اسے صرف وہی لوگ پسند کریں گے جو اہنسا اور دیہی تہذیب پر یقین رکھتے ہیں۔ جو لوگ تعلیم کا کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سچی تعلیم صرف کام کے ذریعہ ہی دی جا سکتی ہے اور یہ کہ مختلف مضامین ہاتھ کے کام کے ذریعہ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ کوئی دیہی تہذیب کو مانتا ہے یا شہری تہذیب کو' عدم تشدد کو مانتا ہے یا تشدد کو۔ ہم جو معلم ہیں اس راز سے واقف ہیں کہ تیرہ برس کی عمر تک بچے چیزوں کو بنانے' بگاڑنے' توڑنے اور جوڑنے کا رجحان رکھتے ہیں اور یہی چاہتے بھی ہیں۔ فطرت اسی طرح ان کی تربیت کرتی ہے۔ بچوں سے یہ کہنا کہ وہ کتاب لے کر ایک جگہ بیٹھ جائیں' ان کے ساتھ تشدد کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے تعلیم کا کام کرنے والے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ تعلیم کے کام میں ہاتھ کے کسی کام کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ امریکہ میں اس کو پروجیکٹ میتھڈ (Project Method) اور روس میں کامپلکس میتھڈ (Complex Method) کہتے ہیں لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے۔ تکلی کے ذریعہ علم نہیں سکھایا جا سکتا تو کیا ہم انھیں نظر انداز کر دیں گے؟ نہیں! ہم دوسری دستکاریوں کے ذریعے وہ مضامین بچوں کو پڑھائیں گے۔" اسی کے ساتھ جرأت اور بے باکی سے ذاکر صاحب نے تعلیم کی خود کفالت کے نظریہ کو بھی مسترد کر دیا جو نا کام ہو چکا تھا۔ گاندھی جی کو ذاکر صاحب کی صاف گوئی پسند

علمائے اسلام کی آراء مغربی مفکرین وفلاسفہ کی آراء سے بنیادی طور پر کئی زاویوں سے مختلف ہیں کیونکہ اگر اسلام کی روشنی سے محرومی ہے تو پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ فرد اور جماعت کے درمیان توازن، فرد کے نفسیاتی مسائل مثلاً بیماری، بیروزگاری احساس تنہائی اور مایوسی وغیرہ کا حل اسلامی تعلیمات میں پہلے سے موجود ہے۔ اسلام میں انفرادیت و اجتماعیت، مادیت وروحانیت اور جبریت وحریت کے درمیان ایک لطیف امتزاج وتوازن اس انداز میں ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں بالعموم وہ مشاکل ومسائل پیدا نہیں ہوتے جن سے مغربی معاشرہ دوچار رہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں صالح ومومن انسان ہی اس کائنات کا خلیفہ وحاکم ہے۔ وہ دیگر تمام مخلوقات کا بادشاہ اور خلاصہ ہے وہی خالق کائنات کا مخاطب ہے (دوسرے نمبر پر جنات بھی پیام حق کے بالواسطہ مخاطب ہیں) مگر کائنات وانسان کی تخلیق کا کیا منشا ومقصد ہے انسانی معاشرہ کون سی بہتر منزل (Synthesis) کی طرف بڑھ رہا ہے اب تک اس کی راہ میں کتنے اہم موڑ اور سنگ میل آئے ہیں اور آئندہ پوری انسانی جمعیت اور پوری کائنات کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ اس بارے میں ملحد وجودی فلسفیوں کے پاس تو کوئی مثبت فکر ہونے سے رہی، جولا ہوتی فلاسفہ ہیں ان کے پاس بھی صحیح جواب نہیں ہے۔ جبکہ اسلامی نقطہ نظر سے انبیائے کرام صفوۃ الخلائق ہیں اور انبیاء میں پانچ اولوالعزم پیغمبر سب سے بڑے ہیں جن میں حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے افضل و برتر ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء پر اللہ کی نعمتوں اور اس کے دین کا اتمام واکمال ہوگیا، یعنی انسان تمام کائنات کا حاصل انبیاء تمام انسانوں کا خلاصہ اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کا نقطۂ کمال وعروج ہیں: . آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ فکر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں بہت واضح طور پر ابھر کر آئی جب آپ نے ایک مکتوب میں لکھا کہ مقام حضرت ختم المرسلین یہ ہے کہ انسانی کمالات وامکانات اور مراتب ومعالی کا اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جاسکتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے ہیں یعنی اس سے زیادہ بلندی کسی مخلوق کے دائرہ امکان میں نہیں ہے[1] یہی بات متفرق مقامات پر حضرت شاہ ولی اللہ نے بیان کی ہے، شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے باب حقیقت نبوت اور اس کے خصائص میں فرماتے ہیں:

---

(۱) ملاحظہ ہو مکتوبات امام ربانی اور تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد۔

آئی اور انھوں نے کانفرنس سے متعلق رپورٹ تیار کرنے کے لیے کمیٹی کا صدر ذاکر صاحب ہی کو نامزد کر دیا۔ وردھا کی اس کانفرنس میں ذاکر حسین کمیٹی نے مندرجہ ذیل سفارشات کیں:۔

۱۔ ملک میں تعلیم سات سال تک مفت اور لازمی ہو

۲۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو

۳۔ تعلیم کا محور کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ کا نفع بخش کام ہونا چاہیے

۴۔ یہ نظامِ تعلیم رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائے کہ اساتذہ کی تنخواہوں کے اخراجات از خود نکل آئیں

ذاکر صاحب نے جب یہ رپورٹ گاندھی جی کو پیش کی تو انھوں نے اس میں دو تین لفظوں کے اُلٹ پھیر کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ذاکر صاحب نے سات سال پر محیط نصاب مرتب کر کے اس رپورٹ میں شامل کر دیا۔ بعد ازاں کانگریس کے تری پورہ اجلاس نے بنیادی تعلیم کی اس قومی اسکیم کو منظور کر لیا اور تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ اس اسکیم کو کانگریسی صوبوں نے بھی اپنایا اور ذاکر صاحب نے بھی جامعہ میں اس کا تجربہ کر کے اسے اپنی کسوٹی پر پرکھا۔ وہ تعلیمی سنگھ کے صدر بھی منتخب ہو گئے تھے اس لیے جہاں بھی اسکیم پر اعتراضات ہوتے وہاں ذاکر صاحب کو بلایا جاتا تھا اور وہ اپنے جوابات سے معترضین کو خاموش اور مطمئن کر دیا کرتے تھے۔ مسلم لیگی حلقوں میں وردھا اسکیم کی شدید مخالفت ہوئی جن کے نزدیک یہ اینٹی مسلم، دشمن اور مسلم مخالف اسکیم تھی۔ لیگ نے ہر طرح ذاکر صاحب کو رسوا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوتے ہی ہندستانی رہنماؤں کو اعتماد میں لیے بغیر ہندستان کو بھی جنگ کے شعلوں میں دھکیل دینے کے حکومت کے فیصلے کے خلاف احتجاج کے طور پر صوبوں سے کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور اس طرح ذاکر صاحب کی بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم بھی ناکامی کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ تاہم آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعد ازاں اس کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ذاکر صاحب نے ایک تقریر میں کہا:

"جو تھوڑا بہت علم مجھے ملک میں اس اسکیم کے وسیع پیمانے پر ابتدائی نظامِ تعلیم کے طور پر چلانے کے بارے میں ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اکثر صورتوں میں اس کو ٹھیک آزمایا نہیں گیا۔ اس کے بنیادی تصورات کی کافی تشریح نہیں کی گئی۔ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو تیاری ہونی

"انسانوں میں سب سے اعلی طبقہ مفہم کا ہوتا...... مفہمین کی بہت سی قسمیں ہیں..... جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کران کے ذہنوں اور قلوب کو اوران کی تمام طاقتوں کو اللہ کے حوالے کرا دیتے ہیں انہیں پیغمبر کہا جاتا ہے.... انسانوں کی نافرمانیوں اور مفاسد پردازی کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مبعوث فرماتے رہے تھے تا آں کہ نبوت کا سلسلہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرما دیا۔(۲)

حضرت نانوتوی کی فکر میں انسانی وجود ایک عالم اصغر ہے جبکہ یہ کائنات عالم اکبر ہے۔ عالم اکبر کی حیات عالم اصغر کی صلاح وفلاح پر قائم ہے۔ اگر عالم اصغر کا نظام بگڑ جائے تو عالم اکبر کا نظام بھی درہم برہم ہونے لگتا ہے، بانیٔ آریہ سماج تحریک پنڈت دیانند سرسوتی نے جب اسلام کے عقیدۂ آخرت وقیامت پر اعتراضات کئے تو حضرت نانوتوی نے ان کے جو جوابات دیئے وہ انتصار الاسلام نامی کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں حضرت نانوتوی فرماتے ہیں:

"اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم اور کائنات چند اجزا اور اجزا کے ایک مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح جسم انسانی مختلف اعضاء وجوارح: آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ الگ الگ مقاصد اور مختلف اغراض کے کام آتے ہیں اسی طرح مجموعۂ کائنات کے اجزاء مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ اور دریا وغیرہ بھی مختلف اغراض اور الگ الگ مقاصد کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔۔۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ مجموعۂ کائنات کو انسانی جسم کے ساتھ بہت حد تک مشابہت و یکسانیت حاصل ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے اپنی خاص اصطلاح میں کائنات کو شخص اکبر یا عالم اکبر اور جسم انسانی کو اس کے مقابلے میں شخص اصغر یا عالم اصغر سے تعبیر کیا ہے جس طرح "شخص اصغر" انسان کے جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے باعث اس کے مزاج اصلی اور اعتدال میں کوئی تغیر وفساد رونما ہو جائے تو اسے مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح "شخص اکبر" کائنات کے مزاج وترکیب میں کسی طرح کا تغیر وفساد رونما ہو جائے اور کوئی نئی اور انوکھی کیفیت ظاہر ہو جائے تو اسے اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کے مرض یا بہ الفاظ دیگر علامت قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تغیر وفساد اور مرض میں اگر اتنی شدت پیدا ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں انسان

(۲) تلخیص حجۃ اللہ البالغہ از سید رضی الدین احمد ص ۷۶۔۷۷

چاہیے تھی نہیں ہوئی اور اکثر صورتوں میں ان حضرات نے جو اس اسکیم کو چلانے کے ذمہ دار تھے اس مستعدی' محنت اور یکسوئی کے ساتھ کام نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔ عموماً مدرّسوں اور انسپکٹروں کو ٹریننگ نہیں دی گئی۔ بنیادی تعلیم کے مدرسوں اور دوسرے مدرسوں کو ساتھ ساتھ چلانے سے یہ ظاہر ہو گیا یا کم سے کم لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ ارباب حل وعقد جو تعلیمی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں ابھی تک حیص بیص کی حالت میں ہیں۔ اکثر جگہ بنیادی تعلیم کے مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں' ہائی اسکولوں اور یونی ورسٹیوں میں مناسب اور واضح تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہمّت شکن خیال پیدا ہو گیا کہ بیسک اسکول ہماری تعلیم کے پر سکون سمندر میں ایک شور انگیز طوفان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عوامل تھے جن کی وجہ سے بنیادی تعلیم کا تجربہ جیسا ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا۔ ایک ایسی تعلیمی اسکیم کے بارے میں جو اتنی دور رس اہمیت رکھتی ہو اور اسقدر معقول تعلیمی نفسیاتی اور سماجی بنیادوں پر قائم ہو' خلوص اور دیانت داری کے ساتھ تجربہ کیے بغیر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناکام رہی"۔

انھوں نے پھر ان الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا کہ "بنیادی تعلیم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ناکام رہی' وہ تو اب بھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے کہ اسے خلوص اور دیانت داری سے آزمایا جائے۔"

وردھا اسکیم کے سلسلے میں خود ذاکر صاحب نے عملی کردار ادا کیا تھا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں جب جامعہ میں استادوں کا مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے مقاصد میں وردھا اسکیم کے تحت اساتذہ کی ٹریننگ بھی شامل تھی۔ اگرچہ وہ بمبئی میں گلوکوما کے سلسلے میں آنکھ کا آپریشن کرا چکے تھے تاہم ان کی بے پناہ مصروفیات نے افاقہ کو دور رکھا اسی لیے جون ۱۹۳۹ء میں انھیں اپنے علاج کی غرض سے جرمنی کا رخ کرنا پڑا اور جب ستمبر میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا تو انھیں سوئٹزرلینڈ کی برفاب وادیوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور بغیر علاج کرائے ہندستان واپس ہونا پڑا۔

اپنے جرمنی روانہ ہونے سے قبل ۵راپریل ۱۹۳۹ء کو ذاکر صاحب نے جامعہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کا خیر مقدم کیا تھا۔ مولانا نامور مسلم رہنما تھے جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد تھے اور دارالعلوم کی جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف سے وابستہ رہ چکے

کی روح جسم سے الگ ہو جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے اسی طرح کائنات کی ترکیب میں بھی اگر ایسا خلل پیدا ہو جائے جس کے نتیجے میں اس کی روح کو اس سے الگ ہونا پڑے تو اسے اسلامی تعلیم کی رو سے قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جیسے موت کے بعد انسانی جسم جن عناصر سے مرکب ہوتا ہے وہ الگ الگ ہو کر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں اسی طرح "عالم اکبر" اور "شخص اکبر" کائنات کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے شیرازۂ ترکیب میں شامل ہر جز ہر عنصر اور ہر طبقہ بھی اپنی اصل سے جا ملے گا، چنانچہ نیکی اور نیکیوں کا عنصر و طبقہ جنت میں اور ہر برائی اور بروں کا عنصر و طبقہ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اسی عمل کو اسلام میں جزا و سزا، حساب و کتاب اور پھر جنت و جہنم میں جانے کے مرحلے سے تعبیر کیا گیا ہے"۔ (۳)

مولانا نانوتوی کے فلسفہ کی رو سے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد خالق کائنات کے نزدیک اس کی صفات کا عرفان اور اس کی عبادت کی تکمیل ہے۔ اس لئے ایک ایسی ذات کی تخلیق پر اس کا نقطۂ کمال پہنچتا ہے جو خدا کی صفات کا عکس لئے ہوئے ہو اور عبدیت کاملہ سے متصف ہو، وہ ذات رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کی جامع صفت علم ہے جو ذات علم کے بھی اعلیٰ درجے پر ہو اور عبدیت کے بھی بلند ترین مقام پر ہو وہی کائنات کا نقطۂ عروج ہے لیکن اب جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی اور دین کی تکمیل ہو گئی تو کیا باقی رہ گیا، اس کے بارے میں حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ:

"اس دین کا عام ہونا اور عبدیت کاملہ کا عام عرفان و اتباع ہونا باقی رہ گیا ہے جب یہ کام پورا ہو جائے گا تو اس وقت یہ کارخانہ عالم لپیٹ دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی"۔

مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں:

"خاتم المراتب ہونے کا درجہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں وہ صفت موجود ہو جسے خاتم الصفات کہا جاتا ہے یعنی صفت علم گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جس ذات میں صفت علم بہ درجہ کمال پائی جائے گی اسی ذات کو خاتم المراتب ہونے کا شرف حاصل ہوگا اور پھر وہی عبادت کاملہ یعنی خدا کی تمام صفات کے مقابلے میں بالاجمال اظہار عجز و نیاز پر قادر ہوگی... غرض کارخانہ عالم کی تخلیق کا مقصد

---

(۳) انتصار الاسلام صفحہ ۵۱ بحوالہ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم مئی ۱۹۹۸

تھے۔ انھیں شیخ الہند نے تحریک آزادی کے سلسلے میں غیر مسلموں کی مدد سے ہندستان کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے کے مقصد سے کابل بھیجا تھا جہاں انھوں نے راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں پہلی جلاوطن عارضی حکومت کی تشکیل کی تھی۔ اس حکومت کے وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ خود مولانا سندھی تھے۔ مولانا نے شیخ الہند کی ریشمی رومال کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا تھا اور تبھی سے وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے بطور خاص انھیں جامعہ میں مدعو کیا اور ان کے ارادوں کی تکمیل میں مدد کی۔ انھیں دنوں ذاکر صاحب کو تبلیغی جماعت سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی اور انھوں نے مولانا الیاس کے پروگرام سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے تبلیغی کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ ان کاموں میں ان کے خلوص سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں ان کے خلاف وردھا اسکیم کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں بڑی حد تک دور ہو گئیں۔

یہ وہ دور تھا جب ہندستان میں مسلم لیگ اپنی جڑوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے عملی اقدامات کر رہی تھی۔ اس نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنے اجلاس لاہور کی قرارداد میں تقسیم وطن کر کے مسلمانوں کے لیے ایک نئی ریاست کا مطالبہ کر دیا۔ اس مطالبہ کی شدت سے مخالفت ہوئی۔ مسلم قوم پرور جماعتوں نے اسے مسترد کر دیا۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبہ نے بھی اس مطالبہ کی مذمت کی جو دو قومی نظریہ کے تحت وطن کو تقسیم کرنے کے لیے منظور کیا گیا تھا۔ جامعہ والے ذاکر صاحب کی قیادت میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اس کی بھرپور مخالفت کرتے رہے اور جامعہ کو ایسے عناصر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے جو فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کی صدارت میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں "کرو یا مرو" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے "ہندستان چھوڑو" تحریک کا آغاز کیا تو جامعہ والوں نے اس کی پرزور حمایت کی۔ کانگریس کے تمام رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد لیگ کو میدان صاف ملا اور اس نے اپنے نظریات کو عام کرنے کی غرض سے وہ تمام حربے استعمال کیے جن سے تحریک پاکستان کو تقویت پہنچ سکتی تھی تاہم جامعہ اس کے زیر اثر نہیں آئی۔ ذاکر صاحب ہمیشہ تمدن کی مشترکہ اقدار پر اصرار کرتے رہے کیونکہ متحدہ قومیت پر ان کا یقین کامل تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جب اپنی عمر کے پچیس برس پورے کر چکی تو جامعہ والوں نے اس کا جشن سیمیں (سلور جوبلی) منانے کا فیصلہ کیا۔ جوبلی کمیٹی کی سربراہی کی ذمہ داری ذاکر صاحب پر عائد ہوئی۔ اس کمیٹی کے دوسرے ممبران پروفیسر محمد مجیب، ارشاد الحق اور عبدالغفار مدھولی

عبادت کاملہ جب پورا ہو جائے گا تو اسے ختم کر دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی... پھر جب خاتم النبیین اور عبدِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ورودِ مسعود کے نتیجے میں عبادت کاملہ وجود میں آ چکی۔ اس لئے اب کائنات کے بقا کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ اب صرف ایک چیز کا انتظار ہے کہ دینِ خاتم النبیین پورے عالم پر ایک بار چھا جائے، اس کام کے پورا ہوتے ہی شیرازہ کائنات بکھیر دیا جائے گا اور اسلامی تعلیمات وعقائد کی رو سے قیامت قائم ہو جائے گی۔ (۴)

انسان وکائنات کے وجود کے بارے میں مذکورہ خیالات بہت واضح ہیں اور یہ منزلیں ہیں جن کا ہمارے وجودی فلسفیوں کو شاید خیال تک نہیں۔ وہ حقیقت میں جب خالق وجود تک نہیں پہنچتے تو وجود تک کیسے پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اس راہ میں اول وآخر رہنما رسول اللہ کی ذات بابرکت ہے اس کا عرفان حاصل کئے بغیر یہ گتھی سلجھ ہی نہیں سکتی۔ وجود وموجودات کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کی وجودی صفات کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کے افکار تقریر دل پذیر اور دیگر متعدد کتب ورسائل میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ کہ کوئی صفت بعض اشیاء میں اصلی ہوتی ہے اور بعض میں عطائی اور بالعرض جیسے گرمی سورج اور آگ میں بالذات ہے مگر ان کے وسیلے سے جن چیزوں میں پیدا ہوتی ہے ان میں حرارت اصلی نہیں بلکہ بخشی ہوئی ہے۔ اسی طرح وجود کی صفت اللہ تعالیٰ کے لئے اصلی ہے اور دیگر تمام اشیاء وذوات کے لئے اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اس لئے حقیقی وجود اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور باقی دیگر وجود عارضی اور عطا کئے ہوئے ہیں، مولانا نانوتوی کی رائے میں صوفیہ کے وحدت الوجود کا یہی مطلب ہے کہ حقیقت میں وجود اصلی ایک ہی ہے۔ حضرت نانوتوی کے نزدیک اس معنی میں وحدت وجود تو صحیح ہے لیکن موجودات میں کثرت ہے، ان میں وحدت سمجھنا غلط ہے، فرماتے ہیں:

وحدت موجودات ایک امر مشہور ہے مگر واقعی نہیں ہے، البتہ وحدت وجود امر واقعی ہے'' (۵)

لفظ وحدت الوجود سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں مگر حضرت نانوتویؒ کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے (ابھی یہ موضوع مزید بسط وشرح چاہتا ہے مگر تطویل کے خوف سے اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے)

---

(۱) انتصار الاسلام بحوالہ ماہنامہ ترجمان دار العلوم نئی دہلی، جون ۱۹۹۸۔ (۱) جمال قاسمی۔ (۵) جمال قاسمی۔

مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۵ء سے "صحیفہ جوبلی" کے نام سے ایک ماہانہ قلمی رسالہ نکلنا شروع ہوا جسمیں جوبلی سے متعلق معلومات ہوتی تھیں۔ ذاکر صاحب نے خیر خواہانِ جامعہ سے اس تقریب کے انعقاد کے سلسلہ میں تعاون کی اپیل کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھا:۔

"۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ منظر آپ کی چشم تصور کے سامنے ہو گا جب خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے خانۂ خدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا۔ اس واقعہ کو چوتھائی صدی گزر گئی۔ مسلمانوں کی قومی تحریک نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت سے سیاسی اور تعلیمی ادارے بنے اور بگڑے لیکن جامعہ ملیہ سخت مشکلوں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی رہی۔ اب اس نے اتنی قوت حاصل کر لی ہے کہ اس کی شاخیں دور دور تک پھیلیں اور سارے ملک پر چھا جائیں: مگر اس سے پہلے ضروری ہے کہ جامعہ ملت اسلامی کے سامنے جائزہ دے کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے اور اس سے ہدایت لے کہ آیندہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

"چنانچہ مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ آیندہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ سلور جوبلی کے نام سے ایک جشن کیا جائے جس میں جامعہ کے قدیم طلبہ، ہمدردانِ جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں۔ ان کی اصلاح اور ترقی کی تدبیریں بتائیں اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع کے لیے پیش کی جارہی ہیں غور فرمائیں۔ کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا جائے اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں خیال ہے کہ علوم اسلامی کا ایک تحقیقاتی ادارہ "بیت الحکمت" کے نام سے قائم کیا جائے، ایک کتب خانے کے قیام کا انتظام ہو، جس میں اسلام اور ہندستان سے متعلق تمام کتب کا ذخیرہ ہو۔ اعلا پیمانہ پر ایک صنعتی مدرسہ کا کام شروع کیا جائے اور ایک لڑکیوں کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی جائے۔ ان نئے اداروں کی عمارت کے علاوہ جامعہ کی نو آبادی کے لیے ایک جامع مسجد کی تعمیر نیز ایک شفاخانہ کا قیام از بس ضروری ہے۔ کاش یہ سب کام جوبلی کے سلسلہ میں کم سے کم شروع تو ہو جائیں۔ آپ کی توجہ سے کیا عجب ہے کہ ہم سال بھر کے اندر اتنا سرمایہ فراہم کر لیں کہ ان کاموں کا آغاز ہو سکے۔"

مولانا عبدالعلی فاروقی*

الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور اہل تشیع

حضرت نانوتویؒ نے اہل تشیع کی اصلاح اور تشیع کے نقصانات سے امت مسلمہ کی حفاظت و صیانت کے لئے جو بارآور خدمات انجام دیں، انہیں علمی اور عملی دو عنوانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علمی سے مراد حضرت کی وہ تحریرات ہیں جن کے ذریعہ تشیع کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے اسلام اور اسلامی تعلیمات سے ان کے متصادم ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے اور عملی سے مراد وہ مساعی جلیلہ ہیں جو آپ نے اصلاح احوال کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اور اپنی عزت و آبرو کو خطرہ میں ڈال کر مباحثوں اور مواعظ کے ذریعہ انجام دیں اور ایک سے زائد مرتبہ اس کے خوشگوار ثمرات ظاہر ہوئے۔

اس موضوع پر حضرت الامام کے علمی آثار میں سب سے زیادہ ضخیم، مدلل، مفصل اور مستند تصنیف ''ہدیۃ الشیعہ'' ہے، جس کے بارے میں ''مواعظ قاسمی'' کے مؤلف حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی یوں رقم طراز ہیں:

> ''تصنیفی سلسلہ میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ساڑھے تین سو صفحات سے زائد اوراق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسط اور لکھائی بھی اس کی گنجی ہوئی ہے۔ اپنے عام طریقۂ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے پیش کیا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام ''ہدیۃ الشیعہ'' ہے(۱)

اس کتاب کے آغاز میں اس کے مقصد تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ ہیچمداں گمنام محمد قاسم نام متخلص بخاکپائے علماء، ناظران اوراق کی

(۱) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۶۴ مطبوعہ دہلی

* ماہنامہ ''البدر، کاکوری، لکھنؤ (یوپی)

اگر چہ جوبلی کے لیے مارچ ۱۹۴۵ء کی تاریخیں طے کی گئی تھیں لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ انہی تاریخوں میں ملک میں انتخابات ہو رہے ہوں گے اس لیے یہ طے ہوا کہ اس تقریب کا انعقاد ۱۹۴۶ء میں ۱۵ر سے ۱۸ نومبر تک عمل میں آئے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ذاکر صاحب کو یونیسکو کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس موقع پر مستقبل میں جامعہ ملیہ کے منصوبوں کو کتابچوں کی شکل میں ہمدردانِ جامعہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ ان میں سے ایک کتابچہ "جامعہ ملیہ کیا ہے" کے عنوان سے خود ذاکر صاحب نے قلم بند کیا۔ اس کتابچہ میں انھوں نے جامعہ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:۔

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہبِ اسلام ہو اور اس میں ہندستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گی۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت و خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لیے دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہِ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا، سنبھلنا، غلطی کرنا اور سیکھنا، یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

"جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک نظام بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔ علم محض روزی کی خاطر، جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی

خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سو تراسی ہجری میں مخدوم العلماء، مطاع الفضلاء، مجمع الکمالات، منبع الحسنات، زیب طریقت، حامی شریعت، فخر احباب، افتخار اصحاب، ملجاء انام، مرجع خاص وعام، معلم قانون اطاعت وانقیاد ومحرک سلسلۂ رشد وارشاد، جامع کمالات ظاہری وباطنی مخدومنا ومولانا مولوی رشید احمد گنگوہی دام رشدہ وارشادہ نے ایک خط متضمن بعضے خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بنام میر نادر علی صاحب ساکن کرتھل نواح الور تھا، اس ہیچمداں کے پاس بایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں، اتفاقات سے ان ایام میں حسب ایماء بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے، اوقات فرصت میں دربارۂ اثبات توحید و رسالت بدلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا، سو کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بوجہ کاہلی طبع زاد اس کے جوابات کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا اور پھر بوجہ ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا، القصہ بہر طور کار دشوار تھا مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا، لہٰذا تحریر مضامین توحید ورسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کئے مگر کچھ تو ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کچھ قلت فرصت اور کچھ سرگرانی، اس لئے ایک دفعہ تو نہ بن پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۴ھ بارہ سو چوراسی میں تمام کیا اور بعد اختتام "ہدیۃ الشیعہ" اوراق کا نام رکھا اور وجہ اس نام رکھنے کی حالانکہ یہ رسالہ بظاہر مؤید اہل سنت ہے اور اس وجہ سے "ہدیہ اہل سنت" کہنا مناسب تھا، یہ ہے کہ بہ نسبت اہل سنت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے، اہل سنت کے لئے تو اس میں اتنا فائدہ ہے کہ کچوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے، پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں ذریعہ حصول ایمان ہے۔ (۲)

واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اسم بامسمّٰی ہے اور اس میں بڑے ہی نرم، ناصحانہ اور مشفقانہ لہجہ میں اہل تشیع کی ان خرافات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے عوام تو عوام، بہت سے اہل علم بھی بے خبر تھے۔ جیسا کہ پہلے تمہید میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عام اہل علم کے ذہنوں میں یہی بات رہی کہ تشیع اور تسنن

(۲) ہدیۃ الشیعہ۔ ص:۲، مطبع قدیم دہلی

خاطر' جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب' حکمت اور صنعت' سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقہ سے روزی کما سکیں' مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا' اجرت کو خدمت کا تاج سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا رکن بنے یعنی سوسائٹی میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ لے جہاں وہ اپنی قوموں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو اور اس کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اس کی اور اس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ خدا ہمیں ان ارادوں پر قائم رکھے۔ آمین''۔

۷ار نومبر ۱۹۴۶ء کو جوبلی کا خاص جلسہ منعقد ہوا اس کی صدارت نواب حمید اللہ خاں والئی بھوپال نے کی۔ اس تقریب میں پنڈت جواہر لال نہرو جو عبوری حکومت کے وزیر اعظم تھے، مسٹر آصف علی' مولانا آزاد' سی۔ راجگوپال آچاری، محمد علی جناح، مس فاطمہ جناح، لیاقت علی خاں اور دیگر بے شمار اکابرین شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں ذاکر صاحب نے جامعہ کی پچیس سالہ کارکردگی کی جو رپورٹ پیش کی وہ ان کی معرکہ آرا تحریروں اور تقریروں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے کہا:۔

''اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول' سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی' آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں موخر الذکر کی اہمیت کا اقرار' یہ ہمیشہ کے لیے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے اور اگرچہ بسا اوقات اس سے

کے درمیان بنیادی اختلاف بس ت ''تفضیل علی'' کا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ خداوند قدوس کی ذات وصفات، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وعصمت اور خاتمیت، قرآن مجید اور اس کے اولین ناقلین کا اعتبار تک اسی اختلاف کی زد میں آچکے ہیں اور اہل اسلام واہل تشیع کے عقائد ان تمام امور میں بالکل جدا جدا ہیں۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے اپنی اس کتاب میں اس کی نشان دہی کرتے ہوئے سب سے پہلے قرآن مجید کی بحث چھیڑی ہے اور اہل تشیع کے ائمہ معصومین کی روایتوں اور ان کی کتابوں کے مضبوط ومعتبر حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ قرآن پر شیعوں کا ایمان نہ ہے نہ ہوسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی حافظ قرآن نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ ایک مقام پر اہل تشیع کے ''عقیدۂ تحریف قرآن'' پر بحث کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''اور کلینی (یعنی کلینی کی تصنیف اصول کافی) جو تمہارے نزدیک اصح الکتب ہے اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے: عن هشام بن سالم عن ابی عبدالله ان القران الذی جاء به جبرئیل الی محمد صلی الله علیه وعلی آله سعبة عشر الف آیات. یعنی ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں فقط۔ اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جو اب موجود ہے اس میں کل قریب چھ ہزار آیتوں کے ہے، تو شیعوں کی اس روایت کے موافق کوئی دو تہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے........(اسی سلسلۂ مضمون میں چند سطروں کے بعد) القصہ حسب مقولۂ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی، قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر معتبر ہونے میں تورات وانجیل سے بڑھ گیا، حالانکہ ان کا حافظ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دنیا پرست کہ آیات خداوندی کا بیچ دینا اور احکام کا بدل ڈالنا اور تحریف کا کرنا، ان کا کام ہی تھا، اس کے فقط پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے، حافظ ونگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے نزدیک کلام اللہ کے تورات وانجیل سے بڑھ کر ہونے کے یہی معنی ہیں کہ بے اعتباری میں ان سے بڑھا ہوا ہے''(۳)

(۳) حوالہ مذکورہ۔ ص:۱۸،۱

بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اس پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی ان کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی' بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔"

ذاکر صاحب نے جامعہ کے ربع صدی پر محیط کاموں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد کہا:

"پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے' جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی' جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے' چمن بندی ہے' مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے اور وہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی' پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُکسے' جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں' دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں' جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو' جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ اللعالمینؐ کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت بنیں' یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو... وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے اور ہر

اسی طرح خلیفہ راشد اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی صحابیت پر آیت قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

تیسری آیت الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزنْ ان اللہ معنا. "یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کروگے تو کیا ہوگا، اللہ اس کا مدد کرنے والا ہے۔ پہلے بھی اس کی اسی نے مدد کی ہے، جب کہ کافروں نے اسے نکال دیا تھا جبکہ وہ تھا اور ایک اس کے ساتھ اور تھا جب وہ دونوں غار میں تھے، کب؟ جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے سے یوں کہتا تھا کہ تو غمگین مت ہو ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ اس آیت میں بہ نظر انصاف غور کیجئے اور منہ زوری کو چھوڑیئے، دیکھئے یہ آیت کدھر کو لئے جاتی ہے؟ سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ بتلاتی ہے؟ ہمیں اس جگہ مرزا کاظم علی صاحب لکھنوی کا مقولہ، جو بڑے متبرک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوۃ الزمان مولوی دلدار علی صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے، یاد آتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو کچھ جی چاہے سو کہے، پر خلیفہ اول کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے، اہل محفل میں سے کسی نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے، صحابی اور صاحب کے معنی میں کچھ فرق نہیں، سو خدا بھی خلیفہ اول کے صحابی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے اتفاق سے ابوبکر صدیق ہی مراد ہیں۔ سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کاظم علی صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے ویسے نہ تھے، علم وزہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرۂ آفاق تھے، کون سا عالم شیعہ مذہب ہے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا۔ اور ان کا بھی اس بات میں کچھ قصور نہیں، اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت وشنود کی نہیں، ہر طرف سے سنیوں کا ہی مطلب نکلتا ہے"(۴)

ایک دوسرے مقام پر شیعوں کے امام معصوم یعنی امام باقر کی طرف سے مقام صدیق اکبرؓ کے اعتراف کا حال بیان کرتے ہوئے یوں رقم فرمایا ہے:

(۴) ہدیۃ الشیعہ۔ ص: ۲۷

طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ دولت لٹانے سے ہی بڑھتی ہے۔ اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنانِ جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی؟ اس سوال کا جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا لیکن اس کا ایک جواب آپ کے ذمہ بھی ہے۔"

جوبلی کا زمانہ ملک میں فسادات کا زمانہ تھا۔ ہر روز فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خود جوبلی کی تقریبات کے انعقاد کے دنوں میں بھی دہلی فسادات کی آگ میں جھلس رہی تھی اس لیے اب جبکہ جوبلی کے جلسہ میں ہر مکتب خیال کے افراد اور ہر فرقہ کے رہنما موجود تھے، ذاکر صاحب نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں سے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطحِ اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے لیے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں' آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے

''حضرت امام باقرؓ بھی ابوبکر صدیقؓ کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے تقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور تقیہ ان پر حرام تھا، علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری اپنی کتاب کشف الغمة عن معرفة الائمة میں نقل کرتے ہیں:

سئل الامام ابوجعفر عن حلية السيف هل يجوز فقال نعم قد حلّى ابوبكر الصديق سيفه فقال الراوى اتقول هكذا فوثب الامام عن مكانه فقال نعم الصديق نعم الصديق نعم الصديق فمن لم يقل له الصديق فلا صدق الله قوله فى الدنيا و الاخرة ۔یعنی حضرت امام ابوجعفر یعنی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ وعن آبا الکرام سے کسی نے پوچھا کہ تلوار کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش و نگار یا بوٹے وغیرہ بھی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے، اس لئے کہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی کا جھول کرایا تھا۔ راوی نے کہا کیا آپ ابوبکر صدیق فرماتے ہیں؟ آپ غصہ میں اپنی جگہ سے اچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق ہاں صدیق۔ جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ اس کی باتوں کو دنیا و آخرت میں سچی مت کیجیو۔ فقط

اب گوش گذار اہل انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ اردبیلی علم و فضل میں یکتا اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں ان کی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑ سکتا''۔(۵)

اسی طرح خلیفۂ دوم سیدنا عمر فاروقؓ کے سلسلہ میں شیعوں کے باطل عقائد کی تردید اور شیعہ کتابوں ہی کے بھرپور حوالوں سے ان کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر یوں تحریر فرمایا ہے:

''حضرت امیر نے حضرت عمر کو لائق فائق سمجھ کر اپنی صاحبزادی مطہرہ کا نکاح کیا، نہ کہ جبراً کرہاً۔ سئل الامام محمد بن على الباقر عن تزويجها فقال لولا انه راه اهلا لما كان يزوجها اياه و كانت اشرف نساء العالمين جدها رسول الله صلى الله عليه وسلم و اخوها الحسن و الحسين عليهما السلام سيدا شباب اهل الجنة و ابوها علىؓ ذوالشرف والمنقبة فى الاسلام و امها فاطمة بنت محمد صلى الله

---

(۵) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۱۴۲، ۱۴۳۔

سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھایئے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی' کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اِس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔"

تمام رہنمایان قوم خاموشی سے ذاکر صاحب کی تقریر سن رہے تھے ان کے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا' البتہ شرمندگی کا احساس ضرور ان کے دلوں کو جھنجھوڑ رہا ہوگا۔ جامعہ کے کارکنوں کے بارے میں جنھوں نے جامعہ کی پچیس سالہ زندگی میں کبھی کوئی ذاتی خوشی نہیں دیکھی تھی اور ہمیشہ دکھ اور پریشانیاں جھیلی تھیں ذاکر صاحب نے کہا:

"میں چند لمحوں کے لیے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کر کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا ـــ جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں' میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ پریشانیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہ قوم کے بچوں کے لیے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لیے ترستے ہیں۔ یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ کتابوں کو ترستے ہیں' تحقیقی وسائل کو ترستے ہیں۔ انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لیے زمین خریدواتے ہیں اور اپنے مطالبات کو موخر کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے فال نیک ہیں۔ انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے ـــ"

ذاکر صاحب کے ان الفاظ نے حاضرین کے دلوں کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خود ذاکر صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ان الفاظ کا اثر یوں بھی ہوا

علیه وسلم وجد تها خدیجة بنت خویلد رضی الله عنها۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثومؓ کے حضرت عمرؓ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علی حضرت عمر کو حضرت ام کلثومؓ کے لائق نہ سمجھتے، ہرگز ان کا نکاح ان سے نہ کرتے۔ وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لئے کہ نانا تو ان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما جو جوانان جنت کے سردار ہیں باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف و منقبت رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت فاطمہ سیدۃ النساء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور نانی ان کی خدیجۃ الکبری خویلد کی بیٹی رضی اللہ عنہا۔ فقط اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی صاحب کی بناوٹ دیکھئے، زوف اسی دعویٰ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لئے صحابہ سے عداوت ہے اور ہماری تشخیص میں یوں آتا ہے کہ آپ کو اصل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب سے اہل بیت کو اپنی طرف کھینچتے ہیں"۔ (۶)

دوسری جگہ اہل بیت نبی یعنی ازواج و اولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیعوں کے سلوک کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ازواج مطہرات جو امہات مومنین یعنی سب مسلمانوں کی ماں ہیں ان کی نسبت جو کچھ شیعہ ثناخواں ہیں سب ہی جانتے ہیں حالانکہ اصل اہل بیت وہی ہیں، کیونکہ اول تو اہل بیت کے معنی بعینہ اہل خانہ ہے، اتنی بات تو گو کچھ لوگ نہ جانتے ہوں مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے، دوسرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی کی شان میں وارد ہوا ہے کہ حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت ہونے کی فضیلت میں داخل ہو گئے ہیں۔ باقی رہی اولاد رسول، سو ان کا حال بھی سنئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور برا کہتے ہیں، منجملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ہمام زین

(۶) ہدیۃ الشیعہ۔ ص:۱۶۹

کہ یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ تھے اور ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوئے تھے جس نے خود دینوی آسایشوں کے بدلے خاردار راہوں پر چلنے کو ترجیح دی تھی۔ ان کی رپورٹ میں جامعہ کی پچیس سالہ زندگی کا پورا نقشہ موجود تھا جسے انھوں نے پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب رقم طراز ہیں:۔

"شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو مختلف موقعوں پر تقریریں کرنی پڑیں، یہ سب برجستہ اور پُرمغز تقریریں تھیں اور ان سب کا نچوڑ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو پہلے کہہ چکے تھے ان کی اس لکھی ہوئی تقریر میں تھا جو غالباً ان کی زندگی کی سب سے زیادہ دلگداز اور پر اثر تقریر تھی۔ ان کے دائیں اور بائیں وہ لوگ بیٹھے تھے جن کے ہاتھ میں اس وقت ہندستان کے عوام کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ انھوں نے ایک ایسے معلم کی حیثیت سے تقریر کی جس نے بیس سال سے زیادہ کام کیا تھا اور مصیبتیں جھیلی تھیں اور جسے اپنے اور تمام سچے معلموں کی امیدوں کی بربادی کا خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ ان کی تقریر نے بہت سی آنکھوں کو پرنم بنادیا اور اگر لوگ عادتاً ذاتی اغراض کی قربان گاہ پر اپنی فطری نیکی اور فیاضی کی بھینٹ چڑھانے کے خوگر نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ رویّوں اور رجحانات میں ایسا تغیر پیدا ہوجاتا جو ہندستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا۔"

اس تقریب میں راج گوپال آچاری نے' جو عارضی حکومت میں تعلیم کے رکن تھے اپنی تقریر میں جامعہ کی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ دن دور نہیں جب جامعہ ایک بہت بڑی یونی ورسٹی ہوگی جو دوسرے تعلیمی اداروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اس موقع پر انھوں نے حکومت کی جانب سے جامعہ کے لیے سات لاکھ روپوں کا اعلان کیا جس میں ساڑھے چار لاکھ روپے جامعہ کے لیے اور ڈھائی لاکھ روپے استادوں کے مدرسہ کی عمارت کی تکمیل کے لیے مختص تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جامعہ کے قیام کے بعد سے ۱۹۴۶ء تک جامعہ کو ملنے والی یہ پہلی رقم تھی جسے جامعہ نے حکومت کی جانب سے منظور کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ادارہ عدم تعاون کی تحریک کے بطن سے پیدا ہوا ہو وہ حکومت سے کیونکر کوئی عطیہ قبول کرتا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۸ء میں انجمن تعلیم ملی کے مقاصد میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ جامعہ حصول آزادی تک نہ تو حکومت سے کوئی تعلق رکھے گی اور نہ اس سے کسی قسم کی امداد چاہے گی نہ قبول کرے گی لیکن اب چونکہ جواہر لال نہرو کی قیادت میں عارضی حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا اس لیے

العابدین رضی اللہ عنہما، جو عالم اور متقی اور متورع تھے اور مروانیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے اور ان کے بیٹے یحیی بن زید ہیں جو بزعم اثنا عشریہ مرتد ہیں اور ایسے ہی ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور جعفر بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں اور بایزید بسطامی ان ہی کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں ان کا لقب بھی کذاب ہے اور حسن بن حسن مثنی اور ان کے فرزند عبداللہ محض اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بہ نفس زکیہ ہیں، کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور ابراہیم بن عبداللہ کو اور زکریا محمد باقر کو اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن اور محمد بن القاسم بن الحسن اور یحیی بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور جماعت کی جماعت سادات حسنیہ اور حسینیہ جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں، گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں.... (چند سطروں کے بعد) اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، کیونکہ ان کے نزدیک دوازدہ امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر ایسا ہی کافر ہے جیسا کسی نبی کی نبوت کا منکر، اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے" (۷)

مختصر یہ کہ حضرت الامام النانوتویؒ کی "ہدیۃ الشیعہ" نامی اسی تصنیف کو آج کل کی مروج اصطلاح میں "انسائیکلوپیڈیا آف شیعہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں مذہب شیعہ کے عقائد مثلاً بداء، امامت، تحریف قرآن، قدح اصحاب کرام وغیرہ، پھر ان کی مذہبی عبادات مثلاً تقیہ، متعہ وغیرہ کا حال ان ہی کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بیان کرنے کے بعد ان کا ابطال کیا گیا ہے۔ نیز شیعوں کے معروف اعتراضات وشبہات مثلاً قصہ قرطاس اور قصہ فدک وغیرہ کا ذکر بالتفصیل کرنے کے بعد ان کے مدلل اور مسکت جوابات فراہم کر کے اہل سنت و جماعت کی حقانیت ثابت کی ہے اور اس مدلل و ضخیم کتاب کا اختتام کرتے ہوئے یوں رقم فرمایا ہے:

"اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے، کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں سے باقی نہیں رہی جس کا جواب شافی بفضلہ تعالیٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا" (۸)

س اہم، مدلل اور شافی کتاب کے علاوہ تقریباً چار سو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم اور ضخیم کتاب "

(۷) ہدیۃ الشیعہ ص: ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶۔ (۸) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۳۶۰

جامعہ والوں کو اس کا ہر عطیہ قابل قبول تھا۔

عارضی حکومت میں کانگریس نے ذاکر صاحب کا نام بھی وزارت میں شمولیت کے لیے پیش کیا تھا لیکن مسٹر جناح نے اس پر اعتراض کیا۔ خود ذاکر صاحب نے بھی یہ شرط رکھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی متفقہ رائے سے ہی وہ عارضی حکومت میں شامل ہوں گے جو ایک ناممکن امر تھا۔ وہ ہمیشہ اتحاد و یگانگت کے علم بردار رہے تھے' اسی لیے انھوں نے جوبلی کے جلسے میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان سے فسادات کو روکنے کی اپیل کی تھی۔

جوبلی کے جلسے سے فارغ ہو کر ذاکر صاحب کو اپنی شدید تکان کا احساس ہوا۔ ان کی صحت یوں بھی گرتی جا رہی تھی اس لیے انھوں نے کچھ روز کشمیر میں آرام کرنے کا قصد کیا اور طلوع آزادی کے بعد ایک ملازم کو ساتھ لے کر کشمیر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جالندھر اسٹیشن پر انھیں فرقہ پرستوں نے گھیر لیا اور چاہتے تھے کہ ان پر حملہ آور ہوں لیکن ایک ہندو اور سکھ افسر نے انھیں پہچان لیا اور اس طرح بمشکل ان کی جان بچ سکی اور وہ کشمیر کا سفر ادھورا چھوڑ کر واپس دہلی آ پہنچے۔ انھوں نے وزیر اعظم کو پنجاب کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے باخبر کیا اور پھر جامعہ کے لوگوں کو اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتے تھے وہ انھوں نے کیا۔ دہلی اور ہمایوں کے مقبرے میں قائم شدہ کیمپوں میں مظلومین کی دیکھ بھال کی اور پناہ گزینوں کی دلجوئی کرتے رہے۔ حکومت نے بھی جامعہ کی نگرانی کے لیے خصوصی انتظامات کیے۔

قیام امن و اتحاد کے سلسلے میں ذاکر صاجب نے ایک ریڈیائی تقریر میں کہا:۔

"۔۔۔ دوستو، دوستی کی رسمیں نباہو، دوستوں کو دشمن نہ بناؤ' کسی عارضی جنون میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو۔ مجنونوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے' دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو۔ دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہے اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ محبت' بھروسے اور یقین سے کام لو اور دیکھو کہ اس میں یہ پودا کیسا لہلہاتا ہے اور اس پر وفا کے پھول کھل کر کس طرح اپنی خوشبو سے کینہ اور کپٹ کی گندی فضا کو مہکا دیتے ہیں اور اپنی شفاف خوش رنگی سے شک و شبہ کے گدلے پن کو کیسے کاٹ دیتے ہیں۔ بھائیو! دوست بنو، دوستی کا حق ادا کرو' دوستی کے تقاضے

اجوبۂ اربعین'' کے نام سے بھی حضرت الامامؒ کی تصانیف میں شامل ہے، یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ شیعوں کی طرف سے اٹھائے گئے چالیس سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

یہ جوابات حضرت نانوتویؒ نے اپنے شاگرد رشید اور استاد زادہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی فرمائش اور اصرار پر رقم فرمائے ہیں، چنانچہ کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''بعد حمد وصلوٰۃ کے یہ خادم خاص محمد قاسم اپنے مخدوم ومکرم مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں سلام ونیاز کے بعد عرض پرداز ہے کہ آج بروز چارشنبہ معلوم نہیں تاریخ ۱۶ ہے یا ۱۷ آپ کا والا نامہ راوڑ سے میرے پاس آیا، دیکھا تو ایک طومار تھا شیطان کے وسوسوں کو بھی مات کیا، دیکھ کر دل بہت گھبرایا، جی میں کہتا کہ یہ ناگہانی بلا اوقات کھونے کے لئے کہاں سے سر پر آپڑی، پھر تسیر حاصل نہ وصول، شیعوں کے راہ پر آنے کی امید نہیں، ادھر دل کاہل کا یہ خیال تھا کہ مولوی محمد یعقوب صاحب ہی نے ان سوالوں کی اپنی لاحول سے کیوں نہ خبر لی، میں کجا اور دیوبند کجا، مگر کچھ آپ کا خوف کچھ حاجی صاحب کا لحاظ، چارو ناچار قہر درویش بر جان درویش''(۹)

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اول میں اٹھائیس سوالات اور ان کے دو جوابات ہیں۔ پہلے جوابات تو حضرت الامامؒ النانوتوی کے ہیں اور دوسرے حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبہٹویؒ کے ہیں اور حصہ دوم میں بقیہ بارہ سوالات کے جوابات ہیں، جو صرف حضرت نانوتویؒ ہی کے قلم سے ہیں۔

حصہ اول میں جوابات کا آغاز کرتے ہوئے حضرت والا نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''مولانا! ہر چند کہ سوالات مرسلہ دیکھنے میں اٹھائیس ہیں، پر اہل فہم جانتے ہیں کہ در حقیقت وہ ایک سوال ہے، مطلب سب کا فقط اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑائی ہے.............اہل عقل کے نزدیک شیعوں کی یہ دھوکہ بازی اس قابل نہیں ہے کہ فریب کھائے، پر کیا کیجئے عقل بہت دن ہوئے اٹھ گئی، کوئی کوئی صاحب عقل نظر آتا ہے ناچار بپاس خاطر ابناء روزگار، اول ایک جواب اجمالی معروض ہے، بعد ازاں تفصیل وار ہر ہر سوال کا جواب عرض کروں گا..........سوالات مذکورہ کا مطلب ہم سے پوچھیے سائل کو نہ حکم پیغمبر خدا صلی

(۹) اجوبۂ اربعین۔ ص: ۴۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء

پورے کرو"

ذاکر صاحب نے اسی قسم کی تقریروں سے امن کی فضا کو سازگار بنانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ جامعہ میں پناہ گزیں بچوں کے لیے انتظامات کیے۔ باڑہ ہندوراؤ میں ان کے رفیق کار شفیق الرحمٰن قدوائی نے کیمونٹی سینٹر قائم کر کے اخوت کے جذبات کو فروغ دیا۔ ۳۰ر جنوری کو مہاتما گاندھی شہید کر دیے گئے۔ اس کا اثر ذاکر صاحب پر شدت سے غالب رہا۔

حصول آزادی کے بعد یہ خیال عام تھا کہ وزارت تعلیم جامعہ ملیہ کا بطور خاص خیال رکھے گی اور اسے وقت پر مالی گرانٹ وغیرہ مل جایا کرے گی لیکن جوبلی کے موقعہ پر راجگوپال آچاری نے جس رقم کا اعلان کیا تھا اس رقم کے علاوہ ۱۹۴۸ء تک جامعہ کو کچھ نہیں ملا۔ ذاکر صاحب کو حکومت کے اس رویے سے شدید صدمہ پہنچا لیکن انھوں نے مالی امداد کے سلسلے میں نہ تو وزیر اعظم اور نہ ہی وزیر تعلیم مولانا آزاد سے ملاقاتیں کیں۔ لہٰذا افسر شاہی اور وزارت کی عدم توجہی نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ جامعہ سے علاحدگی اختیار کر لیں۔ اس لیے انھوں نے ۲۸ر اکتوبر ۴۸ء کو جامعہ کی انجمن کے جلسے میں اراکین سے یہ درخواست کی کہ وہ اب شیخ الجامعہ کے منصب پر دوبارہ منتخب نہ کیے جائیں لیکن انجمن نے ان کی درخواست نامنظور کر دی اور انھیں مزید پانچ سال کے لیے شیخ الجامعہ کے عہدہ پر منتخب کر دیا۔ ذاکر صاحب نے انجمن کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا لیکن مجیب صاحب کو نائب شیخ الجامعہ مقرر کر دیا۔ ذاکر صاحب نے جب جامعہ میں قدم رکھا تھا تو انھوں نے حصول آزادی تک اپنی زندگی کے کسی لمحہ کو ضائع نہیں کیا بلکہ اسے عملی کاموں میں صرف کیا تھا انھوں نے سیاسی ہنگاموں سے جامعہ کو دور رکھا۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں تعلیم کے موضوع پر لکچر دیئے۔ "بچوں کا گھر" کو نئی شکل عطا کی' بعد ازاں وہ انجمن ترقی اردو کے صدر بنے' بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں' افلاطون کی "ری پبلک" کو اردو کا قالب بخشا' معاشیات کے ماہرین کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور جامعہ کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کیا۔

اسی اثنا میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ذاکر صاحب سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی، جو تقسیم کے بعد تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی وائس چانسلری قبول کر لیں۔ دراصل یہ ایک چیلنج تھا جسے انھوں نے اس شرط پر قبول کر لیا کہ یونی ورسٹی کورٹ متفقہ طور پر ان کا انتخاب کرے۔ انجام کار ۲۸ر نومبر ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل مستعفی ہو گئے اور کورٹ نے ذاکر صاحب کو اپنا وائس چانسلر منتخب کر لیا اور اس طرح ۳۰ر نومبر کو ذاکر صاحب نے اپنی مادر علمی یعنی علی گڑھ یونی ورسٹی کی سربراہی کی ذمہ داری

اللہ علیہ وسلم سے مطلب ہے نہ کسی اجماع سے غرض، اس کو اپنے مطلب سے مطلب ہے، غرض اصلی اس کی فقط یہ ہے کہ مستحق خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور لوگ زبردستی بن بیٹھے، ان پر ظلم کیا اور ظلم کا بار اپنی گردن پر لیا، بایں ہمہ وہ لوگ خطاوار، گنہگار، منافق، بے دین، بدآئین، بے وفا، سراپا دغا، دل کے نامرد، نیتوں کے خراب تھے۔ (معاذ اللہ)

اگر بالفرض والتقدیر حضرت علیؓ کے ہوتے اور کسی کا خلیفہ ہونا جائز بھی ہوتا، تو ایسے اوصاف والوں کا خلیفہ ہونا تو پھر بھی جائز نہ ہوتا"۔(۱۰)

پھر ان سوالون کا اجمالی جواب دیتے ہوئے حضرت الامامؒ نے صحابہ کرامؓ کی منقبت میں درج ذیل چار آیات قرآنیہ:

(۱) والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان الخ۔ (پ ۱۱ ع ۲)

(۲) الذين امنوا وهاجروا وجاهدوا باموالهم وانفسهم اعظم درجة عند الله الخ (پ ۱۰ التوبہ ع ۳)

(۳) اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا الخ (پ ۱۷ الحج ع ۵)

(٤) محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم الخ. (پ ۲۶ الفتح آخری آیت)

پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جن لوگوں کی تعریف خود خدائے ذوالجلال نے اس طرح کی ہو ان کے بارہ میں ایمان والوں کی کوئی دوسری رائے کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور پھر کیا ایمان باقی بھی رہ سکتا ہے؟ چنانچہ رقم طراز ہیں:

"ان آیتوں کے بعد یہ عرض ہے کہ صحابہؓ نے جو کچھ کیا بجا کیا یا بے جا؟ ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنایا پھر حضرت عمرؓ کو، پھر حضرت عثمانؓ کو، پھر حضرت علیؓ کو۔ اگر یہ ترتیب حسب مرضی شیعہ ہے تو فبہا، ورنہ یہ معنی ہوئے کہ صحابہؓ نے ظلم کیا، دین محمدی میں رخنہ ڈالا، جن سے ہدایت مقصود تھی ان کو دم مارنے نہ دیا، جنھوں نے نیا دین نیا آئین کر دیا وہ مسند خلافت دبا بیٹھے، باقی ان کے معین اور

(۱۰) حوالہ مذکورہ ص: ۴۹-۵۰

بھی اپنے سر لے لی۔

جامعہ والوں کو ذاکر صاحب کے اس نئے منصب سے خوشی تو ہوئی مگر ساتھ ہی افسوس بھی ہوا۔ خوشی یوں ہوئی کہ جامعہ میں ان کی خدمات کو تسلیم کیا جا رہا تھا اور کام کرنے کے وسیع مواقع میسر ہو رہے تھے' البتہ افسوس یہ تھا کہ اب ذاکر صاحب ان سے بچھڑ رہے تھے۔ ان احساسات کا اظہار اس سپاسنامہ میں کیا گیا تھا جسے جامعہ والوں نے ذاکر صاحب کی خدمت میں ۲/ دسمبر ۱۹۴۸ء کو پیش کیا تھا:۔

"جناب شیخ الجامعہ صاحب! آج ہم جامعہ کے لوگ اپنے آپ کو جس جذبہ سے معمور پاتے ہیں وہ بڑی متضاد کیفیات کا حامل ہے۔ کل تک آپ صرف ہمارے وائس چانسلر تھے لیکن اب آپ مسلم یونی ورسٹی کے بھی وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ اب صرف ہم ہی آپ کو اپنا نہیں کہہ سکتے' وہ بھی ہمارے برابر آپ کو اپنا کہہ سکتے ہیں۔ اس نئی صورت حال کا ہم کیا مطلب سمجھیں۔ اس پر ہم خوش ہوں یا افسوس کریں؟ یہ سوال ہے جو ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اٹھتا ہے لیکن اس کا کوئی قطعی جواب ہم نہیں دے پاتے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کو ایک نہایت قریبی رشتے میں منسلک رکھنے میں آپ کی ذاتی کشش کو غیر معمولی دخل رہا ہے۔ جس طرح چراغ کے گرد پروانے' مقناطیس کے گرد لوہے کے ریزے اکٹھے ہو جاتے ہیں اسی طرح آپ کی دلفریب شخصیت نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اب علی گڑھ میں آپ کی مصروفیتیں اتنی زیادہ ہوں گی کہ جامعہ کے لیے آپ بہت کم وقت نکال سکیں گے اور جو لوگ آپ کی وجہ سے کھنچ کر جامعہ آیا کرتے تھے وہ اب علی گڑھ جانے لگیں گے۔۔۔

"اب کہ آپ جامعہ ملیہ اور مسلم یونی ورسٹی دونوں کے وائس چانسلر ہیں ہمیں امید ہے کہ ان دونوں اداروں کی اس طرح تنظیم فرمائیں گے کہ ان میں باہمی انحصار اور باہمی اشتراک کا رشتہ قائم کیا جا سکے تاکہ ان کے مشترک وسائل سے قوم کی تعمیری جدوجہد کے لیے خاطر خواہ کام کیا جا سکے۔۔۔"

یہ رخصتی سپاس نامہ ذاکر صاحب کی خدمت میں جامعہ والوں کا آخری نذرانہ تھا جس میں محبت تھی' خلوص تھا' عقیدت تھی اور والہانہ پن تھا۔ جن ذاکر صاحب کے ساتھ وہ پچھلے

مددگار ہو گئے .... سو در صورتیکہ (بزعم شیعہ) ترتیب معلوم غلط، اور خلفائے ثلثہؓ ظالم اور بے دین، اور باقی صحابہؓ ان کے مددگار، تو یہ معنی ہوں کہ نعوذ باللہ خدا نے اخوان الشیاطین کی اتنی تعریف کی جو اولیاء کو بھی نصیب نہیں۔ اب حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ خدا کے قول وقرار کا اعتبار ہے یا بھول چوک اور تقیہ کا احتمال ہے؟"(۱۱)

اٹھائیس سوالوں کا اجمالی جواب دینے کے بعد پھر حضرت والا نے ہر ہر سوال کا الگ الگ تفصیلی جواب بھی لکھا ہے اور اس کے بعد مذہب شیعہ پر بیالیس سوالات قائم کئے ہیں جس میں پورے مذہب شیعہ کا احاطہ کر لیا ہے اور عقیدۂ امامت کے ثبوت، ولی بمعنی حاکم کا ثبوت، امام غائب کے عدم ظہور کے سبب، تحریف قرآن مجید، صدیق اکبرؓ کی صحابیت سے انکار، تقیہ، متعہ، فدک، عقد حضرت ام کلثومؓ، جواز لواطت، باندیوں کی شرمگاہیں عاریتاً دینے، وغیرہ جیسے اہم عقائد و مسائل شیعہ پر سوالات کر کے ان کے جوابات کا مطالبہ کیا ہے۔

اسی طرح کتاب کے حصہ دوم میں شیعہ کی طرف سے اٹھائے گئے بارہ سوالات کے مدلل جواب دینے کے بعد "فقہ جعفریہ" کے فحش مسائل مثل متعہ، پھر متعہ دوریہ اور وطی فی الدبر (لواطت) وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ ان جوابات اور کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر جہاں ایک طرف حضرت الامام النانوتویؒ کی تبحر علمی، معاملہ فہمی، اور زیرکی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوتا ہے کہ باوجود شیعوں کی جانب سے اپنے مذہب کے اخفاء و کتمان کے حضرت والا کی اس پورے مذہب پر ایسی نگاہ اور گرفت تھی جو ان کے ہم عصر ہی نہیں ماقبل و مابعد کے اہل علم میں سے بھی گنے چنے لوگوں کو ہی حاصل ہوئی۔

اس موضوع پر حضرت الامام النانوتویؒ کے علمی آثار میں درج بالا دو مستقل کتابوں کے علاوہ "فیوض قاسمیہ" نامی مجموعۂ مکاتیب میں شامل وہ چند خطوط بھی ہیں جن میں مختلف استفسارات کے جواب میں حضرت والا نے اہل تشیع کے اعتراضات اور ان کے پیدا کردہ شبہات کے جوابات اپنے اہل تعلق کو مطمئن کرنے کے لئے دیئے ہیں۔ چنانچہ اس مجموعہ کے مکتوب اول میں جو فارسی زبان میں ہے بڑے لطیف انداز میں شیعہ و خوارج کے عقائد و اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ان

(۱۱) اجوبۂ اربعین۔ ص: ۵۳-۵۴

بائیس برس سے کام کر رہے تھے وہ جامعہ سے رخصت ہو کر اپنی مادر علمی کے حسن کو نکھارنے کے لیے علی گڑھ پہنچ چکے تھے۔ اگر چہ ذاکر صاحب جامعہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے رخصت ہو گئے لیکن ذاکر صاحب کی حیثیت سے وہ ہمیشہ جامعہ والوں کے دلوں میں مقیم رہے اور ذاکر صاحب نے بھی جہاں کہیں تقریریں کیں، تحریریں قلم بند کیں ان میں موقع بہ موقع جامعہ کا ذکر ضرور کیا۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی سربراہی کے ساتھ ذاکر صاحب کو بہت سی قومی ذمہ داریوں کو نباہنا پڑا۔ وہ بہت سے تنظیموں اور اداروں سے وابستہ ہوئے۔ جن میں انڈین یونی ورسٹیز کمیشن، پریس کمیشن، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، ورلڈ یونی ورسٹی سروس اور یونسکو وغیرہ اہم تھے۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں انھیں راجیہ سبھا کا رکن بھی نامزد کر دیا گیا۔ اگر چہ ان کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا گیا تاہم ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کی مقامی سیاست اور باہمی رنجشوں کے سبب ۱۹۵۶ء میں وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر جامعہ آ گئے جو ان کے لیے ہمیشہ کی طرح جائے عافیت ثابت ہوئی۔

بعد ازاں ذاکر صاحب آنکھ کے آپریشن کے بعد جرمنی میں آرام فرما تھے کہ حکومت ہند نے انھیں بہار کا گورنر مقرر کر دیا اور وہ جولائی ۱۹۵۷ء میں پٹنہ چلے گئے اور ۱۹۶۲ء تک گورنری کے منصب پر فائز رہے۔ وہاں بھی وہ جامعہ کو نہیں بھولے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے جانشین وزیر تعلیم کالولال شریمالی کو ایک خط میں ۷ر جولائی ۱۹۶۰ء کو لکھا:

> "۔۔۔ جامعہ میں جو کمیاں ہیں ان سے میں خوب واقف ہوں۔ اس لیے سب سے پہلے اور خاص طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جامعہ کو اس کے صرف اب تک کے کام اور تحصیلات کے پیمانے سے نہیں جانچنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ اس سہارے اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے جس سے اسے اپنے حوصلوں کو عمل میں لانے کا موقع مل سکے گا۔ جامعہ کی تمنا یہ ہے کہ وہ ایک ہم آہنگ مشترک قومی زندگی کی تعمیر کے لیے مسلسل کوشش کرتی رہے۔ جامعہ ایک ایسی درس گاہ ہے جو ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کے اس عزم کی یاد دلاتی ہے جب انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے کاندھے سے کاندھا ملا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑتے رہیں گے۔ ہندوستان میں سیاسی تدبیر کا ایک اہم کام یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک مربوط قومی وحدت کے احساس وجذبات کی

لوگوں کی حیثیت مخنث جیسی ہے جو نہ مرد ہوتے ہیں نہ عورت، بلکہ درمیانی مخلوق ہوتے ہیں، یا ان کی مثال مشکوک پانی جیسی ہے جسے نہ مطلق پاک کہا جا سکتا ہے نہ مطلق نجس۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ بعض عقائد و اعمال کے لحاظ سے انہیں مؤمن سمجھا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے عقائد و اعمال کی وجہ سے ان کا شمار کافروں میں ہونا چاہئے۔ پس یہ دونوں کے درمیان ''برزخی'' لوگ ہیں۔

مکتوب دوم میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کے نام ہے، لکھنؤ کے ایک شیعہ عالم و مجتہد مولوی حامد حسین سے ملاقات اور پھر مختصر مباحثہ کی روداد بیان کرتے ہوئے یہ دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے کہ مولوی صاحب موصوف سے ملاقات کرتے ہوئے حضرت والا نے اپنے کو بھی شیعہ ہی ظاہر کیا تھا اور بوقت حاضری ''السلام علیکم'' کے بجائے شیعوں کے طرز پر ''سلام علیکم'' کہا تھا اور اپنا معروف نام محمد قاسم کے بجائے تاریخی نام خورشید حسین بتایا تھا۔ اس کے بعد حضرت والا نے اپنے سوالات پیش کرتے ہوئے مولوی صاحب موصوف سے کہا کہ ہمارے اس علاقہ میں سنی اہل علم کافی تعداد میں ہیں جبکہ شیعہ میں اہل علم نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے شیعہ حضرات سنیوں کے اعتراضات کے جوابات دینے سے عاجز رہتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ یہ فدک کیا ہے؟ جواب میں مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا، ایک زمین کا نام ہے۔ پھر سوال کیا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے متعلقین نے یہ زمین خریدی تھی؟ جواب دیا، نہیں غنیمت میں ملی تھی حضرت والا نے تحریر فرمایا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ جواب غلط ہے، کیونکہ فدک کی زمین کا تعلق مال غنیمت سے نہیں، مال فئی سے تھا اور دونوں کے احکام جدا جدا ہیں مگر چونکہ بحث کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ مجھے پہچان کر بھڑک جائیں گے، اس لئے گھما پھرا کر سوال اس طرح کیا کہ فدک نام کا کوئی غزوہ سننے میں تو نہیں آیا اور اس نام کی زمین ہے کہاں۔ جواب دیا کہ خیبر کے نواح میں ہے۔ پھر سوال کیا کہ فئی کیا ہے؟ جواب میں کہا کہ غنیمت کو کہتے ہیں۔ پھر سوال کیا کہ حضرت! ایک لاتعلق شخص نے جو نہ سنی ہے نہ شیعہ، کہا کہ فدک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مملوکہ نہ تھی کہ اس میں میراث جاری ہو سکے اور حوالہ میں ما افاء اللہ علی رسولہ الخ پڑھا۔ جواب میں کچھ ادھر ادھر کی باتیں کہیں اور اٹھ کر چل دیئے، کوئی جواب صحیح بن نہیں پڑا مکتوب چہارم تفصیلی ہے جو مرزا قاسم علی بیگ کے نام ہے اور اس میں کئی سوالوں کے جوابات ہیں۔

پہلا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذوالفقار نامی تلوار کے سلسلہ میں ہے کہ حضرت صدیق

نشوونما ہو اور ان کی نتیجہ خیز تاثیر بڑھتی رہے۔ اس قومی وحدت میں جہاں تک مسلم عنصر کا تعلق ہے علی گڑھ اور جامعہ صرف دو جگہیں ایسی ہیں جن سے اس مقصد کے حصول کی کوشش میں کام لیا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ قومیت کی روایت سے 'جو جامعہ کا خاص امتیاز رہا ہے' محروم رہا ہے۔ یہ روایت رفتہ رفتہ علی گڑھ میں بھی پروان چڑھے گی۔ مگر جامعہ میں تو یہ روایت زندہ ہے۔ ضرورت ہے کہ وہاں اس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں جامعہ کی مدد کی جائے۔"

اسی خط میں ذاکر صاحب نے مزید لکھا:۔

"دوسری بات جو ملحوظ خاطر رہنی چاہئے یہ ہے کہ اس دن جب خدمت اور ایثار کے دوسرے نمایاں گوشے مثلاً سیاست، نوجوانوں کی بڑی تعداد کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے گاندھی جی کے مشورے اور فیضان اور حکیم اجمل خاں' مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی حوصلہ افزائی سے مسلم نوجوانوں کی ایک ممتاز و منتخب جماعت نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تعلیم کے آہستہ رو اور صبر آزما کام میں کھپادیں گے کہ تعلیم قوم کی تعمیر میں ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضرورت ہے کہ آج آزاد ہندوستان میں اس خیال ورجحان کو تقویت دی جائے۔ جامعہ جسے آزادی کی جنگ کے دنوں میں سخت آلام و مصائب کا سامنا رہا اور جو سنگین نشیب و فراز سے گزر چکی ہے ایسا نہ ہو کہ آزاد ہندوستان میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے"

خط کے آخیر میں ذاکر صاحب نے وزیر تعلیم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "میری دلی خواہش ہے کہ آپ کو ہندستان میں تعلیم کی تاریخ میں ایسے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جگہ ملے جس نے جامعہ کو اس کے مقاصد کی تکمیل کی راہ پر گامزن کر دیا"۔

ذاکر صاحب کا یہ خط وزیر تعلیم کی عدالت میں جامعہ کے مقدمہ کے سلسلے میں وکیل کا درجہ رکھتا ہے جس میں انھوں نے جامعہ کو اس کے حسن کارکردگی' معیار کار اور اعلا مقاصد کی اقدار میں تولا تھا۔ غرضیکہ دہلی سے باہر رہ کر بھی وہ جامعہ کے خیال سے غافل نہیں رہے۔

مئی ۱۹۶۲ء میں بہار کی گورنری کے ٹھیک پانچ سال بعد ذاکر صاحب کو نائب صدر جمہوریہ منتخب کر لیا گیا۔ انھوں نے ۱۳ر مئی کو اپنے اس منصب کا حلف لیا اور نائب صدارت کے ساتھ ہی راجیہ سبھا کی چیئرمینی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ذاکر صاحب نے اس اعزاز کو

اکبرؓ نے بعد وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے منقولہ اثاثہ کو بطور تبرک تقسیم کر دیا تھا اور یہ تلوار حضرت علیؓ کو دی تھی جس کا بطور وراثت ظن غالب کے مطابق حضرت زین العابدین تک پہنچنا معلوم ہے اس کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ دوسرا جواب شیعہ کے اس عقیدہ و بیان کے سلسلہ میں ہے کہ خلفائے ثلثہؓ حضرات اہل بیتؓ کی شفاعت کے محتاج ہوں گے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے، کیونکہ خلفائے ثلثہؓ کا مقام و مرتبہ اور ان کے فضائل قرآن مجید کی آیات میں بیان کر دئے گئے ہیں اور ان کو اجر عظیم کی بشارت دے دی گئی ہے اس کے بعد ان کو اہل بیتؓ کی شفاعت کی کیا حاجت؟ کیا خدا کے وعدہ پر بھی اعتبار نہیں؟ تیسرا مسئلہ فدک اور میراث نبی کا ہے جس کے جواب میں دیگر باتوں کے علاوہ بنیادی بات ''عقیدۂ حیات النبی'' کی کہی گئی ہے کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو ان کی وراثت کا سوال ہی کیا؟ چوتھا مسئلہ حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہونے اور پھر **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** فرما دینے کی وجہ سے خلیفہ اول حضرت علیؓ کو ہونا چاہئے تھا؟ اس کے جواب میں لفظ مولی کے معنی حقیقی اور اس ارشاد کے آخری ٹکڑے سے استدلال وغیرہ کے علاوہ ایک اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ اگر قرابت رسول ہی کو معیار خلافت قرار دے دیا جائے، تو بھی حضرت علیؓ کا نمبر چوتھا ہی رہے گا، کیونکہ قرابت کے لحاظ سے پہلا نمبر حضرت فاطمہؓ کا، دوسرا حضرت حسنؓ، کا تیسرا حضرت حسینؓ کا اور پھر چوتھا حضرت علیؓ کا ہوگا۔ اب یہ اہل تشیع سے پوچھا جائے کہ حضرت علیؓ کا پہلا نمبر کیوں کر ہوگا؟

اسی مکتوب کے آخر میں ایک جواب فارسی کے بجائے اردو زبان میں ہے جو حضرت عمرؓ پر شیعہ کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو سورۃ البقرۃ یاد نہ تھی۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ جس واقعہ کا حوالہ دیکر یہ بات کہی گئی ہے وہ مکی ہے اور سورۃ البقرۃ کا نزول مدینہ میں ہوا، تو جب یہ سورۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی تو کسی کے یاد ہونے، نہ ہونے کا کیا سوال؟ اور یہ کہ اگر قرآن مجید کا یاد نہ ہونا، باعث عار ہے تو شیعوں کو ڈوب مرنا چاہئے کہ یہ عیب انہی کے یہاں ہے، سنیوں میں تو بکثرت قرآن مجید کے حافظ ہیں۔

پھر اسی مکتوب کے آخر میں حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کی صحت اور ان کے ایمان پر اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ ان ہی کے دور خلافت میں ہونے والے غزوۂ فارس سے شاہ فارس یزدگرد کی تین

تعلیم کے ساتھ ان کے تعلق سے منسوب کیا۔

مئی ۱۹۶۷ء میں ذاکر صاحب کو کانگریس نے صدر جمہوریہ ہند کے عہدے کے لیے امیدوار نامزد کیا۔ حزبِ اختلاف نے جسٹس کے۔ سبا راؤ کو اپنا امیدوار نامزد کیا تھا جنھوں نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کی غرض سے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ۹؍ مئی ۶۷ء کو صدارت کے انتخاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک لاکھ سے بھی زائد ووٹوں سے کامیابی حاصل کی جسے سیکولرازم کی کامیابی سے موسوم کیا گیا۔ ۱۳؍ مئی کو صدر جمہوریہ ہند کا حلف لینے کے بعد ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے نواسی میرا خاندان"۔

وہ تقریباً دو برس اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔

اور ایک دن یعنی ۳؍ مئی ۱۹۶۹ء کو اپنے گھر اور خاندان کے افراد کو روتا چھوڑ کر صبح گیارہ بجکر بیس منٹ پر راشٹرپتی بھون میں جب ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ان کا طبی معائنہ کر رہی تھی ذاکر صاحب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ۵؍ مئی کو ان کے جسد خاکی کو ان کی آخری آرام گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ لایا گیا اور اس جگہ دفن کر دیا گیا جہاں مشرق میں جامعہ کا مدرسہ تھا، مغرب میں جامعہ کا مرکزی کتب خانہ اور شمال میں مسجد واقع ہے۔

جامعہ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی کیونکہ جامعہ والوں کے وہ سابق شیخ الجامعہ اور حالیہ امیر جامعہ ان سے قریب تر ہو کر بھی ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے تھے جنھیں بچوں سے پیار تھا، جو طلبہ کے شفیق تھے، کتابیں جن کی رفیق تھیں، جنھیں پھولوں سے عشق تھا جو فن اور فن کار کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، خود ادیب تھے اور ادیبوں کی قدر افزائی کرتے تھے۔ جامعہ میں ان کی وفات پر جو تعزیتی جلسہ ہوا اس میں ان کے جانشین پروفیسر محمد مجیب نے ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

> "میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کی ہر حالت، ہر رنگ، ہر مقام پر سونا ہی پایا ہو اور کہیں کھوٹ کا میل نظر نہ آیا ہو۔ لیکن جب قدرت کسی کو اپنی فیاضی سے مالا مال کرتی ہے تو پھر اس کے تجسس کی انتہا نہیں رہتی۔ کیا کیا نہیں دیا اس نے ذاکر صاحب کو؟ ایسا جمال صورت جو لاکھوں میں ایک آدھ کو نصیب ہوتا ہے، ایسا جمال سیرت جو کروڑوں میں ایک آدھ کے حصے میں آتا ہے، ایسا روشن دماغ جو ہر مسئلے کی تہہ کو پہنچ جاتا ہو، ایسا قلبِ گداز جس میں سارے عالم انسانیت کے لیے سمائی تھی، جو ہر کسی

بیٹیاں شہر بانو، ماہ بانو، اور مہر بانو غنیمت میں آئی تھیں اور ان میں سے پہلی حضرت حسینؓ کو، دوسری حضرت محمد بن ابی بکرؓ کو، اور تیسری حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دی گئی تھیں اور ان ہی شہر بانو کے بطن سے حضرت حسینؓ کے بیٹے حضرت علی زین العابدینؒ کی ولادت ہوئی تھی، اب اگر حضرت عمرؓ کی خلافت غلط، تو ان کے ذریعہ کیا گیا جہاد اور پھر اس میں ملا ہوا مال غنیمت کیوں کر صحیح ہو سکے گا اور ایسی صورت میں حضرت حسینؓ کے شہر بانو کو قبول کرنے اور پھر حضرت زین العابدین کے ثبوت نسب کا کیا حکم ہوگا؟

مکتوب پنجم میں جو مولوی عبدالحق صاحب کے نام ہے، مسئلہ فدک اور پھر اس ذیل میں مسئلہ وراثت کی مکمل وضاحت کرتے ہوئے تمام شیعی شبہات واحتمالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس مختصر تحریر میں حضرت الامام النانوتویؒ کی تشیع اور اہل تشیع کے سلسلہ میں علمی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن درج بالا سطور میں جو کچھ پیش کیا جا سکا ہے اس سے دو باتیں بوضاحت سمجھ میں آتی ہیں:

اول: یہ کہ حضرت والا کی مذہب شیعہ پر بہت گہری نظر تھی اور وہ اس مذہب کے عقائد، عبادات، اور رسوم، سب سے گھر کے بھیدی کی طرح باخبر تھے اور ان کی تحریروں سے یہ بات آشکار ہے کہ انہوں نے اس مذہب کا ''تقابلی مطالعہ'' مطالعہ کیا تھا۔

دوم: یہ کہ مذہب شیعہ سے اسی ''باخبری'' کی وجہ سے وہ اس مذہب سے اہل اسلام یا اہل سنت کا فاصلہ بنائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اہل تشیع کے مکائد ومزخرفات کو پوری تفصیل کے ساتھ مدلل طور پر انہوں نے اسی لئے بیان کیا کہ اہل تشیع کو ہدایت ہو نہ ہو، لیکن اہل سنت اس ''معصوم زہر'' سے واقف ہو کر اس سے حفاظت کا انتظام ضرور کر لیں۔

اب رہیں تشیع یا اہل تشیع کے سلسلہ میں حضرت الامام کی وہ خدمات جن کو راقم الحروف نے ''عملی'' سے تعبیر کیا ہے، ان کے سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ حضرت الامام کا دور وہ دور تھا جب ''فکری وتہذیبی'' طور پر اہل تشیع غالب گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ارباب جاہ واقتدار کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل تھی، اصلاح احوال کے سلسلہ میں حضرت الامامؒ کے مواعظ، مباحثوں اور اسفار و دیگر خدمات جلیلہ پر غور کیا جائے تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ''اعلاء کلمۃ الحق'' کے لئے حق تعالیٰ نے ان کا اس طرح انتخاب فرمایا تھا کہ وہ حق پرستوں کے لئے ''سرچشمۂ قوت'' اور باطل پر

کی بھلائی چاہتا تھا کسی کی برائی نہ صرف چاہتا نہ تھا بلکہ ایسا سوچ بھی نہ سکتا تھا، جو ان لوگوں کے ساتھ بھی شفقت اور پردہ پوشی کا سلوک کرتا تھا جنھوں نے اس کے ساتھ برائی کی ہو۔ گفتگو میں وہ کشش کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ تقریر میں وہ روانی اور برجستگی، وہ سوز و ساز کہ لفظ دل سے نکلتا تھا اور بجلی کی طرح دل پر گرتا تھا۔ تحریر میں وہ سادگی اور پُرکاری اور خلوص کا وہ بے پناہ جوش جو ہر پڑھنے والے کو اپیل کرتا تھا اور ان سب پر مستزاد وہ لطیف لیکن موثر ذوقِ ظرافت جو ہر قسم کے عناد اور دل آزاری سے پاک تھا اور جس کا شکار بڑی خوب صورتی کے ساتھ کبھی دوسرے لوگ اور اکثر خود ان کی ذات ہوتی تھی۔ وہ یا تو ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کرتے اور اپنی طباعی کا ثبوت دیتے یا اگر پرانی بات بھی ہوتی تو اس کو ایک نئے انداز میں بیان کرتے کہ اس میں نئی جان پڑ جاتی۔ ان کے دماغ میں ماضی، حال اور مستقبل، مذہب اور سائنس، فلسفہ اور معاشیات، قوم کی فکر اور انسانیت کا غم، جمالی دلچسپیاں اور حسنِ عمل کا شیوہ، سب اچھے پڑوسیوں کی طرح پہلو بہ پہلو رہتے تھے۔ انھوں نے نہ فکرِ حاضر سے مرعوب ہو کر کبھی مذہب کو بھلایا۔۔۔ نہ مذہب کی تنگ نظر تعبیر کر کے اس کو حالاتِ حاضرہ سے بے تعلق سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک وحدت ہے اور اس کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔"

سنتوں کے لئے ''دردسر'' بن گئے تھے۔

اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان حالات اور اس ماحول پر ایک نگاہ ڈال لینا مناسب ہوگا جن میں حضرت والا کو خدمت کرنے کا موقع ملا اور جس کا بیان ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف نے اس طرح کیا ہے:

''مغل حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اثر و اقتدار مختلف وجوہ سے قائم ہوگیا تھا۔ اکثر صوبوں کے بھی وہی مطلق العنان حکمراں بن گئے تھے اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برھانہ کے بعد تخت پر جن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے۔ براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلا کر خود مناظرہ کر کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے خلفائے ثلثہؓ کے اسمائے گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا اور مغل حکومت کے ان شاہان شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے، لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر و اجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اور شیعوں میں بہت کم فرق باقی رہا تھا۔ حکومت کے اسی رنگ میں، بتا چکا ہوں، کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی۔ خصوصاً سیدنا الامام الکبیرؒ نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہادتیں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں بھی تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی۔ سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار باہر سے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ (۱۲)

اسی رنگ کو چھڑا کر ''حقیقی اسلامی رنگ'' چڑھانے کے لئے سب سے پہلے تو حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے مبارک خانوادہ کی طرف سے ''اصلاحی مہم'' چھیڑی گئی خصوصاً حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادۂ گرامی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمات جلیلہ اور اس راہ میں پیش آنے والے شدائد و مصائب کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ پھر اس ولی اللہی مشن کی تکمیل کے لئے حضرت حق جل

(۱۲) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۶۱-۶۲۔

شفیق الرحمٰن قدوائی

۱۹۰۱ تا ۱۹۵۳ء

شفیق الرحمٰن ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد حسن الرحمٰن قدوائی صاحب ثروت عالم تھے اور اپنی وضعداری کے لیے مشہور تھے۔ شفیق صاحب نے ابتدائی تعلیم کے مراحل بارہ بنکی میں طے کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے پاس کیا اور بی۔ اے کے تکمیل کے لیے بھی اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ بی۔ اے میں ان کا مضمون معاشیات تھا لیکن جب گاندھی جی نے طلبہ سے سرکاری تعلیمی اداروں کو خیر باد کہہ کر قومی اداروں کی تشکیل و تعمیر کی اپیل کی تو شفیق صاحب نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہا اور اپنی مادر علمی کو خیر باد کہہ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معماروں میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انجمن اتحاد کے اپنے خطبۂ صدارت میں جو انھوں نے ۱۹۲۵ء میں دیا تھا اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

> ''۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۰ کو جب ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی عمارتیں مسلح پولیس کے ذریعہ ہم سے خالی کرائی گئیں اور ہمیں مجبور کیا گیا کہ بورے اور بستر سمیت اپنے گھروں کو چھوڑ کر حدود کالج کے باہر اور ایک میدان میں کرایے کی دو کوٹھیوں اور چند خیموں میں رہنے کا سامان کریں، اس وقت جو کیفیت ہمارے دل اور دماغ کی پریشان خیالی کی تھی اس کا اندازہ اس وقت بھی شاید کیا جا سکتا ہے۔ تحفظِ خلافت کے لیے جاں نثاری کا شوق ہمارے دلوں میں تھا، ناموس اسلام کی حفاظت کا خیال تھا۔ مظالم پنجاب کی یاد ابھی تازہ تھی اور حصولِ سوراج کا سودا ہمارے دماغوں میں چکر لگا رہا تھا۔ غرض ''سارے جہاں کا درد ہمارے

مجدہ نے حضرت الامام النانوتویؒ کا اس طرح انتخاب کیا کہ بقول حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مؤلف سوانح قاسمی:

''جتنا زیادہ حسن قبول ولی الہی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر کے ذریعہ حاصل ہوا، شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی، بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو یا سنت و بدعت، مقلدیت و غیر مقلدیت، تصوف و توہب، تشیع و تسنن وغیرہ کے قصے ہوں، اس سارے مسائل میں ولی اللٰہی مسلک اور نقطہ نظر کو ہندگیر عمومیت جیسی آپ کی بدولت میسر آئی بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے ولی اللٰہی رنگ کا نام ہی اب ''دیوبندیت'' ہوگیا ہے، جو سچ پوچھئے تو ''قاسمیت'' ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے''۔ (۱۳)

حضرت الامام النانوتویؒ کی پر سوز اور مخلصانہ اصلاحی کوششوں کے نتیجوں میں بہت سے شیعہ خاندانوں کو توبہ کی توفیق ملی، مثلاً حضرت مولانا قاری طیب صاحب کے بیان کے مطابق:

''ان سادات بارہہ میں سے خانجہاپور، رتھیڑی اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے اور سنی بنے اور اس قدر گرویدہ اور محبّ بن گئے کہ ان کی دیوبند آمد و رفت مثل اہل بیت کی آمد و رفت کے ہوگئی''(۱۴)

اسی طرح پور قاضی نامی قصبہ میں حضرت نانوتویؒ کی تشریف آوری اور پھر وہاں اہل تشیع کی ''مجلس ماتم'' میں پہنچ کر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت: ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی کو عنوان کلام بنا کر تقریر فرمانے اور اس تقریر سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں کے شیعہ عقائد سے تائب ہو کر سنی بن جانے کی جو تفصیل ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف نے حضرت مولانا محمد طاہر صاحبؒ بروایت حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے حوالہ سے بیان فرمائی ہے اس سے بھی پور قاضی کے شیعوں کی معتد بہ تعداد کے توبہ کر کے ''حقیقی اسلام'' میں داخل ہونے کا علم ہوتا ہے۔ (۱۵)

اسی طرح ایک بہت ہی عبرت ناک واقعہ اور اس کے نتیجہ میں شیعوں کے توبہ کر کے سنی ہو جانے کا حال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاوڑ ضلع میرٹھ سے سن کر ''سوانح قاسمی'' میں رقم فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

---

(۱۳) حوالہ مذکورہ۔ ص:۷۸ (۱۴) حاشیہ سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص:۷۲ (۱۵) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص:۶۶، ۶۷

جگر میں تھا۔" کالج کے چھٹ جانے پر غم و غصہ تھا اس لیے کہ
وہ قوم کے گاڑھے پسینہ کی کمائی تھی اور ہم اپنے کو اس کا وارث
اور جائز حقدار سمجھتے تھے۔"

اس زمانے میں شفیق صاحب کے ساتھ ایک ملازم رہا کرتا تھا جو ہوسٹل میں ان کے لیے کھانا بناتا تھا، ان کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور ان کے آرام کا خیال رکھتا تھا۔ نئے حالات میں شفیق صاحب نے اسے رخصت کر دیا اور اپنی خوش لباسی کو کھدر میں تبدیل کر کے اپنے ریشمی اور قیمتی کپڑوں کو نذرِ آتش کر دیا اگرچہ ان کے جسم پر ریشمی کپڑے بھی چبھا کرتے تھے اور ریشمی موزے تک تکلیف دیتے تھے۔ ان کی کھدر پوشی کے بارے میں رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں کہ:

"ان کا کھدر دیکھ کر کچھ ایسا خیال آتا ہے جیسے پہلے پہل
کپڑے کا اطلاق اسی پر ہوا ہو جو شفیق صاحب کے حصے میں
آیا تھا اور خود ان کو ان کی سج دھج کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ دنیا
کسی کا کچھ بگاڑ سکتی ہو یا نہیں شفیق صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ
سکتی۔ بگڑ جانے کی چیز شفیق صاحب نے اپنے پاس رکھی ہی نہ
تھی۔"

بعد ازاں شفیق صاحب نے مولانا محمد علی کی قیادت میں اپنے آپ کو تحریک خلافت کے لیے وقف کر دیا اور علی گڑھ کے ایم اے او کالج کو خیر باد کہہ کر جامعہ سے وابستگی اختیار کر لی۔ کراچی کی خلافت کانفرنس میں منظور شدہ ایک قرارداد کے سلسلہ میں مولانا محمد علی کی گرفتاری عمل میں آئی تو مولانا نے شفیق صاحب کو اس قرارداد کو دور دور تک پہنچانے اور اس کی حمایت میں فتووں کو تقسیم کرنے کے لیے آندھرا میں متعین کیا شفیق صاحب گیارہ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو کٹر پہ پہنچے۔ انھوں نے وہاں کئی جلسوں سے خطاب کیا اور خلافت کمیٹیوں کی تشکیل کی۔ ۲۱/ اکتوبر کو انھوں نے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی اور فتووں کو تقسیم کیا۔ اس جلسہ میں لوگوں نے کراچی قرارداد کو دہرا کر حکومت کی مخالفت و مذمت کی۔ شفیق صاحب نے تقریباً چودہ سو دستخط بھی اکٹھا کیے اور انگورا فنڈ کے لیے تقریباً ڈھائی ہزار روپے بھی جمع کیے۔ ان سرگرمیوں کے نتیجے میں دفعہ ۱۴۴ اور دفعہ ۱۰۸ کے تحت باغیانہ تقریریں کرنے اور

''مباحثۂ شاہجہاں پور'' کے موقع پر شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے غریب شیعوں کی دعوت پر (جو مقامی شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے تھے کیونکہ زمیندارہ شیعوں ہی کا تھا) حضرت نانوتویؒ نے وہاں جا کر وعظ فرمانا منظور کر لیا، جب اس کی خبر وہاں کے شیعہ زمینداروں کو ہوئی تو ان میں کھلبلی مچ گئی، چونکہ وہ لوگ حضرت کے مقام اور ان کے مواعظ کے اثرات سے واقف تھے اس لئے انہیں خطرہ تھا کہ کہیں وعظ سن کر وہاں کے شیعہ عوام متاثر نہ ہو جائیں اس کی کاٹ کے لئے انہوں نے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہدین کو اس پروگرام کے ساتھ بلوالیا کہ چاروں نے مل کر چالیس سوالات تیار کئے اور طے پایا کہ دس دس سوالات چاروں الگ الگ کریں گے چنانچہ مقررہ پروگرام کے مطابق حضرت والا جب اس گاؤں میں پہنچے اور آپ کا وعظ شروع ہوا تو یہ چاروں مجتہدین چاروں کونوں پر اس تیاری کے ساتھ بیٹھ گئے کہ جوں ہی حضرت وعظ شروع کریں فوراً ایک اپنا سوال پیش کر دے، جب تک اس کے جواب سے فارغ ہوں دوسرے کونے سے دوسرا اپنا سوال پیش کر دے، اسی طرح تیسرا اور چوتھا اس طرح سوال و جواب میں الجھا کر سارا وقت ضائع کر دیا جائے اور حضرت نانوتویؒ کا وعظ ہو ہی نہ سکے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حضرت والا کی کرامت یوں ظاہر ہوئی کہ حضرت والا کا مفصل وعظ ہوا اور اس میں ان تمام سوالات کے جوابات خود بخود اس طرح آتے چلے گئے کہ ان مجتہدین کو کوئی سوال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اب ان مجتہدین اور شیعہ زمینداروں نے اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لئے ایک نوجوان کا ''فرضی جنازہ'' بنایا اور حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں، طے یہ تھا کہ جب حضرت والا دو تکبیر کہہ لیں تو یہ ''مصنوعی مردہ'' اٹھ کر بھاگے گا اور سب مل کر حضرت والا کا مذاق اڑائیں گے اور ان سے ٹھٹھول کریں گے، حضرت والا نے اس درخواست پر پہلے تو معذرت فرمائی، پھر شدید اصرار پر اس حال میں آمادہ ہو گئے کہ اندرونی اضطراب چہرہ سے عیاں تھا۔ بہر حال نماز جنازہ شروع ہوئی، دو تکبیروں کے بعد جب ''مردہ'' میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو پیچھے سے ''ہونہہ'' کہہ کر اسے متوجہ کرنے اور اپنا ''مقررہ کام'' انجام دینے کا اشارہ بھی کیا گیا مگر اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ حضرت نانوتوی نے نماز پوری کرنے کے بعد اسی غصہ کے لہجہ میں فرمایا ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا'' دیکھا گیا تو واقعی مر چکا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر

دفعہ ۱۲۴۔ اے کے تحت فتووں کو تقسیم کرنے اور فوجیوں کو بھڑکانے کے الزام میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ کچھ لوگوں کی شہادت اور خود ان کے بیانات کے بعد مجسٹریٹ نے ان سے ضمانت طلب کی لیکن انھوں نے عدم تعاون کا حامی ہونے کے سبب اس سے انکار کر دیا اس لیے مجسٹریٹ نے انھیں چھ ماہ کی سزا کا حکم سنایا لیکن ان کے عزم اور کردار کے پیش نظر کہا کہ ''تم جیسے باہمت نوجوانوں کو سزایاب کرنا بڑا تکلیف دہ فریضہ ہے۔'' مجسٹریٹ نے ان سے مصافحہ کیا اور پولیس سپرنٹنڈنٹ نے انھیں گلے لگاتے ہوئے کہا کہ ''کاش ملک کی بھلائی کے لیے میں آپ کے شانہ بشانہ کام کرسکتا۔'' اس کے باوجود انھیں گرفتار نہیں کیا گیا۔ انھوں نے آزاد فضا میں مسجد میں نماز ادا کی اور لوگوں کے ہجوم کے ساتھ، ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ وہاں ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹبل پہلے سے موجود تھے جنھوں نے انھیں گرفتار کر کے ویلور سینٹرل جیل بھیج دیا۔ اپنی گرفتاری اور سزایابی کے بارے میں گاندھی جی کو ایک خط میں شفیق صاحب نے تحریر کیا کہ ''ہم بہت خوش ہیں کہ اپنے مشفق و محترم پرنسپل مولانا محمد علی کے نقوشِ پا پر گامزن ہوئے اور اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ہم نے فتوے کو تقسیم کر کے اور کراچی قرارداد کو دہرا کر فوج کو گمراہ کر کے سزایاب ہونے میں پہل کی۔ ہم نے اپنے فرض کی تکمیل کی اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی دعاؤں سے نوازیں۔ ہمیں دلی مسرت ہے اور ہم خدائے تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ہمت اور دلیری عطا فرمائے تا کہ ہم تمام مصائب اور مصیبتیں برداشت کرسکیں۔''

گاندھی جی نے اس خط کے اقتباسات کو ۳؍نومبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا کے شمارے میں شائع کیا اور اپنے تبصرے میں لکھا کہ ''محمود حسین اور شفیق الرحمٰن قدوائی نیشنل مسلم یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ مولانا محمد علی نے انھیں آندھرا کے ضلع میں متعین کیا تھا جہاں وہ بڑی سادگی سے ایک عظیم کام سرانجام دے رہے تھے۔ وہ پہلے ہی جیل جا چکے ہیں جبکہ ان کا سردار ابھی مقدمہ کی آزمائش کی راہ سے ہی گزر رہا ہے۔'' شفیق صاحب کے خط کے سلسلے میں گاندھی جی نے لکھا کہ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں سب سے زیادہ مبارکباد کسے پیش کروں، مجسٹریٹ کو یا پولیس کو یا اس پرنسپل کو جس نے ان نوجوانوں کے کردار کو ڈھالا، جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جس نے ان معصوموں کو جیل بھیجا میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی قبر خود کھود رہی ہے جس کے ساتھ کسی طرح تعاون نہیں کیا جاسکتا۔''

شیعوں میں صف ماتم بچھ گئی او بہت بڑی تعداد میں شیعہ تائب ہو کر سنی ہو گئے۔ (۱۶)

حضرت الامامؒ کی اسی اصلاحی مہم اور علمی و عملی خدمات کے ذریعہ اہل تشیع کی بڑی تعداد کو تائب ہونے کی توفیق ملنے کے علاوہ اس کا سب سے بڑا فائدہ اس ''رنگ'' کے اترنے کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جس میں پورا علاقہ بلکہ پورا ملک رنگا ہوا تھا۔ خود دیوبند کا یہ حال تھا کہ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی اور مسجدوں سے تعزیئے اٹھائے جاتے تھے، جس میں شیعوں سے زیادہ ''نام نہاد سنی'' دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف کا بیان ہے:

''اور تو اور ضلع سہارن پور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں ماوی و ملجاء بنا ہوا ہے۔ کسی موقع پر امیر شاہ خاں مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرٹھ، ہاپوڑ، گلاوٹھی، بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ: ''دیوبند میں سب تفضیلی تھے''

دیوبند کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود تھا بلکہ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے بجائے تفضیل کے لکھا ہے کہ:

''مادہ رفض کا غالب تھا''

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کشمکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی وہ سننے کے قابل ہے۔ (۱۷)

حضرت الامام کی مخلصانہ اصلاحی مہم کے اثرات اس خوشگوار صورت میں ظاہر ہوئے کہ نہ صرف دیوبند اور قرب و جوار بلکہ بہت سے دور دراز مقامات میں رائج تعزیہ داری کا سنی گھرانوں سے خاتمہ ہو گیا، اور سنی رفض و تفضیلیت کے اثرات سے باہر آ گئے۔

آخر میں بطور خلاصہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی دینی و اصلاحی خدمات کے باب میں ''رد تشیع'' کو ایک خصوصی و امتیازی مقام حاصل ہے، جس کے ذریعہ اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کو بھرپور فوائد حاصل ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں بندگان خدا کو اپنے غلط عقائد اور ضلالت آمیز اعمال سے تائب ہو کر ''حقیقی اسلام'' اور اس کے عقائد و اعمال قبول کرنے کی توفیق ملی۔

فرحمة الله عليه رحمة واسعة و جزاه الله عنا وعن جميع المسلمين

---

(۱۶) حاشیہ سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۷۰-۷۱۔ (۱۷) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۷۲-۷۳

شفیق صاحب کو ویلور جیل میں رکھا گیا جس میں گوپال آچاری پہلے ہی سے مقید تھے۔ شفیق صاحب سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی تاہم انھوں نے ہندستان کے قومی رہنما پر جو اثرات مرتب کیے وہ راجہ جی کی ڈائری میں اس طرح درج ہوئے:

"آج علی گڑھ کے ایک نوجوان شفیق الرحمٰن قدوائی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں اس سے زیادہ نیک طینت، تارک نفس، خداترس، مہذب اور شریف نوجوان نہیں دیکھا۔"

شفیق صاحب کے والد حسن الرحمٰن قدوائی تک شفیق صاحب کے پہلی بار جیل جانے کی خبر پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے شفیق صاحب سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ انھیں ایم اے پاس کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے انگلستان بھیجیں گے تاکہ وہاں سے واپس ہو کر وہ اعلا عہدوں پر فائز ہوں۔ لیکن سزایاب ہو کر ان کے بیٹے نے ان کی ساری آرزوئیں خاک میں ملا دی تھیں اور انھیں سماج میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تھا۔ اسی خفگی اور برہمی کے عالم میں انھوں نے شفیق صاحب کو عاق کر دیا اور شفیق صاحب نے بھی مدتوں گھر کا رخ نہیں کیا اور خاموشی سے جامعہ ملیہ میں کام کرتے رہے۔

دراصل جامعہ کے علی گڑھ سے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد شفیق صاحب کا تقرر جامعہ میں ۱۹۲۶ء میں ہوا جہاں انھوں نے معاشیات کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا اور کھدر کو مقبول بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جب ۱۹۲۸ء میں جامعہ میں انجمن تعلیم ملی کا قیام عمل میں آیا جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ کم سے کم بیس برس تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ طلب نہیں کریں گے تو عہد نامہ پر اولین گیارہ دستخط کرنے والے افراد میں شفیق صاحب بھی شامل تھے۔ اس طرح وہ "انجمن تعلیم ملی" کے دائمی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

ان ہی دنوں جبکہ شفیق صاحب کا اپنے گھر اور گھر والوں سے ناتہ ٹوٹ گیا تھا اور انھوں نے قومی تحریک میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھر بار کو قربان کر دیا تھا، مولانا محمد علی نے ان کے والد سے ملاقات کی اور باپ بیٹوں کے درمیان مصالحت کرا دی اور اس طرح شفیق صاحب کو اپنے گھر جانا نصیب ہوا۔ تاہم ۱۹۳۰ء میں جب گاندھی جی نے انگریزوں

مولانا عتیق احمد قاسمی٭

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا فقہی ذوق و مزاج

پس منظر

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ برصغیر کی ان عظیم شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اپنے دور پر اور بعد کے ادوار پر بڑے گہرے دیر پا اثرات چھوڑے ہیں ۔ انیسویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری کی ممتاز ترین شخصیات کی مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے تو اس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا اسم گرامی نمایاں ترین جگہ پائے گا۔ برصغیر ہندو پاک میں مغلیہ سلطنت کے بکھراؤ کے بعد ہندوستان کے اندلس بن جانے کا پورا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، اسلام دشمن طاقتوں نے پوری منصوبہ بندی کرلی تھی کہ برصغیر کے مسلمان اپنا دین و ایمان، تہذیب وثقافت سب کچھ بھول کر یا تو عیسائیت کی گود میں چلے جائیں یا ہندو مذہب اختیار کرلیں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت ہند کی سرگرم پشت پناہی میں پادریوں کی فوج یورپ کے مختلف ممالک سے آکر پورے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور پوری مشنری اسپرٹ کے ساتھ سرگرم عمل تھی، پادریوں کی کوششوں کا خاص نشانہ مسلمان تھے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے دباؤ اور لالچ کا ہر طریقہ اختیار کیا جارہا تھا، پادریوں نے مناظرہ کا بازار گرم کرکے اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تشکیلی مہم چھیڑ رکھی تھی تاکہ اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور ان پر تثلیث کا رنگ چڑھایا جاسکے۔ دوسری طرف آریہ سماج تحریک اپنے شباب پر تھی، اور آریہ سماجی مبلغین اسلام کے خلاف بیہودہ اعتراضات کا بازار گرم کئے ہوئے تھے، اسلامی عقائد و تعلیمات کے خلاف اعتراضات پر مشتمل چھوٹی بڑی کتابیں لکھ کر مفت تقسیم کی جارہی تھیں، کوچہ و بازار میں مسلمانوں کو مناظروں کا چیلنج دیا جارہا تھا، مسلمانوں کو بہکانے اور بھڑکانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

٭ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

کے خلاف نمک ستیہ گرہ کا اعلان کر کے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا تو شفیق صاحب نے بھی اس میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کے موقف کو واضح کرتے ہوئے کہا:

"...... جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ تو خود جنگ آزادی کے لیے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ صحیح تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے۔ کارکنانِ جامعہ کی یہ چھوٹی سی جماعت اس کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب اس کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی اس سیاسی تحریک میں شرکت کے لیے بیتاب ہوں وہ اپنی خدمت کے جذبے کا سب سے بہتر اظہار شاید اس طرح کر سکتے ہوں کہ انھیں ضرور اس تحریک میں شریک ہونا چاہیے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لیے پہلے جامعہ سے انھیں اجازت لے لینی چاہیے تا کہ جامعہ پہلے اپنے کام کا انتظام کر سکے۔"

ذاکر صاحب کے ان خیالات کی روشنی میں شفیق صاحب نے "قومی ہفتہ" کی سرگرمیوں کے دوران اپنے آپ کو جامعہ سے علاحدہ کرنے کا اعلان کیا تا کہ وہ تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو سکیں۔ اس بارے میں ایک تقریر میں ذاکر صاحب نے کہا:

"جامعہ نے اپنے ذمہ جو تعمیری کام لیا ہے اسے یک سوئی اور انہماک سے انجام دینا ہمارا فرض ہے اور یہ فرض ادا کیا جائے گا لیکن جامعہ کے جو لوگ اپنے عقیدہ اور یقین کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اس سیاسی جنگ میں جو آج ملک میں برپا ہے، حصہ لینا چاہیے، جو جامعہ سے الگ ہو کر اس میں حصہ لے سکتے ہیں بلکہ خود شفیق صاحب نے اس دیانت کی وجہ سے جوان

برطانوی سامراج کی آہنی بیڑیوں کو توڑنے کی ایک کوشش ۱۸۵۷ء میں کی گئی، لیکن مختلف اسباب سے اس میں ناکامی ہوئی، اس کے بعد برطانوی حکومت ہند نے اپنے حلقے مزید تنگ کر دیے، مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر کچلنے اور فنا کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں، ہزاروں علماء اور مجاہدین آزادی تہ تیغ کر دیے گئے، بڑی بڑی املاک اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں، مسلمانوں کے قیمتی اوقاف برباد کر دیے گئے، قدیم مدارس جو مسلم نوابوں اور امراء کی اعانت سے یا اوقاف کی آمدنی سے چلتے تھے رفتہ رفتہ موقوف ہو گئے اور مسلمانوں کا مستحکم نظام و تربیت جو نئی نسل کی تربیت اور تیاری کا ضامن تھا درہم برہم ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی نور بصیرت اور فراست ایمانی سے محسوس کر لیا تھا کہ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ گل ہونے والا ہے اور اس سلطنت سے وابستہ نظم ملت کا نظام درہم برہم ہونے والا ہے، انہوں نے برصغیر ہندوستان کے حالات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا، مسلمانوں کے مختلف طبقات میں پائی جانے والی خامیوں، ان کی نفسیاتی کمزوریوں کا جائزہ لیا اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی بیماریوں کا مداوا تجویز کیا، اپنی دعوتی، اصلاحی علمی وفکری اور تدریسی کوششوں کے ذریعہ مسلم سماج کو سنبھالنے اس کے علمی وفکری معیار کو بلند کرنے اور مسلمانوں کو سچا اور پکا مسلمان بنانے کی سعی پیہم کی، حضرت شاہ صاحب نے اپنی تصنیفی اور تدریسی کوششوں کے ذریعہ علماء اور خواص امت کے دل و دماغ میں ایک خاموش انقلاب برپا کر دیا۔

فکر قاسمی اور فکر ولی اللہی

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک کا امتداد تھے، فکر قاسمی کے بنیادی عناصر فکر ولی اللہی سے مستفاد و ماخوذ ہیں فقہ اسلامی کے بارے میں حضرت مولانا نانوتویؒ کے رویہ و موقف میں فکر ولی اللہی کا عکس بہت صاف نظر آتا ہے۔

الامام النانوتوی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح محسوس کر رہے تھے کہ فقہاء ہند کے ایک بڑے طبقہ کا عملی رشتہ کتاب و سنت سے بہت کمزور پڑ چکا ہے، وہ لوگ اگرچہ نظریاتی طور پر اس بات کو مانتے ہیں کہ فقہ اسلامی کا ماخذ قرآن و حدیث ہے لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ ان کی عمر کا تقریباً تمام تر حصہ اصول فقہ کی فنی بحثوں اور فقہی جزئیات کے مطالعہ میں گزرتا ہے، کتاب و سنت کے

کی خصوصیت ہے، یہی راہ تجویز کی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ
جامعہ کے تعلیمی کام اور ملک کے سیاسی کام کو ساتھ ساتھ ایک
وقت میں انجام نہیں دے سکتے اس لیے انھوں نے جامعہ
سے الگ ہو کر اس کام کو کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے
کہ جو شخص شفیق صاحب کو جانتا ہے اسے یقین ہوگا کہ شفیق
صاحب جو کچھ کریں گے سچائی، خلوص، نیک نیتی کے ساتھ
کریں گے اور اپنے عمل سے اپنی مادرِ علمی کے نام اور اس کی
شہرت کو چار چاند لگائیں گے"

اپنی تقریر کے آخری حصے میں ذاکر صاحب نے شفیق صاحب کو ان کے فیصلے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا:

"......میں آخر میں شفیق صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ
اپنے یقین اور عقیدہ کا احترام عمل سے کرتے ہیں اور اس میں
اپنے آرام و آسایش تک کا خیال نہیں کرتے۔ خدا انھیں ان
کے مقاصد میں کامیاب کرے"

اگرچہ شفیق صاحب نے تحریک میں شرکت کے لیے جامعہ سے عارضی طور سے علاحدگی اختیار کر لی تھی لیکن ابھی اپنے والد سے اجازت کے حصول کا مرحلہ باقی تھا۔ مولانا محمد علی کی کوشش سے باپ بیٹے میں صفائی ہو چکی تھی تاہم ان کے والد کو ان کی سیاسی سرگرمیوں سے اب بھی اختلاف تھا لیکن شفیق صاحب تحریک آزادی میں شرکت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے چکے تھے اور گاندھی جی کو اپنا رہنما تسلیم کر چکے تھے اس لیے اس راہ سے منہ موڑ لینا اب ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ تحریک خلافت کے ابتدائی دنوں میں انھوں نے مولانا محمد علی کو اپنا راہبر تسلیم کرتے ہوئے جیل میں فخر کا احساس کیا تھا لیکن اب تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں مولانا کے اختلاف کے باوجود شفیق صاحب گاندھی جی کے عمل سے اتفاق رکھتے تھے اس لیے انھوں نے مولانا محمد علی سے اپنے اختلاف کی پروانہ کرتے ہوئے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا وہ خط جو انھوں نے اپنے والد کو لکھا تھا قابل ذکر ہے اس میں انھوں نے لکھا تھا:

فہم وتدبر پر ان کی توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، فقہ کا قرآن وحدیث سے ربط کمزور پڑتا جارہا ہے، فقہی مجتہدات کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے، صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بعض کم نظر متعصب فقہاء فقہی جزئیہ کے مقابل میں صحیح حدیث نبوی کو برملا مسترد کرنے لگے ہیں۔ اس کا مظاہرہ حضرت نظام الدین اولیاء کے دور سے ہونے لگا جب سماع کے موضوع پر برپا مجلس مناظرہ میں اس دور کے بعض نمایاں فقہاء نے دوران بحث کہہ دیا کہ ہمیں حدیث نبوی سے سروکار نہیں، ہم امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، ہمارے سامنے امام صاحب کا قول پیش کیجئے، اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

> ''قاضی ضیاء الدین برنی اپنی کتاب ''حسرت نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ: جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نماز ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت وحسد سے بھرے ہوئے ہیں، انہوں نے وسیع میدان پایا اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجیب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہ کو سننا ان کو گوارا نہیں تھا، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ اعتقاد ہیں یا نہیں؟ اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے ہیں اور احادیث صحیح کو رد کرتے ہیں، میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا نہ سنا کہ اس کے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ یہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے۔ (۱)

فقہ کو کتاب وسنت سے مربوط کرنے کی کوشش

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد واحفاد نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے صاحبزادگان اور خانوادۂ علمی کی کوششوں سے اگرچہ ہندوستان کے بہت سے علمی حلقوں میں احادیث نبویہ کی گرم بازاری ہوگئی تھی، فن حدیث کے ساتھ اعتناء بڑھ گیا تھا، معتبر کتب احادیث

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص: ۹۲۔۹۳ بحوالہ سیر الاولیاء، ص: ۵۲۷ تا ۵۳۲

''آج غالباً آپ میری وجہ سے فکر مند ہوں گے کہ ملک میں آزادی کی تحریک پھر شروع ہوئی ہے معلوم نہیں اس میں میرا طرز عمل کیا رہتا ہے۔ میں بھی آج دو ہفتہ سے شب و روز اس غور و فکر اور پریشانی میں ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میرے سامنے شرکت کرنے یا نہ کرنے کا کوئی نیا سوال اس وقت پیش ہے، اس لیے کہ یہ مسئلہ اسی دن طے ہو گیا تھا جب میں نے تحریک آزادی میں پہلی بار شرکت کی تھی بلکہ پریشانی اور فکر اس وقت یہ ہے کہ اس تحریک میں شرکت کے لیے آپ سے اجازت کس طرح حاصل کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ آنجناب کو میرے سیاسی خیالات سے اختلاف ہے اور میری گمراہی کو دیکھ کر ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے اور دکھ پہنچتا ہے۔ اگر آنجناب سے اختلاف نہ بھی ہوتا تب بھی غالباً آنجناب کی شفقت یہ کبھی گوارا نہ کرتی کہ میں جان بوجھ کر تکلیف اور عسرت کی زندگی اختیار کروں اور مصیبتوں کا شکار ہوں۔''

شفیق صاحب نے مزید لکھا:۔

''اس وقت میں اپنے سیاسی معتقدات اور مسلک کے متعلق کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری گزشتہ دس سالہ زندگی اور طرز عمل نے یہ حقیقت کم از کم آنجناب پر اچھی طرح روشن کر دی ہوگی کہ میرے سیاسی عقائد اور اعمال صحیح ہوں یا غلط مگر نیک نیتی، خلوص اور دیانت داری کے جذبات پر مبنی ہیں۔ اگر میری طرف سے اتنا اطمینان آپ کو ہو گیا ہے تو یہی میری صفائی کے لیے کافی ہے۔

''تحریک ترک موالات کے زمانہ میں میری ناسمجھی سے بعض غلط فہمیاں ایسی پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے آپ کو صدمہ پہنچا اور آپ کا دل میری طرف سے پھر گیا۔ اس وقت میری طرف

کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا لیکن ایسے علمی حلقے موجود تھے جن میں علوم عقلیہ کے بعد سب سے زیادہ توجہ فقہ اور اصول فقہ پر دی جاتی تھی اور ان کے نصاب درس میں قرآن وحدیث نبوی کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنی تعلیمی تحریک میں کتاب وسنت کی تعلیم کو ان کے شایان شان مقام دیا۔ صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں کو نصاب درس میں شامل کیا، درس کا وہ انداز اختیار کیا کہ کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا ربط ورشتہ کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے، اور قرآن وحدیث قندیل ہدایت کا کام دیں اور ان کی روشنی میں الجھے ہوئے مسائل کی گرہیں سلجھائی جائیں، خلافی مسائل پر الامام النانوتوی کے مکتوبات اور تحریریں اپنے اندر اجتہادی شان رکھتی ہیں، کتاب وسنت کی عطر بیزیاں قدم قدم پر نمایاں ہیں اور ایسے لطیف استنباط پائے جاتے ہیں جن کی نظیر فقہاء متقدمین کے یہاں بھی نہیں ملتی۔

اختلافی مسائل میں الامام النانوتوی کا موقف

الامام النانوتوی جن کو بجا طور پر حجۃ الاسلام کا لقب دیا گیا ہے ان کی توجہات خارجی محاذ پر زیادہ رہیں، عیسائی پادری اور آریہ سماجیوں کا مقابلہ علم واستدلال، بحث ومناظرہ کی سطح پر انہوں نے بڑی مستعدی اور بے جگری کے ساتھ کیا اور اپنی تمام تر توانائیاں ان محاذوں پر صرف کیں اور خارجی محاذ پر لڑنے والا کوشش کرتا ہے کہ داخلی لڑائی نہ لڑنی پڑے، اس لئے الامام النانوتوی مسلمانوں کے اندرونی اختلاف وانتشار کے سخت مخالف تھے، اُسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، رفع یدین، قرأۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر وغیرہ کے بارے میں مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑوں کی خبروں سے ان کے دل پر جو قیامت گزرتی تھی اس کا کچھ اندازہ ان کے بعض مکتوبات اور تحریروں سے ہوتا ہے، ایک خط کے جواب میں جس میں چند مسائل کے بارے میں دریافت کیا تھا لکھتے ہیں:

> ''مخدوم من میاں جی گھیسا صاحب سلامت، بعد سلام گزارش ہے کہ میں پرسوں تیسرے روز پیر کے دن دیوبند سے یہاں اپنے وطن پہنچا، آپ کا خط ملا، دیکھ کر رنج ہوا، کیا خدا کی قدرت ہے کہ آج کل جس طرف سے صدا آتی ہے یہی آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں میں اختلاف ہے، وہاں نزاع ہے، کہیں سے اتفاق کی خبریں نہیں آتیں، ہاں کفار کے جتنے افسانے سنے جاتے ہیں کہ

سے یہ اطمینان بھی آپ کو نہ تھا کہ میں نے اس تحریک میں
شرکت مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر اور سمجھ کر کی تھی یا محض
دوسروں کی دیکھا دیکھی اور بہکانے سے، اسی وجہ سے ایک
عرصہ تک آنجناب کو میری طرف سے ناراضگی اور غصہ رہا لیکن
خدا کا شکر ہے کہ پانچ سال کی خاموشی اور صبر آزما کوشش کے
بعد اگرچہ میں آنجناب کا اعتماد پوری طرح حاصل نہ کر سکا لیکن
جو بے اعتمادی اور نفرت عارضی طور سے پیدا ہو گئی تھی اس کو دور
کرنے میں مجھے ضرور کامیابی ہوئی۔ لیکن ابھی زیادہ زمانہ نہیں
گزرا تھا اور میری طرف سے کلیۃً اعتماد اور اطمینان بھی آپ کو
نہ ہونے پایا تھا کہ میری قسمت سے اللہ میاں نے پھر مجھے ایک
آزمایش اور ابتلا میں ڈال دیا۔"

اپنی موجودہ ذہنی کشمکش کی وضاحت کرتے ہوئے شفیق صاحب نے اپنے والد کو
لکھا:

"اس وقت میرے سامنے ایک عجیب کشمکش ہے۔ اپنے
سیاسی عقائد کے مطابق موجودہ تحریک میں عملی حصہ لینے کی ایک
قوی خواہش اور احساس میرے دل میں موجود ہے۔ جامعہ
کے ایک ذمہ دار خادم کی حیثیت سے بھی بعض مصالح اس کے
مقتضی ہیں کہ میں کانگریس کی موجودہ تحریک میں شرکت سے
گریز نہ کروں۔ پھر ایک استاد کی حیثیت سے اپنے طالب
علموں کو اور ایک سیاسی مبلغ کی حیثیت سے اپنے محدود حلقہ اثر
میں جن باتوں کا سبق دیا کرتا تھا اور جن خیالات کی تبلیغ کیا کرتا
تھا اس کی آزمایش کا وقت خود میرے لیے آ گیا ہے۔ میں
دیانت داری کے ساتھ کیونکر اپنے نفس کو دھوکہ دوں اور اپنے
خیالات کی تردید اپنے عمل سے کروں؟ غرض یہ اور اسی طرح
کے اور بہت سے خیالات پریشانی کا باعث ہو رہے ہیں لیکن

یوں اتفاق ہے، اس طرح اتحاد ہے، کہ خیر بجز انا للہ وانا الیہ راجعون کے اور کیا کہیے، آپ کی خوشنودی خاطر منظور ہے اس لیے جواب لکھتا ہوں ورنہ ایسے جھگڑوں میں دخل دینا محض فضول سمجھتا ہوں''۔(۲)

الامام النانوتوی کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دیکھ مسجد میں شکست رشتہ تسبیح شیخ
میکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

حضرت نانوتوی اور عدم تقلید

الامام النانوتوی ہی کے دور میں اجتہاد اور عدم تقلید کے نام پر مقلدین کو مشرک قرار دینے، فقہ کو کتاب وسنت کے مخالف اور متوازی شریعت قرار دینے کی مہم چل رہی تھی، بعض اہل قلم اور اہل زبان کی دریدہ دہنی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فقہاء مجتہدین کو سب وشتم کر رہے تھے اور فقہ اسلامی کو کوک شاشتر قرار دے رہے تھے، برملا لکھا اور کہا جارہا تھا کہ فقہ حنفی امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کی ذاتی آراء کا مجموعہ ہے، اس کا کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس موضوع پر لٹریچر کا ایک سیلاب سا آگیا تھا، تقلید کو مطلقاً حرام اور ہر کس وناکس کے لئے اجتہاد کے لازم ہونے کی بات کہی جارہی تھی۔

صورت حال کی نزاکت سے مجبور ہو کر الامام النانوتوی نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق واستدلال کا حق ادا کر دیا۔

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ

امام کی اقتداء کرتے ہوئے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے نہ پڑھنے کا مسئلہ عہد صحابہ سے معرکۃ الاراء چلا آرہا ہے، ایک فریق مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتا تو دوسرا ممنوع قرار دیتا ہے، اس موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے جاچکے ہیں۔ الامام النانوتوی کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ اختلاف ونزاع کا باعث بنا ہوا تھا۔ غالی غیر مقلدین کا دعوی تھا کہ اس مسئلہ میں احناف کا دامن

(۲) رسالہ در ثبوت تقلید و بست رکعت تراویح ملحق بہ الدلیل المحکم، ص: ۱۸

کتاب وسنت کے دلائل سے خالی ہے اور مقتدی نے اگر سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ہرگز درست نہیں

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص: ۹۲-۹۳ بحوالہ سیر الاولیاء، ص: ۵۲۷ تا ۵۳۴

دوسری طرف میری شرکت سے جو تکلیف میرے خاندان والوں کو اور خصوصیت کے ساتھ آنجناب کو ہوگی اس پر جب غور کرتا ہوں تو پریشانیوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اپنی موجودہ دماغی تکلیف اور پریشانی کا موازنہ آنے والی تکلیف سے کر کے آپ لوگوں کو یہ یقین دلاؤں کہ اس تحریک میں شرکت کے بعد جو سزا اور تکلیف مجھے ہوگی وہ میری موجودہ تکلیف کے مقابلہ میں راحت کا سامان ہوگی۔ اگر اسی ایک معاملہ میں میرے گھر والوں کا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو میرا ہے تو پھر آنجناب سے اجازت حاصل کرنے میں مجھے زیادہ دقت نہیں ہوتی اور نہ آنجناب کو کوئی تشویش ہوتی مگر نقطۂ نظر کے اس فرق کو دور کرنے کے لیے ابھی ایک مدت کی ضرورت ہے۔

''گزشتہ دس سال کے اندر آزادی کی تحریک کے گرم وسرد اتار چڑھاؤ نے سیکڑوں شوریدہ سروں کا نشہ اتارا اور سیکڑوں کے جوش کو بالکل ٹھنڈا کر دیا۔ عوام سے قطع نظر کر کے خواص پر نظر ڈالی جائے تو جو لوگ آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے اور بغاوت کے علمبردار تھے آج اس تحریک سے علاحدگی اختیار کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ محترم علی برادران کا بھی مشورہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے علاحدہ رہنا چاہیے۔ کاش میرے جنوں پرور جذبات بھی گرد و پیش کے حالات سے یا دیگر اغراض کی شیفتگی سے ٹھنڈے ہو گئے ہوتے تو آج میں بھی اطمینان قلب کے ساتھ بیٹھا تماشہ دیکھتا اور آنجناب کو تشویش اور پریشانی میں نہ ڈالتا، لیکن میں کیا کروں میرے سر میں جو سودا سما گیا ہے وہ کسی طرح مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ محترم علی برادران سے ملا، ان کے خیالات بھی سنے لیکن دونوں بزرگوں کے مشورہ کا

ہوگی۔ الامام النانوتوی نے اس مسئلہ پر البیلے انداز سے قلم اٹھایا اور کتاب وسنت نیز عقلی دلائل سے ثابت کردیا کہ مقتدی کو قرأت فاتحہ سے منع کرنے والوں کا موقف نہ صرف کتاب وسنت سے ثابت ہے بلکہ زیادہ مضبوط اور راجح یہی موقف ہے، حضرت نانوتوی نے پوری علمی متانت کے ساتھ بحث کرنے کے بعد رسالہ کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان اختلافی مسائل میں ان کے معتدل نقطہ نظر کی غمازی کرتا ہے:

''اس پر بھی امام ابوحنیفہ پر طعن کئے جائیں اور تارکین قرأت پر عدم جواز صلوۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں دیوار نہیں پہاڑ نہیں۔ ہم کو دیکھئے باوجودِ توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریبان نہیں ہوتے۔ بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں، امام اعظم بھی باوجود عظمت وشان امکان خطا سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ نہ سمجھتے ہوں، اس امر میں زیادہ تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں اور دو چار ہم بھی سنائیں پر آیت: واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما واذا مروا باللغو مروا کراما اور احادیث منع نزاع مانع ہیں'' (۳)

مسئلہ تراویح

الامام النانوتوی کے دور میں تراویح کا مسئلہ بھی جدال ونزاع کا باعث بنا ہوا تھا، امت مسلمہ کا عمل بیس ۲۰ رکعت تراویح پر چلا آرہا تھا لیکن تیرہویں صدی ہجری میں عمل بالحدیث کا مدعی گروہ اسے بدعت قرار دے رہا تھا اور اس کا اصرار تھا کہ ۸/ رکعات تراویح ہی سنت ہے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متعدد تحریروں میں اس پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ تحریریں سائلین کے جواب میں لکھی گئی ہیں مولانا موصوف نے پوری تحقیق ودیانت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس بات کا بھی شکوہ کیا ہے کہ کتابیں پاس میں نہیں ہیں کہ بھرپور روایتی تحقیق کی جائے۔

''لطائف قاسمیہ'' کا دوسرا خط جناب عبدالرحیم خاں صاحب کے نام تراویح کے مسئلہ پر ہے عبدالرحیم خاں صاحب کی طرف سے جو خط آیا تھا اس میں بیس رکعت تراویح کے خلاف دلائل

(۳) توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام ص ۲۳ الدلیل المحکم علی قرأۃ الفاتحۃ للمؤتم ص: ۱۷

ایمانداری کے ساتھ قائل نہ ہوسکا بلکہ میرا یہ یقین پختہ تر ہوگیا کہ اس وقت مسلمانوں کو کانگریس سے علاحدہ گی کا مشورہ مسلمانوں کے اعلا مفاد کے لیے مضر بلکہ حد سے زیادہ مضر ہے گاندھی جی کی قیادت کے بارے میں شفیق صاحب نے لکھا۔

''آنجناب کو تکلیف ہوگی کہ وطنیت کے جوش میں اس قدر اندھا ہوگیا ہوں کہ اپنے مسلم رہنماؤں کی تقلید کو چھوڑ کر اور ملت کے مفاد کو پس پشت ڈال کر گاندھی جی کی خوشنودی کے لیے کانگریس کی تحریک میں شرکت کررہا ہوں۔ موجودہ حالات میں میرے لیے یہ دشوار ہے کہ اس معاملہ میں اپنی کوئی صفائی پیش کروں۔ آپ اس کا یقین ہی کیوں فرمائیں گے، لیکن ممکن ہے کہ وہ وقت بھی جلد آجائے جب آنجناب پر حقیقت واضح ہوجائے کہ اگر پہلے میں نے علی برادران مدظلہم کی قیادت تسلیم کی تو اس وقت قائد کی شخصیت نہیں بلکہ وہ مقاصد پیش نظر تھے جن کو اپنی فہم وبصیرت کے مطابق میں صحیح سمجھتا تھا اور آج بھی اگر میں ہندستان کے ایک درویش صفت قائد کی رہنمائی قبول کررہا ہوں تو محض اس لیے کہ میرے علم ویقین کے مطابق یہ شخص ایک ظالم اور جابر حکومت کے پنجہ سے ایک مظلوم قوم کو نجات دلانے کے لیے مجھے آمادہ نظر آتا ہے۔ اگر میرا یہ خیال کسی وقت غلط ثابت ہوا تو انشاء اللہ مجھے گاندھی جی کی قیادت سے انکار کرنے میں اسی طرح کوئی پس وپیش نہ ہوگا جیسے آج اپنے دونوں مسلم رہنماؤں کے مشورہ کو قبول کرنے سے مجھے عملاً انکار ہے۔

''اب دو راہیں میرے سامنے ہیں۔ یا تو اپنے عقیدہ کے خلاف اور اپنے جذبات کو دبا کر تحریک آزادی سے علاحدہ ہوجاؤں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جن جذبات کی پرورش

دیے گئے تھے اور کٹھ حجتی کے انداز کی بحثیں کی گئی تھیں، مولانا نانوتوی کا خیال ہے کہ اس خط کے مشتملات کسی "مدعی اجتہاد" کے تحریر کردہ ہیں، فارسی زبان میں ہے خط کے آخری حصہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ایک عرض یہ ہے کہ بندہ کمترین عاملان حدیث کو اگر ان میں فہم ہو برا نہیں سمجھتا بلکہ عمل بالحدیث کو ایمان کا شعار جانتا ہے لیکن آپ کے گرامی نامہ کے مضامین جن لوگوں کے تحریر کردہ ہیں ایسے بدفہموں کیلئے ہرگز عمل بالحدیث کو جائز نہیں سمجھتا، ایسے لوگ تو یضل بہ کثیرا کے زمرہ میں آتے ہیں، عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہے۔ غرضیکہ ایسی راہ اختیار کرنی چاہئے جس سے اکابر صحابہ پر طعن نہ ہو، دین برہم نہ ہو، مختلف احادیث آپس میں قرآن شریف کے ساتھ منسجم ہو جائیں، جس طریقہ کو اختیار کرنے سے صحابۂ کرام مطعون ہو جائیں، احادیث میں تعارض واقع ہو جائے اور قرآنی روش اس کی تکذیب کرے ایسا طریقہ ہرگز اللہ اور رسول کا پسند کردہ نہیں ہو سکتا مجتہد صاحب نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے وہ اسی طرح کا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا (۴)

عبدالرحیم خاں کے خط میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ بیس رکعت تراویح والی مؤطا کی روایت مرسل ہے اور حدیث مرسل محدثین کے یہاں مقبول نہیں ہے، اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے الامام النانوتوی لکھتے ہیں: موطا کی روایت پر طعن کی بنیاد یہ ہے کہ یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، سبحان اللہ کیا دلیل ہے اور کیا دعوی ہے، طعن کا خلاصہ یہ نکلا کہ تابعین کی مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہونا چاہئے، پہلے اس کو ثابت کرنا چاہیئے پھر یزید بن رومان کی روایت کو مسترد کرنا چاہئے، تابعین کی مرسل روایات کے معتبر نہ ہونے کا اصول اگر خود تراشیدہ ہے تو اسے کون پوچھتا ہے اور اگر دوسروں کی تقلید ہے تو امام شافعیؒ کے علاوہ کون اس طرف گیا ہے، امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مراسیل صحابہ کی طرح مراسیل تابعین بھی معتبر ہیں بلکہ سند سے زیادہ مرسل کا اعتبار ہے کیونکہ اسناد کو ترک کرنا روایت پر اپنے اعتماد کی دلیل ہے اور اسناد کا ذکر کرنا سننے والے کے فہم پر چھوڑتا ہے گویا یہ کہہ دیا گیا کہ ذمہ داری راوی پر ہے، اگر تقلید سے عار ہے تو امام ابن صلاح کا قول دیوار پر مارنا چاہئے اور اگر ابن صلاح کی تقلید جائز ہے تو امام

(۴) لطائف قاسمیہ ص:۱۴

میں نے گزشتہ دس سال کے اندر بڑی تکلیف اور مصیبتوں کو جھیل کر کی تھی وہ ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جائیں گے اور میری زندگی بے معنی اور تلخ ہو جائے گی یا پھر یہ صورت ہے کہ آپ کی اجازت حاصل کر کے اس تحریک میں مناسب طریقہ سے اور مناسب وقت اور مناسب جگہ پر عملاً حصہ لوں۔"

خط کے آخر میں شفیق صاحب نے اپنے والد سے تحریک میں شرکت کی اجازت طلب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مجھے امید ہے کہ آنجناب ان تمام حالات پر غور فرمائیں گے جو میں نے خدمت اقدس میں پیش کیے ہیں تو باوجود میرے خیالات سے اختلاف کے میرے احساسات اور میری نیک نیتی کا یقین فرما کر آپ مجھے اس پُرامن سیاسی جنگ میں شرکت کی اجازت ضرور مرحمت فرمائیں گے۔ آپ کی اجازت اگر مجھے نصیب ہوگی اور آپ کی دعائیں میرے شامل حال ہوں گی تو مجھ میں ایک ایسی زندگی بخش قوت پیدا ہو جائے گی جس سے میں اب تک محروم ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ بجائے خط لکھنے کے خود حاضر خدمت ہو کر اور قدموں پر سر رکھ کر آنجناب سے رخصت اور اجازت حاصل کروں لیکن حجاب مانع ہے اس لیے یہ عریضہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں......"

اس خط سے شفیق صاحب کی اپنے والد کے تئیں عقیدت، محبت اور احترام کے شدید جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے ان کی ذہنی کیفیت اور کشمکش بھی ظاہر ہوتی ہے جس سے وہ ان دنوں گزر رہے تھے اور اس عقیدت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں مہاتما گاندھی کے لیے موجزن تھی اور اس قوت ارادی کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے تحت وہ علی برادران کی مخالفت کے باوجود وہ تحریک میں شرکت کے لیے تیار ہوئے تھے۔ انھیں اس خط کا جواب جلد ہی موصول ہو گیا جس میں ان کے والد نے ایک بار پھر تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی رائے دی تھی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شفیق صاحب نے لکھا:

ابوحنیفہ اور امام مالک نے کیا تصور کیا ہے"(۵)

اس مکتوب میں الامام النانوتوی نے اصول حدیث کے بعض مسائل پر بھی بڑی قیمتی بحثیں کی ہیں۔

حضرت نانوتوی کا طریقۂ اعتدال

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانانوتوی ان اختلافی مسائل میں زیادہ قیل وقال اور بحث و تمحیص کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اگر ان موضوعات پر انہیں کبھی لکھنا پڑا تو بڑی نرمی، سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا، طعن و تشنیع کے بجائے حکمت و موعظت کا اسلوب اپنایا، مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

"الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمان میں چرچا کر کے افتراق وشقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرۃ کارہ تھے اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے؛ اسی طرح فردعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفاً عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا اور کتنا پاکیزہ خیال تھا؟ اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ: "طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں"۔ اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ "اگر ایک طرف ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے"

آگے ارقام فرماتے ہیں:

"اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں"(٦)

آپ کا طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموما یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے، پوچھنے اور دریافت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطہ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اسی قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں"(۷)

الامام النانوتوی کا مذکورہ بالا طرز عمل صرف فرعی مسائل کے بارے میں نہیں تھا۔ بلکہ بعض

---

(۵) لطائف قاسمیہ ص:۹ (٦) جمال قاسمی ص:۹ (۷) سوانح قاسمی جلد ۲ ص:۹

''میں نے ایک بار پھر تمام پہلوؤں پر غور کیا اور جمعیۃ العلماء کے چند مقتدر اور قابل اعتماد بزرگوں سے مل کر میں نے یہ اطمینان بھی حاصل کیا کہ جس نیت سے میں آزادی کی موجودہ تحریک میں شریک ہونا چاہتا ہوں وہ بہر صورت جائز اور مستحسن ہے۔ یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد اس میں اللہ کا نام لے کر آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو گیا ہوں۔ اگر میں نے صحیح راہ اختیار کی ہے تو اللہ مجھے استقلال عطا فرمائے اور اگر غلط راہ ہے تو اللہ مجھے ہدایت فرمائے۔''

مہاتما گاندھی کی تحریک سول نافرمانی کا آغاز ہوتے ہی شفیق صاحب نے مٹیا محل کو اپنی سرگرمیوں کا مخفی مرکز بنالیا۔ وہ دن بھر خدمت میں مصروف رہتے اور رات میں مکتبہ جامعہ اور جامعہ پریس میں کاپیوں کی تصحیح کرتے۔ وہ کانگریس کے بلیٹن کے حصے اردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے اس لیے ان کا کام خاصہ اہم ہو گیا تھا۔ جب پولیس کی گولیوں سے زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال کی نگرانی بھی شفیق صاحب کے ذمہ ہو گئی۔ انھوں نے اردو بلیٹن میں پُر جوش مضامین قلمبند کیے، رہنماؤں کے خطبات اور تقریروں کو جگہ دی اور ملک و قوم کو حکومت کی عیاریوں سے آگاہ کیا۔ اس بلیٹن کی پیشانی پر لکھا جاتا تھا کہ ''بغاوت کرنا ہمارا پیدائشی حق ہے۔'' کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا تھا اس لیے پولیس اس بلیٹن کے ایڈیٹر کو بھی تلاش کرتی رہی اور ہر جگہ چھاپے مار کر پتہ چلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام ہوئی۔ شفیق صاحب نے جگہ جگہ پہنچ کر تحریک کے لیے رضا کاروں کی بھرتی کی، انھیں ستیہ گرہ کے لیے تیار کیا اور ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے غیر قانونی جماعت ہونے کے باوجود اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کا اجلاس دہلی میں منعقد کرنے کے سلسلے میں عملی اقدامات کیے۔ ٹرکوں کو یک جا کر کے ان سے اسٹیج کا کام لیا گیا اور اجلاس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ لاہور کانگریس کی آزادیٔ کامل کی قرارداد پاس کی گئی اور عہد نامہ دہرایا گیا، بلیٹن کی کاپیاں تقسیم کی گئیں اور جب تک پولیس وہاں پہنچی اجلاس اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں لیکن شفیق صاحب بچ نکلے تاہم اجلاس کے تیسرے روز انھیں چاندنی چوک سے گرفتار کر کے دہلی جیل لے جایا گیا اور چھے

ایسے مسائل جن کا تعلق کسی نہ کسی درجہ میں اعتقادیات سے ہے ان کے بارے میں بھی اپنی یہی روش بیان فرماتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جسم ناسوتی کے ساتھ اپنی قبر اطہر میں زندہ ہیں یا نہیں یہ دور قدیم سے بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے، اس مسئلہ کو حیات النبی کے عنوان سے جانا جاتا ہے، الامام النانوتوی نے اس مسئلہ پر "آب حیات" جیسی فکر انگیز ایمان افروز کتاب تصنیف فرمائی ہے، لیکن وہ حیات النبی کے عقیدہ کو ضروریات دین میں شامل نہیں سمجھتے، اس لئے اس کے بارے میں زیادہ بحث واصرار کو پسند نہیں فرماتے حیات النبی کے موضوع پر اپنے ایک مکتوب کے آخر میں رقم طراز ہیں:

> "زیادہ کیا عرض کروں ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ یہی ہے اور میں جانتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں نہ منکروں سے دست وگریباں ہوتا ہوں، خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا، کوئی پوچھتا ہے اور اندیشۂ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں دریغ بھی نہیں کرتا آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے فقط" (۸)

فقہی ذوق ومزاج

الامام النانوتوی فقہی امور میں بڑا معتدل نقطۂ نظر رکھتے تھے، درساً اور عملاً حنفی تھے بحث وتحقیق کی روشنی میں مذہب حنفی کو راجح سمجھتے تھے لیکن دوسرے ائمہ مسالک اور فقہی مذاہب کا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے، ان کی ذات تعصب اور جارحیت سے پاک تھی، اختلافی مسائل پر ان کا قلم بڑی احتیاط اور متانت کے ساتھ چلتا ہے، ان کے شاگرد رشید مولانا حکیم محمد منصور العلی مرادآبادی رقم طراز ہیں:

> "عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے" (۹)

نرے مقلد اور لکیر کے فقیر نہیں تھے، احکام کے دلائل اور مصالح وحکم پر گہری نظر تھی، احکام شریعت کے مدارج ومراتب سے بخوبی واقف تھے، اس لئے طبیعت ومزاج میں کافی توسع تھا، بعض مسائل میں ان کا نقطۂ نظر فقہ حنفی کے عمومی نقطۂ نظر سے مختلف تھا، دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ میں ان کے یہاں عام علماء احناف کی سی شدت نہیں تھی، اس مسئلہ پر ان کا ایک مکتوب بڑا مجتہدانہ اور

---

(۸) لطائف قاسمیہ ص: ۵ (۹) مذہب منصور جلد ۲ ص: ۱۹۳۔

ماہ کی سزا کا حکم سنا کر پہلے دہلی اور پھر لائل پور جیل میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے ان کی رہائی اسی وقت عمل میں آئی جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن پیکٹ پر دستخط ہو گئے۔ رہا ہوتے ہی شفیق صاحب جامعہ پہنچے جہاں ان کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ انہوں نے تقریر میں جیل کے تجربات بیان کیے اور کہا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو جیل کی زندگی میں اپنے آپ کو بہت با قاعدہ بنا سکتا ہے۔

جامعہ مستقل مالی بحران کا شکار رہتی تھی اور تحریکات کے سبب دیسی ریاستوں سے بھی اس کی امداد بند ہو جایا کرتی تھی۔ جامعہ کے ان مالی مسائل کو حل کرنے کی غرض سے شفیق صاحب نے ''شعبۂ ہمدردانِ جامعہ'' قائم کیا اور اس کے تحت یہ طے کیا کہ جو لوگ چار آنے، آٹھ آنے، روپیہ، دو روپیہ، یا اس سے زیادہ رقم ماہوار دیں گے انھیں ''حلقۂ ہمدردانِ جامعہ'' کا رکن بنایا جائے گا۔ چندہ دینے والے لوگوں کو جامعہ کے حالات اور کاموں سے باخبر رکھنے اور وصول شدہ رقوم کا حساب کتاب ہمدردان جامعہ کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے شفیق صاحب نے ''ہمدرد جامعہ'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس طرح شفیق صاحب کی سوجھ بوجھ سے جامعہ کسی حد تک مالی مشکلات کے شکنجے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں شفیق صاحب نے ہمدردان جامعہ سے علاحدگی اختیار کر کے جامعہ میں ایک نیا شعبہ ''ادارۂ تعلیم و ترقی'' قائم کیا۔ یوں تو اس کا ابتدائی کام مدرسہ شبینہ کے نام سے ۱۹۲۲ء سے جاری تھا جو صرف اَن پڑھ بچوں اور ناخواندہ بڑوں کو پڑھانے تک محدود تھا لیکن اب یہ کام مدرسہ شبینہ تک محدود نہ رہ کر بالغوں کی تعلیم تک وسعت پا گیا۔ دراصل شفیق صاحب چاہتے تھے کہ تعلیم کے ذریعہ لوگوں میں ایسی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے کہ وہ باہمی طور سے سماجی بھلائی کا کام کر سکیں، ان کے اندر ترقی کی راہیں تلاش کرنے اور اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا جذبہ بیدار ہو اور ان میں سماجی قدروں کو سمجھنے اور انھیں قبول کرنے کی صلاحیت اور اہلیت پیدا ہو سکے۔ اپنے ان مقاصد کو عملی شکل دینے کی غرض سے شفیق صاحب نے تختیوں پر لگے ہوئے مستقل اعلانوں کے ذریعہ قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کی تعلیمات کو عام کرنے کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کم قیمت کتابچوں کے ذریعہ مذہبی، معاشی، اور سیاسی امور میں رائے عامہ کی تربیت کا پروگرام بنایا۔ دیواری

انتہائی فکر انگیز ہے، نماز جمعہ کے لئے شہر ہونے کی شرط پر انہوں نے تفصیلی کلام کیا ہے، ان کا یہ مکتوب اپنے ایک معاصر بزرگ مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی کے استفتاء کے جواب میں ہے، الامام النانوتوی نے اپنے ایک معاصر مولانا عبدالسلام کو جن بلند الفاظ میں یاد کیا ہے، اس سے ان کے اخلاص، تواضع بلند اخلاقی کی پھواریں پھوٹتی ہیں، لکھتے ہیں:

''حضرت مجمع البحرین شریعت وطریقت، مخدوم ومطاع خاص وعام جناب مخدومنا مولانا سید عبدالسلام صاحب دامت برکاتہ''(۱۰)

خلاصہ بحث

الامام النانوتوی کی خدمات کا اصل میدان علم کلام تھا، انہوں نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے علم کلام کی بساط بچھائی، آریہ سماجیوں اور عیسائی پادریوں کی تشکیکات اور دسیسہ کاریوں کا مقابلہ کیا اسلام کی حقانیت عالم پر آشکارا کی، شیعی فتنہ کا علمی سطح پر بھر پور مقابلہ کیا، فقہ اسلامی کے موضوع پر ان کی تحریریں چند رسائل اور چند مکتوبات تک محدود ہیں لیکن ان کی یہ فقہی تحریریں بھی کافی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور فقہ کے اختلافی موضوعات پر اظہار رائے کا ایک خاص معتدل ومتوازن طریقہ سکھاتی ہیں۔

الامام النانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کا نصاب مرتب کرنے میں اس بات کا خیال رکھا کہ فقہ اسلامی کا رشتہ کتاب وسنت سے خوب مضبوط ہو اور اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا مزاج پیدا ہو فقہ کا علم محض جزئیات یاد کرنے تک محدود نہ رہ جائے بلکہ اجتہاد کے سرچشموں تک پہنچا جائے اور فقہ اسلامی کے کارواں کو آگے بڑھایا جائے۔

(۱۰) لطائف قاسمیہ ص:۲۶۔

اخباروں کے ذریعہ روزمرہ کے حالات سے لوگوں کو واقف کرانے، ماہانہ جلسوں کا اہتمام کرانے، ڈراموں کے ذریعہ سماجی حالات کی اصلاح کرنے، گشتی کتب خانوں کے ذریعہ لوگوں میں پڑھنے کے شوق کو رواج دینے اور شبینہ مدرسوں میں درس دینے کا وسیع پروگرام مرتب کیا۔

شفیق صاحب کی شب و روز کی محنت کام آئی۔ انھوں نے قرول باغ میں ایک تعلیمی مرکز قائم کیا جس میں ایک وال پیپر کی روزانہ اشاعت عمل میں آئی، نقشوں اور تصویروں کی نمائش لگائی گئی۔ گشتی کتب خانے جاری ہوئے اور معلوماتی لٹریچر تقسیم ہوا۔ ریڈیو سے خبریں اور تقریریں سننے کا انتظام ہوا، شام کی کلاسیں شروع ہوئیں، ڈرامے کھیلے گئے، کھیلوں اور اسکاؤٹنگ کا انتظام ہوا۔ ان کے علاوہ بے شمار ایسے کام ہوئے جو ادارہ کے مقاصد کی تکمیل کرتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں مہاتما گاندھی نے "بھارت چھوڑو" تحریک سے متعلق قرارداد کے منظور ہوتے ہی حکومت نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں اور سبھی سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے مختلف مقامات پر مقید کر دیا اس زمانہ میں شفیق صاحب ادارہ تعلیم و ترقی کی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان کی مصروفیتوں اور تعمیری کاموں کے پیش نظر گاندھی جی نے انھیں اور ان جیسے افراد کو جیل سے دور رہنے کی صلاح دی اس لیے شفیق صاحب نے بھی گرفتار ہو کر جیل جانا مناسب نہ سمجھا تاہم انھوں نے اس تحریک میں انفرادی طور سے شرکت کی اور وہ "باغی" کے نام سے مختصر ہینڈ بل چھپوا کر انھیں باقاعدہ عوام میں تقسیم کرتے رہے تاکہ حکومت کے خلاف رائے عامہ ہموار ہو سکے۔ یہ ہینڈ بل پولیس کے جوانوں، فوجی سپاہیوں اور دوسرے ہندوستانیوں کے نام پیغام کی شکل میں چھاپے جاتے تھے اور انھیں بغاوت پر اکساتے تھے۔ ان ہینڈ بلوں کی اشاعت ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو شفیق صاحب ادارہ تعلیم و ترقی اور سماجی تعلیم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے اگرچہ وہ فسادیوں کی دست برد سے نہیں بچ سکے۔ تاہم وہ کسی طرح جان بچا کر قرول باغ سے نکل آنے میں کامیاب ہو گئے جہاں مکتبہ جامعہ اور شفیق صاحب کی سرگرمیوں کے مراکز نذر آتش کر دیے گئے تھے۔ یہاں سے

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی*

دینی مدارس کا نصاب تعلیم
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نقطہ نظر

دینی مدارس، اشاعت علم اور حفاظت دین کے مراکز ہیں، اسلامی افکار اور دینی اقدار کے احیاء وبقاء میں ان درسگاہوں اور اُن کے بلند نگاہ فضلاء اور علماء نے جو بے مثال کردار ادا کیا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نگاہِ انصاف کے لیے مہر نیم روز سے کم نہیں، ان مدارس کا بنیادی مقصد دینی علوم کی اشاعت اور اسلامی اخلاق واقدار کے حامل، صالح معاشرہ اور سماج کی تشکیل ہے، اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ اسلام کا رشتہ علم سے بہت گہرا اور مضبوط ہے، قرآن مجید کی سب سے پہلی وحی، اسی نسبت سے نازل ہوئی اور اس نے ظلمت وجہالت سے بھری دنیا میں علم کی اہمیت کو واضح کیا اور اس علم کے مراکز چونکہ دینی مدارس ہیں، علوم نبویؐ کی میراث یہیں سے تقسیم ہوتی ہے اور دین وشریعت کی رہنمائی انہی درسگاہوں سے ملتی ہے، اس لیے علم اور تعلیم کی نسبت سے ان مدارس سے ربط وتعلق اور ان کے تعلیمی وفکری سفر سے واقفیت، ہماری دینی وعلمی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

کسی بھی دانش گاہ کے لیے نظامِ تعلیم وتربیت کے ساتھ نصاب تعلیم کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اسی لیے ہر زمانہ میں تعلیم سے وابستہ افراد اور تعلیمی اداروں نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس کی اثر انگیزی، زمانہ وحالات کے تقاضوں سے اس کی ہم آہنگی اور فعالیت کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامِ تعلیم میں نصابِ تعلیم کے علاوہ اساتذہ کے طریق تدریس اور درسگاہ کے عمومی تعلیمی وتربیتی ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ نصاب تعلیم سے علمی وفکری جہت متعین ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ مختلف علوم وفنون میں طلبہ کی صلاحیتوں کو علمی وتحقیقی رُخ دیا جاسکتا ہے۔

---

* مقیم حال شکاگو، امریکا

انھوں نے اوکھلا میں جامعہ ملیہ کی عمارت میں پناہ لی لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھلتی رہی۔ اس سلسلے میں ان کے رفیق خاص گوپی چند ناتھ امن رقمطراز ہیں کہ ”میں سراسیمگی کے عالم میں ان سے ملنے پہنچا تو دیکھا کہ وہی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل رہی ہے جو مصائب کے کامیاب مقابلہ کرنے والوں کی روایتی علامت ہے۔ اپنے سامان لٹنے کا حال اس طرح بیان کیا گویا کوئی مزاحیہ افسانہ سنا رہے ہوں۔ مجھے اظہار ہمدردی کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔“ انھوں نے اپنے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ بقول بیگم شفیع قدوائی ”انھیں نہ مال واسباب کی فکر تھی نہ پاکستان جانے کی، نہ وہ ہندوؤں کو گالی دیتے تھے نہ مسلمانوں کے ساتھ نوحہ خوانی کرتے تھے۔ ان کے دل پر تو شہر کی بربادی، ملک کی تباہی جامعہ کے نقصان اور انسان کے تنزل کی چوٹ تھی اگر کوئی فکر تھی تو مصیبت زدوں کی امداد کی' جامعہ کی اور اہل جامعہ کی“ ان اقتباسات سے اس حقیقت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تقسیم کے نتیجہ میں رونما ہونے والے تلخ واقعات کسی طرح شفیق صاحب پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ وہ پرانے قلعہ، ہمایوں کے مقبرے اور پناہ گزینوں کے کیمپوں کا پیدل گشت کرتے رہے اور لوگوں کے دلوں اور چہروں سے مایوسی، محرومی، ناامیدی اور اضمحلال کے آثار دور کرنے میں مصروف رہے۔ بعد ازں وہ رفیع احمد قدوائی کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ان دنوں اپنی سرگرمیوں کے بارے میں بیگم شفیق کو ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ:

> ”...بس رفیع صاحب کے گھر پورا دن بھی گزر جاتا ہے اور رات بھی اور رفیع صاحب کی وجہ سے یہاں بھی مجھے کچھ نہ کچھ خدمت کا موقع مل گیا ہے۔ بس یہیں بیٹھے بیٹھے رفیع صاحب کے ذریعہ اور ان کی عنایت سے کچھ کام کرتا ہی رہتا ہوں۔ دوڑ دھوپ کے کام کے لیے اب ہم لوگوں کے واسطے ان حالات میں زیادہ گنجایش نہیں۔... جب تک مجھے یہاں کے حالات کی طرف سے اطمینان یا یکسوئی نہ ہو جائے اس وقت یہاں سے چلے جانا میرے لیے مناسب ہے اور نہ میری کمبخت طبیعت اس کے لیے مائل ہوسکتی ہے... ممکن ہے کہ

نصاب تعلیم کا تعلق صرف درسگاہ اور اس میں پڑھنے اور پڑھانے والوں سے نہیں، بلکہ اس کا ربط اس زندگی سے ہے، جو ہمہ وقت رواں، دواں اور ہر آن تغیر پذیر ہے اور زندگی کے ان تقاضوں سے ہے، جو حالات اور زمانہ کی حکمت و مصلحت کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں، انبیائی دعوت اور پیغمبرانہ معجزات میں بھی زمانہ کے تقاضوں کی بھرپور رعایت ہوتی ہے، غور کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر اور جادوگری کا فن عروج پر تھا، اسی مناسبت سے "عصاء موسوی" کو معجزانہ حیثیت حاصل ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب وعلاج اور میڈیکل سائنس ترقی پذیر تھی، اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کو مطابق حال وزمانہ وہ معجزات دیئے گئے، جن سے آیت ربانی کا ظہور رہوا، نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زبان وقلم اور عربوں کی فصاحت وبلاغت کا غلبہ تھا، چنانچہ "قرآن مبین" کو "عربی مبین" میں اتارا گیا اور دنیا قرآن مجید کے علمی ومعنوی اعجاز اور اس کے کلام وبلاغت کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہی، بلکہ حقیقت پسند عربوں نے تو اعتراف بھی کیا کہ: ماھذا قول البشر یہ انسانی کلام نہیں، ربانی کلام ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت میں بھی حالات زمانہ کی اتنی رعایت ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی مزاجی خصوصیات، نفسیات اور عادات واطوار کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے ہیں اور قرآن مجید میں اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہر وہ شخص واقف ہے، جو نبیوں کی دعوت کے اسلوب سے واقفیت رکھتا ہو، ایک طرف نبیؑ کا رشتہ اپنے رب سے ہوتا ہے، تو دوسری طرف اس کی نگاہ زمانہ کے احوال پر ہوتی ہے، وہ وقت کے تیور کو پہچانتا اور حالات کی نبض تھامتا ہے اور اپنی نگاہ حق شناس اور دل حکمت آشنا سے عصری تقاضوں کو محسوس کرتا ہے، پھر اپنی قوم کے سامنے "علم الٰہی" کی وہ قیمتی متاع رکھتا ہے جس سے قوم اپنے درد دل کا علاج اور اپنی ضروریات کا نسخۂ کیمیا پائے، انبیائی دعوت کے اس تذکرہ سے مقصود یہ ہے کہ ہماری درسگاہیں جب علوم نبویؐ کی محافظ وامین ہیں اور علماء میراث نبوت کے وارث ہیں، تو ان درسگاہوں کو بھی پیغمبروں ہی کی طرح اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ اور ان سے وابستہ علماء کو زمانہ شناس اور روشن دماغ ہونا چاہیے۔

نصاب تعلیم کی اہمیت وافادیت اور اس میں تقاضائے زمانہ کی رعایت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا:

اس عرصہ میں یہاں کے ہزاروں اور لاکھوں پریشان حالوں
میں سے کسی ایک کی کوئی چھوٹی سی خدمت کا مجھے موقع مل
جائے۔“

بارہ بنکی میں گھر والوں کے اصرار کے باوجود انھوں نے دہلی نہیں چھوڑا اپنی خانہ بربادی کے عالم میں بھی انھیں جامعہ اور اہل جامعہ ہی کا خیال رہا اپنے ایک خط میں بیگم شفیق کو انھوں نے لکھا کہ:

”...اس وقت جامعہ کے ڈیڑھ دو سو آدمیوں کو جو جامعہ نگر میں
مورچہ جمائے بیٹھے ہیں ان کو وہاں چھوڑ کر میں گھر کیسے چلا
آؤں! سب میرے ساتھی ہیں۔ اسی لیے مجھے انھیں کے ساتھ
رہنا چاہیے رفیع صاحب کے یہاں اس لیے ٹھہر گیا ہوں کہ
قرول باغ اور شہر کے حالات معلوم کرتا رہا ہوں اور جن چیزوں
کی ذمہ داری مجھ پر تھی اس کی فکر میں ہر وقت رہتا ہوں اور
یہاں بیٹھے بیٹھے جو کچھ ممکن ہے کرتا رہتا ہوں۔ قرول باغ کی
طرف سے یکسوئی ہو جائے گی تو پھر جامعہ نگر مجھے جانا ہے تاکہ
اب وہاں جو کچھ بھی بچ گیا ہے اس کی حفاظت کے لیے جو کچھ
بن پڑے میں بھی کروں۔“

غرضیکہ بے پناہ خطرات کے باوجود وہ ہندوؤں اور شرنارتھیوں کی خدمت میں مصروف رہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اعتماد کی شمع روشن کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ایسے تعلیمی مراکز قائم کیے جہاں شرنارتھی اور مسلمان بچے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔

حالات معمول پر آنے کے بعد شفیق صاحب نے سوشل ایجوکیشن کے فروغ اور خواندگی کو عام کرنے کے سلسلے میں اپنی سرگرمیاں پھر شروع کر دیں۔ انھوں نے ناخواندگی کو جڑ سے مٹا دینے کی مہم کا آغاز کیا۔ انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ تعلیم بالغاں سے متعلق انجمنوں، تنظیموں اور ایجنسیوں کی ڈائریکٹری مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا اس کے ایک ماہانہ خبر نامہ

''نصاب تعلیم کے سلسلہ میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، آغاز اسلام سے لے کر اس وقت تک نظام تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ منہاج تدریس و تعلیم میں وقت کے تقاضوں اور زمانہ کی ضرورتوں کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے، علماء سلف وقت کے سب سے بڑے نبض شناس تھے، ہر زمانہ میں اسلام کی خدمت اور امت محمدیہ کے فلاح دارین کے پیش نظر انھوں نے اپنے نصاب تعلیم میں تغیر و ترمیم کی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، کیونکہ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں سے مراسلات اور معاہدوں کے سلسلہ میں عربی زبان کے علاوہ دوسری زبان اور دوسرے رسم الخط جاننے کی ضرورت پڑتی تھی، آپؐ نے ایک مرتبہ خطوط و معاہدوں کے باب میں عیسائیوں اور یہود کے متعلق خطرہ ظاہر فرمایا کہ یہ کہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کردیں، اسی طرح ایک مرتبہ تورات کے ایک حکم کو ایک یہودی عالم نے آپ کے سامنے اپنے ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی، تو آپؐ نے فرمایا کہ عبرانی زبان سیکھ لو، تاکہ یہ دین کے معاملہ میں مسلمانوں کو فریب نہ دے سکیں، خود صحابۂ کرام نے عبرانی وسریانی اور دوسری زبانیں سیکھی تھیں۔

ہر زمانہ میں علماء اسلام نے دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم سیکھے تھے۔ عہد عباسی میں جب منطق و فلسفہ اور طب و نجوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور مختلف عقائد رکھنے والی قوموں نے اسلام قبول کیا تو دشمنانِ اسلام اور نومسلم قوموں کے بعض ذہین افراد، اسلامی عقائد پر فلسفیانہ اعتراض کرنے لگے، مسلمانوں نے ان جدید علوم کو پڑھ کر اسی ہتھیار سے عقائد اسلام کی مدافعت شروع کردی اور اس طرح علم کلام کی بنیاد پڑی اور اس زمانہ سے لے کر آج تک منطق و فلسفہ اور علم کلام ہمارے نصاب تعلیم کا جزبن گئے۔

علماء سلف کی روشن دماغی، زمانہ شناسی اور وقت کے تقاضوں سے کامل واقفیت کی اس سے بہتر دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ یونانی منطق اور یونانی علم الاصنام (میتھالوجی) کو جسے ہمارے قدیم مدرسوں میں فلسفہ کہا جاتا ہے، دینی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں داخل کیا، بلاشبہ اس زمانہ میں اسلام کی خدمت کا تقاضا تھا۔ اب عقائد اسلام پر نہ وہ اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں، نہ ان کے جوابات کی ضرورت باقی رہی، نہ آج وہ فرقے باقی ہیں، نہ ان کا زور و شور ہے، نہ ان کے

کی اشاعت کا انتظام کیا اور ہر سال ایک قومی سیمنار کے انعقاد کی روایت قائم کی وی، ایس، ماتھر کے الفاظ میں ''شفیق صاحب اپنی تمام عمر معلّم رہے۔ تعلیم کے میدان میں جس جس کارکن سے وہ ملے یا انھوں نے تعلقات رکھے، ہمیشہ اس کی تعلیم و تربیت پر نظر رکھی۔'' یہی سبب تھا کہ انھوں نے سماجی تعلیم میں دلچسپی لی۔ ان کے نزدیک سوشل ایجوکیشن کا مفہوم ان لوگوں کے اندر ایک ذہنی انقلاب لانے کے لیے تمام عمر کا ایک عمل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے تعلیم بالغاں کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ اس مشن میں کامیابی کے لیے وہ حکومت اور نجی تعلیمی اداروں کے مابین تعاون کو ضروری سمجھتے تھے۔ آزاد ہندستان کی حکومت اور تعلیم سے متعلق پالیسی کے پیش نظر انھوں نے آل انڈیا ایڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے حیدرآباد میں کہا:

> ''...ایک جمہوری ریاست کے بالغوں کی زندگی بھر کی تعلیم کا پورا بوجھ دنیا کی کوئی جمہوری حکومت تنہا اپنے سر پر نہیں اٹھا سکتی۔ یہ بوجھ جمہور ہی کو بالآخر خود اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا مگر ظاہر ہے کہ اس وقت ہم میں اس بوجھ کے اٹھانے کا نہ تو شعور پیدا ہوا ہے اور نہ سکت اور طاقت ہے۔ اس لیے دوراندیش حکومت کا یہ فرض ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خدمت کا جذبہ رکھنے والے، پرجوش اور پُرخلوص کارکنوں اور نجی اداروں کی سرپرستی کرے۔ ان کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار کرے ان کو سہارا دے، ان کو مدد دے اور ان کے کام کی بس اس حد تک نگرانی کرے جو تھوڑا سا ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ان پر ایسی پابندی عائد نہ کرے جو ان کی اپج اور جوش عمل کو کچل کر رکھ دے۔''

تعلیم بالغاں کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے سبب شفیق صاحب کو یونیسکو کے فنڈامینٹل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے انڈونیشیا بھیجا گیا وہاں بھی انھوں نے قابل قدر کام کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یورپ کے بعض ملکوں کا سفر کیا اور اپنے اخلاق اور حسن کارکردگی کی داد پائی لیکن وہ انڈونیشیا میں خوش نہیں رہے۔ وہ عملی طور پر

عقائد کی اشاعت کا اب خطرہ باقی ہے، اب جدید علم کلام کی ترتیب کی ضرورت ہے، اب سیاسیات واقتصادیات کی راہ سے اسلام پر جو اعتراض کیا جارہا ہے، اس کے رد کرنے کی ضرورت ہے''۔(۱)

کسی بھی درسگاہ کے نصاب تعلیم کی ترتیب میں دقت نظری اور دوربینی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں معمولی چوک اور غفلت سے نہایت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ اس قدر نازک ذمہ داری ہے کہ اس نصاب کو پڑھنے والی پوری نسل کے ذہنی ارتقاء اور فکری تعمیر کا دارومدار اسی پر ہے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے نصاب تعلیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا طور پر یہ تبصرہ فرمایا:

''نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس پر رواداری کے ساتھ کوئی رائے قائم کرلی جائے، یا کسی عجلت اور جذباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کردیا جائے۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملاً ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے، حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاء، اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سرجوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج ہوتا ہے، اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی علمی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جاسکتا، نصاب تعلیم اس ماحول کا علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے اور اس کی ایک روح ہوتی ہے، جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کو جمع کردینے اور پڑھائی جانے والی چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت، یا کسی علمی گروہ کی اپنی ضروریات کے احساس، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے۔''

مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھنویؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے ہندوستان کے نصاب درس اور اس کے تغیرات کا باریک بینی اور دقت نظری کے ساتھ علمی اور تاریخی جائزہ لیا ہے اور قدیم

---

(۱) تعمیر حیات ۲۵؍مارچ و ۲۵؍اپریل ۱۹۸۴ء

کام کرنے کے عادی تھے اور بناوٹ اور دکھاوے کے قائل نہیں تھے اسی لیے انھوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "میں جلد از جلد وہاں سے بھاگنے والا ہوں اس لیے کہ اس قسم کی بے بنیاد اور بناوٹی تنظیم کے ماتحت کام کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے دہلی میں اتنے عرصے تک بالغوں کی تعلیم کا جو کام کیا ہے اس سے مجھے تجربہ ہوا ہے کہ اس میدان میں کتنی محنت اور خلوص سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور کتنی مدت تک۔ میں جانتا ہوں کہ اس میدان میں کام کرنے والے کے لیے کتنے مضبوط کردار کی ضرورت ہے، ایسے کردار اور کیریکٹر کی جو اپنے کام کے متعلق خلافِ واقعہ پروپیگنڈہ سے خوشی اور اطمینان محسوس نہ کرے۔ اگر میں انڈونیشیا میں کچھ دن اور رہ گیا تو میرے کردار کی یہ خصوصیتیں ختم ہو جائیں گی۔"

ہندستان سے باہر رہ کر بھی وہ جامعہ کی جانب سے متفکر رہا کرتے تھے۔ انڈونیشیا جاتے وقت انھوں نے اپنے بیٹے صدیق الرحمٰن قدوائی کو، جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے، ہدایت کی تھی کہ وہ پابندی کے ساتھ انھیں خط لکھتے رہیں۔ چنانچہ صدیق صاحب نے ایک خط میں جامعہ کا ذکر بھی کر دیا جس سے اس ادارہ کی خامیوں کی نشاندہی ہوتی تھی۔ شفیق صاحب کو جامعہ کے بارے میں اس قسم کے اظہار خیال سے تکلیف پہنچی اور انھوں نے اپنے جواب میں طنزاً لکھا:

> جامعہ کی بدانتظامیوں کو کہاں تک شمار کروگے۔ جامعہ کی وجہ سے دیکھو کوریا میں اُدھم مچا ہے۔ اور کوریا کیوں۔ جاؤ دیکھو ہندستان میں کیا کیا تباہیاں ہو رہی ہیں۔ اور یہاں جنوب مشرقی ایشیا کا حال مجھ سے پوچھو اس میں بھی مجھے جامعہ کی بدانتظامیوں کی جھلک نظر آتی ہے لیکن خدا کرے کہ جامعہ کی تمام بدانتظامیوں کے باوجود تم اس سال ضرور پاس ہو جاؤ۔ تصویریں، نوٹ بک اور ٹکٹ صرف تمھارے لیے بھیج رہا ہوں۔ عتیق میاں کو الگ بھیجوں گا ورنہ تمھارا کیا ٹھکانا، ان کا حصہ بھی کھا جاؤ اور پھر اس کا الزام بھی جامعہ کے سر منڈھ دو..."

۱۹۵۲ء میں آزاد ہندستان میں پہلے عام انتخابات ہونے والے تھے لہٰذا دہلی

ہندوستانی نصاب کے چار ادوار قرار دیئے ہیں:

دور اول: اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا، کم وبیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی، صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح اور اصول بزدوی، تفسیر میں مدارک، بیضاوی اور کشاف، حدیث میں مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ (یعنی مشکوۃ المصابیح کا متن) ادب میں مقامات حریری، جو زبانی یاد کی جاتی تھی، اُس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا، حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آ جاتی تھی وہ ''امام الدنیا فی الحدیث'' کے لقب کا مستحق ہو جاتا تھا۔

دور دوم: نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ نے سابقہ معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکا کی کی ''مفتاح العلوم'' نصاب میں داخل کیں اور بہت جلد یہ کتابیں متداول ہو گئیں، یعنی دور اول میں جو کتابیں تھیں، اس میں اس دور کی مذکورہ بالا کتابیں یعنی مطالع و مواقف اور ان کی شرحیں، مطول، مختصر، تلویح، شرح عقائد، شرح وقایہ، شرح جامی کا اضافہ کر لینے سے دور دوم کے نصاب کی فہرست بہ آسانی مرتب ہو جاتی ہے۔

دورِ سوم: دورِ دوم کے نصاب درس میں جو تغیر ہوا تھا، اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیار فضیلت کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنی ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۴ھ) جو اس دور کے سب سے آخر مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے نے درسیات میں مفید اضافہ کیا، شاہ صاحب اور ان کے اخلاف نے صحاح ستہ کے درس و تدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزو نصاب بنایا۔ شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا، مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درسگاہوں میں منطق و حکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کان و زبان آشنا ہو رہے تھے، نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانہ میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا، اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا۔ مغل دربار کے ایرانی علماء اور امراء کے ذریعہ منطق اور فلسفہ کو جو شروع ہی سے ایران میں معیار فضیلت سمجھے جاتے تھے، آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت

اسٹیٹ اسمبلی کے لیے ریاستی کانگریس کمیٹی نے شفیق صاحب کو اپنا امیدوار نامزد کیا لیکن اُن دنوں وہ انڈونیشیا میں قیام پذیر تھے تاہم کانگریس کمیٹی نے ان کے کاغذات نامزدگی نامور ماہر تعلیم وی۔ ایس۔ ماتھر کے سپرد کردیے جو یونسکو کی ایشائی علاقائی کانفرنس میں شرکت کے لیے بنکاک جارہے تھے اس میں شرکت کے لیے شفیق صاحب بھی انڈونیشیا سے وہاں پہنچنے والے تھے۔ جب ماتھر صاحب نے انھیں کانگریس کمیٹی کے فیصلہ سے آگاہ کیا اور ان سے کاغذات نامزدگی پر دستخط کرنے کی درخواست کی تو وہ ٹال گئے ماتھر صاحب کے بار بار درخواست کرنے کے باوجود وہ انکار کرتے رہے۔ انھوں نے ماتھر صاحب سے کہا کہ ''میں کم وبیش ایک سال اپنے وطن سے باہر رہا ہوں۔ مجھے واپس جاکر بہت سے نامکمل کام پورے کرنے ہیں مگر آپ حضرات ہیں کہ مجھے اس کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے اور مجھے خواہ مخواہ سیاست میں دھکیل کر میرا وقت برباد کرنا چاہتے ہیں اور سب سے زیادہ حیرت اور مایوسی کی بات تو یہ ہے کہ آپ بھی اس مسئلے میں مجھ سے ضد کررہے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ کم سے کم آپ تو جانتے ہیں کہ میرے لیے کون سا کام زیادہ ضروری ہے'' ماتھر صاحب نے اپنے دلائل سے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے۔ ناچار ماتھر صاحب نے دہلی صوبائی کانگریس کے صدر چودھری برہم پرکاش کو بذریعہ تار مطلع کردیا کہ شفیق صاحب الیکشن میں حصہ نہ لینے پر بضد ہیں اور کاغذات نامزدگی پر دستخط کرنے سے انکار کرنے کے بعد جکارتا واپس جاچکے ہیں تو چودھری صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور جامعہ کے سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکرحسین سے رجوع کیا اور ان سے اصرار کیا وہ شفیق صاحب کو کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے تیار کریں چنانچہ ذاکر صاحب نے بذریعہ تار شفیق صاحب کو کاغذات پر دستخط کرنے کی تاکید کی۔ شفیق صاحب ذاکر صاحب کو اپنا مرشد سمجھتے تھے اس لیے مجبور ہوکر انھوں نے دستخط کرکے کاغذات دہلی بھیج دیے لیکن وہ الیکشن کے زمانے میں بھی دہلی سے باہر ہی رہے اور ۴؍جنوری ۱۹۵۲ء کو ممبئی پہنچے اور وہاں سے دہلی روانہ ہونے کے بجائے پونا چلے گئے اور جب ۱۴؍جنوری کو الیکشن ہوا تب بھی شفیق صاحب اس میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کے لیے دہلی میں موجود نہ تھے۔ تاہم جب ۲۱؍جنوری کو ووٹ شمار کیے گئے تو وہ کامیاب ہوگئے تھے۔ دراصل یہ ان کی بے پناہ مقبولیت، شہرت

حاصل ہوتی جاتی تھی، اس لیے شاہ صاحب کے نصاب کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا۔

دورِ چہارم: چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قائم ہوا۔ اس نصاب کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے، یہ شاہ صاحب کے ہم عصر تھے، لہٰذا ان کے زمانہ میں وہی کتابیں رائج تھیں جو شاہ صاحب کے نصاب درس میں تھیں۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارس عربیہ میں رائج ہے، وہ انھی کی یادگار ہے۔ انھوں نے تمام ہی فنون میں اضافے کیے، اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں قوت مطالعہ، دقت نظر، احتمال آفرینی اور قوت قریبہ پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲)

تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مراکز فکر قائم تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد۔ گو نصاب تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان کتاب وسنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا۔ علوم معقولہ کی حیثیت ثانوی درجہ کی تھی۔ لکھنؤ میں علماء فرنگی محل پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیثؐ میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیرآباد مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا اور یہ علوم اس قدر اہتمام کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

دارالعلوم دیوبند جسے گزشتہ صدی سے ام المدارس کی حیثیت حاصل ہے نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ ان کو ترقی دینے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے نصاب تعلیم میں ان تینوں مقامات کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا اور ان کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے وہی نصاب بالعموم مدارس عربیہ میں زیر درس ہے، بعض مدارس نے اپنے علاقے کے تقاضوں کے مطابق بعض فنون میں مفید کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں جہاں تک تعلق حضرت نانوتویؒ کی فکر کا ہے، تو جس طرح حضرت نانوتویؒ اپنے علم میں وسعت اور گہرائی رکھتے تھے، اسی طرح نصاب تعلیم کے

---

(۲) ملخصاً از رسالہ "ہندوستان کا نصاب درس" از مولانا حکیم سید عبدالحیؒ، مطبوعہ شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اور ہر دلعزیزی کا ثبوت تھا۔

ممبر اسمبلی منتخب ہو جانے کے بعد شفیق صاحب وزارت کے لیے نامزد کیے گئے لیکن انھوں نے وزیر بننے سے احتراز کیا۔ ان کی دلیل تھی کہ وزارت کی ذمہ داریاں انھیں اتنی آزادی نہیں دیں گی کہ وہ اپنے کاموں کو جاری رکھ سکیں تاہم وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی ذاتی درخواست پر انھوں نے وزارت میں شامل ہونا منظور کر لیا اور انھیں ۱۷ر مارچ ۱۹۵۲ء کو دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے حلف دلایا گیا محکمہ تعلیم کے ساتھ ہی انھیں ترقیات اور محنت کے محکمے بھی سونپے گئے بقول سوشیلا نائر دہلی کی کابینہ میں ان کا درجہ بڑے بھائی کا تھا۔ دہلی کی حکومت جن تین ستونوں پر کھڑی تھی وہ ان میں سے ایک مستحکم ستون تھے۔

شفیق صاحب ایک کامیاب وزیر ثابت ہوئے انھوں نے تعلیم کو عام کیا اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی سمت میں جدوجہد کی۔ انھوں نے سماجی تعلیم کے مشاورتی بورڈ میں دہلی کے تقریباً سبھی ماہرین تعلیم کو یکجا کر کے سماجی تعلیم سے متعلق اداروں کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔ انھوں نے اسکولوں میں بچوں کے داخلہ سے متعلق پالیسی مرتب کی۔ اس سلسلہ میں ان کا کہنا تھا کہ "ان اسکولوں میں بچوں کو کچھ پڑھایا لکھایا تو جاتا نہیں، لے دے کر اطمینان کا سامان صرف داخلہ رہ گیا ہے۔ پھر داخلہ نہ دے کر ان کی اتنی سی خوشی پر پانی کیوں پھیرا جائے" اس لیے انھوں نے احکامات جاری کر دیے کہ دہلی میں جو بچہ اسکول میں داخل ہونے کا متمنی ہے اسے داخلے سے محروم نہ کیا جائے۔ انھوں نے دیہاتوں میں تعلیم بالغاں کے لیے پندرہ روزہ اخبار "ہمارا گاؤں" شروع کیا اور اس کا شہری ایڈیشن "ہمارا شہر" جاری کیا۔ انھوں نے دلتوں کے لیے ہائی اسکول تک مفت تعلیم کی شروعات کی۔ اسی طرح انھوں نے ریاستی صنعت کو فروغ دینے کی غرض سے سرکاری اور غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ایک صنعتی مشاورتی بورڈ کی تشکیل کی اور شاپ اینڈ کمرشیل ایس ٹیب لش مینٹ ایکٹ (Shop and Commercial Establishment Act) کو دہلی اسٹیٹ اسمبلی میں نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔

وزارت کے دوران وہ اپنے کارکنوں میں اخوت کے جذبہ کو فروغ دیتے رہے۔ ان کے احکامات میں سختی اور سخت گیری نہیں ہوتی تھی بلکہ کارکن کو اپنے اندر جذب کر لینے

بارے میں بھی وہ وسیع الفکر اور فراخ چشم تھے، نصاب تعلیم کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ کی وہ تقریر، جو انھوں نے ۱۲۹۰ھ میں دار العلوم دیوبند کے جلسہ ''اعطاء اسناد و انعام'' میں کی تھی، نہایت اہم ہے اور اس سے ان کا نقطۂ نگاہ معلوم ہوتا ہے، ان کی وہ تقریر تاریخ دار العلوم دیوبند (جلد اصفحہ:۱۶۹) پر موجود ہے، آپ اگر مولانا نانوتویؒ کی اس تقریر پر ایک نظر ڈالیں تو یقیناً محسوس کریں گے کہ وہ حقائق و معارف سے لبریز ہے اور اس کے لفظ لفظ سے ان کی جہاں بینی، باخبری، روشن دماغی، مومنانہ فراست، دینی غیرت اور اسلامی حمیت کے ساتھ اسلامی معاشرت، اسلامی تہذیب، علوم دینیہ اور مقاصد شریعت کے تحفظ کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے، اپنے وقت کے حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں طلبہ و نوجوانوں کو مغربی فکر و تہذیب کی یلغار سے بچانے اور ان کے قلب و نظر کو مومنانہ اور داعیانہ روح سے بھرنے کے لیے انھوں نے ایک ایسے نصاب کو اختیار فرمایا، جس سے طلبہ میں علمی رسوخ، فقہی بصیرت، ذوق حدیث اور فہم قرآن کے ساتھ ساتھ تمام علوم دین و شریعت میں گہرائی پیدا ہو اور وہ دین کی اشاعت اور اسلام کی حفاظت، دونوں محاذوں پر اولوالعزمی، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کے ساتھ مصروف عمل رہ سکیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، جنھیں فکر قاسمی کا شارح و ترجمان کہا جا سکتا ہے، نے ''سوانح قاسمی'' میں حضرت نانوتویؒ کی اس تقریر کو نقل فرمایا ہے اور اس کے ہر ہر جملہ کی دل نشیں تشریح بھی فرمائی ہے اور اپنے قیمتی تبصرہ اور منفرد اسلوب تحریر سے اس تقریر کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کے کچھ حصے آپ کے سامنے پیش کروں، تاکہ مولانا گیلانی کی وساطت سے مولانا نانوتوی کی نصاب تعلیم کے بارے میں جو فکر تھی، اس سے ہم واقف ہو سکیں۔

دینی درسگاہوں میں جدید و قدیم علوم کا امتزاج کیوں اور کیسے ہو؟ یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے، مولانا نانوتویؒ نے اپنی تقریر میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس سے معلوم ہو جائے کہ در باب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں شامل نہیں کیا گیا؟''

مولانا گیلانی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

والی قوت ہوتی تھی۔ وہ مہاتما گاندھی کے اس اصول کے قائل تھے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرمی کا بنیادی مقصد تعمیر ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ حصول آزادی کے بعد شفیق صاحب کی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوگئی حیات اللہ انصاری کے لفظوں میں شفیق صاحب "پبلک کاموں کو بالکل ویسے ہی خلوص سے کرتے تھے جیسے کوئی شخص ذاتی کاموں کو کرتا ہے بلکہ جیسے کوئی شخص اپنے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ ان کے لیے پبلک کی خدمت کام نہیں بلکہ عبادت تھی۔ اسی وجہ سے نہ وہ کبھی تھکتے تھے اور نہ کوئی دشواری، کوئی دقت ان کے لبوں کی مسکراہٹ کو بجھا سکی۔" وزارت میں شمولیت سے پہلے وہ اپنی مختلف اسکیموں اور ارادوں کا ذکر کرتے رہتے تھے لیکن کابینہ کا رکن بن جانے کے بعد اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں تو جامعہ کے لیے اب بیکار ہو گیا ہوں۔"

اگرچہ شفیق صاحب نے ۱۷ر مارچ ۱۹۵۲ء کو پانچ سال کے لیے وزارت کا حلف لیا تھا لیکن ایک سال ہی گزرا تھا کہ وہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئے اور جب ان کی صحت کے لیے دعائیں کی جا رہی تھیں انھوں نے ۲ر اپریل ۱۹۵۳ء کو آنکھوں کو نمناک اور دلوں کو غمناک چھوڑ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی وفات پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے لکھا:

> "...شفیق صاحب ان جوشیلے نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے جامعہ کو قائم کیا اور اُن گنتی کے چند آدمیوں میں تھے جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھا۔ ہو سکتا تھا کہ جامعہ ایک سیاسی چال بن کر رہ جاتی۔ ایسا نہیں ہو پایا اور جامعہ ایک تعلیمی ادارہ، قومی تعلیم کی نئی تحریک کا ایک نمونہ، قوم پرست مسلمانوں کی آبرو بن گئی..."

شفیق صاحب کے چندہ جمع کرنے اور ادارۂ تعلیم و ترقی کے قیام کا ذکر کرنے کے بعد مجیب صاحب نے لکھا کہ:

> "...جامعہ سے انھیں نہ کوئی سرمایہ ملا نہ کوئی سامان۔ خود انھوں نے اس کا ارادہ کیا تھا کہ اپنا کام خود چلائیں گے اور جامعہ پر کسی طرح کا بار نہ ڈالیں گے۔ انھوں نے مختلف

''سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جدید علوم وفنون کے سوال سے، جو یہ باور کرلیا گیا ہے اور اب بھی یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افتراء یا اتہام کے سوا وہ کچھ نہیں، کم از کم دیوبندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار ہستیوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لیے تو یہی کافی ہے کہ اس طبقہ کے سب بڑے پیشوا سیدنا الامام الکبیر (حضرت نانوتویؒ) کے سامنے یہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت والا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو چاک کر کے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشمیوں کے مدعیوں کا گروہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟''

حضرت نانوتویؒ نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''من جملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہیے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔''

مولانا گیلانیؒ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

''مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں یا جماعتیں، ان کے اٹھان اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے مستحق اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں بلکہ چاہیے کہ وہی ہوں، جو سب سے پہلے زیادہ کسمپرسی اور لاپرواہی کا شکار ہو چکے ہوں، جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانانِ ہند کی تربیت واصلاح کے مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہیے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا:

''سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین کے زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی''۔

اس جملہ کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ نہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم وفنون سے الگ تھلگ رہنا چاہیے، جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کرایا ہے، توجہ صرف اس پر دلائی گئی کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم وفنون کے پڑھنے اور پڑھانے کا نظم وسیع پیمانے پر کیا جاچکا ہے اور آئندہ کیا جائے، اور کیسا

طریقے آزمائے۔ مسجد، محفل، گھر، بازار سب کو تجربے کا میدان بنایا اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے لیے ایک راہ نکال لی۔ ان کی گفتگو میں ہمیشہ زور اور جوش ہوتا تھا لیکن وہ اپنے کام کو بڑی سختی سے جانچتے بھی تھے میں ان کی باتیں سنتا تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالغوں کی تعلیم کے لیے۔ صحیح طریقے کی نہیں، حق کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور شاید یہی بات تھی کہ جس سے اس میدان کے تمام کام کرنے والوں میں ان کی ایک خاص حیثیت ہوگئی۔ انھوں نے جامعہ کے صرف ایک شعبے کو ترقی نہیں دی بلکہ سماجی تعلیم کا شوق رکھنے والوں کو مجاہدوں کی ایک جماعت بنا دیا...''

اسی طرح شفیق صاحب کے رفیق خاص خواجہ غلام السیدین نے لکھا:

''...شفیق بہ حیثیت انسان کے اپنے کام کے مقابلے میں زیادہ بلند تھے۔ ان کی انسانیت تعلیم کی راہ میں ان کے کارہائے نمایاں پر غالب تھی ... اگر قدرت ذرا اور دریا دلی سے کام لیتی اور ان کی عمر وفا کرتی تو انھیں زندگی میں اعلیٰ اور بلند تر مرتبہ نصیب ہوتا۔ مگر میرا ایمان ہے کہ اس بلند تر مرتبہ سے انسانیت کی جس منزل پر وہ پہنچ گئے تھے اس میں کچھ اور اضافہ نہ ہوتا۔ مصیبت کا ہنس کر منہ چڑھانا، پریشانی کے زمانے میں توازن قائم رکھنا، ناکامی سے بددل یا مایوس نہ ہونا اور کامرانی سے ابل نہ پڑنا، دشمنی کے خیال کو ترک کر کے دوستی کو شعار بنانا، بدنیتی کی ہوا نہ لگنے دینا اور انسانیت کی ہمہ گیری سے سبق لے کر اسے اصول زندگی بنا لینا۔ انسانیت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد آگے کون سا مقام رہ جاتا ہے؟''

وسیع نظم؟ کہ بقول حضرت والا (مولانا گیلانی) اتنی سرپرستی قدیم علوم اور اسلامی فنون کو گزشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی۔

علوم جدیدہ کی اشاعت وترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ:

''ہاں! علوم نقلیہ یعنی خالص دینی واسلامی علوم کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا گا''

دونوں علوم کی تصویر واقعی پیش کرنے کے بعد مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں:

''ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا، تحصیل حاصل نظر آیا''

حضرت نانوتویؒ کا خیال یہ تھا کہ مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دستبردار ہی نہیں ہوگئی ہے، بلکہ واقعات بتارہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں، ان علوم کے احیاء وبقاء کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں) اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

''صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی ودینی) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (انعطاف) ضروری سمجھا گیا''۔

مولانا گیلانیؒ کی تشریح ملاحظہ فرمایئے:

''آپ دیکھ رہے ہیں دارالعلوم کے نصاب میں خالص دینی واسلامی علوم (قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی وذہنی فنون کی شرکت کی توجیہہ کرتے ہوئے حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے، یعنی مسلمانوں کے ''علوم مروجہ'' کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، قیل وقال، جواب وسوال سے فکری ورزش کرا کے طلبہ میں دقیقہ سنجیوں، موشگافیوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے ''استعداد علوم مروجہ'' سے یہی مراد ہے، اس سلسلہ میں پھر حضرت نانوتویؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

''اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوجاتی ہے''

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم کے مروجہ نصاب میں حضرت والا یہ

پروفیسر محمد مجیب

۱۹۰۲تا۱۹۸۵ء

محمد مجیب کی ولادت شامِ اُودھ کے حسین سایوں میں ۳۰ر اکتوبر ۱۹۰۲ کو لکھنؤ میں ہوئی جہاں ان کے والد محمد نسیم وکالت کرتے تھے۔ ان کا تعلق بہلول گڑھی ضلع بارہ بنکی سے تھا۔ بچپن اور گھرانے کے بارے میں مجیب صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''جس گھر میں میرا بچپن گزرا وہ شہر لکھنؤ کے ایک سرے پر تھا۔ میرا خاندان نہ قصباتی تھا اور نہ شہری۔ ہم کہلاتے تو تھے زمیندار مگر زیادہ آمدنی وکالت سے تھی۔ ہمارے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ لٹا سکیں لیکن شمار امیروں میں تھا۔'' مجیب صاحب کو رمضان علی نامی ملازم کی نگرانی میں دے دیا گیا جنھیں وہ ''نان'' کے نام سے مخاطب کرتے تھے ان کی دوسری نگراں بی بی امّن مقرر ہوئیں جنھوں نے جلد ہی ان کی والدہ محفوظ النساء کی جگہ لے لی اور اس طرح ان دونوں افراد نے مجیب صاحب کی نگرانی کے فرائض انجام دیے کیونکہ نہ تو اپنی والدہ سے ان کا کوئی تعلق رہا اور نہ ہی والد سے۔

پہلے مجیب صاحب کو عربی پڑھائی گئی پھر قرآن کریم کی تعلیم دی گئی بعد ازاں انھوں نے فارسی زبان سیکھی جس کے نتیجے میں انھیں گلزار دبستاں اور گلستان کے اسباق پڑھائے گئے۔ پھر ان کا واسطہ اردو کی کتابوں سے پڑا۔ اس کے بعد انھیں لکھنؤ کے معیاری اسکول لا رینٹو کانونیٹ میں داخل کرادیا گیا جہاں وہ بارہ برس کی عمر تک زیر تعلیم رہے۔ وہاں سے تعلیم پوری کرنے کے بعد انھیں ایک اسلامی اسکول میں داخلہ دلایا گیا جہاں وہ ایک سال تک پڑھتے رہے اور پھر دہرہ دون کے ایک اسکول بھیج دیا گیا جہاں امیروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں ان کی شخصیت سازی کا عمل شروع ہوا اور پرنسپل ٹالبرٹ ڈالبی نے ان کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک بار جب انھیں معلوم ہوا کہ پرنسپل صاحب نے گوشت خوری ترک کردی ہے تو مجیب صاحب نے بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ ٹالبرٹ ڈالبی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رکن

سمجھانا چاہتے ہیں، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں "علوم جدیدہ" کے حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، گویا علوم جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے"۔

چنانچہ آج تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے فضلاء اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد دین کی خدمت اور اسلام کی اشاعت کے نقطۂ نظر ہی سے جب دوسرے علوم حاصل کرتے ہیں تو ان میں اتنی لیاقت ہوتی ہے کہ اس میدان میں بھی وہ فائق رہتے ہیں۔

جدید تعلیم کے حصول سے حضرت نانوتویؒ نے منع نہیں فرمایا اور کیسے منع کرتے وہ تو باخبر، زمانہ شناس اور صاحب بصیرت عالم تھے اور تقاضائے زمانہ سے آگاہ تھے، بلکہ ایک گونہ ترغیب بھی دلائی، مگر یہ بات مخفی نہ رہے کہ مولانا چاہتے تھے کہ طلبہ جدید علوم سے اسلام کی خدمت کریں اور دین اور کار دین سے خود کو وابستہ رکھیں، انھوں نے فرمایا:

"اس کے بعد یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی"

مولانا گیلانی کے مخصوص طرز تحریر کا لطف اٹھاتے ہوئے ان کا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

"ذرا سوچئے کہ غم وغصہ، بے زاری اور دل افگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسے اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنا لیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے، زمین پر پٹک دیئے گئے تھے، ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہیے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو، جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے، ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، مسلمان فطرتاً اس سے بھڑکتے تھے، اسی مسموم فضاء اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا الامام الکبیر یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتویٰ دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم، علمی کمالات کے چمکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں (علماء) کے لیے مفید ثابت ہوگی، اللہ اللہ! ایک طرف اسی زمانہ میں

تھے اس لیے مجیب صاحب بھی اس سوسائٹی میں دلچسپی لینے لگے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''تھیوسوفی ہی کے اثر سے مجھ میں وسعت نظر پیدا ہوئی اور میں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا...... تھیوسوفی کے اثر سے مجھ میں ہندو مذہب سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے گیتا کا بھی مطالعہ کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس زمانے میں تھیوسوفی میری ذہنی کیفیت سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔'' دہرہ دون میں انھیں بائبل پڑھنے کا موقع بھی فراہم ہوا اس کی زبان سے انھوں نے بہت لطف اٹھایا اور بہت کچھ سیکھا'' جب مطالعہ کا ذوق اور بڑھا تو بائبل پڑھتے وقت وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔۔''

دسمبر ۱۹۱۸ء میں مجیب صاحب نے ممبئی سینٹر سے کیمبرج کا امتحان پاس کر لیا اور سترہ سال سے بھی کم عمر میں انھیں انگلینڈ بھیج دیا گیا جہاں آکسفورڈ میں ان کے بڑے بھائی محمد حبیب تاریخ کے طالب علم تھے۔ مجیب صاحب نے بھی بی اے آنرز (تاریخ) میں داخلہ لے لیا آکسفورڈ میں ان کے ہم عصروں میں کے۔ پی۔ ایس مینن، ایم۔ سی۔ چھاگلہ، آر۔ کے نہرو اور اے۔ کے پلے جیسے طلبہ شامل تھے جنھوں نے مستقبل کے ہندستان کے خاکے میں رنگ آمیزی کی۔ انگلستان میں مجیب صاحب انگریزی تہذیب کی اقدار سے متاثر ہوئے لیکن ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ انگریز دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھیں جو وہ اپنوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آکسفورڈ میں ہی انھوں نے فرانسیسی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ ۱۹۲۰ء میں بیس سال کی عمر میں انھوں نے بی اے (آنرز) میں کامیابی حاصل کر لی اور عبدالرحمٰن سندھی کے مشورہ پر پریس کا کام سیکھنے کی غرض سے انگلستان سے برلن پہنچے جہاں عابد حسین اپنی ریسرچ کی تکمیل کے سلسلے میں پہلے ہی سے قیام پذیر تھے یہاں مجیب صاحب نے جرمن زبان بھی سیکھ لی اور کاویانی پریس میں طباعت کا کام شروع کر دیا۔

قیام جرمنی کے دوران مجیب صاحب کو مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرنے کے مواقع فراہم ہوئے انھوں نے جرمن قوم کی دلیرانہ کاوشوں کا مشاہدہ کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ بڑی توہین اور تحقیر کی راہ سے گزر رہا تھا تاہم اس کے دلیر سپوتوں نے اس کی تعمیر نو کر کے اسے ایک نئی قوم میں تبدیل کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب نے دونوں شلاختن زی نامی مقام پر ایک مکان

مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ جو کچھ انھوں نے پڑھ لیا ہے، اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی ہے نہیں جسے سیکھا جائے اور پڑھا جائے، ان ہی علماء کے درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہے، چاہیے کہ یوروپ کے جدید علوم وفنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس (عصری درسگاہوں) میں سکھائی جاتی ہیں، یوروپ کے جدید علوم وفنون کی اہمیت وضرورت کا انکار جسے اس زمانہ میں ہمارے علماء نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا، دیوبندی نظام تعلیم کے امام اول واکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔

گویا حضرت نانوتویؒ قدیم وجدید دونوں علوم حاصل کرنے کی فکر رکھتے تھے، لیکن جدید وقدیم علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم میں کیوں نہیں جاری کیا گیا تو اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا ہے:

''زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل، سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اسلامی ودینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لیے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے، صرف ونحو، ادب، معانی وبیان، اصول فقہ، کلام اور علوم دانش مندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے، ان سب کے مختصر ترین نصاب کے لیے بھی اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بہ مشکل نکل سکتی ہے اور اس بوجھ کے نتیجہ میں صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہو سکتی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے گویا جدید علوم کی تعلیم کی افادیت کے اعتراف کے ساتھ دینی مدارس میں مشترکہ طور پر ان علوم کی تدریس کو خارج از بحث قرار دیا، زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی مدارس سے فراغت کے بعد عصری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کریں یا عصری علوم کی تکمیل کے بعد دینی مدارس میں آئیں، لیکن دونوں کی مخلوط تعلیم کار دانش مندی نہیں ہے، یہ بات انگریزی اور عصری علوم کی تعلیم سے نفرت اور بے زاری کی وجہ سے نہیں، بلکہ دینی واسلامی علوم میں خامی کے اندیشہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا اور صاف طور پر کہہ دیا کہ جنھیں علوم جدیدہ حاصل کرنے ہیں وہ وہاں جائیں۔

درس نظامی کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے خط کے ذریعہ توجہ دلائی کہ وہ قطعی طور پر مردہ ہو چکا ہے، اس واقعہ کا تذکرہ

میں قیام کیا جس کے مالک پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی انجمن کے رئیس التحریر اور اس کے جریدہ کے مدیر اعلا تھے ۔ مجیب صاحب نے اپنا زیادہ تر وقت عابد صاحب اور ذاکر صاحب کے ساتھ گزارا ۔ جب مجیب صاحب نے طباعت کا کام سیکھنا شروع کیا تو ذاکر صاحب نے دیوانِ غالب ،اور دیوان شیدا کی اشاعت کے علاوہ جرمن زبان میں مہاتما گاندھی پر ایک کتاب کی تیاری کا منصوبہ بنایا اور مجیب صاحب اور عابد صاحب کے اشتراک سے اس کی تکمیل کی۔

ذاکر صاحب علی گڑھ سے جب آئے تھے تو جامعہ کے حالات معمول پر تھے لیکن ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی دلچسپی بھی اس تحریک سے ختم ہوگئی اور جامعہ غیر یقینی حالات کا شکار ہونے لگی تو بعض رہنماؤں نے رائے دی کہ اسے بند کر دیا جانا چاہیے لیکن جب یہ اطلاع ذاکر صاحب کو موصول ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے ۔ اس سلسلے میں مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ ” ایک دن ذاکر صاحب اور عابد صاحب جامعہ ملیہ کے بارے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے ۔ میں بھی ان کی باتیں سننے لگا ۔ گفتگو کے ایک موڑ پر ذاکر صاحب کہنے لگے کہ میں نے تو طے کر لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو، جامعہ میں کام کروں گا ۔ ڈاکٹر عابد حسین بولے کہ وہ بھی ان کے ساتھ جامعہ میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ اس پر میں نے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ جامعہ میں کام کروں گا ۔ ذاکر صاحب نے مجھ پر شک وشبہ کی ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے ۔ میں نے جاننا چاہا کہ آخر کیوں؟ ذاکر صاحب بولے' جامعہ آپ کے لیے موزوں اور ٹھیک جگہ نہیں ہے'۔ میں اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور میں نے کہا کہ جامعہ آپ کے لیے موزوں اور ٹھیک ہے تو میرے لیے کیوں نہیں ہے؟' انھوں نے کہا کہ میرا معاملہ دوسرا ہے ۔ میں تو پہلے ہی سے جامعہ میں کام کرنے کے لیے اپنے آپ کو پابند پاتا ہوں ۔“ مجیب صاحب کہتے ہیں کہ اس جواب کے بعد بھی وہ جامعہ میں کام کرنے پر اصرار کرتے رہے تو ذاکر صاحب کے لہجہ میں ایک خاص قسم کی تیزی پیدا ہوگئی اور وہ کہنے لگے کہ ” اگر میں دہلی کے اسٹیشن پر اتر کر آپ کو تانگے میں بٹھاؤں اور ایک ایسی سپاٹ اور خالی جگہ لے جا کر آپ کو اتار دوں جہاں پر کچھ بھی نہ ہو اور کہنے لگوں کہ یہی جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے تو آپ کیا کریں گے“۔ مجیب صاحب نے جواب دیا کہ اس خالی جگہ کو آپ

کرتے ہوئے مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن ہمارے علماء محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم ومدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے آرہے تھے،.... دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ فلسفہ کی راہ سے خام عقلوں کو جن مغالطوں میں مبتلا کردیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے، اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس زمانہ میں ''فلسفہ'' کے نام سے جن خیالات کو حسن قبول حاصل ہورہا تھا جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہوسکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علماء نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے، سیدنا الامام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے، حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہوجاتا تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے، یورپ کے جدید فلسفہ کے مطالعہ کا موقع ہمارے علماء کے لیے بآسانی میسر آسکتا تھا''

راقم سطور اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہے اور اب طبقۂ علما میں اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے کہ اسلام کی تبلیغ ودعوت ہی کے نقطۂ نظر سے انگریزی زبان اور اپنے علاقہ کے اعتبار سے جو زیادہ رائج زبان ہو، انھیں سیکھیں، علما اگر اس طرح کی زبانوں اور بنیادی عصری معلومات سے ناواقف ہوں تو وہ صحیح طور پر دین کی خدمت اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی داں طبقہ، جو پوری دنیا میں بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہے، کو دین کی طرف دعوت دینے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے، یہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی انہیں خبر تک نہیں ہوتی، ہم جو کچھ اردو زبان میں پڑھتے اور حسب توفیق وموقع لکھتے ہیں اور ہماری یہ تحریریں ملکی وبین الاقوامی رسائل واخبارات میں شائع ہوتی ہیں، شاید آپ بھی اس سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ ان اردو رسائل واخبارات میں شائع ہونے والی تحریروں کو پڑھنے والے مسلمان کم اور انتہائی کم ہوتے ہیں، کام جو کچھ ہورہا ہے، اس کے فوائد واثرات کا مجھے پورا اعتراف ہے، لیکن جو بات میں -قدردانی اور اعتراف کے جذبات کے ساتھ- عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ''خوش فہمی کے خول'' سے باہر نکل کر اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ مسلم دنیا کا کتنا بڑا طبقہ وہ ہے جو بدقسمتی سے اردو زبان سے ناآشنا ہے اور اس طبقہ تک ہم اپنی بات اور دینی دعوت وپیام پہنچانے سے قاصر

جامعہ ملیہ کہیں گے تو میں بھی اسے جامعہ ملیہ کہوں گا۔" اس پر ذاکر صاحب آگے بڑھے اور مجیب صاحب کو بڑی شفقت اور محبت سے گلے لگالیا اور کہنے لگے "بہت اچھا، چلئے آپ بھی ہمارے ساتھ جامعہ کے کاموں میں شریک رہیں گے۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں کو ایک برقی پیغام ارسال کیا کہ "میں اور میرے کچھ ساتھی اپنی زندگی کو جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہیں ہمارے ہندستان پہنچنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔" اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری یورپ کے سفر کے دوران پیرس پہنچے تو ذاکر صاحب نے ان سے ملاقات کر کے انھیں اپنی خدمات کو جامعہ کے لیے وقف کر دینے کا یقین دلایا اور مجیب صاحب اور عابد صاحب سے اصرار کیا کہ وہ بھی انھیں اپنی جانب سے یقین دلائیں۔ اس کے نتیجے میں یہ دونوں حضرات برکت علی قریشی اور خواجہ اے حمید کے ساتھ ویانا پہنچے جہاں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ان دنوں مقیم تھے اور انھیں اپنی خدمات کو جامعہ کے لیے وقف کرنے کا یقین دلایا۔ دونوں رہنما ایک دور افتادہ ملک میں ان ہندستانی نوجوانوں کے جذبۂ خدمت وایثار سے بہت خوش اور متاثر ہوئے۔

جب ذاکر صاحب اور عابد صاحب اپنی ریسرچ سے فارغ ہو گئے اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر چکے تو یہ حضرات مجیب صاحب کو ساتھ لے کر فروری میں دہلی آپہنچے جہاں جامعہ کو علی گڑھ سے منتقل کیا جا چکا تھا اور جہاں اس کے چاہنے والے اس کا وجود برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ ان ارکان ثلاثہ کے دہلی پہنچنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جامعہ کے ایک طالب علم معین الدین حارث لکھتے ہیں جو اس قافلہ میں شامل تھے جس نے ان حضرات کا دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کیا تھا: "تاریخ تو اب یاد نہیں، مگر فروری کا مہینہ اور جاڑوں کے وہ دن ضرور یاد ہیں جن میں جامعہ کی بستی میں یہ خبر پھیلی کہ وہ تین نوجوان جو جرمنی میں اعلا تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے ہیں اور جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بہت جلد دہلی آرہے ہیں..... حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کو ان کے سفر یورپ میں انہی نوجوانوں نے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اپنی تعلیم کے خاتمے پر وطن واپس آکر وہ اپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جامعہ کے اس وقت کے

ہیں ــــ نئی نسل جس نے اقتصادی ومعاشی تقاضوں کے پیش نظر انگریزی اور دیگر زبانوں کو رابطہ کی زبان کی حیثیت دی ہے، یا دوسری قومیں جب اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں، تو اسی زبان کے لٹریچر پڑھتی ہیں، جو اکثر مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کی ہوتی ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کے دل میں نفرت کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اس طرح بہت سے دکھے ہوئے بے چین اور مضطرب دل ودماغ تلاش حق میں اسلام کی طرف بڑھتے ہیں، مگر سوائے بدگمانی اور نفرت کے انھیں کچھ ہاتھ نہیں آتا، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میں بڑی حد تک ہماری غفلت اور کوتاہی کو دخل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ طبقۂ علما نے دین کی بڑی وقیع اور قابل قدر وشکر خدمت انجام دی ہیں اور ان کے فیوض وبرکات سے ایک عالم مستفیض ہورہا ہے، مگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مدارس کے فضلاء انگریزی زبان اور دوسری علاقائی زبانوں میں مہارت پیدا کر کے خدمتِ دین کے لیے میدان میں آئیں تو ایک زبردست انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور علماء کا علمی وروحانی فیض دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل سکتا ہے، علما جدید چیلنج کے مقابلہ کے لئے اگر ان بین الاقوامی زبانوں پر نظر رکھیں، بے تکلف اسلام کے ناقدین کو پڑھیں اور جدید حلقہ میں داعیانہ کردار صحیح طور پر ادا کرسکیں تو یہ وقت کے اہم تقاضے کی تکمیل ہوگی، اس سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہ چھ زبانوں کے ماہر تھے اور قرآن حکیم کی آیت: **وما أرسلنا من رسول الا بلسان قومه** کا مفہوم اور تقاضا بھی تو یہی ہے۔

مولانا گیلانی نے اپنی معروف کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ وہ واقعات نقل فرمائے ہیں، جن سے ہمارے اکابر علماء کی دیگر زبانوں سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے، آپ ان واقعات کو ان کی مذکورہ کتاب میں پڑھیں، تاہم سیمینار کے موضوع کی مناسبت سے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کا ایک واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، یقیناً اس میں ہم سب کے لئے عبرت کی مایہ اور نصیحت کا سامان ہے، مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے سنی تھی، اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جارہے تھے تو کپتان

اساتذہ اور طلبہ کا ایک قافلہ ان مہمانوں کے، جو آگے چل کر جامعہ کے صحیح معمار ثابت ہوئے، استقبال کے لیے دہلی اسٹیشن گیا تھا میں بھی اس قافلے میں شامل تھا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو ایک ڈبے سے یہ تینوں نوجوان باہر آئے۔ یہ تھے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، ڈاکٹر عابد حسین مرحوم اور پروفیسر مجیب۔ ۵۴ سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی وہ منظر میری نظروں میں محفوظ ہے۔ قدرے بھاری جسم کے اور چہرے پر سیاہ داڑھی والے ڈاکٹر ذاکر حسین جو گھنی داڑھی کی وجہ سے اپنی عمر سے کچھ زیادہ کے معلوم ہو رہے تھے، ان کے مقابلے میں اکہرے بدن کے ڈاکٹر عابد حسین اور ان دونوں کے مقابلے میں مختصر جثے کے پروفیسر محمد مجیب۔ تینوں شخصیتیں پُر وقار تھیں اور ان کے چہروں پر کچھ ایسا تبسم تھا کہ ان کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہونے والے کے دلوں کو انھوں نے موہ لیا۔ یورپ کی اعلا تعلیم سے مرصّع ہو کر وطن واپسی کی خوشی تو انھیں یقیناً ہوگی مگر اپنے لیے وہ جو میدان طے کر چکے تھے اس کی پہلی منزل پر پہنچ کر وہ غیر معمولی طور پر مسرور وشاداں نظر آ رہے تھے۔ ادھر ان کا استقبال کرنے والے اس خوشی میں پھولے نہ سمائے تھے کہ جامعہ کی اس کشتی کو جو ادھر دو تین سال سے ہچکولے کھا رہی تھی کھیون ہار مل گئے اور اب یہ امید کی جا سکتی تھی کہ جامعہ کی یہ کشتی اپنے ساحل مقصود تک پہنچ سکے گی۔'' جامعہ میں ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے، اعزاز میں ضیافتوں کا اہتمام ہوا اور ''جوہر'' کے خصوصی شمارے کی اشاعت عمل میں آئی۔

ان حضرات کی آمد سے جامعہ کے دن پھر گئے اور ان تینوں کا تقرر بھی ایک ساتھ عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ عابد حسین رجسٹرار بنائے گئے اور ساتھ ہی انھیں رسالہ ''جامعہ'' کا مدیر بھی مقرر کیا گیا اور پروفیسر محمد مجیب کا تقرر تاریخ کے استاد کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ طباعت میں ان کی تربیت کے پیش نظر جامعہ میں کتابوں کی اشاعت کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ایک پرنٹنگ پریس شروع کیا گیا جو چند برسوں تک کام کرتا رہا۔ اپنے خالی اوقات میں وہ ذاکر صاحب کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ برسوں تک وہ جامعہ کے خازن منتخب ہوتے رہے اور بڑی تندہی کے ساتھ اپنی اس ذمہ داری کو نباہتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں نئی تنظیم کے تحت ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے ساتھ انھیں رسالہ جامعہ کی مجلس ادارت میں

نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں، حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے انھوں نے کپتان سے مولانا کے احوال بیان کیے، اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مولانا بہ خوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا، وہی انگریزی داں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر بھی ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیونکہ مولانا کو محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے"۔

لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی، کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جاتا ہے، اس سے ان بزرگوں کی ذات بری ہے۔

سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جب بھی موقع ہدست ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت کے سکھانے کا بھی نظم کیا گیا ہے، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لیے بھیجا گیا اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذاہب وادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرانے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی میں منتقل کردیا جائے، ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے، انشاء اللہ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا" (جلد دوم صفحہ ۴۷۹)

بھی شامل کیا گیا۔ جب جامعہ میں ہاؤس سسٹم کا طریقہ جاری کیا گیا اور ایک استاد کے ذمہ دس سے پندرہ لڑکے اقامت گاہ میں رکھے گئے تو مجیب صاحب نے بھی چند لڑکوں کی نگرانی اپنے ذمہ لی۔

مجیب صاحب نے اپنے ابتدائی دور میں جامعہ میں ڈراموں کو رواج دیا اور خود اس کے لیے ڈرامے لکھ کر انھیں اسٹیج کیا۔ "انجام" "کھیتی" "خانہ جنگی" وہ ڈرامے ہیں جنھیں مجیب صاحب نے نہ صرف لکھا بلکہ ان میں کام بھی کیا۔ انھیں میک اپ میں کمال حاصل تھا اور اداکاروں کے انتخاب میں بھی۔ اسی طرح انھوں نے تاریخی مقامات کی سیر کو تفریح کے زمرہ سے نکال کر تعلیمی شکل عطا کی۔

مجیب صاحب نے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر تقریریں کیں اور لکچر دیے۔ ذاکر صاحب کی عدم موجودگی میں قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یہ ذمہ داری بھی انھی کو نباہنا پڑتی تھی۔ ایسے مواقع پر ان کی تقریریں بڑی معنی خیز ہوتی تھیں۔ استادوں کے مدرسہ کے افتتاحی جلسہ میں قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے انھوں نے کہا:

> "جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بیکار ہو جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی اور کہیں ہم یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لیے بنتی ہے اور ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لیے کوئی عمارت کافی نہ ہو۔ جامعہ جب قائم ہوئی تو شاید کچھ لوگوں کو اس کی امید تھی کہ ہندوستان کو بہت جلد سوراج اور جامعہ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا لیکن یہ غلط فہمی جلد دور ہو گئی اور حالات نے ہمیں یقین دلایا کہ جامعہ جب تک صبر و استقلال کا نمونہ نہیں بنے گی اسے کسی خدمت کے لائق نہ سمجھا جائے گا۔ اس لیے ہم نے طے کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو آزمائیں گے، زندگی اور محنت کو ایک تجربہ پر صرف کریں گے۔"

دارالعلوم دیو بند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی علمی، تعلیمی اور فکری و عملی جد و جہد کا محور و مرکز تھا، اس لحاظ سے دارالعلوم کے نصاب کے سلسلہ میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، تمام دینی درسگاہوں کے سلسلہ میں ان کا نقطہ نظر وہی تھا۔ وقت کے تقاضوں اور حالات کے پس منظر میں ایک باضابطہ دینی درسگاہ کے قیام و تاسیس کے ذریعہ ان کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح کی درسگاہیں جگہ جگہ قائم کی جائیں اور ان سے ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو وقت کے چیلنج کو سمجھنے اور اس کے مقابلہ کی بھرپور لیاقت وصلاحیت رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم کے سلسلہ میں اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مروجہ نصاب تعلیم (درس نظامی) تاریخ کے مختلف ادوار میں اصلاح کے مراحل سے گزرا ہے اور اس تاریخی اعتراف سے یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف نے وقت کے تقاضے اور ملت کے مصالح سے کبھی چشم پوشی نہیں کی، دارالعلوم کی روداد بتاتی ہے کہ ۱۲۸۳ھ میں جو پہلا نصاب جاری ہوا وہ تقریباً ۱۹ سال کی مختصر عرصہ میں تین بار اصلاح و ترمیم کے مراحل سے گزرا، پھر ۱۳۰۲ھ میں ایک نئی شکل اختیار کرگیا، جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ۱۳۹۰ھ تک رہا، اس کے بعد پھر از سر نو جائزہ لیا گیا اور تقاضائے حال کے مطابق ترمیم ہوتی رہی، حال ہی میں (یعنی چند سال پیشتر) دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ نے نصاب تعلیم پر ایک اہم مذاکرہ منعقد کیا، جو نتیجہ خیز اور با مقصد رہا، یہ ایک خوش آئند اور حوصلہ افزا پہلو ہے اور اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہیے کہ وقت کے تقاضوں کی رعایت ایک زندہ قوم کی علامت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء و فضلاء دورِ جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ان علوم و فنون اور زبانوں سے بھی باخبر ہوں، جن کی عملی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، تاکہ میدان عمل میں اجنبیت اور بے گانگی کا انھیں احساس نہ ہو، میں یہ نہیں کہتا کہ مستقل طور پر ان علوم جدیدہ کو داخل نصاب کرلیا جائے اور اپنے اصل دینی علوم کے نظام تعلیم کو متاثر یا کمزور کردیا جائے، تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تکمیل علوم کے بعد ان کے لیے ان جدید علوم سے واقفیت کی کوئی صورت نکالی جائے، یا پھر ایام درس ہی میں بعض علوم کی تدریس (نوٹس وغیرہ کی صورت میں) کچھ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں کی جائے کہ اس سے تعلیمی دلچسپی میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، لیکن اس

اسی طرح اکتوبر ۱۹۳۸ء میں یوم تاسیس کے جلسہ میں قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے مجیب صاحب نے کہا:

”جامعہ نے جہاں کئی اور باتوں میں عام روش اور عام وضع کو چھوڑا ہے وہاں تاسیس کی تقریب منانے میں بھی انوکھا چلن اختیار کیا ہے، ایسا چلن کہ اس پر رعب اور شان کا فریب کھائے ہوئے لوگ مسکراتے ہیں۔ قاعدے اور ضابطے کے سیدھے رستے پر چلنے والے حیران ہوتے ہیں یا الجھتے ہیں مگر سادگی اور خلوص، ایمانداری اور انکسار کے قدردان کو اس میں کچھ نہ کچھ دل میں رکھنے اور ساتھ لے جانے کو ضرور نظر آجاتا ہے ......سب سے بڑی بات جس میں سمجھیے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری ہمارے دلوں کی کیفیت، ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے، کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔

”میں آپ کو صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ کام جسے ہم مشق اور تجربہ کہتے ہیں اب آہستہ آہستہ نظیر اور سند بن رہا ہے۔ ہم کو اب یہ ذمہ داری پوری کرنا ہوگی کہ تعلیم کے جن طریقوں کو ہم آزما چکے ہیں ان میں مہارت پیدا کریں تاکہ آئندہ ترقی کی بنیاد مضبوط رہے۔ ہمارا ہر کام اب اس سہولت اور صفائی سے ہونا چاہیے جو پختہ ارادے اور کامیاب شوق کی سچی علامت ہے۔ اب ہمارے لیے لازمی ہوگیا ہے کہ تفصیلی کاموں میں آپ اپنے چارہ ساز بنیں۔ ایک مرکز سے قوت حاصل کرنے کے بجائے اپنے جوش اور شوق سے مرکز کو

جانب توجہ ضرور دینی چاہیے۔ موجودہ سائنسی وٹکنالوجی ترقی کے دور کا تقاضا بھی یہی ہے، میرے خیال میں فکر قاسمی کی عصری تعبیر وتشریح بھی یہی ہو سکتی ہے کہ ہم زمانہ کے تقاضوں سے آنکھیں بند نہ کریں، بلکہ فکر وجستجو اور حوصلہ مندی کا چراغ جلائے ہوئے آگے بڑھیں، آپ حضرات صاحب بصیرت علماء ہیں، ''آئین نو سے ڈرنا'' اور ''طرز کہن پر اڑنا'' دونوں کے حدود سے آپ واقف ہیں، آپ کی فراست ایمانی اور عالمانہ بصیرت کے تحت یقین ہے کہ کوئی راہ اعتدال کی ایسی ضرور نکل آئے گی جس سے دینی ودنیوی تقاضوں کی بھرپور رعایت ہو سکے۔

آپ کے منصب ومقام اور ذمہ داریوں کا مجھے احساس ہے اور ہر دانا وہوشمند اس ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ حکیم ودانا اقبال کے اس حقیقت افروز، معنی خیز اور حکیمانہ شعر پر اپنی بات ختم کروں، اس میں بلاشبہ ہم سب کے لئے ایک درس اور پیغام ہے:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی　　　جگر خوں ہو تو چشمِ دل سے ہوتی ہے نظر پیدا

☆☆☆

تقویت پہنچائیں اور اس اشتراک عمل کو قائم رکھتے ہوئے جو
ہماری چھوٹی سی جماعت کا مایۂ ناز ہے اپنے مخصوص کام کو جامعہ
کے مجموعی کام اور مجموعی مقصد سے اس طرح ہم آہنگ کر دیں
کہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ آپ ہی ہوتا رہے۔ ہمارا کام اب
تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے، اس اعتبار سے نہیں کہ افراد کے
ذمہ زیادہ کام ہو گیا ہے یا شعبوں کی تعداد زیادہ ہوتی جارہی
ہے بلکہ اس سبب سے کہ ہندوستان کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی
سے وہ تعلق جو ہمارے دل اور ارادے تک محدود تھا اب ایک نیا
روپ لے رہا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے
اندرونی کام کی طرف سے پورا اطمینان ہوتا کہ ہم وہ مطالبے
پورے کر سکیں جو ہماری قوم اس وقت ہم سے کر رہی ہے اور
جنھیں پورا کیے بغیر جامعہ اپنے اصل مقصد تک نہیں پہنچ سکتی۔"

مجیب صاحب بنیادی تعلیم سے متعلق اس کمیٹی کے بھی ممبر تھے جو ذاکر صاحب نے
گاندھی جی کے ایما پر تشکیل دی تھی وہ اس چار رکنی کمیٹی کے رکن بھی منتخب ہوئے جس نے
جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی منانے کے لیے اس کی تاریخ کا تعین اور پروگرام مرتب کیا۔
اور جب جوبلی کی تاریخیں طے ہو گئیں اور پروگرام ترتیب پا گیا تو مجیب صاحب نے
مندرجہ ذیل پیغام جاری کیا:

"پہاڑوں پر چڑھنے والا دور سے کسی چوٹی کو دیکھتا ہے تو
اس کے دل میں نیا شوق، بدن میں ایک نئی جان پیدا ہو جاتی
ہے۔ وہ دشواریوں اور خطروں کے خیال سے اپنی ہمت کو
بڑھاتا ہے، نظر کو بلندی پر جما کر اپنے آپ کو اوپر پہنچانے کی
کوشش کرتا ہے جیسے لوگ رسی پکڑ کر اوپر چڑھتے ہیں۔ جامعہ کی
جوبلی کے منصوبے کوہ پیمائی کے ارادے ہیں اور ہماری جماعت
میں ان ارادوں کو پورا کرنے کا حوصلہ عام ہو گیا ہے۔ اپنے
تعلیمی منصوبوں پر عمل کرنے میں ہم کو جتنی کامیابی ہوئی ہے

تیسرا باب

علمی خدمات وآثار

اسے دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا بے جا نہیں کہ ہم اس منزل پر پہنچ کر دم لیں گے جو ہم نے مقرر کی ہے۔ کسی بیچ کی منزل پر تھک کر نہ بیٹھ جائیں گے۔ خدا ہمیں صحیح طریقہ پر کام کرنے کی توفیق دے اور تندرست و مستعد رکھے۔"

جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو جامعہ میں ایک اقامتی کالج چلایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اقامتی مدرسہ ثانوی اور اقامتی مدرسہ ابتدائی بھی سرگرم کار تھے۔ تعلیمی مرکز کے نام سے ایک ادارہ دہلی شہر میں چل رہا تھا جس میں ایک مڈل اسکول اور ایک دارالمطالعہ بھی تھا۔ ادارہ تعلیم و ترقی کے تحت ایک مرکز قائم تھا جو تعلیم بالغان کی خدمت انجام دے رہا تھا، ایک استادوں کا مدرسہ تھا جس میں استادوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، ان کے ساتھ ہی اردو کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبہ جامعہ سرگرم عمل تھا، اور یہ سارے کام محض عوامی چندوں سے چلائے جاتے رہے تھے جامعہ کو ان کاموں کے لیے حکومت یا صاحبان ثروت سے کبھی کوئی رقم نہیں ملی تھی ویسے انجمن تعلیم ملی کے ضوابط میں واضح طور سے درج کرا دیا گیا تھا کہ جامعہ حکومت سے کوئی سروکار نہیں رکھے گی اسی لیے ان تمام سرگرمیوں میں مجیب صاحب کا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی حصہ ضرور رہا تھا۔

حصول آزادی کے بعد جامعہ کو محض اس رقم سے کام چلانا پڑا جو جوبلی کے موقع پر جمع ہوئی تھی اس لیے اب اسے مرکزی حکومت سے مالی امداد کے لیے رجوع کرنا پڑا لیکن بقول مجیب صاحب "انھیں کوئی ایسا بنا بنایا یعنی انگریزی حکومت کا بنایا ہوا قاعدہ قانون نہیں ملا جس کے مطابق جامعہ کو گرانٹ دی جا سکتی۔" افسران تعلیم کے اس رویہ سے ذاکر صاحب کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ انھوں نے اس بارے میں وزارت تعلیم سے بے تعلقی اختیار کر لی اور اس سے مزید خط و کتابت کا سلسلہ ہی منقطع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور نائب شیخ الجامعہ مجیب صاحب سے کہا کہ "میں گرانٹ کے لیے کسی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا، آپ کو جو کچھ کرنا ہو خود کیجیے۔"

ذاکر صاحب کے مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر ہو جانے کے بعد مجیب صاحب جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھال لی اور اگلی ربع صدی کے لیے جامعہ سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے جامعہ کو

مالی مشکلات سے نجات دلانے کی سعی کی۔ جامعہ کے پرنسپل کیلاٹ صاحب کی مدد سے جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافہ کروایا اور اڑتیس ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ منظور کرائی۔ اسی طرح استادوں کے مدرسہ اور ادارۂ تعلیم وترقی کے لیے بھی حکومت نے گرانٹ منظور کی۔ مجیب صاحب ان رقومات کے حصول سے مطمئن نہیں تھے کیونکہ جامعہ کے دوسرے اداروں کے لیے اب تک حکومت کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی اس لیے انھوں نے ایک وفد کے ساتھ وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی اور انھیں جامعہ کی پریشانیوں سے واقف کرایا اس کے نتیجے میں جامعہ کے لیے ایک لاکھ روپے کی سالانہ گرانٹ منظور ہوگئی۔ بعد ازاں جامعہ کی آمدنی کو وضع کرنے کے بعد خسارے کی رقم حکومت ادا کرنے لگی۔ غرضیکہ مالی مشکلات سے نجات دلانے میں مجیب صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مجیب صاحب کی کوششوں سے ۹ رجون ۱۹۶۲ء کو جامعہ ملیہ کو Deemed University درجہ مل گیا۔ تعلیم وترقی کے تحت تعلیم بالغان کے کام کو وسعت دی گئی، مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، جامعہ میں ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر ایک تعلیمی میلے کا انعقاد ہونے لگا جس میں جامعہ کے مختلف ثقافتی اور تعلیمی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ رورل ایکس ٹینشن پروجیکٹ چلایا گیا، جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا، بی اے (آنرز) سوشل ورک کی تعلیم کا آغاز ہوا، استادوں کے مدرسہ میں استادوں کے لیے توسیعی پروگراموں کی بنیاد پڑی، مدرسہ ثانوی میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ابتدا ہوئی، حکومت نے جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کیا، رورل سروسز اور رورل انجینئرنگ کے شعبے قائم ہوئے، مختلف مضامین میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کورسز شروع ہوئے۔ استادوں کے مدرسہ میں ایم ایڈ کا کورس جاری ہوا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کیا گیا اور اسے رواج دیا گیا۔ اردو مراکز قائم ہوئے، شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا اور اردو خط کتابت کورس جاری کیا گیا۔

تعلیمی میدان میں جامعہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی عمارتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا اس کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے گرانٹ دی۔ فیکلٹی بلڈنگ، سائنس بلاک، لائبریری، کینٹین اور استادوں کے مدرسہ کا توسیعی حصہ بھی مجیب صاحب کے دور میں تعمیر

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی*

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

بحیثیت محدث وفقیہ

اہلِ علم دو طرح کے گذرے ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے یہاں وسعت اور پھیلاؤ ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے یہاں عمق اور گہرائی ہے، یہ دونوں طرح کا مذاق کچھ فرق کے ساتھ ہر عہد میں رہا ہے، علامہ سیوطیؒ اور علامہ سخاویؒ جو معاصر بھی ہیں اور اپنے اعلیٰ علمی ذوق اور تالیفات کی وجہ سے معروف بھی، ان کے بارے میں بھی بعض مقام شناس علما کا تجزیہ یہی تھا کہ ایک کے پاس وسعت ہے اور دوسرے کے پاس عمق۔

اس لحاظ سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں علوم اسلامی میں عمق اور گہرائی پائی جاتی تھی، اخفاءِ حال کا اتنا غلبہ تھا کہ باضابطہ تصنیف و تالیف کا کام بہت کم کیا، لیکن جو کچھ لکھا اور جو کچھ ان سے سننے والوں نے محفوظ کیا وہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگاہی کا شاہد عدل ہے، وہ صرف تیراک نہ تھے بلکہ غواص تھے، ان کے یہاں یافت سے زیادہ دریافت ہے، آپ کی جو بھی تحریر دیکھی جائے اس میں نقل و حکایت کم ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے من جانب اللہ علوم و معارف کا ورود ہو رہا ہے، کتابوں کے حوالوں سے مواد کا اکٹھا کر لینا بھی مشکل کام ہے مگر نسبتاً آسان ہے، لیکن کسی موضوع کی تہہ تک پہونچ کر خود اپنی بات کہنا اور اپنی قوتِ فکر کا استعمال کر کے الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانا دشوار کام ہے۔ اور یہی کام حضرت نانوتویؒ نے کیا ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے لعل و گہر اور جواہر ریزے نکالے ہیں کہ جہاں تک بڑے بڑے اہلِ علم کی بھی رسائی نہیں ہو پاتی۔

---

* المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

ہوئے۔

شیخ الجامعہ مقرر ہو جانے کے بعد مجیب صاحب کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ متعدد قومی اور بین اقوامی اداروں سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں حکومت ہند کی نمایندگی کی، انڈو چائنا فرینڈشپ کمیٹی کے وفد کے ساتھ چین کا دورہ کیا، جنیوا اور پیرس کا سفر کیا۔ یونسکو کے اجلاس میں حکومت کی نمایندگی کی۔ یوگوسلاویہ کا سفر کیا، روس کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کرنے کی غرض سے روس کے دورہ کے لیے نامزد ہوئے۔ ورلڈ کانفیڈریشن آف آرگنائزیشن آف دی ٹیچنگ پروفیشن واشنگٹن سے وابستہ رہے۔ میکگل یونیورسٹی مانٹریال کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کینیڈا میں مقیم رہے، جرمنی میں منعقدہ مختلف مذاہب کے عالموں کی کانفرنس میں ہندستان کی نمایندگی کی، حکومت ترکی کی دعوت پر انقرہ اور استنبول کی یونیورسٹیوں میں لکچر دیے، لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے زیر اہتمام تعلیم کے موضوع پر منعقدہ سیمنار میں شرکت کی اور امریکہ کی مختلف یونی ورسٹیوں میں غالب پر خطبات دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجیب صاحب نے تصنیف و تالیف کی دنیا سے بھی اپنا تعلق قائم رکھا۔

مجیب صاحب نامور ادیب و مترجم تھے ان کی اردو تصانیف کی تعداد دو درجن سے بھی زائد ہے۔ اور انگریزی کتابیں بھی ایک درجن سے زائد ہیں ان میں ترجمے بھی شامل ہیں۔

حکومت ہند نے ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں مجیب صاحب کو ۱۹۶۵ء میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ کثرت کار کے سبب ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا دماغ ہیمرج کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو دماغ کا آپریشن کیا گیا جو کامیاب رہا لیکن صحت یابی کے بعد بھی حافظہ جاتا رہا اگرچہ مجیب صاحب کئی زبانوں کے ماہر تھے لیکن وہ سب کچھ بھول گئے تاہم جب کمزوری رفع ہوئی تو انھوں نے از سر نو انگریزی سیکھنی شروع کی اور کچھ عرصہ محنت کرنے کے بعد اس کوشش میں کامیاب ہو کر اپنی خود نوشت لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا۔ ۲ر اپریل ۱۹۷۳ء کو انھوں نے بحیثیت شیخ الجامعہ پھر اپنا کام شروع کر دیا اور ۸ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تقریباً پچیس سال اور بحیثیت مجموعی جامعہ کی پینتالیس سال کی طویل خدمت کے بعد سبکدوش ہو گئے۔

حضرت نانوتویؒ ان گوشہ نشیں اور عزلت گزیں اہلِ علم میں نہیں تھے جو صرف علم و تحقیق کے کام میں مصروف ہوں اور امت جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذر رہی ہو، ان سے بے خبر اور بے تعلق ہوں، بلکہ وہ دقیق النظر دماغ کے ساتھ ساتھ تڑپتا ہوا بے چین اور دردمند دل بھی رکھتے تھے، امت اسلامیۂ ہند پر کفر کی جو یلغار ہو رہی تھی اس نے ان کی کروٹوں کو بے سکون کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی لئے حضرت نانوتوی کے یہاں "تحقیق برائے تحقیق" کا ذوق نہیں تھا۔ بلکہ زبان جب بھی کھلتی، قلم جب بھی جنبش کرتا اور دل و دماغ جب بھی فکر و نظر کا سفر طے کرتا تو اس کا مقصد و منشاء ایک ہی ہوتا تھا اور وہ مقصدِ جلیل تھا اسلام کی دعوت و اشاعت اور دین حق کی حفاظت و حمایت۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف عیسائی اور دوسری طرف آریہ سماجی پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ زن تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رشتہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین متین سے کٹ جائے اور ان کی ثروت ایمانی لوٹ لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جن عبقری شخصیتوں کو پیدا فرمایا ان میں سر فہرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، اس لئے فطرتی طور پر حضرت نانوتویؒ کا اصل موضوع علم کلام تھا، مولانا کی زیادہ تر تقریریں اور تحریریں عقلی طور پر اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے اور عیسائیت اور ہندومت کی رد میں ہیں، ان کا مواد اتنا وقیع، مخالفین کے لئے اس درجہ مؤثر اور معاندین کے لئے مسکت ہے کہ آج بھی ان کی افادیت مسلّم ہے اور اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کی خداداد ذہانت و ذکاوت، حدیث کی تدریس اور اس کے ساتھ ساتھ رجال کار کی تیاری اور حدیث و فقہ کے میدان میں افراد سازی اور مردم گری سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان فنون میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ لیکن کچھ تو ان فتنوں کا مقابلہ جو یقیناً اس عہد میں کفر و ارتداد کے فتنہ کا مقابلہ تھا۔ اور کچھ کمال اخلاص کی وجہ سے اخفاءِ حال کا غلبہ اور نام و نمود سے دوری کی وجہ سے حدیث و فقہ بلکہ علم کلام کے علاوہ دوسرے موضوعات پر تصنیف و تالیف کی طرف یا تو آپ کی توجہ نہیں ہوئی یا موقع نہیں ملا، اس لئے اس موضوع پر بھرپور اور تفصیلی تجزیہ پیش کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

تاہم اس سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی تحریر میں جو اشارات ملتے ہیں، اور ضمنی طور پر حدیث و فقہ

جامعہ سے ان کی سبکدوشی کے بعد جامعہ کے اساتذہ کی انجمن نے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے مجیب صاحب کو ایک جلسے میں مدعو کرنا چاہا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ نہ معلوم میرے بارے میں آپ لوگ کیا کیا کہیں گے۔ اس وقت تو اساتذہ خاموشی سے چلے آئے لیکن جب سالگرہ کی تقریب کا موقع آیا تو اساتذہ نے انھیں جلسہ میں شرکت کے لیے راضی کر لیا۔ اس وقت انھوں نے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "بھئی، مجھے بھول جائیے، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا، زندگی یوں ہی گزر گئی۔"

جامعہ سے مجیب صاحب کی وابستگی اور جامعہ کے تئیں ان کی خدمات کے سلسلہ میں ان کے جانشین اور شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے فرمایا:

> "ان کی اس ادارہ سے وابستگی کی مجموعی مدت کم وبیش سینتالیس سال رہی ہے اور پچھلے ۲۴۔۲۵ سال سے تو وہ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی رہبری اور قیادت کرتے رہے ہیں۔ جامعہ سے اپنی ذہنی علیحدگی کے باوجود جس کا ذکر موصوف نے بارہا اپنی تحریروں میں کیا ہے، انھوں نے جس لگن اور لگاؤ کے ساتھ خود کو وقف و نثار جامعہ کیا تھا اس کی نظیر تعلیمی اداروں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ وہ اس ادارہ کی ان بزرگ اور برگزیدہ شخصیتوں میں رہے ہیں جن کے ذکر کے بغیر جامعہ کی ہر تاریخ نامکمل اور ہر افسانہ ابتدا اور انتہا سے بیگانہ رہے گا۔"

آخر ۲۰ / ۲۱ جنوری ۱۹۸۵ء کی درمیانی شب میں وہ نہ صرف اپنے اہل خانہ بلکہ تمام جامعہ والوں کو روتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر علی اشرف نے ان کی شخصیت اور سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ:

"صحت یابی کے باوجود مجیب صاحب پر علالت کا اثر اب بھی باقی تھا۔ گفتگو کے دوران خود معذرت کرتے جاتے تھے کہ شاید وہ معنی خیز یا مربوط گفتگو نہیں کر پائیں گے لیکن گفتگو یا موضوع گفتگو سے قطع نظر، ان کی شخصیت کا تاثر یوں ہوتا کہ ایک شخص نحیف

سے متعلق جو مباحث آ گئے ہیں، ان سے آپ کے فکری نہج کا اندازہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر علماء اصول لکھتے ہیں کہ احادیث میں احناف کا طریق یہ ہے کہ اگر روایتیں متعارض ہوں تو اولاً دیکھتے ہیں کہ کیا ایک روایت کے منسوخ اور دوسرے کے ناسخ ہونے پر کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر نسخ کی دلیل مل جائے تو نسخ کا فیصلہ کرتے ہیں، ورنہ پھر وجوہ ترجیح میں غور کرتے ہیں، اور کوئی وجہ ترجیح ہاتھ آ جائے تو ترجیح سے کام لیتے ہیں، اگر کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو تو پھر تطبیق وتوفیق کی کوشش کرتے ہیں، اگر تطبیق کی کوئی راہ نہ نکل سکے، جس کی شاید ہی کوئی مثال مل پائے، تو پھر دونوں دلیلوں کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہوئے: اذا تعارضا تساقطا پر عمل کرتے ہیں لیکن حضرت نانوتویؒ کا مذاق یہ ہے کہ ترجیح کے بجائے تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو کوئی حدیث عمل سے رہ نہ جائے۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلد حضرات کے رد میں جو رسائل لکھے ہیں جیسے "الحق الصریح" اور "توثیق الکلام" ان میں احادیث سے متعلق مباحث میں یہ فکر پوری طرح نمایاں ہے۔ یہی وہ مذاق قاسمی ہے جس کو عامتاً حلقۂ دیوبند کے اہلِ علم نے اختیار کیا ہے، اور یہ احادیث کے سلسلے میں دیوبند کی امتیازی فکر اور اس کی شناخت ہے۔

بلکہ حضرت نانوتویؒ کا ذوق تو یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہیں اگر فی نفسہ ان کی مشروعیت باقی ہو تو اس کو بھی مستحب کے درجہ میں رکھا جائے تا کہ ان پر بھی فی الجملہ عمل ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کی فی الجملہ اتباع ہو جائے، چنانچہ آپ کی رائے ہے کہ "گو پچاس نمازیں منسوخ ہیں لیکن استحباب کے درجہ میں ہنوز باقی ہیں"۔ پھر ایک نکتہ لکھا ہے کہ تتبع سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شب وروز میں پچاس رکعت پڑھنے کا تھا۔

نسخ کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو نسخ کم سے کم مانا جائے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ہے۔ خود حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں:

"نسخ خلاف اصل ہے تا مقدور اس سے احتراز مناسب ہے"

پھر جیسا کہ امام سرخسیؒ وغیرہ عام اصولیین احناف نے لکھا ہے کہ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید نسخ کے حکم میں ہے، یہی رائے حضرت نانوتویؒ کی بھی تھی۔ اسی طرح آپ نص کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے کو بمقابلہ اس کی تاویل وتوجیہ کے انسب خیال کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وناز ک سامنے ہے، وہی شخص جو قریب پچاس برس تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ رہا اور تقریباً پچیس برس جامعہ کا شیخ الجامعہ رہا۔ بظاہر کمزور جسم مگر مضبوط فکر اور ارادہ کا مالک، مصنف اور معلم، دانشور اور فنکار۔۔۔۔ایک شخص جو تعلیم اور تعلقات کی بنا پر کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن جس نے ساری زندگی جامعہ جیسی چھوٹی سی درس گاہ سے وابستہ رہنا پسند کیا۔ یقینی طور پر یہ شخص اپنی طبیعت اور ارادہ میں منفرد تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے دانشور اس کے رفیق تھے لیکن ان کی رفاقت میں بھی ہر ایک کی اپنی انفرادیت تھی...... مجیب صاحب ایک وسیع النظر اور آزاد ذہن وفکر کے آدمی تھے، ایک ایسے آدمی جو چھوٹی چھوٹی ظاہری یا سطحی باتوں سے بلند وبالا تھے۔ ان کا ذہن وقتی یا گردوپیش کے حالات میں پھنسا ہوا نہیں تھا۔ لباس، پوشاک اور زبان شمالی ہندستان کے شایستہ اور تعلیم یافتہ مسلمان کا تھا لیکن روایتی لباس میں ایک غیر روایتی دماغ کارفرما تھا اور صرف دماغ ہی نہیں بلکہ بڑا موثر جمالیاتی رجحان بھی۔

”مجیب صاحب کی شخصیت کا ایک پہلوان کا جمالیاتی ذوق تھا۔ وہ فن کار بھی تھے اور ان کی شخصیت فن کارانہ لطافت کی حامل بھی تھی۔ اکثر فن کار فن میں ماہر تو ہوتے ہیں لیکن اپنی زندگی یا شخصیت میں خود فنکار کم ہوتے ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب بذات خود ایک حسین شخصیت کے حامل تھے۔ وہ جس قدر نفاست پسند تھے اسی قدر نفیس شخص بھی تھے......“

اس موقع پر مجیب صاحب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا کہ:

> ” نا مساعد حالات میں وہی صبر وتحمل، وہی دلنواز تبسم، وہی ساتھیوں میں اعتماد پیدا کرنا اور ان کا دل بڑھانا، کسی کا دل نہ دکھانا دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہنا، جامعہ میں نئے نئے کاموں کے لیے گنجائش نکالنا، شہر دہلی میں اپنی شرافت، نیکی اور تہذیبی خصوصیات کے سبب مسلمانوں اور جامعہ کے نام کو اونچا رکھنا اور بیوروکریسی کے سامنے علم اور دانشوری کے وقار کا علم بلند رکھنا اور جھک کر کسی سے کچھ

''تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل نسخ ہے زیبا نہیں''(۱)

''قرأت فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کی اپنی مستقل توجیہ ہے اور وہ یہ کہ مقتدی کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا تعلق اصل میں اس اصل سے ہے کہ امام مقتدیوں کا نائب ہوتا ہے اور اسی کی نماز اصل ہوتی ہے، امام کی یہ حیثیت نماز میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے، ابتداء میں سلام وکلام بھی جائز تھا، اسے منسوخ کیا گیا، پھر مقتدی سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت بھی کیا کرتے تھے تو ضم سورت کا حکم منسوخ ہوا، پھر مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی منسوخ ہو گیا، تاکہ امام کی نیابت اور نماز میں اس کے ضامن ہونے کی کیفیت آہستہ آہستہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے۔

موضوع قرآن کا ہو یا حدیث کا یا علم کلام کا، حضرت نانوتویؒ کا منہج فکر اور طریقۂ استدلال زیادہ تر اصولی ہوتا ہے، اور متکلمانہ طرز واسلوب سے خالی نہیں ہوتا، مثلاً اسی قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ نماز میں اصل حیثیت امام کی ہے مقتدی کی حیثیت محض تابع کی ہے۔ خود انہی کے الفاظ ہیں:

''امام موصوف بالذات بالصلوٰۃ ہے اور مقتدی موصوف بالعرض''

اور قاعدہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصل اور حضرت نانوتویؒ کی زبان میں موصوف بالذات ہوں، اس طرح گویا مقتدی اس آیت کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ذہن رسا نے: لا صلوٰۃ الا بفاتحة الکتاب کی بابت ایک اور نکتہ اخذ کیا ہے اور یقیناً وہ ان کے تفقہ پر دال ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا خیال ہے کہ صلاۃ کا اطلاق کم سے کم ایک رکعت پر ہوتا ہے گویا صلوٰۃ کا طول ایک رکعت ہے جس کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کافی ہے تو اسی طرح چونکہ مقتدی امام کا تابع ہے اس لئے امام کے ساتھ مل کر مقتدیوں کی نماز ایک نماز ہے لہٰذا چونکہ اس حدیث میں ایک صلوٰۃ کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کو کافی قرار دیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کی مجموعی نماز کے لئے ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہو جائے گی، جو امام کی قرأت سے پوری ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کتاب وسنت کے غواص ہیں اور اپنی ذہانت اور قوتِ اخذ و

---

(۱) مجموعۂ ہفت رسائل ص: ۳۳۵

لینے سے پرہیز کرنا، سیکولرازم کا ایک اچھا نمونہ جونیشنلسٹ مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے، یعنی ہر رنگ کا احترام اور ہر رنگ میں بہار کا اثبات، یہ اور اس طرح کی اور باتیں مجیب صاحب کی جو آج یاد آتی ہیں اور اس کا احساس دلاتی ہیں کہ ذاکر صاحب کی ہم نشینی کے حسن و جمال کا اثر مجیب صاحب کی شخصیت میں کہاں کہاں تک پہنچا تھا، اس کے باوجود کوئی منفرد بات خود مجیب صاحب کی اپنی طبیعت اور اپنی فطرت میں بھی تھی جس نے ایک طرف تو جمالِ دوست کے آب و رنگ کو اتنی گہرائی تک قبول کیا اور دوسری طرف اس میں اپنی طبعی انفرادیت کی آمیزش سے اپنی شخصیت کا ایک جداگانہ رنگ پیدا کیا اور وہی رنگ 'مجیب صاحب' کہلایا۔"

استنباط سے الفاظ کی تہہ میں ایسے ایسے معانی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عام اہلِ علم کو شاید اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے رجال، اس کے درجہ و مقام اور جن احادیث سے استدلال کیا جارہا ہے، ان کے اطراف اور مختلف روایتوں میں الفاظ کا فرق اور احکام کے استنباط میں اس کے اثر پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اصول حدیث میں اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کے نقاطِ نظر اور طریقۂ فکر کو ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''توثیق الکلام'' اور ''الدلیل المحکم'' میں محمد بن اسحاق کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کا اختلاف، بعض احادیث موقوفہ کا احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہونا، موطا امام محمد کی ایک روایت کے علی شرط الشیخین ہونے کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مقتدی کے لئے تتبع سکتات یا سکتۂ طویلہ بین الفاتحہ والسورۃ پر کوئی مرفوع روایت موجود نہیں۔

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کے احادیث سے استدلال میں درایت کا پہلو غالب ہے۔ جو ایک مشکل کام ہے، کیونکہ روایت کے لئے نقل و حکایت ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس بات کی طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے:

''قوت روایت باعتبار درایت قوت سند سے بڑھ کر ہے''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قوت درایت قوت روایت سے مقدم ہے''

اسی لئے حضرت نانوتویؒ کی رائے ہے کہ ایسے رواۃ جو تفقہ میں فائق ہوں، ان راویوں پر ترجیح رکھتے ہیں جو صرف سند اور رجال سے تعلق رکھتے ہوں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اگر روایت میں فقہا کا اعتبار نہ ہو تو اوروں کا درجہ اولیٰ نہ ہوگا''

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں:

''یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہا کا زیادہ سند میں اعتبار ہوا اور کیوں نہ ہو روایت بالمعنی اکثر ہوتی ہے اور اس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے''۔

تراویح کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکتوب میں حدیث مرسل کی حجیت پر قلم اٹھایا ہے، اس میں ایک اعتراض جو غیر مقلد عالم کی طرف سے کیا گیا ہے کہ: علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین میں سنت خلفاء راشدین سے سنت نبوی ہی مراد ہے۔ کیونکہ جب تکرار معرفہ ہو تو وہ

متحد المعنی ہوتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس کا خوب مسکت جواب دیا ہے اور آیت قرآنی: أبناء نا و أبناؤ کم و أنفسنا و أنفسکم سے استدلال کیا ہے۔ تراویح ہی کے مسئلے میں آپ کے اس مکتوب (جو الحق الصریح کے نام سے موسوم ہے) میں کئی اہم مباحث آئے ہیں کہ احکام شرعیہ کا ثبوت صرف صحاحِ ستہ ہی سے نہیں ہوتا، ضعیف اور موضوع روایتوں میں فرق ہے، فضائل اعمال میں ضعیف روایتیں معتبر ہیں اور تراویح بھی فضائل اعمال میں سے ہے، اسی طرح اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خبر واحد سے اعتقادی احکام ثابت نہیں کئے جا سکتے اور عملی احکام میں واجبات و سنن اس سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ تراویح اور تہجد کے دو علیحدہ نماز ہونے پر بھی آپ نے گفتگو کی ہے، جو اس مسئلہ میں یقیناً اصل اور بنیاد ہے۔

''فیوض قاسمیہ'' کا ایک مکتوب جو دیہات میں نماز جمعہ سے متعلق ہے، اہلِ علم کے لئے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتا ہے۔ سورۂ جمعہ کی آیت: اذا نودي للصلوٰة من یوم الجمعة الخ کی ایسی بلیغ تفسیر ہے کہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اس ایک ہی آیت سے حضرت نانوتویؒ نے جمعہ کے وجوب اور جمعہ کی صحت سے متعلق شرائط کو ثابت کیا ہے اور اس آیت سے جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں حنفیہ کی طرف سے استدلال کیا ہے۔ غرض یہ مکتوب قوت استنتاج اور صلاحیت استنباط کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

فقہ و حدیث سے متعلق ایک اہم فن ''اسرارِ شریعت'' کا ہے کہ احکام شرعیہ کی حکمتیں اور ان کے مصالح کیا ہیں؟ اس موضوع پر حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں ایسی قیمتی نکتہ سنجیاں اور حکمت آفرینیاں موجود ہیں کہ شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت نانوتویؒ متکلم اسلام تھے، لیکن علم کلام میں آپ کا نہج خالصتاً نظری اور معقولی بحثوں کا نہیں تھا بلکہ آپ محسوسات اور مشاہدات سے مابعد الطبعی امور پر ایسا استدلال کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ایک روشن صبح کی طرح یہ اَن دیکھی حقیقتیں نظر آنے لگیں، مثلاً خود نماز ہی کے احکام میں قیام، رکوع اور سجود، رات میں جہری اور دن میں سرّی قرأت، سلام، قبلہ کی شرعی حیثیت اور اس کی مصلحت وغیرہ پر ایسی گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی جگہ غالباً ایسی دل کو چھوتی اور عقل کو قائل کرتی ہوئی بات اس فن کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ و ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء.

حضرت نانوتویؒ کو حدیث و فقہ کے موضوع پر کوئی مستقل اور مربوط کام کرنے کا موقع نہیں ملا،

لیکن بخاری شریف کے آخری پانچ اجزاء پر حواشی جو حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ہیں، وہ خود آپ کی نگاہ کی وسعت کی دلیل ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب ؒمحدث سہارن پوری جیسے صاحب علم کے کام کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن حضرت سہارن پوریؒ نے اس نوعمر معاصر عالم کو یہ عظیم الشان کام پورے اعتماد سے حوالہ فرمایا، یہ ایک طرف حضرت نانوتویؒ کے جوہر اور دوسری طرف حضرت سہارن پوری کی جوہر شناسی کی واضح دلیل ہے۔ مولانا سہارن پوریؒ نے جب ان اجزاء کی تعلیق کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو بعض لوگوں کو اس پر تامل ہوا لیکن جب آپ نے اس کام کو مکمل فرمایا تو تمام ہی اہلِ علم نے اس پر آفریں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حواشی حدیث کے اسنا دور جال اور معانی و مفاہیم دونوں پہلوؤں سے حضرت نانوتویؒ کی گہری نظر پر شاہد ہیں، ان میں کئی مواقع وہ ہیں جہاں امام بخاریؒ نے احناف کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان مواقع پر آپ نے روایت و درایت دونوں پہلوؤں سے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کو پیش فرمایا ہے اور حدیث وفقہ اور رجال کے بہت سے مراجع سے استفادہ کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس فن کی نادر و نایاب کتب ہی نہیں بلکہ آج جو متون متداول ہیں وہ بھی اہلِ علم کو دستیاب نہیں تھیں اور نگاہ شوق ان کو پانے کے لئے بے چین رہتی تھی، چنانچہ خود حضرت نانوتویؒ نے بعض مواقع پر کتابوں کی کمی اور عدم دستیابی کا رونا رویا ہے۔ ان حواشی میں بہت سی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ اہلِ علم کے لئے متاع گراں مایہ ثابت ہوگا۔

قضاء قاضی ظاہراً نافذ ہوگا یا باطناً؟ (ص:۱۰۳۰، ۱۰۶۵) پڑوسی کے لئے حق شفعہ ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں احناف کا نقطۂ نظر اور امام بخاری کی تنقید کا جواب (ص:۱۰۳۲) حانث ہونے سے پہلے کفارۂ قسم کی ادائیگی (ص:۱۰۱۸) قضاء علی الغائب (ص:۱۰۶۴) غلام مدبر کی بیع (ص:۱۰۶۶) صوم وصال کی ممانعت (ص:۱۰۷۵) وغیرہ پر نہایت نفیس فقیہانہ اور محدثانہ بحث ملتی ہے، اسی طرح گوہ کے گوشت کی بابت بحث کرتے ہوئے سند اور رجال پر بھی مبسوط اور چشم کشا کلام کیا گیا ہے (ص:۱۰۷۹)

فقہ و حدیث میں ہم فرزندان قاسمی کے لئے سب سے اہم بات جو ہمارے لئے یقیناً اسوہ اور

نمونہ ہے اور جس کو آج کے حالات میں خاص طور پر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے یہاں مسائل میں کمال اعتدال اور تمام سلف صالحین کا غایت درجہ ادب واحترام ہے، نیز استنباط و استدلال میں کبھی عدل وانصاف کا دامن آپ کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا ہے۔ خود قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کے رجحان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترک قرأت اولیٰ ہے لیکن قرأت بھی ناجائز نہیں، فرماتے ہیں:

''ترک قرأت فاتحہ خلف الامام قرأت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے''

ایک مقام پر غیر مقلد حضرات کی بے اعتدالی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست و گریباں نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکان خطاء سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ حضرت امام شافعیؒ صحیح فرماتے ہوں گے اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں''۔

اپنے ایک مکتوب میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر نہایت ہی مدلل اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا ہے کہ چونکہ مسئلہ ظنی ہے اس لئے اگر کہیں دیہات میں جمعہ قائم کرلیا جائے تو الجھنے کی بھی ضرورت نہیں: ''اگر کسے در دیہی جمعہ قائم کند دست وگریبانش نہ زنند''۔

حضرت نانوتویؒ کا یہی وہ طریقہ فکر ہے جو دیوبند کا اصل رنگ ہے اور جو حدیث وفقہ میں دیوبند کے محقق علماء کا اصل منہاج رہا ہے، یہی بات حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ملتی ہے، احادیث میں تطبیق اور فقہی اختلافات میں توسیع اور تسامح کی یہی کیفیت حضرت تھانویؒ کے یہاں ملتی ہے، الحیلۃ الناجزۃ اس کا واضح ثبوت ہے اور یہی رنگ زیادہ وسعت اور عمق کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے سب سے بڑے محدث علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں موجود ہے، فیض الباری اور العرف الشذی کو کہیں سے دس بیس صفحہ بھی پڑھ لیا جائے تو حضرت کشمیری کا یہ رنگ کسی حقیقت پسند عالم کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے عدل واعتدال کی راہ اختیار کرنا، اعتقادی مسائل میں تصلب اور احکام فقہیہ میں دلائل کا اختلاف اور احوال زمانہ کی تبدیلیوں کے اعتبار سے توسع، اور کتب فقہ کی ظاہری عبارتوں پر جمود واصرار کے بجائے سلف صالحین کے مقصد ومنشاء اور ان کے استنباط واجتہاد کی روح کو

سمجھنا، اور اس کو اپنے لئے چراغ راہ اور خضر طریق بنانا، یہ ہے بزرگان دیوبند کی اصل فکر جو میراث ہے اس خانوادۂ فکری کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور فکر ولی اللہی کے خوشہ چیں اور نقیب وترجمان حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی۔

اخیر میں اس سیمینار اور سیمینار منعقد کرنے والے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں حدیث وفقہ کی جو بحثیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن میں ایسے جواہر پارے موجود ہیں جو شاید کہیں نہ مل سکیں، ان کو ایک جگہ حدیثی اور فقہی افادات کے مجموعہ کی حیثیت سے جمع کر دیا جائے اور اسے حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں لکھنے کے بجائے آج کی زبان اور آج کے اسلوب میں مرتب کیا جائے تو اس طرح انشاء اللہ علوم قاسمی کا احیاء ہو سکے گا اور اہلِ علم اور اصحاب فکر و نظر کے لئے نہایت قیمتی اور عظیم الشان تحفہ ہوگا۔ وباللہ التوفیق و ھو المستعان.

مولانا محمد برہان الدین قاسمی سنبھلی*

صحیح بخاری کے حواشی میں الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا انداز

سرزمین ہند پر اگرچہ آفتاب اسلام کی کرنیں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہی پڑنے لگی تھیں، لیکن ان کے ہمہ گیر ہونے اور پورے آب وتاب کے ساتھ پھیلنے میں خاصا عرصہ لگا، پھر تو یہ خطہ جو نا معلوم مدتوں سے۔ قبل از تاریخ زمانہ سے۔ کفر وشرک کے اندھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا، نور اسلام سے ایسا جگمگایا کہ اس سرزمین پر وہ علاقے بھی رشک کرنے لگے جہاں اسلام کا نیر تاباں زمانہ نبوت میں ہی ضوفشاں ہو چکا تھا، یہاں ایسے ایسے علم وعمل، تقوی وخشیت کے آفتاب وماہتاب نمودار ہوئے جن کی تابانی وضیا پاشی کا دائرہ سرزمین ہند سے نکل کر عجم ہی نہیں عرب تک پھیلا، جس کا اعتراف سارے عالم نے کیا، ان گہر بار اور ضیا پاش افراد کی مختصر سے مختصر فہرست کیلئے بھی خاصا وقت درکار ہوگا، جس کا سیمیناروں میں شرکاء کو دئے گئے محدود وقت میں پیش کرنا مشکل ہے، اس لئے آج کی محفل میں صرف اسی ذات گرامی کے بارے میں کچھ عرض کرنے پر اکتفا کیا جانا ہی مناسب لگ رہا ہے، جس کا تذکرہ کرنے اور سننے کے لئے ہم سب آج جمع ہو کر ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں، کیوں کہ یہاں تمام شرکاء بشمول مقالہ نگار وسامعین اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر اور اسی کے بچھائے ہوئے خوان علم کے زلہ گیر ہیں، اسی کے تذکرہ سے لذت یاب ہونے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سب:

أعد ذكر نعمان لنا أن ذكره
هو المسك ما كررته يتضوع"

کا نغمہ زبان حال سے گنگنا رہے ہیں۔

مذاکرہ کے دوران اس شخصیت اور اس کی امامت کے مختلف پہلو سامنے لائے جائیں گے

---

* صدر شعبہ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

اور منتظمین کی بیدار مغزی اور دور بینی کی داد نہ دینا بے داد ہوگی کہ انہوں نے ہر مقالہ نگار کے لئے موضوع کا تعین کر کے اس علمی مذاکرہ کی افادیت بڑھانے اور ''مذکور'' کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کو سامنے لانے کا مناسب سامان کیا۔

راقم کو حضرت ممدوح کے اس اہم علمی کارنامہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا مفوض ہوا ہے جس کی اہمیت وافادیت زمان ومکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے، یعنی جب تک ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' سے استفادہ کا سلسلہ باقی رہے گا اور امید ہے کہ انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا اس وقت تک یہ علمی کارنامہ بھی زندہ وتابندہ ـــــ صحیح البخاری سے استفادہ کیلئے ناگزیر ہونے کی وجہ سے ـــ رہے گا، اس کارنامہ کی اہمیت میں اضافہ یوں اور ہو جاتا ہے کہ موصوف نے اسے ایسی عمر میں انجام دیا ہے کہ جس میں عموماً ـــ اچھے طلبہ کو بھی ـــ صحیح طریقہ پر صحیح بخاری کا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی (مولانا کی ولادت ۳۲ یا ۱۸۳۳ء میں اور حواشی کی طباعت ۱۸۵۰ء میں ہوئی)[(۱)] اور سچ پوچھئے اس کارنامہ سے بالعموم استفادہ کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی، مگر جس کے لئے قادر وقیوم نے ''الامام'' لقب کا سزاوار ہونا مقدر کر دیا ہو اس کے ذریعہ اس قسم کے اہم کارنامے انجام پانے پر تعجب کیوں ہو۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کی علمی جامع تاریخ ''نزہۃ الخواطر'' (نیا نام: الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام) کے بالغ نظر مرتب ومصنف، جو ایک ایک حرف ناپ تول کر لکھنے کے لئے مشہور ہیں، نے ہندوستان کے قریبی زمانہ کے علمائے کبار میں صرف دو شخصیتوں کے لئے ''الامام'' استعمال کیا[(۲)] ایک شہرۂ آفاق درس نظامی کے بانی ملا نظام

---

(۱) مولانا کی ولادت ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں ہونا تو متعدد سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے، لیکن حواشی بخاری، کی طباعت اولی ۱۸۵۰ء میں ہونا مولانا اسیر ادروی صاحب نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''مولانا محمد قاسم نانوتوی'' کے صفحہ ۷۶ پر ذکر کیا ہے (اگرچہ اس بات کا ماخذ نہیں بتایا)۔

(۲) حضرت نانوتوی کی ''امامت'' (بلکہ خود ''امامت'' کی تحقیق) کے مظاہر وامتیازات کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی مرتب کردہ ''سوانح قاسمی'' دیکھنی چاہئے، مولانا گیلانیؒ نے حضرت نانوتوی کی ''امامت'' کا ایک غیبی اشارہ دینے والا ایک خواب نقل کیا ہے (ص: ۱۳۲ ج: ۱ پر) اسی طرح ایک مجذوب کی (بخاری کا نسخہ ہاتھ میں لے کر) پیشنگوئی بھی کہ ''جا تو بڑا عالم ہے'' (ص: ۲۵۶ ج: ۱ سوانح قاسمی) خواب میں امام نانوتویؒ نے حضرت ابراہیم کا نگینہ دیکھا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''انی جاعلک للناس اماما'' (بقرہ) اسی خواب سے حضرت نانوتوی کے غیر معمولی طور پر مہمان نواز ہونے کی بھی توجیہ مولانا گیلانی نے کی ہے (سوانح قاسمی ص: ۵۶۷ ج: ۱ حاشیہ

الدینؒ فرنگی محل کے لئے دوسرے ہم سب کے ممدوح حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کے لئے، بلکہ دونوں شخصیتوں کا تذکرہ ایک ہی طرح کے القاب سے شروع کیا ہے، "الشیخ الامام العالم الکبیر" سے، حتیٰ کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ جیسے ممتاز ترین عالم دین کے لئے بھی امام کا لقب نہیں لکھا یہ لذیذ حکایت مولانا کے اولین سوانح نگار، ہم عمر اور ہم وطن و مستفید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنئے:

"مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری کی، کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے۔ مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کے سپرد کیا، مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے، اسی زمانہ میں بعض لوگوں نے۔ کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے۔ مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا، اسی پر مولوی احمد علی نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے،، (ص: ۷ سوانح عمری مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ از مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ)

حضرت مولانا نانوتویؒ کے جدید سوانح نگار، مشہور اہل قلم، رسالہ "ترجمان الاسلام" کے مدیر جناب اسیر ادروی صاحب مذکورہ بالا اقتباس اپنی کتاب "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حیات اور کارنامے" میں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مولوی احمد علی صاحب نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت نانوتوی کو ایسی ذمہ داری سپرد کی کہ تجربہ کار پختہ کار کے لئے بھی اس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا دشوار تھا، لیکن آپ نے بخاری شریف کے اس حصہ پر جو بخاری میں اہم ترین ہے حضرت نانوتوی سے حواشی لکھوا کر حضرت نانوتوی کی شخصیت پر جو ناشناسی کی دبیز چادر پڑی ہوئی تھی یک بیک اٹھادی اور اس جوہر قابل کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا" (ص: ۷۵ ناشر "شیخ الہند اکیڈمی" دارالعلوم دیوبند)

مولانا ادروی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"حواشی بخاری کی پہلی مرتبہ اشاعت ۱۸۵۰ء میں ہوئی" (ص: ۷۶)

اور حضرت نانوتوی کی ولادت ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں ہوئی اس کا مطلب ہوا کہ یہ حواشی حضرت نے

۱۷یا۱۸سال کی عمر میں لکھے (حضرت نانوتوی کا سن ولادت ۱۲۴۸ھ متعین ہے، اس سے مطابقت ۱۸۳۲ءیا۱۸۳۳ءہوتی ہے)۔

اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح بخاری کا یہ حصہ (آخری پانچ چھ پارے بالخصوص تین پارے) ایک اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے (جس کی طرف خود مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے، آگے تفصیل آرہی ہے) جو دوسرے حصوں کو حاصل نہیں، کیونکہ اسی میں امام بخاری نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے فقہی افکار پر بڑے تیکھے انداز میں تبصرے بلکہ تنقیدیں کی ہیں جن کی شدت بسا اوقات جارحانہ محسوس ہونے لگتی ہے، اس حصہ پر کسی حنفی کا حاشیہ لکھنا گویا امام اعظم کی طرف سے پوری وکالت اور بخاری کے اعتراضات وتنقیدات کے بھرپور علمی جواب دہی کی ذمہ داری قبول کرنا ہے، جو کوئی آسان کام نہیں اور اس کے لئے کسی عالم کا۔ بالخصوص نوعمری میں۔ کمر ہمت کس لینا بدون عبقریت کے ممکن نہیں، حضرت نانوتوی۔ جن کے عبقری ہونے میں شاید ہی کسی واقف کو کلام ہو۔۔۔نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو خوب سوچ سمجھ کر رکھا اور ہر باخبر کہہ سکتا ہے "حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا" کہنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاری کے "قال بعض الناس" کے پردے میں امام ابوحنیفہ پر اعتراضات کے یکجا جوابات کا مجموعہ "دفع الوسواس" (جو اصح المطابع کی مطبوعہ بخاری جلد ثانی کے بالکل شروع میں ملحق ہے) اسی قلم کا رہین منت ہے جو اپنی خودی مٹانے اور کمالات چھپانے میں ید طولی رکھتا تھا، "دفع الوسواس" کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے ناشر نے لکھا ہے: الذی صنفہ بعض المحققین والکملاء المدققین لم یظھر اسمہ ھضما لنفسہ (یہ کہنے والے ملک کے نامور اہل قلم اور تذکرۂ علماء ہند پر اتھاریٹی وسند سمجھے جانے والے محقق عالم مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ تھے، یہ بات موصوف نے خود راقم الحروف کے سامنے کہی)

حاشیہ یا شرح

اگر ضروری تشریحات محض کسی کتاب کے حاشیہ (کنارہ) پر چھپنے کی وجہ سے حاشیہ کا نام پانے کی مستحق قرار پاتی ہیں تب تو یقیناً حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری سے متعلق افادات کو حاشیہ کہنا درست ہے، ایسی صورت میں اہل مطابع کے سامنے پرزور طور پر یہ تجویز رکھنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اس حاشیہ کو کتاب کے حاشیہ (کنارہ) کے بجائے، حوضی میں چھاپیں کیونکہ (شرح یا شروح) کی جتنی

معنوی خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس حاشیہ (یا حواشی) کے اندر موجود ہیں۔

شرح کے امتیازات

کسی کتاب کی شرح کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ کتاب کے فہم کو آسان بنانے، اس پروارد ہونے والے اعتراضات رفع کرنے، اجمالات کی تفصیل، مبہمات کی توضیح، مغلقات کی تشریح، اغلاط کی نشان دہی۔ ممکن ہو توان کی ترجیح۔ فروگذاشتوں پر تنبیہ اور فن حدیث کی کتاب ہو تو رجال کی تحقیق، مراتب رواۃ و روایات کی تعیین، متعارض روایات میں تطبیق یا ترجیح، کسی خاص مسلک کے خلاف ہو، بالخصوص شارح کے مسلک کے خلاف ہو، تو اس کا جواب یا فن حدیث کے اصولوں پر تضعیف کرنا یہ ہیں شرح کی خصوصیات ہم جب حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری کے حواشی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ تمام خصوصیات ان میں نظر آتی ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انہیں صرف اس لئے حواشی کہنے پر اصرار کیا جائے کہ وہ کتاب کے حاشیہ پر طبع ہوئے ہیں حوضی کے اندر نہیں۔

حواشی بخاری کی خصوصیات

جیسا کہ اجمالاً ذکر آیا، مولانا نانوتویؒ کے ان حواشی میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، یہاں ان سب کی مثالیں پیش کرنے سے مضمون اتنا طویل ہو جائے گا کہ شاید پوری ایک نشست میں بھی اسے پورا پڑھنا مشکل ہو، راقم الحروف اپنے ــ سیمیناروں میں شرکت سے حاصل ہونے والے ــ تجربہ کی بنا پر اس اعتراف میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی مجالس مذاکرہ میں کہ جس کے اندر بہت سے اہل علم اپنے قیمتی افادات پیش کرنے تشریف لائے ہوں، کسی بہتر سے بہتر طویل مقالہ کی بھی سماعت کا تحمل آسان نہیں ہوتا چہ جائے کہ احقر جیسے، ہیچ میرز کی ٹوٹی پھوٹی تحریر کا، اس لئے بس چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے، یہاں یہ بتا دینا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ احقر نے مطالعہ کے بعد بہت سے مواقع کے حواشی پر نشان لگا لئے تھے تاکہ انہیں مقالہ کی زینت بنایا جائے، مگر نظر ثانی کے وقت اندازہ ہوا کہ ان سب کو مقالہ کے اندر سمونے سے مقالہ نہیں رہے گا، کتاب بن جائے گا، ظاہر ہے کہ سر دست کتاب نہیں مقالہ لکھنا پیش نظر ہے، اس لئے ان میں سے بہت سے قیمتی حواشی بادل ناخواستہ شامل نہیں کئے جا سکے اور اذا لم یدرک کلہ لم یترک کلہ کے حکیمانہ مقولہ پر عمل پیرا ہونے میں ہی مصلحت نظر آئی۔

مثال ۱ (حدیث کا مطلب واضح کرنے کی)

بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا انتبه من الليل ص:۹۳۵ میں ایک طویل حدیث آئی ہے جس کے آخر میں یہ ہے "اللهم اجعل في قلبي نورا.....واجعل لي نورا قال كريب وسبع في التابوت ......خط کشیدہ جملہ (سبع في التابوت) گویا ایک معمہ ہے جو یقیناً محتاج تشریح ہے کہ اس کے بغیر مطلب تک رسائی مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے حضرت امام نانوتوی لکھتے ہیں: قوله" سبع في التابوت "أي سبع أعضاء أخر في بدن الإنسان الذى كالتابوت للروح أوفي بدنه الذى ماله أن يكون في التابوت أي الجنازة وهى العصب واللحم والدم والشعر والخصلتان الأخريان لعلهما الشحم والعظم، أو المراد سبع أخر في الصحيفة مسطورة لا أذكرها أومكتوبة موضوعة في الصندوق، قال النووى يراد بالتابوت الأضلاع ومايحويه من القلب وغيره تشبيها بالتابوت الذى كا لصندوق يحرز فيه المتاع أى سبع كلمات فى قلبى ولكني نسيتها.... وقيل المراد سبع أنوار أخر كانت مكتوبة موضوعة فى التابوت الذى كان لبنى اسرائيل فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترك آل موسى و آل هارون".

حضرت نے یہاں متعدد احتمالات ذکر کیے جس میں سے کسی کو اختیار کر لینے کی آزادی معلوم ہوتی ہے، لیکن بہرحال مذکورہ شرح کے بغیر مصداق تک رسائی ناممکن تھی۔

مثال ۲ (سند کے بارے میں وضاحت اور غلط فہمی دور کرنے کی)

امام بخاریؒ نے "باب الدعاء على المشركين " کے اندر ایک حدیث بایں سند ذکر کی (ص:۹۴۶) حدثنا محمد بن المثنى قال حدثنا الانصارى قال حدثنا هشام بن حسان الخ اس پر حاشیہ میں فرماتے ہیں: قوله حدثنا الانصارى يريد محمد بن عبدالله بن المثنى القاضى وهو من شيوخ البخارى ولكنه ربما أخرج عنه بواسطة كالذى ههنا وقوله هشام بن حسان هذا وإن تكلم فيه بعضهم من قبل حفظه لكن لم يضعفه بذلك أحد مطلقا بل بقيد بعض شيوخه، واتفقوا على أنه ثبت فى الشيخ الذى

حدث عنه بحديث الباب وهو محمد بن سيرين قال سعيد بن أبي عروبة ماكان أحد أحفظ عن ابن سيرين من هشام بن حسان".

حاشیہ بالا محشی کی اسناد ورجال پر گہری نظر کا آئینہ دار ہے۔

مثال۳ (حل لغات کی)

قرب قیامت کی علامات میں رفع امانت بھی ہے جس کا ذکر حدیث بخاری میں بایں الفاظ آیا ہے: ص: ۹۶۲ "ینام الرجل النومة فتقبض الأمانة من قلبه فيظل أثرها مثل أثر الوكت ثم ينام النومة فتقبض فيبقى أثرها مثل المجل كجمر دحرجته على رجلك فنفط فتراه منتبرا وليس فيه شيئ الخ.

اس حدیث میں کئی الفاظ 'حل' کے متقاضی ہیں، چنانچہ دیکھئے امام نے یہ ذمہ داری بطریق احسن پوری کی:

أثر الوكت بفتح الواو وسكون الكاف وبالمثناة الأثر اليسير و قيل السواد اليسير و قيل اللون المحدب المخالف للون الذى كان قبله و المجل بفتح الميم وسكون الجيم وفتحها هو النفط الذى يحصل فى اليدين من العمل بفأس ونحوه و نفط بكسر الفاء...قال ابن الفارس النفط قرح يخرج في اليدين من العمل و منتبرا مفتعلا من الانتبار وهو الارتفاع ومنه المنبر لارتفاع الخطيب عليه والأمانة: المتبادر منها إلى الذهن المعنى المشهور منها وهو ضد الخيانة وقيل المراد منها هو التكاليف الالهية الخ.

اس تشریح سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت کی عربی لغت پر بھی گہری اور وسیع نظر تھی کہ دقائق پر بھی مطلع تھے۔

مثال۴ (بخاری پر گرفت)

عام طور ہر شراح اور محشین جس کتاب کو شرح وحاشیہ کے لئے منتخب کرتے ہیں وہ گویا طے کر لیتے ہیں کہ صاحب کتاب اور کتاب کی ہر بات کی حتی الامکان تائید اور تصویب کریں گے اور عموما ایسا ہی کرتے بھی ہیں، خواہ مصنف کی تائید وحمایت میں دور از کار تاویلات کا ارتکاب کرنا پڑ جائے، مگر

جس کا حجۃ الاسلام بننا مقدر تھا اور حق کا علمبردار ہونا مقدر تھا وہ بھلا یہ روش کیوں اختیار کرسکتا تھا، چنانچہ حضرت الامام نے متعدد مواقع پر صاحب کتاب (امام بخاریؒ) پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی فرگذاشتوں کی نشاندہی بھی، ان میں سے ایک موقع کتاب الاکراہ "باب اذا اکرہ حتی وھب عبدا أو باعہ لم یجز" میں ہے جہاں بخاری نے امام اعظم کی طرف کی حسب عادت "بعض الناس" کہہ کر دو فقہی قول منسوب کئے جن میں باہم تضاد ثابت ہوتا ہے، حضرت نے بتایا کہ ان قولوں کی یہ نسبت ہی (امام اعظم کی طرف) صحیح نہیں ہے، تفصیل کے لئے باب مذکور اور اس کا حاشیہ (اصح المطابع کی مطبوعہ بخاری میں صفحہ ۱۰۲۷ حاشیہ ۱۲، ۱۳) دیکھا جائے۔

مثال ۵ (سند میں امام بخاری کی غلطی کی نشاندہی)

یہ بات بڑی ہی تعجب خیز اور بظاہر چونکا دینے والی ہے کہ امام نانوتوی، امام بخاری جیسے عظیم محدث کی سند حدیث میں غلطی پکڑیں، مگر واقعہ کو کس طرح جھٹلایا جائے کہ بخاری شریف کے اس حاشیہ کا مطالعہ کرنے والا بظاہر یہ چونکا دینے والی حقیقت اپنی آنکھوں سے (صفحہ ۱۰۴۶ پر ج ۲) کتاب الفتن "باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب" میں دیکھ سکتا ہے، جہاں امام بخاریؒ نے ایک حدیث بایں سند نقل فرمائی ہے: مالك بن اسمعيل قال حدثنا ابن عيينة أنه سمع الزهری عن عروة عن زينب بنت أم سلمة عن أم حبيبة عن زينب بنت جحش "اس پر امام نانوتوی تحریر فرماتے ہیں: قوله عن زينب بنت أم سلمة عن أم جيبة أه قالوا هذا الاسناد منقطع وصوابه كما فی صحيح مسلم زينب عن حبيبه عن ام سلمة عن ام حبيبه عن زينب بزيادة حبيبة "اگرچہ آخر میں ایک توجیہ ایسی بھی ذکر کردی جس سے امام بخاری کے مرتبے کی لاج رہ جائے۔

مثال ۶ (امام نانوتوی کی تاریخ پر وسیع نظر کا ثبوت)

امام بخاریؒ نے کتاب الاحکام، "باب كيف يبايع الامام الناس" صفحہ ۱۰۶۹ میں یہ حدیث موقوف ذکر فرمائی ہے:...... حدثنا عبدالله بن دينار قال شهدت ابن عمر حيث اجتمع الناس على عبدالملك ... الخ اس پر امام نانوتوی نے بڑا ہی مفصل حاشیہ لکھا ہے جو موصوف کی تاریخ پر وسیع نظر کا آئینہ دار ہے، یہاں اس کے جستہ جستہ حصے پیش کئے جارہے ہیں،

فرماتے ہیں: قوله حيث اجتمع الناس على عبدالملك يريد ابن مروان بن الحكم والمراد بالاجتماع اجتماع الكلمة وكانت قبل ذلك متفرقة وكان في الأرض قبل ذلك اثنان كل منهما يدعى له الخلافة وهما عبدالملك بن مروان وعبدالله ابن الزبير فأما ابن الزبير فكان أقام بمكة ....بعد موت معاوية وامتنع من المبايعة ليزيد بن معاوية فجهز اليه يزيد الجيوش مرة بعد أخرى فمات يزيد وجيشه محاصرون ابن الزبيرو لم يكن ابن الزبير ادعى الخلافة حتى مات يزيد فى ربيع الأول سنة أربع وستين فبايعه الناس بالخلافة و بايع أهل الأفاق لمعاوية بن يزيد.... فلم يعش الا نحواربعين يوما فبايع معظم الأفاق لعبد الله ابن الزبيرو انتظم له الملك ...ولم يتخلف عن بيعته الاجميع بنى أمية ومن يهوى هواهم وكانوا بفلسطين فاجتمعوا علي مروان بن الحكم و بايعوه بالخلافة و خرج بمن أطاعه الى جهة دمشق. والضحاك بن قيس قد بايع فيها لابن الزبير فاقتتلوا ...؟ و غلب مروان على الشام ثم ... توجه الى مصرفحاصربها عامل ابن الزبير حتى غلب عليها ثم مات فى سنة .... وعهد إلى ابنه عبدالملك فقام مقامه وكمل له ملك الشام ومصر والمغرب ولابن الزبير ملك الحجاز والعراق والمشرق إلا البصرة غلب عليه المختار بن عبيد ثم صار اليه مصعب بن الزبير... وانتظم أمر العراق كله لابن الزبير فصار عبدالملك الى مصعب فقاتله و ملك العراق كله ولم يبق مع ابن الزبير الا الحجاز واليمن فقط فجهز اليه عبدالملك الحجاج فحاصره .... إلى أن قتل عبدالله ابن الزبير فى جمادى الأولى سنة ٧٣ وكان عبدالله بن عمر فى تلك المدة امتنع أن يبايع لابن الزبير و عبدالملك كما امتنع أن يبايع لعلى ولمعاوية ثم بايع لمعاوية لما اصطلح مع الحسن بن على واجتمع الناس وبايع لمعاوية بن يزيد بعد موت معاوية لاجتماع الناس عليه ثم امتنع من المبايعة لأحد حال الاختلاف إلى أن قتل ابن الزبير و انتظم الملك كله لعبد الملك فبايع حينئذ فهذا معنى قوله لما اجتمع الناس" (بحذف يسير)

حواشی کے بارے میں کچھ اور

یہاں بس ان چند نمونوں کے پیش کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے،ہوسکتا ہے کسی کو یہ احساس ہو کہ اختلافی مسائل پر فقہ حنفی کو ترجیح دینے کی ایک بھی مثال نہیں پیش کی گئی مگر راقم نے جان بوجھ کر اس سے گریز کیا کیونکہ اس کے نمونے تو جا بجا ملتے ہیں ، بلکہ ان میں یہی پہلو غالب ہے جس کی طرف اشارہ خود اولین سوانح نگار مولانا کے ہمدم وہم ساز مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے حواشی کی خصوصیات ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''اور وہ جگہ (جس پر حضرت نانوتویؒ نے قلم اٹھایا) بخاری میں سب جگہ سے زیادہ مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کیے ہیں اور ان کے جواب لکھے ،معلوم ہے کہ کتنے مشکل ،اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھے اور سمجھے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے''۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ حاشیہ کی ایک مزید خصوصیت یہ بتاتے ہیں:

''اور اس حاشیہ میں یہ التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے''

ان دونوں خصوصیتوں کے اس حاشیہ میں موجود ہونے کی ہر وہ شخص شہادت دے گا جس نے ان کا تھوڑا بہت بھی حتیٰ کہ چند صفحوں کا بھی مطالعہ کیا ہے، بے سند کتاب کے (بغیر حوالہ کے) کوئی بات نہ لکھنے کا اندازہ اس فہرست سے کیا جاسکتا ہے، جو شروع کتاب میں (پہلی جلد کی ابتداء میں) اصل محشی مولانا احمد علی صاحبؒ نے درج فرمائی ہے، اس میں مختلف علوم وفنون کی ۶۴ کتابوں کے نام لکھنے کے بعد وغیر ذلك فرمایا، جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ بھی دیگر کتابوں سے حاشیہ لکھتے ہوئے استفادہ کیا گیا ہے یقیناً وہ سب مراجع حضرت نانوتوی کے بھی پیش نظر رہے ہوں گے (اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے جب کہ مطبوعہ کتابوں بالخصوص فن حدیث سے متعلق کی کمیابی بلکہ نایابی کی شکایت عام تھی کے پیش نظر فہرست میں مندرج تعداد غیر معمولی ہی سمجھی جائے گی)۔

حنفیت کی تائید

صاحب سوانح نے دوسری خصوصیت (حنفیت کی تائید) سے متعلق جو کچھ لکھا وہ بھی ہر ایک واقف پر عیاں ہے،اس کا التزام یوں تو ہندوستان کے تقریباً سبھی حنفی شارحین حدیث وحاشیہ نگاروں

نے کیا ہے، کیوں کہ ان کا مسلک یہی (فقہ حنفی) تھا، مگر حضرت الامام النانوتویؒ کے لئے ایک اور محرک بھی تھا جس کا ذکر مولانا مناظر احسن گیلانی (مفصل سوانح قاسمی کے مصنف اور نہایت ذہین اور کثیر المطالعہ والتصانیف متبحر عالم) نے سوانح قاسمی'' کی جلد اول میں تفصیل سے کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت الامام نے ایک خواب دیکھا تھا کہ:

''کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شے پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر آئی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے''

اس خواب کی تعبیر مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ دی کہ:

''خواب دیکھنے والے شخص سے مذہب حنفی کو تقویت ہوگی''

(مولانا کے بارے میں مشہور ہے کہ موصوف کو تعبیر خواب کا ملکہ حاصل تھا) اس خواب کے تذکرہ کے بعد مولانا گیلانی تحریر کرتے ہیں:

میرے نزدیک اس میں اشارہ ہے... کہ تیرھویں صدی (ہجری) کے آخر میں مسلمانان ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنہ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آ گیا تھا اور قریب تھا کہ یک جہتی کا شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہو جائے، شتر بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ سلف کے سارے کارنامے شاید تہہ و بالا ہو کر رہ جائیں، اس کڑے وقت اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کام کیا... کہ فرقہ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہتے ہیں، ان حملوں کے مقابلوں میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے (۳)

مولانا احمد علیؒ اور امام نانوتویؒ کے حاشیے میں کیا فرق ہے؟

(۳) سوانح قاسمی جلد اول ۱۳۴، از مولانا گیلانی مطبوعہ دار العلوم دیوبند)

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حواشی بخاری شریف کے تین چوتھائی سے زیادہ حصے پر ہیں، صرف آخر کے پانچ چھ پاروں (تیس پاروں میں سے) پر حضرت مولانا نانوتوی کے حاشیہ کا ذکر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے کیا ہے، لیکن متعین اور یقینی طور پر اس کا پتہ کسی اور ذریعہ سے نہیں چلتا کہ واقعتاً کتنے پاروں پر حضرت الامام نے تحشیہ کا کام کیا، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی حتمی انداز میں تعیین نہیں کی (پانچ چھ پارے کی تعبیر اختیار کر کے گویا ابہام چھوڑ دیا) ہم جیسے قلیل البضاعت لوگوں کا منصب نہیں کہ دونوں میں تقابل کر سکیں، پھر بھی مطالعہ کرنے سے مولانا سہارنپوری کے یہاں نسبتاً اختصار اور حضرت نانوتوی کے یہاں تفصیل کا فرق دریافت ہوتا ہے اور یہ فرق آخر کے تین پاروں کے حواشی میں زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے شاید اسی بنا پر بعض اہل بصیرت کا خیال ہے کہ حضرت نانوتوی نے آخر کے تین پاروں پر ہی حواشی لکھے (واللہ اعلم)۔

☆☆☆

مولانا محمد ابوبکر غازی پوری*

مناظر اسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہمہ جہت عبقری شخصیت کے مالک تھے کہ ان کی زندگی کا ہر کارنامہ اپنی جگہ منفرد اور بے مثال نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد متحدہ ہندوستان میں اسلامی تعلیمات، اقدار اور تہذیب کی شمع کو کلیسا کی تیز و تند آندھی سے محفوظ رکھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں جو انھوں نے ایمانی و عرفانی فانوس قائم کی وہ آپ کی دینی بصیرت اور ایمانی حمیت کی زندہ یادگار کے طور پر آج بھی موجود ہے۔ اور حضرت نانوتویؒ کے کارناموں میں سرفہرست ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہر خاص و عام کو ہے لیکن مولانا نانوتویؒ نے عیسائیت، آریہ سماج اور دیگر اسلام مخالف مذاہب کا جس عزیمت کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کے ذریعہ رد و ابطال کیا ہے اس کی تفصیلات سے عوام تو کیا علماء کرام تک پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ اپنے دیگر علمی کمالات کے ساتھ ایک باکمال اور کامیاب ترین مناظر بھی تھے۔ کسی اچھے مناظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ پختہ علمی صلاحیت کا مالک ہو۔ جس حلقے کی نمائندگی کر رہا ہو اس کے نظریات، خیالات، معتقدات اور مستدلات پر بصیرت مندانہ گہری نظر کا حامل ہو۔ دوسری طرف فریق مخالف کے مذہب و عقائد سے پوری واقفیت ہو۔ اس کے استدلالات پر بھی نظر ہو۔ اور فریق مخالف کی کمزوریوں سے بھی واقفیت ہو۔ ساتھ ہی ساتھ خود اعتمادی اور عزیمت کا ایسا پیکر ہو کہ فریق مخالف کا کوئی حربہ بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے اور کوئی بھی یلغار اس کے پائے استقامت میں جنبش پیدا نہ کر سکے۔ انداز بیان و تحریر ایسا مؤثر ہو جو دانشمند اور صاحب علم طبقہ کو بھی مطمئن کر سکے اور عوام پر بھی اثر انداز ہو۔

---

* قاسمی منزل، سیدواڑہ، غازی پور (یوپی)

مولانا نانوتویؒ کے مناظروں اور مباحثوں کی جو تفصیلات ہمیں سوانح نگاروں کے توسط سے ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان ساری مناظرانہ خصوصیات کے بہ درجۂ اتم پیکر و مظہر تھے۔

اور یہ بات تو انتہائی حیرت انگیز ہے کہ وہی مولانا نانوتویؒ جن کی تفصیلات کی گہرائی تک بڑے بڑے اہل علم کی رسائی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اور ۱۴-۱۴ مرتبہ آب حیات کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی جیسا متبحر عالم یہ کہنے پر مجبور ہو کہ کتاب سے کچھ کچھ مناسبت ہو گئی ہے، وہی مولانا نانوتوی جب میلۂ خداشناسی میں پادری نولس، پادری واکر اور پنڈت دیانند سرسوتی کے خلاف مجمع عام میں گوہر فشاں ہوتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ دانشور اور اہل علم طبقہ مولانا کے طرز بیاں اور قوت استدلال سے مسحور نظر آتا ہے بلکہ ناخواندہ عوام بھی پورے طور پر محظوظ ہوتے ہیں اور باطل کے مقابلہ میں حق کی نمایاں فتح کو محسوس کرتے ہیں۔ اس باب میں حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کا ایک نمایاں کمال یہ بھی ہے کہ حضرت نے بیک وقت ایسے مختلف النوع موضوعات پر مناظرہ اور تحریر و تصنیف کا بیڑہ اٹھایا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔

ایک طرف عیسائیوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں تو دوسری طرف آریہ سماجیوں سے لوہا لینے میں مصروف ہیں۔ کبھی رد شیعیت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، کبھی غیر مقلدین کے تفردات کا رد بلیغ فرما رہے ہیں۔

اگرچہ مولانا نانوتویؒ کے دوبدو مناظروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن اس سلسلہ کی مختصر و مفصّل تصانیف اور رسائل انتہائی وقیع ہیں۔ اس طرح آپ کی مناظرانہ کاوشوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تقریری مناظرے۔ تحریری مباحثے۔

اس تمہید کے بعد ہم ذیل میں حضرت نانوتوی کے مناظروں کی کچھ تفصیل پیش کرنا چاہیں گے۔

پہلی گفتگو

حضرت نانوتویؒ جن دنوں مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور وہیں مقیم تھے، انھیں ایام میں ایک ہندو عیسائی ماسٹر تاراچند عیسائیت کے فضائل اور مناقب کے بیان میں بڑا پرجوش تھا اور مجمع عام میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اعتراضات کرتا تھا۔ حضرت نانوتوی نے

جب تفصیل سنی تو اپنے شاگرد سے فرمایا کہ تم لوگ بھی مجمع عام میں جاؤ اور تاراچند کی باتوں کا جواب دو۔ اور اس کی باتوں کا رد کرو۔ ایک دن آپ اپنے کو نہ روک سکے خود ہی عام آدمیوں کی وضع قطع اور معمولی لباس میں تاراچند کے پاس پہنچے اور چند باتوں میں اس کو اس طرح گھیرا کہ اس کی ساری چوکڑی بھول گئی اور جواب کے لئے اس کی زبان ہی نہ کھل سکی جبکہ مجمع عام میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ نہایت خفیف اور رسوا ہوا۔ وہاں سے اٹھا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔

میلۂ خداشناسی

اب پادریوں نے بھی یہ طریقہ اپنایا کہ کسی مسلمان یا ہندو کا نام استعمال کرتے اور ان کے نام سے اجتماعات کرتے۔ در پردہ ساری پلاننگ پادریوں کی ہوتی تھی بس منتظم کوئی ہندوستانی ہوتا تھا۔ اس طرح کی ایک کوشش ضلع شاہجہاں پور میں ایک کبیر پنتھی ہندو کے ذریعہ کی گئی۔ اور اجتماع کا نام ''میلۂ خداشناسی'' رکھا گیا۔

اس کے داعی منشی پیارے لال چاند پور ضلع شاہجہاں پور کے ایک جاگیردار تھے۔ شاہجہاں پور میں ایک مشن اسکول تھا اس کا ہیڈ ماسٹر ایک انگریز پادری تھا، جس کا نام مسٹر نولس تھا، دونوں میں رسم و راہ تھی۔ مسٹر نولس نے پیارے لال کو تیار کیا کہ وہ اپنی مملوکہ زمین اور باغ موضع سربانگ پور ملحق سوانہ چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں ایک میلہ کا انتظام کریں، اس میلے کا نام ''میلۂ خداشناسی'' ہو۔ اس میلہ میں ہند اور مسلمان دونوں کو جمع کرو اور کوشش کرو کہ اطراف و جوانب کے عوام بڑی تعداد میں شریک میلہ ہوں۔ پادری نولس کا مقصد یہ تھا کہ اس دیار کے مسلم و غیر مسلم جمع ہوں گے اور اس مجمع میں سوال و جواب اور اعتراضات کا ایک دفتر کھول کر مسلمان علماء کی زبان اگر بند کردی گئی تو تبلیغ عیسائیت کی راہ کی ساری دشواریاں ایک دن میں ختم ہو جائیں گی۔ پادری نولس کو کچھ تو اپنی قابلیت پر زیادہ بھروسہ تھا دوسرے چند بڑے بڑے پادریوں سے بھی اس کا رابطہ تھا اور ان کو میلے میں لانے کا منصوبہ تھا، اس لئے اس کو یقین تھا کہ سارے پادری مل کر اپنے زور بیاں، زور دلائل اور حاکمانہ رعب داب سے مسلمانوں کی زبان بند کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس میلہ کو خوب شہرت دی گئی، اس میں یوروپین پادریوں کے علاوہ دیسی پادریوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اور سناتن دھرم کے نمائندوں کے ساتھ حضرت نانوتویؒ

اور بعض دیگر علماء کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔

اس مباحثہ کی تفصیلی روداد حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے ''مباحثہ شاہجہاں پور'' کے نام سے مرتب کی اور اسی زمانہ میں وہ شائع بھی ہوگئی۔

مباحثہ شاہجہاں پور کے اقتباسات کی روشنی میں مولانا اسیر ادروی نے اپنی کتاب ''مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے'' میں مباحثہ کا نقشہ بڑے ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔

اس مباحثہ میں اہل اسلام کو کھلی فتح نصیب ہوئی۔ پادریوں کا منہ کالا ہوا اور موافق و مخالف ہر ایک کو اس کا اعتراف تھا کہ میدان نیلی لنگی والے (حضرت نانوتویؒ) کے ہاتھ رہا۔

اس میلہ کے پس پردہ پادریوں اور سناتن دھرمیوں کی جو سازش تھی وہ بری طرح ناکام ہوگئی۔

اس موقعہ پر اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کی تردید میں حضرت نانوتوی نے جو مفصل اور برجستہ تقریریں فرمائی ہیں ان میں تعلّی اور خودستائی کی معمولی سی بو بھی نہیں ہے۔

اس مباحثہ میں اہل اسلام کو ایک نمایاں کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ حضرت نانوتویؒ اور ان کے معاونین نے تمام دیسی اور یوروپین پادریوں سے برملا یہ اقرار کرالیا کہ موجودہ انجیل محرف ہے۔اور انجیل کا وہ نسخہ بھی پیش کردیا جس میں موجود ایک عبارت کے بارے میں کئی سرکردہ پادریوں کا یہ حاشیہ موجود ہے کہ ''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''۔ پادریوں کی اسی شرمناک شکست سے ان کا وہ خواب چکنا چور ہوگیا جو ہندوستان میں بے روک ٹوک عیسائیت کے فروغ کے لئے انہوں نے دیکھا تھا۔

اس مباحثہ کے دوران ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب بانی آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی نے بھی اسلام کے خلاف اپنے خودساختہ مذہب کی حقانیت کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس طرح اسلام کے خلاف پادری اور پنڈت جی ایک دوسرے کے ہمنوا ہو گئے۔ان دونوں کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو تقریر فرمائی وہ بھی ایک شاہکار تقریر ہے۔اور اس کے بعد پھر مخالفین میں گفتگو کی سکت باقی نہیں رہی۔

رڑکی کا محاذ

ہندوؤں میں ایک نیا مذہب آریہ سماج کے نام سے پیدا ہوا جس کا بانی پنڈت دیانند سرسوتی تھا جو بظاہر مورتی پوجا کے خلاف تھا اور خود کو وحدانیت کا علمبردار کہتا تھا۔ بے حد گستاخ اور بدزبان انسان

تھا۔ اسلام، شعائر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر افشانی اس کا خاص مشغلہ تھا۔ اس نے ستیارتھ پرکاش نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ دیانند سرسوتی کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔

یہ شخص شہروں شہروں گھوم کر اسلام کے خلاف دل آزار اور زہر آلود تقریریں کرتا تھا۔ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں دیانند سرسوتی رڑکی پہنچا اور وہاں بھی تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا لب ولہجہ انتہائی دل آزار اور جارحانہ ہوتا تھا۔ ان تقریروں کی وجہ سے رڑکی کے مسلمانوں میں بے چینی اور غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ رڑکی کے ذمہ دار مسلمانوں نے حضرت نانوتویؒ کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے گذارش کی کہ آپ رڑکی تشریف لائیں تاکہ اس کی ہفوات کا سلسلہ بند ہو۔ حضرت نانوتویؒ کی صحت ان دنوں ٹھیک نہیں تھی۔ طبیعت مسلسل ناساز چل رہی تھی۔ حضرت نانوتوی نے اپنے تلامذہ میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور عبد العدل صاحبؒ کو رڑکی روانہ کیا اور کہا کہ اگر ضرورت سمجھیں تو پنڈت جی سے بالمشافہ گفتگو کرلیں اور ان سے سوال وجواب کر لیں اور پھر مجمع عام میں پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دے دیں۔ ان حضرات نے راستہ میں جوالا پور سے مولانا منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ساتھ لے لیا اور چاروں حضرات رڑکی پہونچے۔ ادھر صورت حال یہ تھی کہ پنڈت جی تقریریں تو رڑکی کے شہری علاقہ میں کرتے تھے مگر ان کا قیام فوجی چھاونی کے علاقہ میں تھا۔ فوجی ایریا ہونے کی وجہ سے کسی کا وہاں تک پہونچ پانا بہت دشوار تھا۔ پھر بھی کسی طرح یہ علماء کرام وہاں کے چند معزز مسلمانوں کو لیکر پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہونچ ہی گئے۔ اور پنڈت جی سے مطالبہ کیا کہ یہ علماء کرام تشریف لائے ہیں آپ کے جتنے اعتراضات ہیں پیش کیجئے یہ سب کا جواب دیں گے۔ لیکن پنڈت جی کسی قیمت پر گفتگو کے لئے تیار نہیں ہوئے اور بڑی ہٹ دھرمی سے جواب دیا کہ مجھے آپ لوگوں سے کوئی بات نہیں کرنی ہے نہ میں نے چیلنج کیا ہے۔ ہاں اگر مولانا قاسم صاحب آجائیں گے تو ان سے گفتگو کے لئے تیار ہوں، مجبوراً یہ لوگ واپس آگئے اور حضرت کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

ادھر پنڈت جی کی زہر افشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اہل رڑکی کی طرف سے حضرت نانوتویؒ سے دوبارہ گذارش کی گئی کہ جناب تشریف لائیں تاکہ اس فتنہ کا قلع قمع ہو۔

حضرت نانوتویؒ نے سمجھ لیا کہ بغیر سفر کے چارۂ کار نہیں ہے۔ صحت سفر کے لائق نہیں تھی لیکن اپنے مذکورہ بالا چاروں شاگردوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رڑکی پہونچے۔

حضرت نانوتویؒ کے رڑکی پہنچتے ہی ہر طرف سے مسلمانوں کے وفود آنے لگے اور آپ کی قیام گاہ پر ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ آپ شہری علاقہ میں قیام پذیر تھے اور پنڈت جی وہاں سے ڈیڑھ میل کی مسافت پر فوجی ایریا میں براجمان تھے۔ آپ نے ایک تحریر لکھی کہ میں آ گیا ہوں وقت متعین کر کے فوراً مطلع کیجئے، مناظرہ کی جو شرائط ہوں اور جس موضوع پر بھی مناظرہ منظور ہو وہ سب ہم کو تسلیم ہے، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ یہاں آپ کے جواب کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ چونکہ ان میں مناظرہ کی ہمت تو تھی نہیں اس لئے ہزاروں بہانے کئے، نہ تاریخ مقرر کی، نہ آنے کا وعدہ کیا۔

مولانا نے دوسری اور پھر تیسری تحریر بھیجی لیکن پنڈت جی کسی طرح قابو میں نہیں آئے۔ واقعات میں تفصیل بہت ہے مختصر یہ کہ حضرت نانوتویؒ نے تدبیر سے کسی طرح پنڈت جی کو گھیر لیا اور ان کو کسی بھی قیمت پر گفتگو کرنے کے لئے مجبور کیا مگر وہاں تو معاملہ دوسرا تھا۔ پنڈت جی نے راتوں رات رڑکی سے راہ فرار اختیار کر لی۔

حضرت نانوتویؒ نے اپنے چاروں شاگردوں سے فرمایا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں روزانہ جلسے کرو اور آریہ سماجیوں کے ایک ایک عقیدہ کو کھول کر رکھ دو، اور انکے اعتراضات کے مفصّل جواب دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہ حضرات پندرہ دن رڑکی میں مقیم رہے۔

آخر میں حضرت نانوتویؒ نے خود تین دنوں تک مسلسل وعظ فرمایا۔ آپ نے مذہب اسلام کی حقانیت پر ایسے ایسے عقلی، تجرباتی اور مشاہداتی دلائل و براہین بیان فرمائے کہ غیر مسلم بھی کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گئے۔

پنڈت جی میرٹھ میں

رڑکی کا طوفان تھمنے کے کچھ ہی مہینوں کے بعد پنڈت جی میرٹھ پہونچے اور وہاں بھی وہی طوفان بدتمیزی اٹھانا شروع کیا۔ حضرت نانوتویؒ کو اطلاع ہوئی اور اپنی شدید علالت کے باوجود میرٹھ تشریف لے گئے۔ یہاں بھی پنڈت جی کو گھیر گھار کر گفتگو کے لئے آمادہ کرنا چاہا مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور آخر کار چپکے سے میرٹھ سے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

آریہ سماجیوں کا فتنہ جس تیور کے ساتھ اٹھا تھا اگر حضرت نانوتویؒ اور ان کے تلامذہ نے اس پامردی اور اولوالعزمی کیساتھ اس کا تعاقب نہ کیا ہوتا تو معلوم نہیں حالات کا کیا رُخ ہوتا۔

حضرت نانوتویؒ نے آریہ سماجیوں کا تعاقب صرف بالمشافہہ گفتگو اور تقریروں ہی کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ پنڈت دیانند اور اس کے ٹولہ کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے تمام اعتراضات کے جواب میں متعدد وقیع علمی کتابیں اور رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

تحفۂ لحمیہ، انتصار الاسلام، جواب ترکی بہ ترکی، قبلہ نما، حجۃ الاسلام اور تقریر دل پذیر، حضرت نانوتویؒ کی اسی سلسلہ کی تصانیف ہیں۔

ردشیعیت

شیعہ نوابوں اور امراء کی سرپرستی اور عوام الناس کی جہالت کی وجہ سے بہت سے شیعی عقائد سنی مسلمانوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ اور بہت سی خالص شیعی رسومات ان میں رائج ہوگئی تھیں۔ علاوہ ازیں شیعہ اپنے مزعومات کو اسلامی تعلیمات کا رنگ دینے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے تھے۔

حضرت نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے ردشیعت کے سلسلہؒ میں کئی رسائل لکھے اور اپنے مکاتیب میں بھی ان موضوعات پر متعدد خطوط تحریر فرمائے ہیں۔

شیعہ مجتہد سے مباحثہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام جن دنوں میرٹھ میں تھا اسی زمانہ میں ایک شیعہ مجتہد سے حضرت نانوتویؒ کا ایک بہت ہی دلچسپ مُباحثہ ہوا۔ یہ مجتہد صاحب شیعوں کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے اور اہل سنت کے لئے شمشیر برہنہ مانے جاتے تھے۔ مگر حضرت نانوتویؒ سے انکی ملاقات ان کے لئے حادثہ بن گئی۔

اس ملاقات کی داستان خود حضرت نانوتویؒ نے اپنے ایک دوست حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ کے نام خط میں بہ زبان فارسی تحریر فرمائی ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے عام وضع قطع میں مجتہد صاحب سے ملاقات کی اور اُن کے استفسار پر اپنا تعارف تاریخی نام خورشید حسن کے ذریعہ کرایا۔ گفتگو زیادہ طویل نہیں ہوئی لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجتہد

صاحب کی ہمہ دانی کا راز کھل گیا اور ان کے لئے خاموشی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں بچا۔

غیر مقلدین کے بالمقابل

غیر مقلدیت کا فتنہ ابھی جلد ہی شروع ہوا تھا، اور ان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ جاری تھی، حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلدین کے رد میں مختلف فیہ مسائل میں متعدد رسائل تصنیف فرمائے اور اپنے مکتوبات میں بھی ان مسائل پر کلام فرمایا۔ جمعہ فی القریٰ، رکعات تراویح، قرأت فاتحہ خلف الامام اور حیاۃ النبی کے مسائل پر حضرت کے رسائل و مکاتیب اہل علم کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں۔

اس کے علاوہ بدعات اور جاہلانہ رسومات و معتقدات کے خلاف بھی متعدد رسائل اور مکاتیب تحریر فرمائے۔

مختصر یہ کہ حضرت نانوتویؒ نے پرچم اسلام کی سربلندی اور حریم سنت کی پاسبانی کے لئے ہر محاذ پر لوہا لیا اور تقریر و تحریر، مناظرہ مباحثہ کے ذریعہ وہ بے مثال کارنامہ انجام دیا جو ایک جماعت سے بھی ممکن نہ تھا۔ (۱)

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں۔ حضرت نانوتوی کے رسائل۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے، تالیف: مولانا اسیر ادروی۔ سوانح قاسمی، تالیف: مولانا مناظر احسن گیلانی۔

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی*

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مکتوبات گرامی، ان کے مضامین اور مکتوب الیہ

(مختصر تعارف)

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ کی ذات گرامی سے علم کے جو دھارے بلکہ دریا جاری ہوئے ان کی وسعت وثروت اور ثمرات ومنافع کا جائزہ لینا اور اندازہ کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، آج برصغیر بلکہ دنیا کے تمام ملکوں اور براعظموں کا کون ساخطہ ایسا ہے جہاں حضرت مولانا کی ذات عالی سے جاری فیضان کے چشمے نہیں ابل رہے اور خصوصاً برصغیر ہندوپاکستان میں علم نافع یعنی علوم دین وشریعت کی کون سی شاخ اور کون سا چمنستان ایسا ہے جو فیضان قاسمی سے منور اور کسی نہ کسی راستہ اور واسطہ سے علوم قاسمی سے فیضاب وبہرہ ور نہیں ہے؟

مگر یہ بات اہم اور حیرت انگیز ہے کہ حضرت مولانا کا یہ فیضان ''دارالعلوم دیوبند'' کے علاوہ آپ کی صرف چند تصانیف کی برکت اور آپ کے ان علوم کا ایک پرتو ہے، جن کا بہت کم حصہ قلم بند ہوا اور جو قلم بند ہوا اس میں سے خاصا حصہ محفوظ نہیں رہ سکا اور جو محفوظ اور باقی رہا وہ بھی پورا کا پورا نہیں چھپا اور اس کا تقریباً ایک تہائی حصہ یا کچھ کم ابھی تک اشاعت سے محروم ہے، لیکن حضرت کے علوم کا جس قدر بھی سرمایہ محفوظ ہے اس میں حضرت کا اپنا لکھا ہوا بڑا حصہ وہ ہے جو حضرت کے مکتوبات میں محفوظ ہوگیا ہے۔ حضرت کی تصانیف بہت کم ہیں، کیوں کہ حضرت مولانا کی تصنیف کی طرف توجہ کم تھی، لیکن جس قدر بھی ہیں ان میں سے کم ایسی ہیں جو شروع سے آخر تک حضرت نے تحریر فرمائی ہوں، بے شک کچھ تصانیف تو ایسی ضرور ہیں جو حضرت مولانا نے خود لکھی ہیں، مگر حضرت کے نام سے معروف کتابوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو حضرت مولانا نے لکھنی شروع کی تھیں مگر ان کو پورا کرنے کا موقع

---

* محلہ مولویان، کاندھلہ، مظفر نگر (یوپی)

نہیں ملا۔ مولانا کے کسی شاگرد نے اس کو پورا کیا، یا کوئی تقریر تھی جس کو کسی نے لکھ لیا اور ایسا بھی ہے کہ حضرت کے افادات کو کسی شاگرد نے مرتب کیا اور وہ کتاب حضرت کے نام سے چھپی اور اسی حیثیت سے مشہور ہوئی، لیکن حضرت مولانا کے مکتوبات کا معاملہ اس سے مختلف ہے، حضرت مولانا کے جو مکتوبات چھپے ہوئے ہیں یا معلوم ہیں حضرت مولانا سے ان کی نسبت ہر پہلو سے مستند ہے، خطوط کا بہت بڑا حصہ خود مولانا کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے اور جو خطوط املاء کرائے ہیں ان کا حرف حرف حضرت مولانا کی زبان سے نکلا ہوا یا مولانا کی ہدایت کے مطابق لکھا ہوا ہے اور ان مکتوبات میں جو کچھ بھی علمی افادات، ذاتی احوال اور دوسری معلومات ہیں اس میں کسی دوسرے کی شرکت کا سوال ہی نہیں۔ اس پہلو سے قطع نظر اگر بحیثیت مجموعی بھی دیکھا جائے تو بھی مکتوبات کا حصہ اپنی معنویت اور علمی افادی پہلو میں اگر تصانیف کے ذخیرہ سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں ہے۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کی جمع و ترتیب کا کام سب سے پہلے کب شروع ہوا اور کس نے انجام دیا اس کی تحقیق نہیں، مگر جو مجموعہ سب سے پہلے شائع ہوا وہ قاسم العلوم ہے، جس کے جامع، مرتب اور ناشر مطبع مجتبائی کے بانی و مالک منشی ممتاز علی میرٹھی تھے، اس کے بعد اور متعدد حضرات نے مختلف حیثیتوں سے مختلف عنوانات کے تحت اپنی اپنی پسند یا دستیاب مکتوبات کے مطابق علیحدہ علیحدہ مجموعے مرتب کیے۔

پھر ان مجموعوں کی الگ الگ کیفیت ہے، کچھ ان میں سے آج تک شائع نہیں ہوئے، کچھ ایک مرتبہ چھپے ہیں، چند کی بار بار اشاعت ہوئی اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا کوئی حصہ چھپا کوئی نہیں چھپا اور کئی مجموعے ایسے ہیں جو ایک مرتبہ چھپ کر گمنام ہو گئے، اسی میں ایک مجموعہ ایسا بھی ہے (فرائد قاسمیہ) جو تقریباً بیس سال پہلے بڑی جدوجہد کے بعد پہلی بار چھپا تھا، غالباً اب وہ بھی کم یاب ہے، نیز حضرت کے مکتوبات کے کم از کم تین مجموعے ایسے ہیں جو اب تک نہیں چھپے بلکہ ان کا عموماً علم اور تعارف بھی نہیں اور حضرت کے تقریباً پچیس گرامی نامے ایسے بھی ہیں جو کم از کم ایک مرتبہ چھپے ہیں، لیکن وہ ایسی کتابوں یا مجموعوں میں شامل ہیں کہ ان کتابوں کے نام یا عمومی تعارف سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں حضرت مولانا کے گرامی نامے شامل ہوں گے، لہذا یہاں ان سب کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مولانا کے مکتوبات کے ان مجموعوں کا ذکر آئے گا جو چھپے ہوئے اور

نسبتاً متعارف ہیں، اس کے بعد ان مکتوبات کا جو اور کتابوں اور مجموعوں میں چھپے ہوئے ہیں، آخر میں میں ان گرامی ناموں اور مکتوبات کے مجموعوں کا ذکر ہوگا جن کا صرف ایک ایک نسخہ معلوم ہے اور وہ بھی غیر متعارف ہے۔

حضرت مولانا کا علمی موضوعات پر لکھنے کا بہت کم معمول تھا، خاص طور سے متنازعہ یا اختلافی موضوعات پر لکھنے سے خاص احتیاط کرتے تھے، لیکن اگر حضرت مولانا سے بطور خاص کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا، اور حضرت مولانا کے جواب یا تحقیق سے اس الجھن کے دور ہونے یا مسئلہ کی تحقیق پر اطمینان کی امید ہوتی تھی، یا کسی دینی شرعی مسئلہ کی عقلی وجہ معلوم کی جاتی، اس وقت حضرت مولانا کا قلم حرکت میں آجاتا تھا، ورنہ عموماً حضرت مولانا خاموش رہتے تھے اور اختلافی مباحث و مسائل سے کنارہ کش رہنے کی پوری کوشش فرماتے تھے۔ حضرت مولانا نے اپنے اس مزاج و مذاق اور معمول کا ایک خط میں اس طرح ذکر فرمایا ہے:۔

> ''یہاں تک نوبت پہونچی کہ ترجمہ کرنے والے بلکہ ترجمہ پڑھنے والے اپنے فہم کے پیرو ہوگئے۔ مولانا صاحب! یہ نوبت پہونچی تو ایسے وقت استفتاء اور فتوی کس مرض کی دوا ہے، بجز اس کے اختلاف سابق میں ایک اور شاخ نکل آئے۔
>
> اب دہریہ اور جہنیہ جدا جدا ہوگئے، ہر کوئی اپنے وضع کی سنتا ہے، مولویوں کی بات اگر سنتے ہیں تو اس کان سے آئی دوسرے کان سے نکل گئی۔ ایسے وقت میں اس حدیث پر عمل کا وقت ہے:
>
> **اذا رأيت هوى متبعا و شحا مطاعا و دنيا مؤثرة و إعجاب كل ذى رأى برأيه فعليك بخاصة نفسك و دع امر العوام، او كما قال.**
>
> علاوہ بریں اپنی کم علمی اور بے سروسامانی سے اب تک مسائل ضروریہ مشہورہ میں بھی مجھ کو جواب دینے کا اتفاق نہیں ہوتا، ہاں اتنی بات ہے کہ اگر مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور احباب کو اس کی وجہ کی تلاش ہوتی ہے اور مجھ تک مشورہ کی نوبت آتی ہے تو اگر بذریعہ خطوط استفسار کی نوبت آتی ہے تو کبھی کبھی بہت سے تقاضاؤں کے بعد تحریر کا اتفاق ہو جاتا ہے''۔ (۱)

مگر آخر میں اس سے بھی احتیاط فرمانے لگے تھے، اس کی وجہ بھی حضرت مولانا کے اسی خط

(۱) مکتوب بنام نصر اللہ خاں صاحب۔ فرائد قاسمی ص: ۹۵-۹۶ (دہلی: ۱۳۰۰ھ)

سے معلوم ہو رہی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''اب اس سے بھی احتراز ہی اولی معلوم ہوتا ہے، ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ فتنہ برپا ہو جاتے ہیں، اس لئے مجھ کو ان سوالوں کے جواب میں کچھ عرض معروض کرنا بھی دشوار ہے''۔ (۲)

مگر یہ خطوط بھی جو حضرت مولانا عموماً دوستوں اور علماء کے سخت اصرار پر لکھتے تھے ہمیشہ قلم برداشتہ تحریر فرماتے تھے اور نازک سے نازک موضوع پر طویل سے طویل تحریر یا خط عموماً ایک دو نشستوں میں مکمل فرما لیتے تھے اور جو کچھ تحریر فرماتے وہ خزینۂ دماغ میں محفوظ ہوتا تھا، اس کے لئے کسی کتاب سے رجوع کرنے کی، مطالعہ کی، مراجعت کی یا یادداشت دیکھنے کی کبھی (شاید ایک مرتبہ بھی) ضرورت پیش نہیں آتی۔ جو سینہ میں ہوتا کاغذ کے سفینہ کی نذر کر دیا جاتا تھا، علمی مکتوبات کی تحریر میں یہی طریقہ کار رہا جس کا ذکر حضرت مولانا نے متعدد خطوط میں بار بار کیا ہے۔

ناچیز کو حضرت مولانا کے ایک سو بارہ (۱۱۲) مکتوبات کا علم ہے، یہ گرامی نامے حضرت مولانا کی نو تالیفات و مکتوبات کے مجموعوں اور دیگر اصحاب کی نو کتابوں اور مصنفات، کل اٹھارہ کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ مکتوبات علمائے ہند میں مقبول تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں ہیں، جس میں سے آدھے چھپن (۵۶) اردو میں، آدھے سے کچھ کم چون (۵۴) فارسی میں اور صرف دو خط عربی میں ہیں، ان تمام مکتوبات کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: علمی، ذاتی اور مشترک۔ حضرت مولانا کے علمی بیشتر خطوط کئی سوال کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر وہ ہیں جو کسی ایک بحث یا موضوع پر مشتمل ہیں اور ان میں سے اپنے مکتوبات الیہ یا طرفین کے متعلقین کے ذاتی احوال کا کچھ ذکر نہیں۔ دوسری قسم ان خطوط کی ہے جو ذاتی نوعیت کے ہیں، ان میں صرف اپنے یا مکتوب الیہ کے حالات اور گھریلو باتوں پر توجہ مرکوز ہے۔ ایک قسم اور بھی ہے، یہ وہ خطوط ہیں کہ جو اگرچہ ذاتی نوعیت کے ہیں، مگر ان میں کوئی بحث یا اختلافی مسئلہ بھی موضوع گفتگو ہے، تینوں قسم کے خطوط کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ مناسب ہے۔

علمی موضوعات پر جو گرامی نامے تحریر فرمائے ہیں ان کے موضوع میں بڑا تنوع اور وسعت

---

(۲) ایضاً

ہے، ان میں اسرار دین و شریعت کی گفتگو ہے، تفسیر و حدیث کے نکات کی گرہ کشائی فرمائی گئی ہے، فقہی مسائل بھی زیر قلم آئے ہیں، تراویح و قرآت ضاد، جمعہ اور اس دور میں موضوع بحث مسائل پر بھی توجہ فرمائی گئی ہے، ہندوستان کی شرعی حیثیت اور اس کے دارالحرب ہونے نہ ہونے اور یہاں عقود فاسدہ پر بھی اظہار خیال فرمایا گیا ہے، شرک و بدعت کے کلیدی مباحث کو بھی واضح کیا گیا ہے، مختلف دینی فرقوں کے نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، امکان نظیر کے واضح دلائل تفصیل سے لکھے ہیں، امتناع نظیر کے ماننے والوں کے دلائل کا علمی تجزیہ فرمایا ہے، ردشیعت پر بھی خاص توجہ ہے، خلافت و امامت اور باغ فدک وغیرہ کے مشہور اختلافی موضوعات کا علمی عقلی جائزہ لیا گیا ہے، مسلمانوں کے بگاڑ و زوال کے اسباب کا ذکر آیا ہے، اپنوں کی اندرونی کمزوریوں پر بھی کہیں کہیں احتساب کیا ہے، غرض بیسیوں موضوعات و مباحث ہیں جو ان مکتوبات میں زیر قلم آئے ہیں، لیکن ہر ایک میں جامعیت کی فراوانی اور دلائل کی گہرائی و گیرائی کا یہ عالم ہے کہ ہر تحریر منفرد اور ہر بحث حرف آخر معلوم ہوتی ہے۔

ان مکتوبات میں حضرت کا خاص اسلوب بیان ہے جو بڑی حد تک فلسفیانہ ہوتا ہے اور بعض تعبیرات بھی ایسی ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتیں اور بعض جگہ فکر ایسی عمیق اور پرواز ایسی بلند ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا، مجھ بے علم و صلاحیت کا تو ذکر ہی فضول ہے، کئی بڑے بڑے اہل علم بھی اس وسعت پرواز کے سامنے خود کو عاجز و درماندہ پاتے ہیں، حالاں کہ ایسے کئی موقعوں پر زبان اردو ہے، مگر مفہوم مشکل سے گرفت میں آتا ہے، ہر لفظ مخزن اسرار ہے اور ہر فقرہ معدن معانی۔

مکتوبات کی دوسری قسم ذاتی خطوط کی ہے، جن میں اپنے ذاتی، گھریلو یا خاندانی معاملات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان خطوط میں بھی ایک قسم ان مکتوبات کی ہے کہ جو اگرچہ ذاتی حیثیت میں لکھے گئے مگر یہ خطوط ملی اجتماعی معاملات کے متعلق ہیں، اس لئے ان کی حیثیت نجی ذاتی خطوط سے کسی قدر مختلف ہے، دینی علمی اختلافی موضوعات پر جو خط لکھے گئے ہیں ان کی الگ الگ نوعیتیں ہیں، ان کا کسی قدر تفصیلی ذکر آرہا ہے۔ اس سے پہلے ذاتی خطوط کا اجمالی ذکر مناسب ہے۔ ان خطوط میں سب سے اہم وہ مکتوبات ہیں جو حضرت مولانا نے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے نام تحریر کئے ہیں۔ نجی خطوط کی دوسری قسم ان مکتوبات کی ہے جو مولانا نے اپنے قریبی متعلقین یا اہل خانہ کو لکھے تھے اور تیسرے خطوط وہ ہیں جن کو مشترک کہا جا سکتا ہے، یہ خطوط سرسید احمد خاں اور آریہ سماج

کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو لکھے گئے تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے نام جملہ گرامی نامے فارسی میں ہیں، ان میں سے ایک خط بھی اردو میں نہیں ہے۔ یہ خطوط خاصے مفصل ہیں اور ان کے ذریعے سے حضرت مولانا کے ذاتی حالات و معاملات، اعزاء و اقارب اور دوسری بعض ایسی تفصیلات و اطلاعات مل جاتی ہیں جن کا اور ذرائع سے علم نہیں ہوتا۔ پنڈت دیانند سرسوتی کے نام تمام خط اردو میں ہیں اور اس میں دو تین خط بہت مفصل بلکہ ایک رسالہ کے قائم مقام ہیں۔

حضرت حاجی صاحب کے نام خطوط سراپا عجز و انکسار ہیں، ان میں ذاتی احوال، خاندان اور اعزاء کی کیفیات، نانوتہ، رام پور، تھانہ بھون، کاندھلہ کے رہنے والے اور حضرت حاجی صاحب کے اقرباء و متوسلین کا مختصر ذکر ہے۔ کسی کی بیماری کا، کسی کی وفات کا، کسی کی نالائقی کا، کسی کی لیاقت کا۔ نیز ان خطوط میں اپنی ذات کی نفی اور عجز و انکسار کا عنصر نمایاں ہے، ان خطوط کی زبان بالکل سادہ ہے، علم کی تراوش، زبان و بیان کا زور، بے تکلفی کا انداز ان میں مفقود ہے، لیکن جو خطوط اپنے خاص دوستوں یا ممتاز شاگردوں کو لکھے ہیں ان کا طرز تحریر مذکورہ خطوط سے بہت مختلف ہے، ان میں قلم کی روانی اور علم کا فیضان جوش پر ہے، کہیں کہیں بے تکلفی کا خاص انداز ہے اور بعض خطوط میں مزاح کی چاشنی بھی ہے اور طنز کی نشتریت بھی۔

تیسری قسم مشترک خطوط کی ہے، ان کو اس پہلو سے مشترک کہا جا سکتا ہے کہ یہ اگرچہ اہم دینی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ذاتی حیثیت سے لکھے گئے ہیں اور یہ اسلوب تحریر کے لحاظ سے بھی پہلے دونوں قسم کے خطوط سے کسی قدر مختلف ہیں، ان کی زبان اور علمی خطوط کی نسبت سادہ و پروقار ہے، جس میں نہ حضرت حاجی صاحب کے نام تحریر مکتوبات کی سی تواضع ہے اور نہ دیگر علمی خطوطو کا فلسفیانہ انداز اور دقیق فنی و منطقی تعبیرات واصطلاحات، سرسید احمد کے نام تحریر گرامی نامہ (جو تصفیہ العقائد میں شامل ہے) اور سوامی دیانند سرسوتی سے مباحثہ رڑکی کے موقع پر خط و کتابت اسی اسلوب کی نمائندہ اور یادگار ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس ذخیرہ میں سے متعدد مکتوب یا مکتوبات کے مجموعے حضرت مولانا کی مستقل تصانیف کی حیثیت سے متعارف ہیں، حالاں کہ یہ تصنیف نہیں ہیں بلکہ مکتوبات ہیں۔

حضرت مولانا کی تصانیف میں سے مصابیح التراویح واحد تالیف ہے کہ جو ایک خط تھا اور اس کو خود حضرت مولانا نے تصنیف کی حیثیت سے مرتب کر دیا تھا، حضرت مولانا نے ۱۲۸۸ھ میں مولانا سید احمد حسن امروہوی کے سوال کے جواب میں مفصل خط لکھا تھا پھر اس پر ایک تمہید لکھ کر اور جزوی اضافے فرما کر اس کو مصابیح التراویح کے نام سے موسوم کر دیا تھا، یہ مکتوب یا تالیف اسی نام سے شائع اور متعارف ہے۔

اس کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے چند خط (یا کسی ایک موضوع پر لکھے گئے خطوط) ایسے ہیں جو حضرت مولانا کی زندگی میں یا وفات کے بعد مستقل تالیف کی صورت میں شائع کیے گئے اور وہ سب حضرت مولانا کی تالیف میں شمار کیے جاتے ہیں، مگر ان کی موجودہ ترتیب و اشاعت سے مکتوب نگار (حضرت مولانا) کا کچھ تعلق نہیں۔ مولانا کے تلامذہ، مکتوب الیہ، اصحاب یا ناشرین نے ان خطوط کی افادیت کی خاطر ان کو کتابی شکل میں حضرت مولانا کی تالیف کی حیثیت سے شائع کر دیا تھا۔

حضرت مولانا کی ایسی تصانیف جو مکتوبات پر مبنی ہیں مگر حضرت مولانا نے ان کو اس حیثیت سے مرتب نہیں کیا تھا، یہ کل چھ کتابیں ہیں: انتباہ المؤمنین، اجوبۂ اربعین، تحذیر الناس، تصفیۃ العقائد، مناظرہ عجیبہ اور اسرار قرآنی، یہ سب دراصل کسی ایک خط پر مشتمل یا متعدد مکتوبات کے مجموعے ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی تینوں کتابیں یا مجموعے حضرت مولانا کی زندگی میں (وفات ۱۲۹۷ھ) مستقل نام سے کتابی صورت میں علیحدہ چھپ گئے تھے اور اسی وقت سے حضرت مولانا کی تالیفات شمار کیے جاتے ہیں۔ مگر ان کے نام اور کتابی صورت میں اشاعت ناشرین یا مکتوب الیہ اصحاب کی قدردانی کا ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا کو (غالباً) ان تینوں خصوصاً مؤخر الذکر کے چھپنے کا اشاعت کے بعد علم ہوا۔ مذکورہ مؤلفات یا مجموعوں میں ترتیب اور اشاعت کے لحاظ سے انتباہ المؤمنین کو اولیت حاصل ہے۔

الف: انتباہ المؤمنین مولوی الٰہی بخش کے نام خط ہے، جس میں مناقب شیخین و حضرت علی رضی اللہ عنہم میں ایک حدیث کی وضاحت و شرح کی گئی ہے۔ یہ خط حضرت مولانا نے غالباً میرٹھ کے قیام کے زمانہ میں تحریر فرمایا تھا، یہ مفصل مکتوب جو فارسی میں اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے (حضرت مولانا کے استاد زادے) مولانا حبیب الرحمان (خلف حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری) نے

اپنے مطبع احمدی میرٹھ سے شعبان ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں شائع کیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انتباہ المؤمنین حضرت مولانا کی پہلی مستقل تحریر ہے جو مولانا کے نام سے چھپی ہے، اس سے پہلے حواشی صحیح بخاری میں حضرت مولانا کی شرکت ہوئی تھی، مگر اس پر حضرت مولانا کا نام درج نہیں تھا اور مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع قرآن شریف اور حمائل کی تصحیح فرمائی تھی وہ بھی چھپی تھیں، ان کے مصحح کی حیثیت سے حضرت مولانا کا نام درج ہے، مگر ظاہر ہے کہ تصحیح کی اس خدمت کو تصانیف میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ب: اجوبۂ اربعین کا پہلا حصہ مولانا محمد یعقوب کے نام مفصل خط اور مولانا کی فرمائش کی تعمیل میں شیعوں کے تیس سوالات کا جواب ہے۔ ان خطوط کو شیعوں کے ان ہی اعتراضات کے حضرت مولانا کے خویش مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی (۳) کے لکھے ہوئے جوابات کے ساتھ یک جا مرتب کر کے منشی محمد حیات نے ۱۲۹۱ء میں مطبع ضیائی میرٹھ سے اجوبۂ اربعین کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ (۴)

ج: تحذیر الناس بھی ایک خط کی کتابی شکل ہے، یہ خط مولانا محمد احسن نانوتوی کے ایک سوال یا مکتوب کے جواب میں لکھا گیا تھا، مولانا احسن نے اس جواب کو حضرت مولانا کی اجازت و اطلاع کے بغیر مطبع صدیقی بریلی سے تحذیر الناس کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ (طبع اول ۱۲۹۱ھ)۔

حضرت مولانا کی تالیفات میں شمار تین اور کتابیں: تصفیۃ العقائد، مناظرۂ عجیبہ اور اسرار قرآنی بھی کسی ایک موضوع پر لکھے گئے خطوط (یا خط) ہیں، مگر یہ مذکورہ تینوں تالیفات سے اس وجہ سے مختلف ہیں کہ پہلی تینوں کتابیں حضرت مولانا کی حیات میں مرتب ہو کر شائع ہو گئی تھیں اور مؤخرا

(۳) مولانا عبداللہ انصاری خلف مولانا انصار علی انبہٹوی (وفات ۱۳۴۲ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے۔ مفصل تعارف کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مشمولہ مجلہ فکر و نظر علی گڑھ کا نامورانِ علی گڑھ نمبر جلد دوم (۱۹۸۶ء)

(۴) اجوبہ اربعین کا دوسرا حصہ بھی شیعوں کے سوالات و نظریات کے جواب اور تردید پر مشتمل حضرت مولانا کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے، مگر اول تو یہ مجموعہ حضرت مولانا کی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے جیسا کہ اس کے خاتمۃ الطبع سے ظاہر ہے۔ دوسرے اس میں کچھ اور فروگذاشتیں بھی رہ گئیں تھیں، تین سوالات اور ان کے جوابات اور درمیان سے چار صفحات جو تمام حضرت مولانا محمد قاسم کی تالیفات تھے، ضائع ہو گئے تھے، دوبارہ یہ جوابات حضرت کے شاگرد رشید (شیخ الہند) مولانا محمود حسن سے مکمل کرائے گئے تھے یہ حصہ مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔

لذکر حضرت مولانا کی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوئیں۔ تصفیۃ العقائد میں سرسید احمد کے نام خطوط اور وہ تحریریں ہیں جس میں سرسید احمد کے مذہبی خیالات ونظریات پر بحث وگفتگو فرمائی گئی ہے۔ یہ خطوط حضرت مولانا کی کتابوں کے ایک اہم ناشر منشی محمد حیات نے مرتب کر کے مطبع ضیائی میرٹھ سے ۱۲۹۸ھ میں شائع کئے تھے۔

مناظرۂ عجیبہ: حضرت مولانا نے تحذیر الناس میں خاتمیت زمانی، مکانی کی بحث فرمائی تھی، مولانا عبدالعزیز امروہی نے اس پر کچھ شبہات کئے اور حضرت مولانا سے ان کا حل چاہا، حضرت مولانا نے مولانا عبدالعزیز کے اعتراضات کے جو جوابات دئے اور طرفین میں اس موضوع پر جو خط وکتابت ہوئی تھی مولانا محمد حسن (خلف مولانا احمد حسن مرادآبادی) نے اس کو مناظرہ عجیبہ کے نام سے مرتب کر دیا تھا، پہلی مرتبہ مطبع گلزار ابراہیم مرادآباد سے شائع ہوا تھا، اس پر سن طباعت درج نہیں، مگر یہ صراحت ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب واشاعت کی خدمت حضرت مولانا کی وفات کے بعد انجام پائی تھی۔

اسرار قرآنی: قرآن شریف کی آیات وکلمات اور مثنوی مولانا روم وغیرہ کے بعض اشعار کے حل اور تحقیق میں متعدد خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط مولانا محمد صدیق مرادآبادی، مولانا احمد حسن امروہویؒ، مرزا عبدالقادر بیگ وغیرہ کے نام ہیں، یہ مجموعہ مولانا مفتی محمد ابراہیم شاہجہاں پوری نے مرتب کیا تھا، جو پہلی بار ۱۳۰۴ھ میں مرادآباد سے شائع ہوا۔

مکتوبات کے مندرجہ بالا مجموعے وہ ہیں جو حضرت مولانا کی تصانیف کی حیثیت سے شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے مکتوبات کے کم از کم چھ مجموعے اور معلوم ہیں جس میں سب سے پہلا اور اہم ترین مکتوبات کا مجموعہ سلسلہ قاسم العلوم ہے۔

(۱) قاسم العلوم: مطبع مجتبائی میرٹھ دہلی کے مالک منشی ممتاز علی کی یادگار ہے، منشی ممتاز علی حضرت مولانا کے علوم وکمالات کے قدر شناس تھے، منشی جی نے حضرت مولانا کے مکتوبات رسالہ کی صورت میں قسط وار شائع کرنا شروع کئے تھے اور اس کا نام قاسم العلوم رکھا تھا، قاسم العلوم کی پہلی تین قسطیں پندرہ پندرہ دن کے وقفہ سے شائع ہوئیں، (۵) چوتھی اور آخری قسط دو مہینہ کے بعد چھپی، غالباً دقیق علمی مضامین کی

---

(۵) پہلی قسط پندرہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو چھپی، تیسری ۱۵/ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ کو اور چوتھی ۱۵/ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ (۱۹/ جولائی ۱۸۷۵ء) کو طبع ہوئی۔

وجہ سے اس سلسلہ کو زیادہ فروغ نہیں ہوا، اس لئے اس مفید مجلہ کی چار قسطوں پر اشاعت ختم ہوگئی۔

(۲) **فیوض قاسمی**: یہ مجموعۂ مکتوبات حضرت مولانا کے شاگرد اور خادم مولانا عبدالعدل (خلف منشی عنایت علی) پھلتی نے مرتب کیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں اس کی ترتیب عمل میں آئی تھی، ناشر کی صراحت کے مطابق اس میں چھتیس گرامی نامے شامل ہونے تھے، پہلے حصہ میں اکیس، دوسرے میں پندرہ مگر اس کا پہلا حصہ چھپا ہے، دوسرا حصہ (غالباً) شائع نہیں ہوا، راقم سطور کو دوسرے حصہ کے (قلمی یا مطبوعہ) نسخہ کا سراغ بلکہ کہیں حوالہ بھی نہیں ملا۔

(۳) **جمال قاسمی**: اس مختصر مجموعے میں حضرت مولانا کے وہ دو خط شامل ہیں جو حضرت مولانا نے اپنے بچپن کے ایک دوست، مولانا جمال الدین قاسمی دہلوی کو ۱۲۹۵ھ میں لکھے تھے، یہ مجموعہ ۱۳۰۹ھ (۹۲-۱۸۹۱ء) میں مرتب ہوا اور اسی وقت مرتب کی تصحیح سے مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا۔

(۴) **لطائف قاسمی**: اس مجموعہ میں حضرت مولانا کے آٹھ مکتوبات شامل ہیں، اس کے مرتب کا نام راقم سطور کو معلوم نہیں۔ یہ مجموعہ بھی ۱۳۰۹ھ (۹۲-۱۸۹۱ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا۔

(۵) **فرائد قاسمی**: یہ مجموعہ مولانا کے ایک اور شاگرد مولانا عبدالغنی (پھلاودہ ضلع میرٹھ) نے مرتب کیا، اس میں سولہ گرامی نامے اور چند افادات شامل ہیں، یہ مجموعہ عرصۂ دراز تک غیر متعارف اور غیر مطبوعہ رہا، پہلی بار ۱۴۰۰ھ (۱۹۸۰ء) میں مولانا مفتی نسیم احمد فریدی کی توجہ سے دہلی سے چھپا، یہ اصل نسخہ کا عکس ہے۔

(۶) **مکتوبات قاسمی**: یہ مجموعہ ہنوز غیر مطبوعہ اور غیر متعارف ہے، یہ مجموعہ بھی مولانا عبدالغنی پھلاودی نے مرتب کیا تھا، اس کا واحد معلوم نسخہ جو محرم ۱۳۲۲ھ (۹/اپریل ۱۹۰۴ء) کو مولوی محمد ابراہیم صاحب پھلاودہ کے قلم سے مکمل ہوا ہے، ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کا ایک خط بھی مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل نہیں، یہ خطوط اکابر سلسلۂ دیوبند حضرت حاجی امداداللہ تھانویؒ، محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے مکتوبات کے مشترک مجموعوں میں درج ہیں، اس قسم کے بھی متعدد مجموعے ہیں۔

(الف) سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جس میں حضرت حاجی امداداللہ کے ممتاز خلفاء (حضرت مولانا

محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کے خطوط حضرت حاجی امداداللہؒ کے نام، نیز مولانا خلیل احمد انبہٹوی (شارح ابوداؤد رحمہم اللہ تعالی) کے نام حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مکتوبات شامل ہیں، اس مجموعے کے جامع کا نام اور سنہ کتابت وغیرہ محقق نہیں، مگر اس نسخہ اور مکتوبات کی اصلیت میں شک نہیں، اس مجموعہ میں حضرت حاجی امداداللہ کے نام حضرت مولانا کے گیارہ مکتوبات درج ہیں اور یہ تمام خطوط فارسی میں ہیں اور ۹۲-۱۲۹۱ھ (۷۵-۱۸۷۴ء) کے لکھے ہوئے ہیں۔ راقم سطور نے اس مجموعے کا تعارف اور پہلے چار خطوط کا متن سہ ماہی احوال و آثار، کاندھلہ، شوال، ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ (اپریل جون ۱۹۹۵ء) میں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کردیا تھا، باقی خطوط کے ترجمے اور حواشی کا کام بھی بفضلہ تعالیٰ مکمل ہوگیا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ جلد ہی شائع ہوگا۔

(ب) ایسا ہی دوسرا مجموعہ، مکتوبات قاسمیہ ہے، اس کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم کے مکتوبات ہوں گے، مگر یہ خیال صحیح نہیں، یہ مجموعہ تین بزرگوں حضرت حاجی امداداللہ، حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہم اللہ کے خلیفہ بشیر احمد دیوبندیؒ کے نام سترہ خطوط پر مشتمل ہے، جس میں سے آٹھ گرامی نامے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے ہیں، اس مجموعہ کو قدیم دارالمؤلفین (٦) دیوبند نے شائع کیا تھا اس پر سن ترتیب وطباعت درج نہیں۔

(ج) مکتوبات اکابر دیوبند: حضرت مولانا عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور اکابر علمائے دیوبند کے چون مکتوبات کا مجموعہ ہے، جس میں مولانا رفیع الدین مہتمم مدرسہ دیوبند اور شیخ ضیاء الحق دیوبند کے نام حضرت مولانا کے گرامی نامے بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دفتری نورالحق دیوبند نے مرتب کیا تھا، مولانا نسیم احمد فریدی نے اس پر مقدمہ لکھا اور یہ مجموعہ ۱۹۸۰ء کے آغاز میں دیوبند سے چھپا تھا۔

یہ ان مکتوبات کا ذکر تھا جو حضرت مولانا کے مکتوبات کے خاص مجموعوں یا مشترک مجموعوں

---

(٦) قدیم دارالمؤلفین ریاست حیدرآباد (دکن) کے عطیہ سے دارالعلوم دیوبند میں غالباً مولانا حبیب الرحمان (مہتمم دارالعلوم) کی نگرانی میں قائم ہوا تھا، اس ادارہ نے کئی کتابیں شائع کیں، اس کا معیار کتابت وطباعت عموماً نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہوتا تھا۔ دیوبند میں دارالمؤلفین کے نام سے ایک تالیفی اشاعتی ادارہ مولانا وحیدالزماں کیرانوی نے بھی قائم کیا تھا، حال میں وہی معروف تھا، اس لئے پرانے ادارے کے نام کے ساتھ قدیم کا اضافہ کردیا ہے۔

میں شامل ہیں، لیکن حضرت مولانا کے ان کے علاوہ بھی مکتوبات مطبوعہ و معلوم ہیں اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں: وہ مکتوبات جو مختلف مضامین میں ضمناً یا مستقل چھپے ہیں اور وہ خطوط جو کسی غیر متعلق کتاب میں ضمناً درج ہیں، پہلی قسم کے مکتوبات میں:

(۱) مکتوب جو جنگ بلقان کے وقت خلافت اسلامیہ (ترکی) کی حمایت میں ۱۰ ر شعبان ۱۲۹۴ھ (۲۰/ اگست ۱۸۷۷ء) کو لکھا تھا، یہ خط جو کسی مجموعہ میں شامل نہیں تقریباً ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا دریافت ہوا تھا۔ اس وقت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا حبیب الرحمانؒ وغیرہ نے تصدیق کی تھی کہ یہ حضرت مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اسی وقت اس کا عکس اور متن ترجمہ کے ساتھ اور بلاترجمہ علیحدہ علیحدہ چھپے تھے، اس خط کی نقل جو غالباً کسی مطبوعہ متن سے لی گئی ہے، مولانا محمد ابراہیم پھلاودہ کے قلم سے مکتوبات قاسمی قلمی کے آخر میں شامل ہے۔ (مکتوبہ ۲۶/ ربیع الآخر ۱۳۳۹ھ ۶/ جنوری ۱۹۲۱ء)

(۲) مکتوب بنام منشی ممتاز علی: یہ خط بھی مکتوبات قاسمی مرتبہ مولانا عبدالغنی پھلاودہ کے آخر میں درج ہے اور بعد میں اضافہ کیا گیا ہے، یہ خط مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے اردو ترجمہ کے ساتھ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ (اگست ۱۹۵۴ء) میں شائع کرادیا تھا۔

(۳) مکتوبات بنام مولانا صدیق احمد مرادآبادی (مولانا صدیق احمد حضرت مولانا کے شاگرد تھے) مولانا صدیق کے نام حضرت مولانا کے چند مکتوبات اسرار قرآنی میں شامل ہیں، یہ دو مکتوبات جو مولانا کے ذاتی کاغذات میں محفوظ تھے مولانا نسیم احمد فریدی کے مضمون ''مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادی اور ان سے متعلق حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نادر تحریرات'' میں شامل ہے جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ مارچ ۱۹۷۶ء (ربیع الاول ۱۳۹۶ھ) میں چھپا تھا، حضرت مولانا کے درج بالا مکتوبات کا راقم سطور کو علم ہے، ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی کچھ خطوط کسی مجموعۂ مکتوبات میں یا علیحدہ چھپے ہوئے ہوں، مگر راقم سطور کو ان کا علم نہیں۔

دوسری قسم کا اہم ترین ذخیرۂ مکتوبات وہ خطوط ہیں جو سوامی دیانند سرسوتی کے نام سوامی جی کے رڑکی کے قیام کے وقت لکھے تھے جن میں سوامی جی کو مجمع عام میں مناظرہ یا بالمشافہ گفتگو پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر طویل خط و کتابت کے باوجود سوامی جی اس پر تیار نہیں ہوئے تھے، یہ

مراسلت جو۹/ اگست ۱۸۷۸ء (۹/ شعبان ۱۲۹۵ھ) کو شروع ہو کر ۱۸/ اگست ۱۸۷۸ء (۸/ شعبان ۱۲۹۵ھ) کو ختم ہوئی تھی، اس میں حضرت مولانا کے مفصل و مختصر دس خطوط اور سوامی دیانند کے جوابات اور طرفین کے اشتہارات و اعلانات شامل ہیں، یہ اہم مراسلت سوامی دیانند کی سوانح حیات میں درج ہے، مگر حضرت مولانا کے احوال و سوانح پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

یہ حضرت مولانا کے مکتوبات کے قدیم ترین نسخوں اور اشاعتوں اور متعلقہ کتابوں کا مختصر تعارف ہے، جس میں مکتوبات کے اردو ترجموں، شروحات اور ان پر مبنی کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا، مذکورہ تفصیلات ایک مستقل مقالہ کا موضوع ہیں، یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مکتوبات کے مجموعوں اور متعلقہ کتابوں کی

فہرست

(۱)

حضرت مولانا کے مکتوبات اور تالیفات پر مشتمل مکتوبات کے قلمی مجموعے جو ابھی تک چھپے نہیں

مکتوبات بنام حضرت حاجی امداد اللہ

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبداللہ گنگوہی وفات ۱۳۳۹ھ و مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	ندارد	نسخہ بہ ظاہر نقل مؤلفین	مکتوبہ قبل از ۱۳۲۲ھ

مکتوبات قاسمی قلمی

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبدالغنی پھلاودہ	ندارد	بقلم محمد ابراہیم پھلاودہ	مکتوبہ ۱۳۲۲ھ

تنویر النبراس

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبدالغنی پھلاودہ	۱۲۹۱ھ	بقلم محمد ابراہیم پھلاودہ	مکتوب ۱۳۴۳ھ

(ب)

حضرت مولانا کی وہ تالیفات یا فہرست تالیفات میں شامل وہ کتابیں جو مکتوبات پر مشتمل ہیں یا ان میں مکتوب بھی شامل ہیں

☜ **انتباہ المومنین**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مولانا حبیب الرحمٰن سہارنپوری	۱۲۸۴ھ	مطبع احمدی میرٹھ	۱۲۸۴ھ

☜ **مصابیح التراویح**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
حضرت مصنف	۱۲۸۸ھ	مطبع ضیائی میرٹھ	۱۲۹۰ھ

☜ **اجوبۂ اربعین**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
منشی محمد حیات میرٹھی	۱۲۹۱ھ	مطبع ضیائی میرٹھ	۱۲۹۱ھ

☜ **تصفیۃ العقائد**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مرتب کی تحقیق نہیں	۱۲۹۸ھ	مطبع ضیائی ہاشمی میرٹھ	شعبان ۱۲۹۸ھ

☜ **اسرار قرآنی**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مفتی محمد ابراہیم شاہجہاں پوری	۱۳۰۴ھ	مطبع گلزار احمدی مراد آباد	۲۵/ رجب ۱۳۰۴ھ

☜ **مناظرۂ عجیبہ**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مولانا محمد حسن ابن احمد حسن الہ آبادی	ندارد	گلزار ابراہیم مراد آباد	

☜ **الحظ المقسوم من قاسم العلوم**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری	۱۳۲۰ھ	مطبع مشرق العلوم بجنور	۱۳۲۰ھ شوال

(ج)

مکتوبات وافادات کے مجموعے

☜ **قاسم العلوم** کل چار شمارے (جس میں خطوط وافادات ہیں)

منشی ممتاز علی میرٹھی دہلوی	۱۲۹۲ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۵/ربیع الاول ۱۲۹۲ھ سے ۱۵/جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ تک

فیوض قاسمیہ

مولانا عبدالعدل پھلتی	۱۳۰۳ھ	مطبع ہاشمی میرٹھ	صفر ۱۳۰۴ھ

جمال قاسمی

مولانا جمال الدین بجنوری دہلوی	۱۳۰۹ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۰۹ھ

لطائف قاسمیہ

معلوم نہیں	۱۳۰۹ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۰۹ھ

فرائد قاسمیہ

مولانا عبدالغنی پھلاودی	۱۳۱۳ھ	ادارہ ادبیات دہلی	۱۴۰۰ھ

(د)

مکتوبات کے وہ مجموعے یا وہ کتابیں جن میں حضرت مولانا کے مکتوبات بھی شامل ہیں

مکتوبات قاسمیہ

مرتب کا نام درج نہیں	ندارد	دارالمولفین مطبع قاسمی دیوبند	ندارد

مکتوبات اکابر دیوبند

منشی نورالحق عثمانی دیوبندی	۱۳۶۹ھ	معراج بک ڈپو دیوبند	۱۴۰۰ھ

جیون چرتر سوامی دیانند سرسوتی

جامع لیکھرام آریہ مسافر مرتبہ لکشمن		اسٹیم پریس، لاہور	۱۸۹۷ء

حضرت مولانا کے مکتوب الیہ اصحاب اور ان کے نام خطوط کے مندرجات کی فہرست

۱	۱	سرسید احمد خان	تصفیۃ العقائد	سرسید کے عقائد ونظریات کا رد	ص ۳۲ تا ۳۶

۲	۱	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی (امام فن مناظرہ)	تذکرہ مولانا احسن نانوتوی	محمد ایوب قادری بحوالہ عین الیقین مرتبہ سید مہدی حسن ص ۳۴۲ تا ۳۴۳ مطبع فاروقی دہلی	ص ۶۱ تا ۶۲ کراچی (۱۹۶۱ء)
۳	۲	مولانا احمد حسن امروہوی	قاسم العلوم مکتوب ۵ شمارہ ۲	دو حدیثوں کی تطبیق میں	ص ۱ تا ۳۲
۴	۳	ایضاً	مکتوب ۸ شمارہ ۳	سود اور اراضی مرہونہ کا مسئلہ	ص ۱ تا ۳۵
۵	۴	ایضاً	فرائد قاسمیہ	تحقیق مختصر دربیان حدیث متشابہ	ص ۱۶۰ تا ۱۶۴
۶	۵	ایضاً	ایضاً	مابہ الفرق حقیقت سرقہ وغصب وتعذر احکام آں	ص ۱۶۹ تا ۱۷۲
۷	۷	ایضاً	اسرار قرآنی	تفسیر وھل نجازی الا الکفور	ص ۱۸ تا ۲۵
۸	۸	ایضا	مصابیح التراویح	در اثبات بست رکعات تراویح	ص ۴ تا ۸۴
۹	۱	حافظ مولوی احمد سعید	مکتوبات قاسمی قلمی	بسلسلہ جنگ روس وترکی اور ضرورت حمایت ترکی	
۱۰	۱	مولوی الٰہی بخش	انتباہ المؤمنین	تحقیق حدیث عن علی: قیل یا رسول اللہ من نؤمر بعدك قال ان تؤمروا ابابکر	ص ۳ تا ۲۱
۱۱	۱	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ		ذاتی حالات نیز اپنے اور حضرت حاجی صاحب کے رشتہ داروں متعلقین نیز اپنے حالات اور اپنے قصبات کا تذکرہ اور اپنے بعض تلامذہ کا تعارف	
۱۲	۲	ایضاً		ذاتی حالات وغیرہ	

۱۳	۳	ایضاً		ایضاً	
۱۴	۴	ایضاً		ایضاً	
۱۵	۵	ایضاً		ایضاً	
۱۶	۶	ایضاً		ایضاً	
۱۷	۷	ایضاً		ایضاً	
۱۸	۸	ایضاً		ایضاً	
۱۹	۹	ایضاً		ایضاً	
۲۰	۱۰	ایضاً		ایضاً	
۲۱	۱۱	ایضاً		ایضاً	
۲۲	۱	خلیفہ بشیر احمد دیوبندی	مکتوبات قاسمیہ	ذاتی حالات اور تربیت مکتوب الیہ	ص۲تا۳
۲۳	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳
۲۴	۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴
۲۵	۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴تا۵
۲۶	۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵تا۶
۲۷	۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۶
۲۸	۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷
۲۹	۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۸
۳۰	۱	مولوی بشیر احمد مرآدابادی	لطائف قاسمیہ	رہن کی زمین سے جو فائدہ اٹھایا وہ سود ہے یا نہیں	ص۱۹تا۲۰
۳۱	۱	مولوی جمال الدین	جمال قاسمی	تحقیق وحدت الوجود والشہود	ص۳تا۸
۳۲	۲	ایضاً	ایضاً	سماع موتیٰ کی تحقیق	ص۸تا۱۶

۳۳	۱	مولوی حمید الدین	فرائد قاسمیہ	ممانعت مباشرت با زن حائضہ تحقیق و تر بجماعت در رمضان	ص۱۶۴ تا ۱۶۹
۳۴	۱	مولوی حکیم رحیم اللہ بجنوری	الحظ المقسوم من قاسم العلوم	تحقیق المرکب والاجزاء	ص۶ تا ۲۳
۳۵	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۲۵ تا ۲۷
۳۶	۱	شاہ رفیع الدین دیوبندی	ایضاً	ذاتی	ص۵۲
۳۷	۱	سوامی دیانند سرسوتی	تین تحریر سوامی دیانند سرسوتی	بسلسلہ مناظرہ رڑکی	ص۵۲۱ تا ۵۲۲
۳۸	۲	ایضاً		ایضاً	ص۵۲۸
۳۹	۳	ایضاً		ایضاً	ص۵۲۹ تا ۵۳۳
۴۰	۴	ایضاً۔ مع ضمیمہ		ایضاً	ص۵۳۵ تا ۵۴۰
۴۱	۵	ایضاً		ایضاً	ص۵۴۹ تا ۵۵۰
۴۲	۶	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۰
۴۳	۷	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۱ تا ۵۵۲
۴۴	۸	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۴
۴۵	۹	سوامی دیانند کے جواب میں مناظرہ کا اشتہار		ایضاً	ص۵۲۰ تا ۵۲۱
۴۶	۱	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	ارشاد تربیت و سلوک	ص۵۳
۴۷	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۳ تا ۵۴
۴۸	۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۴ تا ۵۵
۴۹	۱	حکیم ضیاء الدین رامپوری	فرائد قاسمیہ	تقوی علم اور عمل کی تحقیق و ترتیب	ص۶۵ تا ۹۳

۵۰	۲	ایضاً	فیوض قاسمیہ	دربیان کیفیت مباحثہ باحامد حسن	ص۴تا۶
۵۱	۳	ایضاً	ایضاً	در تحقیق معنی بدعت وسنت	ص۴۳تا۴۹
۵۲	۴	ایضاً	ایضاً	تحقیق نفس	ص۵۳تا۵۹
۵۳	۱	مرزا عالم بیگ مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	در باب عمل کشائش رزق و ادائے دین	ص۲۱
۵۴	۲	ایضاً	ایضاً	در باب علاج ہوس دنیا	ص۲۱تا۲۲
۵۵	۱	مولوی عبدالحق (مظفرنگری)	فیوض قاسمیہ	در جواب تحقیق وراثت	ص۱۷تا۲۵
۵۶	۲	عبدالرحیم	لطائف قاسمیہ	دراثبات تراویح بدلائل عقلی وبراہین نقلی	ص۶تا۱۳
۵۷	۳	ایضاً	مکتوب قاسمی قلمی	اللہ تعالیٰ کے نظام میں تقسیم کار کی ایک وجہ	ص۳۴تا۳۸
۵۸	۱	حکیم عبدالصمد	فیوض قاسمیہ	اپنے مشائخ کو اپنے قریب جاننا اوران کا تصور کرنا غلط ہے	ص۵۱تا۵۲
۵۹	۱	حافظ عبدالعدل پھلتی	مکتوبات قاسمی قلمی	افضلیت محمدی از آیت ولکن رسول اللہ	ص۳۸تا۴۸
۶۰	۱	مولانا عبدالعزیز امروہوی	فرائد قاسمیہ	بسلسلۂ مناظرہ	ص۱۹۷تا۱۹۹
۶۱	۲	ایضاً	مناظرۂ عجیبہ	بسلسلۂ تحقیق مباحث تحذیر الناس	ص۴۵تا۷۰
۶۲	۳	ایضاً	ایضاً	بسلسلۂ تحقیق مباحث	ص۷۶تا۸۶
۶۳	۴	ایضاً	ایضاً	تحذیر الناس	ص۹۲تا۱۰۵
۶۴	۵	ایضاً	ایضاً		ص۱۰۵تا۱۰۶

۶۵	۱	مرزا عبدالقادر مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	ذاتی، بموقع سفر حج درخواست دعاء	ص۲۰ تا ۲۱
۶۶	۲	ایضاً	اسرار قرآنی	دربیان معنی بیت مثنوی شریف	ص۲۵ تا ۲۹
۶۷	۱	مولوی عبدالقادر بدایونی	تنویر النبراس قلمی	تحذیر الناس پر اعتراض کے جواب	ص۳۹ تا ۹۸
۶۸	۱	مولوی عبداللطیف	فیوض قاسمیہ	مسئلہ علم غیب	ص۵۰ تا ۵۱
۶۹	۱	مولوی عبداللہ	فیوض قاسمیہ	قلب کو بائیں رکھنے کی حکمت	ص۳۳ تا ۳۴
۷۰	۱	مولانا فخر الحسن گنگوہی	قاسم العلوم مکتوب ۹ شمارہ ۴	در تحقیق و اثبات شہادت حسینؓ	ص۱ تا ۱۷
۷۱	۲	ایضاً	ایضاً، مکتوب ۱۰ شمارہ ۴	جواب استدلات علامہ طوسی دربیان امامت	ص۱ تا ۱۹
۷۲	۳	ایضاً	ایضاً، مکتوب ۱۱ شمارہ ۴ فرائد قاسمیہ	دربیان معنی حدیث: من یعرف امام زمانہ فقد مات	ص۱ تا ص۱۷
۷۳	۴	ایضاً	ایضاً	تحقیق کلی متکرر النوع ومثبات بالتکریر	ص۱۵۴ تا ۱۵۷
۷۴	۵	ایضاً	ایضاً	در تحقیق واسطہ فی العروض	ص۱۵۷ تا ۱۶۱
۷۵	۱	مولانا فدا حسین	ایضاً، مکتوب ۳ شمارہ ۲	در تحقیق ما اھل بہ لغیر اللہ وایضاح معنی قید عند الذبح	ص۱ تا ۴۵
۷۶	۱	مولوی قاسم علی بیگ	فیوض قاسمیہ	در جواب بعض شبہات شیعان	ص۱۰ تا ۱۷
۷۷	۱	میانجی گھسا	تصفیۃ العقائد	عقائد نظریات سرسید احمد	ص۳۶ تا ۳۹

۷۸	۱	قاضی محمد اسماعیل منگلوری	فرائد قاسمیہ	امکان و امتناع نظیر	ص۱۲۳ تا ۱۴۷
۷۹	۱	مولانا محمد حسین بٹالوی	قاسم العلوم مکتوب ۷ شمارہ ۳	در جواب شبہات ملحدان بر معجزہ	ص۱ تا ۲
۸۰	۱	مولوی محمد دائم مرادآبادی	فیوض قاسمیہ	تصور شیخ	ص۳۲ تا ۳۳
۸۱	۱	مولوی محمد صدیق مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	در اثبات حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ص۲ تا ۵
۸۲	۲	ایضاً	ایضاً	در فضیلت علم	ص۱۸ تا ۱۹
۸۳	۳	ایضاً	اسرار قرآنی	در معنی بعض آیات شریفہ	ص۲ تا ۱۰
۸۴	۴	ایضاً	ایضاً		ص۱۰ تا ۱۲
۸۵	۱	مولوی محمد صدیق و مولوی شمس الدین	ماہنامہ الفرقان مارچ ۱۹۷۶		ص۳۵
۸۶	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳۶
۸۷	۱	میر محمد صادق مدراسی	فیوض قاسمیہ	تحقیق حکم جمعہ	ص۲۵ تا ۳۲
	۲	ایضاً	لطائف قاسمیہ	در باب تحقیق حکم جمعہ	ص۲۲ تا ۲۸
۸۸	۱	حاجی محمد عابد دیوبندی	فرائد قاسمیہ	در جواب اعتراض اہل تشیع	ص۱۷۲ تا ۱۷۹
۸۹	۱	پیر جی محمد عارف	تصفیۃ العقائد	عقائد و نظریات سرسید احمد خاں	ص۵ تا ۳۲
۹۰	۱	مولانا محمد فاضل پھلتی	قاسم العلوم مکتوب ۱ شمارہ ۱	در جواب شبہ بعض فضلا کہ در بارہ عدم مملوکیت فدک در رسالہ ہدیۃ الشیعہ	ص ۱ تا ۳۸
۹۱	۱	مولانا محمد علی چاندپوری	تنویر النبراس قلمی	تحذیر الناس پر اعتراضات کے جوابات	ص۱ تا ۸

۹۲	۱	مولانا محی الدین خاں مرادآبادی	قاسم العلوم مکتوب نمبر۲، شمارہ نمبر۱	در شرح حدیث ابی رزین قال قلت یا رسول اللہ این کان ربنا قبل ان یخلق	ص۱تا۴۶
۹۳	۱	منشی ممتاز علی میرٹھی	مکتوبات قاسمی قلمی	ذاتی بسلسلہ جوابات مولانا محمد علی وغیرہ	ص۴۸تا ۵۲(۱)
۹۴	۱	مولانا منصور علی خاں مرادآبادی	فرائد قاسمیہ	در معنی شعر: من آں وقت	ص۱۷۹تا۱۸۳
۹۵	۱	مولانا نصر اللہ خویشگی	فرائد قاسمیہ	تقلید کی بحث	ص۹۳تا۹۶
۹۶	۲	ایضاً	فیوض قاسمیہ	حکم ایمان کفر یذیر	ص۳۴تا۳۵
۹۷	۱	مولانا محمد یعقوب نانوتوی	اجوبۂ اربعین	شیعوں کے اٹھائیس سوالات کے جوابات	ص۱تا۱۰
۹۸	۱	مولانا محبوب علی مرادآبادی	مکتوبہ ۲۶/ جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ مطبوعہ ماہنامہ الفرقان مارچ ۱۹۷۶ء	ذاتی احوال و متعلقات	ص۳۳تا۳۵

وہ خطوط جن پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں اور دوسرے ذرائع سے بھی ان کی تحقیق نہیں ہوتی

۹۹	۱	بلا نام مکتوب الیہ	مکتوبات قاسمی قلمی	قرآن کی آیت المومنین کی تحقیق	ص۱تا۳
۱۰۰	۲	ایضاً	فرائد قاسمیہ	(جواب اعتراضات پادریان) بر تعدد نکاح کی حکمت	ص۱۰۴تا۱۲۳
۱۰۱	۳	ایضاً	ایضاً	تحقیق مال حرام و کراہت آں	

۱۰۲	۴	ایضاً	ایضاً	در تحقیق قرأت فاتحہ خلف الامام	ص۱۴۷تا۱۵۴
۱۰۳	۵	ایضاً	ایضاً	اشارات اجمالیہ بحث امکان نظیر	ص۱۸۴تا۱۹۵
۱۰۴	۶	ایضاً	ایضاً	مناظرہ نہ کرنے پر تبصرہ	ص۱۹۵تا۱۹۷
۱۰۵	۷	ایضاً	فیوض قاسمیہ	تحقیق آنکہ شیعہ وخوارج مومن اندنہ کافر	ص۱تا۴
۱۰۶	۸	ایضاً	ایضاً	متعلقہ نذربتاں وغیرہ	ص۳۵تا۴۰
۱۰۷	۹	ایضاً	ایضاً	وجہ جہرقرأت درسہ نماز	ص۴۰تا۴۳
۱۰۸	۱۰	ایضاً	اسرار قرآنی	در جواب بعض شبہات بر آیت خالدین فیہا ما دامت السموات والارض	ص۱۲تا۱۸
۱۰۹	۱۱	ایضاً	مکتوبات قاسمی قلمی	احکام وضو پر پادریوں کے اعتراضات کے جوابات	ص۴تا۳۴
۱۱۰	۱۲	ایضاً	قاسم العلوم مکتوب ۴ شمارہ ۲	در معصومیت انبیاء علیہم السلام	ص۱تا۱۰

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مطبوعہ مکتوبات کی فہرست حسب ترتیب مضامین

چند آیات کی تفسیر اور متعلقات مباحث

نمبر شمار	مضمون مکتوب	کتاب	زبان	صفحات
۱	در معنی بعض آیات شریفہ	اسرار قرآنی	فارسی	ص۲تاص۱۰

۲	درجوابات بعض شبہات برخالدین فیہا مادامت السموات والارض	ایضاً	ایضاً	ص۱۰تا۱۸
۳	تفسیر فہل نجازی الاالکفور	ایضاً	ایضاً	ص۱۸تا۲۵
۴	المومنین کی تحقیق	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۱تا۳۰
۵	ولکن رسول اللہ سے افضلیت محمدی کا ثبوت	ایضاً	فارسی	ص۳۸تا۴۸

چند احادیث شریفہ کے متعلق سوالات کے جوابات اور تحقیق

۱	تحقیق ومطالب حدیث قبل یارسول اللہ من نومر بعدک	انتباہ المومنین	فارسی	ص۲تا۲۱
۲	شرح مطالب حدیث این کان ربنا قبل ان یخلق الخلق	قاسم العلوم مکتوب۲، شمارہ۱	فارسی	ص۱تا۴۶
۳	تحقیق ومطالب من لم یعرف امام زمانہ مات	قاسم العلوم مکتوب۱ شمارہ۴	فارسی	ص۱تا۷
۴	دوحدیثوں میں تطبیق: المکاتب عبد مابقی علیہ من مکاتبۃ درہم (ابوداؤد) اذا اصاب المکاتب حدا او میراثا ورث بحساب ماعتق (ابوداؤد)	قاسم العلوم مکتوب۵ شمارہ۲	فارسی	ص۱تا۳۲
۵	تحقیق حدیث متشابہ کان فی عماء	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۱تا۱۶۴

فقہی مباحث اور متعلقات فقہ

۱	وضو کی حکمتیں (اسرار الطہارۃ)	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۴تا۳۴
۲	تحقیق قرأت فاتحہ خلف الامام	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۴۷تا۱۵۴
۳	وجہ جہر قرأت در سہ نماز	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص۴۰تا۴۳

۴	جمعہ کے احکام اور تحقیق	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۲۲ تا ۲۸
۵	اثبات بست رکعات تراویح	مصابیح التراویح	فارسی	ص۲ تا ۸۴
۶	اثبات تراویح بدلائل عقلی ونقلی	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۶ تا ۱۳
۷	تحقیق وتر بجماعت در رمضان	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۶ تا ۱۶۹
۸	مابہ الفرق حقیقت سرقہ وغضب	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۹ تا ۱۷۲
۹	وجہ ممانعت مباشرت بازن حائضہ	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۴ تا ۱۶۵
۱۰	رہن کی زمین سے جو فائدہ اٹھایا جائے وہ سود ہے یا نہیں	لطائف قاسمیہ	اردو	ص ۱۹ تا ۲۰
۱۱	عدم جواز سود گرفتن در ہندوستان	قاسم العلوم مکتوب ۸ شمارہ ۳	فارسی	ص۱ تا ۳۵
۱۲	مال حرام اور اس کی گندگی	فرائد قاسمیہ	اردو	ص۱۰۴ تا ۱۲۳
۱۳	اللہ تعالیٰ کے نظام میں تقسیم کار کی حکمت	مکتوبات قاسمیہ	اردو	ص۳۴ تا ۳۸
۱۴	تقوی علم اور عمل کی تربیت اور مدارج	فرائد قاسمیہ	اردو	ص۶۵ تا ۹۳
۱۵	درفضیلت علم	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۱۸ تا ۱۹
۱۶	روس اور ترکی کے جنگ کے وقت مسلمانوں کی ذمہ داری اور ملی دینی فریضہ	مکتوبات قاسمی قلمی	فارسی	آخر میں

تصوف

۱	تحقیق وحدت الوجود والشہود	جمال قاسمی	اردو	ص۳ تا ۸
۲	مسئلہ تصور شیخ	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص۳۲ تا ۳۳
۳	قلب کو بائیں طرف رکھنے کی حکمت	فیوض قاسمیہ	اردو	ص۳۳ تا ۳۴

عقائد اور متعلقہ مباحث

۱	متعلقہ نذر بتاں وغیرہ	فیوض قاسمیہ	اردو	ص۳۵ تا ۴۰

۲	تحقیق ما اهل به لغیر الله	قاسم العلوم مکتوب ۳ شمارہ ۲	فارسی	ص ۱ تا ۴۵
۳	دراثبات حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	لطائف قاسمیہ	اردو	ص ۲ تا ۵
۴	تحقیق مباحث تحذیر الناس (امکان نظیر) (جوابات مکتوب مولانا عبدالعزیز امروہوی)	مناظرہ عجیبہ	اردو	ص ۴۵ تا ۷۰
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۷۶ تا ۸۶
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۹۲ تا ۱۰۵
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰۵ تا ۱۰۶
۸	اشارات اجمالیہ بحث امکان نظیر	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص ۱۸۴ تا ۱۹۵
۹	تحذیر الناس پر مولانا محمد علی چاندپوری کے اعتراضات کے جوابات	تنویر النبراس	اردو	ص ۱ تا ۳۸
۱۰	تحذیر الناس پر مولوی عبدالقادر بدایونی کے اعتراضات کے جوابات	تنویر النبراس	اردو	ص ۳۹ تا ۹۸
۱۱	معصومیت انبیاء اور تحقیق کلی طبعی	قاسم العلوم مکتوب ۴ شمارہ ۲	فارسی	ص ۱ تا ۳۲
۱۲	درجواب شبہات ثبوت نبوت از معجزات	قاسم العلوم مکتوب ۷ شمارہ ۳	فارسی	ص ۱ تا ۳۲
۱۳	مسئلہ علم غیب	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص ۵۰ تا ۵۱
۱۴	اپنے مشائخ کو اپنے قریب جاننا غلط ہے حاضر وناظر جاننا صحیح نہیں	فیوض قاسمیہ	اردو	ص ۵۱ تا ۵۲
۱۵	تحقیق مزید بر سماع موتی	جمال قاسمی	اردو	ص ۸ تا ۱۶
۱۶	ایمان وکفر یزید	فیوض قاسمیہ	اردو	ص ۳۴ تا ۳۵

شیعوں کے عقائد اور اعتراضات کی تردید

۱	در تحقیق آں کہ شیعی وخوارج مومن اند نہ کافر	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص ۱ تا ۴
۲	کیفیت مباحثہ با مولوی حامد حسین لکھنوی	ایضاً	فارسی	ص ۴ تا ۶

۳	در جواب اعتراضات اہل تشیع	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص ۱۷۲ تا ۱۷۹
۴	در جواب شبہ شیعان	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص۶ تا ۱۰
۵	در جواب بعض شبہات شیعہ	ایضاً	فارسی	ص۱۰ تا ۱۷
۶	در تحقیق وراثت	ایضاً	فارسی	ص۱۷ تا ۲۵
۷	جواب شبہ بعض فضلا وعدم ملوکیت فدک	قاسم العلوم مکتوب اشمارہ۱	فارسی	ص۱ تا ۱۸
۸	جواب استدلالات علامہ طوسی ، دربارہ امامت وبیان معنی اختلاف امتی	قاسم العلوم مکتوب۱۰ اشمارہ۴	فارسی	ص۱ تا ۱۹
۹	شیعوں کے ۲۸ سوالات کے جوابات	اجوبۂ اربعین حصہ اول	اردو	ص۱۰ تا ۹۸
۱۰	شیعہ علماء سے بیالیس سوالات (حضرت مولانا نانوتوی کی طرف سے)	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰۱ تا ۱۰۸
۱۱	جوابات اعتراضات پادریاں	فرائد قاسمیہ	ایضاً	ص ۹۷ تا ۱۰۴

تقلید اور بدعت کی تحقیق

۱	تقلید کی بحث	فرائد قاسمیہ	اردو	ص ۹۳ تا ۹۷
۲	تحقیق تقلید وتراویح اور ضاد کا مخرج	تصفیۃ العقائد	ایضاً	ص ۳۳ تا ۳۶
۳	در تحقیق بدعت وسنت	فیوض قاسمیہ	اردو	ص۴۳ تا ۴۹

سرسید احمد کے دینی خیالات اور مذہبی تفردات پر نظر

۱	مکتوب بنام پیر جی محمد عارف	تصفیۃ العقائد	اردو	ص۵ تا ۲۹
۲	مکتوب بنام سرسید احمد خاں	ایضاً	اردو	ص۲۹ تا ۳۳

متفرقات

۱	در تحقیق نفس	فیوض قاسمیہ	فارسی	۵۳تا۵۹

ادب

۱	در معنی شعر: من آں وقت	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۷۹تا۱۸۴
۲	در معنی بیت مثنوی: زندہ معشوق است و عاشق مردہ	اسرار قرآنی	فارسی	ص۱۶تا۱۸
۳	در معنی بیت مثنوی شریف	اسرار قرآنی	ایضاً	ص۲۵تا۲۹

علمی فنی اصطلاحات اور مباحث

۱	تحقیق کلی متکرر النوع و مثنات بالتکریر	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۵۴تا۱۵۷
۲	در تحقیق واسطہ فی العروض	ایضاً	فارسی	ص۱۵۷تا۱۶۱
۳	تحقیق المرکب والاجزاء	الخط المقسوم	عربی	ص۶تا۲۳

ذاتی

۱	بنام حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	مجموعہ مکتوبات	فارسی	کل ۹ صفحات
۲	ایضاً	اکابر	ایضاً	ایضاً
۳	ایضاً	قلمی	ایضاً	ایضاً
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً

۱۰	ایضاً	مجموعۂ مکتوبات اکابر (قلمی)	ایضاً	ایضاً
۱۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۲	ممتاز علی میرٹھی	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۴۸ تا ۵۲
۱	مرزا عبدالقادر بیگ مرادآبادی (بموقع سفرحج موصوف)	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۰ تا ۲۱
۱	شاہ رفیع الدین مہتمم مدرسہ (دیوبند)	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۲ تا ۵۳
۱	مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری	الحظ المقسوم	عربی	ص۲۵ تا ۲۷
۱	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	۵۳
۲	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۳ تا ۵۴
۳	ایضاً	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۴ تا ۵۵
۴	درباب عمل کشائش رزق واداۓ دین	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۱ تا ۲۲
۵	درعلاج ہوس دنیا	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۱
۱	خلیفہ بشیر احمد صاحب دیوبند	مکتوبات قاسمیہ	فارسی	ص۲ تا ۳
۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳ تا ۴
۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴
۴	ایضاً	ایضاً	اردو	ص۴ تا ۵
۵	ایضاً	ایضاً	فارسی	ص ۵ تا ۶
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۶ تا ۷
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷ تا ۸
۹	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی امام فن مناظرہ	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری	اردو	ص۶۱ تا ۶۲

۹	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی امام فن مناظرہ	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری	اردو	ص۶۱ تا ۶۲
۱۰	مولانا محمد صدیق احمد مرآدابادی وشمس مرادآبادی	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ مارچ ۷۶ء	فارسی مع اردو ترجمہ	

ذاتی مگر مباحثہ و مناظرہ سے متعلق

۱	مناظرہ کرنے سے انکار کا تذکرہ و شکریہ	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۹۵ تا ۱۹۷
۲	بسلسلۂ مناظرہ مولانا عبدالعزیز امروہوی	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۹۷ تا ۱۹۹
۳	بنام سوامی دیانند سرسوتی بسلسلۂ مناظرہ رڑکی	جیون چرتر سوامی دیانند	اردو	ص۵۲۱ تا ۵۲۲
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۲۸
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۲۹ تا ۵۳۳
۶	ایضاً مع ضمیمہ	ایضاً	ایضاً	ص۵۳۵ تا ۵۴۰
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۴۹ تا ۵۵۰
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۰
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۱ تا ۵۵۲
۱۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۴
۱۱	سوامی دیانند سرسوتی کے جواب میں مناظرہ کا اشتہار	ایضاً	ایضاً	ص۵۲۰ تا ۵۲۱

مولانا اسیر ادروی*

حضرت نانوتویؒ کا قصیدۂ بہاریہ

در نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسن کاکوروی کا قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' کافی مشہور ہے کیونکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے سلسلہ میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، لیکن اس قصیدہ پر ہندو مذہبیات کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ دیر تک رہوار فکر کاشی اور متھرا کی فضاؤں میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ وحدانیت اور توحید کا پیغام لے کر آنے والے شہنشاہ کونین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال ایسے ماحول اور ایسی فضا میں کیا جانا چاہیے تھا جو آپ کے منصب نبوت کے شایان شان ہے۔

اس کے برخلاف الامام محمد قاسم نانوتوی کے قصیدۂ بہاریہ میں ایک ایسی لطیف و پاکیزہ، عشق و محبت کے جذبات میں آگ لگا دینے والی فضا کی منظر کشی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے جو دلوں کو بدمست اور سرشار کر دیتی ہے، احساسات پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے، شوریدگی و آشفتگی اور ایسی بیتابی کا ماحول بن جاتا ہے جو محبوب رب العالمین کے استقبال اور خیر مقدم کے شایان شان ہے عشق میں دیوانگی کا ظہور بہار کی آمد سے وابستہ ہے، گریبان کے چاک کرنے اور دامن کو تار تار کرنے کا یہی موسم ہے، پوری اردو شاعری اس کی عکاس ہے اس لئے حضرت نانوتوی کا یہ نعتیہ قصیدہ بہاریہ ہونے کی وجہ سے بڑا وجد آفریں اور احساسات کو مہمیز کرنے والا ہے اور جب بہار کی منظر کشی کے بعد سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل آتا ہے تو روح عشق و محبت کے جذبات سے سرشار ہو جاتی ہے۔

حضرت نانوتوی شاعر تھے؟ میرے ذہن میں اس کا تصور بھی نہیں تھا، کیونکہ میں ان کو شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے دیکھتا ہوں، میلہ خداشناسی میں پادریوں اور آریہ سماجیوں کو ایسے

* جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی

گھاٹ پر مارتے ہوئے پاتا ہوں جہاں ان کو پانی بھی نہ مل سکا، رڑکی میں دیانند سرسوتی کی پناہ گاہ میں گھس کران کی چرب زبانی کے لبادہ کو تار تار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، وہ فرسودہ اور بوسیدہ علم کلام کی جگہ ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال کر اس پر ایک شاندار محل تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں آخرانھوں نے شعروشاعری سے کب دلچسپی لی؟ ان کی شخصیت اوران کے گردوپیش کے ماحول سے شاعری کا کوئی جوڑ اور ربط نظر نہیں آتا، وہ تنہائی پسند، تقشف کی حد تک زاہد مرتاض نظر آتے ہیں لیکن ان کے کاغذات میں یہ قصیدہ بہاریہ نعتیہ ملا تو یقین کرنا پڑا کہ یہ کلام انھیں کا ہے اور یہ جوہر بھی ان کی تہ درتہ شخصیت میں کہیں پوشیدہ تھا جس کا ظہور بعد میں ہوا۔

حضرت نانوتوی غالب، مومن اور میر کے ہم عصر ہیں یہ تینوں اردو شاعری کے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہیں، اقلیم سخن پر ان کی حکمرانی تھی، حضرت نانوتوی اس حکمراں طبقہ میں نہیں تھے وہ تو عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز محدث کی صف میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ذہین وفطین انسان اپنے گردوپیش پر ناقدانہ نظر رکھتا ہے اپنے گردوپیش کے حالات سے بے تعلق ہوکر بھی اس کا مزاج شناس ہوتا ہے، شاعری بھی اس دور میں ذریعۂ اظہار کا بہت موثر وسیلہ تھا اگر علماء کی صفوں میں بھی اس ذریعۂ اظہار کو اپنانے والے کچھ لوگ ملتے ہیں تو یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے حضرت نانوتوی کا شمار بھی انھیں علماء میں تھا جن کی فطرت میں جوہر شاعری پوشیدہ تھا اور اس کا کبھی کبھی ظہور بھی ہوا۔

حضرت نانوتوی کا یہ قصیدہ ۱۵۱/اشعار پر مشتمل ہے، اس کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ کہنہ مشق اور ایک قادرالکلام شاعر تھے لیکن اس کمال کا ظہور اس لئے نہیں ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طوفانی زندگی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی جو آپ کے شاعرانہ جذبات کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس سے نبرد آزمائی وقت کا پہلا اور بڑا فریضہ تھا، اس طوفانی دور میں شاعری: تیز آندھی میں چراغوں کا سفر ہو جیسے، لیکن یہ حیرت انگیز حقیقت کیسے تسلیم کی جائے، اتنے طویل قصیدہ کے کہنے میں کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب سالہا سال مشق سخن کا سلسلہ رہا ہو، یک بیک اتنا مرصع کلام تخلیق کرنا تجربات کی دنیا میں قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت نانوتوی کا کلام

ہم کو کہیں نظر نہیں آتا سوائے اردو فارسی کی چند نظموں کے، اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے آپ نے نظمیں لکھی ہوں گی لیکن نہ کسی کو سنایا نہ اس کی اشاعت ہونے دی ہوگی پھر وہ ضائع ہوگئیں اس کی حفاظت آپ نے مناسب نہیں سمجھی ہوگی لیکن ان تمام شکوک وشبہات کے باوجود یہ قصیدہ بہاریہ آپ کی تخلیق ہے اور اس کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت نانوتوی میں قوت تخیل وہبی تھی، ہر ذہین وفطین انسان کی فطرت میں یہ جوہر موجود رہتا ہے اور اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے لیکن طائر تخیل کی بلند پروازی کو اپنی حدود میں رکھنے کے لئے قوت ممیّزہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بے سمت پرواز کو روک سکے اور یہ جوہر تجربات ومشاہدات پر گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ کسبی ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں حضرت نانوتوی میں یہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، صرف الفاظ کا صحیح استعمال جو تخیل کی بنائی ہوئی تصویر متشکل کر کے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے اسی کا نام شاعری ہے۔ حضرت نانوتوی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری قدرت حاصل تھی اس لئے وہ اس طویل قصیدہ کے لکھنے میں کامیاب ہوئے، قصیدہ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گہری معنویت اور ان کی وسعتوں پر آپ کی نگاہ تھی آپ کی نثری کتابوں سے بھی اس کی تائید ہوتی اس لئے یہ طویل قصیدہ آپ کے قلم کا شاہکار بن کر ظاہر ہوا تو کوئی تعجب خیز انکشاف نہیں بلکہ ایک صداقت تھی جو دیر میں ظاہر ہوئی۔ ایک بات اور، حضرت نانوتوی کا ابتدائی دور اردو کے عنفوان شباب کا دور تھا ابھی اس میں پختگی نہیں آئی تھی، بہت سے الفاظ اس زمانہ میں مستعمل تھے جو بعد میں متروک ہوگئے، یہ الفاظ اردو شاعری میں ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں اسی طرح بہت سے الفاظ کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی آج سے مختلف تھا بعد کے دور میں اس کی بھی اصلاح کردی گئی، اس لئے حضرت نانوتوی کے اس قصیدے میں بھی ایسے الفاظ، تلفظ اور لب ولہجہ کو اختیار کیا گیا ہے جو بعد کے دور میں متروک ہوئے اس قصیدہ کا مطالعہ اسی دور کے چوکھٹے میں رکھ کر کرنا چاہیے۔

قصیدہ میں تخیل کی بلند پروازی، تجربات ومشاہدات کی خوبصورت منظر کشی، مظاہرِ فطرت کا مطالعہ اور اس کی تصویر کشی اتنے دلکش انداز میں ہے کہ پڑھتے ہوئے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے، قصیدہ کا عنوان ہے: "قصیدۂ بہاریہ درنعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

نہووے نغمہ سرا کس طرح سے بلبل زار — کہ آئی ہے نئے سر سے چمن چمن میں بہار

ہر اک کو حسب لیاقت بہار دیتی ہے — کسی کو برگ، کسی کو گل اور کسی کو بار
کیا ہے بھیج کے سیل آب چاہ کو معزول — بجائے باد صبا، بوے گل ہے کارگزار
کریں ہیں مرغ چمن سارے مشق موسیقی — کہ گانے ہیں انھیں اس سال شکر حق میں ملار

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کا شہرہ ہے، آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، پھولوں کی خوشبو فضا میں ہر طرف اڑتی پھرتی ہے جیسے باد صبا کے ہاتھ سے چمن کی آرائش کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بوے گل چمن کو سنوارنے اور سجانے میں لگی ہوئی ہے، تمام مرغان چمن نے جو خوش الحان ہیں ابھی سے موسیقی کی مشق شروع کردی ہے، کیونکہ جب بہار کی سواری اس سال آئے گی تو اس کے استقبال میں استقبالیہ ترانے گانے ہیں۔ اس کے بعد حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

بہار گل کی خبر سن کے چھڑکے ہے پانی — سحاب، سبزۂ پژمردہ پر کہ ہو ہوشیار
پھریں ہیں کھیلتے آب رواں وبادصبا — کھلیں ہیں غنچے، ہنسیں ہیں گل وخوش ہے ہزار
خوشی سے مرغ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں — کفِ ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
اچھلتے ہیں کہیں دیکھ اک طرف کو فوارے — کہیں ہیں کودتے اونچے سے آب پر ابشار
چمن کو دیکھ کے پھولا پھلا ہوا قمری — کرے ہے سرو پہ تسبیح حق پکار پکار

آدمی کی آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتی ہیں تو پانی کے چھینٹے مار کر اس کو ہوشیار کیا جاتا ہے، اس تجربہ سے کام لے کر حضرت نانوتوی نے کہا دھوپ کی شدت کی وجہ سے سبزے مرجھا جاتے ہیں جو چمن چمن اداسی پیدا کرتے ہیں بادل کو خیال آیا کہ موسم گل کی آمد آمد کا شہرہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کو سنوارنا سجانا اور اس کو استقبال کے لئے چاق وچوبند کرنا مری ذمہ داری ہے، اس لئے اس نے اونگھتے ہوئے پودوں پر پانی چھڑک کر ان کو ہوشیار کردیا، یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ جوں ہی پہلی بارش ہوتی ہے سبزوں میں تازگی آجاتی ہے، سکڑے سمٹے ہوئے سبزے پانی پی کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر حضرت نانوتوی بتاتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر کائنات میں پھیلی ہوئی ہے، اس لئے ہر طرف بہجت ومسرت کے نظارے نظر آتے ہیں، جب کہیں خوشی کی کوئی تقریب ہوتی ہے تو بچے بچیاں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہر طرف بے مقصد دوڑتے پھرتے ہیں، ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں، ہر دیکھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہاں کوئی جشن، خوشی کی کوئی تقریب ہونے والی ہے، اسی

طرح کائنات کی ہر چیز فرط مسرت سے کھیل کود رہی ہے آب رواں اور بادصبا خوشی سے دوڑ بھاگ کر رہے ہیں، چمن میں غنچوں اور پھولوں کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل رہی ہے، بلبل ہزار داستان اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہے کہ اب جلد ہی بہار کا روح افزا دور آنیوالا ہے جب اس کو نغمہ سرائیوں کا سنہرا موقعہ ہاتھ آئے گا۔

باغوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ ان کا گانا ہے، ادھر ادھر پھدکتے پھرنا ان کا رقص مسرت ہے، اس محفل طرب میں درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں، پانی کے فوارے وفور مسرت سے اچھل رہے ہیں، آبشار کا پانی پچاسوں فٹ کی بلندی سے نیچے پانی کی سطح پر کود کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہا ہے، قمری سرو کے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھ کر بہجت و مسرت کے موقعہ پر ''سبحان تری قدرت'' کے نغمے الاپ رہی ہے، گویا پوری کائنات فرط مسرت سے جھوم رہی ہے، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں، ہر چیز سے مسرت نمایاں ہے، حضرت نانوتوی کا طائر فکر کن کن وادیوں کی خبر رکھتا ہے درج ذیل اشعار دیکھئے:

ہوا ہے چرخ کا سب اب کے صرف، بارش آب	زمین سے اُسے ہووےگی حاجت امطار
چمن میں کثرت گل سے رہی نہ گنجائش	پھرے ہے چار طرف بوئے گل، خدائی خوار
عجب نہیں جو جمیں آب تیغ سے پھر سر	کہ نام آب ہی نشوونما کو ہے درکار
سمجھ کے تخم بشر، کیا عجب جو مردوں کو	قوای نامیہ دیں اب کی بار، برگ وبار

استقبال بہار کے اہتمام میں پورے چمنستان عالم کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے آسمان نے اتنی فیاضی سے بارش کی ہے کہ اس کا سارا خزانہ اب ختم ہو گیا ہے، اگر اتفاقاً آسمان کو بھی پانی کی ضرورت پیش آ گئی تو اس کو زمین سے پانی مانگنا پڑے گا، اسی وجہ سے چمن میں ہر طرف پھولوں کا انبار لگ گیا ہے اور اتنا اژدہام ہے کہ صحن چمن میں پاؤں رکھنے کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی، انتہا یہ ہے کہ جو خوشبو ہمیشہ پھولوں کے ساتھ رہی جہاں پھول رہا وہیں خوشبو بھی رہی مگر پھولوں کے اژدہام کی وجہ سے خوشبو کو پھولوں کی صحبت نصیب نہیں، کیونکہ چمن میں پاؤں رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے، اس لئے خوشبو ہر طرف آوارہ و سرگشتہ گھوم پھر رہی ہے، شاعر کو صرف یہ کہنا ہے کہ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی ہے لیکن اس انداز بیان نے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کر دیا ہے۔ پھر حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ

بہار کی آمد آمد کی خبر سے نشو ونما کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ آب تیغ (تلوار کی دھار) جو انسان سے حیات چھین لیتی ہے اس کا وجود لٹا دیتی ہے لیکن اب بہار کی قوت نمو اتنی طاقتور ہے کہ آب تیغ میں چونکہ پانی (آب) کا ذکر ہے اور اب صرف پانی کا نام لینا نشو ونما کے لیے کافی ہے اس لیے آب تیغ سے انسان مرنے کے بجائے زندگی پا جائے گا، اس زبردست قوت نمو کی وجہ سے مردوں اور لاشوں میں جان پڑ جائے گی کیوں کہ قوت نمو اس کو تخلیق انسان کے لیے بیج سمجھ لے گی اور بیج سے پیداوار ہوتی ہے اس لیے انھیں لاشوں سے انسان از سر نو وجود میں آجائیں گے، یہ بہار کی پیدا کردہ زبردست قوت نمو کا تعین ہوگا، اس کے بعد اشعار ہیں:

یقیں ہے اب کے تروتازگی کے باعث سے — بغیر آگ کے پکنا ہو کشت کا دشوار
جو بوئیں ہاتھ سے اپنے ہی زاہدان خشک — تو نکلے شجرۂ طوبیٰ زدانہ ہائے شمار
شرار دانۂ بارود کو لگیں ہیں پھول — عموم فیض بہاری سے آگ ہے گلزار

کھیتوں میں گندم کی بالیوں میں دانے اس وقت پکتے ہیں جب ان کو دھوپ کی تمازت ملتی ہے کھیتوں کو سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سال موسم بہار کی شادابی اور تروتازگی کا یہ عالم ہے کہ سورج کی حرارت ناکام ہوگئی ہے اور کھیتوں میں دانوں کو پکانے کی صلاحیت اس سے ختم ہوگئی ہے اس لیے آگ جلا کر کھیتوں کو حرارت پہونچانے کا نظم کرنا ہوگا تبھی کھیتوں میں دانے پختہ ہوں گے، ''زاہدان خشک'' میں لفظ خشک سے کام لیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے کہا کہ خشکی اور طراوت تو دونوں متضاد ہیں، سوکھی زمین میں کوئی پودا جم نہیں سکتا اگر دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پودے گاڑ بھی دیئے جائیں تو چند گھنٹوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گے، لیکن اب کے موسم بہار کی طراوت، تروتازگی اور شادابی کا حال یہ ہے کہ خشک زمین میں بھی پودے لگا دیئے جائیں وہ شجرہ طوبیٰ کی طرح ہرے بھرے ہوں گے۔ ''زاہدانِ خشک'' کی مناسبت سے یہاں شجرۂ طوبیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں کہ موسم بہار کی شدت طراوت اس درجہ کی ہے کہ بارود کا ذرہ ذرہ جو ایک چنگاری ہوتا ہے وہ پھول بن گیا ہے، بارود ایک آتش کدہ اور آگ کا خزانہ ہے، وہ موسم بہار کے صدقے میں گل و گلزار ہوگئی ہے جیسے حضرت ابراہیم پر آگ گلزار بن گئی تھی۔

یہ فیض عام ہے سر پر ہرن کی شاخیں ہیں — بدن میں شیر کے گل، اور دم میں سیہہ کے خار

کرم میں آپ کو دشمن سے بھی نہیں انکار　　بجھائی ہے دل آتش کی بھی تپش، یارب
پڑا جو سطح پہ سبزہ کے سایۂ اشجار　　بساط سبزہ مشجر بنا ہے صحن چمن

بارہ سنگھا کے ہرن کے سر پر شاخ در شاخ سینگیں ہوں یا شیر کے بدن پر بالوں کے گچھے جو پھول کی شکل اختیار کر گئے ہیں یا ساہی کے بدن پر جو لمبے لمبے کانٹے ہیں وہ سب اس بہار کا صدقہ ہے اور شدت طراوت کا یہ عالم ہے کہ آگ کے سینے میں جو تپش اور جلن ہے وہ بھی بجھ گئی ہے حالاں کہ آگ اور پانی میں ازلی بیر ہے اور ایک دوسرے کے دشمن ہیں، لیکن پانی کی شرافت اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں سے بھی حسنِ سلوک کرنے سے اس کو انکار نہیں ہوتا، اس نے آگ کے دل میں جو تپش تھی اس کو ختم کر کے آگ کو راحت پہنچائی۔ آخری شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس پر شاعر کی قوت مشاہدہ داد و تحسین کی مستحق ہے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کیا ہے، کہتے ہیں کہ صحن چمن میں سبزے کا ہرا ہرا فرش بچھا ہوا تھا وہ شطرنجی یعنی پھولدار فرش بن گیا ہے، کیوں کہ درختوں کے سائے جب سبزے کے ہرے ہرے فرش پر پڑتے ہیں تو دھوپ چھاؤں کی وجہ سے یہ سبز فرش معلوم ہوتا ہے کہ صحن چمن میں شطرنجی بچھا دی گئی ہے اور بہت پُر تکلف فرش کا اہتمام نظر آتا ہے۔ حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

ہوا کو غنچۂ دل بستہ کی ہے دلجوئی　　ادھر ہے آب تلک شاخ و برگ سب پہ نثار
کرے ہے سبزۂ نو خاستہ پہ گل سایہ　　اوڑھاتی آب رواں کی ہیں چادریں انہار
یہ قدر خاک ہے، ہیں باغ باغ وہ عاشق　　کبھی رہے تھا سدا جن کے دل کے بیچ غبار

فطرت نے چمن کی آرائش میں ہوا اور پانی سب کو لگا رکھا ہے تا کہ کوئی آزردہ خاطر نہ رہے غنچہ یا گل جب تک پھول نہ بنے اس کی پتیاں سمٹی رہتی ہیں اس کو دل بستہ بجھے ہوئے دل سے تعبیر کیا گیا اور چمن میں کوئی آزردہ خاطر نہ رہے اس لیے ہوا غنچہ دل بستہ کی خوشامدیں کر رہی ہے، اس کو جھولا جھلا رہی ہے تا کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگے، پانی کی پھواریں تمام درختوں، پودوں اور پھول پتیوں کو نہلا رہی ہیں، پانی ان پر نچھاور اور قربان ہو کر ان کی شادابی میں اضافہ کر رہا ہے۔ چمن میں جو سبزے نئے نئے اگ رہے ہیں اس کو نومولود بچے کی حیثیت میں رکھا گیا ہے جس طرح مائیں بچوں کو دھوپ کی تپش سے بچاتی ہیں، ٹھنڈے سائے میں رکھتی ہیں اور ان کے اوپر کوئی باریک کپڑا اڑھا دیتی ہیں

اسی طرح یہ مولود سبزے اور پودے ہیں ان کی راحت کے لیے پھولوں نے ان پر سایہ کر رکھا ہے کہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا نہ جائیں، نہروں نے آب رواں بھیج کر اُن کو پانی کی چادر اڑھا دی ہے، آب رواں اپنے لغوی معنی میں بھی ہے اور آب رواں ململ اور تن زیب کی طرح باریک کپڑا ہوتا ہے، گرمیوں میں اس کے کرتے اور انگر کھے پہنے جاتے ہیں، یہ مفہوم بھی یہاں مراد ہے یعنی نہروں نے بہت باریک کپڑے نومولود سبزوں کو اڑھا دیئے ہیں۔ آگے شعر میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ سارے پودے زمین سے اُگتے ہیں، باغوں میں درختوں کی جڑیں اسی زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں جب باغ زمین کا مرہون منت ہے عاشقوں کا دل "باغ باغ" اور خوش کیوں نہ ہو جائے، رقیبوں کی طرف سے جو دل میں غبار ہے وہ غبار زمین کا ہی حصہ ہے، اس لیے اس میں باغ پیدا ہو گیا تو غبار اس باغ کے درختوں کی جڑوں کی خوراک بن گیا اور تب عاشق کے دل میں اغیار کی طرف سے جو غبار تھا ختم ہو گیا اور دل صاف ہو گیا، حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں:

نہ ہووے رشک سے لالہ کے دل پہ کب تک داغ	کہ گل ہے سوختہ جاں، تھی جو شمع آتشبار
نہ ہووے رنگ کوئی کب تلک کہ لالہ وگل	نکالیں سبز شجر سبزہ سرخ گل سے عذار
جلائے گر کہیں ہم شکل شاخ شمع کو بھی	دھوئیں بکھیر دے آتش کے دم میں باد بہار
یہ ربط ہے گل وبو میں، اگر جدا ہو بو	تو جان کھونے کو ہو اپنی، گل رہیں تیار

لالہ کا رنگ خوب سرخ ہوتا ہے اور پنکھڑیوں میں کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں اس کو لالہ کے دل کا داغ کہا گیا، یہ داغ پھول اور شمع سے رشک کیوجہ سے پڑے کہ وہ سب دل جلے ہیں مرے دل میں عشق ومحبت کی وہ آگ نہیں اس لیے مارے رشک کے اس کے دل میں داغ پڑ گئے۔ پھر کہتے ہیں کہ چمن میں سرسبز وشاداب درختوں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کا رنگ ہرا اور سبز ہے لیکن ان سے جو پھول نکلتے ہیں وہ معشوق کے رخساروں کی طرح سرخ نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ آخر سبز درختوں کی شاخوں میں یہ سرخ پھول کیسے پیدا ہو گئے، جوش بہار کا عالم یہ ہے کہ شمع جو ایک شاخ کے مانند ہوتی ہے اس کو جلایا جائے تو باد بہاری شمع کو شاخ سمجھ کر آگ کی حلق میں دھواں بھر کر اس کا وجود مٹا دے، پھول اور خوشبو دونوں کے عشق ومحبت کا یہ عالم ہے کہ اگر پھول سے خوشبو جدا ہو کر کہیں چلی جائے تو پھول خوشبو کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا وہیں دم توڑ دے گا، کیونکہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، یہ

بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔

لگائے منہ بھی نہ گلدم، خدا کی قدرت ہے
اور اس کی دم سے لگا یوں پھرے گل بے خار

چنور سنہری بنائے ہیں ہر شجر کے لیے
شعاع کی مہ و خور میں لگا کے چرخ نے تار

سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ
نسیم تیز کو کچھ شمع سے نہیں پیکار

بہ شکل شاخ بناکر کے شمع کچھ مانگے
تو منصب شجر طور ہی دلائے بہار

یہ سبزہ زار کا رتبہ ہے شجرۂ موسیٰ
بنا ہے خاص تجلی کا مطلع انوار

اسی لیے چمنستان میں رنگ مہندی نے
کیا ظہور، ورق ہائے سبز میں ناچار

گلدم ولایتی بلبل کو کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہ اور سر پر چوٹی ہوتی ہے اور اس کی دُم کے نیچے کے پر سرخ ہوتے ہیں اس کو پھول کہتے ہیں، وہ پھولوں کی عاشق کہی جاتی ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اب کے موسم بہار میں پھولوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلبل پھولوں کو منہ تک نہیں لگاتی، الٹے پھول ہی اس کی دم کے پیچھے لگا ہوا ہے، جب انسان کے پاس دولت کا انبار ہو جاتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بے اعتنائی آجاتی ہے۔ ''چنور'' دیہاتی لفظ ''چنتری'' دلھنوں کا لباس ہوتا ہے جس میں سلمہ ستارا اور چمکدار تار ٹانکے جاتے ہیں، تمام درختوں اور پودوں کو دلہن کا لباس تیار کرنے کے لیے آسمان کو ذمہ داری دی گئی ہے وہ چاند سورج کی کرنوں میں تار ڈال کر سنہری چنتری بنا کر چمن کے سارے درختوں اور پودوں کو دلہن کی طرح سجا رہا ہے۔

جوش بہار کا یہ عالم ہے کہ اگر شمع جل رہی ہے اور باد نسیم کا ادھر سے گزر ہو جاتا ہے تو شمع اس لیے بجھ جاتی ہے کہ نسیم بہار یہ سمجھتی ہے کہ شمع کی لو جو نظر آرہی ہے وہ گل لالہ کی سرخ سرخ کلی ہے، اس لیے وہ بے تکلف گزر جاتی ہے اور شمع بجھ جاتی ہے، کیوں کہ باد نسیم کو شمع سے کوئی عداوت نہیں ہے وہ کیوں بجھائے گی مگر غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

موسم بہار کی فیاضی اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر شمع کہدے کہ میں درخت کی شاخ ہوں مجھ کو بھی فیضان بہار سے حصہ ملنا چاہیے تو شجر طور جس زمین پر ہے وہ زمین سفارش کرے گی کہ جب اس بہار کا فیض سب کو پہونچ رہا ہے، زمین کا ہر پودہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے تو شمع جو خود کو شاخ کہہ رہی ہے تو اس شاخ کو پھول پتیوں کی سوغات ملنی چاہیے تو شمع میں بھی پھول پتیاں پیدا ہو جائیں

گی، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ کائنات میں سب سے بڑا رتبہ تو سبزہ زار ہی کا ہے، کیونکہ شجر طور بھی اسی میں سے ہے، اس پر تجلی ربانی ہوئی جبکہ کائنات کی کسی اور چیز پر تجلی نہیں ظاہر ہوئی۔

مہندی کی پتیاں جب پیس کر نرم و نازک ہتھیلیوں پر لگائی جاتی ہیں تو ان کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے جبکہ پتیوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، چونکہ پتیوں کا ہرا رنگ تجلی گاہ ربانی ہے اس لیے مہندی کے رنگ نے ہری ہری پتیوں میں حلول کر کے ظہور کیا، سبز پتیوں کا احترام کیا اور ان کا رنگ نہیں بدلا۔

حضرت نانوتوی پھر فرماتے ہیں:

ہنود کو ہے گماں دیکھ کر یہ اُعجوبے ۔۔۔ کہ اب کے لیں ہیں جنم سبزہ زار میں اوتار

یعنی یہ قوم تو ہر حیرتناک چیز کو دیکھ کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس سال موسم بہار نے وہ حیرتناک جلوے دکھائے ہیں کہ یہ تو ہم پرست قوم کہے گی کہ اب کے اوتار نے سبزہ زاروں میں جنم لیا ہے اور پھر اس کی پرستش کرنے لگے گی۔

نزاکتِ چمنستاں بیان کیا کیجے ۔۔۔ کہ صُنع حق کے تئیں دیکھ عقل ہے بیکار
نہ شاخ گل کے تئیں تاب بارِ شبنم ہے ۔۔۔ نہ کوئی لحہ ہے شبنم کو دھوپ ہی کی سہار
ہوا کی ایک ٹھسک سے ہے چور چور حباب ۔۔۔ رگڑ سے آب کی، دھانگیں ہیں آبجو کی فگار
پڑے پھپھولے حبابوں کی نرمی تن سے ۔۔۔ بندھا جو بوندوں کی کثرت سے تن پہ اُن کے تار
گرادیا ہے تلے، گل نے بار سایہ کو ۔۔۔ کہ رنگ و بو کا اٹھانا بھی تھا اُسے دشوار
نہ ہو کہاں تئیں آب رواں کا پتلا حال ۔۔۔ خراش سبزہ بہ پا، سر پہ سایۂ گل بار
پچھاڑ کھا کے گرے ہے چمن میں چادر آب ۔۔۔ ہوا ہے کثرت لغزش سے آب بھی ناچار
کمر پہ بارگراں بوئے گل، تلے پھسلن ۔۔۔ نہ لڑکھڑائے کہاں تک ہوا دم رفتار
جو گر پڑے تو اٹھا جا نہ سایۂ گل سے ۔۔۔ نہ تھم سکے جو پھسل جائے موجۂ جوئبار

جب آدمی ناز و نعمت میں پلا ہوا ہوتا ہے تو معمولی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا، چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اس کے لیے پہاڑ بن جاتی ہیں، بہار نے چمن کو بڑے ناز و نعم سے پالا ہے، اس لیے اس کی ہر چیز میں نزاکت آ گئی ہے، اس نزاکت کی کیا کیفیت ہے حضرت نانوتوی نے محسوس اور مشاہداتی مناظر دکھائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھول تو پھول اس کی شاخیں اور پتیاں اتنی نرم و نازک ہیں کہ وہ شبنم کے

قطروں کو بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرسکتیں اور خود شبنم جو اسی چمن کے ہم نشینوں میں شامل ہے اتنی نازک اندام ہے کہ سورج کی معمولی حرارت بھی اس کے تن نازک کا وجود مٹا دیتی ہے، چمن کی نہروں میں جو حبابوں کے تاج محل کھڑے ہیں ان کو ہوا کی ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو وہ چور چور ہو جاتے ہیں، نہروں میں پانی چلتا ہے تو نہر کے کناروں سے رگڑ کھا کر اس کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں، نہر کے حبابوں کا بدن اتنا نازک ہے کہ بارش کی بوندوں کا تار بھی ان کے بدن کو چھو جاتا ہے تو ان کے بدن میں چھالے پڑ جاتے ہیں، پھولوں کا عالم یہ ہے کہ ان پر رنگ و بو کا اتنا بڑا بوجھ ہے کہ اسی کو اٹھانا ان کے لیے دشوار ہے، اس پر شاخوں کے سائے کا مزید باران کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو سر سے سایہ کے بوجھ کو اتار کر زمین پر ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ سایہ زمین پر ہی پڑتا ہے مگر اس کی یہ تعبیر کتنی خوبصورت اور رومان انگیز ہے۔

چمن کی نہروں میں جو پانی رواں دواں ہے اس کا بھی حال بہت پتلا ہے یعنی بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہے، کیوں کہ جب وہ چلتا ہے تو سبزے اس کے پاؤں تلے آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں خراش آجاتی ہے اور قدم زخمی ہو جاتے ہیں، پھر اس پر پھولوں کے سایہ کا بوجھ خود بار گراں، پاؤں زخمی اور اتنے بڑے بوجھ کو لے کر چلنا بہت دقت طلب کام ہے، اس لیے اس کا حال بہت پتلا ہو گیا۔

پانی آسمان سے اُترتا ہے تو ہوا کے تھپیڑے کھا کر زمین پر گرتا ہے تو ایک دھما کا سا ہوتا ہے، پانی بھی چمن میں پھسل کر بے تحاشا گرتا ہے، کیونکہ بار بار اس کو ٹھوکر لگتی ہے اور پاؤں میں لغزش ہوتی ہے، اس لیے برسات کی پھسلن میں جیسے آدمی بے تحاشا گرتا ہے اسی طرح پانی بھی چمن میں بار بار گر جاتا ہے، چمن میں ہوا بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے، ایک تو اپنی کمر پر خوشبو کا بھاری بوجھ لاد رکھا ہے دوسرے زمین پر بارش کی وجہ سے پھسلن ہو گئی ہے بھاری بوجھ کی وجہ سے ہر ہر قدم پر پھسل جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب گری اور تب گری، خوشبو کے بوجھ کا تصور بڑا شاعرانہ تصور ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ پھولوں کا سایہ اگر زمین پر گر پڑے تو پھولوں کے لیے سائے کا اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ نہر میں چلنے والے پانی کی موج کو اگر ٹھوکر لگ گئی اور وہ پھسل گئی تو پھر اس کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا وہ پھسلتی ہوئی دور تک چلی جائے گی۔ حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

کہاں زمین، کہاں یاسمین ولالہ ودرو — فلک بھی گرد ہوا دیکھ کر چمن کی بہار
زمیں سے چرخ ہے ہرطرح اب کے شرمندہ — زمیں میں گڑ جا اگر چرخ کی بسے کچھ چار
دکھائے چرخ اگر اپنے چاند سورج کو — مقابلہ پہ ہر اک حوضِ باغ ہو تیار
کئے ہیں آپ زمیں نے جواب بارش میں — بجائے بوندوں کے فوارے اس طرف تیار

اب کی بار موسم گل نے زمین کو انتہائی حسین اور خوبصورت بنادیا ہے، ہرطرف چمبیلی، گلاب اور گل لالہ اپنی بہار دکھار ہے ہیں جن کو دیکھ کر آسمان شرمندہ ہے کہ زمین کی آرائش وزیبائش کے مقابلہ میں میری آرائش وزیبائش گرد ہوگئی ہے، مارے شرم کے وہ زمین میں گڑا جارہا ہے اگر رفع خجالت کے لیے آسمان اپنے چاند سورج دکھائے کہ ہمارے پاس نور کا خزانہ ہے تو زمین بھی مقابلہ پر آجائے گی اور چمن کے حوض کو اس کے مقابلہ میں پیش کردے گی جس میں پانی سیال چاندی کی طرح ہلوریں لے رہا ہے جس سے چاندسورج خود شرمندہ ہوجائیں، آسمان اگر بارش برسا کر اپنی برتری کا مظاہرہ کرسکتا ہے تو زمین اپنے فوارے اس کے جواب میں پیش کردے گی کہ تم ننھی ننھی بوندیں برسا کر مغرور ہو اس کے مقابلہ میں یہ فوارے پورے جوش وخروش سے برستے ہیں۔

حضرات نانوتوی نے زمین وآسمان کے تقابل میں زمین کی برتری دکھائی ہے، زمین کو یہ برتری اسی موسم بہار میں ملی ہے، یہاں ماضی کا کوئی ذکر نہیں، زمین وآسمان کے اسی تقابل سے گریز کے اشعار شروع ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد مدحیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت نانوتوی نے گریز کے یہ دوشعر کتنے معنی خیز کہے ہیں، ملاحظہ ہو:

پہونچ سکے شجر طور کو کہیں طوبیٰ — مقام یار کو کب پہونچے مسکن اغیار
زمین وچرخ میں، ہو کیوں نہ فرق چرخ وزمین — یہ سب کا بار اٹھائے وہ سب کے سر پہ سوار

زمین کی فضیلت وبرتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ شجر طور زمین پر اور شجر طوبیٰ آسمان پر، مگر زمین کا یہ درخت آسمان کے درخت سے کہیں زیادہ باعظمت اور بلند رتبہ ہے، کیوں کہ شجر طور پر تجلی ربانی ہوئی اور وہ محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے اور طوبیٰ کو یہ شرف حاصل نہیں، اس پر فرشتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت رقیب اور اغیار کی ہے، رقیب اور غیر کا گھر محبوب کے گھر سے افضل کیسے ہوسکتا ہے، اسی لیے شجر طور کو شجر طوبیٰ پر فضیلت حاصل ہے، آخر میں ایک مشاہداتی دلیل پیش کرتے ہیں کہ زمین آسمان میں تو

زمین آسمان کا فرق ہے یعنی بہت بڑا فرق ہے کیونکہ زمین سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور آسمان سب کے سر کا بوجھ بنا ہوا ہے کیوں کہ وہ اوپر ہے سب کے سر پر چھایا ہوا ہے۔

حضرت نانوتوی اب تک کائنات کی چمن بندی کرتے رہے اس کے بعد مدح کے اشعار گائیں گے قصیدہ عربی زبان سے فارسی کے راستہ سے اردو میں آیا ہے اس لیے اس صنف سخن میں عربی شاعری کا انداز بیان پایا جاتا ہے، عربی زبان کے شعراء قصیدہ کے آغاز میں عشق ومحبت کے اشعار کہتے تھے اور پورا زور قلم صرف کرتے تھے اسی کو تشبیب کہتے ہیں، فارسی زبان میں جب قصیدہ آیا تو عشق ومحبت کے بجائے مناظر فطرت کی تصویر کشی، بہار اور موسم گل کی دلفریبیوں اور رعنائیوں کا ذکر تشبیب کی جگہ کہنے لگے، اردو قصیدہ نگاری میں بھی یہی طریقہ رہا، محسن کاکوروی کے قصیدہ نعتیہ میں یہی مناظر فطرت کی عکاسی ہے۔ حضرت نانوتوی نے فارسی شعرا سے متاثر ہو کر بہاریہ کہنے کو ترجیح دی، تشبیب درحقیقت قصیدہ کی تمہید ہوتی ہے اور جب اصل مدح شروع ہوتی ہے اس سے پہلے گریز کا ایک یا دو شعر لکھ کر تشبیب اور مدح میں مکمل رابطہ پیدا کر دیتے ہیں گریز کا شعر تشبیب اور مدح کا نقطۂ اتصال ہوتا ہے، حضرت نانوتوی نے بھی گریزؔ کے شعروں میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت نانوتوی کا کمال فن ''بہاریہ'' میں پوری طرح عروج پر ہے جو ایک قادر الکلام شاعر ہونے کی سند ہے، قوت تخئیل انتہائی بلند پرواز، قوت مشاہدہ بہت ژرف بیں اور دقیقہ رس۔ ضرب الامثال اور خوبصورت محاورے بہ کثرت استعمال کئے ہیں، صفت تجنیس کی رعایت نے اشعار کو حسین وجمیل بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے، جوش بہار کے خوبصورت مناظر کی عکاسی ہی کے سلسلہ میں زمین وآسمان کا تقابل کیا گیا اور زمین کی آسمان پر برتری دکھائی گئی، اس کے بعد نعت کا آغاز ہو جاتا ہے:

کرے ہے ذرۂ کوے محمدی سے خجل — فلک کے شمس وقمر کو زمینِ لیل ونہار

وہی زمین وآسمان کا تقابل، اگر آسمان کے چاند سورج اپنی روشنی اور آب وتاب پر فخر کرتے ہیں تو زمین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گلی کوچوں اور گزرگاہوں کی خاک کے ذرے کو فضا میں اُچھال دیتی ہے کہ ان خاک کے ذروں کی آب وتاب اور چمک دمک کو تمہاری آب وتاب کہاں پہونچ سکتی ہے، چاند سورج کو سوائے ندامت کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا:

فلک پہ عیسیٰ وادریس ہیں تو خیر سہی — زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختارؐ

فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانیِ احمدؐ　　زمیں پہ کچھ نہ ہو، پر ہے محمدی سرکار

کئی پیغمبروں کا آسمان پر ہونا فلک کے لیے باعث افتخار ضرور ہے لیکن افضل الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر ہونا ہی اس کی افضلیت و برتری کے لیے کافی ہے۔

نثار کیا کروں، مفلس ہوں، نام پر اس کے　　فلک سے عقد ثریا لوں دلاے اگر وہ اُدھار

ثنا کر اس کی فقط قاسم اور سب کو چھوڑ　　کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار

ثنا کر اس کی، اگر حق سے کچھ لیا چاہے　　تو اس سے کہہ، اگر اللہ سے ہے کچھ درکار

الٰہی! کس سے بیاں ہوسکے ثنا اس کی　　کہ جس پہ ایسا تری ذات خاص کا ہے پیار

جو تو اُسے نہ بناتا تو سارے عالم کو　　نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار

کہاں وہ رتبہ کہاں عقل نارسا اپنی　　کہاں وہ نور خدا، اور کہاں یہ دیدۂ زار

چراغ عقل ہے گل، اس کے نور کے آگے　　زباں کا منہ نہیں جو مدح میں کرے گفتار

جہاں کہ جلتے ہوں پر عقل کل کے بھی پھر کیا　　لگی ہے جان، جو پہونچیں وہاں میرے افکار

مگر کرے میری روح القدس مددگاری　　تو اس کی مدح میں، میں بھی کروں رقم اشعار

جو جبرئیل مدد پر ہو فکر کی میرے　　تو آگے بڑھ کے کہوں، اے جہان کے سردار

حضرت نانوتوی نے ان اشعار میں حضورؐ کے مرتبہ بلند اور شان رفیع کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس کے وجود کے صدقے میں ساری کائنات نے خلعت وجود پایا جس خالق کائنات کے حضور میں کائنات کی ہر چیز سر بہ سجود ہے وہی ذات عالی جس ذات مقدس کو اپنا محبوب بنالے تو اس عظیم المرتبت شخصیت کی مدح و ثنا میں زبان کا منہ ہے کہ گفتگو کرے جبکہ:

ہزار بار بشویم دہاں زمشک وگلاب　　ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ہاں اگر حضرت جبرئیل مدد کریں تو میں زباں کھولوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداح رسول حسانؓ بن ثابت کے لیے دعا فرمائی تھی اللھم ایدہ بروح القدس اے اللہ جبریل کے ذریعہ ان کی مدد فرما، پھر آگے حضرت نانوتوی خالص نعت کے اشعار کہتے ہیں:

تو فخرِ کون ومکاں زبدۂ زمین وزماں　　امیر لشکر پیغمبراں، شہِ ابرار

خدا ترا، تو خدا کا حبیب اور محبوب　　خدا ہے آپ کا عاشق تم اس کے عاشق زار

تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی — تو نورِ شمس گر اور انبیاء ہیں شمسِ نہار
حیات جان ہے تو ہیں اگر وہ جان جہاں — تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
طفیل آپ کے ہے کائنات کی ہستی — بجا ہے کہئے اگر تم کو مبدء الآثار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تا بہ وجود — قیامت آپ کی تھی دیکھئے تو اک رفتار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں — ترے کمال کسی میں نہیں مگر دوچار
گرفت ہو تو تیرے ایک بندہ ہونے میں — جو ہو سکے تو خدائی کا اک تیرے انکار

مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ ہم میں ان میں کیا فرق ہے، ہماری طرح وہ کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، جیسے ہم ویسے وہ بھی ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا ایک بندہ کہنے اور آپ کے رسول ہونے سے انکار کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہنم رسید ہوئے، رسالت سے انکار اور صرف بندہ کہنے پر گرفت ہوئی، حضور سے اگر کسی کمال کی نفی کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ آپ خدا نہیں ہیں بقیہ سارے کمالات آپ کی ذات میں موجود ہیں:

بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال — بغیر بندگی کیا ہے، لگے جو تجھ کو عار
جو دیکھیں اتنے کمالوں پہ تیری یکتائی — رہے کسی کو نہ وحدت وجود کا انکار

صوفیا کا ایک طبقہ وحدت الوجود کا قائل ہے، وجود کا اطلاق صرف ایک ذات واجب الوجود پر کہا جاسکتا ہے، باقی ساری کائنات اس وجود کا پرتو اور اس کے مظاہر ہیں، کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کی جلوہ گری ہے، بذات خود کائنات کا اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں، صوفیا کا ایک طبقہ اس سے انکار کرتا ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اس نظریہ کا انکار کرنے والے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمالات میں یکتائی و بے مثالی کو دیکھ لیں کہ آپ کے کمالات کے سامنے کسی کمال کی کوئی حقیقت نہیں، دنیا کے سارے کمالات آپ کے کمالات کے سامنے گرد ہیں، کائنات میں صرف آپ کا کمال ہی حقیقی کمال ہے، جب آپ کی یکتائی اور بے مثالی اس درجہ کی ہے تو خالق کائنات کے بارے میں وحدت الوجود کے نظریئے کی وہ خود تائید کرنے لگیں گے، آگے کہتے ہیں:

یہ اجتماع کمالات کا تجھے اعجاز — دیا تھا تا نہ کریں انبیاء کہیں تکرار
تو آئینہ ہے کمالاتِ کبریائی کا — وہ آپ دیکھتے ہیں اپنا جلوۂ دیدار

پہونچ سکا تیرے رتبہ تلک نہ کوئی نبی
ہوئے ہیں معجزہ والے بھی اس جگہ ناچار
جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے
کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی اقرار
لگا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا
اگر ظہور نہ ہوتا تمہارا آخر کار
خدا کے طالبِ دیدار حضرت موسیٰ
تمہارا لیجے خدا آپ طالب دیدار
کہاں بلندی طور اور کہاں تری معراج
کہیں ہوئے ہیں زمیں آسمان بھی ہموار
جمال کو ترے کب پہونچے حسن یوسف کا
وہ دلربائے زلیخا، تو شاہدِ ستار
اگر قمر میں کچھ آجائے تیرے چہرے کا نور
تورات دن ہو، اور آگے ہو اس کے دن شب تار

یہاں شاعرانہ تخیل پورے عروج پر ہے اور طائر فکر کی پرواز انتہائی بلند نظر آتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر رات میں چودھویں رات کا چاند نکلا ہوا ہو اور وہ آپ کے چہرے کا نور، آب وتاب اور اس کی روشنی پا جائے تو چاند کی روشنی کا یہ عالم ہوگا کہ رات دن سے اتنی زیادہ روشن اور تابناک ہو جائے گی کہ جب صبح کو سورج طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اس چاند کی روشنی کے مقابلہ میں جس میں حضور کے چہرۂ زیبا کا نور شامل ہو گیا ہے اتنی کمزور اور مدھم معلوم ہوگی کہ لوگ کہیں گے کہ دن نہیں بلکہ تاریک ترین رات ہے، اب چاند طلوع ہوگا تو دن ہوگا اور سورج نکلے گا تو رات ہوگی وہ بھی تاریک ترین رات، اس کے بعد حضرت نانوتوی نے استعارات، کنایات، تشبیہات وتمثیلات کا مینا بازار لگا دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

جمال ہے ترا معنی حسن ظاہر میں
کیا ہے معجزہ سے تو نے آپ کو اظہار
رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت
نہ جانا کون ہے، کچھ بھی، کسی نے جز ستار
سوا خدا کے، بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے
تو شمس نور ہے، شپر نمط اولوالابصار
سماسکے تیری خلوت میں کب نبی وملک
خدا غیور، تو اس کا حبیب اور اغیار
جو آئینہ میں پڑے عکس خال کا تیرے
تو رشک مہر کا ہوجائے مطلع الانوار
تمہارا خالِ قدم دیکھ رشک سے مہ کے
جگر پہ داغ ہے، سورج کو ہے عذاب النار
نہ بن پڑا وہ جمال آپ کا سا اک شب بھی
قمر نے گو کہ کروڑوں کیے چڑھاؤ اتار
اگر پڑے ترے تلوے میں عکس سورج کا
تو آگے نور قدم کے ہو تیرے خال شمار
سفید دیدۂ بے نور سا ہے دیدۂ نور
بصیر ہونے کو تلوے کا تل ہے تیرے بکار

بناشعاعوں کی جاروب تیرے کوچہ سے مہر — کرے ہے دور اندھیرے کا روز گرد وغبار

کتنا خوبصورت شعر ہے، قوت مشاہدہ کی یہ معراج ہے کہ وہ دیکھتی ہے کہ سورج روز جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی لمبی لمبی کرنیں جھاڑو کے تنکے کی طرح معلوم ہوتی ہیں، اس سے خیال پیدا ہوا کہ شاید سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت مقدس گلیوں، کوچوں اور گزرگاہوں کی صفائی کے لیے سورج نے شعاعوں کا جھاڑو بنایا ہے اور اس سے اندھیرے کے گرد وغبار کو صاف کر رہا ہے۔ مقام کی عظمت واہمیت کے پیش نظر اسی کے شایان شان ہر چیز استعمال ہوتی ہے اس لیے مدینہ کی گلیوں کی صفائی کے لیے تنکوں کا نہیں شعاعوں کا ہی جھاڑو زیادہ مناسب اور اس کی شایان شان ہے، پھر کہتے ہیں:

اگر ترے رخِ روشن سے گل کو دوں تشبیہ — شعاع مہر کو ہو آرزوے منصبِ خار
مُربی مہ وخور ذرے ذرے کوچے کے — معلم الملکوت آپ کا سگِ دربار
خوشا نصیب، یہ نسبت کہاں نصیب مرے — تو جس قدر ہے بھلا، میں بُرا اسی مقدار
نہ پہونچیں گنتی میں ہرگز ترے کمالوں کی — میرے بھی عیب شہ دوسرا، شہِ ابرار
قبول جرم سے اُمت کے تیری کھا دھوکا — عجب نہیں ہے جو شیطان بھی ہو نیکو کار
جو چھو بھی دیوے سگِ کوچہ تیرا اس کی نعش — تو پھر تو خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار
عجب نہیں، تیری خاطر سے تیری امت کے — گناہ ہوویں قیامت کو طاعتوں میں شمار
بکیں گے آپ کی اُمت کے جرم ایسے گراں — کہ لاکھوں مغفرتیں کم سے کم پہ ہوں گی شمار
کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو — تو قاسمی بھی طریقہ ہو، صوفیوں میں شمار
ترے بھروسے پہ رکھتا ہے غرّۂ طاعت — گناہِ قاسم برگشتہ بخت، بداطوار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گنہ کیے میں نے — تجھے شفیع کہے کون؟ گر نہ ہوں بدکار
تمہارے حرف شفاعت پہ عفو ہے عاشق — اگر گناہ کو ہے خوفِ غصۂ قہار
یہ سن کے، آپ شفیعِ گناہ گاراں ہیں — کیے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار
ترے لحاظ سے اتنی تو ہوگئی تخفیف — بشر گناہ کریں اور ملائک استغفار
دعا تری مرے مطلب کی ہو اگر حامی — تو بخت بد کو ملے حق کے گھر سے بھی پھٹکار
یہ ہے اجابت حق کو تری دعا کا لحاظ — قضاء مبرم ومشروط کی سنیں نہ پکار

خدا ترا، تو جہاں کا ہے واجب الطاعۃ — جہاں کو تجھ سے، تجھے اپنے حق سے ہے سروکار

قضاء کو تیری یہ خاطر، مگر تجھے وہ ہے — قضاء حق سے نیاز اور نیاز کا اقرار

اگر جواب دیا بیکسوں کو تونے بھی — تو کوئی اتنا نہیں جو کرے کچھ استفسار

کروڑوں جرموں کے آگے یہ نام کا اسلام — کرے گا یا نبی اللہ! کیا مرے پہ پکار

دکھائیے، دیکھئے کیا اپنا طالع بد بیں — نگاہ لطف تری ہو نہ گر مری غم خوار

بُرا ہوں، بد ہوں، گنہگار ہوں پہ تیرا ہوں — ترا کہیں ہیں مجھے، گوکہ ہوں میں ناہنجار

لگے ہے سگ کو ترے، میرے نام سے گو عیب — پہ تیرے نام کا لگنا مجھے ہے عزّ ووقار

تو بہترین خلائق میں بد ترین جہاں — تو سرور دوجہاں، میں کمینہ خدمت گار

اس کے بعد آٹھ دس شعروں میں حضرت نانوتوی نے جو کچھ کہا ہے اس سے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ قصیدہ حضرت نانوتوی نے اس دور میں لکھا ہے جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا اور آپ روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے، انگریزوں نے ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا، آپ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور آپ پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ گرفتاری کا مطلب پھانسی یا کالے پانی کی سزا تھی اس سے ہلکی سزا کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ روپوشی کا یہ دور ایک سال سے کم نہیں تھا، سارا کاروبار زندگی معطل تھا، عزیز واقارب سے رشتہ کٹا ہوا تھا سخت ذہنی اذیت میں آپ گرفتار تھے، انھیں حالات میں قصیدہ لکھا گیا۔ ممکن ہے مرا خیال صحیح نہ ہو کیونکہ حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کے اشعار میں تہ در تہ معنویت ہے اور درج ذیل اشعار سے ان کی منشا اور ہی ہو بہر حال اشعار حاضر ہیں:

بہت دنوں سے تمنا ہے کیجیے عرضِ حال — اگر ہو اپنا کسی طرح تیرے در تک بار

وہ آرزوئیں جو ہیں مدتوں سے دل میں بھری — کہوں میں کھول کے دل اور نکالوں دل کا غبار

مگر جہاں ہو فلک آستاں سے بھی نیچا — وہاں ہو قاسم بے بال و پر کا کیونکہ گزار

نہ جبرئیل کے پَر ہیں، نہ ہے براق کوئی — جو اُڑ کے در تئیں پہونچوں تمہارے، یا ہو سوار

کشش پہ تیری لیے اپنا بار بیٹھے ہیں — تکے ہے تیری طرف کو، یہ اپنا دیدۂ زار

یہ میری جان نکمی سی تھی سو اس کے بھی — پڑے ہیں چرخ وزماں پیچھے باندھ کر ہتھیار

مدد کر، اے کرم احمدی کہ تیرے سوا | نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی | کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا تجھے سردار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا | بنے گا کون ہمارا، ترے سوا غم خوار
کیا ہے سگ نمط ابلیس نے میرا پیچھا | ہوا ہے نفس، موا سانپ سا گلے کا ہار

پھراس کے بعد اپنی بیکسی اور اپنے درد و کرب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی دلی تمناؤں اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ وہ تصوف و سلوک کی راہ کے راہی تھے، ان کا رہوار فکر اسی جانب مڑ گیا ہے پھر دیر تک چلتا رہا عشق نبوی کا سوز، دیار مدینہ پہونچنے کی تڑپ اور اس مقدس سرزمین میں اپنے وجود کو تحلیل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، یہ ساری باتیں اندرونی کرب کی وجہ سے بہت ہی موثر الفاظ میں کہی ہیں، اشعار دیکھئے:

وہ عقل بے خرد اپنی، بہ زور حرص و ہوا | اُسے بجھاؤں میں یا اُن سے آکے ہوں دوچار
دکھائے ہے مرے دل کو لبھانے کو ہر دم | ہزار طرح کے دنیائے کہنہ سال سنگار
ادھر ہجوم تمنا، ادھر نصیبوں سے | کرے ہے بخت زبوں، ہر امید سے انکار
رجاء و خوف کی موجوں میں ہے امید کی ناؤ | جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہووے بیڑا پار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ | کہ ہو سگانِ مدینہ میں مرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے، پھروں | مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
جو یہ نصیب نہ ہو، اور کہاں نصیب مرے | کہ میں ہوں اور سگان حرم کی تیرے قطار
اُڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ | کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار
ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا | کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار
مگر نسیم مدینہ ہے، گرد باد بنا | کشاں کشاں مجھے لے جا جہاں ہے تیرا مزار
ہوس نہیں مجھے اس سے بھی کچھ رہی لیکن | خدا کی اور تری الفت سے میرا سینہ فگار
لگے وہ تیر غم عشق کا مرے دل میں | ہزار پارہ ہو دل، خون دل میں ہو سرشار
لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی | جلادے چرخ ستمگر کو ایک ہی جھونکار
صدائے صور قیامت ہو اپنا اک نالہ | بجائے برق ہو اپنی ہی آہ آتش بار

چبھے کچھ ایسے مرے نوک خار غم دل میں | کہ پھوٹے آنکھوں کے رستے سے اک لہو کی فوار
یہ ناتواں ہوں، غم عشق میں کہ جائے نکل | ذرا بھی جان کو اوپر کا سانس لے جو سہار
تمہارے عشق میں رو رو کے ہوں نحیف اتنا | کہ آنکھیں چشمۂ آبی سے ہوں درونِ غبار
یہ لاغری ہو کہ جان ضعیف کو دم نقل | نہ ہووے ساتھ اٹھانا بدن کا کچھ دشوار
رہے نہ منصب شیخ المشائخی کی طلب | نہ جی کو بھائے یہ دنیا کا کچھ بناؤ سنگھار
ہوا اشارہ میں دو ٹکڑے جوں قمر کا جگر | کوئی اشارہ ہمارے بھی دل کے ہو جا پار

دل کی آرزوئیں اور تمنائیں عشق کی تڑپ اور محبت کے سوز و گداز دلی اضطراب کے ساتھ دربار رسالت میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ کہاں میں اور کہاں وہ دربار عالی تبار جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے پاس ادب کرتے ہیں۔ درخواست اور فریاد کا یہ لب ولہجہ اس عظیم بارگاہ کی شایاں نہیں، اس لیے وہ اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، دل اور زباں کو سرزنش کرتے ہیں اور درود وسلام پر بات ختم کرتے ہیں:

یہ کیا ہے شور ؤغل؟ اتنا سمجھ تو کچھ قاسم | نہ کچھ ترا بڑا رتبہ، نہ کچھ بلند تبار
تو تھام اپنے تئیں حد سے پا نہ دھر باہر | سنبھال اپنے تئیں اور سنبھل کے کر گفتار
ادب کی جا ہے یہ، چپ ہو تو اور زباں کر بند | وہ جائے، چھوڑ اُسے پر نہ کر تو کچھ اصرار
دلِ شکستہ ضروری ہے جوشِ رحمت کو | گرے ہے باز کہیں، جب تلک نہ دیکھے شکار
وہ آپ رحم کریں گے، مگر سنیں تو سہی | شکستِ شیشۂ دل کی ترے کبھی جھنکار
بس اب درود پڑھ اس پر اور اس کے آل پر پہ تو | جو خوش ہو تجھ سے وہ اور اس کی عزت اطہار
الٰہی! اس پہ اور اس کی تمام آل پہ بھیج | وہ رحمتیں کہ عدد کر سکے نہ ان کو شمار

یہ قصیدہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت لکھا گیا جب اردو زبان تراش خراش کے مرحلے سے گزر رہی تھی، اس دور میں ایسے الفاظ کی بہتات تھی جو بعد میں متروک ہو گئے، اس دور کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی کہیں ثقیل تھا، اسی تلفظ کی ادائیگی کے لیے املا بھی اسی کے مطابق تھا جو اب قطعاً متروک ہے، ہم نے اس قصیدہ میں جو املا تھا ہو بہو ٹھیک وہی لکھا ہے تا کہ اس عہد کی زبان سے مطابقت باقی رہے، قصیدہ میں تعقید لفظی بہت نظر آئے گی لیکن یہ حضرت نانوتوی کی مجبوری تھی، وہ بہت ہی وسیع مفہوم کو

صرف دو مصرعوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں، اس لیے الفاظ اپنے مقام پر اکثر جگہ نہیں رہے، یہ مجبوری ہر اس شاعر کو پیش آتی ہے جو دقیق مضامین کو شعروں میں پیش کرتا ہے، مگر بہر حال اس کی وجہ سے اشعار ثقیل اور بوجھل ہو جاتے ہیں۔

یہ قصیدہ اپنی معنوی وسعت، فکر کی گہرائی، ژرف بینی، بے مثال قوت مشاہدہ کا غماز اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی، روح نواز تصویر کشی میں ایک مثالی اور لا جواب قصیدہ ہے، حضرت نانوتوی کے ہر قصیدہ کو شعر و شاعری سے ظاہری بے تعلقی اور ان کی کم سخنی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے، یہ قصیدہ پڑھ کر دل کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس سے پہلے آپ کو شعر و شاعری سے کوئی سروکار نہیں رہا ہوگا، قصیدہ صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق استاذ فن کے قلم کا رہین منت ہے، اب یہ طویل قصیدہ اردو ادب کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء سے بحث کرنے والے ادیبوں اور نقادوں کی خدمت میں پیش ہے تا کہ وہ اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ*

۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیو بند کی اہمیت

ہر تحریک اپنے زمانے اور حالات کی پیداوار ہوتی ہے۔ تحریک دیو بند کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ یہ تحریک جب عالم وجود میں آئی تو اس وقت کے حالات کیا تھے؟

اس سوال کا جواب جب ہم تاریخ کے صفحات میں تلاش کرتے ہیں تو چند باتیں نہایت نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں:

ا۔ سلطان ظہیر الدین بابر نے ابراہم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ درمیان میں اس خاندان کے مختلف فرماں روا آتے رہے اور جاتے رہے۔ آخری زمانہ بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ اس خاندان اور اس کی سلطنت کا مکمل زوال بہادر شاہ ظفر ہی کے دور میں آیا۔

۲۔ سلطنت کے زوال میں سلطان وقت کی غیر ضروری چیزوں میں مشغولیت اور مختلف انداز کی کمزوری، اپنوں کی فریب دہی اور مکاری اور غیروں کی عیاری اور چالا کی کا ہمیشہ دخل رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی بعض خوبیوں کے باوجود یہ عوامل کسی نہ کسی انداز میں یہاں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

بے موقع نہیں ہوگا، اگر اسباب زوال سلطنت کے سلسلہ میں شاہان دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار بخشی محمود کے تجزیہ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس تجزیہ کو اردو کی ایک قدیم کتاب میں حکیم مؤمن خاں مؤمن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے، جو اٹھارہویں صدی کے طور طریقوں کی ایک دل آویز

---

* سابق ناظم دار العلوم سبیل السلام، سبیل نگر، حیدر آباد (اے پی)

تصویر پیش کرتا ہے۔ نتائج المعانی میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:

''ایک روز ابونصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکر زوال سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کی، چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔ اول حکیموں نے فرمان روایان بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تاب تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔ دوسرے کلاونتوں نے، ان کے گھر میں جو نو خیز ہوئی، اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرور میں مائل رکھا، ڈوم ڈھاڑی مدار المہام ہوئے، انتظام فرمان روائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پیر پھیلائے، جابجا خود سر ہو گئے، شرفاء کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔ تیسرے کثرت عیال نے، ادھر ازواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولاد کی ترقی ہوئی، نزاع خانگی سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے، جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا، اپنے تئیں عرش پر پہنچایا، مسائل تصوف بیان کرنے لگے، کنج عزلت کی خوبیاں عرض کرنے لگے، خون بندگان خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی یہ شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا، خود پامال سم سمندان لشکر دعائے دولت و اقبال ہوگا۔ فرماں رواں ان کے دام میں آ گئے، پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا، چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزیں ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی، لیکن زوال حکومت سے علوم اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا، بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا''(۱)۔

۳۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے زوال کے جو بھی اسباب ہوں، ان پر تفصیلی اور تحقیقی تبصرہ کے بغیر زوال کے اس نتیجہ پر نگاہ رکھ لی جائے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں انگریزی تسلط و اقتدار اپنی کامل شکل میں آ گیا اور حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ سے نکل کر براہ راست ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے لگا، یہ جھنڈا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر معین مدت کے لئے دوسروں کے فولادی ہاتھوں میں جا چکا ہے

(۱) نتائج المعانی، صفحہ ۱۷۶، ۱۷۵

اور اب ہندوستان جنت نشاں کی بہاروں پر ایک سفید فام قوم کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے، یہی وہ وقت ہے جب مسلمانوں نے ہندوستان میں جنگ آزادی کا باضابطہ آغاز کیا۔

۴۔ ہندوستان میں جب انگریز مکمل طور پر اقتدار میں آگئے اور زمام حکومت انہوں نے اپنے ہاتھ میں تھام لی، تو گویا انہوں نے ہندوستانی باشندوں کو بلا امتیاز مذہب وملت اپنا ''غلام'' بنالیا۔ باشندگان ملک کی ایسی کسی غلامی کے خلاف آزادی کی جدوجہد ایک فطری تھی اور یہ انسانی فطرت سامنے آئی، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہاں کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اپنے غم وغصہ کا اظہار زیادہ کیا اور انہوں نے ہی آگے بڑھ چڑھ کر آزادی کا نعرہ لگایا، وجہ اس کی یہ تھی کہ اقتدار انہی سے چھینا گیا تھا، اس لئے فطری طور پر انہیں زیادہ رنج وملال تھا اور برطانوی حکومت کے خلاف یہ زیادہ جوش وخروش میں تھے۔ اس تاریخی حقیقت کو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے الفاظ میں اس طرح اجاگر کیا ہے:

> ''ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا حصہ قدرتی طور پر بہت ممتاز ونمایاں رہا ہے، انہوں نے جنگ آزادی میں قائد اور رہنما کا پارٹ ادا کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک ایک صوبہ اور ریاست ان کے زیرنگیں آنے لگی اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کے فرمان روا تھے، سب سے پہلا شخص جس کو اس خطرہ کا احساس ہوا وہ میسور کا بلند ہمت اور غیور فرمان روا فتح علی خاں ٹیپو سلطان (۱۲۱۳ھ م ۱۷۹۹ء) تھا، جس نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کرلی کہ انگریز اسی طرح ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اور اگر کوئی منظم طاقت ان کے مقابلہ پر نہ آئی تو آخرکار پورا ملک ان کا لقمہ تر بن جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے پورے سازوسامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں میدان میں آگئے'' (۲)

مولانا علی میاںؒ نے اپنی اس بات کو اسی کتاب میں دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

> ''باوجود اس کے کہ یہ جنگ آزادی صحیح معنی میں عوامی اور قومی تھی اور ہندو مسلمان سب اس میں شریک تھے اور ہندوستان نے وطن دوستی، اتحاد اور گرمجوشی اور ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا

(۲) ہندوستانی مسلمان، ایک تاریخی جائزہ، صفحہ ۱۵۵

جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا، پھر بھی قیادت ورہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، چنانچہ اکثر قائد مسلمان ہی تھے''(۳)

۵۔ باہر سے آئے ہوئے انگریز اور ان کی قائم کردہ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی اس جدوجہد آزادی اور فطری ''جذبۂ حریت'' کو ان لوگوں نے ''بغاوت'' کا نام دیا اور دیگر باشندگان وطن کے مقابلے میں اس بغاوت کا اصل مجرم مسلمانوں کو قرار دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب مسلمانوں کی طرف سے ''بغاوت'' کی لہر تیز تر ہوئی تو انگریزوں نے مسلمانوں سے اس کا مختلف انداز سے انتقام لینا شروع کر دیا، یہ انتقام جانی و مالی تو تھا ہی، اس کے علاوہ ان کی آبرو پر حملے کئے گئے، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، بچے یتیم کئے گئے، انہیں بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، بوڑھے بھی بخشے نہیں گئے تہذیبی شناخت مٹانے اور دین وایمان سے رشتے کو کاٹنے کی مہم تیز تر کر دی گئی، نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعہ مسلم بچوں کے ذہن ودماغ کو بدلنے، عیسائیت کی طرف لانے، الحاد، دہریت اور ارتداد کی سمت ڈھکیلنے کی منظم کوششیں شروع کر دی گئیں اور چاہتے تھے کہ اسلامی عادات وعقائد کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا جائے۔ سکھوں اور ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کے خلاف ورغلانے اور بھڑکایا جانے لگا، عیسائیت کو پھیلانے کے لئے دیسی اور بدیسی پوپ پادری کو ملک کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں پھیلا دیا گیا، مسلمانوں کے درمیان ان کے مسلکی اختلافات کو بھی ابھارنے کی سازش کی جانے لگی، ان پر ملازمت کے دروازے بند کئے گئے، صلاحیتوں کو کچلنے اور اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے مسلم رہنماؤں، رہبروں، نوجوانوں، ذی وجاہت، ذی حیثیت اور باضمیر افراد کو مختلف قسم کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جانے لگیں، انہیں جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں بند کیا جانے لگا، ایسے لوگوں سے پھانسی کے تختوں کو سجایا گیا، ملک بدر کر کے جزائر انڈومان اور ایسے تکلیف دہ علاقوں میں بھیجا جانے لگا کہ وہ اپنے وطن اور اپنے لوگ سے جیتے جی کٹ جائیں اور گھٹ گھٹ کر مر جائیں اور یہی مرضی صیاد کی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جبکہ آریہ سماج کے فتنے بھی تیزی کے ساتھ اپنے بال وپر نکالنے لگے تھے۔

اوپر کی سطروں میں ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حالات کا جو اجمالی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کی پوری تفصیلات تحریک آزادی سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔ تاہم درج ذیل اقتباسات سے

(۳) ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ صفحہ ۱۵۸

آپ کو حالت کی نزاکت اور سنگینی کا اندازہ بیک نظر ہو سکے گا:

''۲۴/ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، جبکہ انگریزی فوجیں دہلی پر قابض ہو چکی تھیں اور لال قلعہ فتح ہو گیا تھا۔ اس وقت کی تصویر ایک انگریز کمانڈر Lord Roberts نے جو کانپور سے فوج لے کر دہلی، بغاوت کو کچلنے گیا ہوا تھا، ان الفاظ میں کھینچی ہے:

''صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا، (لال قلعہ کے) لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے، دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا، ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی، ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری، ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تا کہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں، وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا، لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی کسی کو اشارہ کر رہا ہو، دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اس لئے کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے، پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر اور بیماری و بدبو سے لبریز تھی''۔ (۴)

یہ ایک قتل عام تھا، لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے، اس لئے کہ بہت سے ذمہ دار انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، ایک انگریز مصنف Henry Mead کہتا ہے:

---

(۴) ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ، صفحہ ۱۶۲، ۱۶۱

بحوالہ Lord Roberts Forty one yerars in India p 152

''اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی، یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی۔''(۵)

ایک دوسرا مورخ لکھتا ہے:

''ایک انگریز کا شیوہ یہ ہوگیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان جواب میں مسلمان، سنتے ہی گولی مار دیتا''(۶)

ایک اور مورخ نے لکھا ہے:

''ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموری کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے'' (۷)

ایک باخبر صاحب قلم نے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب معرکہ ۱۸۵۷ء میں اپنوں کی بے وفائیوں اور غداریوں اور دشمن کی فریب کارانہ چالوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہوگیا تو اب انہوں نے دل کھول کر انتقامی کارروائیاں کیں، ۵ لاکھ ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ دہلی میں جہاں کوئی مقامی باشندہ نظر آتا، اسے گولی کا نشانہ بنایا جاتا، صرف ایک دن میں ۲۴ مغل شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا بہادروں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے جاتے، بعض لوگوں کو سور کی کھال میں سی کر دریا میں پھینک دیا گیا لال قلعہ کے قریب شاندار عمارتوں اور بازاروں کو مسمار کر کے چٹیل میدان بنا دیا گیا۔ دہلی کے علاوہ بھی ہر بڑے شہر میں عارضی پھانسی گھر بنائے گئے۔ پانچ سو بلند پایہ علماء سولیوں پر لٹکائے گئے۔ پاکباز خواتین کی آبرو اس طرح برباد ہوئی، جیسے قصاب کی دکان کے آگے کتے چھیچھڑوں کو نوچتے پھرتے ہیں، صدیوں میں جمع کئے ہوئے سلاطین دہلی کے علمی خزانے آگ کی نذر ہوئے یا دریائے جمنا میں بہا دیئے گئے''۔

مسلمانوں کے ''جسمانی قتل'' کے ساتھ ''ذہنی اور تہذیبی قتل'' کا منصوبہ جس انداز میں بنایا گیا تھا، اس کا اندازہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی دارالعوام میں کی گئی اس تقریر سے ہو سکے گا۔

---

(۵) حوالہ سابق (۶) عروج سلطنت انگلشیہ، صفحہ ۱۲۷ (۷) قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۵۴

''خداوند تعالیٰ نے یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے، تا کہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں کرنا چاہئے۔''

ایک مورخ کا بیان ہے:

دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں، نوسو صرف ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ تبلیغ عیسائیت میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ ایک مکتی؟ فوج تھی، جس کے اسی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے''(۸)

انگریز ماہر تعلیم میکالے نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رجحان، رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو''۔

۱۲/ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو میکالے نے ایک خط اپنی والدہ کے نام ہندوستان سے لندن بھیجا جس میں لکھا تھا کہ:

''اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد یہاں ایک بھی بت پرست غیر عیسائی نہیں رہے گا۔''

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا تھا:

''ہمارے طریق تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے، بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے''(۹)

مغربی قوم حکمراں بنی تو یوروپ کی مغربی تہذیب اپنے تمام آثار ہمراہ لائی، عریانی، فحاشی، شراب نوشی اور تمام وہ غلاظتیں، جو یوروپ کی گندی تہذیب کے لازمی اجزاء ہیں، پھیلنے لگیں الغرض مسلمان سیاست اور حکومت سے محروم ہوئے، جان و مال عزت و آبرو کے ساتھ ان کا مذہب بھی خطرے میں پڑا، ان کی معیشت متاثر ہوئی، آداب معاشرت بدلے، افکار و عقائد میں بھی بگاڑ آیا۔

(۸) سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ صفحہ ۴۲ (۹) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص: ۲۵۲

اندرونی طور پر بدعات وخرافات بھی فروغ پارہی تھیں، مختلف قسم کے رسم ورواج نے مسلم معاشرے کو جکڑنا شروع کر دیا تھا، مسلمانوں کے دین و مذہب پر آریوں کے رکیک حملے بھی ہو رہے تھے، اکثریتی طبقے کے بعض مذہبی نمائندے بھی انگریزی حکومت کا ایما پا کر ایک جماعت کے ساتھ اپنے آپ کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے وقف کر چکے تھے اور سہارنپور، رڑکی، میرٹھ وغیرہ میں اپنی تحریک کا جال بچھا رکھا تھا۔ یہ وہ پرآشوب حالات تھے جو معرکہ ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہوئے۔ ان حالات میں سخت اندیشہ تھا کہ دین وایمان اور اسلامی تہذیب ومعاشرت سے رشتہ کم یا ختم نہ ہو جائے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ کوئی تحریک چلائی جائے، تاکہ مسلمانوں کو اس تباہ کن صورت حال سے بچایا جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء وقت میں اس خطرے کی شدت کا سب سے زیادہ احساس الامام محمد قاسم النانوتویؒ کو تھا۔ حضرت نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانوی اقتدار پر ایک زبردست ضرب لگا چکے تھے، جو معرکۂ شاملی کے نام سے تاریخ کا ایک روشن عنوان ہے، انگریز کی زبردست قوت کے مقابلہ میں اگرچہ یہ مہم ناکامی پر منتج ہوئی اور ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا، مگر حضرت نانوتویؒ کے دل ودماغ اور فکر ونظر نے ہمت نہیں ہاری، انہوں نے اس سپاہی کی طرح جو میدان جنگ سے ہٹ کر نئے مورچہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تعلیمی میدان کا انتخاب کیا، اس انتخاب کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد برطانوی سامراج کا ہندوستان سے انخلاء، دوسرا مقصد ایک دینی مدرسہ کے قیام سے مسلمانوں کو ان کے دین و ایمان اور اسلامی تہذیب ومعاشرت سے جوڑے رکھنا اور باہر کی مسموم ہوا سے ان کی روح اور ذہن ودماغ کو متاثر نہ ہونے دینا۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مرتب جناب سید محبوب رضوی مرحوم ۱۸۵۷ء کے حالات کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ اس وقت بنیادی طور پر اس نقطہ نظر کو اپنایا گیا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لئے ایک دینی وعلمی درس گاہ کا قیام ضروری ہے، اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء خاص مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا

فضل الرحمٰن صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیو بند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونا چاہئے"۔ (۱۰)

اس تاریخی فیصلہ کے بعد اس تاریخی، دینی درسگاہ کا قیام ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء پنجشنبہ کو چھتے کی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سایہ میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر عمل میں آیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مرشد اور جماعت دیو بند کے روحانی پیشوا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو مکہ مکرمہ میں اس مدرسہ کے قیام کی اطلاع دی گئی تو فرمایا:

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑ گڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے"(۱۱)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے قیام مدرسہ کی خبر سن کر یہ دعا بھی فرمائی تھی:

"اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا"۔

دیو بند کا یہ مدرسہ، جو عالم میں دار العلوم کے نام سے معروف و مشہور ہے، اس کی فکری نسبت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے قائم ہے اور اس کے مقاصد میں تنوع، پھیلاؤ اور ہمہ گیری ہے جس کا اندازہ دار العلوم کے لئے متعین کردہ مطبوعہ اغراض و مقاصد اور گزشتہ سطروں سے ہو سکے گا، جب ہم تحریک دیو بند کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو علانیہ طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات پر تحریک دیو بند کی گہری چھاپ رہی ہے، چونکہ یہ ایک روایتی مدرسہ نہیں تھا، بلکہ اس مدرسہ کے پس پشت بہت سے اغراض و مقاصد تھے جن کی تکمیل وقت اور حالت کے مطابق ہوتی رہی، پھر تحریک دیو بند کے اثرات برصغیر ہند ہی میں مرتب نہیں ہوئے، بلکہ عالم اسلام اور دنیائے انسانیت کو بھی اس کا فیض بالواسطہ یا بلا واسطہ پہنچا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر چند نکات لائق توجہ اور قابل غور ہیں:

۱۔ تحریک دیو بند نے آزادیٔ ہند کی جنگ کو کامیاب کیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف اس نے جو جذبۂ

(۱۰) سوانح قاسمی ۲۲۳ (۱۱) تاریخ دار العلوم دیو بند جلد اول صفحہ ۱۴۹

جہاد پیدا کیا ہے، اس سے سرشار علمائے وقت نے اس جنگ میں حرارت اور گرمی پیدا کی، اس نے مجاہدین آزادی کا ایسا قافلہ تیار کیا کہ اس سے نئے نئے قافلے پیدا ہوتے رہے، طوالت کے خوف سے ہم ان علماء کے نام بھی یہاں چھوڑ رہے ہیں (۱۲) جنہوں نے نہایت حوصلہ مندی، بے جگری اور سر فروشی کے ساتھ، تحریک دیوبند سے متاثر ہوکر جنگ آزادی میں حصہ لیا، یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی تھی اگر علماء دیوبند کا تدبر اور ان کی فکر و فراست قائدانہ رول ادا نہ کرتی۔

۲۔ ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے اور باشندگان ہند کے گلے سے طوق غلامی کو اتارنے کے ساتھ اندرون خانہ مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مایوسی اور احساس شکستگی سے نکال کر امید کی کرن روشن کی اور انہیں خوف و ہراس کی نفسیات سے نکال کر اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی قدروں سے روشناس کرایا، اس حقیقت کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کی اس وقت کے حالات پر گہری نظر ہے۔

۳۔ انگریزوں نے عیسائیت کے جال میں پھانسنے کی جو گہری سازش کی تھی، تحریک دیوبند سے اس جال کے پورے تار و پود بکھر گئے۔ باطل فرقے، مسلمان اور ان کی نئی نسل کو اپنے دام میں لانا چاہتے تھے ان کی تدبیر خود الٹ گئی۔ دینی تعلیم کا ایسا باوقار مستحکم نظام فراہم کیا گیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سوچ اور فکر کے دھارے کو بدل دیا، پہلے زمانہ میں امراء اور روساء اپنے وسیع و عریض مکانات کے ایک حصہ میں دینی تعلیم کا نظم کیا کرتے تھے۔ سلاطین وقت کی مدد سے چھوٹے چھوٹے دینی مدارس و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف تھیں، مگر وقت کے نباض اور بالغ نظر عالم مولانا محمد قاسم نانا توی علیہ الرحمۃ نے اپنے قائم کردہ مدرسہ اور دیگر دینی مدارس کے لئے جو اصول ہشتگانہ مرتب فرمائے اسے ''الہامی'' کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی چھٹی دفعہ میں دینی مدارس کے چلانے کے لئے شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام سے ہٹا کر ''عوامی چندہ'' سے مربوط کر دیا۔ ایک شاہ اور جاگیردار کو زوال تو آسکتا ہے، مگر عوامی دور ہمیشہ سدا بہار رہتا ہے، یہ اصول ہشتگانہ (۱۳) جو حد درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہیں۔ ان کا مطالعہ آنکھیں کھول دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم

---

(۱۲) تفصیلی معلومات کے لئے تحریک آزادی سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۳) مولانا نانوتویؒ کے ترتیب دئے ہوان آٹھ اصولوں کو تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص: ۱۵۲ تا ۱۵۴ پر دیکھا جاسکتا ہے

تحریک خلافت کے زمانہ میں جب دارالعلوم تشریف لے آئے تو بے ساختہ فرمایا کہ:

''ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو الہامی ہیں، پھر فرمایا، حیرت ہے کہ سو برس دھکے کھا کر ہم آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اپنے اجتماعی اداروں کو انگریز کی کسی امداد پر ہرگز معلق نہ رکھیں، بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں۔ حیرت ہے کہ یہ بزرگ سو برس پہلے ہی اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے''(۱۴)

۴۔ دیوبند کے مدرسہ کے علاوہ مولانا نانوتویؒ نے اپنے رفقاء کی اس عظیم تحریک ہی کے پیش نظر گلاؤٹھی، میرٹھ اور مراد آباد میں مدرسے قائم کئے اور اپنے اثر ورسوخ سے دوسرے مقامات پر بھی مدرسے قائم کرائے۔ اس طرح ہندوستان میں ان کے جلائے ہوئے ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہوتے گئے۔ اس لحاظ سے برصغیر میں علمی ودینی نشاۃ ثانیہ کی نقیب، مولانا نانوتویؒ کی شخصیت قرار پاتی ہے۔ قیام دارالعلوم دیوبند سے پہلے لکھنؤ میں دو تین دینی مدرسے ضرور تھے مگر ان کی حیثیت روایتی تھی، تحریکی خوبو ان کے اندر نہیں تھی۔

۵۔ شادی بیاہ کے سلسلہ میں جو رسوم ورواج مسلم معاشرہ میں راہ پا گئے تھے، عقد بیوگان کو جس طرح معیوب سمجھا جا رہا تھا، وراثت کی تقسیم میں جس طرح کی ناہمواریاں تھیں، بدعات وخرافات جس طرح معاشرہ میں جڑ پکڑ رہی تھیں، سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کا ذوق جس انداز سے کم ہو رہا تھا، ارتداد، بے دینی اور اخلاقی انارکی جس طرح فروغ پا رہی تھی۔ تحریک دیوبند نے اس مورچہ کو بھی سنبھالا اور دین وشریعت کی روشنی میں مناسب حال رخ دیا۔ خود مولانا نانوتویؒ نے ان معاشرتی مسائل میں اپنے کردار کے ایسے جگمگاتے نقوش چھوڑے کہ جن کی چمک دمک اب بھی باقی اور قائم ہے۔ اسی طرح تحریک دیوبند اور اس سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ افراد نے وحدت امت اور اتحاد ملت کا پیغام بھی مستحکم بنیادوں پر خلوص دل کے ساتھ دیا ہے، جس سے واقفیت کیلئے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے رسالہ ''وحدت امت'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تحریک دیوبند سے دعوتی، اخلاقی اور روحانی نظام کو بھی فروغ ملا۔ اس موقع پر اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تحریک دیوبند کو جن علماء دیوبند نے مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں سے پروان چڑھایا اور آگے بڑھایا، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن

(۱۴) تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول صفحہ ۴۸۔

دیوبندیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا قاری محمد طیبؒ کے اسمائے گرامی شامل ہیں، مشاہیر علمائے دیوبند اور ان کے کارناموں پر مختلف کتابیں موجود ہیں، ان کے مطالعہ سے ان کا کام اور پیغام سامنے آسکتا ہے اور یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات نے دیوبند کے مسلک، فکر اور اس کی تحریک کو کس قدر تقویت پہنچائی۔

تحریک دیوبند کا فیض اور اس کی برکت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں ہندوستان کو اسپین بننے نہیں دیا اور یہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی ورثہ سے جڑے رہے، بعد کے حالات میں جب مسلمانوں پر مختلف گوشوں سے مسلسل تہذیبی یلغار کی جاتی رہی تو ۱۹۷۲ء میں بلا امتیاز مسلک ومشرب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں کا متحدہ اور مشترکہ پلیٹ فارم بنا، اس کی تشکیل میں بھی فضلاء دیوبند، بالخصوص حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (امیر شریعت بہار واڑیسہ) کا کلیدی کردار رہا ہے، ہندوستان کے پس منظر میں مسلم پرسنل لاء کی اس اہم اور عظیم تحریک کو بعد میں دیوبند اور ندوہ، دونوں سے نسبت رکھنے والے ''نجیب السندین'' فاضل مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آگے بڑھایا۔

۶۔ غور کی نظر اس نکتہ کو بھی پوری طرح کھول دے گی کہ اگر ہندوستان میں دیوبند کے اس مدرسہ کی بنیادی حیثیت جو ''دارالعلوم'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ''ام المدارس'' کی ہے، تو ۱۸۵۷ء کے بعد جتنی دینی، تعلیمی، ملی جماعتی اور رفاہی تحریکیں ہندوستان سے اٹھیں، ان سب میں تحریک دیوبند کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کو ''ام المدارس'' ہی نہیں بلکہ ''ام التحریکات'' بھی کہا جاسکتا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ تحریک علی گڑھ، تحریک ندوہ، اور تحریک جامعہ ملیہ پر بھی تحریک دیوبند

کے اثرات رہے ہیں۔ خلافت، امارت شرعیہ، ریشمی رومال، جمعیۃ علماء، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری تحریکیں، جو ہندوستان سے اٹھیں یا بعض تحریکیں جو عالم اسلام میں برپا ہوئیں، ان میں تحریک دیوبند کی کسی نہ کسی اعتبار سے شمولیت محسوس ہوتی ہے، میرے پیش نظر اس وقت اختصار ہے، اس لئے تاریخی شواہد کو جمع کر کے اس کی توثیق و تصدیق ضروری نہیں سمجھ رہا ہوں۔ تا ہم باخبر حضرات ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیوبند (جس نے تحریک حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور تحریک حضرت سید احمد شہیدؒ سے اکتساب نور کیا ہے) کی عظمت، اہمیت، وسعت اور ہمہ گیری سے بے خبر نہیں ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ملک اور بیرون ملک میں جس حیثیت اور شان کے ساتھ رہے، وہ تحریک دیوبند کے نمائندہ بن کر رہے، امید یہی ہے کہ تحریک دیوبند کے یہ اثرات ماضی اور حال کی طرح مستقبل میں بھی پھیلتے رہیں گے اور جو شخص ۱۸۶۶ء میں تنہا منزل کی جانب چلا تھا، اس کے بعد کارواں بنا، یہ کارواں در کارواں اسی منزل کی طرف ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔

معلوم نہیں ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کس پس منظر میں یہ شعر کہا تھا، مگر تحریک دیوبند اور اس کے اثرات اور فیوض و برکات پر یہ شعر پورے طور پر منطبق ہو رہا ہے کہ:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

☆☆☆

مولانا ابوالقاسم نعمانی*

بانیٔ دارالعلوم دیوبند

تاریخ ساز اور عظیم شخصیتوں کی زندگی کا ہر پہلو روش عام سے جداگانہ ہوتا ہے، ہر ایک کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے ان کے غور وفکر کی سطح ہمیشہ بلند ہوتی ہے اس لئے ان کا ہر کارنامہ دوسروں کے لئے حیرتناک ہوتا ہے، مگر ان کے کارناموں میں کوئی ایک ہی کارنامہ ایسا ہوتا ہے جس کو اس کی زندگی کا نصب العین یا اس کی شخصیت کا عکس جمیل کہا جاسکتا ہے، وہی حاصل زندگی ہوتا ہے حضرت نانوتوی کی عملی زندگی کے جس رخ کو دیکھئے وہ آفتاب و ماہتاب سے چشمک زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کی شکل میں جو کارنامہ ظاہر ہوا میں اسی کو حضرت نانوتوی کی زندگی کا نصب العین اور حاصل زندگی سمجھتا ہوں، وہ شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے ہوں یا میلۂ خداشناسی میں عیسائیوں اور پادریوں سے مناظرہ کرتے ہوئے ہوں یا دیانند سرسوتی کے اعتراضات کے جواب میں تصنیف و تالیف میں مصروف ہوں یہ سب حضرت نانوتوی کے کاروانِ زندگی کے راہ کی خارزار وادیاں ہیں جن کو طے کرنا ان کے لئے حالات اور وقت کی مجبوری تھی لیکن ان کی منزل اس سے کہیں آگے تھی، وہ منزل تھی برطانوی استعمار کے ظالمانہ و جابرانہ دور میں اسلام کا تحفظ و بقاء اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد انگریزی حکومت کی انتقامی کاروائیوں نے مسلمانوں میں وہ خوف و ہراس پیدا کر دیا کہ رؤساء، امراء، جاگیردار اور علماء اپنے گھروں میں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے، چن چن کر مسلمان رؤساء کو یا تو پھانسی پر چڑھا دیا گیا یا کالا پانی بھیج دیا گیا، یہی لوگ دینی علوم کے مدارس قائم کرتے تھے جن سے دینی علوم کے ماہرین پیدا ہوتے تھے اور مسلم معاشرے کو صراط مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتے تھے، اب وہ مدارس کھنڈر ہو گئے، کیوں کہ اب اُن کے اوقاف رہے نہ وہ لوگ

* رکن مجلس شوری دارالعلوم، دیوبند

رہے جو ان مدارس کے اخراجات پورے کرتے تھے، دوسرے ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی اور اس کے اطراف پر قابض ہو چکی تھی، اس لئے عیسائیت کی تبلیغ طاقت کے بل بوتے پر کی جاتی تھی، تمام سرکاری ملازمین کو یقین تھا کہ مستقبل میں ہر شخص کو بہ جبر و اکراہ عیسائی بنا دیا جائے گا، اس صورت حال نے مسلمانوں میں یہ خوف و ہراس پیدا کر دیا کہ حکومت کے ساتھ ساتھ اسلام بھی اس سرزمین سے رخصت ہو جائے گا، ساری صورت حال اس اندیشے کو تقویت پہونچاتی تھی۔

سرسید جیسے مقرب بارگاہ سلطانی نے رسالہ ''اسبابِ بغاوت ہند'' میں حکومت سے کہہ دیا تھا کہ جب تمام مسلمان سرکاری ملازموں کو لاٹ پادری کی تقریر سننا لازم کر دیا گیا تو ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ آج نہیں تو کل ہم سب لوگوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنا ضروری ہو جائے گا، ان حالات میں یہ یقین کرنا پڑا کہ ہندوستان میں آئندہ اسلام کو اپنے وجود و بقاء کے لئے موت و زیست کی جنگ کرنی پڑے گی، بس یہ وہ غم تھا جو حضرت نانوتوی کو کھائے جا رہا تھا، غور و فکر کے بعد اُنھوں نے اس کا واحد حل یہی تجویز کیا کہ ہندوستان میں دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے۔

لیکن حالات اتنے نازک اور خطرناک تھے کہ حضرت نانوتوی کو ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا ضروری تھا وہ برطانوی استعمار کے ''مفرور مجرم'' اور حکومت کے ''باغیوں'' میں سے تھے حکومت کی نگاہ میں انکا جرم بغاوت ثابت ہو چکا تھا گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا تقریباً ایک سال تک آپ کو انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا تھا، انگریزی حکومت کے مخبر آپ کے گرد و پیش منڈلاتے پھرتے تھے، آپ کی گرفتاری کے لئے مختلف مقامات پر بار بار پولیس کے چھاپے پڑتے تھے، یہ تو حضرت نانوتوی کے بخت بلند کا کرشمہ تھا کہ قاتل سر پر آ کر بھی وار کرنے سے مجبور رہا، اس کا ہر نشانہ خطا کر گیا، اس کا ہر جال کمزور ثابت ہوا، انگریزی پولیس نے گرفتاری کی جدوجہد کی لیکن قضا و قدرت ان کی حرکاتِ مذبوحی پر مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

عنقاء شکارِ کس نہ شود دام باز چیں

جب دوسرے سال ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے حکومت چھین کر ملکۂ وکٹوریہ کے ہاتھ میں دے دی تو عام معافی کا اعلان کیا گیا اور مجرمین کی ساری فائلیں داخل دفتر کر دی گئیں، لیکن خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ اس اعلان معافی پر بھی مسلمانوں کو بھروسہ نہیں

تھا، اور جن کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا تھا وہ اعلان معافی کے بعد بھی برسوں انتہائی محتاط زندگی بسر کر رہے تھے، کیونکہ ہر ایک کو یہ یقین تھا کہ اس عام معافی کے اعلان کے باوجود ان کی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھی جا رہی ہے۔

شکوک و شبہات اور اندیشوں میں زندگی کے کئی بیش قیمت سال گذر گئے کہ حضرت نانوتوی کو سکون کا لمحہ میسر نہیں آیا، نہ اپنے ذہنی خاکے میں کوئی رنگ بھر سکے، حضرت نانوتوی کی دلی کیفیات کی ترجمانی تاریخ کے اوراق میں صراحتاً نہیں ملتی لیکن اس بند محل میں کچھ روزن ضرور ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ و بقا کے لئے مدارس دینیہ کے قیام کو بنیادی حیثیت دی تھی۔

دارالعلوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کا نقطۂ آغاز حضرت حاجی عابد حسین صاحب کا یک بیک فراہمی سرمایہ کے لئے اٹھ کھڑا ہونا ہے اور جب مالی اعتبار سے یہ اعتماد ہوا کہ اس سے ایک سال تک ایک چھوٹا سا دینی مدرسہ چلایا جا سکتا ہے تب حضرت نانوتوی کو مطلع کیا گیا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو دینی مدرسہ قائم کرنے کے سلسلے میں گفتگو ہوا کرتی تھی اب اس کی ایک شکل ہو گئی ہے آپ فوراً کسی عالم کو بھیج دیں کہ مدرسہ کا کام شروع کر دیا جائے، آپ نے ملا محمود دیوبندی کو پندرہ روپیہ تنخواہ مقرر کر کے بھیج دیا اور چھتہ مسجد میں دیوبند کے معززین کی موجودگی میں ایک استاد اور ایک طالب علم سے ایک دینی مدرسہ کا افتتاح کر دیا گیا اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب برسہا برس اس کے ناظم یا مہتمم رہے، جب دارالعلوم کی شہرت ہوئی اور پورے ملک سے طلبہ آنے لگے تو اس مدرسہ کو چھتہ مسجد سے جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا اور جب کچھ سالوں بعد طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مسجد کی تین سمتوں میں کمروں کی مزید تعمیر ہوئی، اس تمام عرصے میں حضرت حاجی صاحب ہی اس کے منتظم اور نگراں و ذمہ دار رہے، حضرت نانوتوی ظاہری طور پر اس سے بے تعلق رہے اور میرٹھ میں قیام پذیر رہے۔

لیکن کیا یہ ظاہری بے تعلقی حقیقت تھی؟ واقعات اس کی نفی کرتے ہیں، دارالعلوم کی اس ابتداء پر ایک مدت گزر جانے کے بعد ایک موقع جلسۂ دستار بندی کا آیا جس میں مشاہیر اہل علم کو مدعو کیا گیا عوام و خواص کا ایک بڑا مجمع ہو گیا، یہ سب کچھ حضرت نانوتوی کے مشورے سے ہوا تھا اور جلسہ کے

انعقاد سے پہلے آپ نے ایک بڑی زمین خریدی تھی، یہ خریداری اس خاکے کے مطابق تھی جو حضرت نانوتوی نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا، دستار بندی کے اس جلسے کے روح رواں حضرت نانوتوی تھے آپ نے اس جلسے میں تقریر فرمائی اور ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی دیا جو یہ کہہ رہے تھے کہ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے سے نوکری مل نہیں سکتی اس لئے کیوں نہ اس مدرسہ میں سرکاری نصاب بھی پڑھایا جائے تاکہ سرکاری نوکری کا دروازہ انکے لئے کھلا رہے، آپ نے اعلان فرمایا جن کو سرکاری نوکریاں حاصل کرنی ہوں وہ سرکاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں مگر ہم اپنے مدرسہ میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم جمع نہیں کر سکتے، اس جلسے کے دوران حضرت نانوتوی نے اعلان فرمایا کہ مدرسہ کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد آج ہی رکھ دیا جائے کیونکہ اتنے اکابر کا مجمع پھر میسر آئے یا نہ آئے سب لوگ اس زمین پر چلیں جہاں بنیاد کھودی گئی ہے، علماء و صلحا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے چلے اور حضرت نانوتوی کے ساتھ سنگ بنیاد کی جگہ پر آئے پہلی اینٹ حضرت نانوتوی نے اپنے استاد اور مشہور محدث حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے رکھوائی اور دوسری اینٹ بنیاد میں اتر کر خود حاجی عابد حسین صاحب نے رکھی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت نانوتوی نے ساری وہ ذمہ داریاں جو حضرت حاجی صاحب ادارہ کے تئیں انجام دیتے تھے پھر انھیں کو سپرد کر دیں اور خود اپنی ذات کو اس سے عملاً علیحدہ رکھا جب کہ اب دارالعلوم ٹھیک حضرت نانوتوی کی منشاء کے مطابق ایک عالمی دینی یونیورسٹی ہونے کے پہلے اسٹیج پر آچکا تھا، اب آپ کو خود اس کی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہو جانا چاہئے تھا۔ تاکہ آئندہ ہر کام جو دارالعلوم کی توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہے اپنے خاکے کے مطابق بروئے کار آئے۔ لیکن آپ نے عجلت پسندی سے کام نہیں لیا ان کے سامنے وہ تمام مصلحتیں تھیں جو سادہ دل حضرت حاجی صاحب کی دنیاوی تعلقات سے یکسوئی کی وجہ سے ان کے سامنے نہیں تھیں، خود حضرت نانوتوی نے ان مصلحتوں کی طرف کسی مجلس میں کوئی اشارہ نہیں کیا، لیکن دارالعلوم کے خاکے میں آپ کی منشاء ہی کے مطابق رنگ بھرا جاتا رہا، آخر دور میں دارالعلوم سے قربت کچھ زیادہ بڑھی لیکن ایسی قربت نہیں کہ عام طور پر لوگ سمجھنے لگیں کہ اس ادارہ کے روح رواں حضرت نانوتوی ہیں، کبھی کوئی سبق بھی پڑھا دیا کبھی اس کے دفتر میں بیٹھے اور دارالعلوم کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے قلم سے اصول ہشتگانہ قلم بند فرما

کردار العلوم کو دے گئے، لیکن باضابطہ نہ وہاں فرائض تدریس انجام دیئے نہ اس کے صدر اور سر پرست ہوئے اور نہ مہتمم اور ناظم، کوئی باضابطہ تعلق دارالعلوم سے نہیں رکھا جبکہ سارے امور آپ کی صواب دید کے مطابق ہی انجام دیئے جاتے رہے، زندگی کے اخیر لمحے تک دارالعلوم سے متعلق آپ کا یہی رویہ رہا، یہاں تک کہ آپ ۱۲۹۷ھ میں اس دنیائے فانی سے چل بسے، لیکن دارالعلوم کی مکمل حفاظت کا بندوبست کر کے گئے، اپنے مخلص دوستوں اور شاگردوں اور قدرشناسوں کو دارالعلوم کے نظم ونسق اور تعلیم و تدریس کا ذمہ دار بنا کر گئے کسی بھی ایسے شخص کی دارالعلوم میں گنجائش نہیں تھی جو دارالعلوم کے کاز کے برخلاف ایک قدم بھی چل سکے اس لئے دارالعلوم ہر طرح کی آفتوں سے محفوظ رہا اور حضرت نانوتوی کے دل میں جو کھٹکا تھا وہ وجود میں نہیں آیا۔

حضرت نانوتوی کی فراست اور مصلحت دینی کا راز بہت دنوں بعد کھلا جب ابتدائی دور کے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی انتقال کر گئے اور مولانا سید احمد دہلوی صدارت سے استعفا دے کر بھوپال چلے گئے اور حضرت نانوتوی کے شاگرد خاص مولانا محمود حسن دیوبندی جو تاریخ میں شیخ الہند کے خطاب سے مشہور ہوئے صدر مدرس بنائے گئے۔

۱۸۵۷ء کی عام بغاوت کے بعد حضرت نانوتوی پر وارنٹ ایک مدت تک رہا اور آپ انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنے پر مجبور تھے دیوبند جب بھی اس مدت میں آئے انگریزوں کے مخبر فوراً مقامی پولیس کو مطلع کر دیتے، یہ مخبر قصبہ ہی کے تھے اور حضرت نانوتوی کی ہر ہر نقل وحرکت کی جستجو میں رہتے تھے، گھر پر چھاپہ پڑا آپ بچ گئے، چھتہ مسجد پر چھاپہ پڑا آپ محفوظ رہے، شیخ نہال احمد کی دیہات میں جو کوٹھی تھی اس پر چھاپہ پڑا اللہ نے بچالیا، یعنی دیوبند اور قرب وجوار میں آپ کا محفوظ رہنا ممکن نہیں رہا کیوں کہ مخبر غیر نہیں اپنے ہی جیسے لوگ تھے، ایک سال بعد خدا خدا کر کے عام معافی کے اعلان کے بعد گرفتاری کا خطرہ دور ہوا وارنٹ تو منسوخ ہو گیا لیکن پولیس کے ریکارڈ میں یہ نام محفوظ رہ گیا، پولیس ایسے لوگوں کی نقل وحرکت پر ہمیشہ نظر رکھتی تھی اس لئے ایسے تمام حضرات پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، یہی وہ راز تھا جس کی وجہ سے دارالعلوم میں ایک ایسی شخصیت کو سامنے رکھا گیا جو ہر طرح کے شک وشبہہ سے ماوراء تھی، اور آخر تک انہی کی نگرانی اور سرپرستی میں سارے امور انجام پاتے رہے اور ظاہری طور پر بطور مہمان یا عالم دین کے حضرت نانوتوی دارالعلوم کی تقریبات میں شریک ہو جاتے۔

تھے، کیونکہ اگر حکومت کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ ادارہ حضرت نانوتوی کی جدوجہد کا ثمرہ ہے اور مقامی مخبر پولیس کو مطلع کر دیتے تو شاید اپنے وجود کے دوسرے ہی دن دارالعلوم کا وجود مٹ جاتا کیونکہ اس سے حکومت کو بغاوت کی بو آنے لگتی، حکومت کے کاسہ لیس اور پولیس سے رابطہ رکھنے والے کچھ معزز افراد نے یہ زہریلا تیر چلایا لیکن انھوں نے دیر کر دی اور تیر نشانہ سے خطا کر گیا۔

حضرت نانوتوی کا ۱۲۹۷ھ میں انتقال ہو گیا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوسرے ملزم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی دارالعلوم کے سرپرست بنائے گئے، صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند ہوئے، وہ لابی دارالعلوم پر قبضہ کرنا چاہتی تھی جب وہ اس میں ناکام ہوگئی تب اس نے حکومت کو درخواست دی، یہ وہی لوگ تھے جو کبھی حضرت نانوتوی کی گرفتاری کے لئے مخبری کرتے تھے، انھوں نے حکومت کو یقین دلانا چاہا کہ یہ مدرسہ حکومت کے باغیوں نے قائم کیا ہے اور یہاں بغاوت کی تعلیم دی جاتی ہے یہ سارا واقعہ حکیم عبدالحی رائے بریلوی نے اپنی کتاب ''دہلی اور اسکے اطراف'' میں لکھا ہے، یہ ان کا سفرنامہ ہے یہ سفر دیوبند ۱۳۱۲ھ میں کیا تھا اور شیخ الہند سے تفصیلی ملاقات کی تھی انھوں نے حضرت شیخ الہند سے سارے واقعات سن کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، وہ کہتے ہیں:

> ''جب مخالفین عاجز آگئے تو انھوں نے گورنمنٹ کو درخواست دی کہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی کثرت سے رکھے گئے ہیں، ایک زمانے میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت میں شرکت کی تھی، یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، انکی مسل نکالی جائے بہتر تو یہ ہے کہ مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں لے لے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد اس کے سرپرست مقرر کئے جائیں جن کو جشن جوبلی میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے'' (۱)

اس تاریخی حقیقت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر انگریزی حکومت کے ہوا خواہوں نے حضرت نانوتوی کے دور میں یہ حربہ اختیار کیا ہوتا تو اس کا انجام کیا ہوتا؟ کہا نہیں جا سکتا، یہی وہ خطرہ تھا جسکو حضرت نانوتوی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے مگر دارالعلوم کا قیام بھی وقت کا اہم ترین فریضہ تھا اور

(۱) دہلی اور اس کے اطراف از حکیم عبدالحی صاحب ص ۱۰۰۔ حیات خلیل از محمد ثانی حسنی ص ۱۶۴۔

اس سے زیادہ اس کا تحفظ اور بقا ضروری تھا، اس لئے حضرت نانوتوی نے اپنے منصوبے کے مطابق دارالعلوم قائم کیا لیکن ظاہری بے تعلقی بھی قائم رکھی تا کہ دارالعلوم کے نوخیز پودے کو برطانوی استعمار کے ہواخواہوں کی بادسموم سے بچایا جاسکے۔

یہ حضرت نانوتوی کی فراست ایمانی کی دلیل ہے جس کو زبان رسالت سے "اتقوا فراسة المؤ من فانه ینظر بنور اللّٰہ" کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، آج وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد اسلامی یونیورسٹی ہے جو کسی حکومت یا سیاست کی مالی امداد کی احسانمند نہیں ہے، یہ احسان لینا اس کو منظور بھی نہیں کیوں کہ اس کے بانی حضرت نانوتوی کے مرتب کردہ اصولوں میں سے یہ ایک بنیادی اصول ہے، آج دارالعلوم کی عمر ۱۳۸ سال کی ہو چکی ہے ہر طرح کے حالات آئے اور گذر گئے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں ، زندگی دشوار ہو جائے

مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم*

الامام محمد قاسم النانوتویؒ

تاریخ اسلام کے تسلسل میں آبدار موتی، نظام مدارس کے مجدد اعظم

سیمینار وقت کی اہم ضرورت

اس سیمینار کا اس وقت کیا جانا اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ سیاسی الجھاؤ اور نفسانی آفتوں نے ملت کو ایسے مقام پر پہونچادیا ہے جہاں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ماضی اور اس کی عظمت سے رشتہ کٹ چکا ہو، وہ تو کہئے کہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر جماعت اور فرقہ معرضِ انحطاط میں سرگرداں ہے۔ ورنہ جو مخالفین پہلے جماعت دیوبند کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے وہ اس وقت پورے ہاتھ اٹھادیئے۔ اس بناء پر شاید میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ حضرات یہ سیمینار کر کے ہر علمی دینی تحریک کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

زمانہ خیر اور خیر کا تسلسل

اگر ایک طرف حدیث پاک: **خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم** سے، اگر چہ غلط ہی ہو، یہ احساس دل میں پیدا ہوتا ہے کہ ہم شر القرون میں ہیں جس میں ایسی صالح اور صاحب خیر شخصیتیں نہیں ہوں گی جن سے ہم اکتساب فیض کر سکیں تو دوسری حدیث میں بارگاہ نبوت سے یہ خوش خبری مروی ہو کر اس احساس کو باطل کر دیتی ہے کہ: **مثل اُمّتی مثل المطر لایُدری اوّله خیرٌ ام اٰخره.**

صدیق اکبر و فاروق اعظم

چنانچہ دور صحابہ میں یوں تو **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم** کے مطابق ہر

* معہد تعلیم الاسلام، ایلجن، ایلے نائے، یو۔ایس۔اے

ہستی مجسم نورِ ہدایت ہے لیکن ان میں بھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مقدسین کی شخصیتیں تہ بہ تہ ہیں اور ہر تہ سونے کے ورق کی ہے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ظاہری اور باطنی کا شخصی مظہر یہ دونوں بزرگ نظر آتے ہیں، علم میں گہرائی، اخلاق میں گیرائی، اخلاص میں قوت، نظر میں دوررسی، ارادوں میں شجاعت، فکر میں پاکبازی، فیصلوں میں بے نفسی، غرض خیر الامم میں: وما خلقت بیدی کا اگر کسی پر اطلاق ممکن ہے تو یہی دو ہستیاں اس کا اولین حق رکھتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام جو جامع اور محکم و مستحکم دین دے کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے اس کی جامعیت اور استحکام کو ان دو ہستیوں نے عروج کامل عطا کر دیا۔

یوں تو ان میں کی ہر ایک شخصیت منفرد اور ہر ایک کا تشخص مستقل اور جداگانہ تھا لیکن مزاجوں کے فرق اور ان کے اثرات پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے اجتماع سے ہی وہ کارنامہ انجام پایا جس کی نظیر تاریخ عالم میں مفقود ہے، چنانچہ اگر ایک میں نرمی اور رافت اور دوسرے میں سختی اور شدت مشاہد ہوتی تھی تو نرمی والا سختی والے کو یہ کہتا بھی نظر آیا: اجبار في الجاهلية وخوار في الاسلام اور نرمی والے نے شدت والے کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد کیا تو یہ وجہ بتلا کر لوگوں کو مطمئن کرتا بھی دکھائی دیا کہ ان کی سختی میری نرمی کے سامنے تھی اور واقعہ بھی یہ ہے کہ نرمی میں اعتدال سختی کی آمیزش سے ہی ہو سکتا ہے جو معاملات کے لئے نہایت مفید و کارگر ہوتا ہے، اسی مزاج کے اور اضداد کو بھی قیاس کر سکتے ہیں۔

غرض صدیقیت اور فاروقیت کے اس اجتماع نے جسم اسلامی کو وہ صالح غذا مہیا کر دی جس کے نتیجے میں یہ جسم نہایت تندرست، پرشکوہ اور متحرک نظر آنے لگا، جس میں بدنمائی یا اضمحلال کا کوئی شائبہ بھی گرد و پیش میں نہ رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر دو شخصیتوں کے کمالات کا مرکز و مبدأ ذاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی تھی صاف نظر آتا ہے کہ تجلی رسالت کا ایک پرتو صدیقیت ہے تو دوسرا فاروقیت، لسانِ نبوت نے ہر دو کے بارے میں جو ارشاد فرمایا تھا ہو بہو اس کی مجسم تشریح و تعبیر دنیا نے دیکھ لی:

عن عبدالله بن حنطب ان النبی صلی الله علیه وسلم رای ابابکر وعمر فقال هذان السمع والبصر (رواه الترمذی مرسلا) وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله

صلی اللہ علیہ وسلم ما من نبی إلا وله وزیران من اهل السماء وزیر ان من اهل الارض فأما وزیر ای من اهل السماء فجبرئیل ومیکائیل وأما وزیر ای من اهل الارض فابوبکر وعمر (رواه ترمذی)

پھر دیکھ لیا جائے کہ جہاں مبدا تھا وہیں معاد ہوا، **کل شی یرجع الی اصله**، اس لئے مدفن بھی دونوں کا وہی حجرہ مبارکہ ہوا جو قیامت تک خلوت کدۂ رسالت ہے اور وہیں جسم عنبریں استراحت فرما ہے، اسی لئے حضرت علی مرتضٰی نے حضرت عمر کے جنازہ پر یہ اظہار حقیقت کر دیا تھا:

یرحمك الله انی لارجو ان یجعلك الله مع صاحبك لانی کثیرا ما کنتُ اسمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول کنتُ وابوبکر وعمر وفعلتُ وابوبکر وعمر وانطلقت و ابوبکر وعمر ودخلتُ وابوبکر وعمر وخرجتُ وابوبکر وعمر (عن ابن عباس، متفق علیه)

دورِ تابعین میں خیر و شر

بہر حال یہ تو ذکر ہوا سرتا سر زمانہ خیر اور بطور خاص دو شخصیتوں کا، جس کا حاصل یہی ہے کہ بلاشبہ تمام صحابہ شرف وسعادت کے بلند مرتبہ پر فائز تھے مگر ان سب میں حضرات شیخین نہایت ممتاز اور کمالاتِ نبوت کے سب سے نمایاں عکس تھے۔

اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور دیکھا جائے تو بھی ایمانی حرارت اور اسلام کے پھیلاؤ کی عام جدوجہد نظر آتی ہے، اسلامی تاریخ کی بھاری بھرکم شخصیتوں سے یہ زمانہ بھرا ہوا ہے، فتوحات اسلامی چہار دانگ میں پھیلتی جارہی ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مجاہدین جہاد کے میدانوں میں تو سرفروشی دکھارہے تھے ان کی کامیابیاں دورِ صحابہ کی کامیابیوں کے ہمرنگ ہی تھیں لیکن اندرونی معاشرہ اس بگاڑ میں دور تک چلا گیا تھا جس کو نابود کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات دن ایک کیا تھا اور ہر تکلیف اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے ایسا معاشرہ ترتیب دیا تھا جس کا مشاہدہ چشم فلک پہلی مرتبہ کر رہی تھی، پھر وصال نبوی کے بعد زخم خوردہ بگاڑ نے تاک جھانک کرنی چاہی تھی، لیکن حضرات شیخین کی ایمانی قوت اور فیصلوں کی مضبوطی نے اس کو بے جان کر دیا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کا مقدس دور پورا ہوا بھی نہیں تھا کہ بگاڑ نے پھر جھرجھری لے کر رجعت قہقری

کرلی تھی، جس معاشرہ پر کچھ عرصہ تک صبغۃ اللہ کی جلوہ فرمائی تھی، امیر ہو کہ مامور، غنی ہو کہ محتاج، حکومتی نظم ونسق ہو کہ بازار کالین دین، خلوت کدے ہوں کہ اجتماعات ہر جگہ شریعت غراء کی نور افشانی تھی، اب اسی معاشرے کے ایک معتد بہ حصہ نے معاملات اور فکر ونظر کا زاویہ بدل لیا تھا، سیاست دینوی، نفسانی اغراض نیز خاندانی عصبیتوں اور قبائلی تحدیدات کے ظلماتی سایہ میں ایک طبقہ پہنچ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بگاڑ کی تلخی اندرونِ معاشرہ تک محدود نہیں رہ سکتی تھی، اگر اس پر فوری اور مضبوط روک نہ لگتی تو پھر جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کے شوق سے سرشار مجاہدین اس تعفن سے محفوظ نہ رہتے، پھر خواہ وہ تلواروں نیزوں کے کرتب کیسے ہی دکھلاتے رہتے لیکن جہاد کی اسپرٹ ان میں سے نکل چکی ہوتی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اور رجوع الی الخیر

پھر یہ ہوا کہ مؤرخ کا قلم جو اس وقت کے المناک احوال کو دکھ درد کی روشنائی سے رقم کر رہا تھا اس کو بریک لگی اور یہ دکھائی دیا کہ بگاڑ کے ذمہ دار درباروں اور محلات کے اندر سے اچانک ایک رجلِ رشید کو کھڑا کر دیا گیا اور اس نے اس بگاڑ کو لگام دے دی، خلافت راشدہ کے پانچویں منصب دار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جیسے ہی صلاح وتقوی کے ساتھ قیادت سنبھالی تو لوگوں نے ہی نہیں بلکہ درندوں اور چرندوں نے بھی موافقت کا مخلصانہ مظاہرہ کیا اور اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ لوگوں نے خوشی اور پسند سے بگاڑ کو نہیں اپنایا تھا بلکہ: فانی تصرفون کا مصداق بن گئے تھے، نیز یہ بھی واضح ہوا کہ زمین میں صلاح اصل ہے فساد تو مفسدین کی کارستانی سے ہوتا ہے، قرآن حکیم کی پکار بالکل صحیح ہے: لا تُفسدوا في الأرض بعد اصلاحها.

امام زہری اور جمع احادیث

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مبارک دور میں اعمال واخلاق کی اصلاح کا کام نامکمل رہ جاتا اگر اس دور میں علوم شریعہ کی حفاظت واشاعت اور دستوری اصول اور قانونی فروع کی ترتیب وتدوین کا کام نہ کیا جاتا کیونکہ اعمال واخلاق علم کے تابع ہوتے ہیں، پھر یہ کہ دنیا کا تین چوتھائی آباد حصہ امت مسلمہ ہی کی دنیا بنا ہوا تھا۔ آب وہوا کے فرق، رسم ورواج کے اختلاف، عادت واخلاق کی نیرنگیوں سے کتنے سوالات نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔

حضرت عمر بن الخطاب کو جس طرح جمع قرآن کی ابتداء کا شرف حاصل ہو چکا تھا کہ ان ہی

نے اس عظیم کام کا مشورہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کو دے کر باصرار اس کے لئے ان کو راضی کیا تھا اب ان ہی کے نواسے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع احادیث کی واجبی اور عظیم المرتبت ضرورت کی طرف توجہ کی اور وقت کے مسلم امام حدیث ابن شہاب زہری کو اس جلیل القدر کام پر مامور کیا، پھر اس بلند مرتبہ کام نے وہ پھیلاؤ اور عروج حاصل کیا جس کی مثال نوع انسانی کی تاریخ میں نہ پہلے تھی اور نہ بعد میں ہوئی، احادیث کی جانچ پڑتال کے اصول وضع کئے گئے، راویوں کی چھان بین میں بے نظیر محنتیں کر کے علم اسماء الرجال وضع کیا گیا پھر ان سب چیزوں کی روشنی میں احادیث کی درجہ بندی کی گئی، بلاشبہ محدثین نے اس باب میں بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

امام ابوحنیفہ اور فقہ

بہر حال ایک طرف ابن شہاب زہری اور ان کے تلامذہ ورفقاء اپنی زندگیاں اس بلند وبالا کام میں لگائے ہوئے تھے اور یہ کام بام عروج کو پہونچ چکا تھا، ٹھیک اسی دور میں دوسری طرف امام ابوحنیفہ نے نادرہ روزگار علم الفقہ کے کام کی داغ بیل ڈالی ہوئی تھی، اس کام کی نوعیت یہ تھی کہ تمام ذخیرہ احادیث کو اور قرآن پاک کو سامنے رکھ کر عمیق غور وفکر سے منشأ شریعت کا تعین کیا جارہا تھا، پھر اس روشنی میں احکام وہدایات کی درجہ بندی، عموم وخصوص، اطلاق وتقیید کی تشخیص کرتے ہوئے حلال وحرام، فرض وواجب، مستحب ومباح، ناجائز اور مکروہ کی تقسیم وتحدید کی جارہی تھی، پھر احوال کی موجودہ اور ممکنہ تبدیلیوں سے پیدا شدہ مسائل میں حکم شرعی کے استخراج کے لئے علت احکام، مصالح عامہ، مصالح خاصہ، اجماع اور قیاس وغیرہ امور کی تعیین وتشخیص کر کے اجتہاد میں ان سے کام لیا جارہا تھا۔

چونکہ سینکڑوں محدثین کے درمیان ابن شہاب زہری کا امتیازی مقام تھا اس وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان ہی کا انتخاب جمع احادیث کے عظیم الشان کام کے لئے کیا اسی طرح متعدد فقہاء اور ائمہ مجتہدین کے درمیان امام ابوحنیفہ کی نہایت ممتاز حیثیت تھی۔ نیز اخلاق وعادات، زہد وتقوی، استغنا وتواضع، کثرت عبادت، ذہانت وفطانت، ایثار وہمدردی اور شفقت وسخاوت میں بھی آپ کی شخصیت نمایاں تھیں۔

وہ دور ایسے تو ایسی ایسی عظیم شخصیتوں سے بھرا ہوا تھا جن کے احسان سے امت سبکدوش نہیں ہوسکتی، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بگاڑ پر قدغن لگانے اور پھر اصلاح اور علوم شریعہ کو مرتب شکل دینے

میں تین شخصیتوں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام زہریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی حیثیت اساطین ثلاثہ کی ہے۔ رحم اللہ رحمۃ واسعۃ.

بعد کے ادوار میں بلاشبہ نہایت عظیم الشان کام ہوئے، بڑی بڑی شخصیتوں کی موجودگی رہی، زبردست علمی اور تحقیقی کام کئے گئے، علمی اور تحقیقی کتابوں سے کتب خانے وجود میں آئے، ہر صدی نئے رنگ سے شروع ہوئی اور انوکھے روپ میں ختم ہوگئی۔

لیکن تیرہویں صدی میں عجیب بات یہ دکھائی دیتی ہے کہ اس میں بھی اساطین ثلاثہ (تین شخصیتوں) کا انقلاب احوال، اور خدمت علم و اصلاح اعمال پر مشتمل ایک ایسا کارنامہ نظر آتا ہے جس کے اثرات عالمگیر بھی ہیں اور دوامی بھی۔

تاتاری فتنہ عالمگیر نہ تھا

سب کو معلوم ہے کہ فتنہ تاتار نہایت ہولناک تھا، جو اس کی زد میں آیا وہ نیست و نابود ہوا، کتنے ہی ملک اس کی درندگی اور وحشت و بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے، مگر پھر بھی اس فتنہ کی براہ راست زد ساری دنیا پر نہ تھی۔ تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں یورپ و امریکہ اور برطانیہ کی سفید اقوام نے اپنی تہذیب اور سلطنت و سطوت کا جال جس طرح ساری دنیا پر پھیلایا تھا، یہ فتنہ یقیناً عالمگیر تھا، پورا عالم اس کی لپیٹ میں تھا، ایک طرف مسیحیت اس کے زیر سایہ اپنی جڑیں پھیلا رہی تھی تو دوسری طرف وہ گوری تہذیب اپنا جال پھیلا چکی تھی جس کا شعار عریانیت و بے حیائی ہے۔

ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ یہاں لگ بھگ نو سو سال سے مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا جو کمزوری کی اس انتہا کو پہونچ گیا تھا یا پہونچا دیا گیا تھا کہ برطانیہ کے لئے قبضہ آسان ہوگیا تھا، آخری مغلیہ تاجدار اور ان کے شہزادوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کی پوزیشن یہ تھی کہ اس پر قبضہ کے نتیجہ میں برصغیر بلکہ مشرقی وسطیٰ پر بھی یورپ اور برطانیہ کے پنجے مضبوطی سے پیوست ہو رہے تھے، اس لئے ہندوستان میں اس خطرناک بگاڑ پر روک لگانا ضروری تھا تاکہ نزدیک والے بھی اس شر سے محفوظ رہیں اور دور والے بھی۔

تیرھویں صدی کے اساطین ثلاثہ

چنانچہ ہمت مردانہ کے ساتھ تڑپ کر اٹھنے والا اگر کوئی تھا تو وہ ایک مرد درویش تھا، حضرت

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو چند نوجوان ایسے ملے جن میں یہی تڑپ موجود تھی، ان میں بھی دو زیادہ ممتاز تھے حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔

جہادِ شاملی

اس گورے اقتدار کے ظلم و جور کو دیکھتے ہوئے ان حضرات نے برطانیہ کے دعوائے حکومت کو رد کر دیا اور جہاد کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ خیال یہ رہا ہوگا کہ اپنے اس اقدام سے ہندوستانی باشندوں خاص طور سے مسلمانوں میں بلند ہمتی پیدا ہوگی اور وہ بھی حوصلہ کے ساتھ ملتے جائیں گے، بالآخر ایسی قوت بن جائے گی کہ دہلی پر قبضہ کر لینے والے برطانوی آسانی سے قابو نہ پا سکیں گے بلکہ اس سے مغلیہ حکومت کے بچے کھچے سپاہیوں اور اس حکومت کے ہمدردوں کو سہارا مل جائے گا تو وہ بھی ان قابضوں کے مقابلہ پر اکٹھے ہو جائیں گے، لیکن افسوس کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی، قبل اس کے کہ بات وہاں تک پہونچے، دہلی سے زبردست طاقت نے پہونچ کر اس جہاد کو ناکام کر دیا اور یہ اساطین ثلاثہ برطانوی قابضین کے مجرم قرار دیئے گئے، صورتِ حال سے مایوس ہو کر حضرت حاجی صاحبؒ البلد الامین مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

ادھر برطانوی قبضہ کاروں نے اپنے تباہ کن منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مزید انتظار کو بھی گوارہ نہیں کیا، مسیحی مشنریاں اور ماہرین تعلیم حرکت میں آ گئے، مشنریوں کا کام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ مسیحیت کی ترویج و اشاعت ہو لیکن ظاہر ہے تبدیلی مذہب آسان نہیں ہے، سوائے ایسے چند بیچاروں کے جن کا کوئی والی و وارث نہ ہو اور مذہب نام کی کسی چیز کا علم نہ ہو، مذہبی لحاظ سے وہ پہلے بھی کچھ نہیں ہیں ان کو عیسائی بنا لیا جائے تو بنا لیا جائے ورنہ لکھے پڑھے بلکہ تھوڑی سی بھی سمجھ رکھنے والے کے لئے مذہب کا بدلنا نہایت دشوار اور کٹھن ہے، اس لئے ماہرین تعلیم کے فرائض یہ طے پائے کہ ایسا نصاب تعلیم بنا کر رواج دیا جائے جس کے نتیجے میں ایسی کھیپ نکلے جس کا رنگ و روغن ہندوستانی رہے تو رہے مگر دماغ برطانوی ہو جائے۔

حضرت نانوتویؒ اور تحریک دیوبند

جہاد میں ناکامی اور بدیسی حکومت کے اس فریب نے حضرت نانوتویؒ کو (بالخصوص) تڑپا دیا، جوش اور جذبہ میں کوئی حرکت کی جاتی تو اس کا مقدر بھی ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوتا، ضرورت تھی

طویل المدت حکیمانہ منصوبہ اور اس پر عمل درآمد کی۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنے درویشانہ طرزِ زندگی کے باوجود نقشہ کار بنا کر بڑی سادگی کے ساتھ جس طرح چند مخلصین کے ذریعے اس کو عملی جامہ پہنایا اس کے پس پشت حضرت کی گہری فکر، ایمانی بصیرت، دوررس نگاہ، قوت اخلاص، وسعت علم، تقویٰ وللّٰہیت، اسلام اور امت مسلمہ سے سچی محبت اور حلم وتدبر کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ اوصاف کسی عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیت کا جو تصور دماغ میں قائم کرتے ہیں حضرت اپنی سوانح کے آئینہ میں بالکل ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

دیوبند جو مغربی یوپی کے قصبوں میں کا بس ایک قصبہ تھا اس میں ایک مدرسہ کی ابتدا کی، لیکن یہ مدرسہ کیا تھا علم وعمل، نظریہ وعقیدہ اور اصلاحِ معاشرہ کے باب میں ایک ہمہ گیر انقلاب تعلیم وتعلم کی ایک ہی صورت برسوں سے چلی آرہی تھی، یا تو کوئی عالم دین خود سے کسی جگہ (عام طور سے مسجد میں) بیٹھ گیا اور اس کی ذات یا خوش قسمتی سے اس کے بعد اس کے کسی شاگرد کے بیٹھنے سے وہ مدرسہ کہلایا گیا، یا پھر کسی امیر کبیر کی علم نوازی یا تشہیر ذات کی خاطر کسی مدرسہ کی نمود ہوگئی، اور اخراجات کی مسلسل کفالت امیر کے خزانے سے ہوتی رہی یا کوئی وقف قائم کر دیا گیا اور اسے اخراجات کی پابجائی ہوتی رہی۔

اس نہج کے دو نقصانات تھے جس کی تلافی کے لئے کبھی نہیں سوچا گیا، ایک تو پورا نظام تعلیم ایک فرد کا مرہونِ منت ہوگیا، خواہ وہ خود معلم ہو یا کفیل، دوسرے نظام تعلیم کی تشکیل اس ڈھنگ پر نہیں ہو پائی، جس کی وجہ سے عوام اور علماء باہم مربوط ہوتے ہوں، ذاتی شوق اور لگن کے تحت کوئی ربط قائم کرلے تو بات الگ ہے۔

نظام المدارس اور حکمت قاسمیہ

اس طرز کار میں حکمتِ قاسمیہ کا تجزیہ کیا جائے تو عظیم فوائد نظر آتے ہیں، اور تجربہ ان کا شاہد عدل ہے۔

طبعی بات یہ ہے کہ کسی کام میں جب کوئی مدد کرتا ہے تو اس کام سے اس کو تعلق اور ہمدردی ہوجاتی ہے، لہٰذا جس نے مدرسہ کی اعانت کی اس کا مدرسہ سے ربط ہوگیا۔

ہر زمانے میں اور ہر جگہ غریبوں کی کثرت ہوتی ہے، رئساء اور امراء کم ہوا کرتے ہیں، لہٰذا

مدرسہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اگر امراء کی طرف ہی توجہ کی گئی تو مدرسہ کے ساتھ ربط کم لوگوں کا ہوگا معاشرے کا بڑا حصہ مدرسہ سے بے تعلق رہ جائے گا۔

غریب اپنی محنت کی کمائی میں سے جو کچھ دیتا ہے اس میں عام طور پر اور نسبتاً اخلاص زیادہ ہوتا ہے، اور اخلاص ہی سرچشمہ قوت اور خیر و برکات ہے، مدرسہ کے کام میں اس سے خیر و برکت ہوگی۔

غریب زیادہ نہیں دے پاتا، جو کچھ دیتا ہے وہ چونکہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے اس لئے احسان کا خیال بھی دل میں نہیں آتا جس کو جتلانے کی نوبت آئے، نیز مدرسہ کے نظام میں مداخلت کی ہمت اس کو نہیں ہوتی برخلاف امراء یا حکام کے، ان کی مدد لی جائے گی تو ان کی مداخلت کو گوارا کرنا پڑے گا، اس طرح مدرسہ اپنے نظام اور مقاصد میں آزاد نہ رہے گا۔

مدرسہ کی ضروریات جس قدر بڑھتی جائیں گی اسی کے بقدر مالی مدد کی بھی ضرورت ہوتی جائے گی جس کے لئے ارباب مدرسہ کو زیادہ مسلمانوں (غریبوں) تک جانا ہوگا، جو محنت کو چاہتا ہے، اس محنت کے نتیجے میں جو مدد وصول ہوگی اس کو قیمتی سمجھا جائے گا اور صحیح مصرف میں احتیاط کے ساتھ خرچ کیا جائے گا۔

منتظمین مدرسہ کو امراء و حکام کی خوشامد نہیں کرنی پڑے گی، اس کی وجہ سے ان میں استغناء کا وصف برقرار رہے گا۔

چونکہ مدرسہ کی لگی بندھی اور مستقل آمدنی نہیں ہوگی، اللہ کے بھروسہ پر آمدنی کی امید رکھنی ہوگی، جس سے ان میں توکل اور قناعت کے اوصاف پیدا ہو کر ترقی پذیر رہیں گے۔

چونکہ مالی تعاون کرنے والے اپنے اختیار اور رغبت سے تعاون دیں گے کوئی قانونی ٹیکس کی شکل نہیں ہے کہ جس کو خواہی نخواہی ادا کرنا ہی ہو، اس لئے علماء (ارباب مدرسہ) معاونین کے احسان مند اور ان کے حق میں دعا گو رہیں گے۔

علما اور عوام ایک دوسرے کے قدردان رہیں گے، علماء تو اس لئے کہ عوام نے ان کی بتوسط مدرسہ مدد کی ہے اور عوام اس لئے علماء کے قدردان ہوں گے کہ ان کے نزدیک علماء کی خدمت کا مقدس کام یہ حضرات انجام دے رہے ہیں جس کے فوائد و برکات سب کے لئے عام ہیں۔

اس طریقِ کار سے علماء اور عوام مسلمین میں باہمی ربط بلکہ مضبوط تعلق قائم رہے گا، جس کی وجہ سے کوئی طبقہ بگڑنے نہیں پائے گا، علماء عوام کی اصلاح وتربیت سے خود کو بے تعلق نہ کرسکیں گے، اور خود کو بھی بگاڑ سے دور رکھیں گے اس لئے کہ عوام کی نظریں ان پر جمی ہوئی ہیں اور ان کا ان کے اوپر حق ہے۔

یہ ہیں حکمتِ قاسمیہ کے وہ دوررس فوائد اور ثمرات، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دیوبند کا مدرسہ اسلامیہ ہی اکیلا دار العلوم بن کر نہ رہ گیا، بلکہ حکمتوں پر مبنی اس نظام کے کامیاب تجربہ نے کثیر تعداد میں مدارس قائم کرادیئے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے عقیدے بھی محفوظ ہوگئے اور اخلاق واعمال کی اصلاح بھی ہوئی، پھر مدارس اور علماء میں تلازم کی وجہ سے مدارس بھی بڑھتے گئے اور علماء کی تعداد بھی روز افزوں ہوتی رہی، ان علمانے محض درس وتدریس پر اکتفانہیں کیا بلکہ بے شمار دینی علمی کتابیں تصنیف کیں جس سے علم محفوظ بھی ہوا اور شائع بھی۔

نانوتوی نظام کی مقبولیت

اور اب تو حالت یہ ہے کہ صرف ہندوستان میں ہی اس کثرت سے مدارس قائم ہیں کہ ان کی تعداد کوئی بھی بتلانہیں سکتا، پھر اس سلسلہ نے وہ قبولیت اور وسعت حاصل کی کہ برصغیر ہی نہیں بلکہ افریقہ، یورپ، برطانیہ اور امریکہ تک میں اسی نہج پر علماء وعوام نے مدارس قائم کردیئے جو نہایت مضبوط پیانہ پر خدمتِ دین وعلم کررہے ہیں، بلکہ مسلک ومشرب کے اختلاف کی دیواریں بھی اس نہج کی قبولیت کو نہ روک سکیں، سب ہی نے اس نظام کو اپنایا خواہ اس کا احساس واعتراف کریں یا نہ کریں۔

بہرحال ہندوستان میں گوری تہذیب واقتدار نے جس عالمی تخریب کو یہاں مسلط کیا تھا اس کا دفاع اور مقابلہ اس انداز میں کیا گیا کہ اسے اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

دار العلوم دیوبند اور اس تحریری وتقریری جدوجہد نے جو نتائج برآمد کئے تھے اس سے ایک طرف لوگوں کے عقائد میں پختگی آئی تھی جس کی وجہ سے نصرانیت اپنے بال و پر نہ پھیلا سکی اور پادریوں کو ناکامی ہی دیکھنے کو ملی، دوسری طرف اخلاق واعمال درست ہوئے، تیسری طرف جذبہ جہاد اور استخلاص وطن کے فکر کی آبیاری ہوئی، تحریک آزادی اور اس کے لئے ہمہ قسم کی قربانیاں دی گئیں، آخر کار ہندوستان آزاد ہوا، پھر تو دنیا شاہد ہے کہ جس برطانوی اقتدار کی وسعتوں کا حال یہ تھا کہ

سورج تمام علاقوں میں سے کسی نہ کسی جگہ چمکتا ہی رہتا تھا وہ اقتدار سمٹ کر صرف انگلینڈ میں محدود ہو کر رہ گیا: وتلك الايام نداولها بين الناس.

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، دورِ صحابہ کے بعد سے چودہ صدیوں میں محدثین ومفسرین فقہاء ومورخین اور دیگر علوم اسلامیہ کے اندر لاتعداد مسلم ماہرین گزرے اور ان سب نے علوم نبویہ کی جس طرح خدمت انجام دی ہے ان کی افادیت وعظمت لازوال ہے، حدیث پاک ان الله يبعث لهٰذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها . کے مطابق ہر صدی میں مجددین بھی یقیناً گزرے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جو کارنامہ تحریک دیوبند کے توسط سے انجام پذیر ہوا اسے بلاشبہ ہم اس صدی کا تجدیدی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ (لیکن اسی کے ساتھ یہ ناقابل انکار حقیقت بھی ہے کہ حدیث کے باب میں اولیت کے لحاظ سے امام زہری اور حجیت کے لحاظ سے امام بخاری اور فقہ کے میدان میں بہر لحاظ امام ابوحنیفہ امام الائمہ ہوئے ہیں)

شاہ ولی اللہ کا تجدیدی کارنامہ

اس کے تحت دیکھا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی شخصیت اور خدمات اس بات کو باور کراتی ہیں کہ وہ اپنی صدی کے بلاشبہ عظیم مجدد ہوئے ہیں اور ان کے تجدیدی کام کے اثرات لازوال ہیں، حکمت شرعیہ میں ان کو امام تسلیم کیا ہی جاتا ہے، کتبِ حدیث کا ہندوستان میں تعارف اور پھر ان کو مروج کرنا بھی ان کا زبردست احسان ہے، لیکن ترجمہ قرآن کا جو شرف انھیں حاصل ہوا وہ اور کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہ ان کا ایسا زبردست کارنامہ ہے کہ امتِ مسلمہ خواہ وہ کسی بھی خطے میں ہو، کوئی بھی زمانہ ہو اور کسی بھی مسلک سے وابستہ ہو الامام ولی اللہ الدہلوی کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

تیرھویں صدی کا مجدد

حضرت شاہ صاحب کے بعد ماننا ہوگا کہ حضرت نانوتوی ہی کی شخصیت ایسی گزری ہے کہ ان کے کاموں کے اثرات رہتی دنیا تک تابندہ و پائندہ رہنے والے ہیں، بزرگوں میں سے کسی کا یہ قول منقول ہے کہ جماعت دیوبند من حیث الجماعت مجدد ہوئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جماعت کے لئے مجددیت کی راہ بنانے والی جو ذات تھی اس کو مجدد کیوں نہ سمجھا جائے۔

دیوبند ختم ہوگیا؟

۱۹۸۱ء میں جو کچھ دیوبند میں ہوا اکثر لوگ اس کے حوالہ سے یہ لفظ بولتے ہیں کہ دیوبند تو ختم ہوگیا...ظاہر ہے کہ ایسا کہنے والوں کی مراد دیوبند بستی نہیں ہے، وہ یہ لفظ لازماً دارالعلوم کے بارے میں بولتے ہیں جو دیوبند میں ہے، مگر میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم ایک مدرسہ کا نام تو نہیں ہے، وہ تو تعلیم و اصلاح کے باب میں ایک انقلابی عالمی تحریک ہے، دیوبند میں واقع مدرسہ اس کی اولین شکل ہے۔ دیوبند کی یہ تحریک اگر صرف دیوبند کے اندر محدود ہوتی اور اس پر آئی ہوئی افتاد کے بعد یہ الفاظ کہے جاتے تو شاید درست ہوجاتا مگر دیوبند تحریک جب عالمی ہے کہ بے شمار مدارس، لاکھوں کتابیں اور ہزاروں علماء دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اس مقصد کی آج بھی تکمیل کررہے ہیں تو دیوبند ختم کیسے ہوگیا؟

دیوبند کا کام تا ابد

مثلاً ہندوستان میں فقہ اکیڈمی نے جس طرح علماء موجودین کو اپنی بہترین علمی وفقہی صلاحیتوں کے نہایت مفید مقصد میں استعمال کرنے کی راہ پر لگایا ہوا ہے اور مقصد اور کام کی وحدت نے جس طرح ان اہل علم کی شیرازہ بندی کی ہوئی ہے یہ دیوبند تحریک کا زندہ کارنامہ ہی تو ہے، اور کون جانے ابھی مزید کیا ہوتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ دیوبند تحریک بے شمار علمی و دینی تحریکات کی موجد اور مجدد ہے اور حضرت نانوتوی کا کارنامہ کسی بھی مجدد وقت سے ہرگز کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریک کو مزید بار آور کرے اور حضرت نانوتوی کو بہترین جزا دے اور ان کے علوم سے مستفید ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی*

الامام محمد قاسم النانوتوی کی تصنیفات
ایک مختصر جائزہ

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کا انداز بیان جدا ہے، بحث کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے لیکن علم کلام کی گہری چھاپ ہے، اس لئے زیر بحث موضوع اور علم کلام سے واقفیت کے بغیر آپ کی بہت سی تحریروں کو سمجھنا آسان نہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے آپ کی اکثر تصانیف اور مکتوبات اردو میں ہیں لیکن وہ آج کی اردو سے بہت مختلف ہے، دور حاضر میں اردو کے سہل سے سہل تر رجحان کی وجہ سے ایک سو سال پرانی قدیم زبان تقریباً متروک ہو چکی ہے بلکہ بہت سے لوگ اس سے نا آشنا ہو گئے ہیں اس لئے حضرت نانوتوی کی زبان اور اس میں جا بجا علم کلام کی اصطلاحات اور مخصوص الفاظ کی وجہ سے آپ کی بہت سی عبارتوں کا مطلب سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی کی تصنیفات کا ایک بڑا حصہ شائع بھی ہو گیا ہے جن کے نام حجۃ الاسلام، تحفۂ لحمیہ، جواب ترکی بترکی یا براہین قاسمیہ، قبلہ نما، تقریر دل پذیر، آب حیات اور رسائل میں ہدیۃ الشیعہ اور توثیق الکلام وغیرہ ہیں۔

آپ کی دوسری تحریروں کا تعلق مکتوبات سے ہے......لیکن آپ کے یہ مکتوبات رسمی خطوط نہیں بلکہ اس زمانے میں آپ سے جو مسائل دریافت کئے گئے آپ نے ان کا علمی و تحقیقی جواب دیا جو چھوٹے بڑے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مکتوبات کا موضوع: سماع موتی، زیارت قبور، نذر لغیر اللہ، مسئلہ علم غیب، سنت و بدعت، شیعوں کا اسلام، اہل بیت پر رونا، شفاعت اہل بیت، فدک کا

* لکچرر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسئلہ، یزید کا کفر وایمان، حیات نبویؐ کی حقیقت، سرسید اوران کے عقائد، تعداد رکعات تراویح، قرأت خلف الامام وغیرہ ہیں۔ حضرت نانوتوی نے ان سوالات پر نہایت مدلل اور تشفی بخش جوابات لکھے۔

جبکہ آپ کی مستقل تصنیفات کا موضوع ردِّ عیسائیت اور ہندو مذہب اوران کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ہے۔ اس باب میں اہم موضوعات وجود باری تعالیٰ، توحید، صفات باری تعالیٰ، عقیدۂ تثلیث وآواگون واوتار کارد، انبیاء کی ضرورت، دین محمدی کے بعد دوسری تمام شریعتوں کی منسوخی، معراج، معجزات نبوی، بیت اللہ بحیثیت قبلہ، حدوث عالم، ثبوت عالم برزخ، جنت دوزخ، ملائکہ اور شیاطین کا وجود، روح کی حقیقت، تقدیر، جانوروں کی حلت وحرمت، مردے کو دفن کرنا اور جلانے کے فائدے ونقصانات وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو ایسے عقلی اور منطقی انداز میں ثابت کیا گیا کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی، انداز بیان کچھ اس طرح ہے کہ کسی بات کو ثابت کرنے سے پہلے بالعموم ایسا مقدمہ وتمہید بیان کرتے ہیں جو مشاہدات اور روزمرہ کے حالات کے روشنی میں مرتب ہوتا ہے پھر جب نتیجہ نکلتا ہے تو فریق مخالف کے لئے راہ فرار باقی نہیں رہتی۔ یعنی جب صغریٰ کبریٰ کو تسلیم کرلیا تو نتیجہ سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔ جیسے ایک جگہ آپ اثبات قیامت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''جو اشیا مختلف الاغراض چیزوں سے مرکب ہوا کرتی ہیں جیسے کھیتی کہ اس میں غلہ آدمیوں کے لئے اور بھس گھاس جانوروں کے لئے تو ایسی چیزوں کو انجام کار توڑ پھوڑ کر جدا جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں اور اسی کے مناسب اس کو کام میں لاتے ہیں مثلاً کھیتی کو ایک روز کاٹ چھانٹ، توڑ پھوڑ کر بھس اور غلہ کو جدا جدا کر کے بھس کو کوپوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور غلہ کو کوٹھیوں اور برتنوں وغیرہ میں جمع کر لیتے ہیں اور اس کو وقتاً فوقتاً جانوروں کو کھلاتے رہتے ہیں اور غلہ کو بقدر ضرورت آپ کھاتے رہتے ہیں، پر اپنے کھانے میں بھی یہ تفریق کہ چھان پچھوڑ کر اچھے اچھے غلہ کو اپنے لئے رکھتے ہیں اور ناقص کو خدام اور شاگرد پیشوں اور جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ غور سے دیکھا تو اس عالم اجسام کو بھی مختلف الاغراض اجزاء سے بنا ہوا پایا، چنانچہ اس کے ہر ہر رکن اور ہر ہر طبقہ سے نمایاں ہے کہ یہ اور کام کا وہ اور کام کا، اس میں کچھ خاصیت، اُس میں کچھ، زمین کی کچھ خوبیاں اور پانی کے کچھ دوسرے فوائد۔ مجموعۂ عالم کو دیکھئے تو ایسا لگتا ہے جیسے آدمی یا کسی جانور کا جسم ہو، جیسے گوشت ودست وپا وغیرہ جدا جدا کام کے ہیں ایسے ہی اس مجموعہ

عالم میں زمین وآسمان وغیرہ ارکان جدا جدا مصرف کے ہیں، جیسے اس جسم خاکی میں عناصر اربعہ (آگ، ہوا، پانی، مٹی) کی جدا جدا خاصیت ہے ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں علویات اور سفلیات کی جدا جدا طبیعت اور خواہشات نفسانی کی جدا جدا تاثیر ہے، جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے غلبہ کے باعث مزاج اصلی میں تغیر آجاتا ہے تو اس کا نام مرض ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اگر روح کو جسم سے مفارقت کرنی پڑے تو اس کا نام موت ہے، ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں کسی رُکن جس کا مجموعۂ عالم کی ترکیب میں دخل ہے اگر ترکیب اصل میں فرق آجائے اور کوئی کیفیت تازہ ظہور میں آئے تو اس کا نام علامات قیامت ہے، اگر اس مجموعہ سے مفارقت کا اتفاق ہوجائے تو اس کا نام قیامت ہے اور پھر جس طرح انسان کا جسم مرنے کے بعد اس کے مختلف عناصر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں یعنی حرارت آگ سے، رطوبت پانی کے ساتھ اور ہوا ہوا کے ساتھ اور خاک خاک کے ساتھ، اسی طرح ایک وقت آئے گا مجموعہ عالم بھی جسم انسانی کے مانند ایک ایک جز الگ ہوکر اپنی اصل کے ساتھ مل جائے گا یعنی مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں، حرارت آگ میں وغیرہ وغیرہ۔ اسی کا نام قیامت ہے۔"

حضرت نانوتوی کی کم وبیش تمام تحریروں کا یہی انداز ہے، آپ کی تصنیفات اور مکتوبات پڑھنے کے بعد علوم شریعہ کے بہت سے اسرار وحکم تک رسائی ہوتی ہے اور عقل بھی ان کی تائید کرتی ہے ذیل میں آپ کی تصنیفات ومکتوبات کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام

کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا، ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن دریا بکوزہ ہے۔ اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ ضلع شاہجہانپور میں ایک جلسہ بنام میلہ خداشناسی ہونا طے پایا اور اطراف وجوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوا کر ہر مذہب کے علماء کو اپنے اپنے مذہب پر تقریر کے لئے دعوت دی گئی، حضرت نانوتوی کو اسلام کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی۔ چونکہ پہلے سے یہ امر بالکل نامعلوم تھا کہ مباحثہ کا موضوع کیا ہوگا اور یہ کہ اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی ہی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ہر کسی کو پیش کرنی پڑے گی تو اس نظریہ کے تحت حضرت نانوتوی کے دل میں خیال آیا کہ ایک تحریر لکھ لی جائے جو اصول اسلام وفروع

ضروریہ پر مشتمل ہو۔ چونکہ وقت بہت تنگ تھا اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ بیٹھ کر ایک تحریر منضبط فرمالی، لیکن مباحثہ میں اس تقریر کو پڑھ کر سنانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ حضرت نانوتوی جب شاہجہانپور سے واپس آئے تو خدام کے کہنے سے اسے طبع کرنے کو دے دیا، حضرت مولانا فخر الحسن نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز فرمایا اور شائع کر دیا۔ اس تحریر میں آپ نے جن باتوں کا جائزہ لیا ان میں انسان کی تخلیق کا مقصد، توحید، رسالت، عقیدۂ تثلیث کی تردید، ثبوت تقدیر، حدوث عالم، استقبال قبلہ، نماز میں قیام، رکوع، سجدہ کی مصلحت، زکوٰۃ، روزہ حج کی حقیقت، عصمت انبیاء، معجزات، قرآن کی فصاحت و بلاغت، ختم نبوت، قرآن میں نسخ کی وجہ، نبی آخر الزماں کی فضیلت اور آخر میں حلت گوشت کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ گوشت کھانا انسان کی فطرت ہے۔

انتصار الاسلام

یہ کتاب باضافہ شرح و مطالب مولانا محمد میاں دیوبندی ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا، یہ کتاب وفات سے دو سال قبل ۱۲۹۵ھ میں تصنیف کی گئی، انتصار الاسلام رسالہ کا نام آپ کے شاگرد خاص حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی نے تجویز کیا۔ یہ رسالہ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ان سوالوں کے جوابات میں لکھا گیا جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں پر لگائے تھے۔ حضرت نانوتوی نے جلسۂ عام میں ان الزامات کی تردید کی اور اعتراضات کے جوابات قلمبند بھی کرادئے۔ اس کتاب میں جن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ان میں: ذات باری تعالیٰ، شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود، بہشت، دوزخ کا وجود، جنت میں شراب طہور کی حقیقت، احکام خداوندی میں نسخ، مردہ کو دفنانا، روح، عالم برزخ، جانوروں کی حلت و حرمت، توبہ سے گناہ معاف ہونے جیسے مضامین ہیں۔ پنڈت دیانند کے گیارہ اعتراضات تھے، حضرت نانوتوی نے ایک ایک کر کے تمام سوالوں اور الزامات کے جوابات نوٹ کرادیئے اور پھر اسے عوام کے فائدہ کی خاطر شائع کر دیا گیا۔

تحفۂ لحمیہ

یہ پندرہ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا، یہ رسالہ ہندوؤں

کے ایک اعتراض کے رد میں لکھا گیا، اعتراض یہ تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے اور ظلم ہر ملت ومذہب میں ممنوع ہے۔ حضرت نانوتوی نے اس رسالہ میں ان کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر گوشت خوری اور جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہوتا تو ساری دنیا کے ملکوں میں گوشت خوری عام نہ ہوتی اور دنیا کے اطباء وحکماء ضرور منع کرتے، دنیا میں صرف ایک ہندوستان ہے جس میں ہندو قوم بستی ہے، تنہا وہی اس کو ظلم کہتی ہے، بقیہ دنیا کے تمام ممالک میں اس پر کوئی پابندی نہیں، خود ہندوؤں میں بعض جانوروں کو کھایا جاتا ہے اور بعض کو بطور نذر دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے، اگر تمام جانوروں کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا ظلم ہوتا تو ہندو ایسا کیوں کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ہندو ان کی کھال کے جوتے چپل کیوں پہنتے ہیں۔ سوم یہ کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، انہیں قید کرنا بھی ظلم ہے، اسی طرح اگر جانوروں کو ذبح کرنا گناہ کبیرہ ہے تو ان کو مارنا پیٹنا ثواب کا کام نہیں۔

جواب ترکی بہ ترکی

۵۹ صفحہ کے اس رسالہ کو مطبع قاسمی دیوبند نے شائع کیا ہے، یہ رسالہ آریہ سماج کے رسالہ ''آریہ سماچار'' میرٹھ کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ ان دنوں حضرت نانوتوی کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ قلم سے کچھ لکھ سکیں، اس لئے آپ سوالوں کے جواب بتاتے گئے اور آپ کے شاگرد حضرت مولانا عبد العلی میرٹھی نے انہیں لکھ کر مضامین کی شکل میں ترتیب دیا۔ الفاظ مولانا میرٹھی کے ہیں لیکن متکلمانہ دلائل، منطقیانہ مقدمات کی ترتیب حضرت نانوتوی کا فیضان علم ہے۔ اس کے بنیادی مباحث میں باری تعالیٰ اس کا وجود اور اس کی صفات، علم، ارادہ، قدرت وغیرہ کی تفصیل ہے پھر مادہ قدیم ہونے کی تردید پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں قرآن کو کلام اللہ اور دوسری کتب سماویہ کو کتاب اللہ ثابت کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں انبیاء کی ضرورت، ان کی حیثیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبین ہونے کی دلائل اور خاتمیت کے مفہوم کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ کتاب اردو میں ہونے کے باوجود چونکہ کلامی مباحث اور منطقیانہ طرز استدلال سے پُر ہے ایک ایک موضوع کے تحت شاخ در شاخ بحثیں ہیں۔ پوری کتاب مسلسل مضمون کی شکل میں ہے، اس میں نہ کہیں ابواب وفصول ہیں اور نہ کہیں فل اسٹاپ اور پیراگراف

وغیرہ، اس لئے عام آدمی کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ اس لئے اس کتاب کی تسہیل کی ضرورت تھی جسے استاذ دارالعلوم مولانا اشتیاق احمد صاحب نے پوری کردی اور اسے براہین قاسمیہ کے نام سے شائع کیا۔

قبلہ نما

اس کتاب کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا۔ یہ کتاب دراصل حضرت نانوتوی کی کتاب انتصار الاسلام کا دوسرا حصہ ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات میں ایک یہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور خود ایک مکان (بیت اللہ) کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں۔ یہ کتاب اسی سوال کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں متکلمانہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ استقبال قبلہ اور بت پرستی میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اول تو لفظ استقبال قبلہ اور لفظ بت پرستی ہی اس پر شاہد ہے کہ بت پرستی کو توجہ الی الکعبہ کے ساتھ کچھ نسبت نہیں۔ لفظ اول کا مفہوم فقط کعبہ کی طرف منہ ہو اور بت پرستی کا حاصل یہ ہے کہ بت معبود ہوں۔ دوسرے اہل اسلام کے نزدیک کعبہ کی طرف منہ ہونا چاہئے عبادت صرف خدا کی کی جاتی ہے کعبہ کی نہیں، اگر بالفرض وہ پتھر کی دیواریں منہدم ہو جائیں تب بھی نماز اسی کی طرف کو ادا کریں گے، لیکن بت پرستی میں مقصد ان بتوں کو پوجنا ہوتا ہے جو مندروں میں رکھے ہوئے ہیں، اگر مندر سے بتوں کو اٹھا کر کہیں اور رکھ دیں تو پھر بت پرستی کے سارے فرائض وہیں پر ادا ہونے لگتے ہیں مکان اول کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اہل اسلام خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں اللہ نہیں کہتے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اگر کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے مکان نہیں، اسی پر استقبال قبلہ کو قیاس کر لیجئے۔ بت پرست اپنے بتوں کو خانہ خدا نہیں بلکہ مہادیو اور گنیش وغیرہ خیال کرتے ہیں، اس لئے بیت اللہ کی طرف کو منہ کر کے نماز ادا کرنا دوسری بات ہے اور بت پرستی اور چیز ہے اور یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔

تقریر دل پذیر

اس کتاب کی ضخامت ۳۲۸ صفحات ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا۔ حضرت نانوتوی نے یہ کتاب دعوت اسلام کے نقطہ نظر سے تصنیف کی۔ کتاب میں جن موضوعات پر بحث کی

گئی ہے ان میں وجود باری تعالیٰ، توحید، ابطال تثلیث و اصنام پرستی، انجیل کا محرف ہونا، بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے، نیز حدوث عالم، جنت، دوزخ، ملائکہ وشیاطین کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، مسئلہ تقدیر، آسمانی شرائع میں نسخ کی وجہ، حسن وقبح اعمال، ضرورت نبوت، صفات الٰہی، جزء لایتجزیٰ کی بحث اور قیامت کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔

آب حیات

حضرت نانوتوی کی یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ میں نے اسے حضرت نانوتوی سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ کتاب کا موضوع حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت نانوتوی کے عہد میں چونکہ شیعی جراثیم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اس لئے حضرت نانوتوی سے شیعوں کی روایتوں کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے، حضرت نانوتوی ان سوالوں کے بڑی تفصیل سے جوابات لکھتے تھے۔ آب حیات لکھنے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب آپ نے ''ہدیۃ الشیعہ'' لکھی جس میں مسئلہ فدک اور خلفاء راشدین پر شیعوں کے الزامات کو موضوع بنایا۔ آپ نے ''آب حیات'' میں یہ ثابت کیا کہ آپ قبر میں حیات ہیں اور چونکہ زندہ شخص کے مال میں وراثت نہیں جاری ہوتی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔ وراثت کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے جب مورث وفات پا جائے اور مورث جب تک زندہ ہے مال اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں حیات ہیں اور اسی لئے ان کی ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہے، لہٰذا آپؐ کے مال میں وراثت نہیں جاری ہوسکتی۔

اس کتاب میں بھی انداز بیان خالص فلسفیانہ اور متکلمانہ ہے اور دلائل شاخ در شاخ پھیلے ہوئے ہیں۔ پوری کتاب مسلسل مضمون کی شکل میں ہے، نہ کہیں ذیلی عنوانات اور نہ یہ پتہ لگتا ہے کہ بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم، کہاں پیراگراف شروع ہوا کہاں ختم، اس لئے مباحث سمجھنے میں انتہائی دشواری پیش آتی ہے۔

توثیق الکلام

یہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، اس میں قرأۃ فاتحہ خلف الامام کا مشہور اور مختلف فیہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ انداز بحث متکلمانہ ہے۔

مکتوبات

ان مذکورہ بالا کتب و رسائل کے علاوہ آپ کی دوسری تحریروں کا تعلق مکتوبات سے ہے جن میں آپ سے مسائل دریافت کئے گئے آپ نے ان کا جواب دیا۔ یہ مکتوبات مستقل چھوٹے بڑے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر دہلی کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین علوی نے حضرت نانوتوی سے وحدت الوجود اور سماع موتیٰ کے بارے میں استفسار کیا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ حضرت نانوتوی نے اس خط کا جواب لکھا جس میں حضرت نانوتوی نے بڑی تفصیل (لگ بھگ ۱۵ صفحات) میں ان دونوں باتوں کا جواب لکھا۔ پھر یہ رسالہ عام لوگوں کے فائدہ کے لئے ۱۲۹۵ھ میں سہارنپور سے شائع بھی ہوگیا اس کا نام "جمال قاسمی" رکھا۔

جمال قاسمی کی طرح کم از کم آٹھ مطبوعہ مجموعے موجود ہیں جن کے نام "مکتوبات قاسمیہ"، "فیوض قاسمیہ"، "لطائف قاسمیہ"، "الحق الصریح"، "تحذیر الناس"، "اسرار قرآنی" اور "فرائد قاسمیہ" ہیں۔ ان مجموعے یا مکتوبات میں زیارت قبور، نذر لغیر اللہ، مسئلہ علم غیب، سنت و بدعت، شیعوں کا اسلام، اہل بیت پر رونا، شفاعت اہل بیت، فدک کا مسئلہ، یزید کا کفر و ایمان، نفس کی حقیقت، تعداد رکعاتِ تراویح، قرأت فاتحہ خلف الامام اور ان جیسے دوسرے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ ان سوالوں کے نہایت مدلل اور تشفی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ حضرت نانوتوی کا ایک مکتوب "تصفیۃ العقائد" کے نام سے ہے جو ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا۔ حضرت کا یہ مکتوب سرسید احمد خاں کے عقائد و خیالات کے تعلق سے ہے۔ اس مکتوب کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بزرگ جنہیں حضرت نانوتوی نے "پیرجی" کے نام سے یاد کیا ہے، ان کی ملاقات حضرت نانوتوی سے انبہٹہ میں ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ڈپٹی امداد علی اکبرآبادی اور گورکھپور کے جج علی بخش بدایونی نے سرسید کے خلاف طوفان اٹھا رکھا تھا۔ دونوں کی ملاقات کا موضوع سرسید تھے یہ دونوں بزرگ اس ہنگامے سے خوش نہیں تھے اس لئے گفتگو زیادہ تر سرسید کے بارے میں ہمدردانہ تھی اور چاہ رہے تھے کہ جن عقائد کی نسبت سرسید کی جانب کی جارہی ہے ان سے وہ کنارہ کشی کرلیں اس لئے ان بزرگ یعنی پیرجی نے سرسید کو خط لکھا کہ حضرت نانوتوی آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ سرسید نے اس خط کا جواب

لکھا اور اپنے عقائد کی اس خط میں وضاحت کی جو لگ بھگ ۱۵ شقوں میں تھے۔ یہ خط حضرت نانوتوی کے پاس پہنچا، حضرت نانوتوی نے ایک ایک کر کے ان کے عقائد و خیالات کا تفصیلی جواب دیا۔ واضح رہے کہ سرسید کے خط میں جو انہوں نے اپنے عقائد لکھے ہیں وہ بالکل وہی تھے جو اہل اسلام کے ہوتے ہیں۔ حضرت نانوتوی کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرسید کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے اُنہیں باتوں کے پیش نظر جوابات لکھے۔ آپ نے لکھا کہ کلام خداوندی اور کلام نبوی حقیقت کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی چیز مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہو تو کلام اللہ اور حدیث نبوی سے اس کی تغلیط کر دیں گے۔ غرض یہ کہ کلام اللہ اور حدیث کو اصل مقرر کر کے دلائل عقلیہ کو اس پر منطبق کریں گے اگر کھینچ کھانچ کر بھی مطابق آجائے فبھا ورنہ قصور عقلی سمجھیں، یہ نہ ہو کہ اپنے خیالات واوہام کو اصل سمجھیں اور کلام اللہ اور حدیث کو کھینچ تان کر اس پر مطابق کریں...... اس طرح سرسید کے تحریر کردہ پندرہ اصولوں کی تشریح کر کے جہاں جہاں سے کجروی کی راہیں اور گمراہی کے راستے نکل سکتے تھے ان سب کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

خلاصہ

حضرت نانوتوی کی تصنیفات اور مکتوبات پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا انداز بیان بالکل برجستہ اور بے تکلفانہ ہے، اس میں کوئی بناوٹ اور تصنع نہیں اور نہ ہی ان میں دوسروں کی تصانیف سے کوئی استفادہ کیا گیا بلکہ جیسے جو خیال آیا اس کو اسی طرح ضبط کر لیا گیا یا املا کرا دیا، اس پر نظر ثانی کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ چونکہ حضرت نانوتوی کا مشن دشمنان اسلام کے خلاف اسلام کا دفاع تھا اس لئے جہاں تقریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تقریر اور جہاں تحریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تحریر سے کام لیا۔ تصنیف آپ کا پیشہ نہ تھا بلکہ اسے آپ نے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

آپ کی اکثر و بیشتر تصانیف اگرچہ اردو میں ہیں تاہم آج عام آدمی کے لئے انھیں سمجھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی اردو اور سو سال قبل کی اردو میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق نہ صرف اردو زبان کے ساتھ ہے بلکہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔

آپ کی تحریروں میں خاص بات علم کلام اور اس کی اصطلاحات اور اس کے مخصوص الفاظ کا بہت زیادہ استعمال ہے جو آج کل بالکل ہی متروک ہے جس کی وجہ سے آپ کی کتابوں کو سمجھنا مشکل

معلوم ہوتا ہے۔ آج علم کلام کا زمانہ نہیں۔ اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے شاذ و نادر ہی ہیں لیکن اس زمانے میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی۔ حضرت نانوتوی خود فرمایا کرتے تھے کہ آج دین کا تحفظ علم معقول کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت کی کتابوں کو سمجھنے میں دشواری کی ایک وجہ علم کلام سے ناواقفیت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مرتبہ زیر بحث مسئلہ کی ناقص معلومات بھی عبارت سمجھنے میں پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت کا ایک مکتوب مسئلہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود سے متعلق ہے، قاری کو جب تک علم کلام کے ساتھ اس مسئلہ کی بنیادی معلومات نہ ہوں اس وقت تک حضرت نانوتوی کی عبارت اور اس کا فن کمال سمجھ ہی میں نہیں آ سکتا۔

جہاں تک آج کے دور میں آپ کی تحریروں کی افادیت کی بات ہے حضرت کی کتابیں آج کے عقلی و مادی دور میں جہاں ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے خاص طور پر مفید ہیں جو ہر بات کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں۔ وہیں دوسری طرف آپ کی تحریروں میں بکھرے ہوئے شریعت کے اسرار و حکم خواص کے لئے بھی مفید ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت کی کتابوں کی تسہیل کر کے عوام کے سامنے لایا جائے تاکہ عام و خاص اس سے مستفید ہوں۔

ماخذ

۱۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات و کارنامے، مولانا اسیر ادروی، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم ۱۹۹۷ء
۲۔ سوانح قاسمی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دارالعلوم دیوبند، ۱۳۷۵ھ
۳۔ تاریخ دیوبند، سید محبوب رضوی، ادارہ تاریخ، دیوبند
۴۔ انتصار الاسلام، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۵۔ جواب ترکی بترکی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۶۔ تحفہ لحمیہ، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۷۔ تقریر دل پذیر، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۸۔ تصفیۃ العقائد، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۹۔ قبلہ نما، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۱۰۔ حجۃ الاسلام، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۱۱۔ جمال قاسمی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ، سہارنپور
۱۲۔ تاریخ دعوت و جہاد، عبیداللہ فہد، ہندوستان پبلیکشر، دہلی ۱۹۸۴ء

مولانا عبدالقدوس رومی*

حضرت الامام الشیخ محمد قاسم النانوتوی الصدیقی قدس سرہ کا سلوک واحسان

واقعات وحالات کے آئینہ میں

ملا ہے دفتر تنظیم سے عجب عنوان سلوک حضرتِ قاسم لکھوں عیاں کردں احساں

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا فرمان صادر ہوا کہ مجھے حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے متعلق مجوزہ تذکار قاسمی (سیمینار) کے لئے حضرت امام موصوف کے "سلوک واحسان" پر ایک مقالہ تیار کرنا ہے۔

فرمائش پڑھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی، بار بار سوچتا رہا کہ ہمارے ان کرم فرماؤں کو احقر سے متعلق یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ وہ یہ فرمائش ایک ایسے شخص سے کر بیٹھے جسے کوچہ "سلوک واحسان" اور راہ اخلاص وعرفان کی ہوا بھی تو نہیں لگی ہے، اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جو آوارہ گردی سے محفوظ رہ سکا تھا وہ "دیوبند سے بریلی" تک کی سیاحی میں گزرا پھر کچھ "تفہیم القرآن" سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اب سے تقریباً نصف صدی قبل جب مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب غریق بحر رحمت نے اپنے وطن عزیز فتح پور تال نرجا (اعظم گڑھ) سے ہجرت نہیں فرمائی تھی اسی دور میں حضرت موصوف کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ایک ماہانہ رسالہ "الاحسان" نامی الہ آباد سے جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت واشاعت کی ذمہ داری احقر کے سر تھی۔

ممکن ہے کہ ہمارے احباب تنظیم کو اسی رسالہ "الاحسان" کی نسبت سے کچھ غلط فہمی ہوگئی ہو، اس پرانی سرگذشت کو یہاں دہرانے سے مقصد صرف یہی اظہار حقیقت ہے کہ ذمہ داران تنظیم نے راقم آثم کے لئے جو عنوان تجویز فرمایا ہے اس کا پورا حق ادا کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس کا تھوڑا حق

---

* مفتی شہر آگرہ (یوپی)

بھی ادا کر دینا احقر کے بس کی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کہ حضرت امام موصوف کی بلند و بالا شخصیت اس درجہ عظیم و عالی مقام تھی کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دار العلوم دیوبند سوانح قاسمی کے مقدمہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی مختصر سوانح قاسمی کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اس مختصر سوانح کا تذکرہ جب حضرت قطب وقت آیۃ من آیات اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ مولانا محمد قاسم کی سوانح مولانا محمد یعقوب کیا لکھ سکتے ہیں؟ دنیا میں اگر ان کی حقیقی سوانح حیات کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں، مگر میں کیا کروں آنکھوں سے معذور ہوں''(۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مرتبہ شناس حقیقی حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس صریح وصاف اور واضح اعلان حقیقت کے بعد کس کی ہمت یہ جرأت وجسارت کر سکتی ہے کہ وہ حضرت امام موصوف کی ''سوانح'' نگاری کا ارادہ بھی کرے؟ راقم السطور ایسی جرأت وجسارت اپنے اندر تو پاتا نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ اندیشہ وخطرہ بھی دامن گیر ہے کہ اگر حضرات اصحاب تنظیم کے اس ارشاد گرامی کی عدم تعمیل کو بھی احقر کی ناروا ''جسارت'' پر محمول کر لیا گیا تو کیا ہوگا؟ **این المفر من هذا الخطر؟**

ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کا طالب اور توفیق خیر رفیق کا خواہاں ہوتے ہوئے یوں دعا کی جائے کہ وہ اپنے فضل خاص سے زیر دست قلم اور بساط وطاقت سے باہر اس مضمون کی تکمیل آسان فرمادے اور اسے ملت مسلمہ کے لئے ذریعۂ اصلاح اور خود احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور وسیلۂ مغفرت بنائے۔ آمین

اس ضروری ومختصر اعتذار آمیز تمہید کے بعد ''مقالۂ مجوزہ'' پیش خدمت کیا جارہا ہے مگر اس سے پہلے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''یک نظری''، ''چند سطری'' سوانح بھی اگر اسی موقع پر دوسری بیش قیمت تحریرات کے ساتھ قلم بند ومحفوظ ہو جائیں تو یقیناً ہر لحاظ سے ''برمحل'' ہی قرار پائے گی۔

یہ چند سطری، یک نظری ''سوانح'' احقر راقم السطور کو دیوبند سے شائع ہونے والی ایک

(۱) مقدمہ سوانح قاسمی: مولانا گیلانی ص:۹ ج:۱۔

کتاب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' میں دستیاب ہوئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد امروہوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے اور یہ سوانح اپنے اسی مقدمہ میں درج ذیل تمہید کے ساتھ نقل فرمائی ہے (یہ سوانح حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بچپن کے ساتھی اور پھر آپ کے مسترشد حضرت شیخ ضیاء الحق عثمانی دیوبندی کی تحریر کردہ ہے جو انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ فرما رکھی تھی۔ احقر رومی) مفتی امروہوی صاحب فرماتے ہیں:

مولانا ضیاء الحق عثمانی کی ایک ''بیاض'' سے حضرت مولانا نانوتوی کی مجمل مختصر سوانح عمری پیش کرتا ہوں، واقعی کوزے میں دریا کو بند کیا گیا ہے۔ (وہ سوانح عمری ملاحظہ ہو)

مولانا محمد قاسم صاحب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں بمقام دیوبند وفات پائی۔

آپ کی عمر پچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی۔ اور ایک روایت سے پونے اڑتالیس برس کی ہوئی (ناقل سطور احقر رومی عرض کرتا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر میں اختلاف کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت بقید تاریخ و ماہ محفوظ نہ رہ سکی تھی جیسا کہ مختصر سوانح قاسمی یعقوبی سے ظاہر ہوتا ہے، آپ کے تاریخی نام ''خورشید حسین'' کی وجہ سے صرف سن ولادت ہی محفوظ رہا اور دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مجموعی عمر کی مدت ''انچاس سال چار ماہ چار یوم'' سن ہجری کے لحاظ سے متعین کی گئی ہے اور پونے اڑتالیس برس کی مدت سن عیسوی کے حساب سے بتائی گئی ہو۔

اور یہ عمر اس تفصیل سے بسر ہوئی (۱) نو سال والدین کے ناز و نعمت میں (۲) آٹھ سال تعلیم و تربیت میں (۳) آٹھ سال آزادی (تجرد) اور ذکر و شغل میں (۴) چوبیس سال ترقی اسلام و رفاہ مسلمین میں (یہ لطیفہ بھی خوب ہے کہ حضرات اہل حق اہل سنت و جماعت کو زبردستی ''وہابی'' کا نام دیگران کے لئے جو تاریخی عدد چوبیس تجویز کیا گیا ہے قدرت کی نظر میں حضرت امام قدس سرہ کی یہی چوبیس سالہ خدمات دین و اسلام ہندوستان میں اسلام کی ''نشاۃ ثانیہ'' کی بنیاد قرار پاگئیں۔ (رومی)

دنیا میں حضرت مولانا کا مشہور نام محمد قاسم، تاریخی نام ''خورشید حسین'' (۱۲۴۸ھ) تخلص

قاسم کنیت ''ابوالمساکین'' اور عالم ارواح میں شمس الاسلام ـــ اور مولانا مرحوم کے (ان ناموں سے) نامزد ہونے کی تفصیل اس طرح پر ہے:

عرفی (مشہور) نام (محمد قاسم) تو آپ کے باپ دادا سے ملا، تاریخی نام (خورشید حسین) اور تخلص (قاسم) بہ نفس نفیس تجویز فرمایا اور کنیت ''ابوالمساکین'' پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ صاحب چشتی کے حضور سے عطا ہوا اور شمس الاسلام سرکار ''احکم الحاکمین'' سے عنایت ہوا (سرکار احکم الحاکمین کی طرف سے ''شمس الاسلام'' کا لقب عالم ارواح میں دیے جانے کی کوئی تفصیل تو خود مرتب سوانح مولانا ضیاء الحق عثمانی نے ذکر کی، نہ ہی ناقل سوانح حضرت مفتی نسیم احمد امروہوی نے کوئی ضرورت سمجھی حالانکہ اس کی ضرورت بہرحال تھی۔ احقر رومی)

مورخہ ۴؍جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء یوم پنجشنبہ بوقت ایک بجے دن کے قبل الظہر ضیق النفس (دمہ) کی بیماری سے انتقال فرمایا (اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضرت مولانا ضیاء الحق عثمانی علیہ الرحمہ کی اس یک نظری وچند سطری سوانح تو اوپر ملاحظہ میں آچکی اب انہیں بزرگوار کی مفصل سوانح قاسمی کے مسودہ کا حسرتناک وعبرتناک حشر بھی حضرت موصوف مفتی نسیم احمد امروہوی کی زبانی سن لیجیے، موصوف نے اس مفصل سوانح کا تذکرہ بھی اپنے اسی مقدمہ مذکور میں فرمایا ہے فرماتے ہیں:

> دفتری صاحب (یعنی نورالحق عثمانی جو مولانا ضیاء الحق عثمانی کے صاحبزادے تھے اور مولانا ضیاء الحق عثمانی حضرت حاجی رفیع الدین صاحب دیوبندی کے داماد تھے) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد مولانا ضیاء الحق عثمانی نے حضرت ''قاسم المعارف'' کی مفصل سوانح عمری لکھی تھی احقر نے اس کے مطالعہ کی انتہائی کوشش کی، دفتری صاحب ہی سے معلوم ہوا وہ ان کے کسی عزیز کے پاس ہے، گذشتہ سال (یعنی ۱۳۷۷ھ) انھوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ وہ سوانح عمری دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے لے کر تلف کردی۔[۲] اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس المناک واقعہ کا نہ صرف عبرتناک بلکہ دردناک یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ آخر اس مفصل سوانح عمری میں ایسی کیا بات تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے اسے تلف

---

(۲) مکتوبات اکابر دیوبند ص: ۱۵

کر دینا ہی ضروری سمجھایا گیا در پردہ اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ اس سے چند ہی سال قبل یعنی ۱۳۷۳ھ میں حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی علیہ الرحمہ کی ''سوانح قاسمی'' دار العلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہو چکی تھی جس کے مصنف حضرت مولانا گیلانی صاحب سوانح قدس سرہ کے نہ تو معاصر تھے نہ ہی مندرج واقعات وحالات کے چشم دید گواہ تھے اور اس کے برخلاف اس تلف شدہ سوانح کے مصنف حضرت امام نانوتوی کے معاصر، بچپن کے ساتھی ہونے کے ساتھ حضرت امام کے مسترشد و مکتوب الیہ بھی رہے تھے جن کے نام حضرت امام نانوتوی کے بعض مکاتیب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' کے زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں۔

شبہ ہوتا ہے کہ اس مسودہ کے تلف کرنے میں ممکن ہے کچھ کاروباری جذبہ شامل ہو گیا ہو اور یہ خیال کر لیا گیا ہو کہ اس مسودہ کی اشاعت ہو جانے سے دار العلوم دیوبند سے شائع ہونے والی سوانح قاسمی (مولانا گیلانی) کی مقبولیت واشاعت متاثر ہو سکتی ہے اس لئے اسے تلف کر دینا ہی بہتر ہے۔

حقیقت حال کا علم تو صرف عالم حقیقی ہی کو ہے محض ظن و تخمین سے کوئی متعین بات کہی بھی نہیں جا سکتی تاہم اس حقیقت کا اظہار تو شاید کسی طرح بھی ناروا اور بیجا نہ ہوگا کہ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ایسے اہم مسودہ کا ضیاع ''تاریخ قاسمی'' سے متعلق نا قابل فراموش سانحہ ہے۔

سوانح قاسمی (مصنفہ حضرت مولانا گیلانی) کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم علیہ الرحمہ نے بھی اس مسودہ کے علاوہ بعض دوسرے چند مسودات سوانح قاسمی کا ذکر فرمایا ہے ان تفصیلات کو نظر میں رکھنے سے اندازہ یہی ہوتا ہے جسے کہا گیا ہے:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　　می دہد یزداں مرادِ متقیں

چنانچہ حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے مقدمہ میں متعدد سوانح کے مرتب ہونے اور اشاعت سے پہلے ہی تلف وضائع ہونے کی بات کہہ کر یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ:

> ''متعدد بزرگ سوانح نگاری پر متوجہ ہوئے اور سوانح عمریاں کافی مواد کے ساتھ تفصیلی طور پر مرتب ہوئیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا صورت واقعات یہ ہے کہ ''سوانح عمریاں'' مرتب ہوتی رہیں اور کسی مخفی ہاتھ سے سامنے آنے سے پہلے ہی تلف بھی ہوتی رہیں۔ (۳)

(۳) مقدمہ سوانح قاسمی ص:۹

راقم السطور سے ''سلوک واحسانِ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ پر مضمون کی فرمائش کی گئی ہے اس لئے احقر نے اپنے لئے سہولت اسی صورت میں سمجھی کہ حضرت موصوف سے متعلق موجود کتب سوانح کو بالاستیعاب ''سلوک واحسان'' کا چشمہ لگا کر دیکھا جائے۔

اسی جہت سے سطور بالا میں حضرت الامام قدس سرہ کی یک نظری و چند سطری سوانح بھی بطور یادگار و تبرک پیش نظر رکھ لی گئی ہے کہ راقم السطور اپنے موضوع سے متعلق معروضات و گذارشات میں حضرت امام قدس سرہ کی اس مختصر و قلیل مدت حیات کو نظر میں رکھتے ہوئے حضرت والا کے ''سلوک وعرفان'' کو زیر بحث لائے، کیونکہ عام مشاہدات و تجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ عام طور پر کسی بزرگ شخصیت کا ''سلوک وعرفان'' ان کی ''کہولت و مشیخت'' ہی کی عمر میں جوان ہوتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام قدس سرہ اس دور کہولت و مشیخت تک پہنچنے سے پہلے ہی راہی جنت اور واصل بحق ہوگئے ہیں جس وقت کہ خود حضرت امام عالی مقام کے پیر و مرشد و شیخ طریقت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی بہ نفس نفیس بقید حیات مکہ معظمہ میں قیام فرماتے، نیز حضرت امام موصوف کے استاذ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی نقشبندی دہلوی مہاجر مدنی بھی مدینہ منورہ طاب ثراہا میں آپ کی وفات سے ایک سال پہلے تک (یعنی ٦ محرم ١٢٩٦ھ تک) بقید حیات فیض رسانِ خلائق بنے ہوئے تھے۔

ان دو بڑے شیخ المشائخ کے علاوہ اور بھی متعدد شیوخ طریقت آپ کے معاصر موجود تھے اس لئے ہمارے حضرت امام قدس سرہ کے لئے پردۂ خمول و گمنامی میں رہتے ہوئے ''اخفائے حال'' آسان تھا جس سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا جیسا کہ اس سلسلہ کی بعض تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے جو آئندہ سطور میں شامل مضمون بھی کی جائیں گی، صرف نمونہ کے طور پر مولانا ضیاء الحق عثمانی کے نام دو خطوط یہاں نقل کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا پہلا خط بھی دلی میں یاد پڑتا ہے آیا تھا پر بعض وجہ سے مقصر رہا، اب آپ اپنا جواب لیجئے جیسے لڑکے کھیلتے وقت کسی کو بادشاہ کسی کو وزیر بنا لیتے ہیں، ایسی ہی میری پیری سمجھئے، یہی وجہ تھی کہ تم سے ہنسی میں کہہ دیا کرتا تھا کہ ''شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہو جاؤ، جب تم

واقعی مرید ہونے کو تیار ہوئے تو واقعی حال کہنا پڑا۔

ہاں وظیفہ کا کچھ مضایقہ نہیں، نماز پنجگانہ تو باجماعت پڑھتے ہی ہوگے، بعد ہر نماز کے ایک تسبیح اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم کی اور بعد عشا تین تسبیح يَا حَيُّ يَا قَيُّوم بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ کی پڑھ لیا کرو، عشا کی تسبیحوں کے اول وآخر گیارہ گیارہ بار درود بھی کہہ لیا کرنا اور سوا اس کے اگر جی چاہا کرے تو کلمہ اول اور درود شریف کی جتنی کثرت ہو سکے اتنی بہتر ہے مگر جو وظیفہ پڑھو اس کے پڑھتے وقت یہ سمجھا کرو کہ خدا کے سامنے حاضر ہوں اور زبان دل سے عرض کر رہا ہوں باقی خیریت ہے۔

تمہارے بھتیجے عین الحق وعزیز الحق یہیں ہیں اور تمہارے بڑے بھائی بھی کل سے آئے ہوئے ہیں سب بخیریت ہیں اور سب کو سلام کہتے ہیں چچا صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتے ہیں، اپنی چچی اور بھائی کو میرا بھی سلام کہہ دینا۔ رقیمہ محمد قاسم از نانوتہ صفر ۱۲۹۳ھ (۴)

تعلیق راقم برنامہ مذکور

حضرت الامام قدس سرہ کے جواب مذکور سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شیخ ضیاء الحق موصوف نے اپنے خط میں کیا بات لکھی تھی جس کا جواب دیا جارہا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنے خط میں حضرت امام کو ''شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہوجاؤ'' والی پرانی بات کے حوالہ سے حضرت والا قدس سرہ سے بیعت ہونے کی درخواست کی ہوگی جس کا جواب حضرت قدس سرہ نے کیسے لطیف و پرمذاق انداز میں دیکر اور اس پرانی بات کو بچوں کا کھیل بتا کر ان کی درخواست بیعت کو یوں رفت وگذشت کردیا جیسے وہ کوئی قابل ذکر بات ہی نہ تھی۔

درخواست بیعت کے ساتھ شیخ صاحب نے حضرت والا قدس سرہ سے کوئی ''وظیفہ'' بھی دریافت کیا ہوگا، اس درخواست کی پذیرائی ہوگئی اور موصوف کو صرف ایک وظیفہ نہیں بلکہ دو تین وظیفے بتادیئے گئے۔

جواب سامی قاسمی کا نکتۂ خاص

راقم السطور کی نظر سے ایسے بہت سے خطوط گذرے ہیں جن میں سائل نے کسی بزرگ سے

(۴) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۴۷۔

کوئی وظیفہ وعمل دریافت کیا ہے اور ان بزرگ نے دریافت کرنے والے کو جواب میں صرف وظیفہ یا عمل بتادیا ہے اور بس۔

لیکن اس مکتوب قاسمی کا نکتۂ خاص یہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ پوچھنے والے کو صرف وظیفہ ہی نہیں بتاتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ غیر رسمی اور بالکل غیر محسوس طور پر سائل کو ''مراقبۂ احسان'' کی بھی تلقین فرمائے جارہے ہیں مگر بالکل ایسے طور پر کہ سائل کو یہ بالکل محسوس نہ ہونے پائے کہ اسے کیسے عجیب انداز میں مراقبہ احسان کی مشق بھی کرائی جارہی ہے:

(۲) عزیزم شیخ ضیاء الحق صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ کمترین محمد قاسم بعد سلام مسنون عرض پرداز ہے کہ عشرۂ اول محرم میں آپ کا عنایت نامہ میرے پاس رام پور پہنچا تھا، جواب کا فکر تو اسی روز سے تھا پر وہاں تو بوجہ کثرت آمد ورفت اہل ملاقات اتفاق نہ ہوا۔ وہاں سے آیا تو ایک ہی شب رہنے کا اتفاق ہوا تھا کہ ناگہاں بریلی کے آب ودانہ نے زور کیا تین چار روز ہوئے کہ بدقت تمام وہاں سے آنا ہوا بہت سے خط جمع ہوگئے تھے آج خطوط جواب طلب کے جواب میں دن گزرا آپ کا عنایت نامہ بھی نکالا اور جواب لکھنا شروع کیا۔

عزیز من! نہ میں اس قابل کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں؟ البتہ دو چار بزرگوں سے عقیدت ہے ایک تو جناب حاجی امداد اللہ صاحب دوسرے شاہ عبدالغنی صاحب ان کے بعد مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائے غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں اگر یہ بات ہوتی تو پہلے سالک کو بھی ہوا کرتی، زیادہ بجز امید والتماس دعا اور کیا عرض کروں، اپنے چچا اور بھائی سے میرا سلام کہنا والسلام۔ ۶/صفر ۱۲۹۶ھ از نانوتہ (۵)

تعلیق راقم السطور رومی برنامۂ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا یہ دوسرا مکتوب گرامی بھی ویسی ہی صاف ستھری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ خود جوابِ خط کے الفاظ ہی سے یہ بات منکشف ہوجاتی ہے کہ شیخ ضیاء الحق صاحب

---

(۵) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۵۵۔

نے اپنے خط میں حضرت امام قدس سرہ سے کیا بات دریافت کی تھی۔

نامہ گرامی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جناب شیخ ضیاء الحق صاحب نے جب دیکھا کہ حضرت امام قدس سرہ نے پیری مریدی کی بات کو بچپن کا ایک کھیل بتا کر بات ٹال دی ہے تو انھوں نے بہت غور وخوض کر کے تقریباً ایک سال بعد یہ دوسرا خط لکھا تھا جس میں انھوں نے حضرت قدس سرہ سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ اگر جناب خود مجھے بیعت نہیں فرما رہے ہیں تو پھر مجھے یہ مشورہ ہی دے دیجئے کہ میں کس سے بیعت کروں؟ اور اسی سلسلہ میں شاید انھوں نے یہ سوال بھی کر لیا ہوگا کہ سلوک وطریق میں میرا حصہ کس بزرگ کے ہاں ہے کہ میں اس سے بیعت ہو جاؤں۔

ان دونوں ہی سوالوں کا مختصر جواب حضرت امام قدس سرہ نے یہ دے دیا کہ:

عزیز من! نہ تو میں اس قابل ہوں کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں —— ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائیں غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں۔

مکتوب گرامی کے یہی آخری خط کشیدہ فقرے قابل غور ولائق توجہ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بالکل غیر ارادی طور پر حضرت امام قدس سرہ کے قلم سے سلوک وعرفان کی ایک بہت بڑی حقیقت لکھوادی جس سے حضرت امام قدس سرہ کا کمالِ عرفان بھی ظاہر ہوگیا کہ اصل سلوک صرف سلوک ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے:

سلوک راہ بھی ہے اور سلوک منزل بھی — اسی سلوک سے مالک ہوئے ہیں واصل بھی

فراق ووصل چہ خواہی رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

حضرت امام قدس سرہ کے یہ دو مکتوب گرامی بطور نمونہ یہاں نقل ہوگئے، اس سلسلہ کے دوسرے مکتوبات انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ پیش خدمت ہوں گے۔

حالات زمانہ وابنائے زمانہ کو دیکھتے ہوئے طبیعت کا تقاضہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک وعرفان پر تفصیلی گفتگو سے پہلے نفس سلوک وتصوف کی اہمیت وضرورت واضح کر دی جائے جس کی وجہ یہ صورت حال ہے کہ دور حاضر کے مدعیان اسلام کے مختلف حلقوں اور طبقوں کی طرف سے مطلق "سلوک واحسان" اور طریق تصوف وطریقت کا شدت سے انکار کیا جا رہا ہے، اسے

نہ صرف یہ کہ خلاف کتاب وسنت کہا جا رہا ہے بلکہ اس سے بھی اور آگے بڑھ کر اس کا رشتہ اہل شرک وبدعات کے مراسم اور اہل ہند کے سنیاس اور جوگ سے جوڑ کر خلاف دین ومذہب صریح ضلال وگمراہی ٹھہرایا جا رہا ہے۔

ان حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم کسی مخصوص بزرگ شخصیت کے سلوک واحسان کی خصوصی بحث کرنے سے پہلے نفس سلوک واحسان ہی کی ضرورت واہمیت اور اس کے مرتبہ ومقام پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کر دیں کہ کتاب وسنت اور دین وشریعت کی روشنی میں خود اصل سلوک وتصوف کا مقام کیا ہے؟

تصوف وسلوک کے خلاف جو لوگ سرگرم نظر آتے ہیں غور وفکر کے بعد کا تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کتاب وسنت کی ان تعلیمات ہی سے بے خبر ہیں جن کی رو سے علم فقہ وشریعت کی طرح علم اخلاق وسلوک طریقت بھی فرض قرار پاتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے نام نہاد مدعیان تصوف کے خلافِ شرع مراسم طریقت وتصوف کو دیکھ کر سرے سے اصل سلوک وتصوف کو قابل انکار ٹھہرا دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصوف وطریقت بھی علم دین وشریعت ہی کا ایک اہم حصہ اور جزو لازم ہے۔

مشاہدہ گواہ ہے کہ ہر انسان بالخصوص ہر مسلمان اپنے وجود ظاہری میں دو چیزیں رکھتا ہے اس کا ایک وجود تو اس کے ظاہری جسم وبدن کا وجود ہے اور اس کا دوسرا وجود وہ ہے جسے ہم انسان کے باطن اور قلب وروح سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح انسان کامل کے دو رخ ہیں ظاہر وباطن یا قلب وقالب اسی طرح دین کامل کے بھی دو رخ ہیں، شریعت وطریقت یا اعمال جوارح واعمال قلب، اعمال جوارح سے متعلق رخ کو شریعت اور اعمال قلب سے متعلق رخ کو تصوف وطریقت کہتے ہیں، طریقت شریعت کے لئے لازم ہے اس سے مغایر ومتضاد کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ نام نہاد مدعیان تصوف نے مشہور کر رکھا ہے۔

حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ "تصوف ونسبت

صوفیہ'' میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

من تصوف ولم یتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینهما فقد تحقق.

یعنی جس شخص نے تصوف تو حاصل کیا لیکن فقہ سے نابلد رہا تو سمجھو کہ وہ زندیق و بے دین ہی رہا اور جس شخص نے شریعت وفقہ کو تو حاصل کیا لیکن تصوف نہیں حاصل کیا تو وہ خشک ملا ہی رہا اور جس نے فقہ اور تصوف دونوں کو جمع کیا اور دونوں چیزیں حاصل کیں تو وہ شخص صحیح معنی میں محقق ہو گیا۔

اسی شریعت وطریقت سے متعلق فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے فتاوی رشیدیہ سے دو سوالوں کے جوابات کا خلاصہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

جواب اول مختصراً

اس سوال کو بے فائدہ اس قدر طویل لکھا خلاصہ جواب یہ ہے کہ علم شریعت وعلم طریقت ایک ہی ہے اور شریعت وطریقت بھی ایک ہی ہے جب آدمی کو حکم شریعت معلوم ہوا علم شریعت حاصل ہوا اور جب کنہ اس حکم کی معلوم ہوئی وہ علم طریقت ہوا اور عمل بقدر ادائے فرض وواجب کے بہ تکلف نفس سے کرانا عمل بہ شریعت کہلاتا ہے اور جب اخلاص وحب حق تعالیٰ تہ دل میں ساری ہو گئی اس کو عمل بہ طریقت کہتے ہیں۔

جب تک کشاکش علم وعمل کی ہے شریعت ہے جب طمانینت ہو گئی وہ طریقت ہے، ابتدا اور انتہا کا فرق ہے جس نے اصل شے کے واحد ہونے کو خیال کیا ایک کہا یہ بھی درست ہے اور جس نے اول وآخر کا تفرقہ کیا دو کہہ دیا یہ بھی صحیح ہے مطلب دونوں کا واحد ہے۔

جواب دوم مکمل

یہ دونوں ایک ہیں ظاہر سے عمل کرنا شرع ہے اور جب قلب میں حکم شرع کا داخل ہو کر طبعاً عمل شرع ہونے لگے وہ طریقت ہے۔ دونوں کا حکم قرآن وحدیث سے ہے ادنیٰ درجہ شرع ہے۔ اس کا ہی اعلیٰ درجہ طریقت کہلاتی ہے۔ (۶)

ان معروضات کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ تصوف

---

(۶) فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۱۶۔۲۱۷ درسی کتب خانہ دہلی۔

وطریقت بھی فی الحقیقۃ دین وشریعت اور فقہ احکام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اسی جہت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی جو تعریف منقول ہے وہ فقہ ظاہری (شریعت) اور فقہ باطنی (طریقت) دونوں ہی کے لئے جامع سمجھی گئی ہے فرماتے ہیں:

علم الفقہ کی تعریف ہے: مَعْرِفَۃُ النفسِ مَا لَھَا وَ مَاعَلیھَا.

یعنی نفس انسانی ہر اس بات سے واقف وباخبر ہو کہ کون کون سے کام اس کے حق میں نافع ومفید ہیں اور کون کون سے کام اس کے حق میں غیر مفید اور ضرر رساں ہیں، اسی واقفیت وآگاہی کو فقہ کہتے ہیں۔

مناسب ہوگا کہ اسی موقع پر ایک نظر علم سلوک وتصوف کی تعریف پر بھی ڈال لی جائے کہ حضرات صوفیہ علم تصوف کی تعریف کیا کرتے ہیں مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ اپنے رسالہ تصوف ونسبت صوفیہ میں فرماتے ہیں:

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے ھُوَ عِلْمٌ تعرف بہ أحوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاھر والباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ.

قابل غور اور لائق توجہ نکتہ خاص یہ ہے کہ فقہ وتصوف کی مذکورہ ہر دو تعریفوں کا حاصل ولب لباب ایک ہی ہے اگر کچھ فرق ہے تو وہ صرف مجمل ومفصل کا ہے حضرت امام اعظم سے فقہ کی جو تعریف نقل ہوئی ہے وہ اگرچہ بظاہر بہت مختصر ومجمل ہے لیکن یہ حضرت امام کا کمال بلاغت ہے کہ انہوں نے صرف ایک فقرہ میں وہی بات ادا کر دی جو تصوف کی تعریف پر مشتمل تین چار فقروں میں کہی گئی ہے حالانکہ اگر یہاں بھی اختصار کا ارادہ کیا جاتا تو یہ مفصل تعریف ایک ہی جملہ میں سمیٹی جاسکتی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ علم تصوف تعمیر ظاہر وباطن کا نام ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ طریقت اور اصلاح باطن کی ضرورت سے بحث کرتے ہوئے اپنی مشہور ومہتم بالشان تصنیف ''التکشف عن مہمات التصوف'' میں فرماتے ہیں:

اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی اور اخلاق کی اصلاح کی

فرضیت پر دال ہیں، قرآن وحدیث میں زہد وقناعت، تواضع، اخلاص، صبر وشکر، حب الٰہی، رضا بالقدر، توکل وتسلیم وغیر ذالک کی فضیلت اور ان کی تحصیل کی تاکید اور ان کے اضداد حب دنیا، حرص، تکبر، ریا، شہوت، غضب، حسد ونحوہا کی مذمت اور ان پر وعید وارد ومذکور ہے۔
پھر ان کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے، یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے (۷)

زیر تحریر مضمون ومقالہ چونکہ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ کے سلوک واحسان سے متعلق ہے، مناسب تو یہی تھا کہ اس بحث میں بھی حضرت امام موصوف کی کوئی تحریر تبرکاً شامل مضمون ہو جاتی لیکن اس قلیل البضاعت کو اس میں تو کامیابی نہ ہو سکی البتہ حضرت موصوف کے یار غار پوری عمر کے ساتھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی ایک خود نوشت تحریر تذکرۃ الرشید حصہ دوم میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے محفوظ فرما دی ہے استبراکاً وہ تحریر مبارک احقر راقم کی مطلب خیز ترجمانی کے ساتھ یہاں نقل کی جا رہی ہے:

علم الصوفية، علم الدين ظاهراً وباطناً وقوة اليقين وهو العلم الاعلىٰ، حالهم اصلاح الاخلاق و دوام الافتقار الى الله تعالىٰ، حقيقة التصوف، التخلق باخلاق الله وسلب الارادة وكون العبد فى رِضاء الله تعالىٰ، اخلاق الصوفية، ما هو خلقه عليه السلام بقوله اِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عظيم وما ورد به الحديث.

وتفصيل اخلاقهم هكذا، التواضع ضده الكبر، المداراة واحتمال الاذى عن الخلق، المعاملة برفق وخلق حسن وترك غَضَبٍ وغيظ، المواساة والايثار بفرط الشفقة على الخلق وهو تقدم حقوق الخلق على حظوظهٖ، السخاوة، التجاوز والعفو، طلاقة الوجه والبشرة، السهولة ولين الجانب ترك التعسف والتكلف، انفاق بلاقتار و ترك الادخار، التوكل، القناعة بيسر من الدنيٰ، الورع، ترك المراء والجدال والعتب الا بحق ترك الغل والحقد والحسد، ترك المال والجاه، وفاء الوعد، الحلم، الاناءة، التوادد، والتوافق مع الاخوان

(۷) التکشف بحوالہ تصوف ونسبت صوفیہ ص ۴۴، از حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ۔

والعزلة عن الاغيار وشكر المنعم، بذل الجاه للمسلمين.

الصوفي يهذب الظاهر والباطن في الاخلاق والتصوف ادب كله، ادب الحضرة الالٰهية، الاعراض عما سواه حياءً واجلالاً وهيبةً، اسوء المعاصي حديث النفس وسبب الظلمة.(۸)

حضرات صوفیہ کا علم (یعنی علم تصوف کوئی نیا علم نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت) علم دین ہی ہے جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی سے متعلق ہے اور یہ علم تصوف اس علم دین میں قوت یقین کا ذریعہ بنتا ہے اور درحقیقت یہی علم سب سے اعلیٰ ہے اور حضرات صوفیہ کا دائرہ عمل اصلاح اخلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حاجت مندی کا دائمی اظہار ہے۔

تصوف کی اصل حقیقت اپنے ارادہ کا ترک وسلب ہے اور حق تعالیٰ کے اخلاق سے آراستگی ہے اور یہ کہ بندۂ خدا اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں لگا رہے اور صوفیہ کے یہ اخلاق وہی ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ تھے جسے اللہ تعالیٰ اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عظیم کے ذریعہ بیان فرمایا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے اور حضرات صوفیہ کے ان اخلاق کی فہرست ایک نظر میں یوں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۔ تواضع یعنی عاجزی جس کی ضد کبر وتکبر (اپنے کو بڑا سمجھنا) ہے (۲) مدارات (اخلاق و رواداری) (۳) مخلوق سے جو تکلیف پہنچے اسے برداشت کرنا (۴) حسن اخلاق اور نرمی سے معاملہ کرنا (۵) غصہ وغضب نہ کرنا (۶) دلجوئی اور دوسروں کا خیال اپنے سے زیادہ رکھنا یعنی عام لوگوں کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرنا (۷) سخاوت کرنا (۸) عفو و درگذر سے کام لینا (۹) لوگوں کے ساتھ کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا (۱۰) لوگوں کے ساتھ آسانی و نرمی کا معاملہ کرنا (۱۱) تصنع بناوٹ اور تکلف سے دور رہنا (۱۲) خرچ میں اعتدال کہ تکلیف بھی اٹھائے اور آئندہ محتاجی بھی نہ ہو (۱۳) ذخیرہ اندوزی کا ترک کرنا (۱۴) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا (۱۵) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا زیادہ کی ہوس نہ کرنا (۱۶) بحث ومباحثہ اور مقابلہ ومجادلہ سے دور رہنا مگر حق بات کے لئے بحث ومباحثہ کی اجازت ہے (۱۷) بغض، کینہ اور حسد سے دل کو خالی

---

(۸) تذکرۃ الرشید، ج ۲، ص ۱۱۔

رکھنا (۱۸) مال و جاہ کی محبت نہ رکھنا (۱۹) وعدہ پورا کرنا (۲۰) بردباری اختیار کرنا (۲۱) اطمینان وسکون سے کام کرنا (جلد بازی نہ کرنا) (۲۲) دوستی وموافقت کے ساتھ رہنا (۲۳) اہل اسلام کے لئے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرنا۔

مندرجہ فہرست اخلاق کو نظر میں رکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ صوفی اپنے ظاہر وباطن کو درست کر کے اور اسے سنوار کے تہذیب اخلاق کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تصوف کل کا کل ادب ہے (طرق العشقِ کلها اداب، ادبوا النفس ایها الاصحاب) حضرت باری تعالیٰ کا ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے رہو اس کے جلال وہیبت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ماسوا سے اعراض و بے توجہی رکھی جائے، اور سب سے برا گناہ کہ دل ہی دل میں گناہ کی باتیں کرتا ہے یہ حدیث نفس دل کی تاریکی کا سبب ہے اللهم احفظنا منه.

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر امام اہل الہند صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کی تفہیمات الٰہیہ سے بھی کچھ اقتباس پیش کردیں۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک بات اس طرح شروع فرمائی ہے۔

وَمُعْظَمُ مَا دَعَتْ اِلیٰ اِقامته الرسل امور ثلثة. اللہ تعالیٰ کے جملہ انبیا ورسل نے جس دین کو قائم کرنے کی دعوت دی ہے اس کی اکثر اور اہم اور تعلیمات تین ہیں

پھر حضرت شاہ صاحب نے ان تین امور کی تفصیل وتعیین فرمادی ہے کہ وہ تین امور یہ ہیں:

(۱) تصحیح عقائد (۲) تصحیح اعمال (۳) تصحیح الاخلاق والاحسان۔

اس تعیین کے بعد حضرت شاہ صاحب تیسرے امر اخلاص واحسان پر مفصل بحث وکلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بیدہ هذا الثالث ادق المقاصد الشرعية مأخذاً و اعمقها محتداً بالنسبة الى سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنى من اللفظ. وتكفل بها الصوفية رضوان الله عليهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوىٰ وحازوا السهم الاعلىٰ(۹)

---

(۹) تفہیمات الہیہ، ج ا، ص ۱۳ بحوالہ تصوف ونسبت صوفیہ۔

اس ذات کی قسم کھا کے کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ امور ثلثہ میں سے یہ تیسرا امر مقاصد شرعیہ میں سب سے زیادہ باریک و دقیق اور سب سے زیادہ تہ نشین اور عمیق مقصد ہے شریعت کے دوسرے مقاصد اتنے عمیق و دقیق نہیں، یہ بمنزلہ روح ہے جسم کے مقابلہ میں اور لفظ کے پیش نظر یہ معنی کا درجہ رکھتا ہے، اور اس مقصد عمیق و دقیق کو حضرات صوفیہ نے اپنا میدان عمل بنایا، خود بھی ہدایت یاب ہوئے دوسروں کو بھی راہ یاب کیا خود بھی بادۂ عرفان سے سیراب ہوئے دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے مقام پر فائز ہو گئے اور دین کا بڑا حصہ حاصل کرلیا۔

اب تک جن اکابر کی عبارات نقل کی گئیں ان کی حیثیت موضوع زیر بحث میں ان کے صوفی ہونے کی وجہ سے ایک فریق کی سی ہو جاتی ہے اور بعض مجلسی قسم کے انشاء پردازوں نے تو انہیں چنیا بیگم (افیونِ تصوف) سے شغل رکھنے والا بھی کہہ دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ایک مسلم و مشہور صاحب افتا و فقیہ علامہ ابن عابدین شامی کے مقدمۂ شامی سے بھی کچھ اقتباسات نقل کردیں علامہ شامی صاحب درمختار کے قول (وعلم القلب) کے تحت فرماتے ہیں:

ای علم الاخلاق وهو علم یعرف بهٖ انواعِ الفضائل و کیفیة اکتسابها وانواع الرذائل و کیفیة اجتنابها — لما علمت من ان عالم الاخلاص والعجب والحسد والریاء فرض عین ومثلها غیرها من افات النفوس کالکبر والشح والحقد والغش والغضب والعداوة والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلا والخیانة والمداهنة والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعة والقسوة وطول الامل ونحوها مما هو مبین فی ربع المهلکات مِنَ الاحیاء قال فیه وَلَا ینفك عنها بشر فیلزمه ان یتعلم منها ما یریٰ نفسه محتاجاً الیها و ازالتها فرض عین ولا یمکن الا بمعرفة حدودها واسبابها وعلاماتها و علاجها فان من لا یعرف الشر یقع فیه (۱۰)۔

علامہ شامی علیہ الرحمہ کی مندرجہ بالا عبارت میں بھی تقریباً وہی باتیں کہی گئی ہیں جو اوپر بیان

(۱۰) مقدمہ شامی ص: ۳۳، ج:۱۔

کی جا چکی ہیں اس وجہ سے اس موقع پر عربی عبارت کا ترجمہ غیر ضروری سمجھ کر نہیں کیا گیا ہے، ان حوالہ جات سے مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ علم اخلاق وتصوف کی ضرورت واہمیت کے قائل صرف مشائخ وصوفیہ ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے وقت کے مشہور صاحب مقام فقیہ ومفتی علامہ ابن العابدین شامی بھی اخلاق حسنہ کی تحصیل اور رذائل کا تزکیہ فرض شرعی بتا رہے ہیں۔

الحمد للہ کہ نفس تصوف وسلوک کی فرضیت وضرورت گذشتہ صفحات میں بفضلہٖ تعالیٰ حضرات مشائخ کبار رحمہم اللہ تعالیٰ کی مستند تحریرات کے اقتباسات کی روشنی میں اطمینان بخش طور پر پیش کر دی گئی ہے امید کہ انصاف پسند حضرات کو اس روشنی میں صورت حق نمایاں نظر آ جائے گی۔

آئندہ سطور میں حضرت امام حجۃ الاسلام شیخ نانوتوی قدس سرہ کے سیر وسلوک اور عرفان واحسان سے متعلق محدود و ناقص معروضات پیش خدمت کی جا رہی ہیں خدا کرے ناچیز راقم سطور سے موضوع بحث کا حق کسی بھی درجہ میں ادا ہو جائے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

مشہور ہے: گاہ باشد کہ کودک ناداں — از غلط بر ہدف زند تیرے

امام الاعلام حجۃ الاسلام حضرت محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی حیات روحانی واقعات وحالات کے آئینہ میں

احقر راقم السطور نے گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی مختصر ترین چند سطری ویک نظری سوانح اسی مقصد کے تحت ذکر کی تھی کہ اپنے موضوع پر کچھ لکھتے وقت احقر کے پیش نظر حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات بھی رہے اور پھر اسی مجموعی مدت حیات میں اپنی آنکھوں پر سلوک وعرفان کا چشمہ لگا کر حضرت قدس سرہ کے سلوک وعرفان کا سراغ لگایا جائے۔

حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر و مدت حیات پچاس سال کی بھی پوری نہ تھی، مہینوں اور دنوں کا حساب لگا کر کہا جا سکتا ہے کہ عمر کا پچاسواں سال تھا جبکہ آپ نے دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر عالم آخرت کا سفر فرما لیا۔

احقر نے حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات (۴۹ سال) کے لیے تاریخی فقرہ نکالنا چاہا تو "ایزد آگاہ" کا فقرہ نکلا اس "غیبی لطیفہ" کو "تفاءل" کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اس کھلی ہوئی

حقیقت پر یہ الہامی فقرہ گواہ ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ولایت ومعرفت اور خدا شناسی وایزد آگاہی من جانب اللہ مؤید ہے۔

ناظرین کرام سے ایک ضروری واہم جملہ معترضہ عرض کرنے کی معذرت خواہی کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھانے سے پہلے کچھ پیچھے لوٹنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی قلمبند کردہ چند سطری سوانح عمری پیش کی جاچکی ہے، مولانا موصوف نے اپنی اس مختصر سوانح میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت کی گتھی نہایت لطیف انداز میں حل کردی ہے مگر خدا جانے کن وجوہ کی بنا پر (احقر کے محدود علم ومطالعہ کے مطابق) اب تک لوگوں کی نظر میں نہیں آسکی ہے، احقر کو اثنائے ترتیب مقالہ اس طرف توجہ ہوگئی تو مناسب یہی معلوم ہوا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت سے بحث اگرچہ راقم السطور کے موضوع سے متعلق نہیں ہے تاہم اسے بالکل غیر متعلق بھی نہیں کہا جائے گا اس لئے اس مختصر سوانح کا یہ جزو یہاں ذکر کیا جارہا ہے موصوف نے لکھا ہے:

آپ کی عمر انچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی ظاہر ہے کہ جب مولانا ضیاء الحق صاحب کو حضرت امام قدس سرہ کی تاریخ وفات بھی معلوم ہے جس کے لحاظ سے وہ حضرت قدس سرہ کی مجموعی عمر (بقید سال وماہ ویوم) انچاس سال چار ماہ چار یوم متعین طور پر بتا رہے ہیں تو اس حساب کو نظر میں رکھتے ہوئے ۴؍جمادی الاول ۱۲۹۷ھ سے ۴۹ سال ۴ ماہ، ۴ یوم پہلے کی تاریخ ہجری نکال لی جائے وہی تاریخ حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین کی جاسکتی ہے۔

احقر بھی ''امة امية'' ہی کا ایک فرد حقیر ہے حساب کتاب سے واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جو کچھ حساب بہ آسانی لگایا جاسکا ہے اس کی رو سے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ولادت آخر ذی الحجہ (۲۹۔یا ۳۰) ۱۲۴۸ھ متعین کی جاسکتی ہے اس لحاظ سے مجموعی عمر وہی بنتی ہے جو مولانا ضیاء الحق عثمانی نے بتائی ہے یعنی انچاس سال چار ماہ چار یوم — الحمد للہ کہ اس طرح حضرت امام کی غیر متعین وغیر فیصل تاریخ ولادت بھی دریافت ہوگئی۔

اب تک حضرت امام قدس سرہ پر جو کتب سوانح لکھی گئی ہیں (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی سوانح قاسمی سے لے کر مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی اور مولانا اسیر ادروی کی مولانا

محمد قاسم: حیات اور کارنامے) ان سب ہی میں حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین نہیں کی جاسکی ہے لیکن چونکہ مولانا ضیاء الحق صاحب نے مجموعی مدت عمر اور تاریخ وفات متعین طور پر لکھ دی ہے جس کی وجہ سے مجموعی عمر کا پہلا سرا (تاریخ ولادت) بھی دریافت کیا جاسکتا ہے جو دریافت کر کے اوپر درج کیا گیا ہے۔

اوپر اسی سوانح کی ضمن میں یہ بات بھی احقر لکھ آیا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کے سلوک واحسان کا سراغ لگانے کے لئے ضرورت پڑے گی کہ حضرت امام کی مجموعی عمر میں سلوک واحسان کے آثار کا جائزہ دقت نظر کے ساتھ لیا جائے۔

اس خیال کے تحت یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کے عہد طفولیت کو بھی غور وتوجہ کے ساتھ نظر میں رکھا جائے جسے بالعموم ناز ونعمت کا دور کہہ کر نا قابل توجہ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

ابتداءً احقر کا خیال یہی تھا کہ زیر نظر مقالہ میں ان حضرات شیخین کی بیعت کے تقدم وتاخر کو موضوع بحث نہ بنائے لیکن سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی نے اچھی خاصی بحث کرنے کے باوجود بحث کو یونہی ناتمام چھوڑ دیا ہے مجبوراً اس بحث میں شرکت ضروری سمجھی گئی ورنہ واقعہ یہی ہے کہ یہ بحث ایک طرح سے بالکل بے بنیاد اور غیر ضروری ہے، جن حضرات نے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی تحریر کردہ سوانح بغور پڑھی ہے انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کا فیصلہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی مختصر سوانح میں صاف وصریح الفاظ میں فرما گئے ہیں ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

> آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک طے کیا۔(۱۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یہ سوانح (مصنفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی) حضرت امام قدس سرہ کی وفات کے بعد ہی قریب زمانہ میں لکھی گئی تھی اور جیسا کہ ابھی اوپر نقل کیا گیا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی معلومات حضرت امام نانوتوی وحضرت امام گنگوہی قدس سرہما کی بیعت وسلوک سے متعلق یہی ہیں، یہ روایت اس لحاظ سے زیادہ اہم اور قابل توجہ واعتنا قرار پاتی ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی حضرت امام نانوتوی کے استاد

(۱۱) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ سوانح قاسمی مولانا گیلانی۔ص:۲۸۔

زادہ ہیں زمانۂ تعلیم دہلی میں حضرت امام نانوتوی انہیں کے ساتھ اپنے استاد ہی کے مکان پر رہتے تھے دونوں ہر وقت کے ساتھی اور ہمدم وہمساز تھے جس کی وجہ سے ان کی روایت صاحب البیت کی روایت ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری روایت کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ٹھہرتی ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق سلوک اور ذکر اذکار وغیرہ کی مشغولی اور اس کی مزید کیفیات وتفصیلات بھی اکثر وبیشتر انہی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی معقول وجہ ہمیں اس بات کے لئے نہیں ملتی کہ ہم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ذکر واشغال کی تفصیلات تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی روایات سے لیں اور اہل سلوک وبیعت کے معاملہ کو تذکرۃ الرشید میں منقول روایات کی روشنی میں طے کرنے لگیں جبکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اس کے عینی شاہد بھی نہیں ہیں کیوں کہ موصوف کی پیدائش حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی وفات کے ایک سال بعد پانچ رجب ۱۲۹۸ھ کو ہوئی ہے اور حضرت گنگوہی قدس سرہ سے آپ کی بیعت ووابستگی ۱۳۱۶ھ میں ہوئی تھی ابھی بیعت کو صرف سات ہی سال گذرے تھے کہ ۸ یا ۹ جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بھی رحلت ہو گئی تھی۔

اس صورت حال کو نظر میں رکھتے ہوئے سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرات شیخین امام نانوتوی و محدث گنگوہی قدس سرہما کی بیعت کی وہ تفصیلات جو خدا جانے کن بنیادوں پر کہیں تذکرۃ الرشید اصل کتاب میں اور کہیں حاشیہ پر مذکور ہوگئی ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی سوانح کی بالکل صریح وصاف اور واضح مروایت کے ہم پلہ بھی نہیں کہی جاسکتیں چہ جائے کہ انہیں اس پر ترجیح دی جائے کیوں کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ جس زمانے سے متعلق یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ:

> اور اسی زمانے میں دونوں صاحبان (حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی) نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔ (۱۲)

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خود حضرت مصنف سوانح اس وقت حضرات شیخین کے ساتھ ہی دہلی میں

(۱۲) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص: ۲۸ مشمولہ سوانح قاسمی جلد: اول۔

ان حضرات کے استاذ اور اپنے والد محترم مولانا مملوک العلی صاحب علیہ الرحمہ کے مکان پر مقیم تھے بلکہ اسی زمانے میں عربی کی بعض ابتدائی کتابیں حضرت امام قدس سرہ سے پڑھی بھی تھیں اور حضرت امام نانوتوی نے جب کتب حدیث کا درس دینا شروع کر دیا ہے تو موصوف نے حضرت امام نانوتوی سے بخاری و مسلم شریف بھی پڑھی۔

ایسی صورت میں کہ مولانا محمد یعقوب صاحب جو ان حضرات کے اس درجہ قریب رہے ہوں ان کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ انھوں نے ان حضرات کی بیعت سے صحیح واقفیت کے بغیر ہی ایسی صاف و صریح اطلاع یوں ہی سپرد قلم کردی ہوگی مگر کیا کہا جائے کہ مولانا عاشق الٰہی کی تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر آئی ہوئی مندرجہ ذیل عبارت نے ایسی صاف بات کو بھی مستقل طور پر ایک موضوع بحث بنا دیا ہے، مولانا میرٹھی ص:۴۶ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا قاسم العلوم گو عقیدت میں حضرت گنگوہی سے مقدم ہیں مگر ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے، حضرت مولانا کو اعلیٰ حضرت سے بیعت ہونے کی جو کچھ بھی ترغیب دیتے اور حاجی صاحب کے مناقب بیان فرمایا کرتے تھے وہ اسی عقیدت کی بنا پر تھے جو نانوتہ کے ابتدائی تعلق قرابت و زیارت کے وقت سے آپ کو حاصل تھی، مولانا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرانے میں کوشش کا ثواب بھی حضرت مولانا گنگوہی کو حاصل ہوا، چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔ (۱۳)

تذکرۃ الرشید کا مذکورہ بالا حاشیہ پڑھنے کے بعد اسی کتاب کے ص ۴۳ کا یہ حاشیہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے حاشیہ کی عبارت درج ذیل ہے:

> مسجد کی ملاقات کے بعد (مسجد کی یہ ملاقات کب ہوئی تھی بعد میں بتائی جائے گی) حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ اعلیٰ حضرت کی جائے قیام یعنی مولوی سراج الدین صاحب کے مکان پر حاضر ہوئے اور زیارت کی۔

اسی ملاقات یا گنگوہ کے کسی دوسرے سفر میں جو حضرت کی چوتھی ملاقات کہلاتی ہے۔ یہ قصہ

---

(۱۳) حاشیہ: ۴۶ تذکرۃ الرشید۔

پیش آیا کہ اعلیٰ حضرت نے مولانا (گنگوہی) قدس سرہ سے دریافت فرمایا کہ:

میاں رشید احمد! اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی بھی تمنا ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ "حضرت! جی تو بہت چاہتا ہے" آپ (حضرت حاجی صاحب) نے دریافت فرمایا کہاں؟ اور کس کی طرف میلان ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ حضرت اب تک جتنا بھی غور وفکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا اور یا آپ کا، اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرما کر بات کو ٹال دیا کہ ہاں صاحب شاہ عبدالغنی صاحب عالم بھی ہیں۔ شیخ بھی مشہور محدث ہیں۔ علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں، مجھے کیوں شامل کرتے ہو؟ میں بیچارہ پڑھا نہ لکھا — حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کو کھینچ لیا، اس گفتگو کے بعد آپ کا خیال آستانہ امدادیہ کی جانب پختہ ہو گیا جس کا چند روز بعد وقوع ہو گیا۔ (۱۴)

راقم السطور رومی عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالا حاشیہ میں مسجد کی جس ملاقات کا ذکر ہوا ہے اس ملاقات کا ذکر اصل کتاب تذکرۃ الرشید میں ص ۴۲ پر مفصل مذکور ہے وہ تفصیل تو غیر ضروری ہے تاہم اس ملاقات سے متعلق یہ مختصر وضروری انکشاف اہم اور قابل ذکر ہے کہ تھانہ بھون کی مسجد کی یہ ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب یہ ہر دو حضرات شیخین دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

ایسی صورت میں بظاہر صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی منقولہ بالا روایت کو اگر حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تیسری ملاقات قرار دے لیا جائے تو متعدد روایات میں تطبیق کی صورت بھی نکل آتی ہے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی بیان فرمودہ حقیقت واقعہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی اور واقعہ کی صورت یہ قرار پاتی ہے کہ صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی روایت کے مطابق حضرت حاجی صاحب قدس سرہ اور حضرت گنگوہی کے درمیان یہ ملاقات ومکالمہ بیعت سے پہلے اس وقت ہو چکا ہے جب حضرات گنگوہی ونانوتوی دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے، قیام دہلی کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا جس کے نتیجہ میں حضرت گنگوہی کا وہ تردد بین الشیخین ختم ہو گیا جو بوقت مکالمہ ظاہر ہوا تھا اور پھر آپ نے دوسری طرف سے یکسو ہو کر

(۱۴) حاشیہ از صوفی محمود حسن سہارنپوری۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے بیعت کا فیصلہ فرمالیا اور پھر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے درس حدیث کی تکمیل کے بعد ہے دونوں صاحبان حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے اور سلوک بھی شروع کر دیا۔

اس بیعت کے وقوع میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کے شاکلہ وافتادِ طبع کے لحاظ سے عین ممکن ہے کہ دونوں صاحبان کی بیعت بالکل ایک ساتھ نہ ہوئی ہو اور حضرت گنگوہی کے ارشاد کے مطابق صورت وہی ہوئی ہو کہ ہر دو حضرات کی بیعت میں فی الجملہ تقدم وتاخر بھی ہوا ہو۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے خصوصی شاکلہ وافتادِ طبع پر نظر رکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس تقدم وتاخر کو میری دو پھسڈی کے چشمہ سے دیکھا جائے کیونکہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا شاکلہ خصوصی اور حضرت کی افتادِ طبع کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ وہ ہر ایسی بات سے دور رہنا چاہتے تھے جس میں ادنیٰ شائبۂ شہرت اور داعیۂ نام ونمود پایا جائے۔

حضرت امام نانوتوی کے سوانح کا یہ پہلو کھل کر زیر بحث نہیں آسکا ہے کہ حضرت نے دہلی کے عربک کالج میں پڑھنے کے باوجود سالانہ امتحان کی شرکت سے کیوں گریز کیا تھا؟ وجہ ظاہر ہے کہ امتحان دیتے تو ٹاپ کرتے مگر یہ شہرت وہاں مطلوب ہی کسے تھی؟ اس لئے چپ چاپ کالج چھوڑ دیا اور گھر بیٹھے رہے۔

جن حضرات نے صرف ظاہری طور پر رسم بیعت کی ادائیگی میں تقدیم وتاخیر اور اولیت وثانویت کو ایک بالکل غیر ضروری موضوع بحث بنا کر ان حضرات شیخین میں تفریق وتفصیل کی صورت پیدا کر دی ہے انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے ربط باہم اور مودت وخلوص ہی کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ضمنی طور پر حقیقت بیعت سے بھی اپنی بے خبری بھی ظاہر کر دی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرات مشائخ طریق بھی بیعت کو مفید ومستحسن ہی قرار دیتے ہیں اسے ضروری وفرض کا درجہ تو کوئی بھی نہیں دیتا ہے۔

بیعت کی یہ حقیقت اگرچہ ان حضرات مشائخ کی تحریرات سے بھی مفہوم ہو جاتی ہے جن کے حوالہ سے تصوف وسلوک کی شرعی حیثیت گذشتہ صفحات میں مفصل وقابل اطمینان حد تک بیان کی جا چکی ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بالعموم لوگوں میں خدا جانے کیوں یہ غلط فہمی عام

طور پر پائی جاتی ہے کہ جو لوگ کوچۂ سلوک وتصوف میں قدم رکھنا چاہتے ہیں وہ اصل سلوک یعنی اصلاح باطن کی طرف تو قطعاً توجہ ہی نہیں کرتے، ان کی پہلی اور آخری منزل بیعت اور صرف بیعت ہی ہوتی ہے اور بیعت ہو کر وہ پھر یوں سو جاتے ہیں جیسے گھوڑوں کا سوداگر گھوڑا بیچ کر سو جایا کرتا ہے۔

اگرچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ (جنہیں علمائے عصر نے سلوک وتصوف میں تو بہر حال مجدد مانا ہی ہے) نے بیعت رسمیہ کے معاملہ میں پھیلی ہوئی اور پائی جانے والی اس مشہور عام غلط فہمی کا صاف اور واضح انداز میں ازالہ فرمادیا ہے لیکن مدتوں کی جڑ پکڑی ہوئے غلط فہمی پوری طرح دور نہیں ہوسکی ہے چنانچہ صاحب تذکرۃ الرشید کا ذہن بھی پوری طرح صاف معلوم نہیں ہوتا جنہوں نے بالکل غیر ضروری طور پر یہ بحث چھیڑ دی اور ان ہر دو حضرات شیخین کو طرفین وفریقین کی حیثیت دے کر ان کی بیعت کے تقدم وتاخر کو ایک نزاعی اور قابل فیصلہ مقدمہ بنادیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی امام دوسرے وابستگان دار العلوم ومظاہر علوم کے غیر متنازع فیہ متفقہ طور پر امام وسید الطائفہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ حضرات شیخین اپنے مخصوص شاکلہ اور خصوصی افتاد طبع کے لحاظ سے باہم دگر اگرچہ فی الجملہ مختلف بھی ہیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے صحیح معنی میں مقام شناس بھی ہیں ہر دو بزرگ اپنی سلامتِ طبع کے باعث اس جذبۂ معاصرت سے بالکل پاک وصاف تھے جو معاصرت کو منافرت میں تبدیل کردیا کرتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ تذکرۃ الرشید کے حاشیہ کی منقولہ بالا عبارت نے اس موضوع بحث کو اس انداز سے پیش کردیا ہے جس سے کچھ ایسا رنگ جھلکتا ہے کہ قاسمی ورشیدی یہ الگ الگ دو گروپ ہیں اور ہر گروپ ہیرو وشپ میں مبتلا ہے اور اس کی پوری کوشش صرف یہ ہے کہ اس کا ہیرو زندگی کے ہر میدان وہر مرحلہ میں اول نمبر پر رہے۔

یہ جذبہ مغرب میں خواہ کتنا ہی پسندیدہ قرار دیا جاتا ہو اسلام میں اس قسم کی ہیرو وشپ نہ صرف یہ کہ بالکل بے قیمت ہے بلکہ انتہائی قابل مذمت ولائق نفرت جذبہ ہے جس کی حوصلہ افزائی کسی طور پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اسلامی ادب کے مسلم صاحب قلم ہیں ان کی نکتہ آفرینی ونکتہ سنجی، ژرف نگاہی ودور بینی طبقہ اہل علم میں مسلم ہے لیکن سوانح قاسمی میں وہ اپنی ان نکتہ آفرینیوں کی رو میں بار بار کچھ اس طرح بے قابو ہو کر الجھ جاتے ہیں کہ بعض مقامات پر ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ

اپنی اسی رو میں تضاد بیانی سے صحیح طور پر اپنا دامن بچانے میں ناکام ہوتے جارہے ہیں، یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہ دوسرے مستقل مضمون کا موضوع ہے۔

مولانا گیلانی صاحب نے تذکرۃ الرشید کی زیر تبصرہ بحث سوانح قاسمی جلد اول کے ص:۲۹۳ سے شروع کی ہے جو تقریباً آٹھ صفحات تک چل کر ص ۳۰۰ پر ختم ہوئی ہے۔ اس طویل سلسلۂ کلام کا ایک اقتباس ذیل میں اپنے تبصرہ کے ساتھ پیش خدمت کیا جارہا ہے۔

حضرت مولانا گیلانی تذکرۃ الرشید ص ۴۶ پر دئے ہوئے حاشیہ کی عبارت نقل فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

> "یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا گویا چشمہ کا سراغ جس نے لگایا تھا باوجود پیاس کے اس وقت تک اپنے تلاش کئے ہوئے پانی کو اس نے استعمال کرنا مناسب نہ خیال کیا جب تک کہ دوست کو نہ دیکھ لیا کہ وہ سیراب ہو چکا ہے"۔(۱۵)

مولانا گیلانی نے مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ فرمایا ہے وہ عقلی و منطقی اعتبار سے مخدوش ہے، جن مقدمات پر مولانا نے اپنے نتیجہ کی بنیاد رکھی ہے وہ اپنے ناقص ہونے کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے لیکن مولانا نے اپنے مقدمات کے نقص کو نظر انداز کر کے بالکل ہی زبردستی ان سے نتیجہ نکال لیا ہے جسے اہل منطق تحکم ہی کہیں گے۔

مولانا کا یہ ارشاد تو اپنی جگہ پر درست ہے کہ یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے، مگر اس موقع پر مولانا کو اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ دوسرا مقدمہ (کبریٰ) بھی ذکر کر دینا چاہئے تھا کہ اس روایت کے علاوہ کوئی دوسری روایت جو اس سے زیادہ قوی ہو موجود بھی نہیں ہے — لیکن مولانا نے یہ بات نہیں کہی اور وہ کہہ بھی کیسے سکتے تھے کہ خود انہیں کے متعین کردہ متن (یعنی سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی) میں مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے کہیں زیادہ وزنی، صحیح و قوی روایت موجود ہے کہ:

---

(۱۵) سوانح قاسمی ج ۱ ص:۲۹۴۔

"اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا"۔ (۱۶)

پھر مولانا گیلانی کا آگے بڑھ کر یہ فرمانا کہ:

بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا۔

موصوف کا یہ نتیجہ بھی عقلی و منطقی طور پر ناقابل تسلیم ہے یہ انداز استدلال حد درجہ ضعیف و کمزور ہے، اس کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر خدا جانے کتنی غلط باتوں کو صحت کی سند دینی پڑ جائے گی۔

عقلی طور پر یہی بات ناقابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بنظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات و مصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اس لئے ایسے حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ تذکرۃ الرشید کی اشاعت کے بعد انہوں نے بہ نظر غور و تنقید اس کے تمام تر مندرجات حرفاً حرفاً پڑھے ہوں گے بظاہر اسے توقع بے جا ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب اسی سلسلۂ بحث کا ایک دوسرا اقتباس اسی سوانح قاسمی کا ملاحظہ ہو۔ مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اور جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا بظاہر مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اس خبر کے مشتبہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، البتہ ایک چیز اس سلسلہ میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے ——

چند فقروں کے بعد —— مصنف امام ہی کے قلم مبارک سے ایک فقرہ یہ بھی نکل پڑا ہے:

اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا (ص: ۲۸)

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "طلب حدیث" ہی کے زمانے میں دونوں صاحبوں کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ بیعت ہی کا نہیں بلکہ سلوک باطنی کی تربیت پانے کا شرف حاصل

---

(۱۶) سوانح قاسمی ج: ۱ ص: ۲۸۔

ہو چکا تھا آگے پیچھے اس فقرے کے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک مولانا مملوک العلی صاحب دونوں حضرات کے استاد فنون زندہ تھے، مصنف امام کے اس بیان کو اور اس کے سابقہ ولاحقہ مضامین کو دیکھتے ہوئے دل میں بعض عجیب قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں خصوصاً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جن تفصیلات کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام علوم اور علم حدیث وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد گنگوہ میں آکر جب مولانا گنگوہی نے قیام اختیار فرمایا اور کچھ درس وتدریس اور ''نوشت وخواند'' کے مولویانہ کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے تب وہی مولانا شیخ محمد تھانوی کے مناظرہ کا قصہ پیش آیا اور مناظرے کے حیلہ سے تقدیر تھانہ بھون آپ کو حاجی صاحب کے قدموں تک پہنچادیتی ہے مگر مصنف امام کے فحویٰ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کا زمانہ دونوں بزرگوں کا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی صاحب سے دونوں مرید ہو گئے اور سلوک میں بھی لگ گئے بظاہر ان دونوں روایتوں میں تطبیق آسان نہیں ہے اور بجائے تطبیق کے ترجیح کا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے مصنف امام کی روایت ہر لحاظ سے مولوی عاشق الٰہی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں ترجیح کی زیادہ مستحق ہے۔ (۱۷)

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مولانا گیلانی پھر اپنی پرانی گومگو والی کیفیت پر لوٹ گئے ہیں اور پھر تذکرۃ الرشید کی روایت میں انہیں کافی قوت نظر آنے لگتی ہے بلکہ وہ پھر دوبارہ اس غلط استدلال کا سہارا لینے میں بھی تامل نہیں فرماتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> اس (تذکرۃ الرشید) کے شائع ہونے کے بعد بھی جہاں تک میں جانتا ہوں اس کتاب کے بیانات پر کسی سمت سے تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کر کے تاویل وتوجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہاں تک میرا خیال ہے، کافی گنجائش ہے لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعۂ بیعت سے ہے نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے اس لئے تاویل وتوجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی

(۱۷) سوانح قاسمی ج:۱، ص:۲۹۹۔

مذاق کے سپرد کر کے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں (انشاء اللہ تعالیٰ وبعونہ راقم السطور یہ فریضہ آئندہ سطور میں عنقریب ہی ادا کرنے کی کوشش کرے گا، ابھی تو مولانا گیلانی کی بات پہلے پوری ہو جائے موصوف فرماتے ہیں)

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو لیکن اپنے مصنف امام (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ) کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ فقروں کی روشنی میں بہ ہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم از کم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقۂ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر وسلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا۔ (۱۸)

تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی تنقیح وتنقید:

اس مقصد کے تحت یہاں کچھ معروضات پیش خدمت ہوں گی مگر اس سے پہلے اپنے ہی ایک دعویٰ کا ثبوت پیش کر دینا برمحل ہوگا، گذشتہ صفحات میں احقر راقم السطور نے جب حضرت مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے اس انداز استدلال کی صحت میں تامل کا اظہار کیا ہے کہ ــــ بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا تھا۔

تو احقر نے وہاں لکھا ہے کہ عقلی طور پر یہی بات ناقابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بہ نظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ وتجربہ کی روشنی میں تو یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات ومصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اب اس موقع پر احقر اپنی بات کے ثبوت میں یہ سوال اہل نظر واصحاب انصاف کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ولادت ۱۲۹۸ھ میں ہوئی ہے جبکہ اس سے ایک سال پہلے حضرت امام نانوتوی دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے تقریباً

(۱۸) سوانح قاسمی ج ۱ ص: ۳۰۰

چودہ سال بعد ۱۲۹۷ھ میں وفات پا چکے تھے اور ان کی وفات کے متصل ہی زمانے میں حضرت امام نانوتوی کی مختصر سوانح عمری حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تصنیف فرما چکے تھے جن کی وفات بھی جلد ہی یعنی ۱۳۰۵ھ میں ہو گئی تھی۔

اس موقع پر سوال یہ ہے کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے جب حضرت گنگوہی قدس سرہ کی سوانح تذکرۃ الرشید لکھنے کا ارادہ کیا تو اس وقت انہوں نے کیا یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ اپنے اس مقصد کے لئے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری مولانا نانوتوی کا بھی مطالعہ فرمالیں جو ان کے شیخ حضرت گنگوہی کے اصل رفیق وصدیق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مرتبہ شناس بھی تھے؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مولانا میرٹھی نے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری کا مطالعہ یا تو کیا ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو بہ نظر غائر نہیں کیا؟ ورنہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح قاسمی کا یہ انکشاف ان کی نظر سے گزر جانا چاہئے تھا کہ:

> اور اسی زمانہ میں (جس زمانہ میں ان حضرات نے شاہ عبدالغنی صاحب سے تکمیل حدیث کی تھی) دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا (ص:۲۸)

تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت'' جس طرح قلم بند ہوئی ہے اس سے بالکل عیاں ہے کہ مولانا میرٹھی کے علم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کا یہ صریح وصاف انکشاف مطلق نہیں تھا ورنہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت'' کے دوران کوئی ایک حاشیہ اس انکشاف کی تردید میں ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ انکشاف ایک ایسی شخصیت کے قلم حقیقت رقم سے تھا جو مروجہ پر تکلف انشاء صحافت سے یکسر پاک ہونے کی وجہ سے نظر اندازی کے لائق ہرگز نہ تھا۔

اس تفصیل سے احقر کا مدعا واضح ہو جاتا ہے کہ جب تذکرۃ الرشید کے فاضل مصنف اپنے تذکرہ نگاری کے وقت بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے کہ اپنے شیخ ومرشد کے حقیقی ساتھی حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق لکھا ہوا وہ تذکرہ بھی دیکھ لیں جو جس طرح حضرت امام نانوتوی کا زمانہ تعلیم وقیام دہلی میں ہمدم ودمساز تھا، اسی طرح اور تقریباً اسی درجہ کا تعلق اسے حضرت

گنگوہی سے بھی حاصل تھا اس لئے کسی کتاب کو سند تصدیق دینے کے لئے یہ حسن ظن کافی نہیں ہے کہ اس کتاب پر کسی جانب سے صدائے تنقید نہیں اٹھی تھی — اس ضروری معروض کے بعد تذکرۃ الرشید کی روایت سے متعلق معروضات پیش خدمت کی جارہی ہیں خدائے تعالیٰ راقم السطور کی مدد فرمائے اور قلم کو حقیقت نگاری کی حد سے باہر نہ ہونے دے۔

معاملہ ومقدمہ کی نوعیت کیا ہے

تذکرۃ الرشید کی مفصل داستان بیعت پر کچھ تنقید وتبصرہ کرنے سے پہلے حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے کہ نوعیت معاملہ ومقدمہ متعین ہو جائے اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

احقر ہیچمداں کے فہم ناقص کے مطابق معاملہ ومقدمہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ:

جملہ وابستگان دیوبند کے مسلم ومتفق علیہ امام وپیشوا اور بزرگان دین ہیں امام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ اور ان کے رفیق خاص فقیہ النفس محدث عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی — ہر دو بزرگوں کی عمر میں چار سال کا فرق ہونے کے باوجود یہ صورت اتفاق بھی نکل آئی کہ تقریباً تمام تر درسیات دونوں ہی بزرگوں نے ایک ساتھ اور ایک ہی استاذ سے پڑھیں اور ایک ساتھ ہی دونوں نے تکمیل درس کی۔

حدیث شریف کی تکمیل حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں ہوئی اور دوسرے علوم وفنون کا بیشتر حصہ مولانا مملوک العلی صاحب اور مفتی صدر الدین صاحب آزردہ دہلوی کی خدمت میں پڑھا تھا اور اسی طالب علمی ہی کے زمانے میں دونوں ہی بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام امام نانوتوی قدس سرہ نے انچاس سال چار ماہ چار دن کی عمر میں وفات پائی حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اس وقت ترپین سال کی عمر میں بقید حیات تھے جو حضرت امام کی وفات کے بعد دار العلوم کے سرپرست ومربی رہے۔

امام نانوتوی کی وفات کے بعد ہی متصلاً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح عمری تصنیف فرمائی جس میں اصلاً تو حضرت امام نانوتوی کے ضروری احوال نہایت درجہ اختصار کے ساتھ قلم بند فرما دیئے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے صدیق ورفیق حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی تعلیمی رفاقت کا ذکر بھی کرتے گئے — انہیں تفصیلات

میں یہ واقعہ بھی قلم بند ہو گیا کہ جس زمانے میں ان دونوں بزرگوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے کتب حدیث کی تعلیم پوری کی ہے اسی زمانے میں ان دونوں ہی بزرگوں نے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی کی اور سلوک شروع کر دیا۔

حضرت امام نانوتوی کی اس مختصر سوانح عمری کی اشاعت کے تقریباً پچیس سال بعد تک حضرت گنگوہی بقید حیات رہے اور ہر دو حضرات کی رفاقت وصداقت کے پیش نظر گمان غالب یہی ہے کہ حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اگر عذر نابینائی کی وجہ سے یہ سوانح ملاحظہ نہ فرما سکے ہوں گے تو بھی اسے سنا تو ضرور ہوگا اور اگر اس کی کوئی بات حضرت کو خلاف واقعہ لگی ہوگی تو اس پر متنبہ بھی ضرور فرمایا ہوگا—— مگر ایسی کوئی بات کہیں منقول نہیں ہے۔

پھر حضرت امام گنگوہی قدس سرہ کی وفات کے چند سال بعد تذکرۃ الرشید (سوانح حضرت گنگوہی قدس سرہ) منظر عام پر آئی اس کتاب میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے ''سلوک وتحصیل طریقت'' کے عنوان سے ص ۴۰ سے ص ۴۹ تک تقریباً دس صفحات میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی ''روداد بیعت'' قلم بند کی گئی ہے روداد کا بیشتر حصہ تو اصل متن کتاب میں مذکور ہے لیکن بعض بعض مقامات پر چند حاشیوں میں بھی انکشافات واطلاعات درج ہیں۔

تذکرۃ الرشید کے اس عنوان کے تحت حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی کی بیعت سے متعلق جو تفصیلات مذکور ہیں ان کی وجہ سے ان حضرات کی سیدھی سادی بیعت کا وہ معاملہ جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی تصنیف کردہ سوانح میں غیر اختلافی سمجھا جا رہا تھا ایک نہایت درجہ اہم اختلافی مسئلہ کی شکل میں سامنے آ گیا لیکن یہ اختلاف روایات شاید ایک عرصہ تک موضوع بحث نہ بن سکا تھا یہاں تک کہ پورا ایک دور اس طرح گزر گیا اور دونوں تذکروں میں دو علیحدہ علیحدہ روایات دبی پڑی رہیں۔

تذکرۃ الرشید کی اشاعت پر تقریباً پچاس سال گزرنے کو تھے کہ ارباب دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ذریعہ سوانح قاسمی تین جلدوں میں مرتب کرا کے اسے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ۱۳۷۳ھ میں شائع کر دیا۔

حضرت مولانا گیلانی کی نکتہ سنجی ودقیقہ رسی اہل علم واہل قلم میں مسلم ہے، موصوف نے شاید

پہلی بار اپنی مرتبہ سوانح قاسمی میں اس غیر ضروری قضیہ کو ایک ''مقدمہ'' کی صورت میں پیش کیا اور اپنے مخصوص انداز میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ کسی فیصلہ ونتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کامیابی کی صورت نظر نہیں آسکی تو تطبیق وتوجیہ کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب احقر کو اپنے مجوزہ ومفوضہ مقالہ نگاری کے دوران جب اس پیچیدہ مسئلہ کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت پڑی تو احقر کو بھی اس بیل کو منڈھے چڑھانا دشوار نظر آرہا ہے اور بجا طور پر یہ احساس ہو رہا ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ مولانا گیلانی ہی کر گئے ہوتے مگر افسوس کہ یہ کام ہو نہ سکا۔

اصل دشواری یہ ہے کہ یہ خالص تاریخی معاملہ ہے جو دو مختلف قسم کی عقیدت مندیوں کے حصار میں جکڑا ہوا ہے اگر تاریخی وروایتی معیار پر اس مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے (جو آئندہ سطور میں پیش خدمت ہوگا) مگر دشواری یہی ہوگی کہ اس فیصلہ میں غیر ضروری وبیجا عقیدت مندی کی قربانی ضرور ہو جائے گی۔

اصولی طور پر مقدمہ کا حل تو یہی ہوسکتا ہے کہ یہ مقدمہ دو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے متضاد روایات کا مقدمہ ہے جن میں تطبیق وتوجیہ کی راہ بالکل بند ہے ایسی صورت میں کوئی فیصلہ ہر دو روایات کے ضعف وقوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہئے جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔

اس اصول کے پیش نظر شاید ہی کوئی صاحب الرائے اہل علم اس فیصلہ سے اختلاف کرے کہ روایت کے ضعف وقوت کی جہت سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی روایت متعدد وجوہ سے لائق ترجیح اور قابل قبول ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت مصنف بذات خود ہیں جو ہر دو بزرگوں کے استاد زادے اور ہر وقت کے رفیق وجلیس بھی ہیں، ان کے استاد شریک بھائی بھی ہیں اور ان کے پیر بھائی بھی ہیں۔

اس کے برخلاف تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی روایت میں متعدد اضطرابات ہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب کو صحیح طور پر یہ بات بھی محفوظ نہیں ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کی ملاقاتیں بیعت سے پہلے کتنی ہوئیں اور کہاں اور کب ہوئیں۔

چنانچہ احقر نے تذکرۃ الرشید ص:۴۳ کے حاشیہ پر منقول ہوئی محمود حسن کی روایت کے ذکر

کے ساتھ اپنا رجحان ذکر کر دیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے مابین بیعت سے متعلق ایک مکالمہ ان حضرات کی طالب علمی ہی کے دور میں ہو چکا تھا جس نے حضرت گنگوہی کو یکسو کر کے حضرت حاجی صاحب سے وابستہ ہونے کے لیے پوری طرح آمادہ کر دیا تھا جس کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اس مکالمہ کے بعد ہی اثنائے طالب علمی میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔

ایسی صورت میں حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تاخیر بیعت کی کوئی معقول وجہ نہ تو کسی نے بیان کی ہے اور نہ ہی سمجھ میں آتی ہے۔ احقر کو اپنے قصور علم وفہم کا اعتراف ہے اور کسی طرح اپنے چھوٹے منہ سے کوئی بڑی بات کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے، پھر معاملہ بھی ایسا ہے جس سے لوگوں کی عقیدت مندیاں وابستہ ہیں لیکن آیت کریمہ اعدلوا هو اقرب للتقویٰ اور مقولہ حکیمانہ: ''انصاف شیوۂ ایست کہ بالائے طاعت است'' پر عمل کرتے ہوئے احقر نہایت ادب کے ساتھ اس صاف گوئی کی اجازت چاہتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کی متنازعہ روایت میں احقر کے نزدیک کچھ خلط ہو گیا ہے اور دو مختلف واقعات کو ایک ہی روایت میں جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان حضرات کی بیعت کا سیدھا سادہ معاملہ ''عقدہ لاینحل'' بن کر رہ گیا ہے۔

احقر کے فہم ناقص کے مطابق صورت واقعہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان ہر دو حضرات کی بیعت کا زمانہ تو زمانۂ تعلیم ہی میں مانا جائے جیسا کہ ان حضرات کے ہمہ وقتی جلیس ورفیق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ارشاد فرما رہے ہیں اور حضرت شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ سے مناظرہ کے واقعہ کو واقعۂ بیعت سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

اس مرتبہ کی حاضری جو اصلاً بہ نیت مناظرہ ہی تھی لیکن حضرت حاجی صاحب کی ناپسندیدگی کے بعد آپ نے اچانک اصلاح اخلاق اور سلوک طریقت کا فیصلہ فرما لیا اور امروز وفردا پر ٹلتے ٹلتے یہ قیام پورے ایک چلہ تک ممتد ہو گیا جو لوگ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ابتدائی بیعت سے باخبر نہ تھے انہیں یہی اندازہ ہو سکا کہ آپ نے اس موقع پر بیعت کی ہے۔

تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیوں کی روایات کو اگر بعینہٖ طور پر درست وصحیح مان لیا جاتا ہے تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جن کی مختصر سوانح عمری اور سوانح مخطوطہ وغیرہ کے کتنے ہی مندرجات بے محل ہو جائیں گے جن میں حضرت امام نانوتوی کے وہ مجاہدات وریاضات بڑی تفصیل

سے بیان کئے گئے ہیں جو حضرت امام نے قیام دہلی کے زمانے میں انجام دیئے تھے (جن کا ذکر عنقریب ملاحظہ میں آئے گا)

تذکرۃ الرشید میں اس بحث سے متعلق جو مندرجات ہیں ان میں کا بیشتر حصہ تو مولانا عاشق الٰہی کے ''مدرجات'' کی وجہ سے بڑی حد تک اپنی استنادی حیثیت سے کمزور ہو گیا ہے لیکن ص:۴۶ کے حاشیہ کا درج ذیل فقرہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ذات والا صفات تک مرفوع ہو جانے کی وجہ سے پوری طرح مستند ہے کہ:

> چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔(۱۹)

صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات حضرت امام گنگوہی کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات بطور تفنن و مزاح دوستانہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ''مُیری'' اور ''پھسڈّی'' والے جذبہ کا کوئی ادنی شائبہ بھی دور دور تک نہیں ہے۔

علاوہ ازیں صرف مذکورہ بالا روایت میں پوری پوری گنجائش اس بات کی موجود ہے کہ اسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی سوانح عمری والی روایت کے ساتھ جمع کر لیا جائے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے اس کی تفصیل یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ ہر دو بزرگوں کی بیعت زمانہ طالب علمی ہی میں ہو گئی ہو اور ان دونوں کی بیعت میں فی الجملہ تقدم و تاخر بھی ہو گیا تو کسی کو کیا اشکال ہے اوپر یہ بات اشارتاً عرض کر آیا ہوں کہ حضرت امام کے شاکلہ اور افتاد طبع کا تقاضا ہی یہی تھا کہ وہ جس طرح علم و حکمت کا ننگ و نام اپنے لئے پسند نہیں فرماتے تھے تو مرید ہو کر پیر بننے کے امکانات کو کیسے ہنسی خوشی اور جلدی سے گوارا فرما سکتے تھے۔

سوانح قاسمی کا یہ الجھا ہوا معاملہ جو بالکل غیر ضروری طور پر نزاعی موضوع بحث بن گیا تھا، اوپر کی معروضات میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کا قابل اطمینان حل نکل آئے۔

خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے جہاں تک احقر کے فہم ناقص کی رسائی ہے یہی

---

(۱۹) حاشیہ ص:۴۶ تذکرۃ الرشید

سمجھ میں آتا ہے کہ معروضات بالا میں ہر دو بزرگوں کی بیعت کا معاملہ اور پھر ان میں تقدم وتاخر کی غیر ضروری بحث اطمینان بخش طور پر صاف ہوگئی ہے۔

اس موقع پر احقر کی کوشش یہی رہی ہے کہ اس گتھی کو حل کرنے میں بنیادی اہمیت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح قاسمی کو دی جائے کہ اس سوانح کی اہمیت اور اس کی استنادی حیثیت کو تذکرۃ الرشید کی وجہ سے چیلنج بہر حال نہیں کیا جانا چاہئے راقم السطور احقر کو بات کے اسی پہلو پر اصرار ہے اور احقر بڑی حد تک پر امید بھی ہے کہ احقر کا یہ جذبہ واحساس انشاء اللہ تعالیٰ عند اللہ بھی قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کی ابتدا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح کے مطابق تو یہ بتائی جا چکی ہے کہ دہلی کے قیام اور طالب علمی ہی کے زمانے میں حضرت امام نانوتوی وحضرت امام گنگوہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی ہو گئے تھے اور اسی وقت سے سلوک بھی شروع فرما دیا تھا— لیکن احقر نے زیر نظر مقالہ کی ترتیب کے دوران جب بہ نظر غائر سوانح قاسمی اور اس سلسلہ کی دوسری تحریرات دیکھیں تو احقر راقم اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مجموعی حالات پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ بادی النظر میں آپ نے متعدد حضرات اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب بھی تہ کیا اور اگرچہ آپ نے بظاہر حضرت حاجی صاحب سے بیعت بھی کی اور حضرت کی تلقین کے مطابق ذکر واشغال ومجاہدہ وریاضات بھی کئے لیکن ان تمام مصروفیات ومشغولیات کے پس پردہ آپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

راقم السطور نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تحصیل علم اور آپ کے سلوک طریق کی تفصیلات کو متعدد بار بغور پڑھا تو احقر بھی اسی نتیجہ تک پہنچا ہے جسے مولانا گیلانی صاحب نے سوانح قاسمی میں بار بار دہرایا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ذات والا صفات اللہ تعالیٰ کی شان اجتبائی کا ایک خاص مظہر تھی، احقر کو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضرت امام نانوتوی صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ اپنے سلوک واحسان کے نتیجہ میں ''جامع العلمین'' اور ''مجمع البحرین'' بھی تھے۔

حضرت امام نانوتوی کے علوم ومعارف اور منازل ومقامات صرف ان کے کسب واکتساب ہی کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ان کا بڑا حصہ وہبی ولدنی بھی تھا جو براہ راست من جانب اللہ حضرت والا کے قلب

مبارک پر فائض و وارد ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے براہ راست حضرت امام قدس سرہ سے استفادہ کیا ہے ان کی شہادت یہی ہے کہ آپ کی تقریر درس میں جو علوم و معارف بیان ہوتے تھے وہ کسی کتاب سے ماخوذ و منقول نہیں ہوتے تھے۔

حضرت امام قدس سرہ کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات کا بیشتر حصہ اگرچہ پردۂ خفا میں ہے کیونکہ آپ کی کتب درسیہ کی خواندگی کا صحیح طور پر پورا تسلسل مختصر سوانح عمری میں بیان نہیں ہوسکا ہے مگر جو کچھ بھی تفصیلات موجود و منقول ہیں انہیں دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کی درسی کتب کے تسلسل میں جہاں کہیں بھی کچھ خلا محسوس ہوتا ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ شاید درمیان کی کوئی درسی کتاب خواندگی سے رہ گئی ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ آپ کی علمی صلاحیت و استعداد جس انداز پر سامنے آئی اسے دیکھتے ہوئے صاف دکھائی دیتا ہے کہ درمیان کی کسی درسی کتاب کی ناخواندگی نے حضرت کی تعلیمی استعداد کو کسی طرح بھی تو متاثر نہیں کیا ہے۔

حضرت امام کی ''علمی عبقریت'' کو سمجھنے کے لئے حضرت کی طالب علمی کے دور کی صُرف دو مثالیں لائق توجہ و قابل غور ہیں۔

(۱) پہلی مثال تو تعلیم اقلیدس کی ہے کہ عربک کالج دہلی میں جس سال حضرت امام نانوتوی تعلیم کے لئے داخل ہوئے ہیں اسی سال اس کالج کے لئے ایک نیا نصاب تعلیم تجویز ہوا تھا جس میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی شامل کر لئے گئے تھے۔

نصاب تعلیم کی اس تبدیلی کے نتیجہ میں حضرت امام نانوتوی کو ریاضی اور اقلیدس بھی وہاں پڑھنا تھی مگر پڑھائی کا یہ مرحلہ کس طرح طے ہوا تھا؟ اسی پہلو کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی فرماتے ہیں:

> والد مرحوم مولانا مملوک العلی نے مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) سے فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔ (۲۰)

(۲) دوسری مثال سوانح قاسمی ص ۲۶۳ پر ارواح ثلثہ کے حوالہ سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مندرجہ ذیل روایت نقل کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۲۰) سوانح قاسمی ص: ۲۲۴

علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدرالدین صاحب ہوئے اور مولانا (محمد قاسم) کا ''صدرا'' کا امتحان ان کے پاس گیا، انہوں نے کوئی جگہ پڑھوائی مولانا کے ذہن میں اس کا مطلب نہ تھا کیونکہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی اور خود جان رہے تھے کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کئے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا لیا لیکن (دل ہی دل میں) اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے، بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آ گیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ''یہ بات'' فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ ہاں! یہی تو پوچھتا تھا۔(۲۱)

تعلیمی زندگی کی یہ دونوں ہی مثالیں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''عبقریت'' اور ''فطری علمی مناسبت'' کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اسی قسم کی متعدد مثالیں حضرت امام نانوتوی کے سوانح وحالات کے درمیان موجود ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے اس لئے ان تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔

حضرت امام نانوتوی کی عبقریت وفطری علمی مناسبت کو دیکھ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ سوانح قاسمی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوال پہلے بھی لوگوں کو پیش آ چکا تھا ۔مولانا گیلانی ناقل ہیں:

> حکیم الامت تھانوی قدس سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے مصنف امام کے حوالہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان (مولانا محمد یعقوبؒ) سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مولانا (یعنی مولانا محمد قاسم) کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے؟ اسی سوال کے جواب میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے منجملہ دوسرے اسباب ووجوہ کے یہ بھی فرمایا کہ:
>
> مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے۔(۲۲) مولانا گیلانی اس اقتباس کے بعد فرماتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے مولانا محمد یعقوب صاحب باضابطہ فن طب کے ماہر

---

(۲۱) ارواح ثلثہ ص:۱۹۶۔ (۲۲) قصص الاکابر ص ۳۰ بابت جمادی الاولیٰ ۵۷ھ

اور استاذ تھے، مولانا مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور رفیق تھے ان کی یہ شہادت کہ فطری طور پر مولانا کے قویٰ اور مزاج دونوں معتدل تھے، میرے نزدیک تو صرف یہی ایک فقرہ حضرت نانوتوی کی جسمانی خصوصیات اور ان غیر معمولی خداداد نعمتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہے جن سے آپ نوازے گئے تھے۔ (۲۳)

اس سلسلہ میں اپنی کچھ عرض معروض کرنے سے پہلے حضرت مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی ہی کے حوالہ سے حضرت حکیم الامہ تھانوی قدس سرہ کا ایک اور ارشاد جو اوپر مذکور ارشاد ہی کا تتمہ تکملہ ہی کہا جاسکتا ہے وہ بھی عرض کر دینا برمحل ہوگا مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اسی موقع پر یعنی آپ کے قویٰ اور مزاج کے اعتدال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے بعض مذاکروں میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے ''مصنف امام'' نے یہ بھی کہا کہ اور حسب سنۃ اللہ اعتدال مزاج سے ''نفس کامل'' فائض ہوتا ہے۔ (۲۴)

حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالہ سے اپنے مصنف امام قدس سرہما کا ارشاد گرامی نقل کرنے کے بعد مولانا گیلانی اس کی مزید تشریح اور تائید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یہ اس زمانے کے مدرسی فلسفہ یا مشائی علماء کے طریقۂ فکر کی ایک تعبیر ہے، مادے میں جتنی زیادہ بہتر استعداد اور صلاحیت ہوتی ہے، ''واجب اول'' یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے فیضان بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کرنے کے لوگ اس زمانے میں عادی تھے، لیکن ایمانی حکمت کی رو سے درحقیقت حضرت نانوتوی کی اجتبائیت (برگزیدۂ حق ہونے) ہی کا ایک معاصرانہ اقرار ہے، ہمارے یہاں جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مادے میں قابلیت اور استعداد بھی دادِ حق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۵)

اسی سوانح قاسمی میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے حوالہ سے ایک قصہ لکھا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ:

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا سننے والوں میں سے

---

(۲۳) سوانح قاسمی ص: ۱۵۴۔ (۲۴) ص: ۲۵ قصص بحوالہ سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۱۶۷۔ (۲۵) سوانح قاسمی ص: ۱۶۸

کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، یہ سن کر مصنف امام نے فرمایا:

جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے— جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت میں پھوٹ پڑتا ہے مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

''مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا ہے اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے۔''(۲۶)

حضرت امام نانوتوی کے خداداد علم کی یہ مندرجہ بالا کیفیت سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے خود حضرت امام کے فرمائے ہوئے الفاظ میں یوں نقل فرمائی ہے فرماتے ہیں:

آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضے بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں۔ (۲۷)

اسی سلسلہ میں ''ارواح ثلثہ'' میں منقول حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہ کا یہ بیان بھی یہاں نقل کر دینا یقیناً برمحل ہوگا کہ:

چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے اسی مجمع میں (حضرت مولانا محمد یعقوب) فرمانے لگے کہ بھائی آج تو صبح کی نماز میں، ہم مر جاتے بس کچھ ہی کسر رہ گئی لوگ حیرت سے پوچھنے لگے آخر کیا حادثہ پیش آیا؟ سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرما رہے تھے کہ آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گزرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے— کہتے تھے کہ وہ تو خیر گزری کہ وہ دریا جیسا اک دم آیا تھا ویسا ہی نکلا چلا گیا اس لئے میں بچ گیا— آگے یہ بھی ارشاد گرامی منقول ہے کہ نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں

(۲۶) ص:۲۹، الہادی جمادی الثانیہ ص: ۲۵۷۔ (۲۷) سوانح قدیم ص: ۳۵ مشمولہ سوانح قاسمی ص ۳۵

اور تحمل دشوار ہو جائے — اسی سلسلہ میں حضرت مصنف امام نے حضرت امام نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کیے ہوئے ہوگا۔ (۲۸)

سطور بالا میں حضرت امام نانوتوی کی وسعت قلب اور کثرت علوم کی شہادات حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حوالہ سے نقل کی گئیں جو حضرت امام نانوتوی کے استاد زادہ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کے شاگرد بھی تھے، اس لئے ممکن ہے کسی کو ان بیانات وشہادات میں سعادت مند شاگرد کی بیجا عقیدت مندی کا خیال گذرے، اس خیال سے آئندہ سطور میں حضرت امام نانوتوی کے حقیقی مقام شناس معاصر فقیہ النفس حضرت محدث گنگوہی کا بھی ایک ارشاد نقل کیا جا رہا ہے۔

ملفوظات حکیم الامت کے مجموعہ حسن العزیز ص ۳۸۲ کے حوالہ سے معارف الاکابر (ناشر ادارۂ اسلامیات لاہور) کے ''معارف نانوتوی'' کے تحت حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی کو ''شہباز عرش'' فرمایا ہے حکیم الامت نے فرمایا ایک جگہ مولانا محمد قاسم وعظ فرما رہے تھے مولانا گنگوہی بھی شریک تھے ایک بولے کہ خیر وعظ کی مجلس میں بیٹھنے کا ثواب تو ہو گیا، باقی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اگر مولانا کچھ عام فہم مضامین بیان فرمایا کریں تو کچھ نفع بھی ہو، مولانا گنگوہی سن رہے تھے فرمایا کہ افسوس ہے ''شہباز عرش'' سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اڑے۔

حضرت محدث کبیر مولانا گنگوہی قدس سرہ کا یہ ایک فقرہ جو نہایت بلیغ تشبیہ پر مشتمل ہے حضرت امام نانوتوی کے بلند علمی مقام کو سمجھانے کے لئے بہت کافی ہے، حضرت محدث گنگوہی کے اس ''بلیغ فقرہ'' کی حقیقت حضرت مصنف امام کے بیان فرمائے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے جسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دار العلوم دیوبند کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے

---

(۲۸) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۳۴۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا اس وقت حضرت مولانا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرہ میں تھے اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی مولانا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ "نازل" ہو کر تقریر فرمایئے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی جس کے لفظ مانوس تھے مگر معانی قطعاً بلند اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا کچھ اور نازل ہو کر فرمایئے پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی جو کچھ قریب الفہم آ گئی تھی مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی وقت پوچھیئے گا۔ (۲۹)

گذشتہ صفحات میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی غزارت علم وہبی کی کچھ تفصیلات پیش کر دی گئی ہیں اب آئندہ صفحات میں حضرت امام کی طہارت قلب وصفائی باطن پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جس سے راقم السطور کا یہ دعویٰ پورے طور پر مبرہن ہو جائے گا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ جامع العلمین ومجمع البحرین بھی تھے۔

سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی علیہ الرحمہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فطری عالم وسالک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار حضرت والا قدس سرہ کے لئے "اجتبائی" اور "اجتبائیت" کا فقرہ استعمال کیا ہے مگر وہ اپنی نکتہ آفرینی کی حد سے آگے بڑھ کر بطور جزم اس کو اپنے اذعانی واعتقادی انداز میں پیش کرتے ہوئے جھجک بھی محسوس کرتے نظر آتے ہیں، موصوف کی اس کیفیت کو راقم السطور نے سوانح قاسمی کے صفحات میں بار بار محسوس کیا اور موصوف کی اس کشمکش کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو اصغر کا یہ شعر یاد آتا رہا:

بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں ۔۔۔ نہ کامیاب ہوا اور نہ رہ گیا محروم

راقم السطور حضرت امام قدس سرہ کے حالات وسوانح کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے وہ بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یوں عرض کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے حضرت امام نانوتوی كُلُّ مولودٍ يُولَدُ على الفطرة کے مکمل اور صحیح مصداق تھے جس کی تائید حضرت مولانا محمد

---

(۲۹) ارواح ثلثہ ص ۱۹۷، سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۴۱۴

یعقوب صاحب نانوتوی کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو اوپر نقل کیا جاچکا ہے کہ:

مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے ــــــ اور حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے "نفس کامل" فائض ہوتا ہے۔

معارف الاکابر میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہ ملفوظ مزید تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:

اس میں کئی چیزوں کو دخل ہے ایک تو مولانا طب کی رو سے معتدل مزاج تھے اس سے اس پر نفس کامل فائض ہوا دوسرے یہ کہ استاد بڑے کامل ملے یعنی مولانا مملوک العلی صاحب جن کا علم و فضل مخفی نہیں تیسرے یہ کہ آپ متقی اعلیٰ درجے کے تھے۔ پھر ان میں استاد کا ادب بہت تھا (اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت امام حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کا بھی نہایت ادب فرماتے تھے صرف اس وجہ سے کہ ان کے بڑے بھائی مولانا مہتاب علی صاحب امام نانوتوی کے استاد تھے اس کے علاوہ یہ وجہ تھی کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے اپنی بیماری میں کافیہ کا ایک سبق مولانا ذوالفقار علی صاحب کے ذریعہ پڑھوا دیا تھا پھر پیر بھی بڑے کامل ملے یعنی حضرت حاجی صاحب۔ (۳۰)

اس بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ تحصیل علوم و فنون اور تحصیل عرفان و احسان کے سلسلہ میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی جو کچھ "چلت پھرت" اور "بھاگ دوڑ" کے حالات ہمیں حضرت کی سوانح میں ملتے ہیں وہ سب درحقیقت حضرت امام کے "علم لدنی" اور "پیدائشی ولایت" پر ایک طرح کا پردہ ہیں اور یہ پردے بھی اللہ تعالیٰ نے اس لئے ڈال دیئے ہیں کہ حضرت امام کی سب سے بڑی خواہش دلی یہی تھی کہ وہ گمنام رہیں اور گمنام ہی چلے جائیں:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　　می دہد یزداں مرادِ متقیں

پھر حضرت امام نانوتوی کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردوں میں بھی صورت یہ ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کا پردہ علم حضرت کے سلوک و عرفان کے لئے بڑا پردہ بن گیا اور حضرات صوفیہ کے مقولہ "العلم الحجاب الاکبر" کا مصداق سامنے آ گیا۔

---

(۳۰) معارف الاکابر ص: ۲۳۲۔

حضرات اہل طریق کی تصریحات کے مطابق اگر غور کیا جائے تو سلوک وتصوف کی بنیاد دو چیزوں پر ہے: اخلاص (واحسان) اور تقویٰ۔

تقویٰ کے مفہوم میں اس درجہ وسعت وگنجائش ہے کہ جملہ اوامر ومندوبات کا امتثال اور جملہ نواہی ومکروہات سے اجتناب، یہ دونوں ہی اس کے مفہوم میں داخل ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا حضرت امام کا زہد وتقویٰ ہمارے علمائے اکابر دیوبند میں مسلم اور متفق علیہ ہے اور حضرت کی کتب سوانح میں اس کی مثالیں مذکور ہیں۔ چنانچہ معارف الاکابر میں حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات (۳۱) کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

> فرمایا: بزرگوں نے مشتبہ مال سے بچنے کا بڑا اہتمام کیا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی ایک شخص نے دعوت کی، کھانا مشتبہ تھا آپ نے اس کی دلجوئی کے لئے کھا تو لیا مگر گھر پر آکر قے کر کے سب نکال دیا۔
>
> اس سے ایک طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ تناول کا ارتکاب تو ہو ہی چکا تھا جو مذموم ہے، پھر ایسا کرنے سے کیا نفع ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ایک فعل تو ہے کھانا وہ تو بے شک واقع ہو چکا مگر دوسری چیز ہے جزو بدن بننا، جزو بدن بننے سے جو ظلمت ہوتی اس سے بچاؤ کیا، جیسا کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے خبری میں اجرت کہانت کا دودھ پی لیا تھا جس پر کوئی مواخذہ نہ تھا (کہ بے خبری میں کیا تھا) مگر پھر بھی خبر ہونے کے بعد قے کر دی، اس کا بھی یہی نفع تھا۔ (۳۲)

حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ کے ملفوظات ہی میں یہ ارشاد بھی ہے:

> فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب جب مدرسہ دیوبند کے دوات قلم سے کوئی خط لکھتے تھے تو روشنائی اور قلم کے استعمال کے عوض میں ایک پیسہ دے دیتے تھے۔ (۳۳)

حضرت امام نانوتوی کے تقویٰ کی مثال میں وہ مشہور واقعہ بھی اسی موقع پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لاکر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

---

(۳۱) الافاضات الیومیہ ج ۲، ص: ۳۰۰۔ (۳۲) معارف الاکابر ص: ۲۴۶۔ (۳۳) الکلام الحسن بحوالہ معارف الاکابر ص: ۲۷۴

—— غلام نرگسِ مست تو تاجدارانند —— کے مطلع والی سنوائیں حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہنچی تھی کہ بیچارہ گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ: ''آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے''

(حاشیہ پر یہ تفصیل دی گئی ہے) امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا؟ جواب میں کہا کہ بھائی صاحب گانے میں آگے پڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھ دی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ (۳۴)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی نام ان کا عبداللہ خاں تھا۔ گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر فرما رہے ہیں کہ:

میرا ایماء معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی؟ اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ میں جس طرح ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں، اسی طرح ''مولویت'' کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے (ص:۱۷۶)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بلند مقام تقویٰ سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے راقم السطور کو بڑی شدت سے اس نمایاں تبدیلیٔ احوال کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دو ایک ہی جملے اس تبدیلیٔ احوال سے متعلق بھی قلم بند کر دے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یادگار تذکار منانے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے حضرت امام کی مکمل حیات کا صحیح نقشہ اپنے اصل خد و خال کے ساتھ آجائے۔

قابل غور اور لائق عبرت ہے کہ بانیٔ دار العلوم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ تو حضرت حافظ شیرازی کی ایک غزل کو بھی لہجہ و راگ اور خوش الحانی کے انداز میں سننے کے صرف یہی نہیں کہ روادار نہیں ہوئے بلکہ اس کے لئے اس کرامت کے اظہار پر بھی مجبور ہو گئے جسے عام حالات میں حضرت

---

(۳۴) ارواح ثلثہ ص:۱۷۶۔

امام چھپانے ہی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور آج صورت حال اس سے کس درجہ مختلف ہو چکی ہے کہ اب اسی دارالعلوم دیوبند کے فارغین وفاضلین کی خاصی تعداد ٹی، وی جیسی منکر چیز کو اپنے گھروں میں ساتھ رکھتی اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے زمین وآسمان اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی؟

حضرت امام قدس سرہ کے سلوک کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے راقم السطور عرض کر آیا ہے کہ سلوک کی بنیادی چیزیں دو ہیں۔ سطور بالا میں حضرت کے تقویٰ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، آئندہ سطور میں حضرت امام قدس سرہ کے اخلاص واحسان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ان مکاتیب تک راقم السطور کی رسائی آج (۱۹ر جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۹۹ء) تک نہیں ہو سکی ہے جو حضرت امام نے اپنے مسترشدین کو لکھے ہیں اس لئے حضرت والا کے سلوک واحسان کی ترجمانی کا حق تو ادا کرنا حد درجہ مشکل ہے، امام موصوف کے ایسے گرامی نامے صرف معدودے چند ہی دستیاب ہوئے جن میں سے دو مکتوب مقالہ زیر نظر کے شروع میں نقل کئے جا چکے ہیں، تین مکتوب گرامی یہاں نقل کئے جا رہے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مکتوب گرامی بنام شیخ ضیاء الحق عثمانی (خویش حضرت حاجی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند)

برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون اینکہ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے، استغفار ولاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو ''عملیات'' میں دخل نہیں، ہاں اس سے پہلے پہلے قرض وکشائش کے لئے حَسْبِیَ اللہ وَنِعْمَ الوکیل اور لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ ولا ملجأ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا الیہ پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول وآخر درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل وزبان سے عرض مطلب کر رہا ہوں، الراقم محمد قاسم عفی عنہ (۳۵)

(۲) مکتوب گرامی قاسمی بنام مرزا محمد عالم بیگ صاحب

---

(۳۵) مکتوبات اکابر ص: ۵۳۔

— غلام نرگسِ مست تو تاجدارانند — کے مطلع والی سنوائیں حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہنچی تھی کہ بیچارہ گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ: ''آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے''

(حاشیہ پر یہ تفصیل دی گئی ہے) امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا؟ جواب میں کہا کہ بھائی صاحب گانے میں آگے پڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھ دی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ (۳۴)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی نام ان کا عبداللہ خاں تھا۔ گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر فرما رہے ہیں کہ:

میرا ایماء معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی؟ اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ میں جس طرح ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں، اسی طرح ''مولویت'' کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے (ص:۱۷۶)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بلند مقام تقویٰ سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے راقم السطور کو بڑی شدت سے اس نمایاں تبدیلیٔ احوال کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دو ایک ہی جملے اس تبدیلیٔ احوال سے متعلق بھی قلم بند کردے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یادگار تذکار منانے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے حضرت امام کی مکمل حیات کا صحیح نقشہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ آجائے۔

قابل غور اور لائق عبرت ہے کہ بانیٔ دارالعلوم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ تو حضرت حافظ شیرازی کی ایک غزل کو بھی لہجہ وراگ اور خوش الحانی کے انداز میں سننے کے صرف یہی نہیں کہ روادار نہیں ہوئے بلکہ اس کے لئے اس کرامت کے اظہار پر بھی مجبور ہو گئے جسے عام حالات میں حضرت

---

(۳۴) ارواح ثلثہ ص:۱۷۶۔

امام چھپانے ہی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور آج صورت حال اس سے کس درجہ مختلف ہو چکی ہے کہ اب اسی دار العلوم دیوبند کے فارغین وفاضلین کی خاصی تعداد ٹی، وی جیسی منکر چیز کو اپنے گھروں میں ساتھ رکھتی اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے زمین وآسمان اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی؟

حضرت امام قدس سرہ کے سلوک کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے راقم السطور عرض کر آیا ہے کہ سلوک کی بنیادی چیزیں دو ہیں۔ سطور بالا میں حضرت کے تقویٰ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، آئندہ سطور میں حضرت امام قدس سرہ کے اخلاص واحسان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ان مکاتیب تک راقم السطور کی رسائی آج (۱۹ر جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۹۹ء) تک نہیں ہو سکی ہے جو حضرت امام نے اپنے مسترشدین کو لکھے ہیں اس لئے حضرت والا کے سلوک واحسان کی ترجمانی کا حق تو ادا کرنا حد درجہ مشکل ہے، امام موصوف کے ایسے گرامی نامے صرف معدودے چند ہی دستیاب ہوئے جن میں سے دو مکتوب مقالہ زیر نظر کے شروع میں نقل کئے جاچکے ہیں، تین مکتوب گرامی یہاں نقل کئے جارہے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مکتوب گرامی بنام شیخ ضیاء الحق عثمانی (خویش حضرت حاجی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دار العلوم دیوبند)

برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون اینکہ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے، استغفار ولاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو ''عملیات'' میں دخل نہیں، ہاں اس سے پہلے پہلے قرض وکشائش کے لئے حَسْبِیَ اللہ وَنِعْمَ الوکیل اور لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ ولا ملجأ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا الیہ پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول وآخر درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل وزبان سے عرض مطلب کر رہا ہوں، الراقم محمد قاسم عفی عنہ (۳۵)

(۲) مکتوب گرامی قاسمی بنام مرزا محمد عالم بیگ صاحب

---

(۳۵) مکتوبات اکابر ص: ۵۳۔

سراپا عنایت سلامت! السلام علیکم آج گیارہویں رمضان کو آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے۔ استغفار اور لاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کی ادائیگی کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو عملیات میں دخل نہیں، اگر ہو سکے تو جناب مولوی اکبر علی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حال عرض کر دو ادائے قرض کے لئے جو کچھ فرمائیں اس کی تعمیل کرو اور کشائش رزق کے لئے جو کچھ ارشاد فرمائیں اس کو یاد رکھو، ہاں اس سے پہلے **حسبی اللہ و نعم الوکیل** اور **لاحول ولا قوۃ الا باللہ ولا ملجأ ولا منجی من اللہ الا الیہ** پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول و آخر گیارہ بار درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل و زبان دونوں سے عرض مطلب کر رہا ہوں۔

مرزا قادر بیگ صاحب مرزا محمد نبی بیگ صاحب کو یاد رہے تو سلام کہہ دینا اور سوائے ان کے اور کوئی احباب میں مل جائے اور یاد آ جائے تو ان کو بھی، فقط (۳۶) اس مکتوب پر نام و دستخط اور تاریخ تحریر بھی درج نہیں ہے ناقل رومی)

(۳) سراپا عنایت مرزا محمد عالم بیگ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم آج پندرہویں تاریخ (مہینہ مذکور نہیں ہے) جمعہ کو تمہارا خط پہنچا کیفیت حال معلوم ہوئی پچھلے دنوں اثنائے سفر میں بیمار ہو گیا تھا اس مرض سے شفا تو اثنائے راہ ہی میں ہو گئی تھی مگر جب سے کسی نہ کسی قسم کی خلش چلی جاتی ہے، اسی میں کھانسی کی شدت ہو گئی دو تین مہینے اس کی تکلیف رہی اب بفضلہ تعالیٰ اس کو بھی آرام ہے یوں ہی برائے نام باقی ہے انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی رفع ہو جائے گی غرض اب میں اچھا ہوں۔

باقی کی ہوس دنیا کے لئے یادگاری موت سے بہتر کچھ نہیں، ہو سکے تو ہر روز گھڑی آدھ گھڑی موت کے تصور میں گذار دیا کرو اور اس وقت اس قسم کا خیال رکھا کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جس قدر انبیا ہوئے وہ سب مر گئے (وفات پا گئے) جس قدر بادشاہ اس زمانے سے پہلے ہوئے وہ سب مر گئے، بہ زور دین کوئی چھوٹتا تو انبیا چھوٹتے اور بہ زور دنیا کوئی بچتا تو بادشاہ

---

(۳۶) ماخوذ از مکتوبات قاسمی نسخہ قدیم۔

بچتے میں نہ اِلی الذی نہ اولا الذین نہ زور دینی نہ زور دنیا میں، بچوں تو کیوں کر؟ پھر اس کے ساتھ قیامت کے حساب و کتاب اور عذاب وثواب کو سوچا کرو فقط (۳۷) (اس مکتوب پر بھی نام و دستخط درج نہیں ہے۔ ناقل رومی)

تعلیقات

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تین مکتوبات اوپر نقل کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے دو مکتوب میں حضرت امام والا مقام نے ہر دو مکتوب الیہ کو "مراقبہ احسانی" کی تلقین فرمائی ہے اور تیسرے مکتوب میں ہوس دنیا کی کمی کے لئے "مراقبہ موت و مراقبہ قیامت" تجویز فرمایا ہے۔

احقر راقم السطور نے اس قسم کے مکتوبات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا ہے کہ حضرت امام نانوتوی کی تعلیم و تربیت کا انداز کتاب وسنت کی تعلیمات ہی پر مبنی تھا حضرات صوفیائے کرام کے مابین مروج وظائف و عملیات کی تعلیم و تلقین حضرت کی تعلیمات میں نہیں ملتیں جو شخص بھی حضرت سے اس قسم کے عملیات دریافت کرتا آپ صاف الفاظ میں اپنی لاعلمی ظاہر فرماتے ہوئے تحریر فرما دیتے کہ کسی عامل سے پوچھئے مجھ کو عملیات میں دخل نہیں۔

حضرت امام گرامی کے ان مکتوبات میں اپنے مسترشدین کو "مراقبۂ احسانی" کی تلقین و تاکید دیکھ کر احقر کو تو کچھ ایسا لگا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں صرف پڑھنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے گنا بھی تھا جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے اپنی ملاقات کے تذکرہ میں فرمایا ہے کہ:

> ایک بار از راہ شفقت دریافت فرمایا کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟ حضرت حکیم الامت پر اس قدر رعب وداب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے، پھر مولانا (امام نانوتوی) نے دوسری باتیں شروع کیں تاکہ ہیبت کا اثر کم ہو جائے اور حضرت حکیم الامت کی طبیعت کھل جائے ــــ چنانچہ (کچھ دیر بعد) فرمایا کہ:
>
> ایک ہوتا ہے پڑھنا اور ایک ہوتا ہے گننا، محض پڑھنا کافی نہیں، گننے کی ضرورت ہے، پھر ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک حافظ ہدایہ تھے مگر سمجھ کر نہیں پڑھی تھی جنہوں نے سمجھ کر پڑھی تھی کہا کہ ایک مسئلہ

---

(۳۷) ماخوذ از مکتوبات قاسمی قدیم نسخہ۔

ہدایہ میں ہے، حافظ ہدایہ نے انکار کیا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں نہیں ہے میں ہدایہ کا حافظ ہوں مگر جب دوسروں نے کتاب کھول کر عبارت پڑھ کر استنباط کیا تو حافظ ہدایہ حیران رہ گئے اتنا فرما کر حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔ (۳۸)

حضرت امام کے اس ارشاد کی روشنی میں یہی سمجھا جانا چاہئے کہ امام موصوف نے خود بھی اپنے زمانۂ تعلیم میں محض پڑھنے پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے پوری طرح گنا بھی تھا اور شاید اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ حدیث جبرئیل میں آئی ہوئی تشریح ''احسان'' کا مراقبہ حضرت کی تعلیم وتربیت کا بنیادی نقطہ اور مرکزی خیال بن گیا اور اپنے ہر مسترشد کو حضرت امام نے اس کی تلقین وتاکید فرمانا ضروری خیال فرمالیا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے اصلاحی وتربیتی مکاتیب اگرچہ زیادہ نہیں مل سکے ہیں مگر جو چند خطوط دستیاب ہوئے ہیں انہی کے ذریعہ احقر راقم السطور اس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے، احقر کو تو صورت حال کچھ اس طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے پہلی ہی بار جب حدیث جبرئیل میں ''ماالاحسان'' کا جواب پڑھا ہوگا اسی وقت سے پڑھنے کے دوسرے درجہ ''گننے'' کی بھی تکمیل فرما کر باقاعدہ طور پر عملی مشق بھی شروع فرمادی ہوگی اور پھر نتیجہ یہی ہوا ہوگا کہ یہ ''کیفیت احسانی'' حضرت کا ملکہ راسخہ بن گئی ہوگی۔

سطور بالا میں حدیث جبرئیل میں آئے ہوئے ''ماالاحسان'' کے سوال کا ذکر بار بار آچکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے یعنی اَنْ تَعْبُدَ اللہ کاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاه فَاِنَّه يَرَاكَ (تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ (یہ بات تو بہرحال یقینی ہی ہے کہ) اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں بہرحال دیکھ رہا ہے) حدیث کے اس جواب سے متعلق کچھ ضروری توضیح وتشریح بھی یہاں کردی جائے۔

احقر نے مشکوۃ شریف جب پڑھی تھی تو یاد پڑتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یا تو استاد محترم ہی نے یہ بتایا تھا یا احقر خود کسی غلط فہمی میں حدیث شریف کا یہ مطلب سمجھ بیٹھا تھا کہ اس حدیث میں احسانی مراقبہ کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔

---

(۳۸) معارف الاکابر ص: ۲۳۹۔

(۱) مراقبہ احسانی کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ عبادت کرنے والا یہ بات دل میں جمالے کہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر و موجود ہوں اور اسے دیکھ رہا ہوں اس خیال کو دل میں جماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مشاہد ہونے اور منظور الیہ ہونے کا خیال دل میں جمالینا عام حالات میں آسان نہیں ہے اس لئے حدیث شریف کے اگلے فقرے میں مراقبہ احسانی کا دوسرا درجہ بھی بتادیا گیا ہے وہ یہ کہ:

(۲) اگر تم پہلے درجہ کے مطابق خدا تعالیٰ کے حاضر و موجود اور مشاہد و منظور الیہ ہونے کا خیال دل میں نہیں جما سکتے ہو تو پھر یہ بات ہی دل میں جمالو کہ خدا تعالیٰ جو کہ خبیر و بصیر بھی ہے وہ تو مجھ کو دیکھ ہی رہا ہے، میں اس کے معاینہ و مشاہدہ میں تو بہر حال ہوں اس لئے مجھے یہ عبادت اس طور پر ادا کرنی ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے سامنے ہونی چاہئے، میں اگرچہ خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن وہ تو دیکھ ہی رہا ہے۔

حدیث جبریل میں ''احسان'' کی حقیقت اوپر جو بیان ہوئی ہے، مشکوٰۃ شریف پڑھنے کے زمانے (یعنی ۱۳۶۴ھ) میں تو احقر یہی سمجھتا رہا تھا لیکن بعد کو کسی وقت تذکرۃ الرشید حصہ اول میں قرآن و حدیث کے بعض مقامات کی تشریحات جو امام ربانی محدث گنگوہی قدس سرہ سے منقول ہوئی ہیں ان میں اس حدیث احسان کی تشریح یوں منقول ہے جو احقر کے فہم ناقص کے مطابق زیادہ قابل قبول ہے۔(۳۹)

(۸) تَعبُدَ رَبَّكَ كَانَّكَ تراه فان لم تكن تراه فانه يَراك کی توضیح میں ارشاد فرمایا کہ فا (فان لم تكن کی فا) اس جگہ علت کے لئے ہے پس معنی حدیث یوں ہوئے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اس لئے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے (کیونکہ اس کی رویت دنیا میں غیر ممکن ہے) تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے ''كانك تراه'' حرف تشبیہ کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ گویا تم اس کو دیکھتے ہو ''تراه'' محض نہیں فرمایا کہ حقیقتاً دیکھ ہی رہے ہو، غرض مقصود حدیث میں جملہ ثانیہ ''فان لم تكن الخ'' سے بھی جملہ اولیٰ ''كانك تراه'' کا ثابت کرنا مقصود ہے نہ کہ تردید و تشقیق جیسا کہ عام شراح سمجھ رہے ہیں اگر تقسیم مراد ہوتی تو یوں ارشاد ہوتا: فان لم تكن فی درجة كانك

(۳۹) ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید مطبوعہ قدیم بلالی اسٹیم ساڈھورہ۔

تراه فانه یراك. فليفهم (۴۰)

چونکہ شیخین علمائے دیو بند حضرت امام گنگوہی اور حضرت امام نانوتوی قدس سرہما نے کتب حدیث حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے پڑھی تھیں اس لئے بطور ظنِ غالب یہی سمجھا اور کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ بھی حدیث احسان کی تشریح اسی طور پر فرماتے رہے ہوں گے جس طرح اوپر تذکرۃ الرشید سے نقل کی گئی ہے۔

اوپر یہ بات بھی نقل ہو چکی ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف پڑھنے کے قائل نہ تھے بلکہ پڑھنے کے ساتھ گننا بھی ضروری سمجھتے تھے اس لئے حدیث جبرئیل میں جب حضرت امام قدس سرہ کو احسان کی حقیقت دریافت ہوگئی تو پھر حضرت نے اپنی پوری زندگی میں اسے ہر دم اپنے پیش نظر ہی رکھا اور برابر اس کی عملی مشق بھی فرماتے رہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تین والا نامے جو چند صفحات پہلے نقل کئے جا چکے ہیں ان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مراقبۂ احسانی حضرت امام کے لئے ملکہ راسخہ بن گیا تھا اور اسی کا یہ اثر تھا جو اوپر کے نقل شدہ مکاتیب میں دیکھا گیا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے ہر مکتوب الیہ کو بھی اسی مراقبۂ احسانی کی تلقین فرما کر اسے بھی اپنے ہی رنگ میں رنگنا چاہا ہے۔

مندرجہ بالا مکاتیب میں سے پہلے کے دو مکاتیب میں تو دونوں صاحبان کو مراقبہ احسانی کی تلقین وہدایت فرمائی گئی ہے اور تیسرے گرامی نامہ میں مرزا محمد عالم بیگ کو ہوس دنیا کی کمی کے لئے ''مراقبہ موت'' و ''مراقبہ قیامت'' کی ہدایت فرمائی ہے کہ حدیث شریف میں موت کے لئے ''ہادم اللذات'' (لذتوں کو ڈھا دینے والا) کا لقب تجویز فرمایا گیا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

أكثِروا ذِكرَ هادِمِ اللّذّاتِ ''لذتوں کو ڈھا دینے والی چیز (موت) کا ذکر کثرت سے کیا کرو''۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے حضرت امام کا سلوک صرف قرآن وحدیث ہی کی تعلیمات پر مبنی تھا چنانچہ حضرت امام کے تجویز کردہ دونوں ہی مراقبے (مراقبۂ احسانی اور مراقبۂ موت) حدیث شریف ہی کے تعلیم فرمودہ مراقبے ہیں۔ مراقبۂ احسان تو حدیث جبرئیل میں بتایا ہوا مشہور مراقبہ ہے جسے حضرات مشائخ صوفیہ نے اپنے طریق کی

(۴۰) تذکرۃ الرشید مطبوعہ بلالی اسٹیم ساڈھورہ ج ۱، ص: ۱۰۴۔

بنیاد ہی قرار دیا ہے اور مراقبۂ موت بھی بعض احادیث میں تعلیم فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقی کی شعب الایمان سے بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ منقول ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان هذهٖ القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء و قيل يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وما جلاؤها قال كثرة ذكر الموت وتلاوة القران. (مشکوٰۃ شریف، ص:۱۸۹)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ قلوب انسانی بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب اس پر پانی کا اثر پڑ جائے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ پھر دل کی صفائی (اس کی قلعی) کیسے ہوتی ہے آپ نے فرمایا موت کو بکثرت یاد کرنے سے اور تلاوت قرآن کی کثرت سے قلوب کا تصفیہ ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص:۱۸۹)

مشکوٰۃ شریف ہی میں انہیں امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منقول ہے:

قال تلا رسول الله صلى الله عليه وسلم فَمَنْ يُرِدِاللّٰهُ اَنْ يَهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَه للاسلام. فقال رَسُوْلُ الله صلى الله عليه وسلم اَلنُّوْرُ اذَا دَخَلَ الصدرَ انْفَسَحَ فقيل يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فهل لِتِلك علم يُعرف به قال نعم التجافى عن دارِ الغرور والإنابة اِلىٰ دار الخلودِ والاستعداد للموتِ قبلَ نُزُوْلِهٖ. (مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَمَنْ يُرِدِاللّٰهُ اَنْ يهديه يشرح صدره للاسلام (اللہ تعالیٰ جس کے لئے ارادہ فرما لیتے ہیں کہ اسے سیدھی راہ لگا دیں تو اور اس کے سینہ کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں) تو آپ نے (آیت تلاوت فرمانے کے بعد) فرمایا کہ نور (حق) جب سینے میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ (قبول حق کے لئے) کھل جاتا ہے تو آپ سے پوچھا گیا کہ کیا اس (شرح صدر) کی کوئی پہچان ہے جس سے یہ بات معلوم ہو سکے (کہ شرح صدر ہو گیا ہے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہچان ہے دنیا سے دوری، آخرت و جنت کی

طرف توجہ اور موت آنے سے پہلے موت کے لئے تیاری (جس کا بہترین طریقہ مراقبۂ موت اور مراقبۂ قیامت ہے)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے ایسی ہی احادیث کی روشنی میں مراقبۂ موت و مراقبۂ قیامت کی تعلیم و تلقین اپنے مسترشدین کے لئے تجویز فرمائی ہے۔

مشکوٰۃ شریف کے اسی صفحہ پر اسی حدیث بالا کے ساتھ ایک دوسری حدیث شریف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کا مفہوم تو اس حدیث مذکور سے ضرور مختلف ہے لیکن ہمیں حضرت امام نانوتوی کی زندگی میں اس حدیث شریف کی اثر انگیزی نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس لئے اس موقع پر اس حدیث شریف کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

عن ابی هريرة وابی خلاد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال إِذَا رَأَيْتُم الـعَبـدَ يُعطىٰ زهداً فی الدنيا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فاقتربوا منه فانه يُلقىٰ الحكمة. (البیہقی مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوخلاد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ جب کوئی ایسا بندۂ خدا دیکھو جسے زہد یعنی دنیا سے بے تعلقی و بے رغبتی دی گئی ہو اور وہ کم گو بھی ہو زیادہ نہ بولتا ہو تو اس کے قریب رہا کرو کیونکہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکمت و دانائی عطا فرمائی جاتی ہے۔

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے اپنی تصنیف مختصر سوانح عمری حضرت امام نانوتوی میں حضرت امام کی کم سخنی و کم گوئی کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

مولوی صاحب (حضرت امام نانوتوی) کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاجی و ظرافت کے ترش رو مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا، نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے۔ (۴۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو وہ بیہقی کی مذکورہ بالا روایت ہی

(۴۱) سوانح عمری مرقومہ مصنف امام مشمولہ سوانح قاسمی ج ۱ ص: ۳۰۔

کے مطابق نظر آئے گی اور اگر حضرت امام کی تصنیفات اور درسی تقریروں کو دیکھا جائے تو حدیث شریف میں آئے ہوئے فقرہ یلقی الحکمة کی سچی بولتی ہوئی تصویر دیکھنے کو مل جائے گی باقی رہا حضرت امام نانوتوی کا مقام زہد وانقطاع عن الدنیا تو حضرت کی زندگی کا یہ پہلو اس درجہ مشہور و زبان زد خلائق ہے کہ ضرورت ذکر و بیان ہی نہیں ہے اور مضمون کی مقدار شاید حد سے بڑھی جا رہی ہے اس لئے اس کی شہرت عامہ کو نظر میں رکھتے ہوئے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ سے متعلق معروضات گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئیں۔

زیر نظر مقالہ کی مجوزہ ذہنی ترتیب کے پیش نظر راقم السطور آئندہ سطور میں مقصد سلوک کی نشاندہی کرنے کے بعد حضرت امام قدس سرہ کی ''منزل رسی'' کا ذکر کر کے اپنا مقالہ ختم کرنا چاہتا ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ کا بیان کیا گیا ہے انہیں حضرات کی تعلیمات کی روشنی میں ''مقصدِ سلوک'' اور ''منزل سالک'' کی بھی تعیین تو ہو ہی جانی چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے جو حالات وواقعات اور سوانح ہم لوگوں تک پہنچ سکے ہیں انہیں نظر میں رکھتے ہوئے حضرت قدس سرہ کا مقصد سلوک بھی بڑی آسانی سے متعین ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت کی منزل سلوک کا تعین بھی دشوار نہیں رہ جاتا ہے حضرت امام کے واقعات وحالات بتاتے ہیں کہ حضرت کا مقصد سلوک تو کیفیت احسان کا حصول ہی تھا جو مشائخ طریق کے نزدیک بھی متفقہ طور پر مقصد سلوک ہے جسے اصطلاح سلوک میں حصول نسبت کہتے ہیں۔

چنانچہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ اپنی مشہور تصنیف ''القول الجمیل'' میں فرماتے ہیں:

> مرجع الطرق کلھا الی تحصیل ھیأة نفسانیة تسمیٰ عندھم بالنسبة لانھا انتساب و ارتباط باللہ عزَّ وجلَّ و (تسمیٰ) بالسکینة وبالنور وحقیقتھا کیفیة حَالَّة فی النفس الناطقة من باب التشبیه بالملائکة و التطلع اِلیٰ الجبروت۔(۴۲)

(۴۲) القول الجمیل از نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔

حضرات مشائخ کے جملہ طرق کا مرجع ومقصد نفس انسانی کی ایک ہیئت خاصہ کا حاصل کرنا ہے جسے مشائخ کے ہاں ''نسبت'' کا نام دیا جاتا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا انتساب وارتباط ہے اور اس نسبت کو سکینہ اور نور بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت دراصل ایک خاص قسم کی کیفیت ہے جو نفس ناطقہ میں پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نفس میں ایک ملکی شان پیدا ہو جاتی ہے اور عالم بالا کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اس کے علوم مکشوف ہو جاتے ہیں۔

اور رسالۂ شفاء العلیل (ترجمہ القول الجمیل) میں مزید توضیح یوں فرمائی گئی ہے۔

حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق ومحبت اور کسر نفس (فنا) کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ''ملکہ قویہ'' حاصل ہوگا اور نسبتیں بے شمار ہیں چنانچہ اشغال قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام ومواظبت اور اس کا استغراق ہے تاکہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے۔ (۴۳)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس کو بھی پیش نظر رکھنا مفید ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ القول الجمیل میں فرماتے ہیں:

ولاتظنن ان النسبة لا تحصل الا بهذهِ الاشغال بل هذه طِريق لتحصيلها من غير حصر فيها وغالب الرأى عندى ان الصحابة والتابعين كانوا يحصلون السكينة بطرقٍ اخرىٰ فمنها المواظبة علىٰ الصلواتِ والتسبيحات في الخلوة مع المحافظة علىٰ شريطة الخشوع والحضور ومنها المواظبة علىٰ الطهارة وذكر هادم اللذات وما اعده الله للمطيعين له من الثواب وللعاصين له من العذاب فيحصل انفكاك عن اللذات الحسية وانقلاع عنها ومنها المواظبة علىٰ تلاوة الكتاب والتدبر فيه واستماع كلام المواعظ وما فى الحديث من الرقاق۔ (۴۴)

آپ یہ گمان نہ کریں کہ یہ نسبت ان اشغال کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں ہوتی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال بھی منجملہ طرق دیگر ایک طریقۂ تحصیل نسبت ہے، میرا غالب گمان

---

(۴۳) نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔ (۴۴) نسبت صوفیہ ص: ۴۸۔

تو یہ ہے کہ حضرات صحابہ وتابعین یہ ''نسبت وسکینت'' دوسرے ہی طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ من جملہ ان کے نماز پنجگانہ کی پابندی اور خلوت میں تسبیحات وغیرہ کا اہتمام اور خشوع وحضور کی شرط لازمی بھی ان میں ملحوظ رہتی تھی اور منجملہ ان کے ہروقت باطہارت رہنے کی پابندی اور ذکر موت کا اہتمام اور یہ مراقبہ کہ آخرت میں اطاعت گذار بندوں کو کیا کیا اجر وثواب ملے گا اور نافرمانوں کو کیسے کیسے عذاب دیئے جائیں گے اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیاوی اور حسی لذتوں سے طبیعت کو دوری ہوجائے گی اور یہ لذتیں سب چھوٹ جائیں گی اور من جملہ ان کے تلاوت قرآن اور اس میں غور وفکر اور خوف ورقاق کی احادیث کا سننا بھی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر (جبکہ مقصد سلوک کی تعیین کی جارہی ہے) حضرت محدث گنگوہی قدس سرہ کی ایک تحریر کا مختصر ضروری اقتباس بھی نقل کردیا جائے فرماتے ہیں:

ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر وموجود جان کر حیاء وشرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا، مقصد اصلی ہے اور یہی احسان ہے، باقی زوائد

اسی سلسلہ میں آگے چل کر (حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا سلوک بیان کرتے ہوئے) فرماتے ہیں:

سنو! کہ سلوک صحابہ وتابعین وتبع تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز حسن عباد کا ہونا تھا، بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل... ہمت اطاعت وجان ومال کی بازی فی رضاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا، نہ استغراق تھا نہ فنا تھی... متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہوجائے سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں بوحدت وجود یا بوحدت شہود علیٰ خلاف بینہم.

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہا راہ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالک الی حقیقۃ الحقائق واصل الاشیاء اور اس میں فنا اپنا اور اپنے علم انانیت کا کردینا مقرر ہوئے۔

اس راہ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے گویا وہ کمالات

اب کالعنقا ہو گئے جس طرح کوئی سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے، ہنوز اس کے آثار کے سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، ان کا حوصلہ وملکہ ملاء اعلیٰ سے ناشی تھا، اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں... مع ہذا راہ جذب ہے نہ درگاہ (راقم السطور رومی کے فہم ناقص میں اس خط کشیدہ فقرے میں بوقت کتابت کچھ تقدیم وتاخیر ہو گئی ہے فقرہ شاید یوں ہوگا "مع ہذا جذب راہ ہے نہ درگاہ" (یعنی جذب طریق وذریعہ ہے مقصود ومنزل نہیں ہے) بعد طے راہ جذب کے وہی طریقۂ صحابہ کہ "عبدیت" کا مقام ہے اختیار کرنا وعبادت وعاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے۔ (۴۵)

مکتوبات رشیدی کے مندرجہ بالا اقتباس پر مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ مزید توضیح فرماتے ہیں:

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صحابہ کے سلوک کی جو تفصیل بیان فرمائی ہے بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے بلاشبہ حضرات صحابہ کا یہی حال تھا لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ وہاں نہ استغراق نہ فنا تھی تو اس کی کچھ توضیح کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل تھا حضرات صحابہ کا فنا اس قسم کا نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں وہ حضرات فنا سے عاری تھے، ایسا نہیں تھا ان حضرات نے تو اپنے آپ کو کامل طور پر فنا کر دیا تھا لیکن ان کے فنا میں سکر نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا پورے فانی اور پوری طرح باہوش تھے... اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے فنا میں سکر کا انداز تھا۔ (۴۶)

سطور بالا میں اصلاً بیان تو مقصد سلوک کا ہو رہا تھا لیکن مکتوبات رشیدی میں سلسلۂ کلام مقصود سلوک اور منزل سالک تک پہنچ گیا اس لئے آئندہ چند سطور میں مقصود سلوک ومنزل سالک ہی سے متعلق معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرات مشائخ طریق وسلوک کی تصریحات سے منزلِ سالک اور مقصود سلوک بھی متعین ہو جاتا ہے کہ مقصود سلوک فنائے انانیت ہے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے

---

(۴۵) مکتوبات رشیدیہ ص:۲۰ بحوالہ نسبت صوفیہ ص:۵۳۔ (۴۶) نسبت صوفیہ ص:۵۴

صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس فنا پر گفتگو فرمائی ہے اس مکتوب کی چند سطریں یہاں نقل کی جارہی ہیں فرماتے ہیں:

ایں بزرگواراں (مشائخ صوفیہ) درمحبت حق جل وعلا از خود واز غیر خود گسستہ اند و در عشق او از آفاق وانفس گزشتہ ماسوا را در راہ او در باختہ و باد ساختہ اند، اگر حاصل دارند اورا دارند اگر واصل اند باو واصل اند، باطن شاں را بہ نہج انقطاع از دون او تعالیٰ روے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند بیاد شان نیاید واز انانیت نفس بہ نوعے گزشتہ اند کہ عود کلمہ انا را بر خود شرک می دارند. (۴۷)

ان بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت میں خود اپنے آپ سے بھی اور اپنے غیر سے بھی رشتہ وتعلق قطع کر لیا ہے اور اس کے عشق میں انفس وآفاق سے گزر کر ہر ماسوا کو اس کی راہ میں بازی پر لگا دیا ہے اب اگر کچھ ان کو حاصل ہوا ہے تو وہ حق تعالیٰ ہی ہوا ہے اور اگر وہ کسی تک واصل ہوئے ہیں تو اسی حق تعالیٰ تک واصل ہوئے ہیں، ان کا باطن حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے اس طرح بے تعلق ہو گیا ہے کہ اب اگر وہ سالہا سال تک ماسوا اللہ کو یاد کرنا بھی چاہیں تو وہ انہیں یاد نہ آئے اور اسی طرح اپنی "انانیت" سے اس طرح نکل گئے ہیں کہ اب انہیں اپنی ذات کے لئے کلمہ "انا" کا استعمال کرنا بھی شرک معلوم ہوتا ہے۔

اسی مکتوبات معصومیہ میں ایک موقع پر اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا گیا ہے جو آج کل کے بہت سے سالکین بلکہ بعض مشائخ طریقت کی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھی جاتی ہے فرماتے ہیں:

مقصود از سیر وسلوک شیخی ومرید گرفتن نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعت نفس۔ ونیز مقصود نیستی وگمنامی است وزوال رعونت وانانیت امارہ کہ معرفت بداں مربوط است (۴۸)

سیر وسلوک سے یہ مقصود نہیں ہے کہ سالک شیخ بن جائے اور لوگوں کو مرید بنانے لگے بلکہ اس سے مقصود ہے کہ سالک منازعتِ نفس (کشمکش نفس) کے بغیر آسانی کے ساتھ وظیفہ بندگی وعبودیت ادا کرنے لگے اور اس سے مقصود نیستی وگمنامی بھی ہے کہ دل سے رعونت وتکبر اور "نفس امارہ کی انانیت" نکل جائے کہ حق تعالیٰ کی معرفت اور حصولِ نسبت اسی فنا ونیستی سے وابستہ ہے (۴۹)

---

(۴۷) مکتوبات معصومیہ: ص ۴۸ ج ۳۰۔ (۴۸) مکتوبات معصومیہ ص: ۶۸ بحوالہ نسبت صوفیہ ص: ۵۹ (۴۹) مکتوبات معصومیہ بحوالہ نسبت صوفیہ

اسی گمنامی و نیستی کے لئے کسی شاعر کا یہ شعر بھی خوب ہے:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے   کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

مگر سلوک و طریقت کے لحاظ سے شعر محلِ غور ہے کیونکہ کچھ مرتبہ چاہنا گمنامی و نیستی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ:

فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں

راقم سطور اس کی مزید توضیح کر دینا چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ فنا کی حقیقت ہے، کچھ نہ ہونا اور کچھ کے عموم میں احساس فنا بھی ہے لہٰذا یہ احساسِ فنا بھی نہ ہونا چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فنا و نیستی کی شہادت حضرت امام کے حقیقی مرتبہ شناس محدث گنگوہی علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں ادا کی ہے کہ:

جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل و خوار کوئی ہستی نہیں ہے۔(۵۰)

اس درجہ کے معتمد و ثقہ ائمہ سلوک و طریق دو بزرگوں کی ایسی وقیع شہادت کے بعد کوئی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے کامل السلوک ہونے کا کوئی اور ثبوت پیش کیا جائے لیکن ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی زندگی میں اس گمنامی و نیستی اور فنا کی جو جھلکیاں درخشاں ہیں مختصر طور پر کچھ ان کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے یہ عام شہرت ہے کہ حضرت امام لوگوں کو آسانی سے بیعت نہیں فرماتے تھے مکتوبات معصومیہ کا ایک اقتباس ابھی اوپر نقل ہوا ہے جس میں خواجہ معصوم نے بہت صاف الفاظ میں بات کہہ دی ہے کہ سلوک کا یہ مقصود ہی نہیں ہے کہ سالک شیخ بن کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو مرید بنانا شروع کر دے اس لئے حضرت امام نانوتوی (جن کی پوری زندگی اخفا و تستر اور گمنامی و فنا کی کوششوں ہی میں گذری ہے) اس غیر مقصود مقام کو آسانی سے قبول فرما سکتے تھے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے ثقہ راویوں کے تواتر کے ساتھ اس قسم کے متعدد فقرے

---

(۵۰) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۴۸۳۔

منقول ہیں جو حضرت کے ''مقام فنا'' کا پتہ دیتے ہیں:

(۱) ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔(۵۱)

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ منقولہ بالا کلمات نقل فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

(۲) میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے؟ کیا اس میں سے ظاہر ہوئے آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اور اپنا کہنا کر دکھایا (حوالہ بالا)

(۳) لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔(۵۲)

(۴) اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا۔ (ارواح ثلثہ ص:۱۷۲ الخ قاسمی ص:۲۴۵)

سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تلمیذ خاص مولانا عبدالعلی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام نے انہیں حکم دیا کہ:

(۵) مجھے اس خلجان سے جس میں (مخلوق کی آمد و رفت کی وجہ سے) مبتلا ہو گیا ہوں نکالو... میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو۔

(۶) اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا نہ پڑھتا صرف سیدھی سادی نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا۔(۵۳)

اب آئیے اسی طرح حضرت امام نانوتوی کا مقام فنا حضرت امام کی عملی زندگی میں بھی دیکھئے:

(۱) یہ بات اس درجہ مشہور ہے کہ یہاں بغیر کسی حوالہ کے اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ حضرت امام

---

(۵۱) سوانح عمری قدیم مشمولہ سوانح قاسمی ص:۳۱۔ (۵۲) قصص الاکابر ص:۱۳۰ سوانح قاسمی ص:۲۴۹۔ (۵۳) سوانح مخطوطہ ص:۳۸، سوانح قاسمی ص:۴۸۵

نانوتوی اخفائے حال کے لئے خود اپنے اسم گرامی اور اپنے وطن مالوف کا نام بتانے میں اخفا سے کام لے لیا کرتے تھے چنانچہ اپنے اصل نام کی جگہ تاریخی نام خورشید حسین بتا دیتے اور اپنے وطن کا نام الہ آباد بتا دیتے (کہ ہر مقام تو اللہ تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے اسے الہ آباد بھی کہا جا سکتا ہے)

(۲) بعض موقعوں پر اپنے ''تصرف باطن'' کا بھی اخفا فرمایا ہے اس ذیل میں دو تین واقعات قابل ذکر ہیں:

(الف) معارف الاکابر میں حضرت حکیم الامۃ تھانوی علیہ الرحمہ کے مجموعہ ملفوظات ''خیر الافادات'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

> فرمایا: ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کسی مسجد میں چند مریدوں کو توجہ دے رہے تھے اور رات کا وقت تھا چراغ نہ تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کی خبر لگی جلدی سے آ کر خفیہ طور پر حلقہ میں بیٹھ گئے حضرت نانوتوی کو ''نسبت یعقوبیہ'' کا احساس ہو گیا آپ نے توجہ روک لی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کا ادراک ہو گیا، خفا ہو کر فرمانے لگے: بنا دوان کو وہ غوث وقطب، میں ہی ایک منحوس ہوں جو خار معلوم ہوتا ہے۔ (۵۴)
>
> (ب) خورجہ میں ایک صاحب حاجی محمد اسحٰق نامی تھے، بیچارے ذاکر وشاغل اور پابند صوم وصلوٰۃ سیدھے سادے مسلمان تھے، خود حاجی صاحب مرحوم امیر شاہ خاں صاحب سے کہتے تھے کہ ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے، جب بیلوں کو سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے، جب کتوں میں لڑائی ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کو کاٹتے ہیں جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلہ میں ہی پس رہا ہوں، لڑکے بھاگتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑ رہے ہیں... آخر میں کہتے تھے کہ میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسجد آنا جانا بھی ان کے لئے دشوار ہو گیا تھا کان میں روئی کے روہڑ ٹھونس کر گھر ہی میں پڑے رہتے تھے۔

امیر شاہ خاں صاحب کے حاجی اسحٰق دوست بھی تھے سیدنا الامام الکبیر سے بیعت کا شرف

---

(۵۴) معارف الاکابر ص ۲۷۵۔

بھی ان کو حاصل تھا، ان کا حال سن کر خاں صاحب نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ اپنے پیرومرشد (مولانا نانوتوی) کو اپنے حال سے آگاہ کرو، جو حالات گزر رہے تھے لکھ کر امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ حاجی صاحب نے کئے انہوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں بھیج دیئے، اسی زمانے میں حضرت کا قیام دلی ہی میں تھا جواب میں امیر شاہ خاں صاحب کو حضرت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ حاجی اسحٰق کو میرے پاس یہیں (دہلی) بھیج دو حسب الحکم حاضر ہوئے پھر جیسا کہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ:

> مولانا نانوتوی نے کچھ نہیں کیا صرف اوراد واشغال کے وقت بدل دیئے اور وقت کی صرف اس ہلکی سی تبدیلی کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حاجی اسحٰق مرحوم دوسرے ہی دن اچھے ہو گئے۔

جو کچھ کیا گیا اس کو دیکھ کر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی ازالۂ مرض کا سبب بن گئی، لیکن جس قسم کی بیماری میں حاجی صاحب مرحوم مبتلا تھے کیا اس سے صحت یاب ہونے کے لئے اوراد واشغال کے اوقات کا بدل جانا کافی تھا؟ اس راہ کے ایک محرم اسرار سے سنئے!

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ:

> احقر کا وجدان ہے کہ مولانا (نانوتوی) نے تصرف فرمایا ہے اور اخفاء تصرف کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں۔ (۵۵)

حضرت امام نانوتوی کے مقام فنا کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت امام قدس سرہ کے مفصل حالات وسوانح نہ ہونے کے باوجود متعدد واقعات مختلف صورتوں سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

اسی طرح حضرت امام قدس سرہ کی متعدد کرامات بھی مختلف تذکروں میں موجود ہیں لیکن چونکہ کرامات کا ہونا مشائخ طریق کے نزدیک معیار بزرگی نہیں سمجھا گیا ہے اس لئے ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل کمال حضرت امام نانوتوی کا ان کا یہی ''مقام فنا'' تھا کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے بلکہ سب کچھ ہوتے ہوئے حضرت کی پوری کوشش یہی رہی کہ انہیں کچھ نہ سمجھا جائے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جسے حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے ذکر فرمایا ہے

---

(۵۵) ارواح ثلثہ ص:۱۶۹، سوانح قاسمی: ۳۳۴۔

ملاحظہ ہو قدیم سوانح عمری کا صفحہ ۳۶ فرماتے ہیں: (۵۶)

ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب بیان ہوتے، ایک صاحب کہ کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یوں سمجھے کہ یہ (عجیب وغریب مضامین) اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے، درخواست کی کبھی تنہا ملئے، آپ نے فرمایا کہ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے تنہائی کہاں؟ آپ جب چاہیں تشریف لائیں وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے مولانا (محمد قاسم صاحب) سبق پڑھا رہے تھے البتہ موقوف کر دیا مگر آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند ان کی طرف متوجہ ہوئے ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے پھر معذرت کی اور کہنے لگے مولانا مجھے خبر نہ تھی کہ آپ میں یہ جوہر بھی علی الوجہ الاتم موجود ہے۔ (۵۷)

راقم السطور کا گمان ہے فیض باطنی پہنچانے والے بزرگ کا یہ قصہ زمانۂ قیام میرٹھ میں اس وقت پیش آیا ہوگا جب حضرت امام نانوتوی سے ایک جماعت مسلم شریف پڑھ رہی تھی (دار العلوم دیوبند کا قیام اس وقت تک نہیں ہوا تھا) مسلم شریف کی جماعت میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی شریک تھے، اسی وجہ سے حکایت واقعہ ایسے انداز سے تحریر فرمائی ہے جیسے یہ واقعہ عینی مشاہدہ ہو۔

اسی نوعیت کا یہ دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو سوانح قاسمی میں ارواح ثلثہ سے نقل کیا گیا ہے جس کے راوی مشہور صاحب روایات حضرت امیر شاہ خاں صاحب ہیں کہ:

نواب مصطفےٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللٰہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے، سر اٹھایا تو ایک صاحب اموجان (نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن

---

(۵۶) سوانح قاسمی میں بھی یہ واقعہ ص: ۳۲۸ پر مذکور ہے نقل روایت میں کچھ حصہ اس کا بھی آ گیا ہے۔

(۵۷) ارواح ثلثہ ص: ۱۹۵، سوانح قاسمی ص: ۳۲۸۔

مولانا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ (۵۸)

ارواح ثلثہ میں یہ حکایت اسی قدر بیان ہوئی ہے پڑھ کر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اصل صورت حال کیا تھی؟ احقر اپنے فہم ناقص سے یہ سمجھ سکا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے نواب صاحب کو امتحان لینے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنی نسبت کا پوری طرح اخفا فرمالیا کہ انہیں نسبت کا پتہ ہی نہ لگ سکا مذکورہ بالا دو واقعات میں دو مختلف بزرگوں نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے نہ صرف صاحبِ نسبت ہونے کی بلکہ صاحب نسبت قویہ ہونے کی شہادت دی ہے، اس کے بعد اب خود حضرت امام کے شیخ طریقت اور پیر مرشد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی نہ صرف شہادت بلکہ ''سندِ اعزاز'' قابلِ توجہ اور لائق دید ہے۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے اپنے رسالہ ضیاء القلوب میں ان حضرات شیخین کے لئے یہ سند اعزاز مرحمت فرمائی ہے اصل عبارت فارسی کا ترجمہ ملاحظہ فرمایا جائے، حضرت حاجی صاحب نے اس سند اعزاز کو مبنی بر الہام فرمایا ہے:

> جو شخص اس فقیر (حاجی امداد اللہ صاحب) سے محبت، عقیدت اور ارادت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مولوی محمد قاسم اور مولوی رشید احمد صاحب جو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں، میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر شمار کرے، اگر چہ معاملہ برعکس ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں، ان کی صحبت کو غنیمت سمجھئے کیونکہ ان جیسے آدمی اس زمانے میں نایاب ہیں۔
>
> آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لائے؟ تو میں قاسم اور رشید کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (۵۹)
>
> حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مختصر سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے... اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو۔ (۶۰)

یہ تمام تفصیلات جان لینے کے بعد ناظرین کرام کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ زیر

---

(۵۸) ارواح ثلثہ ص: ۲۷۷، سوانح قاسمی ص: ۳۳۷۔ (۵۹) معارف الاکابر ص ۲۳۵۔ (۶۰) مختصر سوانح مشمولہ سوانح قاسمی ص: ۳۴۔

نظر مضمون میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے احسان وسلوک کے تحت بہت کچھ باتیں تو بیان ہوگئیں لیکن حضرت امام کے مجاہدات وریاضات کا مطلق ذکر نہیں آیا؟ کیا حضرت والا کو ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا تھا؟ جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی زبانی سنئے جو حضرت امام والا مقام کے زمانۂ بیعت اور زمانۂ ابتدائے سلوک میں حضرت امام کے ساتھ دہلی ہی میں قیام فرما تھے مختصر سوانح قاسمی کے چند متفرق اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف) مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا، اشغال دشوار جیسے ''حبس دم'' اور ''سہ پایہ'' مدت تک کئے ہیں اور ''بارہ تسبیح'' اور ''ذکر ارّہ'' کا دوام تھا ہی سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے، حرارت مزاج میں ایسی آ گئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی، یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) (ص:۲۹)

(ب) مولوی صاحب بھی میرے پاس آ رہے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھا دیں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔ (۶۱)

حضرت امام کے مجاہدہ وریاضت کی مزید تفصیل سوانح مخطوطہ میں یوں بیان کی گئی ہے:

مگر بایں ہمہ شان عبودیت آپ (مولانا نانوتوی) پر ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر ارّہ وغیرہ میں مشغول رہے، چھ چھ سات سات گھنٹے ذکر ارّہ اور حبس دم کرتے تھے۔ جس وقت آپ اس شغل کو کرتے صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے ــــ وہ تہ بند عرق بدن (پسینے) سے ایسا تر ہو جاتا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے۔ (۶۲)

اب اسی موضوع سے متعلق سوانح قاسمی ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ کا ایک طویل اقتباس قدرے اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہو اس اقتباس میں متن یعقوبی اور شرح گیلانی دونوں ہی کی عبارات نقل ہوں گی۔

---

(۶۱) سوانح قاسمی ص:۲۹۔ (۶۲) سوانح مخطوطہ ص:۱۵) سوانح قاسمی ص:۳۰۳

''متن یعقوبی'' جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب) اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے اور دو ایک آدمی اور تھے، اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب تنہا رہ گئے، مکان مقفل رہتا تھا (ص:۲۹،۳۰)

''شرح گیلانی'' بظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا دن کو تو نہیں لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی اسی وقت جیسا کہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

(متن یعقوبی) رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے (جانے) والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں رہتا ہے اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گزرتی تھی یا گزاری جاتی تھی پھر بقول مصنف امام ''متن یعقوبی'' اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے چند ماہ اسی ''ہو'' کے مکان میں گذرے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید ''ہو'' کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کا ذکر خاکسار (مولانا گیلانی) سے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمان العثمانی سابق مہتمم دار العلوم بھی فرمایا کرتے تھے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ:

حضرت نانوتوی اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکے کی آواز بھی آتی تھی لوگ مشوش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے حجرے کے کواڑ اتارے گئے کیونکہ اندر سے زنجیر بند تھی، اندر جا کے دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی اپنا سر زمین پر دے مارتا ہے، حضرت گردن اٹھاتے ہیں تو وہ بھی سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی زور سے زمین پر سر پٹکتا ہے، یہ دھماکہ اسی کا تھا لوگوں نے اسے مارا، مار کر باہر لائے لیکن حضرت کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ (۶۳)

---

(۶۳) مکتوب الحفید السعید ۳ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) (سوانح قاسمی ص:۳۰۶۔

راقم السطور کے فہم ناقص میں تو گنجائش اس بات کی بھی ہے کہ وہ سانپ اسی ویران وغیر معمور مکان کا مکین کوئی جن ہی رہا ہو اور حضرت امام قدس سرہ اس کی موجودگی اور اپنے برابر ہی بیٹھے ہوئے ذکر میں شرکت سے باخبر بھی رہے ہوں اور اس کے بے ضرر ہونے کی وجہ سے اس سے تعرض غیر ضروری خیال فرماتے رہے ہوں لیکن یہ اجانب جو اصل صورت حال سے بالکل بے خبر تھے اسے ضرر رساں وموذی سمجھ کر مار ڈالنا ہی ضروری سمجھا ہو اور حضرت نے بھی اخفائے حال واخفائے بزرگی کے پیش نظر اپنے کو بالکل ہی بے خبر ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا ہو۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال.

حضرت امام نانوتوی کی ایک اور خصوصیت

گزشتہ صفحات میں حضرت امام قدس سرہ کے شیخ وپیر مرد کی سند اعزاز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اس سند اعزاز میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ بھی ان کے شریک ہیں۔

اب حضرت امام نانوتوی کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ اپنے اور حضرت امام نانوتوی کے شیخ ومرشد حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے ایک لسان عطا فرماتے ہیں چنانچہ حضرت شمس تبریزی کو مولانا رومی لسان عطا ہوئے جنہوں نے حضرت شمس تبریزی کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرما دیا اسی طرح مجھ (حضرت حاجی صاحب) کو مولوی محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں (حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ)

> مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب میں اپنی تصنیف کو حضرت حاجی صاحب کو سنا دیتا ہوں تب مجھے اس کے مضامین پر اطمینان ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے بدون سنائے اطمینان نہیں ہوتا اور ایک بڑی لطیف بات فرماتے تھے کہ ہمارے ذہن میں مبادی پہلے آتے ہیں یعنی مقدمات اول آتے ہیں ان کے تابع نتیجہ ہوتا ہے اور ان حضرات کے ذہن میں نتائج پہلے آجاتے ہیں اس لئے جب سنا لیتا ہوں تو اطمینان ہو جاتا ہے کہ مقاصد تو ٹھیک ہیں، مقدمات چاہے غلط ہوں ان کی کیا ہے انہیں تو خود ٹھیک ٹھاک کر لیں گے، مقاصد تو صحیح ہیں۔ جتنے وہبی علوم بزرگوں کے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بس ایک سچی بات قلب میں پڑ گئی ان کے منتسبین میں جو اہل علم ہوتے

ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کی تقویت اور تائید دلائل سے بھی کر دیتے ہیں تو ان کے دلائل تابع مقاصد کے ہوتے ہیں بخلاف علمائے رسوم کے ان کے مقاصد تابع دلائل کے ہوتے ہیں۔ (۶۴)

مضمون ختم کرتے کرتے حضرت امام نانوتوی کے زمانہ سلوک کی سرگذشت سے متعلق ایک خاص بات جو اوپر مذکور نہ ہو سکی ہے اس کا ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہاں بیعت اور ذکر و شغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر و شغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ آپ کچھ نہیں کہتے اپنے پیر کے استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ مولانا (محمد قاسم) رونے لگے، پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے: کہ اپنا حال کیا بیان کروں۔

جہاں تسبیح لے کے بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے۔ زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں... اب یہی سننے کی بات ہے... راہ و رسم منزل سے جو آگاہ تھا یعنی آپ کے شیخ عارف بے ساختہ فرمانے لگے کہ ''مبارک ہو'' مولانا! حق تعالیٰ کے اسم ''علیم'' کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ سے اس موقع پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ: ''یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا''۔ جس کی تشریح حاجی صاحب کے حوالہ سے انہوں نے یہ کی ہے کہ: تم سے (یعنی مولانا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔ (۶۵)

حضرت امام نانوتوی کے قلب مبارک پر جس فیضان نبوت کی اطلاع حضرت حاجی صاحب نے دی تھی اسی کا یہ اثر تھا جسے سوانح مخطوطہ میں یوں ذکر کیا گیا ہے لکھتے ہیں:

(۶۴) مجموعہ ملفوظات حسن العزیز بحوالہ معارف الاکابر ص: ۲۶۴۔ (۶۵) سوانح قاسمی ص: ۲۵۹

طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئے۔(٦٦)

او پر حضرت امام کی بیعت مرشد کی بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ امام نانوتوی ومحدث گنگوہی دونوں ہی حضرات نے طالب علمی ہی کے زمانے میں بیعت کر لی تھی ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت امام نانوتوی کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ ہی سال رہی ہوگی۔

ایسی صورت میں قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا یہ ارشاد سوانح مخطوط کی مذکورہ بالا شہادت کو مزید مصدق وموثق اور قابل یقین بنا دیتا ہے کہ:

مولانا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہوگئی۔

اب قابل توجہ اور لائق غور بات رہ جاتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے حضرت شیخ حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے فیضان نبوت کی مبارک بادسن کر اور ذکر وشغل کا اہتمام چھوڑ دینے کی ہدایت پا کر کیا کیا؟ کیا آپ نے ذکر وشغل کا اہتمام چھوڑ دیا؟ مجاہدات وریاضات ترک کر دیئے؟ سوانح میں مذکور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ آپ نے بھی اس فیضان نبوت کے تحت وہی کیا جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا اعلان سن لینے کے بعد بھی اَفَلَا اَكُونُ عبداً شکوراً فرما کر حق عبودیت ادا کرتے اور محسن حقیقی کی شکر گذاری فرماتے رہے یہی حضرت امام نانوتوی نے بھی کیا رحمہ اللہ وقدس اللہ سرہ۔

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے سلوک واحسان سے متعلق اپنی بساط اور معلومات کی حد تک جو کچھ الٹا سیدھا لکھا جا سکا وہ پیش ناظرین کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے آمین۔

آخر میں ایک حکایت جو اسی موضوع تحریر سے متعلق ہے وہ بھی ملحوظ خاطر رہے تو احقر کے حق میں زیادہ مفید بات ہوگی۔

بزرگوں سے سنا ہے اور بعض کتابوں میں پڑھا بھی ہے لیکن حوالہ مستحضر نہیں ہے اس نقص کے باوجود حکایت قابل سماعت ہے مشہور حکیم وفلسفی شیخ الرئیس بوعلی سینا کے زمانے میں ایک مشہور

(٦٦) سوانح قاسمی ص:٣٠٢۔

بزرگ صوفی وشاعر حضرت شیخ ابوسعید ابو الخیر بھی تھے بوعلی سینا ایک دن حضرت شیخ کی زیارت و ملاقات کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوئے کچھ دیر بیٹھے کچھ گفتگو بھی ہوئی ہوگی پھر چلے آئے۔

بعد میں حضرت شیخ کے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا کہ حضرت شیخ میرے چلے آنے کے بعد کچھ میرے بارے میں فرمایا تو نہیں تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ فرمایا تھا کہ مردے خوب است و لے اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے یہ سن کر اخلاق پر پورا ایک رسالہ لکھ ڈالا اور حضرت شیخ کی خدمت میں بھیج دیا، شیخ رسالہ کو ادھر ادھر سے دیکھا اور فرمایا من نگفتہ بودم کہ اخلاق نہ داند گفتہ بودم کہ اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے جو غلطی کی تھی وہی غلطی راقم السطور سے بھی سرزد ہوگئی ہے کہ اخلاق نہ رکھتے ہوئے اخلاق پر یہ مقالہ سپرد قلم کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف راقم السطور کا قصور نہیں ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری سیمنار کے ذمہ داروں کی ہے۔

مولانا عبدالوحید حیدرآبادی*

ہم نواؤں سے ہم کلامی
مولانا قاسم نانوتوی کی زبانی

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے دیوبند کی چھتہ مسجد میں انار کے درخت کے نیچے بنا چبوترہ مدینۃ الرسول کی مسجد نبوی میں بنے اصحابِ صفّہ کے چبوترے کے سلسلے کی ایک کڑی بن کر ابھرا تھا، جس میں علم وہدایت کی ایسی شمع روشن کی گئی تھی جو زنگی اور فرنگی ہر دور میں روشنی پھیلاتی رہی۔ اب یہ روشنی کا مینار وسیع وعریض رقبہ پر بلند وبالا عمارتوں کی شکل میں طالبانِ علم دین کے لشکر کی تربیت گاہ بنا ہوا ہے، جہاں کے تربیت یافتہ خدا کے سپاہی سچے اور صحیح عقائد سے لیس، زیور علم اور دینی تعلیمات سے آراستہ دنیا کے چپہ چپہ میں دین الٰہی کی روشنی کو عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ آج دنیا جہان میں جو ہزاروں دینی اور اصلاحی درسگاہوں اور جماعتوں کا جال بچھا ہوا ہے وہ اُسی انار کے چھتنار برگد کے سمان بٹی زنجیروں کے بَل اور تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں جو: واعتصموا بحبل الله کی روشن تعبیر بنے ظلمتِ دہر میں وحدت ورسالت کے نور کو عام کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے ہیں۔ تبلیغ واصلاح کی کوئی تحریک اور جماعت جھوٹے منہ بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتی کہ وہ اس بحر بیکراں سے ہم کنار اور اس فیض رساں چشمہ سے فیضیاب نہیں۔

امام قاسم نانوتوی کی ذات ہم سب کے لئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا لڑکپن، طالب علمی کا زمانہ، عائلی زندگی، روزی اور روزگار کے مشاکل کا سامنا، خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری، حق وصداقت کا بے باک اظہار، حلال وحرام کی تمیز میں تقویٰ وطہارت کا پاکیزہ معیار ہمارے لئے زندگی کے ہر مرحلہ پر مشعلِ راہ بنا ہوا ہے:

---

* حیدرآباد (اے پی)

دل ہے یہ پتھر نہیں ہے جگ ہنسائی کے لئے　　　　بس یہی کافی ہیں شاید دل ربائی کے لئے

اہل قیافہ وفراست کی شخصیت شناسی کی شریعت میں کوئی شنوائی نہیں، قرائن، دلائل اور شواہد نہیں، مگر بادل کی گرج دیکھ کر پیشین گوئی کرنے والے پر کوئی پابندی بھی نہیں! ورنہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اور پالنے میں پاؤں دیکھنے کی روایت زمانہ کی آنکھ اور ماں باپ کی آس بن کر زندگی کی دھوپ میں چھاؤں نہ بنتے۔ یوسفؑ کو بھائیوں نے کیوں اندھے کنوئیں میں دھکا دیا؟ فرعون نے موسیٰ کو کیوں موجوں کے حوالہ کیا؟ نوفل نے چہرہ پر کون سی روشنی دیکھی تھی؟ صحیفے کائنات میں گم ہوئے، آوازیں فضاؤں میں سماگئیں مگر ضائع کچھ نہیں ہوا، یہ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا جب: أنطقنا الله الذی أنطق کل شیء کا عملی مظاہرہ ہوگا۔

مولانا قاسم نانوتویؒ کا بچپن گاؤں دیہات کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پانے والے بچوں سے مختلف نہ تھا، صدیوں سے چلی آئی روایت آج بھی گاؤں دیہات میں مکتب اور بچوں کا وہی منظر نامہ پیش کرتی ہے جس کا نقشہ سیرتِ قاسم میں پیش کیا گیا ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ گاؤں، قصبوں اور شہروں میں تبدیل ہوتے گئے، مگر اس کے ساتھ چند گھروں کی بستیاں بھی گاؤں بن کر اُبھر گئیں، جن میں اب بھی وہی ریت رائج ہے جو دیوانے چھوڑ گئے، یہیں سے ہر بڑے دینی اور دنیوی اداروں کو ایسے افراد بھی فراہم ہوتے رہے جن پر شہروں کی جگمگاتی اور طلسماتی دنیا خول تو چڑھا دیتی ہے مگر دل کی دنیا نہیں بدل پاتی:

وہی مکتب وہی ملا وہی بچوں کی غوغائیں
یہیں پڑتی ہیں بنیادیں، یہیں اُٹھتی ہیں دیواریں

مولانا قاسم نانوتوی کی تربیت جس طرح ہوئی تھی وہ بھی اپنے لئے، اپنے بچوں کی تربیت کے لئے، مکاتب ومدارس کے ارباب نظم ونظارت کے ذمہ داروں کے لئے فکر وعمل کا نہج سجھاتی ہے، بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے جس قدر تعلیم وتعلم کی ضرورت ہے، اسی قدر جسم وجان کے ڈھانچے کو مضبوط رکھنے کے لئے کھیل کود اور بدنی ریاضت کی ضرورت ہے، تاکہ ہماری نسلیں علم وعمل سے آراستہ، اسلامی تربیت کے اولین معلم کے درسِ اولین: اقرأ باسم ربك الذی خلق کی روشنی سے منور ہو کر اسلامی معاشرہ اور اسلامی طرزِ زندگی کے اولین رہنما کے ارشاد: المومن القوی خیر من

المؤمن الضعیف کا بہتر مظہر بن کر دنیا میں زندگی گزاریں۔

مکتب کی تعلیم کے ساتھ وہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہوتے، بازی لے جانے اور پالا مارنے کی پوری کوشش کرتے، اس کے ساتھ آئندہ زندگی کے مسائل اور مشاکل کا سامنا کرنے کے لئے اس عہد کی ضرورت کے مطابق عزت کے پیشہ خطاطی اور جلد سازی کے فن کو بھی سیکھتے رہے۔ بزرگوں کا کہنا بے معنی نہیں "ہاتھ میں ہنر روزی کا ضامن ہے۔"

آج سینکڑوں پیشوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی ان کو سیکھا جاسکتا ہے تاکہ یہ دور اندیشی "داشتہ آید بکار" کے طور پر ضرورت پڑنے پر کام آسکے۔ مولانا قاسم نانوتوی مفلس گھر میں پیدا نہیں ہوئے تھے، پھر بھی طالب علمی کے دور میں خطاطی اور جلد سازی کا فن سیکھتے رہے تاکہ وقتِ ضرورت ہاتھ کی روزی کشکول کی ذلت سے محفوظ رکھ سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دینی مدارس کے تعلیم یافتہ بھی سرکاری ملازمت کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ پہلے اہلیت معیار تھی، اب ڈگری معیار ہے۔ اہلیت کے ساتھ ڈگری ہو تو سونے پر سہاگہ، یہ اپنا اپنا اختیار ہے کہ آدمی ایک آتشہ رہے یا دو آتشہ بن جائے۔

مولانا قاسم نانوتوی نے سرکاری ملازمت بھی کی اور کتابوں کی تصحیح کے پیشہ سے بھی روزگار حاصل کیا اور جب مدرسہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اپنی ذات اور اہل وعیال پر دینی تعلیم اور دینی مدرسہ کی ذمہ داری کی اجرت صرف کرنا گوارا نہ کیا۔ تقویٰ وطہارت اور کردار کی پاکیزگی کا یہ وہ معیار ہے جس پر مجھ جیسے جامہ زیب، سرمہ سلائی اور نمائشی شیروانی کے خوگر شاید و باید ہی پورے اتر سکیں، جبکہ مجھے اس کا بھی پورا علم ہے کہ دین کے کسی کام کی اجرت لینا غیر مستحسن ہے، اس کو بدرجۂ مجبوری روا رکھا گیا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں مستحسن بنانے کے لئے غیر مستحسن یافت سے زیبائش مجھے کس زمرہ میں شامل کرتی ہے؟

عائلی زندگی، اپنی ذات اور ذریتِ آدم میں اضافہ کے مرحلوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں بڑے پتے کی بات کہہ گئیں "فصل کی پھوٹ فصل میں لوٹ" آٹے کا خمیر گرم توے پر ہی جوبن دکھلاتا ہے۔ ہمیں تو یہ سکھایا گیا ہے من یستطع منکم الباءۃ فلیتزوج رادھا کے ناچنے کے لئے نو من تیل کا انتظار کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ روزے رکھنا اور دھنیے کا پانی پینا تو مجبوری کا نام

جی حضوری ہے۔

دینی تعلیم کا تسلسل کس طرح ہونا چاہئے، اس میں بھی مولانا قاسم نانوتوی کی تربیت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔مکتب کی ابجدی تعلیم، ناظرہ قرآن کے بعد حفظ قرآن کا مرحلہ آتا ہے۔نہ معلوم ان کی تربیت میں یہ کڑی، مکتب کی تعلیم کے دوران کیوں کر ادھوری رہ گئی تھی؟ مولوی کو اس وقت اپنی علمی قابلیت میں کمی کا احساس ہوتا ہے جب وہ قرآنی حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو شرعی احکام میں سب سے محکم دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، حافظ قرآن کی عظمت بجا مگر شاید مولانا نانوتوی کو یہ احساس بار بار کچوکے لگاتا تھا کہ وہ شرعی احکام کے حوالوں اور حاضر جوابی میں قرآنی استدلال اَز بر پیش کرنے میں حافظ جیسی روانی نہیں دکھلا سکتے تھے، چنانچہ عائلی زندگی میں بیوی بچوں کی چوں چراں اگنی کے باوجود اٹھائیس سال کی عمر میں انہوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا، یہ وہی کر سکتا ہے جس کو اپنی ذات میں کمی اور نقص کا احساس ہوتا ہے اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے وہ عزم وحوصلے سے کام لیتا ہے، یقین محکم، عمل پیہم کامیابی کا گُر ہے۔

امام قاسم نانوتوی کی ساری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہمیں آئینہ دکھاتی ہے۔اس میں دیکھنے والے کے لئے اپنی ذات کے بے ہنگم کھانچے اور نفس امارہ کے خونچے سب کچھ نظر آجاتے ہیں۔ہم کس کھانچے پر لڑکھڑاتے ہیں اور کس خونچے پر رال ٹپکاتے ہیں۔وہ ایک ایسی ذات تھی جس نے کبھی اپنے وقت کے رئیسوں اور جاگیرداروں کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا، ہمیشہ ان سے گریز کیا، زینت وزیبائش سے بے نیاز رہا، سادہ زندگی، سادہ خوراک اور سادہ لباس کو ترجیح دی، غریبوں اور کمزوروں میں گھلا ملا رہتا تھا، نووارد پوچھتے پھرتے تھے قاسم کون ہے؟

سادہ لوح غریبوں اور کمزور طبقہ کے افراد میں کتنا ایمان اور اخلاص ہوتا ہے۔اس کو بے لوث نظر ہی دیکھ سکتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم نے ماضی قریب تک اس روایت کو برقرار رکھا تھا کہ حکومتی امداد اور مالداروں کی موٹی رقم کے مقابلے میں غریبوں کے خون پسینے کے پیسے کو ترجیح دی جائے، مستقل آمدنی کی کوئی جائیداد نہ بنائی جائے۔کیسے مخلص اور دور اندیش مومن تھے وہ لوگ جن کے عاقبت اندیش فیصلوں نے حکومتی دراندازی اور جائیدادوں کے ضمن میں پیدا ہونے والے خویش پروری اور حرص وہوس کے جذبات کا سدِ باب کر دیا تھا۔سیاست اور ریاست کا مرغوب نظام، شوریٰ کی

بالا دستی کے بغیر بے روح جان کی حیثیت رکھتا ہے، ماضی کے تلخ تجربے مجھ سے کیوں یہ کہلواتے ہیں:

تیغ منصف ہو، جہاں دار و رسن ہوں شاہد — بے گناہ کون ہے اس دار میں قاتل کے سوا

شہید حق وحیدالزماں کا یہی قصور تھا نا کہ وہ بے باک، بے لوث حق گو مرد مومن تھا، مولانا نانوتوی کا سچا پیروکار تھا، مولانا حسین احمد مدنی کا مرید تھا اور امام قاسم کے کردار کا شیدائی، اس نے ان کے کردار اور پیغام کو عام کرنے کے لئے ''القاسم'' رسالہ جاری کیا تھا، وہ ارادت اور قیادت کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے: خذ ما صفا و دع ما کدر کا عملی نمونہ تھا۔

میری ہر ادا مجھے منافقت کے دائرے میں کھینچ لے جاتی ہے، میں اپنی ذات پر وہ سب کچھ منطبق نہیں کر پاتا جس کا مجھے درس دیا گیا تھا، شریعت و طریقت کا آئینہ دیکھتا ہوں تو میرے چہرے کے بدنما داغ مجھے منہ چڑاتے ہیں، مگر میں اتنا بے حس ہوگیا ہوں کہ بدنمائی میرے احساس کو چابک لگانے کے بجائے لیت و لعل کی لوریاں سنا کر سُلا دیتی ہیں۔ گروہ بندی اور جماعتوں کی تقسیم انا پرستی اور جاہ پرستی کی آماج گاہ بنی ہوئی ہیں، حق و ناحق میں جانبداری اور غیر جانبداری وہ منزل ہوتی ہے جہاں سربرآوردہ افراد اور برگزیدہ شخصیتوں کے ایمان و تقویٰ کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے، جس میں مولویانہ تاویلیں اور حیلے بہانے نفس کے بہلاوے اور دوسروں کو چپ کرنے کے پُرفریب غیر حقیقی منطقی قضیے موجبی نتیجے تو پیش کرسکتے ہیں مگر دل کی سالبی خلش کو نہیں مٹا سکتے۔ کیا وقتی مصلحت، مرغ و ماہی کی لذت اور جاہ پرستی کی ہوس لا یخفی علیه شیء کی آنکھوں میں دھول جھونک سکیں گے۔ نہیں، ہرگز نہیں!

میری یہ سچائیاں جب میری ہی ذات پر منطبق نہیں ہوتیں تو میں کیوں کر دعویٰ پارسائی کرسکتا ہوں، میرے لئے اس کا جواب ''من نہ کردم شما حذر بکنید'' بہت آسان ہے، مگر میں اس تر نوالے سے لذتِ نفس کو آسودگی بخشنے کا قائل نہیں - میں اس کو قابلِ تلافی کوتاہی سمجھتا ہوں، جب تک اس کا احساس زندہ ہے میرے ایمان کی تازگی برقرار ہے، جب یہ برقراری بے قراری میں بدل جائے گی تو مجھ میں اور بل هم اضل میں کیا فرق رہ جائے گا۔ زیاں کا احساس ہی انسان کو ایمان کے دائرہ میں رکھتا ہے۔ میری اس بے ہنگم تحریر کو فلسفیانہ اور مولویانہ موشگافیوں سے بالاتر رکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں، یہی میرا مدعا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں میرے افکار پیش کرسکے، طوالت سے بچتے ہوئے، اختصار کے ابہام سے گریز کرتے ہوئے ژولیدہ بیانی کے انداز میں کچھ اشارے کردیئے

ہیں، مقدر اور برضرورت حذف کو صرفی نحوی تحلیل کرنے والے سمجھ کر عبارت کا مطلب نکال لیتے ہیں، بین السطور اور حواشی پر نظر رکھنے والے مافی بطن الشاعر کو خوب سمجھتے ہیں۔

انجماد اور جمود کو اسلام نے کبھی مستحسن قرار نہیں دیا، اس نے: سخرنا لکم ما في السمٰوات وما في الارض اور: واعدّوا لھم مااستطعتم کا درس دے کر ترقی اور باعزت زندگی گزارنے کا گر بتایا، اس نے خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی ہمیشہ ترغیب دی مگر اسلامی تعلیمات کے دائرہ میں رہ کر اس طرح کہ آپ کی ذات اور کردار کو دیکھ کر انسانی معاشرہ کا ہر فرد آپ کو اسلام کا صحیح ترجمان سمجھے۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، ایسے وقت میں دانشوروں اور بزرگوں پر یہ الہامی اور فکری فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر نسخۂ حکمت قوم کو دیں تا کہ بروقت مرض کا ازالہ ہو سکے۔ ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ چند مصلحت بیں موقعہ پرست کسی چڑھتے سورج کے گرد ہالہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں جس سے وہ اپنی روشنی کے خول میں بند ہو جاتا ہے، جہاں اس کی اپنی ساری توانائیاں ناتواں ہو کر دستر و دستار کے سنوارنے میں لگ جاتی ہیں۔ ''پھر پیراں نمی پرند مریداں می پرانند'' کا شیطانی غول اس پر چوغ قبا اور شیروانی کا غلاف چڑھا کر کام و دہن کی لذتوں میں مصروف کر کے فکر فردا اور امت مسلمہ کی نیاز سے بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس کو ایسے عنکبوتی جال میں جکڑ دیتے ہیں جہاں وہ کیڑوں کی ہی خوراک بن کر رہ جاتا ہے۔

مولانا قاسمؒ نے اپنے گرد ہالہ بندی نہیں ہونے دی تھی جس سے ان کی سرگرمیاں اور توانائیاں برقرار رہیں، وہ ایک ایسے عبوری دور سے گزر رہے تھے جس میں مسلمانوں کا جاہ وجلال ماند پڑنے لگا تھا، فتنے سر اٹھانے لگے تھے، معاشی بدحالی اور جہالت، دین حنیف پر یلغار کر رہی تھیں، ایسے نازک مرحلہ پر انہوں نے حکمتِ عملی اپنائی کہ مقامی اور عوامی دونوں محاذوں پر بیک وقت اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، مقامی طور پر مدارس اور مکاتب کا جال بچھانا شروع کیا تا کہ آئندہ نسلیں علم دین سے آراستہ اور پیراستہ ہو کر ایمان پر قائم رہ سکیں، چنانچہ دہلی اور اس کے اطراف بلند شہر، مراد آباد، سنبھل، مظفر نگر، ہری دوار، سہارنپور، بجنور، علی گڑھ اور میرٹھ میں دینی مدارس قائم کئے، جن کی شمع سے شمعیں جلتی گئیں اور آج ان کی تعداد دنیا جہان میں ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچ گئی اور کروڑوں

افراداں کی روشنی سے فیضیاب ہو رہے ہیں:

مردے آمد و کارے بکرد

دوسرا محاذ انہوں نے عوامی بحث و مناظرہ کا کھولا تھا، حکومت کے چھن جانے کے بعد معاشی پسماندگی اور جہالت کی ظلمت کی آڑ میں عیسائی پادری اور ہندو پنڈت سادہ لوح مسلمانوں کی ایمانی دولت بھی لوٹ لینا چاہتے تھے۔ اس خطرناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے پادریوں اور پنڈتوں کو عوامی جلسہ اور اجتماع میں مناظرہ کے لئے للکارا جو اسلام یا اس کے کسی شرعی حکم پر اعتراض یا یاوہ گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے تاکہ عوام میں پھیلائی ہوئی افواہوں اور غلط بیانیوں کا اسٹیج پر پردہ فاش ہو جائے۔

ان دونوں محاذوں پر سینہ سپر رہتے ہوئے انہوں نے اپنے علم، تجربے اور مشاہدات کو سفینوں میں انڈیل دیا، درجنوں کتابیں اہل علم اور اہل طلب حضرات کے لئے مشعل نور و ہدایت بنی ہوئی ہیں۔ مولانا وحید الزماںؒ کیرانوی نے اس مرد مجاہد، سالار قافلہ، ایمان و صفا کے عملی پیکر امام قاسم نانوتوی کی تصنیفات اور تالیفات کی ازسرِ نو طباعت و اشاعت کا بیڑہ اٹھایا تھا، اپنے ادارہ دار المصنّفین سے اکابر کی بہت سی کتابوں کو ازسرنو طبع کیا، مرحوم اپنے پروگراموں اور اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیا کرتے تھے، آخری سانس تک بریف کیس، مسودے، قلم اور بڑے نمبر کے دبیز شیشوں کی عینک سرہانے رہی اور یہ کہہ کر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ”اتنی ہی توفیق ملی تھی اتنا ہی کر پایا“ ان کے برادر خورد مولانا عمید الزماں نے ان ادھورے منصوبوں کو پورا کرنے کا بار اٹھایا ہے، جس میں سب سے بڑا منصوبہ مولانا قاسم کے تمام علمی اور ادبی کارناموں کی اشاعت و ترویج ہے۔

آخر اور اخیر میں دل کا بوجھ کم کرنے کی خاطر اپنوں سے، اغیار اور اخیار سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیا اسلام میں جمود اور انجماد کی پذیرائی ہے؟ کیا طریقہائے کار کی بہتری کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں! طریقہائے کار تو کائنات کی نبض تھمنے تک خوب سے خوب تر کو خوش آمدید کہتے رہیں گے۔

اگر انسانی معاشرہ اور اسلامی طرز زندگی اپنے بنیادی ارکان، اقدار اور اصول کے تحفظ کے ساتھ ترقی اور تحسین کے عمل کو قبول کرتا ہے تو ہمیں زمانہ کی رفتار کے ساتھ طریقہائے کار اور حکمت عملی

کوتبدیل کرنا چاہئے۔

مولانا نانوتوی اور ان کے رفقائے کار نے اپنے عہد کے حالات کے تحت دینی دعوت واصلاح کے لئے جو حکمت عملی اختیار کی تھی، ان میں ایک مناظروں اور مباحثوں کے ذریعہ باطل فتنہ پردازوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ اور فریب کا پول کھولنا تھا۔ آج بھی اس کی ضرورت ہیمگر اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہر ملک کی اپنی زبانوں میں اور عالمی سطح پر انگریزی میں اخبارات، رسائل اور انٹرنیٹ کے ابلاغ وترسیل کے نظام کو اپنا کر اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے اور معترضین کے جواب بھی ان کی زبان اور ان کے سکّے میں دیئے جائیں۔ آپ کو تعجب ہوگا بابری مسجد کے انہدام سے پہلے انٹرنیٹ اور ٹیلیفون لائن کے واسطہ سے نشرواشاعت اور باہمی سوال وجواب کے کمپیوٹری نظام کو استعمال کر کے دنیا بھر میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے فارسی میں لکھی گئی تاریخی کتابوں کے حوالہ سے انگریزی میں بار بار یہ بیان نشر کیا گیا کہ مندر کو مسمار کر کے بابری مسجد تعمیر کی گئی تھی، ہم میں سے کسی نے بھی ان حوالوں کی تغلیط اور تردید میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کے بعد چند دنوں کے اندر منصوبہ بند طریقہ سے چند گھنٹوں میں صدیوں سے قائم آہنی گچ اور چونے سے بنی بلند وبالا ٹیلے پر کھڑی حسین گنبدوں والی مسجد حصار بند پولیس کے محاصرہ میں شہید کر دی گئی تھی۔ مولویوں کو تو کیا خبر ہوتی، برسوں سے مسجد کے نام پر لیڈری چمکانے والے لیڈروں اور گیدڑوں کو تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا۔ عنادل آشیانوں اور ایوانوں میں لوریاں سنتے رہےاور باغباں نے مسجد پر میزائل برسادئے۔ **أعدوا لھم مااستطعتم** کا حکم عام ہےاور ہر عہد کے لئے تو ہم کس قدر غافل اور بے عمل ہیں خود اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں۔

کیا ہمارے بڑے اداروں اور جماعتوں کے مراکز میں ایسے شعبے ہیں جو مولانا نانوتوی کی مناظرے کی روایت کو آگے بڑھا کر مقامی زبانوں میں اپنے علاقہ میں اور عالمی سطح پر ترقی یافتہ ذرائع کا استعمال کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈوں کا جواب دیتے ہیں، **ادع الی سبیل ربك بالحکمة** پر عمل کرتے ہوئے **بلغوا عنی ولو آیة** کا فریضہ پورا کر رہے ہیں؟

دوسری حکمت عملی مولانا نانوتوی اور ان کے رفقائے کار نے یہ اپنائی تھی کہ گاؤں گاؤں شہر شہر دینی مدارس قائم کئے جائیں، ان کی آج بھی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے، صبح اور شام کے اوقات

میں ہر گاؤں اور شہر کے ہر محلے میں مسجد میں یا اس سے ملحق عمارتوں میں مکتب قائم ہوں، اہل محلہ اور اہل شہر ہی اس کے کفیل ہوں، عملاً اور عملی طور پر اس کو باعثِ عار سمجھا جائے کہ اپنے گاؤں اور شہر کے مدرسوں کے لئے دوسرے گاؤں یا شہر سے چندہ خیرات مانگی جائے۔ ہم جب اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں، بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتے ہیں تو چند روپے اپنے بچے بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نہیں دے سکتے؟

امام نانوتوی نے تصنیف و تالیف، طباعت و نشر کے شعبہ میں بھی ہماری رہنمائی کی، ہمارے بڑے اداروں میں نشر و اشاعت کے شعبے تو برائے نام قائم ہیں، ان کی کارکردگی دیکھی جائے تو فرد واحد کی انفرادی جدوجہد سے سامنے آنے والے نتائج کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ معاصر دور میں عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وسائل موجود ہوتے ہوئے بھی یہ برائے نام شعبے صرف چند افراد کی خیراتی روزی روٹی کے کفیل بنے ہوتے ہیں۔ جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ مرکزی اداروں میں ملک کی ہر زبان کے ماہر عالم فاضل افراد کی ایک جماعت موجود ہوتی جو قوم اور ملکوں میں پیدا شدہ مسائل، ان کے حل، بنیادی کتابوں اور ان کے ترجمہ کی عالمی سطح پر نشر و اشاعت کی ذمہ دار ہوتی۔

درسیات، نقلیات اور عقلیات کے سارے علوم جمود کا شکار ہو کر رہ گئے، منطق کا ناطقہ بند ہے، میبذی کی ارضی حرکت رک گئی اور شمس بازغہ کی روشنی ماند پڑ گئی، طب نبوی اور طب رازی کے تریاق اغیار لے اڑے، خوارزمی کی حساب دانی سے فائدہ اٹھا کر محیر العقول کمپیوٹر بنائے گئے، یہ بھی ایک تفصیل طلب غور و فکر کا موضوع ہے۔

طریقۂ کار کیا ہو، حکمت عملی کیسی اختیار کی جائے، وہ آپ جیسے عہد کے نبض شناس دانشوروں اور علماء کی ذمہ داری ہے جو قوم کا درد اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

یہی امام قاسم کا پیغام ہم نواؤں کے نام ہے جو ہم سے ہم کلام ہے، یہ سیمینار بھی ان کے پیغام اور کام کو عام کرنے کے لئے منعقد کیا گیا، جو قومیں اپنے اسلاف کی تاریخ اور کارناموں کو فراموش کر دیتی ہیں وہ اپنی وقعت کھو بیٹھتی ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را   گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

☆☆☆

چوتھا باب

اساتذہ ورفقاء

مولانا نور عالم خلیل امینی*

حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ کے اہم اساتذہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مبادیِ نوشت وخوانداور ناظرہ قرآن پاک وغیرہ کے مراحل نانوتہ کے مکتب میں طے کیے۔ مکتب کے اساتذہ کا کوئی ذکر نہ سوانح یعقوبی میں ہے اور نہ سوانح گیلانی میں۔ پھر آگے عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم دیو بند میں، شیخ کرامت حسین (جو بعد میں حضرت نانوتویؒ کے خسر ہوئے اور جو دیو بند کے رئیسوں میں تھے) کے مکان پر مولانا مہتاب علی (متوفی ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) سے پڑھی، جو شیخ الہندؒ کے تایا یعنی ان کے والد مولانا ذو الفقار علی دیو بندی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا مہتاب علی قیامِ دار العلوم کی تحریک میں پیش پیش رہے تھے، قیام دار العلوم کے لیے پہلا چندہ حاجی سید محمد عابد حسین (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء) کا تھا اور دوسرا چندہ اِنھی مولانا مہتاب علی صاحب کا تھا[۱] اس سے آگے کی عربی وفارسی کی تعلیم آپ نے اپنے نانا مولوی وجیہ الدین وکیل سہارنپور کی سرپرستی میں مولوی محمد نواز سہارنپوری سے حاصل کی۔

اس کے بعد کی متوسط اور اعلیٰ تعلیم کی منزلیں آپ نے جن علمائے نام دار کے سامنے طے کیں، ان میں سرفہرست استاذ العلماء مولانا مملوک علی (متوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۷ء) شاہ عبد الغنی مجددی (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) کا نام ان کے تذکرہ نگاروں نے لیا ہے۔

ان اکابر میں سے مفتی صدر الدین آزردہؒ کے حوالے سے یہ پتہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ نے ان سے کون سی کتاب یا مضمون پڑھا تھا، باقی تینوں حضرات سے انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا اس کی تعیین تذکروں میں موجود ہے۔

بہ ہر صورت ان اکابر اربعہ کا مختصر سا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

---

* استاذ ادب عربی ورئیس تحریر مجلّہ "الداعی" دار العلوم دیو بند

مولانا مملوک علی نانوتویؒ

مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ اپنے شاگرد نانوتویؒ کے ہم وطن تھے بلکہ دونوں کے جد اعلیٰ ایک ہی تھے۔ مولانا مملوک علی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ صدیقی ۱۲۰۴ھ/۸۹-۱۷۸۹ء میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، چالیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

مولانا مملوک علی کا جو تذکرہ ہمارے پاس موجود مراجع میں ملتا ہے، اس میں ان کی زندگی کے تشفی بخش حالات اور پھر تعلیم کے مراحل کا ذکر نہیں ملتا، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی اور متعدد اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ارواح ثلاثہ میں ہے کہ:

''مولانا مملوک علی نانوتویؒ جب تحصیل علم کے لیے دہلی تشریف لے گئے، تو یہ صورت پیش آئی کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتے وہ علوم سے قلتِ مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا۔ اس صورت حال سے مولانا سخت ملول اور غم گین تھے۔ ایک روز اسی پریشانی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: ''تحصیل علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا'' شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''اچھا کل آنا'' مولانا اگلے دن حاضر ہوئے، شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا: ''جاؤ! اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ انکار نہیں کرے گا۔'' چنانچہ پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے چلے کہ بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد ہوئے۔''(۲)

حوالۂ بالا سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مولانا مملوک علیؒ نے ایک آدھ ہی سبق سہی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) یعنی حضرت امام شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۶۲-۱۷ء) کے بڑے صاحبزادے سے بھی پڑھا۔ اس طرح ان کا سلسلۂ تلمذ و اسناد بہت عالی ہو جاتا ہے اور بالآخر تمام

---

(۱) تاریخ دیوبند مؤلفہ سید محبوب رضوی طبع دوم (ص ۲۳۱ و ۲۳۲) نیز حاشیہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ج:۱ ص ۱۵۰۔

(۲) ارواح ثلاثہ، بحوالہ روایات الطیب، حکایت نمبر ۱۸۵، نقل از تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص ۹۸ (حاشیہ)

علمائے دیوبند و علمائے ہند کا بھی جنہیں ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

۲۔ مولاناؒ نے ہدایۃ النحو سے قبل کے مراحل گویا اپنے وطن نانوتہ میں طے کر لیے تھے اور ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔

۳۔ دہلی میں متعدد اساتذہ سے کسب فیض کیا، صرف مولانا رشید الدین خاں صاحب سے ہی نہیں جیسا کہ عموماً مولاناؒ کے تذکرہ نگاروں کی عبارت کے ابہام سے سمجھ میں آتا ہے۔

۴۔ مولانا کو ابتدائے راہ میں، علم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی حتیٰ کہ اساتذۂ کرام ان کی قلتِ مناسبت کی وجہ سے ایک سبق سے زیادہ پڑھانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

لیکن آپ نے دیکھا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کی دعاء و توجہات اور التفاتِ قلبی نے انہیں ایسا کندن بنا دیا کہ بقول سرسید (متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء):

''علمِ معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان تمام کتب سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو اُن کی لوحِ حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال وفضیلت پر خلق و حلم، احاطۂ تحریر سے فزوں تر ہے۔''(۳)

یقیناً مولانا مملوک علیؒ نے متعدد اصحابِ کمال سے کسبِ علم کیا ہوگا، لیکن انہوں نے حدیث وفقہ کی اعلیٰ تعلیم اور اکثر علوم معقول و منقول مولانا رشید الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء) سے حاصل کیے، جو مفتی علی کبیر بنارسی، حضرت شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) نیز شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) کے خصوصی شاگرد اور ان کے تربیت یافتہ تھے(۴) شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ان کی تعلیم و تربیت پر بیٹے کی طرح خصوصی توجہ کی تھی، ہر وقت

---

(۳) آثار الصنادید، ج:۲، ص: ۱۱۵، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۰ء

(۴) سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

''مولانا رشید الدین خاں گو ہر فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے، لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں ان کو خاص مہارت تھی اور اس زمانے میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مناظرے میں بھی ان کو زبردست کمال حاصل تھا۔ عربی زبان کے بے نظیر ادیب تھے۔ علم و فضل کے ساتھ مولانا رشید الدین صاحب کا زہد و تقویٰ بھی مسلم تھا، قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، ایک مرتبہ عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۲۵ء میں جب دہلی کا مشہور مدرسہ غازی الدین دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا تو اس میں عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے، سو روپے ماہوار مشاہرہ ملتا تھا، فیاض طبع تھے، جو ضرورت مند پہنچ جاتا حتی المقدور اس کی مدد کرتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا'' (تاریخ دار العلوم دیوبند، ←

ان کی اصلاح وترقی کی فکر وسعی رہتی تھی۔(۵)

مولانا مملوک علیؒ کے فیض رسانی کے دائرے، تلامذۂ باکمال کی کثرت اور مستفیدین کے تنوع اور اکثر شاگردوں کے اپنی اپنی جگہ علم وفضل اور قیادت وتحریک کی جوئے رواں کی حیثیت رکھنے پر ایک نظر ڈالی جائے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی صلاحیت، مقبولیت، مرجعیت، ہمہ گیر افادیت اور علماء وفضلاء کے سرچشمہ ہونے کی کیفیت میں رب کریم کے خصوصی فیضان اور اس کی حکمت ومشیت کو بطور خاص دخل تھا۔ اللہ پاک نے زوالِ علم وعرفان کے اِس دور آخر میں، جس میں اسلامی شان وشوکت کا چراغ سرزمین ہند پر گل ہورہا تھا، مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ہاتھوں علم وعمل کے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب پیدا کیے جنھوں نے ہندوستان کو اسپین بن جانے سے بچانے کے لیے بروقت اور فعال کوششیں کیں، اسلامی اقدار وثقافت کے بجھتے ہوئے چراغ کی لو پھر سے تیز کردی۔

وہ شب وروز تعلیم وتدریس کے لیے غیر معمولی لگن کے ساتھ اپنے کو وقف کیے رہتے اور طالبانِ علوم ان سے استفادے کے لیے پروانہ واران پر ٹوٹتے رہتے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) مولاناؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ''گھر اس کا محط الرجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء وفضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف واقطار ہندوستان میں فاضل ہوکر گئے، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے، اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں، ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف وجوار سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسنِ اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔''(۶)

حق یہ ہے کہ اِس آخری دور میں علم وفضل کی بساط بچھانے والی اکثر شخصیتیں آپ ہی کی

← ج:۱، ص:۱۰۰-۱۰۱، بحوالہ آثار الصنادید)

لیکن حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے ان کی تاریخ وفات ۱۲۴۳ھ لکھ کر ان کے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پاجانے کی تصریح کی ہے۔(ج:۷، ص:۱۹۹)

(۵) تاریخ دارالعلوم، ج:۱، ص:۱۰۰

(۶) تذکرۂ فرائد الدہر از مولوی کریم الدین پانی پتی، ص:۴۰۳۔

شاگرد ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی علوم کے اِحیاء کے ساتھ مغربی علوم کی ترویج کے لیے مدرسہ غازی الدین خاں کا نام، ۱۸۲۵ء میں مدرسہ دہلی کر دیا تھا جو عربک کالج کے نام سے بھی مشہور ہوا، مولانا مملوک علیؒ اس کے صدرالمدرسین تھے، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

''درس وأفاد مدة عمره، وأفنیٰ قواه في ذلك، حتی ظهر تقدّمه في العلماء، أخذ عنه خلق كثير لا يحصون بحدّ وعدّ، كان فيهم كبار العلماء والأساتذة والمنشؤون للمدارس الكبيرة القائدون للحركة العلميّة الدينية''(۷)

یعنی انہوں نے مدۃ العمر تدریسی خدمت وفائدہ رسانی میں گزارا، اپنی ساری توانائیاں اس کی نذر کردیں، حتیٰ کہ علماء کی صف میں ان کی برتری نمایاں اور مسلم ہوگئی، لاتعداد مخلوق نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، جن میں بڑے بڑے علماء واساتذہ، بڑے بڑے مدرسوں کے بنیادگزار اور علمی ودینی تحریک کے قائدین شامل ہیں۔

مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں:

''نیا مدرسہ عربی (یعنی مدرسہ غازی الدین خاں جس کو انگریزوں نے اپنے انتظام میں لے لیا تھا) ان کی ذات سے مستحکم ہے۔(۸) فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم اور فن سے جو اِن زبانوں میں ہیں، مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں، انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئی ہیں، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا

---

(۷) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۵۳۴، ط:۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء۔

(۸) بعض تذکرہ نگاروں جیسے مولانا سید حکیم عبدالحی حسنی (نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۵۳۴) نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک علیؒ نے مدرسہ ''دارالبقاء'' میں بھی تدریس کی خدمت انجام دی تھی، اگر ایسا ہے تو یقیناً مولانا نے اس مدرسے میں عربی کالج سے وابستہ ہونے سے پہلے تدریس کی خدمت انجام دی ہوگی؛ اس لیے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک عربی کالج سے ہی وابستہ رہے اور اسی وابستگی کی حالت میں آپ کا انتقال ہوا۔

مدرسہ دارالبقاء زیر جامع مسجد خود شاہ جہاں نے تعمیر کیا تھا، انگریزوں کے عہد میں سلطنت کی تباہی کے ساتھ مدرسہ بھی برباد ہوگیا تھا، مفتی صدرالدین آزردہ (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے اپنے خرچ پر دوبارہ بنوایا، عمارت درست کرائی، درس وتدریس کا اہتمام کیا، اساتذہ وطلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظیفہ جاری کیا، منتہی طلبہ کو عدالت کے کام سے فارغ ہوکر اسباق خود پڑھاتے تھے اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے (دیکھیے علمائے ہند کا شان دار ماضی مؤلفہ مولانا سید محمد میاں دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء ج:۴، ص:۲۲۳ بحوالہ ''آثار الصنادید'' از سر سید احمد خاں متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۸ء)

ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول سے ہی جانتے ہیں اور جس کار پر مامور ہیں اُس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاذ سے ایسا ہوا ہو۔"(۹)

تدریس کا ملکہ، طلبہ کو مطمئن کرنے اور تفہیم و القاء کی استعداد بھی لاجواب تھی، "تذکرۃ الرشید" میں حضرت گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کا ان کے سلسلے میں یہ ارشاد منقول ہے:

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے؛ لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا، کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کر لیں۔ گویا استاذ نے گھول کر پلا دیا۔ اس زمانے میں اچھے اچھے استاذ دہلی میں موجود تھے، مگر ایسے استاذ کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ایک ہمارے استاذ مولانا مملوک علی صاحب اور دوسرے ہمارے استاذ مفتی صدرالدین صاحب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہما۔"(۱۰)

حضرت مولانا مملوک علی ایسے استاذ الاساتذہ تھے، جن کے خوانِ علم و فضل سے خوشہ چینی کرنے والوں میں زندگی، قیادت، تحریک، علمی و دینی سرگرمیوں اور تعلیمی و تربیتی جدوجہد کے متنوع میدانوں کے شہ سوار نظر آتے ہیں۔

ان کے ممتاز شاگردوں میں امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ بن مولانا مملوک علی (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) مولانا احمد علی سہارنپوریؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد احسن نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ والد ماجد شیخ الہندؒ (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی عثمانی (متوفی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) مولانا محمد منیر نانوتویؒ (متوفی

(۹) تذکرہ طبقات الشعرائے ہند از مولوی کریم الدین پانی پتی، ص: ۴۶۳

(۱۰) "تذکرۃ الرشید" مؤلفہ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) ص: ۳۰-۱

۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) مولانا جمال الدین مدار المہام سکندر بیگم ملکۂ بھوپال (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) مولوی کریم الدین پانی پتی مؤلف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین اہل. ایل. ڈی. دہلوی (متوفی ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) مولانا عالم علی نگینوی مرادآبادی (متوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) مولوی سمیع اللہ حنفی دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) جنہوں نے ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور سرسید کے شریک کار رہے جس کو سرسید احمد خان نے پھر اپنے خون جگر سے زندگی بھر سینچا (۱۱) اور مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (متوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) جیسے حضرات قابل ذکر ہیں؛ لیکن ان کے تذکرہ نگاروں کا یہ جملہ پڑھ چکے ہیں کہ ان سے بے شمار افراد نے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ استاذ الکل مولانا مملوک علیؒ کے پاس دیگر تمام علمائے باکمال (جن میں سے بعض کا اوپر نام لیا گیا) از خود پڑھنے کے لیے گئے تھے؛ لیکن ان کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے علاوہ شاید تنہا امام محمد قاسم نانوتویؒ ہی ایسے واحد خوش قسمت تھے جنہیں مولانا مملوک علی خود ہی اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور ذکاوت وذہانت کے اس پتلے کو علم وعمل کے میدان کا شہ سوار ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بنا دیا۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ میں فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں (یعنی ۱۲۵۸ھ میں) احقر کے والد مرحوم حج کو تشریف لے گئے، احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظِ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا؛ مگر صاف نہ تھا، صاف کرتا تھا۔ مولوی صاحب (یعنی امام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ) سہارنپور سے وطن آئے اور اُن کے نانا کا انتقال اِس سال کے وبائی بخار میں مع بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا...... جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے، تب مولوی صاحب سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ بعد از اجازت والدہ کے، دہلی روانہ ہوئے، ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں وطن سے چلے اور دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے، چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔

---

(۱۱) دیکھیے کتاب نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۸۶، تذکرہ مولوی سمیع اللہ صاحب نیز دیکھیے ص:۴۰ تذکرہ سرسید احمد خاں صاحب

مولوی صاحب نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستاں۔ والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا اُن کے سپرد کر دیا تھا اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی، صیغوں کا اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔"(۱۲)

مولانا مملوک علیؒ سے حضرت نانوتویؒ نے علوم وفنون کی ضروری کتابیں دہلی کالج میں داخلے سے قبل ہی ان کے مکان واقع کوچہ چیلان میں پڑھ ڈالیں اور کس طرح پڑھیں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنیے:

"...... پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی معقول کی مشکل کتابیں: میر زاہد، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے؛ کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے تھے۔"(۱۳)

چنانچہ حسبِ توقع استاذ العلماء کے بعض شاگردوں کو اس پر استعجاب ہوا اور خیال ہوا کہ شاید محمد قاسم بلا سمجھے ایسے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

مولانا محمد یعقوبؒ فرماتے ہیں:

"والد مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو سمجھتے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔"

اس پر استاذ الکل نے جو کچھ فرمایا وہ جہاں ان کی فراستِ علمی، تدریسی مہارت اور طلبہ کی نفسیات کی گہری بصیرت کی غماز ہے، وہیں طالبِ علم محمد قاسم کی غیر معمولی ذہانت اور کسب علم کی تعجب خیز خداداد صلاحیت پر بھی دال ہے۔

مولانا محمد یعقوبؒ لکھتے ہیں:

"جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ میرے سامنے طالبِ علم بے سمجھے چل نہیں سکتا۔ اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔"(۱۴)

پھر استاذ العلماء نے مولانا محمد قاسم کو دہلی کالج میں داخل کرا دیا جہاں وہ خود صدر الاساتذہ

(۱۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم بقلم مولانا محمد یعقوب بن مولانا مملوک علی نانوتوی، ص: ۵۔۶

(۱۳) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۶، مطبوعہ دیوبند

(۱۴) حوالۂ بالا، ص: ۶

تھے، اس کے بعد بھی ان کی ماورائے کالج اپنے پاس تعلیم جاری رکھی جیسا کہ کالج میں بھی متعلقہ مضامین ان کو پڑھائے ہوں گے۔

مولانا محمد یعقوبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہوجیو، میں ان کو پڑھالوں گا اور (مولوی محمد قاسم سے) فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعدِ حساب کی مشق کرلو، چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ ازبس کہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا، طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی، یہ کب عاری تھے، ہر بات کا جواب باصواب تھا، آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے؛ ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔''(۱۵)

امام نانوتویؒ نے ہر چند کہ مولانا مملوک علیؒ کے بعد دیگر اساتذۂ کرام سے بھی کسب علم کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ استعداد سازی اور اساس گزاری کا اصل کام مولانا مملوک علی ہی نے انجام دیا جنہیں خدائے حکیم نے استاذ الجلیل اور معلم العلماء بنا کر پیدا کیا تھا۔

۱۱؍ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۹؍ستمبر ۱۸۵۱ء کو انتقال فرمایا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے قبرستان واقع مہندیان میں مسجد کے سامنے آسودۂ خواب ہوئے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ

مفتی صدرالدین خاں آزردہ (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کے متعلق پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے کہ امام نانوتویؒ کے اساتذہ کی فہرست میں آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ تعیین نہیں کی جاتی کہ آپ نے ان سے کیا پڑھا؟

چونکہ مفتی صاحب مولانا نانوتویؒ کی دہلی کی طالب علمی کے زمانے میں حیات تھے، ان کی عظمت وشہرت، مسلمانوں کے تمام طبقوں میں ان کی مقبولیت اور تمام علم وفن میں ان کے یگانہ روزگار ہونے کی وجہ سے طالبانِ علوم ان سے کسی طور استفادے کی کوشش ضرور کرتے تھے؛ اِس لیے یہ قرین

(۱۵) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۶-۷، مطبوعہ دیوبند

قیاس بھی ہے کہ امام نانوتویؒ نے بھی ان سے علمی استفادہ ضرور کیا ہوگا۔

اِس قیاس کو تقویت ''تذکرۃ الرشید'' (سوانح امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''حضرت گنگوہی فراغت کے کئی سال بعد اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اسی سلسلے میں حضرت مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور کی خدمت میں بھی حاضری دی؛ کیونکہ آپ نے ان سے بھی بعض کتابیں پڑھی تھیں اور وہ آپ کے اساتذہ میں تھے۔ ملاقات کے دوران مفتی صاحب نے حضرت گنگوہی سے دریافت فرمایا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے بتایا کہ ایک مطبع میں تصحیح کا کام کرتے ہیں، دس بارہ روپے تنخواہ ہے، تو مفتی صاحب نے ران پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''قاسم اتنا سستا، اتنا سستا؟!۔'' (۱۶)

اس عبارت سے بعض تذکرہ نگاروں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت نانوتویؒ سے مفتی صاحب کی اتنی واقفیت اور ان کی علمی قدر و منزلت کی اتنی شناخت جس کا اظہار آپ نے ''قاسم اتنا سستا، اتنا سستا؟'' والے انتہائی استعجاب کے لہجے سے کیا ہے تب ہی ہو سکتی تھی جب امام نانوتویؒ نے ان سے پڑھا ہوگا اور انھوں نے ان کو قریب سے دیکھا اور برتا ہوگا؛ کیونکہ ایک استاذ ہی کو اپنے شاگرد کی حقیقی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے۔

نیز یہ کہ مولانا گنگوہیؒ اور نانوتویؒ دونوں دہلی کی طالب علمی میں یک جان و دو قالب بن گئے تھے اور یہ کیفیت زندگی کے آخری لمحے تک باقی رہی، تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت گنگوہی کوئی کتاب کسی عظیم استاذ سے پڑھیں اور امام نانوتویؒ اس میں ان کے شریک نہ ہوں۔

بہر صورت مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کا مختصراً تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

مفتی صدر الدین آزردہ اپنے زمانے کے بلاشبہ مجمع الکمالات اور نادرۂ روزگار لوگوں میں تھے، ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، آپ کے آباء و اجداد کشمیری تھے، والد کا نام لطف اللہ تھا۔ معقولات کی تعلیم مولانا فضل امام خیر آبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء)

(۱۶) تذکرۃ الرشید، ص: ۳۲

سے حاصل کی جب کہ منقولات یعنی فقہ وحدیث واصول وغیرہ حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے حاصل کیا۔ وہ موسوعی عالم تھے۔ علماء واہل افتاء کے صدر، شعراء کے امیر، ادباء کے امام، بزم تدریس کے صدر نشیں، ہر دل عزیز اور خوبیوں کا مجسمہ تھے۔

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) جو مفتی صاحب کے اخص تلامذہ میں تھے، اپنی مشہور اردو کتاب ''حدائق الحنفیہ فی طبقات المشائخ الحنفیہ'' میں رقم طراز ہیں:

''مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور تمام علوم: صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولی رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آباء واجداد آپ کے کشمیر کے اہل بیت علم وصلاح تھے مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی، علوم نقلیہ: فقہ، حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضل امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ (شاہ) محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔

''آپ بڑے صاحبِ وجاہت و ریاضت اور اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے، ریاستِ درس وتدریس خصوصاً، افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ وشمالیہ دہلی اور امتحانِ مدارس وصدارت حکومتِ دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہِ دہلی کے تمام اعیان واکابر، علماء وفضلاء خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلباء واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (انشاء پرداز) بغرضِ اصلاحِ انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔

''اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوتِ حافظہ وحسن تحریر ومتانتِ تقریر وفصاحتِ بیان اور بلاغتِ معانی کے صاحبِ مروت واخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا۔ طلبہ مدرسۂ دارالبقاء (۱۷) اکثر طعام ولباس وبعضے ماہوار، جناب سے پاتے اور آپ سے اور دیگر علماء سے

---

(۱۷) پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مدرسۂ دارالبقاء جامع مسجد کے نیچے شاہ جہاں کا تعمیر کردہ مدرسہ تھا جو زوال سلطنت کے ساتھ برباد ہوگیا تھا، مفتی صدرالدینؒ نے اپنے ذاتی خرچ پر اس کا احیا کیا اور اس کے دیگر مصارف کے کفیل رہے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۸، دوسرا پیراگراف۔

تحصیل علم کرتے تھے۔"(۱۸)

صاحبِ "نزہۃ الخواطر" لکھتے ہیں:

"وہ (مفتی صدرالدین خاں آزردہ) ہر علم وفن خصوصاً علوم ادبیہ میں نادرۂ عصر تھے۔ کسی بھی علم وفن کے متعلق ان سے رجوع کیا جاتا تو سننے اور دیکھنے والے کو ایسا لگتا کہ اسی فن میں انہیں اختصاص ہے اور اس کو یقین کرنا پڑتا کہ وہ اس فن میں طاق ہیں؛ اسی لیے تم دیکھتے کہ علماء انہیں علم کا بے نظیر پہاڑ تصور کرتے ہیں، شعراء انہیں فنِ شعر کا علم بردار گردانتے ہیں اور امراء ہر معاملے میں ان سے رجوع ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ خوش حال اور کشادہ رزق تھے۔"(۱۹)

سرسید احمد خاں بانیِ اے ایم یو کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نے اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں مفتی صاحب کا تذکرہ وجد آمیز اور مسرت سے لبریز لب ولہجے میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کے تذکرے کا آغاز مشہور مدحیہ شعر سے کیا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبیست

اس کے بعد ایک فکر وفلسفے سے لبریز مدحیہ تمہید کی ہے، پھر پر شوکت الفاظ اور زرق برق اسلوب میں ان کی اس طرح مدح سرائی کی ہے کہ سطر سطر سے عقیدت مترشح ہے اور بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کی جلالتِ شان، علمی آن بان اور فضل وکمال کے تنوع کا جادو کس طرح سرسید کے قلم کو سرمست کیے دے رہا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں:

"قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس زبدۂ جہاں وجہانیاں کی صفات کا احصار (احاطہ وشمار) محالات سے اور کمالات کا حصر (احاطہ) مرتبۂ متعسرات سے (دشوار گزار چیزوں کے درجے میں) ہے، جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت، صفات میں سے لکھے؛ یا زبان ارادہ

---

(۱۸) حدائق الحنفیہ (نقل از "علمائے ہند کا شاندار ماضی" ج:۴، ص: ۲۲۱-۲۲۲)

(۱۹) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص: ۲۴۶

کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے، جو کہ ہر صفتِ قابلیت اوّل لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے: مدت تک یہی عقدہ بند زبانِ تحریر اور گرہِ لسانِ تقریر رکھتا ہے کہ کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتداء کرے:

مجلس تمام گشت وبپایاں عمر رسید
ماہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

"بے شائبۂ تکلف و بے آمیزشِ مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مجمع علومِ بے منتہا ہو، اب سوا اس سرگروہِ علمائے روزگار کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہیں۔"

مفتی صاحب اعلیٰ درجے کے عالم، مفتی، قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ، عربی، اردو اور فارسی نظم ونثر اور فصاحت وبلاغت میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ سرسید نے ان کی عربی نثر، فارسی نثر اور عربی، فارسی اور اردو (جسے اس وقت ریختہ کہتے تھے) شعر کے نمونے درج کیے ہیں۔

مفتی صاحب "جس طرح متنوع العلم والکمال تھے، اسی طرح متنوع المشاغل بھی تھے، جوان کی کسبی و وہبی صلاحیت کی بھرپور غماز تھیں۔

مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ فرماتے ہیں:

"مفتی صاحب نے غالباً زمانۂ اسارت میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ (۲۰) کو ایک خط لکھا تھا جس میں پچھلی زندگی (یعنی ۱۸۵۷ء کی کوششِ انقلاب میں ہندوستانیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد کی زندگی) کے مشاغل کا تذکرہ تھا، ملاحظہ فرمایئے:

"شکر ہے اس پروردگارِ عالم کا جس نے مجھے ایسی دلدل سے کہ ہمہ اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اُن سے سوائے اِس صورت کہ جو پیش آئی، ممکن نہ تھا۔ مقدماتِ اصلی کا فیصل کرنا؛ منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا؛ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات کے دوران میں فتوے دینا؛ کمیٹیوں میں حاضر ہونا؛ طلبۂ مدرسۂ سرکاری کا امتحانِ ماہ واری لینا؛ احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا؛ ہزار بار کاغذات پر دستخط کرنا؛ پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف وجوانب کے سوالاتِ شرعی کا جواب دینا؛ وہابیوں اور بدعتیوں

(۲۰) تلمیذِ مومن وغالب جن کا دوسرا تخلص حسرتی بھی تھا، متوفی ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء

کے جھگڑے میں حکم (ثالث) ہونا؛ مجلس شادی وغمی اور اعراس میں جانا؛ شعر وشاعری کی صحبت گرم رکھنا؛ باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔''(۲۱)

۱۸۵۷ء کے جدوجہد آزادی کی موافقت میں جن علماء نے فتوے دیے ان میں مفتی صاحب پیش پیش تھے، بلکہ وہ انقلابی سرگرمیوں کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے دس سال قبل جب رئیس المجاہدین مولانا احمد اللہ شاہ صاحبؒ (ش ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) دہلی تشریف لائے تھے تو مفتی صاحب نے ہی اپنی دور اندیشی کی بنا پر موصوف کو مشورہ دیا کہ اپنی جدوجہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ کو بنائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مفتی صاحب کے تعاون سے انہیں آگرہ میں قدم جمانے اور اپنی سرگرمیاں انجام دینے کا موقع ملا۔ (۲۲)

مولانا سید محمد میاں دہلویؒ لکھتے ہیں:

''۱۱رجولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور چند روز ہی علمائے دہلی سے اس جدوجہدِ آزادی کی حیثیت مشخص کرانا چاہی، تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ فتوی مرتب کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا کہاں تک دخل تھا، البتہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتوی پر سب سے پہلے دستخط کیے، اُن میں حضرت مفتی صاحب کا اسم گرامی آج تک زیبِ قرطاس ہے۔''(۲۳)

اسی لیے ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی کے بعد مفتی صاحب کو باوجودے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے صدر الصدور اور مفتی کے منصب پر فائز تھے انگریزوں کی شدید پکڑ کا سامنا کرنا پڑا، جانِ عزیز تو کسی طرح بچ گئی، لیکن تمام املاک وجائے داد ضبط کرلی گئی، کئی ماہ نظر بند بھی رہنا پڑا۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبہ کاریاں ہوئیں، آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا؛ نوکری موقوف، جائیداد ضبط۔ ناچار خستہ وتباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائے داد

---

(۲۱) ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' ج:۴، ص:۲۲۴

(۲۲) حوالہ بالا، ص:۲۲۵

(۲۳) حوالہ بالا، ص:۲۲۸

واگذاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ امداد (واگذاشت جائیداد کی آمدنی) ان کے گزارے کو کافی ہے؛ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک آپ کی بی بی، بتیس چالیس روپے مہینہ کی آمدنی؛ لیکن امام بخش (صہبائی) (۲۴) کی اولاد ان کی "عترت" (خان دان) ہے، وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی، ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں، یعنی اسی برس کے قریب عمر ہوگئی۔ خدا سلامت رکھے، بہت غنیمت ہیں۔" (۲۵)

نظر بندی کے بعد رہائی ملی تو مفتی صاحب لاہور چلے گئے، وہاں پنجاب کے چیف کمشنر "لارڈ جان لارنس" کے ذریعے، جو مفتی صاحب کے دہلی میں مہربان رہ چکے تھے، جائے داد کی واگزاری کی کوشش کی، لیکن منقولہ جائے داد کی واپسی ممکن نہ ہو سکی، البتہ غیر منقولہ جائداد واگزار ہوگئی، پھر دہلی واپس آگئے اور بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں قیام کیا اور پھر اپنی حویلی واقع کوچہ چیلان میں خانہ نشین ہوئے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو عبادات و وظائف اور تدریس علوم دینیہ میں صرف کیا۔

وفات

زندگی کے آخری سالوں میں ایک دو سال فالج کے مرض میں مبتلا رہے، اور ۸۱ سال کی عمر میں پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/جون ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔

مولانا فقیر محمد جہلمیؒ یکے از تلامذۂ مفتی صدرالدین آزردہؒ لکھتے ہیں:

"یہ مؤلف بھی ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹،۶۰ء) میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تیرہ ماہ تک ان کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی و عقلی کا استفادہ کرتا رہا۔ اس وقت مولانا موصوف باوجودے کہ چوہتر (۷۴) سال کے تھے، مگر ذوقِ شعر و سخن میں جوانانِ عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا اور مقتضا اس کے ہمیشہ فرطِ عشق اور ولولۂ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ خاطر، دیدۂ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے۔ اشعار پڑھنے میں نہایت

---

(۲۴) ش ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء (۲۵) غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی متوفی ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء (نقل از علمائے ہند کا شاندار ماضی)

دل شگاف آواز، لحنِ حزیں اور صورت دردانگیز رکھتے تھے، جس نے آپ کی زبان سے سخنِ موزوں سنا ہے وہی اس کی کیفیت جانتا ہے کہ کیا انشاء وشعر تھا یا ایجادِ سحر۔"(۲۶)

مفتی صاحب کا ایک شعر زبان زدِ خاص وعام ہے:

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ

شاہ عبدالغنی عمری مجددی دہلوی مہاجر مدنی بن ابوسعید بن صفی القدر (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء) امام ربانی مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ شاہ صاحب نے تمام علوم وفنون مرکزِ علم وثقافتِ اسلامی دہلی میں حاصل کیے، حفظِ قرآن پاک کے بعد صرف ونحو اور تمام عربی علوم مولانا حبیب اللہ دہلوی سے حاصل کیے فقہ وحدیث کی اکثر کتابیں اپنے والد شاہ ابوسعید (متوفی ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) سے پڑھیں جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ خصوصاً صحاح ستہ نیز مؤطا امام محمد، بخاری شریف حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) سے پڑھی۔ جبکہ "مشکاۃ المصابیح" حضرت شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھی۔ پھر حجاز مقدس میں حدیث کی تمام کتابوں کی سند واجازت شیخ محمد عابد سندی اور شیخ ابوالزاہد اسماعیل بن ادریس رومی ثم المدنی سے حاصل کی۔

حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی "انجاح الحاجہ" کے نام سے سنن ابن ماجہ پر گراں قدر تعلیقات ہیں۔

۱۲۷۳ھ میں مدینۂ منورہ ہجرت کر گئے اور وہیں مقیم ہوگئے اور وہیں چہار شنبہ ۶ محرم ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

علامہ عبدالحی کتانیؒ نے اپنی کتاب "فہرس الفہارس والاثبات" میں شاہ عبدالغنیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"متاخرین کے سلسلوں میں شاہ عبدالغنی کے سلسلۂ حدیث سے طاقتور اور قابل اعتماد کوئی سلسلہ

(۲۶) حدائق الحنفیہ، ص: ۴۸۲

نہیں؛ کیونکہ یہ سلسلہ اپنی بلندی کے ساتھ ساتھ اعصار و امصار کے ائمہ اور اہلِ علم و عمل کے ذریعہ مسلسل اور مربوط ہے۔"(۲۷)

حضرت شاہ صاحب، ولی اللّٰہی سلسلے کی براہ راست اور مضبوط کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں علم حدیث کی یہ مجلس ولی اللّٰہی اور درس گاہِ علوم نبوی اجڑ گئی۔ علم و تقویٰ، دیانت، امانت، اتباع سنت میں اپنی مثال آپ تھے، سرسید اپنی معرکتہ الآراء کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں:

"......اوقات آپ کی ایسی خوب ہے کہ اگلے زمانے کے اچھے اچھے دیندار لوگوں کی بھی شاید ایسی ہوئی ہوگی۔ مسجد میں بیٹھے رہنا اور طریقۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو برتنا دن رات آپ کا کام ہے......اس قدر اتباعِ سنت اختیار کیا ہے کہ اگر آپ کو آسمان و زمین کے رہنے والے محی السنۃ اور قامع البدعہ کہہ کر پکاریں تو بجا ہے۔ ان کے نزدیک سوائے انحراف کمتر حکم شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں، ارتکاب اُس امر خلافِ سنت کا، جس کو ہم کم بخت لوگ بال سے کم جانتے ہیں، ان کے نزدیک امر محال ہے۔ اس تقویٰ اور ورع کو خیال کرو کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع و شرا بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے، وہ از روئے شرع شریعت کے درست نہیں، اُن چیزوں کے مزے سے واقف نہیں...صرف اتباعِ سنت کے لیے ہزارہا نعمتِ دنیائے دوں پر لات ماری ہے اور گوشہ نشینی اختیار کی ہے، ملاقات اور مکالمات میں ہرگز پیروی سنت کی نہیں چھوڑتے اور ادائے سنت کے ترک سے کسی چیز کو برا نہیں جانتے ہیں۔"(۲۸)

صاحب "نزہۃ الخواطر" لکھتے ہیں:

"سچائی و دیانت داری، پاک دامنی و پرہیزگاری، حسنِ نیت و اخلاص، انابت الی اللہ، خوفِ خدا، اس کی عظمت کے استحضار، سنت کی پابندی، دعاء و مناجات، حسنِ اخلاق، مخلوق کو فائدہ پہنچانے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے، دنیا اور اس کے اسباب سے کنارہ کشی وغیرہ کے ساتھ ساتھ علم و عمل، زہد و حلم اور بردباری میں امامت انھی پر ختم تھی......عرب و عجم کا ان کی ولایت اور جلالتِ شان پر اتفاق تھا۔"(۲۹)

---

(۲۷) "العناقید الغالیہ من الأسانید العالیہ" از مولانا محمد عاشق الٰہی برنی مقیم مدینہ منورہ، ص:۳۴۔۳۵

(۲۸) آثار الصنادید، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۰ء، ج:۲، ص:۴۴ (۲۹) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۳۲۰۔۳۲۱

دیگر سیکڑوں علمائے کرام کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے بھی انھی سے حدیث پاک پڑھی اور اس کی سند و اجازت حاصل کی۔ البتہ "سنن ابوداؤد" حضرت نانوتوی نے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) سے پڑھی، جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

ہندوستان میں احادیث کی کتابوں کو طبع کر کے عام کرنے اور ان پر گراں قدر حواشی لکھ کر علماء وطلبہ پر ناقابل فراموش احسان کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے۔

آپ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں سہارنپور کے انصاری خاندان میں پیدا ہوئے۔

مولانا احمد علی بن لطف اللہ سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۰۰ء) نے قرآن پاک میرٹھ میں حفظ کیا اور عربی کی ابتدائی کتابیں سہارنپور میں بانیِ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور مولانا سعادت علی (متوفی ۱۲۸۶ھ) سے پڑھیں جو حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی (ش ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی جماعت کے مخصوص افراد میں تھے۔ پھر دہلی تشریف لے گئے جہاں استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مولانا وصی الدین سہارنپوری اور مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے کسب علم کیا جو مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڈھانوی کے شاگرد تھے، حدیث پاک کی تحصیل مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحاق بن محمد افضل دہلوی (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) نبیرہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے کی، سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں لکھتے ہیں:

> "حدیث کی تحصیل مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے اس طرح کی کہ روزانہ فجر سے ظہر تک حرم میں بیٹھ کر پہلے احادیث کی نقل کرتے اور ظہر کے بعد عصر تک شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر نقل کی ہوئی احادیث کی سماعت کرتے تھے۔ حدیث کی تمام کتابیں شاہ صاحب سے اسی طرح پڑھیں۔" (۳۰)

سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ کتب احادیث کی نشر و اشاعت اور تصحیح و تحشیہ میں دل و جان سے لگ گئے، اِس غرض سے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں دہلی میں مطبع احمدی قائم فرمایا، جس سے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی،

(۳۰) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص:۱۰۶

۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مشکاۃ المصابیح انتہائی اہتمام کے ساتھ شائع فرمائی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہ مطبع میرٹھ منتقل ہو گیا۔

تحصیل علم کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذریعہ معاش کے طور پر مولانا احمد علیؒ کے اِسی مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار کیا اور مولانا احمد علی صاحب کے حکم پر صحیح بخاری کے آخر کے پانچ چھ سپاروں کے حواشی بھی لکھے۔

چونکہ حضرت نانوتوی نئے نئے فارغ التحصیل تھے؛ اس لیے بعض لوگوں کو مولانا احمد علی صاحب کے اس اقدام پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے ایک نوعمر عالم کو اتنے بڑے کام کی ذمہ داری سپرد کر دی تو مولانا احمد علیؒ نے فرمایا کہ میں نے سوچ سمجھ کر ان کے سپرد کیا ہے، میں ایسا نادان نہیں کہ بلا سوچے سمجھے اتنا بڑا اقدم اٹھالوں۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں:

''جناب مولوی احمد علی سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سپارے جو آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا، مولانا صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بہ طور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا؟! اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ ''میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں'' اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان لوگوں کو دکھلایا، جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا، جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کیے ہیں اور ان کے جواب لکھنے، معلوم ہے کتنے مشکل ہیں؟! اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے، محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔''(۳۱)

---

(۳۱) سوانح مولانا قاسم بقلم مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مطبوعہ دیوبند، ص: ۷۔۸

حضرت نانوتوی نے کب مطبع میں کام شروع کیا، کب تحشیہ کا کام کیا اور کب ابوداؤد شریف پڑھی؟

مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی لکھی ہوئی سوانح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء سے قبل حضرت نانوتوی تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے اور ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء کے بعد ایک سال کے قریب ان کا قیام مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے مکان واقع کوچہ چیلان ہی میں رہا۔ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں مولانا محمد یعقوب صاحب ملازمت کے لیے اجمیر چلے گئے، تو کچھ دن حضرت نانوتوی دہلی میں دوسری جگہوں پر رہے اور اسی زمانے میں تحشیہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ حضرت نانوتویؒ کے رفیق درس حضرت گنگوہیؒ کے متعلق یقین کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ دہلی میں وہ چار سال تعلیم حاصل کر کے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں فارغ ہو کر اپنے وطن گنگوہ لوٹ گئے: اس لیے حضرت نانوتوی کا سن فراغت بھی یہی سال ۱۲۶۵ھ ہو سکتا ہے کیوں کہ دونوں حضرات ہم سبق اور ہم استاذ تھے۔

صحیح بخاری پہلی مرتبہ مطبع احمدی سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں چھپی تھی؛ اس لیے ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء ہی وہ زمانہ ہو سکتا ہے، جس میں حضرت نانوتوی نے صحیح بخاری کے پانچ چھ پاروں کی تصحیح اور حاشیہ نگاری کا کام کیا ہوگا۔ گویا اپنی عمر کے ۲۱ ویں سال میں انھوں نے اتنا بڑا کام عربی زبان میں انجام دیا۔ (۳۲)

اور چونکہ حضرت نانوتویؒ نے ابوداؤد شریف مولانا احمد علی محدث سے تصحیح کے تعلق کے بعد ہی پڑھی ہوگی جیسا کہ قرین قیاس ہے؛ اس لیے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء سے ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء تک کے دوران ہی کسی وقت انھوں نے ابوداؤد شریف پڑھی ہوگی:

> ''علمائے مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات'' سے معلوم ہوتا ہے کہ محدث سہارنپوری نے ۱۸۵۷ء میں مطبع کو نقصان پہنچنے کے بعد اس کو میرٹھ منتقل کر دیا، پھر اس کے بعد میرٹھ کے رئیس شیخ الہی بخش کی طرف سے کلکتہ جا کر وہاں تجارت شروع کر دی۔ تقریباً دس سال وہاں قیام رہا۔ (۳۳)

---

(۳۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص:۱۱۱-۱۱۲

(۳۳) علمائے مظاہر علوم، ج:۱، ص:۵۵

۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مستقل قیام کی نیت سے کلکتے سے سہارنپور تشریف لے آئے اور مظاہر علوم کے نائب اہتمام کے عہدہ کی زینت بنے نیز ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں مظاہر علوم کے صدر المدرسین مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء) حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے، تو آپ نے نیابت اہتمام کے ساتھ ساتھ صدر المدرسینی کی ذمے داری کو بھی رونق بخشی اور کتبِ حدیث واصولِ حدیث وتفسیر وفقہ کا درس بھی دیا۔

مظاہر علوم کی تعمیر وترقی میں، باقاعدہ وابستگی سے قبل سے ہی، محدث سہارنپوریؒ نے حصہ لیا اور ۱۲۹۲ھ کے بعد سے باقاعدہ اور آخر تک اس کی ہر طرح کی ترقی میں کوشاں رہے۔(۳۴)

اسی کے ساتھ مولانا احمد علی محدث زہد وورع، فروتنی وتواضع اور کسر نفسی میں اپنے اسلاف کی روشن مثال تھے۔ حالاں کہ انھوں نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور تعلیم وتدریس کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا، اس لیے اللہ پاک نے فارغ البالی اور تمول سے نوازا تھا، اس کے باوجود گھر کی ضروریات اور خورد ونوش کا سامان خود ہی بازار سے خرید کر لایا کرتے تھے۔ تقوی کا یہ عالم تھا کہ کوہر کی فروخت جب شروع ہوتی تو آم کھانا چھوڑ دیتے۔ جب خود اپنا باغ خرید لیا تو اس وقت اپنا یہ معمول بھی ترک کر دیا۔(۳۵)

ان کی پرہیزگاری اور احتیاط کا ایک واقعہ ہماری نسل کے تمام علماء وداعیانِ اسلام کے لیے باعث عبرت وموعظت ہے:

> ''جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندے کے سلسلے میں کلکتے تشریف لے گئے کہ وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے، تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کے آمد وخرچ کا مفصل حساب مدرسے میں داخل کیا، اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتے میں فلاں جگہ میں اپنے دوست سے ملنے گیا تھا، اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا؛ لیکن میرے سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی، چندے کی نہیں تھی؛ اس لیے وہاں کی آمد ورفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کرلیا جائے۔''(۳۶)

---

(۳۴) حوالۂ بالا، ص:۵۵۔۵۸ (۳۵) حوالۂ بالا، ص:۵۸

(۳۶) علمائے مظاہر علوم، ج:۱،ص:۵۸ بحوالہ ''آپ بیتی'' از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، ج:۱،ص:۲۱

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ مدرسہ مظاہر علوم کی روداد میں اِس طرح درج ہے:

''مولوی احمد علی صاحب سہارنپور سے بنارس جب نواب صاحب والیِ ٹونک کی خدمت میں تشریف لے گئے، تو مولوی صاحب موصوف نے کانپور سے بنارس تک کا کرایہ لیا اور یہاں سے کانپور کا کرایہ چوں کہ اپنا کام بھی اِس ضمن میں تھا، مدرسے سے نہیں لیا اور جناب نواب صاحب کی طرف سے سوائے چندۂ مدرسہ کے، پندرہ روپے بہ طور دعوتِ خاص مولانا موصوف پیشکش ہوئے تھے، وہ بھی مولانا صاحب نے مدرسے میں داخل کردیے۔''(۳۷)

دارالعلوم دیوبند چوں کہ ان کے اخلاص پیشہ اور باکمال شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جدوجہد کا خاص ثمرہ تھا؛ اس لیے اس سے ان کی محبت دوچند تھی۔ دارالعلوم کے نودرے کی مشہور اور سب سے پہلی عمارت ''نودرہ'' کا سنگِ بنیاد حضرت محدث سہارنپوریؒ ہی کا رکھا ہوا ہے۔ دارالعلوم کی روداد بابت ۱۲۹۲ھ میں تحریر ہے:

''اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا مولوی قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔''(۳۸)

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے تلامذہ کی فہرستِ میں بڑے بڑے باکمال علماء کا نام ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) جنہوں نے سنن ابوداؤد شریف ان سے پڑھی تھی۔

(۲) مولانا حافظ سید تجمل حسین صاحب دیسوی بہاری (متوفی ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء) انھوں نے محدث سہارنپوری سے ۱۲۹۵ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں بخاری و مسلم شریف پڑھی تھی۔

(۳) مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی (متوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ وغیرہ پڑھی۔

---

(۳۷) علمائے مظاہر علوم، ج:۱، ص:۵۹، بحوالہ روداد مدرسہ مظاہر علوم بابت ۱۲۹۹ھ، ص:۴

(۳۸) علمائے مظاہر علوم، ج:۱، ص:۵۹، بحوالہ روداد دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۲ھ

(۴) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) انہوں نے محدث سہارنپوری سے وشاہ عبدالغنی مجددی سے صحیح بخاری و جامع ترمذی اور دیگر کتب حدیث پڑھی تھیں۔

(۵) مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ (متوفی ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء) جنہوں نے ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ کا مظاہر علوم سہارنپور میں درس لیا۔

(۶) مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری (متوفی ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) انہوں نے مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اور شیخ نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے علاوہ محدث سہارنپوری سے بھی تحصیل علم حدیث کیا تھا۔

(۷) مولانا محمد احسن نانوتوی (متوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) نے علم حدیث کی تکمیل مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کے علاوہ محدث سہارنپوری سے بھی کی۔

(۸) مولانا محمد اشرف علی سلطانپوری، ۱۲۹۵ھ میں محدث سہارنپوری سے بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مؤطا امام محمد پڑھی۔

(۹) مولانا سراج الحق صاحب دیوبندی، آپ نے بھی ۱۲۹۵ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

(۱۰) مولانا شاہ ابوالحسن صاحب سہارنپوری (متوفی ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ پڑھی۔ (۳۹)

وفات

محدث سہارنپوری پر آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا اسی کے ساتھ بخار اور ضعف بھی طاری ہوگیا۔ ایک عرصے تک علیل رہے۔ حضرت نانوتوی عیادت کو تشریف لائے اور ۱۴ روز سہارنپور میں قیام فرمایا۔ آخرکار ۶/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۷/ اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ کے روز یہ محدث جلیل اپنے مولی سے جاملا۔ سہارنپور میں اپنے جدی قبرستان متصل عیدگاہ میں تدفین عمل میں آئی۔ بوقت وفات عمر تقریباً ۷۲ سال تھی کیونکہ آپ کی ولادت ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کی ہے۔ ''خزانہ خوبی'' ۱۲۹۷ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔

---

(۳۹) علمائے مظاہر علوم، ج:۱، ص:۶۰-۶۶

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی*

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

اور ان کے نامور رفقاء

دیوبند عنوان ہے ایک علمی، فکری اور انسانیت کی فلاح وتعمیر کی عالمی تحریک کا، نئی صدی میں قدم رکھتے ہوئے ہمیں انیسویں صدی میں برپا ہونے والی اور پروان چڑھنے والی اس تحریک کے پس منظر اور نشیب وفراز کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہئے جس کے ایک اہم اور ممتاز رکن سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ تھے۔

دنیائے آب وگل میں ان کی زندگی کے لمحات کی گنتی تو پچاس سال[۱] سے بھی کم ہے، لیکن ان کے فکر کے چراغوں کی روشنی اور ان کی راہ عمل کے نقوش اور اس کے اثرات ونتائج صدیوں اور قرنوں کے دائروں میں محدود نہیں ہیں:

زمانہ ہو گیا گزرا تھا کوئی بزم انجم سے
غبارِ راہ روشن ہے بشکل کہکشاں اب تک

میر کارواں کے ساتھ اس مقدس کاروانِ فکر وعمل کے نامور اور عالی مقام رفقاء کی خدمات بھی کچھ کم نہیں ہیں، ان کی زندگی کے مختلف گوشے اور ان کی خدمات کی جہتیں آنے والی نسلوں کے لئے جرس کارواں کی طرح مسلسل پیغام ہیں بیداری کا، عمل کا، حرکت کا اور آگے بڑھتے رہنے کا۔

(۱) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۲) مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی (۳) حضرت حاجی سید محمد عابد دیوبندی (۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۵) مولانا رشید احمد گنگوہی (۶) مولانا محمد منیر

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ولادت ۱۲۴۸ھ؍۱۸۳۲ء، وفات ۱۲۹۷ھ؍۱۸۸۰ء

* دارالسلام اسلامی مرکز دہلی گیٹ، مالیرکوٹلا، پنجاب

نانوتوی (۷) مولانا حافظ ضامن شہید (۸) مولانا رفیع الدین دیوبندی (۹) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۰) مولانا ولایت علی (۱۱) مولانا جعفری تھانیسری

کوئی میدان جہاد میں آپ کے ہم رکاب ہے، کوئی درس کا ساتھی ہے اور کوئی مدرسہ عربی کے قائم کرنے میں آپ کے قدم بقدم ہے، کوئی اس تحریک کے آگے بڑھانے میں آپ کے افکار کی ترویج واشاعت میں۔

بات شروع ہوئی ہے ۱۶۰۱ء سے، برطانیہ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی قافلے نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں مغل بادشاہوں سے برطانیہ کے یہ تاجر رعایتیں حاصل کرتے رہے، اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت جیسے ہی کمزور ہوئی، انگریز سیاست میں دخل اندازی کرنے لگے، تاجر سے تاجداری کی طرف بڑھنے لگے، ایک ایک کرکے ریاستوں کو ہتھیانا شروع کیا۔

- ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست دی۔
- ۲۳/ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ انگریزوں کی شاطرانہ چالوں سے ہار گیا۔
- ۱۷۶۵ء میں دہلی کے شاہ عالم ثانی نے بہار، بنگال، اڑیسہ کے دیوانی حقوق ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیئے۔
- ٹیپو کے والد سلطان حیدر علی کے بعد جنہوں نے جنگ آزادی کا آغاز کیا تھا، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت سے میسور کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا اور یہ کہیئے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کا راستہ صاف ہوگیا۔
- ٹیپو کی شہادت کے ساتھ ہی ۱۸۰۰ء میں میسور کے مضافات کڈپہ، کونور، بلاری، اننت پور، وہار، بیجاپور پر انگریزں کا قبضہ ہوگیا۔
- ۱۸۰۱ء میں نواب اودھ سے دوآبہ اور روہیل کھنڈے کے علاقے لئے اور کرناٹک بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔
- ۱۸۰۲ء میں مرہٹوں کی حکومت ختم کردی گئی۔

- ۱۸۰۳ء میں نواب حیدر آباد باج گذار ہو گئے۔
اسی کے ساتھ ناگپور، آگرہ، بندیل کھنڈ، جے پور، گوالیار ہاتھ سے نکل گئے۔
- دارالسلطنت دہلی میں شاہ عالم ثانی انگریزوں کے پنشن یافتہ تھے۔

انگریزوں کے اقتدار میں کیا کیا ظلم وستم نہیں ہوئے، سب سے زیادہ نشانہ علمائے دین اسلام کو بنایا گیا ۱۶۵۱ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک تین صدیوں پر پھیلی ہوئی علمائے حق کی داستان قربانیوں کی خوں چکاں تاریخ ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے سب سے پہلے انگریز حکومت کے خلاف ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا، یہ فتویٰ انقلاب آزادی کی گونج بن کر ہندوستان کی فضاؤں پر چھا گیا، حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے خاص شاگرد حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ کو نواب امیر خاں کے لشکر میں فوجی تربیت کے لئے بھیجا۔ سید احمدؒ سات سال کی فوجی تربیت کے بعد ۱۸۱۶ء میں دہلی واپس آئے، باقاعدہ ایک فوجی دستہ تیار کیا گیا جس میں سید احمد صاحب کے علاوہ مولانا عبدالحئی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے لوگ شامل تھے، یکم مئی ۱۸۳۱ء سے دس مئی ۱۸۳۱ء تک بالا کوٹ کے میدان میں یہ فوجی دستہ انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوا، مولانا سید احمد اور مولانا اسمٰعیل صاحب سمیت تقریباً ساڑھے چار ہزار مسلمان شہید ہو گئے، اس فوجی دستے میں سے سو کے قریب علماء بچ گئے جن میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا ولایت علی، مولانا مملوک علی اور مولانا یحییٰ وغیرہ شامل تھے۔

- ۱۸۵۶ء میں دہلی میں ممتاز علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ولایت علی، حاجی امداداللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن شہید جیسے بڑے بڑے علماء شامل تھے، فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ ہوا۔
- شاملی ضلع مظفر نگر کے میدان میں انگریز فوجوں کے ساتھ مقابلہ میں حافظ ضامن صاحب نے جام شہادت نوش فرمایا، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سخت زخمی ہو گئے۔
- لاہور کی شاہی مسجد کے پھانسی گھر میں ایک ایک دن میں دو دو سو علماء کو پھانسی دی گئی ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۷ء تک چودہ ہزار علماء کو تختہ دار پر لٹکایا گیا:

مقام فیض کوئی راہ میں ملا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ان حالات اور پس منظر کو سامنے رکھئے، وقتی طور پر پسپائی کے باوجود انگریز کی جابر و قاہر حکومت مسلمانوں کے جذبۂ جہاد، علمائے کرام کے حوصلے اور اہل ہند کی حریت فکر کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام رہی، انگریز خوب سمجھتے تھے کہ یہ شکست وریخت وقتی طور پر دبا سکتی ہے جڑ سے ختم نہیں کر سکتی اس لئے اس نے ایک اور محاذ کھول دیا، افکار پر غلبہ فکری غلامی جسمانی غلامی سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ کسی قوم کو فکری طور پر غلام بنالیا جائے تو اس کو جسمانی طور پر غلام بنانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

یہ منظر آج بھی ہمارے سامنے ہے، سیاسی آزادی کے باوجود ہند اور دوسرے بہت سے ممالک کیا ذہنی طور پر پوری طرح آزاد ہیں، کیا آج بھی وہ مغرب کے دماغ سے نہیں سوچتے، مغرب کی آنکھ سے نہیں دیکھتے اور مغرب کے کان سے نہیں سنتے؟

منصوبہ بڑا خطرناک اور اسکیم بڑی بھیانک تھی، دیکھنے میں ہندوستانی اور اندر سے انگلستانی مقابلہ ایسے فاتح سے تھا جو قوت و خود اعتمادی سے لبریز تھا، سامنے ایک ایسی تہذیب تھی جو جدت ونشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی اور ہندوستانی مسلمان زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ خاطر تھے۔

یہیں سے سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء کی حکمت و عظمت کی تصویر ابھرتی ہے، حکمت عملی یہ طے پاتی ہے کہ مسلح تصادم سے گریز کرتے ہوئے اقدام و دفاع کے لئے ایسے مردان کار تیار کئے جائیں جو دین کی حفاظت و اشاعت، حریت فکر، بیداری، سرگرمی عمل، ہمدردی و اخوت کا پیغام لے کر اٹھیں، ملکی اور عالمی افق جو مغربی فکر و تہذیب سے دھواں دھواں ہو رہا ہے، انگریزی اقتدار جس کے جبر کے نیچے انسانیت کراہ رہی ہے، غلامی کی زنجیر میں جکڑے اذہان و ابدان کو پھر صداقت و عدالت کا سبق پڑھایا جائے اور ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو سہارا دے کر اس طوفان کے مقابلے کے لئے تیار کیا جائے۔ آپ کسی ایسے اسلامی ملک کی مثال دیجئے جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو اور پھر وہ طوفان سے کشتی نکال کر لے جائے، علمائے ہند نے ہندوستانی مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کا احترام اور مغربی تہذیب سے مقابلہ کی طاقت اور صلاحیت پیدا کر دی۔

۳/مئی ۱۸۶۶ء کو انار کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دو محمود اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھے۔

جس کے فکری قائد، بانی اور محرک اول سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے دست و بازو ان کے نامور رفقا ہیں، اس تحریک کا رنگ علمی و فکری تھا اور جذبۂ عمل جہادی تھا، ایک بڑی طاقت سے ٹکرانے والی آفاقی تحریک جہاد کے ڈانڈے آپ کو کہیں نہ کہیں ۱۸۶۶ء میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے دو محمودوں سے مل جائیں گے۔ کہیں آپ کو ملا محمود کے شاگرد محمود حسن شیخ الہند بن کر ریشمی رومال کی تحریک کی قیادت کرتے نظر آئے گے، کہیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی صورت میں پادریوں سے ٹکر لیتے ہوئے، کہیں آریہ سماج جیسی تحریکوں سے نبرد آزما الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ۔

آیئے آپ کی اس تحریک میں ہمسفر آپ ے کچھ نامور رفقاء کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کی خدمات کا ایک ہلکا سا جائزہ تو لیتے ہی چلتے ہیں کہ رفقاء و احباب کی رفعت سے سالار کارواں کی عظمت کا بھی خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۱) مولانا ذوالفقار علی دیو بندی (۱۲۳۷-۱۳۲۲ھ)

مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیو بند کے سب سے پہلے صاحب علم محمود حسن دیو بندی شیخ الہند (۱۲۶۸ھ۔۱۳۳۹ھ) کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی ان تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس مدرسہ کے آغاز میں پہل کی، انہوں نے مولانا مملوک علی (وفات ۱۲۶۷ھ۔۱۸۵۱ء) اور دوسرے علماء سے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے، ۱۸۵۷ء میں آپ کو میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کیا گیا پھر انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز ہوئے، عربی زبان و ادب کے بڑے اچھے ادیب تھے۔

آپ کی تصنیفات و تالیفات سے آپ کے علمی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

(۱) تسہیل الدراستہ — اردو شرح دیوان حماسہ
(۲) تسہیل البیان — اردو شرح دیوان متنبی
(۳) التعلیقات — علی السبع المعلقات
(۴) ارشاد — شرح قصید بانت سعاد
(۵) عطر الوردة — شرح قصیدہ بردہ
(۶) تذکرۃ البلاغت

(۷) تسہیل الحساب یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں بریلی سے چھپی تھی۔

۱۳۰۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف عربی زبان میں لکھا جس کا نام تھا "الھدیۃ السنیہ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیہ"۔ عربی زبان وادب میں دستگاہ کے ساتھ مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔ پنشن پانے کے بعد آپ کو دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمن عثمانی دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔ ۱۵رجب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء دوشنبہ کے دن ۸۵ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور قبرستان قاسمی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مشرقی پہلو میں کو دفن کیا گیا۔ مولانا ذوالفقار صاحب کے بائیں جانب اسی قبرستان میں مولانا محمد احسن صدیقی (۲) نانوتوی کی قبر ہے، اس کی نشاندہی مولانا فضل الرحمن کے اس شعر سے ہوتی ہے:

ہاں بخسپ آسودہ ترمابین دو یاران خویش

قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

یہ قبرستان قاسمی وہی ہے جسے حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے وقف کیا تھا، اس کا نام گورغریباں تھا اور یہاں سب سے پہلے تدفین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کی ہوئی تھی۔

مولانا ذوالفقار علی صاحب کے بارے میں فرانس کا مشہور مصنف گارسان دتاسی لکھتا ہے کہ:

> "وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے، چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہوگئے، ۱۸۵۷ء میں وہ میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے، ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طباع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بریلی میں ۱۸۵۲ء میں چھپی۔"

مولانا ذوالفقار علی صاحب کے ان مختصر حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی کے یہ نامور رفیق جو دارالعلوم دیوبند کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک ہیں، نہ صرف یہ کہ علوم عربیہ پر ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے بلکہ مغربی علوم سے بھی واقف تھے جس کا اعتراف فرانس کے مشہور مصنف گارسان دتاسی نے بھی کیا ہے، اس سے ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے یہ

---

(۲) مولانا محمد احسن صدیقی ۲۲ نے فقہ کی کتاب کنزالدقائق کا عربی زبان میں حاشیہ بھی لکھا تھا۔ یہ حاشیہ ابھی نامکمل تھا کہ مولانا کی وفات ہوگئی اور ان کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند نے اس حاشیے کو مکمل کیا۔

معمار، بدلتے ہوئے حالات ورحجانات سے بے خبر نہ تھے، لیکن اس وقت جس طرح کے نازک حالات تھے اور پیچیدہ قسم کی نفسیاتی کیفیات تھیں، اس کا تقاضہ یہی تھا کہ مغرب کے اقتدار سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے مفاہمت کی فضا میں بچے کھچے علمی سرمائے کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے اور آج ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت کے حالات میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ کامیاب تھی، جو جنگ ہم میدانِ جنگ میں ہار گئے تھے اس کو ہم نے علم کے میدان میں جیت لیا۔

(۲) مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۱۲۴۷ھ۔۱۳۲۵ھ)

مولانا فضل الرحمن عثمانی نے بھی دہلی کالج میں اعلیٰ تعلیم مولانا مملوک علی سے حاصل کی تھی دارالعلوم کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک تھے اور آخر تک اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے دارالعلوم کی روداد ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے کہ:

"مولانا فضل الرحمن ان مقدس ارکان میں سے تھے جن کے متبرک ہاتھوں سے مدرسے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مولانا کی تمام عمر مدرسہ کی خدمت میں گذری، خبر گیری، جاں نثاری اور خیر خواہی میں صرف ہوئی اور ہر حالت میں جدوجہد اور سعی اور جانفشانی کے ساتھ مدرسے کے معاملات میں بدل و جان سرگرم رہے، امورِ مدرسہ میں ہمیشہ احتیاط و دیانتداری، راست بازی اور انجام بینی سے کام لیا۔"

فارسی ادب میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دارالعلوم نے ان کا ذکر "خاقانیٔ ہند" سے کیا ہے (۳) حکومت ہند کی طرف سے محکمہ تعلیم کے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز رہ کر ریٹائر ہوئے۔

دیوبند میں ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا، اس کی تباہ کاریوں کو مولانا نے فارسی زبان میں نظم کیا۔ اس کا تاریخی نام قصہ غمِ دیبن (۱۳۰۱) ہے۔ دیوبند کے حالات میں یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ مولانا کو مادۂ تاریخ کے نکالنے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ دارالعلوم کی رودادوں میں بھی ان کی بہت سی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے نہایت عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، ان کے وصال پر جو آپ نے اشعار کہے اس کا آخری شعر یہ ہے:

(۳) حیات شیخ الہند مولانا میاں اصغر حسین ص:۱۷

سرالم سے لکھی فضل نے سنین وفات   وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے
۱۲۹۷ء

مولانا فضل الرحمن صاحب کا انتقال اپنے وطن دیو بند میں ۳ ؍جمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵/ جون ۱۹۰۷ء بروز ہفتہ ہوا۔ ان کا مزار قبرستان قاسمی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے برابر میں ہے۔ آپ کے مزار پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت بھی تھے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی اولاد میں تین نام ایسے ہیں جن کو ہندوستان کی دینی اور علمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی، ایک ان کے بڑے بیٹے مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی جو کہ دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی ہوئے، دوسرے مولانا حبیب الرحمن عثمانی ۱۳۲۴ھ سے دارالعلوم کی مسند اہتمام پر رونق افروز ہوئے، فہم وفراست، علم وفضیلت میں نہایت ممتاز تھے، دارالعلوم کو مرکزی درسگاہ بنانے میں ان کا کردار نمایاں رہا ہے۔ تیسرے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، صحیح مسلم کی عربی شرح فتح الملہم، تفسیر عثمانی اور اس کے علاوہ بہت سی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ حضرت علامہ ان بزرگ علماء میں سے تھے جن کی نظریں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ (۴)

حضرت نانوتویؒ کے ان دوسرے نامور رفیق کی زندگی کے حالات سے اور ان کی علمی خدمات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی روشن فکری سے وقت اور حالات پوشیدہ نہیں تھے، ان کے حوصلے جوان تھے کیوں کہ دارالعلوم کے قائم کرنے کے وقت ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی، ایک اہم نکتہ جو ہم سب کے سامنے رہنا چاہئے وہ یہ ہے کہ مغرب کا اقتدار جس اسلامی ملک میں پہونچا وہاں اس نے فکر ونظر کے پیمانے بدل دئے لیکن ہندوستان میں ان علما کی کوششوں سے دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے لئے قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں زبردست استقامت اس تحریک نے پیدا کر دی جس سے دین کا سرمایہ تاراج ہونے سے محفوظ رہا اور آج بھی ملت اسلامیہ کی دینی غیرت وحمیت اس حد تک توانا ضرور ہے کہ وہ مسائل کا ادراک بھی رکھتی ہے اور

---

(۴) تاریخ دارالعلوم دیو بند کے مصنف سید محبوب رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ: ”حضرت مولانا فضل الرحمن کے اخلاف نے عظیم دینی و علمی خدمات انجام دیں، جس کا سلسلہ بحمد اللہ ابھی تک جاری ہے“ (تاریخ دارالعلوم دیو بند جلد اوّل)

مقابلے کی طاقت بھی۔

(۳) حضرت حاجی سید محمد عابد دیوبندی (۱۲۵۰ھ۔۱۳۳۸ھ)

حاجی سید محمد عابد صاحب دیوبند میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل کے لئے دہلی پہنچے، حاجی صاحب کا رجحان تزکیۂ باطن کی طرف زیادہ رہا، اس سلسلے میں متعدد بزرگوں سے تعلق رہا اور خلافت حاصل کی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی بیعت کی اجازت حاصل کی، ساٹھ برس تک چھتے کی مسجد میں قیام رہا جہاں سے دار العلوم کی ابتدا ہوئی تھی۔ حاجی صاحب دار العلوم کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک تھے، اس مدرسہ کے لئے سب سے پہلے آپ نے خود بھی تین روپے چندہ دیا اور سفید رومال کی جھولی بنا کر اشراق کے وقت محلہ ابوالبرکات میں چندے کے لئے نکلے اور پہلے دن چندے کی کل رقم تین سو روپے جمع ہوئی حاجی صاحب دار العلوم کے سب سے پہلے مہتمم بھی تھے، یوم تاسیس ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ سے لے کر ۱۲۸۴ھ تک مہتمم رہے پھر دوسری بار ۱۲۸۶ھ میں مہتمم بنائے گئے اور ۱۲۸۸ھ تک مہتمم رہے، تیسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ میں پھر مہتمم بنائے گئے، مجموعی طور پر دس سال تک اس ذمہ داری کو مختلف ادوار میں ادا فرماتے رہے۔

جامع مسجد کی تعمیر میں آپ کا بڑا حصہ ہے، جمعرات کے دن ۲۷/ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۲ء کو وفات ہوئی، آپ کا مزار قبرستان قاسمی سے ذرا آگے ایک بڑے چبوترے پر بنا ہوا ہے، آپ کی سوانح تذکرۃ العابدین میں آپ کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔ حضرت حاجی صاحب دار العلوم کو جامع مسجد میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے دار العلوم میں دالان اور حجرے بھی بنائے گئے تھے، مگر مولانا نانوتویؒ کے سامنے دار العلوم کا ایک بڑا تصور تھا اور وہ اس کی مستقل تعمیر چاہتے تھے۔ موجودہ دار العلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرے کا سنگ بنیاد ۲/ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو رکھا گیا تو مولانا نانوتوی کی درخواست پر اختلاف ختم ہوگیا اور حضرت حاجی صاحب نے سنگ بنیاد میں شرکت فرمائی۔

(۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۶ھ۔۱۳۲۳ھ)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ولادت گنگوہ ضلع سہارنپور میں ۶/ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ دوشنبہ کے دن ہوئی، ان کے والد کا نام مولانا ہدایت احمد تھا جو اپنے زمانے کے جید عالم تھے، قرآن مجید آپ نے اپنے وطن گنگوہ میں پڑھا، اس کے بعد اپنے ماموں کے ساتھ کرنال چلے گئے، ان سے

فارسی کی کتابیں پڑھیں، عربی صرف ونحو کی کتابیں مولوی محمد بخش صاحب سے پڑھیں ۱۲۶۱ھ میں مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی (۵) کے پاس دہلی پہنچے اور ساری کتابیں ان سے مولانا قاسم نانوتویؒ کے ساتھ پڑھیں۔ اس طرح آپ مولانا نانوتوی کے رفیق درس بھی تھے، معقولات کی بعض کتابیں آپ نے مفتی صدر الدین آزردہ (۶) سے بھی پڑھیں، حدیث کی کتابیں آپ نے شاہ عبدالغنی مجددی (۷) سے پڑھیں۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے اور ان سے خلافت کی اجازت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۲۶۶ھ میں آپ گنگوہ آگئے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حجرے کو آباد کیا، ذریعہ معاش طبابت تھا۔

مولانا یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ:

"جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سے اسی زمانے سے ہم سبقی اور دوستی رہی ہے، اخیر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے سے دونوں صاحبوں نے حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی۔"

۱۸۵۷ء میں خانقاہ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور دوسرے رفقاء کے ساتھ شاملی کے معرکہ جہاد میں شامل ہو کر خوب داد و شجاعت دی۔ جب میدان جنگ میں حافظ ضامن صاحب شہید ہو کر گر پڑے تو آپ ان کی نعش اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے اور پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔

معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور گرفتار کر کے سہارنپور کی جیل میں بھیج دیا گیا، چھ مہینے جیل میں بند رہے، وہاں بہت سے قیدی آپ کے معتقد ہو گئے اور جیل خانے میں جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی۔

رہائی کے بعد گنگوہ میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا، درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ہر آدمی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، آپ کے درس حدیث کی ایک خوبی یہ تھی کہ حدیث کے مضمون کو سن کر اس پر عمل کا شوق پیدا ہو جاتا تھا آپ کے درس ترمذی کی تقریر "الکوکب الدری" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو ترمذی کی نہایت جامع شرح ہے۔ اس کے علاوہ "لامع الدراری" جو کہ

(۵) وفات ۱۲۶۰ھ (۶) متوفی ۱۲۸۵ھ (۷) متوفی ۱۲۹۶ھ

بخاری کے درس کی تقریر ہے وہ بھی چھپ چکی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو حضرت مولانا زکریا صاحب (سابق شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور) نے اپنے اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے، فقہ و تصوف کے موضوع پر آپ کی تقریباً چودہ کتابیں ہیں، فتاویٰ رشیدیہ میں آپ کے فتاویٰ آپ کی فقہی بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، ۱۳۱۴ھ میں آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا سرپرست بنایا گیا، ۹/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) اذان جمعہ کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، گنگوہ کے ایک باغ میں آپ کا مزار مبارک ہے آپ کی سوانح حیات تذکرۃ الرشید (۸) کی دو ضخیم جلدوں میں آپ کے مفصل حالات زندگی موجود ہیں۔ آپ کے شاگردوں اور خلفاء کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں بڑے بڑے نامور علماء جیسے مولانا عبدالغفار صاحب (مئو اعظم گڑھ)، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، مولانا ماجد علی جونپوری جیسی معروف شخصیات شامل ہیں۔

شاملی کی جنگ کے بارے میں سوانح قاسمی جلد دوم میں جو تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے:

''انگریزی فوج شاملی کی جس گڑھی میں پناہ گزیں ہوگئی تھی اس کے صحیح محل وقوع کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے۔ بہر حال کتابوں میں جو کچھ مل سکا ہے اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا الامام الکبیر کے فرزند سعید مولانا حافظ محمد صاحبؒ سے حیدرآباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس دردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت کے رکن بحیثیت مفتی ہونے کے تھے اسی زمانہ میں نواب عبدالباقر مرحوم کی کوٹھی حسین علم میں ایک خانگی مجلس میں بیان فرمایا تھا کہ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی روپوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں الا یہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی جس طرف گڑھی کا پھاٹک تھا، محصوروں نے گڑھی کے پھاٹک کو بند کر دیا تھا اور جتھے کا جتھا تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ

---

(۸) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

میدان میں پتنگوں کی طرح پھیلا ہوا تھا، ان پر بندوقوں سے گڑھے والے انگریزی فوج کے بندوقچی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے لیکن اس مختصری مسجد کے سوا جو میدان میں تھی غریب مجاہدوں کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ مارنی شروع کی جس سے سیکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے، لے دے کر وہی ایک مسجد تھی اسی میں مجاہدین دم لینے کے لئے آجاتے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ اس دروازے کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی جو غالباً محافظوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی۔

مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ: "حافظ ضامنؒ کا حضرت گنگوہی کے زانوں پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا۔"

دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں ان کی بنیاد پر اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ یہ چاروں یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی حضرت مولانا رشید گنگوہی، حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہید اور مولانا محمد میز صاحب نانوتوی بہ نفس نفیس اس یورش میں عملاً شریک تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے اس نامور رفیق کے حالات زندگی سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کو اپنی تحریک کے آگے بڑھانے میں کیسے جانباز اور وفادار رفقاء میسر آئے کہ وہ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس تحریک کے دست و بازو بنے رہے اور حضرت نانوتویؒ کے طریق فکر و عمل کو پوری طرح سمجھ کر اس کو آگے بڑھاتے رہے، اس کے نتیجے میں انگریز کے مکمل اقتدار اور مغربی تہذیب کی یورش کے باوجود ہندوستان اسپین بننے سے محفوظ رہا، ہم اور ہماری نسلیں سپاس گذار رہیں گی حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کی کہ انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے اللہ کے دین کی حفاظت کی۔

(۵) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۲۴۹ھ۔۱۳۰۲ھ)

مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نانوتوی ۱۳/ صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی

نام منظور احمد تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد اپنے والد مملوک صاحب کے ساتھ دہلی چلے گئے، وہاں ابتدا سے لے کر انتہا تک تمام علوم وفنون کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ حدیث کی تعلیم کے لئے مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں بھیجے گئے، حدیث کی جو کتاب باقی رہ گئی تھی وہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھی، فراغت کے بعد آپ کا تقرر اجمیر گورنمنٹ کالج میں ہوا۔ اسی زمانے میں آپ کو ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ پیش کیا گیا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ کو ڈپٹی انسپکٹر کی حیثیت سے سہارنپور بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا اور میرٹھ کے ایک چھاپے خانے میں کتابت کی تصحیح کی نوکری کر لی۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور اس کی صدارت تدریس پر فائز کئے گئے۔ بحیثیت شیخ الحدیث پوری زندگی درس حدیث دیتے رہے۔ بڑے بڑے مشہور علماء آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں جیسے شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی وغیرہ۔

مولانا صاحب نسبت بزرگ تھے اور جذب کا غلبہ تھا، آپ نے دو حج کئے۔ شعر وشاعری کا بھی ذوق تھا، آپ کا تخلص گمنام تھا۔ آپ کی تصانیف میں سوانح حضرت مولانا محمد قاسم، مکتوب یعقوبی، بیاض یعقوبی شامل ہیں۔ ۳/ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو اپنے وطن نانوتہ میں وفات پائی اور وہیں اپنے قبرستان کے ایک باغ میں مدفون ہیں۔ ''حیات یعقوب ومملوک'' میں آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب بھی حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی اس علمی تحریک کے دل وجان سے حامی، اس کے خدمتگار اور تاحیات ممد ومعاون رہے ہیں اور حریت فکر وعمل جو تحریک دارالعلوم کی روح ہے اور اقتدار سے غیر وابستگی، مولانا یعقوب صاحب نے ہمیشہ ان اصولوں کی پاسداری کی ہے۔

(۶) مولانا رفیع الدین صاحب عثمانی دیوبندی (۱۲۵۲ھ۔۱۳۰۸ھ)

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب عثمانی ۱۹/ رمضان المبارک ۱۲۵۲ھ میں دیوبند میں پیدا

ہوئے، ان کے والد بزرگوار کا نام فرید الدین تھا جن کا مزار دار العلوم کے شمالی دروازہ کے سامنے ہے مولانا رفیع الدین صاحب شاہ عبدالغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں سے تھے اور ان کا شمار اولیاء کاملین میں ہوتا تھا، آپ کو دو مرتبہ دار العلوم کا مہتمم بنایا گیا۔ پہلے ۱۲۸۴ھ سے ۱۲۸۴ھ تک اور دوسری مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں مستقل مہتمم رہے اور ۱۳۰۶ھ تک یہ خدمت انجام دی، کل مدت اہتمام ۱۹ سال ہے۔ دار العلوم کی سب سے پہلی عمارت نو درہ ۱۲۹۲ھ میں آپ کے سامنے ہی بنی۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن کو آپ سے خلافت حاصل ہوئی۔ ۱۳۰۶ء میں ہجرت کے ارادے سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور دو سال وہاں قیام کے بعد جمعرات ۱۲/ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو صبح کے وقت ۵۶ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ کے مزار کے قریب ہے، حضرت عثمانؓ کے مزار پر پہلے قبہ بنا ہوا تھا جہاں اس کا پرنالہ گرتا تھا، ٹھیک اس کے نیچے مولانا رفیع الدین صاحب کی قبر ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے یہ نامور رفقاء جن کو دار العلوم کے اکابر ستہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حضرت نانوتویؒ کی اس تحریک کے قافلے کے ایسے ساتھی تھے جنہوں نے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو اس راہ میں وقف کر دیا، اس تحریک کی نوعیت اگر چہ ملکی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک عالمی تحریک ہے جس کے سرخیل حضرت نانوتویؒ ہیں۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ*

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مخصوص رفقاء کرام

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے رفقاء کرام کو متعین کرنے کے لئے ہمیں صرف دارالعلوم دیوبند کے بنیادی مقصد اور نصب العین پر نگاہ ڈالنی ہوگی، پھر اس ذیل میں وہ تمام حضرات اپنے کارہائے نمایاں کے ساتھ منظر عام پر آتے چلے جائیں گے جن کو حضرت الامامؒ کے رفقاء خاص ہونے کا شرف حاصل ہے:۔

مگر اس کے ساتھ ٹھیک اسی زمانہ میں جب حضرت الامام تعلیم وتبلیغ میں مصروف تھے دیکھا گیا کہ مشیت ایزدی نے چند ہم خیال ایسے نفوس کو یکجا کر دیا ہے جو اجتماعی تعلیم کا خاص تجربہ رکھتے ہیں اور دینی تعلیم کا ادارہ قائم کرنے کے لئے فکر مند ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں میں حاجی سید عابد حسینؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمٰنؒ ان کے علاوہ مسجد چھتہ کی مجلس انس میں جو حضرات، حضرت الامام کے دست وبازو بنے اور تحریک دیوبند کے بنیادی محرک اور معاون ثابت ہوئے ان میں سوانح مخطوطہ کی فہرست کے مطابق دیوان حاجی یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق کلو پیر جی، حاجی ظہور الدین اور حکیم مشتاق صاحب۔ ان کے علاوہ دو ناموں کا اور تذکرہ ملتا ہے شیخ منظور احمد اور منشی نہال صاحب۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس اُنس کی ابتدا مسجد چھتہ میں حاجی سید عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب دامت برکاتہم کی رفاقت سے ہوئی اس میں رفتہ رفتہ دیوبند کے مختلف محلوں سے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی شامل ہوتے گئے جن سے عہد قدیم کی اس مجلس کی تشکیل عمل میں آئی اور پھر قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں یہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے ہمنوا، ہم خیال اور تحریک کے معاون ثابت ہوئے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ مشیت ایزدی نے اس تحریک کے لئے جن نفوس قدسیہ کو یہاں

---

* جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

یکجا فرمایا تھا ان میں کا ہر شخص اپنی منفرد خصوصیت اور بے نظیر صلاحیت میں کامل تھا جس سے نہ صرف بنیادی کام لیا جانا تھا بلکہ اس سے ایک ایسی نسل کا ظہور ہونے والا تھا جو اس کمزور پودے کو ایک مضبوط اور تناور درخت بنانے میں اہم کردار ثابت ہو اور پھر علم و عرفان کی اس درسگاہ سے دین کے مخلص خدام اور اسلام کے جرأت مند و جانباز سپاہی تیار کئے جائیں، جو اپنی مخلصانہ مساعی کے ذریعہ سفینۂ ملت کو پار لگائیں اور ہر مخالف ہوا اور آندھی کے مقابلہ میں تن من دھن کی بازی لگانے سے دریغ نہ کریں اور اللہ کا فضل اور بانیان دارالعلوم کی پاکیزہ نفسی اور سوز دروں کی یہ برکت ہے کہ دارالعلوم روز اول سے اپنی تاسیس کے ان مقاصد کو پورا کر رہا ہے۔ ان نفوس قدسیہ میں حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ خود مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد رشید تھے اور تعلیم کے بعد انسپکٹر آف اسکول کے منصب سے ریٹائر ہوئے پھر اپنے وطن دیوبند کی سکونت اختیار کر لی گویا آپ کے تعلیمی تجربات کی بھی ایک نئے تعلیمی ادارہ کو ضرورت تھی اس لئے آپ کی خدمات دارالعلوم کو حاصل ہو گئیں، پھر یہی نہیں بلکہ آپ کے فرزند جلیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے تلامذہ کی کثیر تعداد نے تحریک دیوبند کو بام عروج تک پہونچایا، آپ چالیس سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور ۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۵ سال وفات پائی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں جانب مشرق آپ کا مزار مبارک ہے۔

حضرت حاجی سید عابد حسین

اس کے بعد ہم حضرت الامام کے ابتدائی خصوصی رفقاء میں حضرت حاجی سید عابد حسینؒ کا تذکرہ پہلے ضروری سمجھتے ہیں جنھیں دارالعلوم کی بنیادی صورت کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ کی باکمال شخصیت کے روحانی فیوض و برکات کا اس ادارہ کی بنیادوں میں پیوست ہونا بھی لازمی تھا کیونکہ اس طرح کی روحانی تحریکوں کی کامیابی کی حقیقی کلید صرف دماغ نہیں ایسا دل ہوتا ہے جو مرکزی غیبی قوت سے لو لگائے سربسجود کامیابی کی دعائیں کرتا ہو جس طرح غزوہ بدر کے میدان میں صف بندی کرنے کے ساتھ رسول اکرم کی پیشانی مبارک خاک پر پڑی بارگاہ ایزدی میں دست بدعا تھی، کہا جاتا ہے کہ حاجی سید عابد حسینؒ کو عہد طفلی سے باطنی معرفت و سلوک کا شوق تھا اور آپ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ میاں جی کریم بخش سے بیعت تھے جو رامپور منہیاران کے رہنے والے تھے اور آپ کو انہی سے خلافت ملی تھی۔ لیکن تاریخ مشائخ چشت میں خلیق نظامی مرحوم نے آپ کو حضرت

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اہل دیوبند کو حضرت حاجی سید عابد حسینؒ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی بچہ ایسا ہوگا جس کے گلے میں حاجی کا تعویذ نہ ہو، اس کے علاوہ ظاہری تقویٰ اور احکام شریعت کی پابندی میں آپ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حاجی صاحب کو بہت رنجیدہ دیکھا اور افسردگی کی حالت یہ تھی جیسے کسی کی میت ہوگئی ہو جب بمشکل تمام سبب دریافت کیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج فجر کی جماعت میں تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی ہے، گویا ایسے ہی بزرگ ہاتھوں نے اس مقدس پودے کا بیج ڈالا تھا جو آج تک اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور آپ ہی کے خانوادے کے چشم و چراغ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی خدمات جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ امینیہ دہلی اور جمعیۃ علماء ہند میں تدریسی، تنظیمی اور تصنیفی حیثیت سے ناقابل فراموش اور تاریخ کا روشن باب ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مشیت ایزدی نے دارالعلوم کے بانیان اور خدام میں چن چن کر ایسے اشخاص کو منتخب کیا تھا جو مختلف النوع صفات وصلاحیت کے حامل ہوں چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندؒ بھی اپنی خداداد صلاحیت کی حیثیت سے منفرد حیثیت کے مالک تھے، اگرچہ آپ کی علمی حیثیت تو زیادہ نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انتظامی صلاحیت سے خوب نوازا تھا آپ کی پیدائش ۱۸۳۶ء اور وفات ۱۸۹۰ء ہے، آپ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں سے تھے اور آپ کا شمار اپنے زمانہ کے اولیاء کاملین میں تھا، آپ نے دو مرتبہ دارالعلوم کے مہتمم کے فرائض انجام دیئے، دارالعلوم کی بہت سی ابتدائی عمارتیں آپ کے زیر اہتمام تعمیر ہوئیں جو استواری اور حسن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس سے متعلق آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ۱۸۷۵ء میں جب دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرہ کی بنیاد کھودنا شروع کی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے خطاب کر کے فرمارہے ہیں کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے اور یہ فرما کر خود اپنے عصاء مبارک سے احاطہ و عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ انہی پر بنیاد کھود کر تعمیر شروع کرائی گئی، مولانا مرحوم ۱۸۸۸ء میں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور دو سال بعد ۱۸۹۰ء میں وصال ہوا، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا یعقوب نانوتوی

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک العلی نانوتوی ۱۸۳۴-۱۸۸۶ء علم معقول ومنقول میں اپنے والد کا نمونہ تھے۔ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ معقولات ومنقولات غرضیکہ فنون میں آپ اپنے دونوں ساتھیوں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتویؒ سے کم نہ تھے۔ ذکاوت وذہانت اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عطا فرمائی تھی، طلب علم کا بے انتہا شوق تھا[1] دارالعلوم کے قیام میں آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے مگر حضرت الامام مولانا قاسم نانوتویؒ کے طلب کرنے پر سرکاری ملازمت چھوڑ کر دیوبند چلے آئے اور ایک قلیل سی رقم پر دارالعلوم میں صدر مدرس مقرر کیۓ گئے اور دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ نے ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان ۱۹ سال تک تدریس کے فرائض انجام دیئے، اسی مدت میں ایک سو اکیاون طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی جن میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علماء کرام شامل ہیں۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دارالعلوم کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ وباطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کیۓ جاتے تھے، آپ کی وفات باون سال کی عمر میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ [2]

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک تھے آپ نے دہلی میں مولانا مملوک علی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی تھی آپ فارسی اور اردو کے ایک بلند پایہ اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے مادہ تاریخ نکالنے میں آپ کو بڑا کمال حاصل تھا، اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو صالح اور اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل اولاد سے نوازا تھا، آپ کے لائق اور صالح بیٹوں میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مشہور مفسر قرآن پاک اور صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند شامل ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے پوتے تھے۔ حق یہ ہے کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور

(۱) مفتی عزیز الرحمٰن، تذکرۂ مشائخ دیوبند مطبوعہ کراچی ص: ۱۷۰۔

(۲) قاری محمد طیب" تاریخ دارالعلوم دیوبند کراچی پاکستان ۱۹۷۲ء ص: ۹۸۔

آپ کی اولاد نے دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات انجام دی ہیں اور دینی وملی خدمات کا سلسلہ اب بھی آپ کے اخلاف میں جاری ہے۔ آپ کی وفات ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۲ھ-۱۳۲۳ھ) حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم سبق رفقاء میں سے ہیں۔ آپ کو اکابر دارالعلوم سے گہرا تعلق رہا ہے، بعض طلباء دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر گنگوہ حاضر ہوتے اور حضرت گنگوہی کے درس حدیث میں شریک ہو کر استفادہ کرتے تھے اس لئے اکابر دارالعلوم اور رفقاء کرام کے ساتھ آپ کا تذکرہ ضروری ہے اور ویسے بھی ابتدائی تعلیم کے بعد جب ۱۲۶۱ھ میں آپ دہلی پہونچے تو مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور یہیں سے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے تعلق قائم ہوا جو ساری عمر بدستور رہا۔ (۳)

آپ کے بارے میں حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا مملوک کی حجاز سے واپسی ایسے وقت میں ہوئی کہ رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے اس لئے وطن نہ آسکے سیدھے دہلی پہونچے اور جب سالانہ تعطیل ماہ ذی الحجہ میں ہوئی تو وطن نانوتہ تشریف لائے اور واپسی میں مولانا قاسم نانوتویؒ کو بھی پڑھانے کی غرض سے ساتھ دہلی لے گئے اور پھر استاذ الکل مولانا مملوک علی کی خدمت میں ہر دو شمس وقمر یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کو ایک زمانہ میں مدت تک یہاں حاضر رہنے اور نخلستان علم کی خوشہ چینی کا اتفاق رہا، مگر دونوں کی آمد میں ایک سال کا فرق ہے اس لئے کہ حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تو ۱۲۶۰ھ میں دہلی تشریف لے آئے تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۱۲۶۱ھ میں دہلی پہونچے۔ (۴)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ دونوں جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سے اسی زمانہ میں ہم سبقی اور دوستی رہی ہے آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی کی خدمت میں پڑھی اور اس زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔ (۵)

---

(۳) سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند ج اول ص:۱۲۷۔ (۴) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید ج اول ص:۲۷۔

(۵) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج اول سید محبوب رضوی ص:۱۲۷۔

اب اگرچہ ہمارے موضوع کے مطابق تقریباً حضرت الامام کے تمام رفقاء کرام کا مختصر تذکرہ آچکا ہے مگر یہ ذکر تشنہ اور داستان نا تمام رہے گی اگر اس کا اختتام استاذ الاساتذہ اور اس تحریک کے مخزن و منبع حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ذکر سے نہ ہو۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

حضرت حاجی صاحبؒ ۱۲۳۲ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، آپ کو اللہ تعالی نے ہزاروں انمول خوبیوں سے نوازا تھا، آپ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ ان میں ایک تو مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی جس نے بالآخر دیوبندی تحریک کی شکل اختیار کی یہ حضرت حاجی صاحب ہی کے خلفاء اور مریدین کے پرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۸۸۶ء) اور حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ (متوفی ۱۹۱۲ء) ان کے خلفاء تھے۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ مولانا محمد قاسم کے جانشیں تھے اور انہی بزرگوں کی کوششوں سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

۲۔ باطنی اصلاح و تربیت کے لئے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو حضرت حاجی صاحب کے اجل خلیفہ تھے آپ نے نصف صدی سے زیادہ ایک پرانے قصبہ تھانہ بھون کی کہنہ مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا دوسرے بزرگ عالم مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ آج دنیا کے سامنے ہے۔ اور مولانا محمد الیاس صاحب بھی مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید تھے گویا یہ بھی حضرت حاجی صاحب کے فیوض روحانی کا ایک پرتو تھا جس کی تحریک آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں قبول عام حاصل کر چکی ہے۔

۳۔ انیسویں صدی کی تیسری تحریک آزادئ وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حضرت حاجی صاحب اور ان کے متوسلین و منسلکین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (٦)

(٦) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ندوۃ المصنفین دہلی ص: ۲۳۳۔

پروفیسر اختر الواسع*

دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سید احمد خاں کے تعلقات کی روشنی میں

علی گڑھ اور دیوبند، برِ صغیر کی تاریخ میں مسلم حرکت وفکر کی دو علامتیں ہیں۔ یہ علامتیں جدید اور قدیم، دنیا و دین اور مسٹر و مولوی کی مترادف بن گئی یا بنادی گئی ہیں۔ علی گڑھ اور دیوبند ــــ دو مختلف دبستانِ فکر ہیں اور دو جداگانہ تحریکیں بھی۔ دونوں میں بظاہر بڑی دوری ہے لیکن افسوس کہ ان دونوں میں جو مماثلتیں ہیں ان کے ساتھ نہ تو ہمدردی سے کام لیا گیا اور نہ ہی کما حقہ ان پر توجہ دی گئی۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ یہ دونوں تحریکیں ایک ہی واقعے کا الگ الگ ردعمل تھیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے سرسید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، دونوں کے دلوں میں مسلمانوں کی عظمتِ گم گشتہ کی بازیافت اور ان کے لئے ایک باعزت وغیرت وخودداری کی حامل زندگی گزارنے کے مواقع اور طریقوں کی فراہمی کے لیے ہر ممکن جدوجہد کے جذباتِ صادق کو موجزن کردیا تھا اور دونوں نے ''تعلیم'' ہی کا اس کے لیے انتخاب کیا، ایک نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈال کر تو دوسرے نے دارالعلوم کی تاسیس کے ذریعے۔ کیا اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے کہ دونوں اداروں کے بانی ولی اللٰہی مکتبِ فکر کے پروردہ تھے اور دونوں نے مولوی مملوک علی ہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔

ایک بڑی مماثلت جو دونوں تحریکوں یا اداروں کے بانیوں میں تھی وہ ان کا ''امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے لیے دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اس کی زبوں حالی کا احساس تھا۔ دینی حمیت اور ملّی غیرت بھی دونوں کے یہاں قدرِ مشترک تھی، جس کے ثبوت میں سرسید کی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' اور مولانا قاسم نانوتوی کے عیسائی مشنریوں سے ہونے والے مناظروں کی روئدادیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ملّی غیرت کے مظاہر کا آئینہ دار سرسید کا آگرہ دربار سے وہ واک آوٹ تھا کہ جس کا سبب یہ تھا کہ ''دربار میں ہندستانیوں وانگریزوں کی کرسیاں برابر کے درجہ پر نہ تھیں'' اور حضرت نانوتوی کا ملکۂ وکٹوریہ کے جشن اقتدار کے وقت دہلی سے صرف اس لیے چلے آنا تھا کہ ''انگریزوں کی شوکت

* اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

دیکھی نہیں جاتی تھی۔''

یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے جو بڑی چونکا دینے والی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے موقع پر لال قلعہ میں شاہانِ تیموریہ کی آخری یادگار اور مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے چراغ سے صرف سرسید ہی مایوس نہ تھے بلکہ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء کو بھی اس کا یقین تھا کہ باغی افواج کے مرکز اطاعت بہادر شاہ ظفر میں اب کوئی دم باقی نہیں رہا ہے، اسی لیے مجاہدین کی یہ جماعت انقلابیوں کی اس ٹولی سے الگ الگ رہی اور اپنے لیے اطاعت کا مرکز اور قیادت کا محور حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ذاتِ اقدس کو بنایا۔

ان تمام مماثلتوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی کی فکر، معاملہ فہمی اور اندازِ کار میں بڑا فرق تھا۔ دونوں کی منزل ایک تھی، لیکن ان کے راستے اس قدر جداگانہ تھے کہ زمانے کی کوتاہ بیں نگاہوں نے دونوں کی منزل ایک ہونے کے احساس کو بھی دھندلا دیا۔ سرسیّد مولانا محمد قاسم نانوتوی کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس تعزیتی نوٹ سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے مولانا نانوتوی کے انتقال پر ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارے میں لکھا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں:

> ''زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج وغم کا باعث ہوتا ہے...... اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم صاحب اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو، اِلّا تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا...... درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہوجانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔''

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کردینا مناسب ہوگا کہ مولانا نانوتوی کی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' سرسیّد کے مذہبی استفسارات کا ہی جواب ہے۔

سرسیّد کی طرح مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی انگریزی کی اہمیت کو جانتے تھے اور ان کا خیال تھا

کہ مسلمان انگریزی زبان اور علومِ جدیدہ سے بہرہ ور ہوں۔ ۹ ر جنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم دیوبند کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبائے دارالعلوم مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔''

دوسری طرف سرسیّد بھی مذہبی تعلیم کے پوری طرح قائل تھے اور اسی لیے نہ صرف دینیات کی تعلیم علی گڑھ کے نصاب میں شروع سے لازمی رکھی گئی بلکہ دیوبند ہی کی طرف رہنمائی کے لیے ان کی نظریں بھی اٹھیں۔ سرسیّد تو اس سلسلے میں مولانا قاسم صاحب ہی کی مدد چاہتے تھے، جس کا پتہ اس خط سے چلتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک دوست پیر محمد عارف کو لکھا تھا۔ سرسیّد خط میں لکھتے ہیں:

''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لائیں تو میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔''

گو حضرت نانوتوی تو اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے لیکن ایک زمانے تک علی گڑھ کالج کی نظامت دینیات کے منصب پر ان کے داماد مولانا عبداللہ انصاری صاحب فائز رہے، کیوں کہ سرسید علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلباء کے ''دائیں ہاتھ میں فلسفہ، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر کلمۂ طیبہ کا تاج'' دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ علی گڑھ اور دیوبند کے بانیوں میں یہ بھی قدرِ مشترک تھی۔ فرق تھا بھی تو صرف ''تقدیم و تاخیر'' کا۔ اب رہا نتائج کا معاملہ تو یہ تو علی گڑھ اور دیوبند کے فرزندوں کی توفیق پر منحصر رہا کہ انہوں نے اپنے اداروں کے بانیوں کے اس جذبے کو کس حد تک سراہا، تسلیم کیا اور عملی جامہ پہنایا۔ بقول کسے بڑھیا نے دیا تو روشن کر دیا تھا، اب کوئی گھر سے ہی نہ نکلا تو اس میں اس کا کیا قصور؟

جہاں تک اس سمت میں کوششوں کا سوال ہے اور علی گڑھ و دیوبند کے درمیان اشتراک کا معاملہ ہے تو ماضی کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ اس کے لیے مخلصانہ کوششیں بھی ہوئیں۔ مثال کے طور پر ۱۷/۱۸/اور ۱۹/ اپریل ۱۹۱۰ء کو دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں علی گڑھ کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے شرکت کی اور ۱۸/ اپریل کی شام کو انہوں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ:

''اگر دارالعلوم دیو بند کے کچھ فارغ التحصیل طلبہ علی گڑھ کو انگریزی اور سائنس کی تکمیل کے واسطے بھیجے جائیں تو کالج کی طرف سے ہر ایسے طالب علم کو پچیس روپے ماہوار وظیفے کی مدد دی جائے گی۔''

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی اس تجویز کی بازگشت ہمیں پورے پچیس سال بعد الحاج مولانا محمد سلیم صاحب مرحوم، مہتمم مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ کے اس مضمون میں ملتی ہے جو انہوں نے اپنے رسالے ''ندائے حرم'' میں لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری موجودہ درسگاہیں دینی ہوں یا دنیوی، اس قسم کے آدمی تیار کر رہی ہیں جو زمانہ حال کی دینی یا دنیوی ضرورتوں کو مل کر پورا نہیں کر سکتے۔ جو خیال آج ہمارے ذہن میں ہے پچیس سال پیشتر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو اس ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اپنے اس خیال کو لے کر وہ علی گڑھ سے دیو بند پہنچے۔ سچے درد اور پورے اخلاص کے ساتھ انہوں نے اس تحریک کی ابتدا کی تھی کہ دارالعلوم دیو بند کے دین اور علی گڑھ کی دنیا کا سنگم ملا دیں''۔

آج جب کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالے سے یہ سیمینار ہو رہا ہے اور علی گڑھ کو سوا سو سال نیز دیو بند کو اس سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے یہ تمنا ہنوز باقی، آرزو تشنۂ تکمیل اور خواب ادھورا ہے کیوں کہ ''دین و دنیا'' کے سچے امتزاج کے نمونے والے مسلمانوں کی آج گزرے ہوئے کل سے زیادہ ضرورت ہے۔ ایسے دانشور جو ''جامِ شریعت'' اور ''سندانِ عشق'' کے حامل ہوں آج کے اس پر آشوب دور میں، جس کو ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ بھی ہے، ہمارے ملی تشخص کی برقراری اور باعزت حیثیت کے حصول کے لیے ناگزیر ہیں۔ آج علوم جدیدہ کے نتیجے میں پیدا شدہ تشکیک اور زمانے کے پیش کئے ہوئے چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ علی گڑھ اور دیو بند میں وسیع پیمانے پر منصوبہ بند کوشش کے تحت ایک علمی لین دین ہو۔ گریز، خوف اور نفسیاتی کشمکش کو دل و دماغ سے جھٹک کر ہم حوصلہ مندانہ عجز و انکسار، محبت و احترام اور خلوص دل سے علی گڑھ اور دیو بند میں ایک نئے علمی، ثقافتی اور تہذیبی رشتے کا آغاز کریں تا کہ وہ دوری جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے چلی آ رہی ہے اور جس کے مضر نتائج ہم نے اب تک دیکھ لیے ہیں، ختم ہو سکے اور علی گڑھ و دیو بند کے اشتراک سے اکیسویں صدی میں برصغیر کے مسلمان سچے معنوں میں ''خیر امت'' کی تصویر پیش کریں، اللہ کی رسی کو

مضبوطی سے پکڑیں اور ایک ایسے سماج کی تشکیل میں حصہ لے سکیں جہاں دوئی کے بجائے ایکی کا تصور ابھر کر آئے، حریفانہ دوری کی جگہ حلیفانہ یگانگت لے سکے۔

سرسیّد کا علی گڑھ اپنے قیام سے آج تک مولانا نانوتوی کے دیوبند کا مداح رہا ہے اور معتقد بھی۔ (اس کے ثبوت میں دینیات فیکلٹی کے وہ مقالے ہیں جو کہ اعلا تحقیقاتی ڈگریوں کے حصول کے لیے پیش کئے گئے ہیں اور جن کا موضوع اکابرین دیوبند کی حیات اور علمی و مذہبی خدمات ہیں) اور جب بھی دیوبند سے کوئی صدائے حق اور نعرۂ حریت بلند ہوا، علی گڑھ نے اپنی بساط بھر اس کا خیر مقدم کیا ہے، گو انگریزوں کی مخالفت اور ان کی غلامی کے طوق سے ملک کو آزاد کرانے کی جو جدوجہد دیوبند کے فرزندوں کو اپنے بانی سے ورثے میں ملی تھی، اس کو اس ادارے کے ممتاز فاضلین نے اپنے پائے استقامت کو جنبش دیے بغیر بھی جاری رکھا۔ لیکن اس جدوجہد میں جدید تعلیم و تربیت کے پروردہ علی گڑھ کے کھلنڈروں نے بھی آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ بس فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہاں شعوری طور پر انگریزی دشمنی گھٹی میں پلائی گئی تھی اور یہاں جدید تعلیم کے نتیجے میں جنم لینے والے افکار و نظریات کا یہ منطقی نتیجہ تھا۔ اور جب شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے ساتھ تحریک ترکِ موالات کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو انہوں نے اس کا اعلان ان لفظوں میں کیا کہ:

> ”اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔“

ایک بار پھر وقت آواز دے رہا ہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دیوبند کو اور پہلے سے زیادہ زور سے پکار رہا ہے کہ وہاں سے پھر کوئی شیخ الہندؒ اٹھے اور علی گڑھ سے اس رشتے کو نئے انداز سے استوار کرے جس کی بنا عملی طور پر ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن مولانا محمود حسنؒ کے ہاتھوں پڑی تھی اور سرسیّد کا علی گڑھ ایک بار پھر رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی پیروی کرے۔

کیا ایسا ممکن ہو سکے گا؟ — بانیٔ دارالعلوم، دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالے سے منعقدہ اس اجتماع کے حوالے سے وقت اور تاریخ دونوں آپ سے، آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔

مولانا عقیدت اللہ قاسمی*

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی اور سرسید احمد خاں

حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی سید احمد خاں معروف بہ سرسید احمد خاں ایک ہی منبع البحرین حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کے فیض کا پرتو تھے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مذہبی احیاء، تعلیمی ترقی و فروغ، سیاسی ارتقا، تہذیبی وثقافتی وملی نشوونما اور معاشرتی اصلاح کے یہ دونوں دھارے ایک ہی چشمۂ فیض اور بحر ذخار سے نکل کر بہنے والی دو عظیم نہریں تھیں۔ اگر چہ سرسید احمد خاں کی سوانح، حیات جاوید کے مولف الطاف حسین حالی نے ان کے استادوں میں مولانا مملوک علی کو شامل نہیں کیا ہے لیکن شیخ محمد اکرام آئی سی ایس، برصغیر کی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور اسلامی وملی تاریخ تحریکوں اور نمایاں شخصیتوں کے موضوع پر اپنی مایۂ ناز تالیف موج کوثر میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ اسحٰق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاذ ومحسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں''۔ (ص:۸۰)

شیخ محمد اکرام اس مایۂ ناز ومنفرد تالیف میں ایک اور جگہ مولانا مملوک علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرحوم دہلی کالج میں مدرس ہوگئے تھے، جن بزرگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی ان میں سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج، مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی سرپرست دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور ان کے اپنے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے صاحب علم وفضل شامل ہیں''۔ (ص:۱۹۴)

ان دونوں بزرگ رہنماؤں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے دو مختلف قسم کے تعلیمی مراکز

---

* ڈاسنہ، ضلع غازی آباد (یوپی)

کی بنیادیں رکھیں۔ اس وقت کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے والے کو کوئی ڈگری یا سرٹیفکٹ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اس کے اندر صلاحیت پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس روایت کے مطابق آج بھی دارالعلوم دیوبند کی سند میں لـه مـنـاسبة في العلوم کے الفاظ لکھے جاتے ہیں یعنی ہمارے یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس شخص کے اندر علوم سے مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرح اس مناسبت، لگاؤ اور صلاحیت وقابلیت کے بل پر اس کو آگے بڑھنے کے لئے رہنمائی کی جاتی اور راستے کھولے جاتے تھے، جس سے الامام مولانا نانوتوی نے علوم دینیہ میں کمال پیدا کیا اور عالم اسلام نے انہیں حجۃ الاسلام تک کا خطاب دیا، جبکہ اسی تعلیم کی بنیاد پر مولوی سید احمد خاں نے اپنے آبائی پیشہ لال قلعہ کی درباری وملازمت کے طور طریقوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور بڑھتے بڑھتے انگریزی سرکار کے اعلیٰ عہدوں تک پہونچ گئے، حکومت برطانیہ سے ''سر'' کا خطاب حاصل کیا اور ایسے ایسے اعزازات حاصل کئے جو ان سے پہلے کسی ہندوستانی کو نہیں ملے تھے۔

یہ دونوں ہی عظیم رہنما اس زمانہ میں اس عالم رنگ وبو میں قدم رنجہ ہوئے تھے جب مغلیہ سلطنت زوال، انتشار، بدنظمی اور طوائف الملوکی سے دوچار تھی اور یورپ کی کمپنیاں اس ملک کو اپنے ظلم وستم کے پنجوں میں جکڑ رہی تھیں اور اپنا تسلط جما رہی تھیں۔ اگرچہ ہندوستان پر مسلمانوں کے دور میں شخصی حکومتیں ہوا کرتی تھیں اور جمہوری حکومت کے طرز پر مبنی اداروں کے وجود سے دنیا آشنا نہ تھی لیکن یہ خودمختار سلاطین جو شخصی حکومت کے علم بردار کہے جاتے تھے فی الحقیقت رعایا کی رضامندی کے جویا رہتے تھے، رعایا کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتے تھے، مطلق العنان بادشاہ آئینی حکمرانی کے جادۂ اعتدال سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بادشاہی سے ناراضی کا جذبہ بغاوت وسرکشی کی صورت میں نمودار ہوتا، ہر روز تخت پلٹتے، ملک میں افراتفری اور طوائف الملوکی عام ہوتی اور وہ اتنے اتنے طویل عرصہ تک حکمرانی نہ کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آنے سے پہلے ہندوستان ایک متحد ملک نہیں بلکہ ہزاروں ملکوں میں بٹا ہوا اور گھر گھر کے رجواڑوں میں باہم برسرِ پیکار رہنے والا خطہ تھا۔ اس کو مسلم حکمرانوں نے ہی ایک متحدہ ملک اور سونے کی چڑیا بنایا تھا۔ فرانس کے مشہور سیاح ڈاکٹر برنیئر کے الفاظ میں ''وہ ایسی بے تھاہ خلیج تھا جس میں دنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف

سے آ کر جمع ہوتا اور بمشکل ایک طرف سے نکلتا تھا''۔ مسلمانوں کی حکومت کے عروج کے جاتے رہنے اور دہلی کی حکومت کے پاش پاش ہو جانے کے بعد طوائف الملو کی کے پھیل جانے کے زمانہ میں بھی لارڈ میکالے نے کہا تھا:

''باوجود مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبۂ بنگال باغ ارم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آبادی بے حد و غایت بڑھی ہوئی تھی، غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبجات پرورش پاتے تھے اور لندن و پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑے پہنتی تھیں۔ دولت کی یہ کیفیت تھی کہ بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار انگلستان کے سب سے بڑے بنک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہوا تھا اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برابر تھا''۔

ان حکمرانوں کی رعایا پروری کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۷۶۸ء میں جب راجپوتانہ میں سخت قحط پڑا تھا اور بہت سے میواتی و مارواڑی اپنا وطن چھوڑ کر روہیل کھنڈ پہونچنے لگے تو اول حافظ الملک والی روہیل کھنڈ نے ان لوگوں کے روزینے مقرر کیے، اس کے بعد پیلی بھیت کی شہر پناہ کی تعمیر شروع کر کے ان لوگوں کو کام میں لگا دیا اور جب یہ تعمیر ختم ہو جانے پر بھی قحط زدہ لوگوں کی آمد بند نہ ہوئی تو اس شہر پناہ کو گروا کر اسے از سر نو پختہ بنوانا شروع کر دیا۔ حافظ الملک نے روزی روٹی اور عزت نفس کا یہ انتظام ان لوگوں کے لیے کیا تھا جو نہ ان کے ہم مذہب تھے اور نہ ہی رعایا۔ لا اینڈ آرڈر اور امن و قانون کی صورتحال کو انگلستان کے مشہور مقرر ایڈمنسٹر برک کی اس تقریر کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو انہوں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں کی تھی:

''ایشیا کا بڑا حصہ مسلم حکمرانوں کے زیر اقتدار ہے اور اسلامی حکومت کے معنی ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا مضبوطیاں ہیں، ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لئے رعایا سے لے کر بادشاہ تک سب کے سب یکساں طور پر قانون اور مذہب کے پابند ہیں...... قرآن شریف کے قانون کا ایک ایک حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ قانون کی شرح کرنے والے علما و قاضیوں کا ایسا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضی سے محفوظ ہے کہ جسے بادشاہ

ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے، بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے"۔

اس زمانہ میں مذہبی حقوق کی حفاظت کا نقشہ پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی کے حسب ذیل الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد ان کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت سے رہتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی...... ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہندوستان میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیریں عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے"۔ (مضامین بابو سندر لال)

پنڈت سندر لال مزید لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے اپنی زبان عربی اور فارسی چھوڑ کر ہندوستان کی زبان اختیار کی جس کا نام اردو ہے"۔

اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

یہاں ایک ہزار سال کی جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن، جس کی زبان اور جس کی ملکی سیاست ایک ہو رہی تھی اور مسٹر چارلس گرانٹ نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوؤں کے کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ (تاریخ التعلیم از سید محمود)

مسلمانوں کے دور حکومت میں ابتداء سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام مفت بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میکس مولر نے اعتراف کیا ہے کہ

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے، اس طرح چار سو آدمیوں کے آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالفانہ طرز عمل کے باوجود ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی جو کچھ تعلیمی اور

ذہنی حالت رہی اس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے کیا جا سکتا ہے:

''عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ (بغاوت ہند اور ہماری آئندہ پالیسی از بیرنگٹن طامس)

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی سید احمد خاں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی اپنی آنکھوں سے وہ دردناک مناظر بھی دیکھنے پڑے جنہوں نے مسلمانوں کو عروج کی بلندیوں سے اٹھا کر زوال کی انتہائی پستیوں میں دھکیل دیا۔ جن کا ایک نقشہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے گورنمنٹ کو پیش کردہ اپنی ایک متفقہ یادداشت میں کھینچا:

''انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے، ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصل علوم کے بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار کے فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے''۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص:۱۳۹)

ایک موقع پر لارڈ میکالے نے لکھا تھا:

''کلایو کسی مسلمان کو بنگال کے محکمۂ انتظامی کا ذمہ دار بنانے کے بہت خلاف تھا''۔

اسی طرح سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان ہی کر دیا تھا کہ:

''جو ملازمتیں خالی ہوں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔''

مدراس گورنمنٹ نے ۱۸۷۳ء میں تسلیم کیا کہ:

''موجودہ طرز تعلیم کا قالب ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا اور مسلمانوں کو اس بارے میں اس قدر زیادہ گھاٹے میں رکھا گیا کہ اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد کم ہونا حیرت انگیز امر نہیں ہے بلکہ ان حالات میں محض ان کا موجود ہونا ہی حیرت انگیز ہے۔'' (تاریخ التعلیم از سید محمود)

ان حالات میں ہمارے یہ دونوں عظیم دردمند رہنما میدان عمل میں آئے مگر دونوں نے الگ

الگ راستے اختیار کیے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے رفقاء کی معیت میں غیر ملکی حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں جہاد کیا۔ ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد میں ناکام ہو جانے کے بعد قلم اور زبان سے وہ تا دم آخر جہاد کرتے رہے۔ انہوں نے دین و مذہب اور تہذیب و ثقافت کو اولین درجہ دیا۔ انہوں نے دنیا کو کبھی ایک مردار سے بڑھ کر نہیں سمجھا حالانکہ انہوں نے اس زمانہ کے عیسائی راہبوں اور ہندو سنیاسیوں و سادھو سنتوں کی طرح دنیا کو بالکل ترک بھی نہیں کیا۔ انہوں نے دنیا میں سے اپنے لئے اتنا تھوڑا حصہ لینے پر اکتفا کیا کہ زندگی اور دنیاداروں کے موجودہ معیار سے ان کی حالت قریب قریب تارکان دنیا ہی کی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ جہاں ان بزرگوں کی عملی مثال اور تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ دیوبند فقط اہل علم کا مدرسہ نہیں بلکہ اہل اللہ اور تارکان دنیا کی خانقاہ بھی بن گئی۔ اس طریق کار نے دیوبند میں ایک روحانی سربلندی پیدا کر دی۔ ظاہر ہے اس حقیقت کو وہ لوگ کیسے قابل قدر گردان سکتے ہیں جو دنیا کی لذتوں ہی کو مقصد حیات تصور کرتے ہیں۔ حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ہمہ جہت شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کو سیمینار کے بیش بہا مقالات میں حضرات گرامی بخوبی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اس لئے بخوف طوالت حجۃ الاسلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو دوسرے مقالہ نگاروں پر چھوڑتے ہوئے بغرض موازنہ و تقابلی مطالعہ سرسید کے حالات کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔

سرسید احمد خاں کا مادی ترقی کے متعلق جو نقطۂ نظر تھا وہ اظہر من الشمس ہے، اس مقصد کے لئے سرسید کو تقلید مغرب سے بھی کوئی عار نہ تھی۔ سرسید کے بزرگوں کا ہمیشہ شاہی دربار سے واسطہ رہا۔ وہاں سے انہیں برابر خطاب، منصب اور خلعتوں سے نوازا جاتا رہتا تھا، ان کے والد میر متقی کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانہ سے نہایت خلوص اور خصوصیت کا لگاؤ تھا، ان کا رسوخ دربار میں بہت زیادہ تھا، انہیں قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت ۱۸۳۸ء میں سرسید کی عمر بائیس سال تھی، اس وقت انہیں نوکری کا خیال پیدا ہوا، انہوں نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں سے جو اس وقت دلی میں صدر امین تھے کچہری کی کارروائیوں کے طریقے سیکھے۔ انہوں نے چند ماہ بعد اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ کچھ دن بعد سرا ینمرٹ ہملٹن کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔

انہوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ تیار کیا جسے کمشنر صاحب نے گورنمنٹ میں پیش کر کے سرسید کے لئے عہد ہ منصفی کی سفارش کردی۔ سرسید نے عہدہ منصفی کے لئے قواعد کا امتحان دیا اور مین پوری کے منصف بن گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کے خاندانی خطاب سے بھی آگے "جوادالدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" کے خطاب سے نوازا۔ بحیثیت منصف دہلی تبادلہ ہو جانے پر خارج وقت میں عمارات دہلی کی تحقیق کے بعد ضخیم شاہکار آثار الصنادید ترتیب دیا۔ جس کی بنیاد پر انہیں گریٹ برٹن آئرلینڈ ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہر موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریہ سوسائٹی کا آنریری ممبر نامزد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت وہ ضلع بجنور میں صدر امین کے عہدہ پر تھے، وہاں انہوں نے نہایت تحقیق، کاوش اور محنت کے ساتھ ضلع بجنور کی تاریخ لکھی۔ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تحقیق وتصحیح کی۔ انہوں نے ہندوستان کی قوموں کے لئے فیصلہ اور انقلاب انگیز معرکہ ۱۸۵۷ء میں یورپین حاکموں کا ساتھ دیا۔ گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں بھرپور طریقہ سے سرگرم رہے۔ تاریخ سرکشی بجنور لکھی۔ مرادآباد پہونچے تو وہاں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ترتیب دیا، اسے اردو اور انگریزی میں شائع کیا۔ اسی سلسلہ میں سرکار کو ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔ رسائل موسوم بہ لائل محمڈنز آف انڈیا ترتیب دے کر شائع کئے جن کی تحقیق اور چھان بین سے ایسی شہادتیں بہم پہونچائیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کی خیر خواہی میں جاں بازی اور جاں نثاری کے جس قدر کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی سے نہیں آئے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اضلاع شمال مغرب میں عام قحط پڑا تھا سرسید مرادآباد میں صدر الصدور تھے۔ انہیں ضلع کے قحط کا انتظام سپرد کیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے جو حسن انتظام کا مظاہرہ کیا اس سے تمام ہندوستان میں نہایت عزت اور نیک نامی حاصل ہوئی۔ انہوں نے بائبل کی تفسیر تبیین الکلام لکھنے اور قرآن وحدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا کام شروع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے۔ ان کا تبادلہ غازی پور ہوا تو وہاں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس میں انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یہاں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی بھی قائم کی جس کا مقصد انگریزی

کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانا تھا۔ علی گڑھ تبادلہ ہونے پر سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ ایک وسیع عمارت اس کے لئے بنوالی۔ یہاں سے وہ عہدۂ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر بنارس چلے گئے۔ مسلمانوں کے اندر مغربی تعلیم کی اشاعت اور ان کے انگریزوں سے میل جول کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے ولایت کا سفر کیا، پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا، بہت سے پروگراموں میں شرکت کی اور بہت سے عمائدین سے ملاقاتیں کیں، بہت سی جگہوں پر ان کی عزت افزائی کی گئی، سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ ملا، سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر کے خلاف دانستہ یا نادانستہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ازالہ کرنے کے لئے خطبات احمدیہ ترتیب دے کر شائع کرائی۔ ہندوستان واپسی پر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کے ایڈیٹر اور منیجر وہ خود ہی تھے۔ سرسید نے ۳۵ سالہ سرکاری ملازمت کے فرائض کے علاوہ تصنیف وتالیف اور ترویج علوم کے میدان میں اپنی عظمت کا سکہ جما دیا۔ انہوں نے تفسیر قرآن کی سات جلدیں اور کئی دوسرے مذہبی رسائل بھی لکھے۔ کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان، مسلمانوں کی تعلیم سے دوری کے اسباب کا پتہ لگانے کی غرض سے تشکیل دی اور کمیٹی کی طرف سے ایک کالج کے قیام کی تجویز ہونے مجوزہ کالج کے لئے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین بنائی۔ آخر سرسید کے ابتدا سے شریک کار، دست راست اور سکریٹری سب کمیٹی مولوی سمیع اللہ سب جج علی گڑھ نے اپنی کوٹھی میں مدرسۃ العلوم قائم کیا، جبکہ سرسید احمد خاں بنارس میں سب جج تھے، وہ بعد میں جولائی ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے پنشن پاکر علی گڑھ آکر مقیم ہوئے۔ اسی مدرسہ کو انہوں نے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں بدلا جو ان کے انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کے بائیس سال بعد جنوری ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس طرح سرسید کی پوری زندگی سراپا حرکت، عمل اور جدوجہد کا نام ہے۔

سرسید احمد خاں کی زندگی کے ایک ایک پل کا عمل یقیناً لائق صد ہزار تحسین اور آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، مگر قوم ان میں سے اکثر کارناموں سے بے خبر ہے اور انہیں صرف مسلم یونیورسٹی کے بانی کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ یقیناً خود یہ کارنامہ بھی تاریخ کا انتہائی درخشاں باب ہے، مگر انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ سرسید کے حوالہ سے ایک بہت ہی غلط اور بے بنیاد بات انتہائی

شدت اور پوری قوت کے ساتھ پھیلائی جاتی ہے۔ ''الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں'' کے عنوان سے لکھے جانے والے مقالہ کے لئے یہ بحث بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا مقصد ایک انتہائی لغو جھوٹ کی پول کھولنا اور حقیقت سے پردہ اٹھانا ہے۔

بعض لوگوں کا من پسند مشغلہ یہ شور مچانا ہوگیا ہے کہ ''مولویوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے محروم کر دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ بعض مسلم دانشور یہ رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ قدامت پرست مولویوں نے سرسید کی انگریزی تعلیم کی تحریک کی مخالفت کی جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے اور انگریزی سرکار اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، ان مولویوں نے انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلائی، انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اسکولوں و کالجوں میں جانے کے خلاف کفر کے فتوے لگائے، مولویوں کی اس عاقبت نااندیشی نے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں کئی سو سال پیچھے چھوڑ دیا، ہماری اس تعلیمی زبوں حالی کے لئے مولویوں کے فتوے ذمہ دار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی تعلیم کی مخالفت کے اس بے بنیاد فسانہ کو اس زور وشور اور تسلسل کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے کہ آج بہت سے لوگ اس جھوٹ کو حقیقت باور کر بیٹھے ہیں حتیٰ کہ آج کل مولویوں کا بھی ایک بڑا طبقہ اس پر یقین کرتا اور اپنے بزرگوں کی رائے سمجھ کر خود انگریزی تعلیم کی مخالفت میں بحث کرنے لگتا ہے، حالانکہ ہمارے اکابر علما نے انگریزی تعلیم کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ایک طبقہ میں چند وجوہ کی بنا پر سرسید احمد خاں کی بہت مخالفت ہوئی اور چونکہ اس مخالفت کے متعلق نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی زبردست غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کا سنجیدگی سے جائزہ لینا اور حقائق سے پردہ اٹھانے کے لئے قدرے تفصیل سے بحث کرنا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ علما نے سرسید احمد خاں کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے سرسید کی مخالف وموافق تحریروں کی روشنی میں بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس بہتان طرازی کے ذریعہ علماء اسلام کو ایک ایسے جرم میں قابل گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے جس کا سارے فسانہ میں کوئی ذکر نہیں اور جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علماءِ حق نے کبھی بھی انگریزی یا کسی اور زبان کو سیکھنے کی نہ مخالفت کی اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتے تھے، ظاہر ہے وہ کسی علم کے حاصل کرنے کی مخالفت کرتے بھی کیسے جبکہ پیغمبر اسلام پہلے ہی فرما چکے تھے "ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔" رسول خدا نے کسی خاص علم کی بھی بات نہیں کہی بلکہ خود اپنے چہیتے صحابی حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی زبان عبرانی سریانی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں علماءِ حق نے عملاً یونانیوں کے علوم وفنون، فلسفہ، حکمت، طب، ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا، الجبرا، جغرافیہ اور طبیعات وغیرہ کو بھی حاصل کیا اور نہ صرف حاصل کیا بلکہ انہیں اس طرح اپنا لیا کہ وہ بقراط، سقراط، جالینوس اور ارسطو و افلاطون کے علمی ذخیروں کے مالک، وارث اور امین بن گئے۔ اقلیدس اور بطلیموس کے علوم وفنون کی تحقیقات ان کی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ وہ علوم عربی سانچے میں ڈھل گئے اور عربی زبان میں نئے ادب اور تاریخ کی بنیادیں پڑیں۔ علماءِ اسلام نے ان علوم کو اس طرح اپنایا کہ آج وہ سب اسلامی علوم وفنون کہلاتے ہیں۔ فارسی جو ایران کے زرتشتوں اور آتش پرستوں و مجوسیوں کی زبان تھی عربی کی طرح ہی اسلامی زبان کہلانے لگی۔

استاذ الاساتذہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے بستر مرگ پر دراز ہونے کی حالت میں ۱۶ رصفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی۔ شیخ الہند نے اس کے سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

> "آپ میں سے جو محقق اور باخبر لوگ ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے اور دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر جو یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگتے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں اور حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے تو ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔"

سرسید احمد کے جنم لینے سے بھی بہت پہلے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خلف الرشید شاہ عبدالعزیز سے (جو خود سرسید کے الفاظ میں اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں نہایت

نامی مولوی تھے) انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے متعلق فتوی پوچھا گیا تو جیسا کہ خود سرسید احمد خاں نے اسباب بغاوت ہند ص ۲۰ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ میں لکھا ہے:

''انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج جانا اور انگریزی زبان سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔''

ان کا کہنا تھا کہ:

''جاؤ انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعا ہر طرح جائز ہے۔''

فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز، فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبدالحی نے فتوی دیا کہ:

انگریزی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھنا اگر تشبہ کی غرض سے ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لئے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے خبردار ہو سکیں تو کوئی حرج نہیں۔''

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس طرح فتوی دیا تھا:

''انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ ہووے (فتاوی رشیدیہ ص ۵۷۴ مطبوعہ درسی کتب خانہ دہلی)

علماء نے روزگار حاصل کرنے اور علم میں اضافہ کے لئے بھی کھل کر انگریزی تعلیم کے جائز ہونے کا فتوی دیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے جلسہ تقسیم انعامات میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے عربی مدرسوں سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونے کی خواہش رکھنے والے طلبا کی حوصلہ افزائی ان الفاظ میں فرمائی تھی:

''اگر اس مدرسہ کے طلبا سرکاری مدرسوں میں جا کر جدید علوم حاصل کریں تو یہ بات ان کو کمال کی جانب بڑھانے والی ثابت ہوگی۔ (روئداد دارالعلوم)

جب دارالعلوم دیوبند کے مشہور عالم حضرت شیخ الہند کے شاگرد خاص مولانا عبیداللہ سندھی نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ جو انگریزی تعلیم یافتہ طلبا دین کی تبلیغ کا شوق رکھتے ہوں اور دارالعلوم دیوبند میں آکر اسلامی علوم حاصل کرنا چاہتے ہوں، دارالعلوم ان کی

تعلیم کا خصوصی انتظام کرے گا اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبا کو خصوصی انتظام کے ساتھ انگریزی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔ اس طرح اس معاہدہ کے تحت آج بھی دارالعلوم دیوبند اور دوسرے دینی مدارس کے فارغ طلبا علی گڑھ جا کر مختلف شعبوں اور فیکلٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے اور بہت سی یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور اپنے شعبہ کے سربراہ یعنی ڈین آف فیکلٹیز تک بنتے ہیں، جبکہ علی گڑھ یا دوسرے کالجوں و یونیورسٹیوں کے مسلم طلبا کے دلوں میں چونکہ دینی تعلیم کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت پیدا نہیں کی جاتی اس لئے وہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسوں کا رخ نہیں کرتے۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور ذہنوں میں پیدا ہوگا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ کے قائم کئے ہوئے کالجوں میں پڑھنے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو علما نے جائز قرار دیا تھا تو ایک ایسے مدرسۃ العلوم یا اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کی مخالفت کیوں کی گئی جو خود مسلمانوں کا جاری کردہ تھا اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام تھا؟

یہ تو حقیقت ہے کہ اس کالج کی مخالفت ہوئی اور اس کے بانی سرسید احمد خاں کے خلاف فتوے لگائے گئے۔ اس سلسلہ میں موج کوثر کے مصنف شیخ محمد اکرام آئی سی ایس لکھتے ہیں:

''اس معرکہ کو حل کرنے کے لئے ان مضامین اور فتاوی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جو علی گڑھ کالج اور سرسید احمد خاں کی مخالفت اور ان کی تکفیر کے سلسلہ میں شائع ہوئے، ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لئے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا جو اپنی کتابوں اور رسالہ تہذیب الاخلاق میں مذہبی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔''

ان میں سے بعض خیالات کو الطاف حسین حالی نے ان کی سوانح کے طور پر لکھی ہوئی اپنی ضخیم تالیف ''حیات جاوید'' میں بھی جمع کر دیا ہے۔

سرسید احمد خاں کا کہنا تھا:

''طیور منخنقہ یعنی جن پرندوں کو نصاری نے گلا گھونٹ کر مار دیا ہو مسلمانوں کے لئے ان کا کھانا حلال ہے۔ شیطان یا ابلیس کا جو لفظ قرآن میں آیا ہے اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان کے اندر جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہی مراد ہے۔ وضع لباس میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہیں اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات جن کا ہمیں علم نہیں موجود ہوں، لیکن ملائک یا ملائکہ کے جو الفاظ قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قوی اپنی قدرت کاملہ سے مادے میں ودیعت کئے ہیں۔ جیسے پہاڑوں میں صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، بدن کی قوت جذب و دفع و امثال ذلک انہی کو ملائک یا ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدم اور ملائکہ و ابلیس کا جو قصہ قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ آیت الذین آتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم (یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی یعنی اہل کتاب ان کو بالکل اس طرح پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) میں حضور پیغمبر اسلام مراد نہیں ہیں، جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے، جن لوگوں کو روزہ رکھنا شاق ہے خواہ وہ بوڑھے ہوں خواہ جوان وہ روزہ کے بدلہ فدیہ دے سکتے ہیں۔ پرامیسری نوٹوں پر جو نفع لیا جاتا ہے اس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ کسی گورنمنٹ یا کمیٹی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپے قرض لے اس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کو جو رفاہ عام کے لئے چندہ جمع کرے اس روپیہ کا سود میں لگانا اور اس منافع سے رفاہ عام کا کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت نہیں ہے۔ شہیدوں کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اس سے ان کا علو درجات، روحانی خوشی اور دنیا میں قابل تقلید مثال چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے ہیں۔ صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد بار آیا ہے محض استعارہ ہے فی الواقع کوئی آلہ مراد نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال سے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز، استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا

ہے۔اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے جیسے بعث ونشر، حساب کتاب، میزان، صراط اور جنت ودوزخ وغیرہ وہ سب حقیقت پر نہیں مجاز پر محمول ہیں۔قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں برائیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد ان پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوجانا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت ان کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے۔قرآن مجید میں جو جنگ بدر وحنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوا اور آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد وعورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہوسکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہونچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا۔''

سرسید کی لکھی ہوئی تفسیر کے مطالعہ سے ان کے اس طرح کے بہت سے عقائد سامنے آتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاوی میں بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ ''انگریزی کا پڑھنا کفر ہے۔'' ان فتاوی میں یہ لکھا ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرے اس کی اعانت جائز نہیں اس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلانا مسلمان کا کام نہیں۔''

مسلمانوں کا روشن مستقبل کے مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ کا بھی یہی کہنا ہے کہ کوئی اعتراض سرسید کے مخالفین کی طرف سے مطلق انگریزی تعلیم کے متعلق کہیں درج نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم سے اختلاف نہ تھا بلکہ اس طرز معاشرت سے اختلاف تھا جس کو بقول حالی ''سرسید تعلیم سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے اور جس سے مسلمان بھڑکتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے لڑکے انگریزی پڑھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی تربیت پا کر اپنی تہذیب اور مذہب سے دور ہوجائیں گے اور ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے''۔

حالی نے لکھا ہے کہ:

"خود سرسید کو جس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اسی وقت سے اس بات کی فکر ہوئی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لئے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو اس تعلیم کے ان مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اور خواہ عیسائی ان کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی، وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقت عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علوم طبعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا کہ ریاضی اور سائنس کے ہر مسئلہ پر ان کو ملتا رہا ہے، ان کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف ان کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے، اس لئے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جسے وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں۔"

اس موقع پر اس امر پر توجہ دلانا بے جا نہ ہوگا کہ عقائد، خیالات اور نظریات کا کسی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ان باتوں پر زبان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اثر ان مضامین اور عبارتوں کا پڑتا ہے جو کسی بھی زبان میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ عربی میں جو آج پوری طرح اسلامی زبان ہے عیسائیت پڑھائی جا سکتی ہے۔ فارسی میں ہندوتو اور اردو میں یہودیت کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں اسلام کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ مسلمانوں نے آج تک درسیات پر توجہ نہیں دی۔ جہاں مسلمانوں نے کچھ کالج کھولے ہیں وہاں بھی صہیونیوں، نصرانیوں اور شنویوں کی اپنے نقطۂ نظر سے تیار کردہ درسیات ہی پڑھائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے آج بھی وہی اثرات سامنے آرہے ہیں جن پر سرسید، اکبرالہ آبادی اور اقبال نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ سرسید احمد خاں ایسٹ انڈیا کمپنی، حکومت برطانیہ اور مشنریز کی

تعلیمی پالیسیوں کے حوالہ سے بہت سی شکایتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ''ان تمام باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم ورواج کے ادا کرتے ہیں نہ کہ بطور احکام مذہب کے، ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد کی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ وہ ان کے برتاؤ میں ہیں اس سبب سے وہ مذہب میں نہایت سست ہیں اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے، جس کو دل میں اعتقاد جانتے ہیں، برخلاف باتیں ہوا کریں ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد کے بموجب جو باتیں ان کے مذہب میں نجات دلانے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسی سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض ہیں۔'' (اسباب بغاوت ہند)

سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ مخالفت سرسید کی اس وجہ سے ہوئی کہ خود سرسید نے عربی مدارس کی تعلیم پر سخت حملے کئے تھے۔ ان میں سے بعض مدارس تو بہت زیادہ پرانے تھے اور بعض علی گڑھ تحریک شروع ہونے سے کئی سال قبل جاری ہوئے تھے، ان مدارس میں بالعموم غیر مستطیع طلبا پڑھتے تھے جو انگریزی تعلیم کے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اور نہ ان مدارس کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ وہ قوم کے بچوں کی انگریزی تعلیم میں مانع یا حارج ہوتی۔ مگر باوجود اس کے سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کی ابتدا میں قدیم عربی مدارس کے خلاف مختلف عنوانات سے لکھا، انہوں نے مسجدوں، کنوؤں، پلوں اور مہمان سراؤں کی تعمیر کے نام سے کئے جانے والے کاموں کا مذاق اڑایا۔ وہ عربی مدارس پر کئے جانے والے اخراجات کو نقش برآب اور نہایت حقیر خصلت قرار دیتے تھے۔ جامع مسجد دہلی کی مرمت اور عربی مدارس کے قیام کی تضحیک کرتے ہوئے ثواب، بہشت، جنت کے حور وغلمان، باغ، میوہ اور نہروں کی امید کو خود غرضی، دھوکہ اور گدھے کا کھایا کھیت پاپ نہ پن جیسے الفاظ استعمال کئے۔ سرسید کی طرف سے اپنے عقائد کی تشہیر واشاعت اور ان کی اس قسم کی

تحریروں سے مسلمانوں نے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ جس قسم کی مذہبی تعلیم علی گڑھ میں دی جائے گی وہ سرسید کے ان عقائد کے مطابق ہی ہوگی اور مروجہ مذہبی تعلیم سے مختلف ہوگی، اس لیے ان کی اور بھی زیادہ مخالفت ہوئی اور اس وقت کے علماء اھون البلیتین کے اصول کے پیش نظر اس بات پر راضی تھے کہ سرکاری مدارس کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے اور اس طرح مسلمانوں کو انگریزی پڑھائی جائے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب مفسر دہلوی نے لکھا تھا۔

''مسلمانوں کے لیے جداگانہ کالج بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکوں کو سرکاری مدارس میں داخل کر کے ان کی مذہبی تعلیم کا انتظام اپنی طرف سے کیا جائے۔ اس پر ردعمل میں سرسید نے ایک مضمون ''قدیم مذہبی تعلیم سے لامذہبیت پیدا ہوگی'' کے عنوان کے تحت اس طرح لکھا:

بڑے بڑے معمم ومشمل قدوسی عالموں نے بہت غور کے ساتھ یہ تجویز کی کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ واصول وتفسیر وحدیث وعلم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محققانہ تعلیم مذہبی اصول فقہ واقعیہ پر بلاشبہ مانع نقصان عقائد فقہ اسلامیہ کے ہوگی، مگر تقصیر معاف ہو یہ اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہوسکتی اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج نہیں کرسکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جاویں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسہ میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل وکتابوں میں کر رہے تھے اور ان کی تصانیف میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف ہی نہیں بلکہ ان کے موافق بھی بدظن ہوجاتے تھے، ان کے خیالات اور عقائد کو عام مسلمان تفہیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے، جبکہ سرسید ان پر اصرار کرتے تھے اور انہوں نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد وخیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے، ایسے میں ان عقائد وخیالات کی مخالفت لازمی تھی۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج عام طور سے ہمارے دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان

دقیانوسی علما نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے اور سرکار انگلشیہ کے مخالف تھے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے حق پسند علما نے سرسید یا کسی اور کی انگریزی تعلیم کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی، جن لوگوں نے سرسید کی تعلیم کی تحریک اور مولوی سمیع اللہ کے مدرسۃ العلوم کو اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں بدلنے کی مخالفت کی وہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے یا ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے مولوی نہیں خود سرسید احمد خاں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج یعنی سرکار انگلشیہ کے وفادار، نمک خوار اور معزز افسر تھے۔

اصحاب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس زمانہ کے تعلیمی نظام اور نصاب سے فارغ ہونے والا ہر شخص مولوی کہلاتا تھا اسی لیے خود سرسید احمد خاں کو بھی مولوی کہا جاتا تھا، کیونکہ انہوں نے بھی دلی کے اسی مدرسہ غازی الدین میں تعلیم حاصل کی تھی جسے نظام الملک آصف جاہ اول کے جد امجد غازی الدین فیروز جنگ اول نے اجمیری گیٹ سے متصل قائم کیا تھا اور جہاں سے ہمارے بہت سے بزرگ علما: مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ نے تعلیم حاصل کی تھی اور جہاں مولانا مملوک علی صدر المدرسین رہے ہیں چنانچہ الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں وغیرہ سب انہی کے شاگرد تھے۔

خود سرسید کے سوانح نگار الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ خود سرسید نے اپنے بعض مضامین میں علی گڑھ کے کلکٹر اور صوبہ کے ڈائریکٹر محکمہ تعلیم کو مدرسۃ العلوم کا مخالف قرار دیا ہے۔ ان انگریزوں میں سے بعض کے ساتھ مذکورہ دونوں معزز جج و کلکٹر صاحبان کو خاص تعلق تھا، اس لئے سرسید کی مخالفت کو انہوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا۔''

الغرض سرسید کے عقیدوں اور خیالات کی وجہ سے ہی مدرسۃ العلوم کی شروع میں مخالفت ہوئی تھی، ورنہ علماء حق نے تو ہمیشہ حالات کی نبض پر انتہائی دانش مندی کے ساتھ نظر رکھی ہے۔ یہاں تک کہ جب شدھی تحریک کے علمبرداروں نے اسلام کے خلاف جارحانہ انداز میں رکیک حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ الزامی اور ترکی بہ ترکی جواب کے لئے علما نے ویدوں کے مطالعہ کا بھی فیصلہ کیا۔ اتنا ہی نہیں ان کی زبان سنسکرت کو سیکھنے کے لئے اپنے یہاں کے تین فارغین کو دارالعلوم کے خرچ اور ذمہ داری پر کلکتہ تک بھیجا جن میں ایک تاریخ دارالعلوم کے مصنف جناب سید محبوب رضوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ اسی طرح جب سرسید نے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں اپنے مخصوص عقیدوں کی تبلیغ واشاعت نہ کرنے کا یقین دلایا تو علما نے بھی کالج میں تعاون دینا شروع کر دیا۔

خود حیات جاوید میں الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے علما سے التجا کی کہ ''مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اس کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھوں میں لے لیجئے میں اس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا'' تو اس اپیل پر یہ جواب ملا تھا کہ ''آپ اور آپ کی کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو۔''

مسلمانوں کا روشن مستقبل کے مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں کہ:

> جب مولانا قاسم نانوتوی سے کہا گیا کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا اپنی مرضی سے انتظام کریں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دستبردار ہو جائیں اس کے بعد ہی مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس پر سرسید نے یہ کیا کہ جو کمیٹی دینیات کی بنائی گئی اس کے ممبر خود نہیں ہوئے۔

سرسید کے یہ راستہ اپنانے پر مولانا قاسم نانوتوی کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو ناظم دینیات کے طور پر بھیجا گیا، مولانا عبداللہ کے لیے خود سرسید نے سفارشی خط لکھا تھا، اس خط سے علماء دیوبند کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

"مولوی عبداللہ فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے، نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے اور داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان کے سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ اسلام انجام دیں اور اس لحاظ سے میں ان کا مدرسہ میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔"

مولانا نانوتوی اور سر سید احمد خاں کے درمیان بعض دینی خیالات اور رجحانات کے متعلق بعد المشرقین تھا لیکن ذاتی طور پر دونوں ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور عقیدت مندی اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ان دونوں مخلص اور بے لوث ہمدرد و خیر خواہوں کے مذہبی اختلافات کو خصوصاً آج کل کے دانشوروں نے ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں نے سر سید کی مخالفت کی لیکن ان مخالفین کے نام تاریخ کے اوراق میں دفن ہو کر رہ گئے اور ان کے اوپر دھول کی دبیز تہہ جم گئی، جبکہ حالات کی ستم ظریفی کہ چونکہ بار بار یہ بات سامنے آتی رہی کہ "مولویوں نے سر سید احمد خاں کی مخالفت کی تھی، ایسے میں ہمارے دانشور جب یہ دیکھتے ہیں کہ سر سید کے زمانہ میں مولانا قاسم نانوتوی نے دار العلوم دیوبند قائم کیا تھا تو فوراً نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ مولانا نانوتوی نے ہی سر سید کی انگریزی تحریک کی مخالفت کی تھی۔

حالانکہ الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سر سید احمد خاں کے آپسی تعلقات کا پتہ خود ان دونوں کی تحریروں سے آسانی سے چل جاتا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کو سمجھنے کے لئے ان کی آپس میں ہونے والی خط و کتابت بھی مددگار ثابت ہوتی ہے جو "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ سر سید نے اپنے ایک دوست پیر جی منشی محمد عارف کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو یہ میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"

اور جواب میں حضرت نانوتوی نے اولاً پیر جی منشی محمد عارف صاحب ہی کو لکھا تھا:

اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندیٔ اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے، مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ مجھ کو ان کی کمال دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کو ثمرہ محبت سمجھ کر تہہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے۔

مولانا نانوتوی کو سرسید کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا بھرپور اظہار انہوں نے مولانا کی وفات پر لکھے ہوئے اپنے تعزیتی مضمون میں بخوبی کر دیا ہے۔ یہ مضمون سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۳۰ راپریل ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے جہاں مولانا نانوتوی کی بے شمار خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے، ان کے علم وعمل، خدا ترسی، تقوی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ خود سرسید کی انصاف پسندی اور صاف دلی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کی رائے اپنے ایسے معاصر کے بارے میں جو اس کے عقائد نظریات اور رجحانات سے سخت اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ بے لاگ حیثیت ہی کی حامل ہوگی۔ یہ بات تو بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ رائے عقیدت مندی کی مبالغہ آرائی اور تعریف وستائش سے بالکل ہی پاک ہوگی۔

سرسید نے لکھا تھا:

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح مولوی محمد قاسم نے ۱۵ راپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو یا اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج اور غم وافسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علما میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم وفضل اور تقوی وورع میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم صاحب نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ وورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمر میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے انہوں نے جناب مولوی مملوک علی سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقوی اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے، ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش ز ہوش مندی　　می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت و سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے، بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہی کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے خوشی کا ہو یا ناخوشی کا کسی طرح ہوا سے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ کہتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے جانتے تھے، مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی

زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو الا یہ اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت وافسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر یا رومال سے پونچھ کر صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے''۔

مقام شکر ہے کہ سرسید کی نصیحتوں پر مولانا نانوتوی کے معتقدین نے مثالی انداز میں عمل کیا اور نہ صرف علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے دیوبند میں قائم کئے ہوئے ان کے مدرسہ کو ترقی دے کر ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند بنا دیا بلکہ دیوبند سے نکلنے والے ہر فرد نے ایک نیا دیوبند قائم کرنے کو اپنا مقصد حیات قرار دیا جس سے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں مدرسوں کا جال پھیل گیا ہے۔ علما اور ان کے قائم کردہ دینی مدرسوں کے بارے میں یقیناً بہت سی شکایتیں ہو سکتی ہیں اس کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان مولویوں اور حافظوں کو جو کچھ آتا ہے اور جو کچھ ان کے اختیار میں ہے وہ اس کو انجام دے رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی، بائیولوجی، کمپیوٹر، سائنس، کامرس اور دوسرے عصری علوم وہ خود نہیں جانتے، ایسے میں ان سے ان علوم کی تدریس و تعلیم کی توقع رکھنا بہت بڑی نادانی ہے۔

اس کے برعکس سرسید کے نام لیواؤں نے خود ان کے الفاظ میں ''بہ نسبت اس کے کہ عملی طور

پر کوئی کام کرتے زبانی عقیدت اور ارادت بہت ظاہر کی ہے۔" چنانچہ آج عصری علوم کے میدان میں مسلمانوں کی حالت نہایت خستہ اور پسماندہ ہے، اگر جدید علوم کے ماہرین سر سید احمد خاں سے سچی محبت اور دلی وابستگی رکھتے ہیں تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ سر سید نے جو راستہ دکھایا ہے، جو مشن دیا ہے اس کو اختیار کرتے ہوئے ہر ہر گلی اور ہر ہر محلہ میں ایسے اسکول اور کالج قائم کئے جائیں جن میں تعلیم حاصل کرنے والے عصری علوم کے مختلف میدانوں میں بلند مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب پر پوری طرح فخر کرتے ہوں، وہ اپنے مذہب کے اصول وفروع، اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض کو اس طرح اپنائیں کہ وہ سر سید کے دیکھے ہوئے خواب کی سچی تعبیر بن جائیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں جدید علوم ہوں، دوسرے ہاتھ میں قرآن کریم ہو اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔

◀◀ اختتامیہ ▶▶

رپورٹ

مولانا عبدالقادر شمس قاسمی*

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار

۲۰ تا ۲۲ رمئی ۲۰۰۰ء کو نئی دہلی میں انیسویں صدی میں علمی و دینی تحریک برپا کرنے والی عظیم شخصیت، دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات و خدمات کو اجاگر کرنے اور ان کے افکار و نظریات سے اکیسویں صدی کو مستفید کرنے کے لیے ایک عظیم الشان سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز علما، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہان اور ملی قائدین و دانشوران نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار کا اہتمام ''تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' نے کیا تھا۔

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کا افتتاحی اجلاس نئی دہلی کے تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے اسٹیڈیم میں طلبا بھی تھے، اساتذہ بھی اور تحریک دیوبند سے والہانہ اور جذباتی وابستگی رکھنے والے ہزاروں فرزندانِ توحید بھی، جو ملک کی مختلف ریاستوں اور اتر پردیش کے مختلف اضلاع سے بسوں، کاروں اور ریل گاڑیوں سے آئے تھے۔ ساتھ ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ذرائع ابلاغ کے مختلف شعبوں کے نمائندے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اس باوقار اجلاس کو پررونق اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے ملک کی ممتاز شخصیتیں اسٹیج پر جلوہ افروز تھیں۔

اجلاس کی صدارت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور بہار واڑیسہ کے امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب نے فرمائی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شیخ عبدالرحمٰن ناصر العوہلی سفیر سعودی عرب برائے ہند، جلوہ افروز تھے۔ اجلاس کا باضابطہ آغاز دارالعلوم دیوبند کے استاذ وسابق صدر شعبۂ تجوید قاری ابوالحسن اعظمی کی تلاوت قرآن سے ہوا، اس کے بعد مولانا محمد عبداللہ مغیثی (صدر مجلس استقبالیہ) نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبہ استقبالیہ میں مولانا مغیثی نے کہا کہ ''آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جن حالات میں امام محمد قاسم نانوتوی نے تحریک دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، جس

* سب ایڈیٹر ''عالمی سہارا''

نے احیائے امت اور احیائے اسلام کے ساتھ ساتھ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا، آثار بتا رہے ہیں کہ ہم پھر کچھ اسی قسم کے تشویش ناک حالات سے دوچار ہونے والے ہیں۔ آج پھر ہماری شریعت، ہماری عبادت گاہیں اور ہمارے مدارس ومکاتب نشانے پر ہیں، حالات کا تقاضا ہے کہ ہم منصوبہ بند طریقے پر درپیش مسائل وخطرات کا مقابلہ کریں اور بانیٔ تحریک دیوبند کے کارناموں کا بھی مطالعہ کریں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پیشتر آج سے زیادہ تشویش ناک حالات وخطرات میں گھرنے برصغیر کے مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کی تھی''۔

شیخ عبدالرحمٰن ناصر العوہلی نے اپنے خطاب میں امام محمد قاسم نانوتویؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: انھوں نے اپنے قافلۂ سخت جاں کے جاں نثار ساتھیوں اور تلامذہ کے ساتھ مل کر اس ملک میں اسلامی تشخص کی حفاظت وبقا اور ہندوستانی مسلمانوں کا اپنے ایمان وعقائد سے رشتہ استوار وبرقرار رکھنے اور اسلام مخالف رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ایسے وقت میں جدوجہد کی جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نازک اور مشکل دور تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام مخالف قوتوں کا مقصد اسلام کی روشن اور صاف شفاف تصویر کو داغدار کرنا ہے، آج اسلام کو تعصب، تشدد اور دہشت گردی سے جوڑنے کی مہم جاری ہے۔ ان حالات میں علما ومفکرین کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔

سعودی سفیر کی تقریر کا ترجمہ وخلاصہ نہایت بلیغ وپُر اثر انداز میں مولانا فصیح الدین دہلوی نے پیش کیا۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں فرمایا کہ: ۱۳۴ ربرس قبل امام نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ایک تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی تھی جس کی روشنی آج پورے عالم کو منور کررہی ہے۔ انھوں نے اپیل کی کہ امام نانوتویؒ کی دینی وتعلیمی تحریک کے نتیجہ میں مدارس ومکاتب کا جو جال نظر آرہا ہے، اس کا تحفظ اور استحکام آج کی اولین ضرورت ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ: امام محمد قاسم نانوتویؒ دنیا کی وہ عظیم ہستی تھی جس نے ایک صدی کی تعمیر کی ہے اور ایک عہد کو شعور وفکر اور علم وآگہی سے نوازا ہے۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انظر شاہ

مسعودی کشمیری نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں تحریک دیو بند کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: حضرت نانوتوی باشعور، وقت شناس اور بابصیرت عالم دین تھے۔ ماہنامہ الفرقان کے مدیر مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی نے بھی دور حاضر کے چیلنجوں اور علما کی ذمہ داریوں کے موضوع پر نہایت فکر انگیز خطاب فرمایا۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے مولانا سید نظام الدین نے فرمایا کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ نے قانونِ شریعت کے تحفظ اور مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات کی روح پیدا کرنے اور تنظیم واتحاد کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کی مجلسیں منعقد کیں، نیز شعائر اسلام کے تحفظ اور عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور حملوں کا مومنانہ فراست کے ساتھ مقابلہ کیا۔ موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم امام نانوتوی کے علمی وفکری سرمایے کو نئے انداز واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔

افتتاحی اجلاس کو جن ممتاز علما اور دانشوروں نے خطاب کیا ان میں جماعت اسلامی کے نائب صدر مولانا شفیع مونس، جمعیۃ اہل حدیث کے جنرل سکریٹری مولانا عبدالوہاب خلجی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں مولانا سید محمد ولی رحمانی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ تفسیر وحدیث مولانا برہان الدین سنبھلی، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر سراج حسین، موسیٰ رضا، ڈاکٹر سید فاروق احمد، مشہور صحافی جناب شاہد صدیقی، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے صدر مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب کہ مولانا وحید الدین خاں، مولانا محمد اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا سید احمد ہاشمی، سید شاہد مہدی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولانا نور عالم خلیل الامینی، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا خالد ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید ساجد میاں، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی دہلوی (دہلی یونیورسٹی)، محمد آصف صدیقی، مولانا فضیل احمد قاسمی، مولانا منظور احمد سابق سکریٹری اردو اکیڈمی بہار واڑیسہ، مولانا سعید احمد قاسمی کشمیری، مولانا معین الدین قاسمی ناندیڑ مہاراشٹر، مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی اورنگ آباد مہاراشٹر، مفتی مجد القدوس خبیب رومی، مولانا عبداللہ الحسنی، مصری سفارت خانہ کے اول سکریٹری ولید المنوفی، افغان سفارت خانہ کے نائب سفیر فضل الرحمٰن فاضل، عراق کے اول سکریٹری محسن ہادی،

لیبیا سفارت خانہ کے صالح محمد الحسنی، ڈاکٹر معین الدین بقائی، کمال فاروقی، مولانا آس محمد گلزار قاسمی، مولانا سید عقیل احمد قاسمی اور مولانا یعقوب مظاہری وغیرہ اجلاس میں موجود تھے۔

تنظیم کے تعارف اور افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض تنظیم کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر زین الساجدین قاسمی نے انجام دیئے۔ اخیر میں مولانا عبدالستار سلام قاسمی نے ملک و بیرون ملک سے ان مشاہیر کے پیغامات پڑھ کر سنائے جو اس اجلاس میں زبردست خواہش کے باوجود اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ جن میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان)، قاری عبداللہ سلیم (امریکہ)، مولانا عبداللہ کاپودروی (کناڈا)، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)، مولانا یعقوب اسماعیل منشی (برطانیہ)، مولانا عاشق الٰہی بلند شہری (مدینہ منورہ)، مولانا شمشاد احمد قاسمی (جدہ)، مولانا عبدالرحیم قاسمی (دبئ)، مولانا خلیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخیر میں تنظیم کے کارگزار ناظم اعلیٰ مولانا محمد مزمل الحق الحسینی نے مندوبین اور حاضرینِ اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔

اس سیمینار میں "تحریک مدارس" کے موضوع پر تقریر کرنے کے لیے ملک کے مشہور مفکر و عالم مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز دہلی کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا، موصوف نے اس موضوع پر نہایت قیمتی مقالہ تیار کیا تھا جس کے بارے میں طے پایا تھا کہ یہ مقالہ افتتاحی اجلاس میں بصورت تقریر پیش کیا جائے گا، مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ مقالہ پیش نہ کیا جا سکا۔

سیمینار کا علمی سیشن نہایت پُرسکون و باوقار ماحول کے اندر جامعہ ہمدرد کے کنونشن سنٹر میں ۲۰ رمئی ۲۰۰۰ء کو بعد نماز مغرب شروع ہوا۔ کنونشن ہال جدید سہولیات اور سامان آرائش سے مرصع تھا، جس کا شمار غالباً دہلی کے سب سے اچھے ہالوں میں ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں فکر قاسمی کی اہمیت، امام محمد قاسم نانوتوی کی شخصیت کے امتیازی پہلو اور قاسمی فکر و فلسفہ کی خصوصیات جیسے موضوعات پر بیش قیمت مقالے پیش کئے گئے، مقالہ نگاروں نے امام محمد قاسم نانوتویؒ کو اپنے وقت کا عظیم مجاہد، مصلح امت اور اسلامیان ہند کا مسیحا اور امام قرار دیا اور کہا کہ امام نانوتویؒ بیک وقت میدان جنگ کے سپہ سالار بھی تھے، علم و معرفت کے علم بردار بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ متکلم اسلام اور مکتب ولی اللہی کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ ممتاز علما نے سیمینار کی پہلی، دوسری اور تیسری نشست میں یہ اپیل کی کہ موجودہ حالات میں جہاں اس بات کی ضرورت

ہے کہ ہم امام نانوتویؒ کے علمی وفکری سرمایے کو نئے انداز واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں نیز ان کے نقوش علمی اور افکار ونظریات کی ترویج واشاعت کے لیے سرگرم جدوجہد کی شروعات کریں وہیں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ برادران قاسمی کی اس تحریک کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے ہر ممکن تعاون پیش کریں۔

سیمینار کی پہلی نشست مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی صدارت میں منعقد ہوئی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا عتیق احمد بستوی نے انجام دیئے۔ اس نشست میں امام نانوتوی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، ڈاکٹر بدرالدین الحافظ سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی، مولانا محمد اسلم قاسمی دیوبند، سید ولی حسین جعفری لکچرر جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس نشست میں جناب منظور احمد وائس چانسلر امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ نے امام نانوتوی کی شخصیت کو انگریز مصنفین کے حوالے سے نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا۔ اس موقع پر دیوبند سے آئے ہوئے طارق ابن ثاقب نے امام نانوتوی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

دوسری نشست کا آغاز ۲۱ رمئی کو حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی صدارت میں ہوا، نظامت کے فرائض مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے انجام دیئے اور مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد، مولانا ندیم الواجدی، مولانا عتیق احمد بستوی لکھنؤ، مولانا برہان الدین سنبھلی لکھنؤ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے، اس نشست سے جناب سراج حسین صاحب وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے بھی خطاب کیا، اس موقع پر مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری نے نظم پیش کی۔

تیسری نشست مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مفتیٔ اعظم پنجاب کی صدارت اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کی نظامت میں منعقد ہوئی، اس نشست میں مولانا اسعد اسرائیلی، مولانا اختر امام عادل اور ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی نے اپنے اپنے مقالات پڑھ کر حاضرین کو مستفیض کیا، جب کہ مولانا مجد القدوس خبیب رومی نے اپنے والد مفتی عبدالقدوس رومی مفتی شہر آگرہ کا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ مولانا اسعد اسرائیلی کا مقالہ بے حد پسند کیا گیا۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین قاسمی، ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی، ڈاکٹر بصیر احمد خاں، مفتی سلیمان ظفر قاسمی، مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا عبدالحفیظ رحمانی، مولانا

نورالحسن راشد کاندھلوی اور مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے بھی اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ قاری عبداللہ سلیم (امریکہ) کا مقالہ ان کے نواسے مولانا یاسر ندیم، مولانا محمد اسلم قاسمی کا مقالہ ان کے صاحبزادے محمد عاصم قاسمی، مولانا بدرالحسن قاسمی (کویت) کا مقالہ مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی اور مولانا ابوالقاسم نعمانی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا مقالہ مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی نے پیش کیا۔

مقالہ لکھنے والوں میں مولانا عاشق الٰہی بلند شہری (مدینہ منورہ)، مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر)، مولانا نور عالم خلیل الامینی دارالعلوم دیوبند، مولانا اسیر ادروی، مولانا ابوبکر غازی پوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی، مولانا محب الحق امروہہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبردست خواہش اور کوشش کے باوجود حضرت مولانا مفتی مظفر حسین ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر سیمینار میں شریک نہ ہوسکے۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی بھی بیرون ملک میں ناسازیٔ طبع کی وجہ سے سیمینار میں شرکت سے معذور رہے۔ البتہ حضرت قاضی صاحب نے اپنا کلیدی خطبہ شرکائے سیمینار کے لیے ارسال کردیا تھا جو قدرے تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر سیمینار میں پڑھا نہ جاسکا۔

چوتھی نشست کی صدارت مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا ندیم الواجدی نے انجام دیئے، جب کہ اختتامی اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر نے کی اس نشست میں بعض بڑے اہم علمی مسئلوں پر بحث ہوئی، جن پر صدر اجلاس نے مؤثر تقریر کرتے ہوئے ایسی وضاحت کی جو سبھوں کے لیے قابل قبول تھی، آخر میں انھوں نے کہا کہ علمی معاملات میں غور وفکر سے کام لیا جائے گا، تو الگ الگ رائیں سامنے آئیں گی، یہ اختلاف آراء کثرت علم اور غور وفکر کی علامت ہے، اختلاف رائے سے گھبرانا نہیں چاہیے، یہ وہ اختلاف ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا: اختلاف امتی رحمة ... یہ اختلاف، نفس کے لیے نہیں، اپنی بات پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے نہیں، مخالفت کے لیے نہیں، بلکہ یہ اختلاف تحقیق وجستجو کے نتیجہ میں حقیقت کی تلاش کی وجہ سے ہوا کرتا ہے، جو رحمت کا سبب ہے۔

حضرت امام نانوتویؒ نے اسی لیے اصلاح نفس اور تربیت نفس کی تعلیم دی، انھوں نے ضبط نفس کا مجاہدہ کیا، تاکہ اختلاف اور مخالفت کی سرحدیں واضح رہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کی رضا کے لیے کیا، اس لیے نہ ناکامیوں میں دل شکستہ ہوئے، نہ کامیابیوں پر اترائے، بس خدا کی رضا کے لیے پوری زندگی سرگرم سفر رہے، ان کی سیرت وخدمت کی روح یہی ہے کہ راضی برضا ہوکر جینے کا مزہ دیکھ۔ شاملی کا معرکہ کارزار ہو یا اصلاح معاشرہ کی پرمشقت مہم، اصلاح کتب کی محنت ہو، یا دارالعلوم کے قیام کے صبر آزما مرحلے، تربیت نفس کی بات ہو، یا نونہالان امت کے مستقبل کی تعمیر، مشکل حالات اور صبر آزما لمحات میں وہ کبھی خزاں رسیدہ نظر نہیں آئے، ہمیشہ شجر سایہ دار بنے رہے، انھوں نے جس نسل کو تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی، اس کا شعار **بالليل رهبان وبالنهار فرسان** (رات میں عابد اور دن میں مجاہد) ہے، وہ آنے والی نسل کو ماضی کے ان اہل علم، باحمیت اور باکردار، بزرگوں کے طرز پر دیکھنا چاہتے تھے، جن کی تصویر علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کھینچی ہے:

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اختتامی اجلاس میں گراں قدر تجاویز منظور کی گئیں۔ امام نانوتوی کے افکار وعلوم کو مختلف زبان اور نئے اسلوب کا پیرہن دینے اور دیگر اکابر دیوبند کی حیات وخدمات پر اس طرح کے سیمینار منعقد کرنے، ان کے افکار ونظریات پر مشتمل کتابوں کی اشاعت، فضلائے دیوبند کو منظّم ومربوط کرنے نیز دعوت وتبلیغ کے لیے ذرائع ابلاغ کا استعمال اور انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ مخصوص کرنے کی تجویزیں بھی منظور کی گئیں۔ ان تجاویز کے علاوہ امام نانوتوی سے منسوب ہر سال دو ایوارڈ دینے کا اعلان، تنظیم ابنائے قدیم کو وسعت وترقی دینے کے لیے فضلائے دیوبند سے رابطہ کی مہم، اترپردیش مذہبی عمارات بل اور قادیانیوں کے بڑھتے قدم کے خلاف ٹھوس جدوجہد سے متعلق تجاویز منظور کرتے ہوئے عملی جدوجہد کے آغاز کا عزم کیا گیا۔

اس سیمینار کی مناسبت سے جامعہ ہمدرد کی ''حکیم محمد سعید نیشنل لائبریری'' میں تحریک دیوبند سے متعلق کتابوں کی ایک نمائش لگائی گئی جس میں شرکائے سیمینار نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی رسالے ''صفا'' کا خصوصی شمارہ بعنوان

''الامام محمد قاسم النانوتوی حیات اور افکار و آثار'' کی رسم رونمائی مولانا محمد سالم قاسمی کے ہاتھوں عمل میں آئی نیز اعلان کیا گیا کہ جلد ہی ''مکتوبات نانوتوی'' کے نام سے امام نانوتوی علیہ الرحمہ کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا مجموعہ شائع کیا جائے گا جسے نور الحسن راشد کاندھلوی نے ترتیب دیا ہے۔

سیمینار کی کامیابی پر سیمینار کے داعیان مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، ڈاکٹر معین الدین بقائی، ڈاکٹر سید فاروق احمد، مولانا بدرالدین الحافظ، مولانا فرید الزماں کیرانوی، مولانا بدرالزماں قاسمی کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا خالد قاسمی، مولانا اسعد الاعظمی، مولانا عبدالستار سلام قاسمی وغیرہ نے مندوبین کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون واشتراک سے اتنا بڑا اور نتیجہ خیز سیمینار کامیاب ہوسکا۔

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی اسسٹنٹ سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر محسن عثمانی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالحی فاروقی جامعہ ہمدرد، ڈاکٹر رضی احمد کمال جامعہ ملیہ اسلامیہ، راحت محمود چودھری، مولانا عبدالرؤف قاسمی اور چودھری اقبال الدین بھی سیمینار کی مختلف نشستوں میں شریک ہوئے۔

اس عظیم الشان اجلاس کو بحسن وخوبی کامیاب بنانے اور اس کی تیاری میں زبردست تعاون دینے والوں میں حکیم عبدالمعید ہمدرد فاؤنڈیشن، پروفیسر ریاض عمر، منصور عثمانی سکریٹری اردو اکیڈمی، سید عارف میاں، انجم عثمانی (دوردرشن)، سید محمد شکیل، مولانا قاری محمد سلیمان قاسمی، مولانا وارث مظہری، مولانا نوشاد عالم قاسمی، انوار الوفا اعظمی، چودھری محمد رفیق قاسمی، شاہد کمال قاسمی، جناب کوثر علی انجینئر، معصوم مرادآبادی، منور حسن کمال، چودھری اقبال الدین، مولانا افتخار حسین قاسمی مدرسہ امینیہ، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا اشفاق احمد قاسمی (قومی آواز)، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ذاکر باغ، ڈاکٹر محمد ارشد غازی آباد، مولانا محمد ارشد فاروقی اعظمی، مولانا عبدالسمیع اجراڑہ، عبدالقادر شمس قاسمی اسسٹنٹ ایڈیٹر ماہنامہ ملی اتحاد نئی دہلی، حاجی رفیع الدین جعفرآباد، جناب نظام الدین دہلوی کشمیری گیٹ، مولانا انور علی قاسمی، قاری عبدالرحمٰن عابد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منظور شدہ تجاویز اور فیصلے

تجویز (۱)

اس اجتماع کا احساس ہے کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ کے افکار اور علوم و معارف ایک قیمتی ورثہ ہیں اور موجودہ حالات کے پس منظر میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے فرزندانِ دارالعلوم کو خصوصاً اور علمائے دین کو عموماً آپ کی تحریروں کو نئی زبان اور نئے اسلوب کا پیرہن دینے میں آگے آنا چاہئے اور تنظیم ابنائے قدیم کو چاہئے کہ ایسی کوششوں کو مربوط کرے اور اس کے لئے ممکن وسائل فراہم کرے۔

تجویز (۲)

یہ سیمینار تنظیم سے درخواست کرتا ہے کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ کی طرح دیگر اکابر دارالعلوم دیوبند کی حیات اور خدمات اور افکار و تعلیمات پر بھی ملک کے مختلف علاقوں میں سیمینار منعقد کرائے جائیں تاکہ علماء، اربابِ دانش اور عام مسلمان ان کے علوم و افکار سے روشنی حاصل کر کے موجودہ حالات میں اسلام کی دعوت و اشاعت اور حمایت و حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

تجویز (۳)

اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ طلبۂ مدارس کے سامنے اکابر دیوبند کا تعارف آئے تاکہ وہ اپنے بزرگوں سے فکری، ذہنی اور روحانی طور پر مربوط رہیں۔ اس کے لئے یہ سیمینار سفارش کرتا ہے کہ اکابر دیوبند کی شخصیات اور ان کے بنیادی افکار و تعلیمات پر مشتمل کتابیں تیار کی جائیں تاکہ دینی مدارس کے طلبا اکابر دیوبند کے روشن کارناموں سے واقف ہو سکیں۔

تجویز (۴)

یہ زمانہ ذرائع ابلاغ کا ہے جس کا بہتر مقاصد کے لئے استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اجتماع کو احساس ہے کہ دوسری قوموں کی طرح ہم ذرائع ابلاغ سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ضرورت ہے کہ انٹرنیٹ پر تنظیم ابنائے قدیم ایک خصوصی ویب سائٹ حاصل کرے تاکہ اسلامی دعوت و تبلیغ اور اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کے لئے اکابر دارالعلوم دیوبند کے کارنامے وسیع طور پر دنیا کے سامنے آسکیں۔ شرکائے اجتماع کو احساس ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے

گزشتہ ۱۲۴ سال کی مدت میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو تاریخی خدمات انجام دی ہیں، دنیا ان سے صحیح طور پر واقف نہیں ہے، اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ دنیا کو اس سے واقف کرانے کے لیے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کیا جائے۔

تجویز (۵)

اللہ کے فضل و کرم سے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اپنا علمی سفر جاری رکھے ہوئے ہے، یہ تنظیم اپنے قیام کے روز اول ہی سے اس بات کے لئے جدوجہد کر رہی ہے کہ فضلائے دارالعلوم دیوبند میں فکر و عمل کی وحدت کے لیے تمام ممکن طریقے بروئے کار لائے جائیں۔ الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کا انعقاد اسی جذبہ سے کیا گیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اس سیمینار نے جمود کی برف پگھلا دی ہے اور فضلائے دارالعلوم کے دلوں میں ایک نیا جوش بھر دیا ہے تنظیم ابنائے قدیم اس جوش کو تازہ دم رکھنے اور شوقِ علم کو مہمیز کرنے کے لئے ہر سال ''الامام محمد قاسم النانوتویؒ'' کے اسم گرامی سے منسوب دو ایوارڈ دیئے جانے کی تجویز منظور کرتی ہے۔ جن میں سے ہر ایوارڈ کی مالیت سر دست پچاس ہزار روپے ہوگی۔ ساتھ ہی ایک توصیفی سند بھی پیش کی جائے گی۔

ان میں سے ایک ایوارڈ ممتاز فضلائے دارالعلوم دیوبند کے لئے مخصوص ہوگا۔ جنہوں نے علوم اسلامیہ کی خدمت اور تصنیف و تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں اور دوسرا ایوارڈ ان حضرات کے لیے ہوگا جو اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل نہیں ہوں گے، مگر انہوں نے اسلامیات پر کوئی گراں قدر اور ٹھوس علمی کام کیا ہوگا۔ اور ان کا علمی و تحقیقی کام منظر عام پر آ گیا ہوگا۔ یہ ایوارڈ ایسے اصحاب علم کو بھی دیا جا سکتا ہے جنہوں نے کسی اہم اسلامی موضوع پر کوئی وقیع کام کیا ہو اور اسے اصحاب علم و فضل سے بھرپور تحسین و تائید حاصل ہو، اس سلسلہ میں ایک ایوارڈ کمیٹی بنا دی گئی ہے، جس کے کنوینر تنظیم ابنائے قدیم کے نائب صدر مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد ہوں گے۔

تجویز (۶)

سیمینار کا احساس ہے کہ اس وقت ریاست اتر پردیش نے جو مذہبی عبادت گاہ بل منظور کیا ہے اور جس سے ملتا جلتا قانون راجستھان، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش میں پہلے سے موجود ہے۔

وہ ملک کی جمہوری روایات کا قتل اور شہری حقوق سے متعلق دستور میں دی گئی ضمانتوں سے کھلا ہوا انحراف ہے۔ اس لئے حکومت اتر پردیش اس بل کو واپس لے اور راجستھان، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کی ریاستیں بھی ان قوانین کو منسوخ کریں۔ یو پی بل کے خلاف مسلم تنظیموں کی طرف سے جو تحریکیں چل رہی ہیں تنظیم ابنائے قدیم ان کی حمایت کرتی ہے۔

تجویز (۷)

شرکائے سیمینار کو اس بات کا احساس ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے ہندوستان میں قادیانیوں کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ وہ مختلف چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں خیراتی اداروں، مدرسوں اور مراکز کھول کر اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ کچھ سادہ لوح مسلمان ان کے دام فریب میں گرفتار بھی ہو رہے ہیں۔ اس غرض سے نئی دہلی کے تغلق آباد علاقے میں ایک بڑا مرکزی دفتر بشکل مسجد تعمیر کیا گیا ہے۔

تنظیم عام مسلمانوں اور مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کو اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ اس طرح کی سرگرمیاں دیکھیں، مسلمانوں کو آگاہ کریں اور حکمت وتدبر کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں۔

تجویز (۸)

یہ اجتماع خواہش کرتا ہے کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے ریاستی، ضلعی اور علاقائی سطح پر منظم کیا جائے نیز بیرون ملک کے فضلاء کو بھی تنظیم کے تحت منظم کیا جائے تاکہ فضلائے دیوبند باہم مربوط ہوں اور وہ زیادہ ارتباط وانضباط کے ساتھ اپنی دینی، اصلاحی اور فکری خدمات انجام دے سکیں اور تنظیم کی توسیع وترقی کے لئے مفید ومعاون ہو سکیں۔

تجویز (۹)

یہ زمانہ تعلیمی پھیلاؤ اور قوموں کے باہمی اختلاط وتعامل کا زمانہ ہے۔ سیمینار کو احساس ہے کہ عصری ضرورتوں کی تکمیل اور دعوت اسلامی کے کام کو وسیع طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اسلامی طلبہ عصری علوم سے بھی کسی حد تک واقف ہوں۔ اس لیے یہ سیمینار سفارش کرتا ہے کہ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

(۱) عمومی دینی تعلیم : جس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے اس کے تحت تمام ضروری مضامین: انگریزی، حساب، جغرافیہ، عربی زبان، فارسی زبان، سائنس، معلوماتِ عامہ اور انشاء وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔

(۲) خصوصی دینی تعلیم : یعنی وہ اعلیٰ تعلیم جو ہمارے بڑے مدرسوں میں دی جارہی ہے جس کی ضرورت باقاعدہ ماہر عالم دین بننے کے لیے ہے اس ضرورت کے لیے مروج درس نظامی ضروری ترمیمات کے ساتھ بالکل مناسب ہے۔

تجویز تعزیت:

آج کا یہ سیمینار دل کی گہرائیوں سے ملت کے عظیم محسنین اور ارباب علم وفضل کی جدائی پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، شرکاء کو احساس ہے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حکیم عبدالحمیدؒ، حضرت مولانا حنیف ملی، مولانا حکیم زماں حسینیؒ جیسی شخصیات اس دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ہم تمام حاضرین اپنے ان بزرگوں کو بصمیم قلب خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ملت کے ان محسنین کے ساتھ احسان کا معاملہ فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔

تجویز تشکر:

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کے انعقاد پر ہم اپنے معاونین، مندوبین اور کارکنان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو جن حضرات نے جس شکل میں بھی اپنے تعاون سے نوازا ہے، ہم شرکائے اجتماع ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں خاص طور پر ہم جناب مولانا عبداللہ کاپودروی، مقیم کناڈا، جناب مولانا قاری عبداللہ سلیم، مقیم امریکہ، جناب مولانا شمشاد احمد قاسمی، مقیم جدہ، جناب مولانا عبدالرحیم قاسمی، مقیم دبئی، جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد چیرمین ہمالیہ ڈرگس کمپنی، جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی، جناب حکیم عبدالمعید متولی ہمدرد وقف، جناب سراج حسین وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی تغلق آباد وغیرہ حضرات کے ممنون و مشکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو اپنے ان تمام محسنین کا سرگرم تعاون آئندہ بھی ملتا رہے گا۔

مولانا وارث مظہری

آئینہ حیات
امام محمد قاسم نانوتویؒ

نام : محمد قاسم، تاریخی نام، خورشید حسین
والد کا نام : شیخ اسد علیؒ
سن پیدائش : ۱۲۴۸ بمطابق ۱۸۳۲یا۱۸۳۳ء
وطن : قصبہ نانوتہ، ضلع سہارنپور یوپی (نانوتہ دہلی سے تقریباً ۱۶۴کلومیٹر شمال میں واقع ہے)
تعلیم : ابتدائی تعلیم، ناظرہ قرآن اور خوش نویسی وغیرہ نانوتہ کے مکتب میں حاصل کی۔ ابتدائی عربی تعلیم (میزان ومنشعب وغیرہ) دیوبند میں مولوی مہتاب علیؒ کے مکتب میں نیز سہارنپور میں مولوی محمد نوازؒ کے مکتب میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول اور اس کی تکمیل دہلی میں ہوئی۔ (حفظ قرآن ۱۸۶۶ء میں حج کے سفر کے دوران کیا)
فراغت : ۱۲۶۴ یا ۱۲۶۵ھ
مدت تعلیم : ۵ یا۶ سال
اساتذہ : مولانا مملوک علی نانوتوی، شاہ عبدالغنی مجددی، مفتی صدر الدین، مولانا احمد علی محدث دہلوی وغیرہ۔
تصوف وسلوک کی تعلیم : حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ
مشہور رفقا : مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ دیوبند، حضرت حاجی سید محمد عابد حسین دیوبندیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین عثمانی دیوبندی وغیرہ۔
مشہور تلامذہ : مولانا احمد حسن امروہوی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا منصور علی خاں حیدرآبادی وغیرہ۔
ذریعہ معاش : کچھ دنوں دہلی کے کسی سرکاری مدرسے میں ملازمت تدریس تصحیح کتب: (الف) مطبع احمدی-دہلی (تا ۱۸۵۷ء) (ب) مطبع مجتبائی میرٹھ (از: ۱۸۶۱ تا ۱۸۶۸ء) (ج) مطبع ہاشمی (د) مطبع مصطفائی-دہلی

نکاح : (بہ عمر تقریباً ۲۱ یا ۲۲ سال، اہلیہ: بنت شیخ کرامت حسین (رئیس کبیر دیوبند)

اولاد : (لڑکے) محمد احمد، محمد ہاشم، محمد میاں، (لڑکیاں) اکرام النساء، رقیہ، خدیجہ، مریم، عائشہ (ان کے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی ہیں جن کا نام معلوم نہیں)

اصلاح معاشرہ کی کوشش : اصلاح افکار وعقائد احیائے عقد بیوگان، لڑکیوں کے حق وراثت کا احیاء دیوبند سے تعزیہ داری کی رسم کا خاتمہ۔ اہل دیوبند سے ترک بدعات پر اقرار نامہ

مناظرے
- ۱۹-۲۰ / مارچ ۱۸۷۶ء کو چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور۔ یوپی میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ مناظرے کیے اور اسے شکست فاش دی نیز عیسائیت کے اہم نمائندوں پادری اسکاٹ، نولس اور جان ٹامس وغیرہ کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے ایسے مکمل اور دندان شکن جوابات دیئے کہ حاضرین دم بخود رہ گئے۔ اسی موقع پر پادری نولس نے کہا تھا "کہ اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے"۔
- جولائی ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرے اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے حضرت نانوتوی ۱۷ دنوں تک رڑکی میں رہے لیکن پنڈت جی مناظرے پر آمادہ نہ ہوئے اور راہ فرار ڈھونڈی۔
- ۱۸۷۹ء میں پنڈت دیانند سرسوتی میرٹھ پہنچے اور اپنی عادت کے مطابق اسلامی عقائد واحکام پر اعتراضات کئے حضرت نانوتوی نے یہاں ان کا تعاقب کیا لیکن وہ کسی بہانے فرار ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد پنڈت جی پھر میرٹھ پہنچے، مناظرے کی دعوت دی لیکن وہ سامنے نہ آئے۔
- ۷/۸ / مئی ۱۸۷۵ء کو "میلۂ خدا شناسی" میں عیسائی پادریوں (نولس وغیرہ) کے سامنے اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کے ابطال پر تقریر۔

دفاعی اقدامات : جنگ آزادی کی ابتدائی تحریک ۱۸۵۷ء کے زمانے میں شاملی کی جنگ میں شرکت۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس : ۱۵ / محرم الحرام ۱۲۸۳ھ - ۳۰ / مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات۔

قیام سے پہلے چندہ : ۲ / ذی قعدہ ۱۲۸۲ بروز جمعہ (چندے کی پہل حاجی سید محمد عابد حسین کے ہاتھوں ہوئی)

دارالعلوم دیوبند کی تعمیر کی سب سے پہلی اپیل : تحریری طور پر ۱۲۸۸ھ، اعلان عام کی شکل میں، ۱۹ / ذی قعدہ ۱۲۹۱ بروز جمعہ بموقع جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات۔

تاریخ سنگ بنیاد : ۲ / ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ بموقع جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات۔

آپؒ کی تحریک پر دارالعلوم کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس : منبع العلوم گلاؤٹھی، ضلع بلند شہر یوپی، مدرسہ شاہی، مرادآباد یوپی، مدرسۃ الشرع، سنبھل مرادآباد یوپی ان کے علاوہ مزید دس گیارہ مدارس مظفرنگر، رڑکی، خورجہ، بجنور، علی گڑھ وغیرہ میں قائم ہوئے۔

تصنیفات اور تحریریں : (۱) آب حیات (۲) انتصار الاسلام (۳) تحذیر الناس (۴) تحفۂ لحمیہ (۵) تحشیہ بخاری (آخر کے پانچ چھ پاروں کا) (۶) تصفیۃ العقائد (۷) تفسیر معوذتین (۸) تقریر دل پذیر (۹) توثیق الکلام (۱۰) جواب ترکی بہ ترکی (۱۱) حجۃ الاسلام (۱۲) سنت وبدعت (بشکل مکتوب) (۱۳) فیوض قاسمیہ (مکتوبات کا مجموعہ) (۱۴) قبلہ نما (۱۵) گفتگوئے مذہبی (۱۶) مباحثۂ شاہجہاں پور وغیرہ۔

سفرحج : (۱) ۱۲۷۷ھ-۱۸۶۰ء (۲) ۱۲۸۶ھ-۱۸۷۰ء (۳) ۱۲۹۴ھ-۱۸۷۷ء

وفات : ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء بعد نماز ظہر۔

مدفن : گورغریبان معروف بہ ''مزار قاسمی'' (دیوبند)

☆......☆......☆
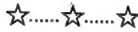
اصول ہشتگانہ

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

۱- ''اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲- ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳- مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آ جائے گا، القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلبؔ میں اہلِ مشورہ سے مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار متعدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵- خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سرو سامانی ملحوظ رہے۔

۷- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸- تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔ (تاریخ دار العلوم ج ا ص: ۱۵۳-۱۵۴)

عکس تحریر حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ
از: مباحثہ شاہ جہاں پور